اولیائے کرام نمبر
رحمہم اللہ تعالیٰ
سیارہ ڈائجسٹ

مدرسہ سیفیہ

لالہ موسیٰ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

شہزاد کاظمی ۱۹۶۹

سیارہ ڈائجسٹ

مدیرِ منتظم

امجد رؤف خان

زیرِ ادارت

علی سفیان آفاقی

نائب مدیر

ندیم اُپل

خطاطی:۔ محمد اقبال طاہر، علی احمد

ناشر:۔ امجد رؤف خان

شعبہ اشتہارات:۔ محمد اقبال طاہر (لاہور) واجد علی (کراچی)

رابطہ کے لیے

۱۸۹۔ ریواز گارڈن۔ لاہور۔ فون ۵۷۱۵۲۱

اولیائے کرام نمبر

جلد سوم

محمد احمد السیفی

پینل برائے

خصوصی شعبۂ ادارت

علامہ ضیاء الحبیب۔ پروفیسر مسز سعادت شبیر۔ جی آر اعوان۔ محمد ریاض قادری۔ طاہر محمود۔
عابد شکوہ۔ فقیر صفدر حسین۔ حامد چنیوٹی۔ حاجی محمد سلیم شامی نقشبندی۔ سید مقبول محی الدین گیلانی

ڈیزائن:۔ ارشد یعقوب

خطاطی:۔ محمد اقبال طاہر۔ علی احمد۔ عبدالعزیز۔ محمد ارشد

پروسیس:۔ فلک شیر

اہتمام:۔ امجد رؤف خان

قیمت:۔ عام شمارہ ۲۴ روپے اولیائے کرام نمبر: ۷ روپے

ناشر:۔ عثمان غنی

طابع:۔ اللہ والا پرنٹرز۔ لاہور

اس شمارے میں

حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ

حمد

یا ربّ ! غضب کی راہ سے ہر دم بچا مجھے
اپنے کرم سے راستہ سیدھا دکھا مجھے

مجھ کو تو مار ڈالتے شاید یہ حادثات
رحمت نے تیری بڑھ کے دیا حوصلہ مجھے

تُو نے تفکرات کی کاٹی ہیں بیڑیاں
تُو نے ہی بندِ غم سے کیا ہے رہا مجھے

میں اس کرم کا شکر کروں کس طرح ادا
تُو نے بنایا اُمّتیٔ مصطفےٰ مجھے

دل کا گداز ، اشکِ سحر ، عشقِ مصطفےٰ
جو کچھ مِلا ترے ہی کرم سے مِلا مجھے

ہوتا رہے کرم ترا مجھ پر یہ بار بار
بطحا دِکھا مجھے ، کبھی طیبہ دِکھا مجھے

ہر کام ہے خدائے دو عالم کے ہاتھ میں
عابدؔ نہیں جہاں میں کسی سے گلہ مجھے

خواجہ عابدؔ نظامی

دَر کُنگرہ وہدایہ نتواں خدارا یافت   ورقِ دل بہ بین کہ بہ ازیں کتابے نیست
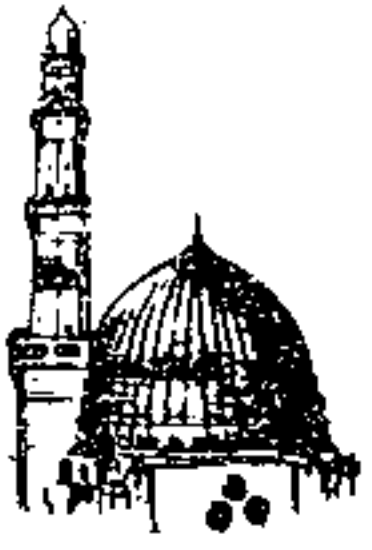
نعت شریف

بھیجے دُرود جو شہِ دیںؐ کی جناب میں
ممکن نہیں رہے وہ غم و اضطراب میں

دونوں جہاں کی نعمتیں قدموں میں آئیں گی
آ جاؤ، بارگاہِ رسالتماب میں

سرکارؐ کے پسینے کی تھی بات ہی کچھ اور
خوشبو کہاں وہ عنبر و مُشک و گلاب میں

انوارِ مصطفےٰ کی ملی کچھ اسے زکات
ورنہ یہ روشنی تھی کہاں آفتاب میں

مدّت سے ہوں بس ایک تمنا لیے ہوئے
اِک بار پھر حضورؐ کو دیکھوں مَیں خواب میں

اِک عشقِ مصطفےٰ تھا جو جوش آگیا مجھے
ورنہ دھرا ہی کیا تھا جہانِ خراب میں!

بھیجی تھیں کچھ دُرود کی عابدؔ نے ڈالیاں
آئیں ہزار رحمتیں اُس کے جواب میں!

خواجہ عابدؔ نظامی

دسمبر ۱۹۸۶ء میں سیارہ ڈائجسٹ نے نامور صوفیا، بزرگانِ دین مشائخ اور برگزیدہ ہستیوں کی زندگی اور اُن کے ایمان افروز واقعات پر مبنی اولیائے کرام نمبر کی جلد دوئم شائع کی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ہم نے اس عزم کا اظہار بھی کیا تھا کہ دینِ اسلام کی آبیاری کرنے والے ان بزرگانِ دین کے پُراسرار اور ایمان افروز حالات و واقعات پر تحقیق جاری رکھی جائے گی تاکہ ان زندۂ جاوید ہستیوں کے بارے میں جلد سوئم کا اہتمام کیا جا سکے۔

الحمد اللہ! کہ ہمیں اپنے اس نیک اور پختہ ارادے میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی اور اسی شب و روز کی تحقیق اور عرق ریزی کے نتیجے میں اولیائے کرام نمبر کی جلد سوئم کا نذرانہ آپ کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

جلد سوئم میں روشن ضمیر بزرگانِ دین کے حالاتِ زندگی اور کرامات وغیرہ کو یکجا کر دیا گیا ہے ہمیں اس بات کا بھی اعتراف ہے کہ کفر و ضلالت کے اندھیروں سے نجات دلانے والے اولیائے کرام اور صوفیا کی تعداد ان گنت ہے جس کے لیے شاید مزید دس جلدیں بھی متحمل نہ ہو سکیں۔ تاہم ہماری یہ مقدور بھر کوشش رہی ہے کہ اسلام کی ترویج و اشاعت کرنے والے اللہ کے ان پُراسرار بندوں کی زندگی کے پوشیدہ پہلوؤں کی زیادہ سے زیادہ نقاب کشائی کی جا سکے۔ ہم اپنے اس مقصد میں کس حد تک کامیاب رہے ہیں اس کا فیصلہ بہرحال ہمارے معزز قارئین کرام کو کرنا ہے۔

تیسری جلد کی تیاری میں ادارتی بورڈ کے معزز ارکان نے جو تحقیق اور عرق ریزی کی اس کے علاوہ جن قارئین کرام نے ہمیں اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا مزید برآں جن مصنفین نے ہمارے ساتھ تعاون فرمایا ہم اُن سب کے دلی طور پر سپاس گزار ہیں۔ ہم یہ بھی عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ ان مضامین کے انتخاب، ترتیب اور تہذیب و تدوین کے سلسلے میں پوری تندہی اور احتیاط سے کام لیا گیا ہے۔ تاہم اس سلسلے میں ہمیں اپنے معزز قارئین کرام کی آراء اور اُن کے قیمتی مشوروں کا انتظار رہے گا تاکہ اولیائے کرام نمبر کے آئندہ ایڈیشنوں میں اُن تجاویز کو ملحوظِ خاطر رکھا جا سکے۔
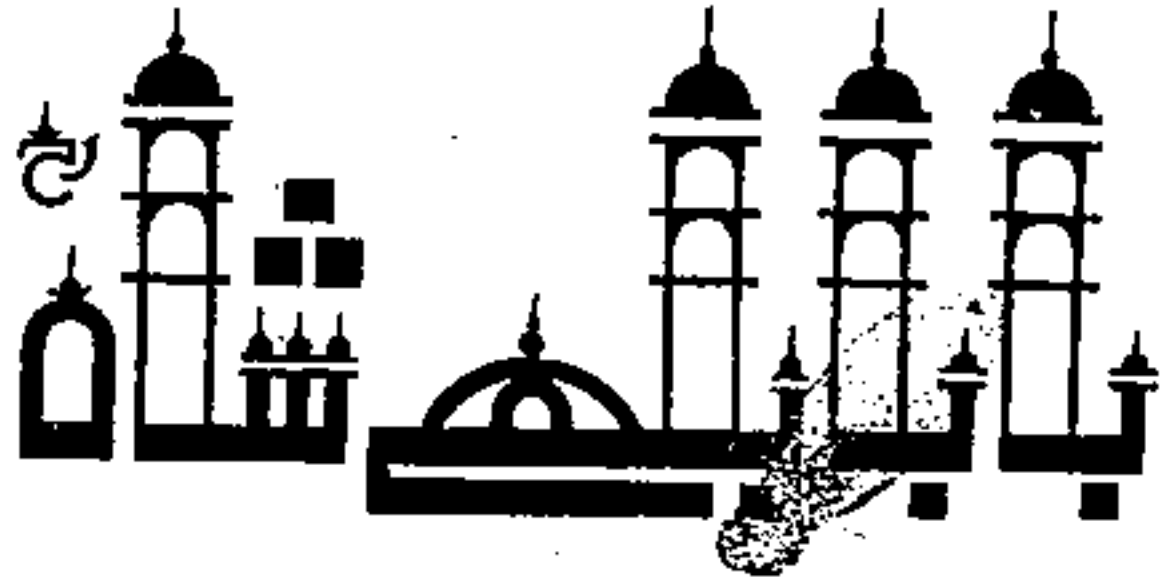
ایک طویل و عریض رقبے کے کھیت میں عجیب ہی سماں تھا۔ ہر طرف مویشی ہی مویشی اپنی من مانی کر رہے تھے کچھ کھا رہے تھے کچھ ویران کر رہے تھے۔ اتفاقاً کھیت کا مالک آ گیا۔ اپنے کھیت کو یوں اُجڑتے دیکھ کر غم و غصّے کی وجہ سے اس کی بُری حالت ہو گئی۔ انتہائی بدحواسی میں اس نے ارد گرد کے مویشیوں کے چرواہے کو تلاش کرنا شروع کیا۔

کیا دیکھتا ہے کہ ایک نوجوان درخت کے سائے میں سو رہا ہے اور ایک پھنیر سانپ اس کے چہرے پر سایہ کیے ہوتے ہے۔ مالک گھبرا گیا اور بھاگ کر نوجوان کے والد کے پاس پہنچا اور کہنے لگا کہ آپ کے صاحبزادے نے میرا کھیت اُجاڑ دیا ہے اور خود درخت کے نیچے مرا پڑا ہے۔ اور سانپ اس پر پھن لہرائے کھڑا ہے۔ نوجوان کا والد اور کچھ دوسرے لوگ اس جگہ پر آتے جہاں نوجوان سو رہا تھا۔ لوگوں کے پاؤں کی آہٹ سُن کر سانپ بھاگ گیا اور نوجوان بھی بیدار ہو گیا۔ والد نے بیٹے سے کہا "بیٹے ہم پردیسی ہیں اور لوگ تمہاری شکایت لے کر آتے ہیں۔" نوجوان نے پوچھا "کیسی شکایت۔"

اُس کے والد نے کہا "جیون خان کے کھیت کو تمہارے مویشیوں نے اُجاڑ دیا ہے" یہ سُن کر نوجوان نے مسکرا کر کہا "حضور دیکھتے کھیت اُجڑا کہاں ہے بلکہ وہ تو پہلے سے زیادہ لہلہا رہا ہے" لوگوں نے دیکھا تو واقعی کھیت کی بہت عمدہ حالت تھی۔ جیون خان نوجوان کی اس کرامت کو دیکھ کر اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے وہ سارے کا سارا کھیت آپ کے والد کی نذر کر دیا جس پر بعد ازاں اس نوجوان کے والد کا مزار اقدس بنا۔ اس جگہ پیداوار کی اوسط اب بھی باقی کھیتوں کی نسبت بہت زیادہ ہے۔

یہ نوجوان جو مویشی چرا رہے تھے یہ حضرت بلھے شاہؒ تھے۔ حضرت بلھے شاہؒ اچ گیلانیاں میں ۱۶۷۵ء ۱۰۶۱ھ میں پیدا ہوتے۔ اُن دنوں اچ گیلانیاں صوبہ سندھ کی عملداری میں شامل تھا۔ آج کل یہ تاریخی قصبہ بہاولپور کے علاقہ میں ہے۔ آپ کا اصل نام عبداللہ شاہ، عرف و تخلص بلھے شاہؒ ہے۔ آپ کے والد ماجد سید درویش محمد

صاحب تعلیم و تبلیغ اور تدریس کے سلسلہ میں اپنے وطن کو چھوڑ کر موضع ملکوال نزد کاہنہ نو ضلع لاہور میں آکر آباد ہو گئے۔ اُس وقت حضرت بلھے شاہ کی عمر چھ سال کے لگ بھگ تھی۔

آپؒ کے والد عربی اور فارسی کے عالم تھے اور موضع ملکوال کے امام مسجد بھی تھے۔ اس لیے آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے ہی حاصل کی۔

ایک دن آپ اپنے ہم عمروں کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ آپ کے والد آپ کو تلاش کرتے ہوئے ادھر آئے۔ بلھے شاہؒ کے ہاتھ میں تسبیح تھی اور آپ یہ الفاظ دھرا رہے تھے۔

لوکاں دیا جیپ مالیاں نے بابے دا جیپ مال
ساری عمراں مالا پھیری اک نہ کنھا وال
چلنا اج چھڑ پیندا لال

آپ کے والد صاحب یہ کلامِ معرفت سُن کر وجد میں آگئے۔ چنانچہ یہی واقعہ بعد میں اُن کے لیے حصولِ عرفان کا پیش خیمہ ثابت ہُوا۔

اس کے بعد آپ کے والد محترم ملکوال سے سکونت ترک کر کے ایک دوسرے گاؤں "پانڈو کے" میں رہائش پذیر ہو گئے اور اسی گاؤں میں آپؒ کے والد محترم کا مزارِ اقدس بھی ہے۔ پانڈو کے میں آپؒ کے والد محترم امام مسجد بھی تھے اور مدرس بھی تھے۔ اُن کے پاس کچھ مویشی بھی تھے جن کے چرانے کا کام حضرت بلھے شاہؒ کے سپرد تھا۔ اسی دوران وہ واقعہ پیش آیا جس کا ذکر شروع میں کیا گیا ہے اور اس واقعہ کے بعد آپ کی کرامت کا شہرہ پورے گاؤں اور گرد و نواح میں پھیل گیا۔

حضرت بلھے شاہؒ نے ابتدائی تعلیم کے بعد مزید تعلیم حافظ غلام مرتضیٰ سے حاصل کی جو قصور میں قیام پذیر تھے۔ قصور ان دنوں پٹھانوں کی راجدھانی اور اسلامی علوم کا مرکز تھا۔ جامع مسجد کے خطیب حافظ غلام مرتضیٰ صاحب کے درس کا ہر طرف چرچا تھا۔ حضرت بلھے شاہؒ وہاں سے مروجہ علوم حاصل کرنے کے بعد کسی کامل مرشد کی تلاش میں لگ گئے تاکہ باطنی علوم اور روحانی تعلیم حاصل کر سکیں۔

ایک دن اسی جستجو میں ایک درخت کے نیچے بیٹھے تھے کہ اونگھ آگئی۔ کیا دیکھتے ہیں کہ آپ کی پانچویں پشت کے جدِ امجد سید عبدالحکیمؒ کا تخت نیچے اُترا ہے۔ انہوں نے پوچھا "تم کون ہو" آپؒ نے جواب دیا "میں سید عبداللہ بن سید درویش محمد ہوں" انہوں نے کہا "بیٹا ہمیں پیاس لگی ہے۔" بلھے شاہؒ نے دُودھ کا پیالہ اُن کی خدمت میں پیش کیا۔ انہوں نے کچھ خود پیا اور کچھ بچا کر بلھے شاہؒ کو عنایت فرمایا اور کہا "لو بیٹا پی لو" اس دُودھ کا پینا تھا کہ آپ سرمست اور بے خود ہو گئے اور نورِ معرفت سے ان کا قلب منور ہو گیا۔ اس پر سید عبدالحکیم نے فرمایا "بیٹا ہمارے پاس یہ تمہاری امانت تھی جو ہم نے تمہیں عنایت کر دی ہے۔ آج سے دس روپیہ تمہارا وظیفہ مقرر ہے۔ اب مرشد کی تلاش کرو جو تمہیں علوم معرفت سے آگاہ کرے۔"

اس کے بعد آپ کی آنکھ کھل گئی۔ آپؒ گھر واپس آئے اور اپنے والد محترم کو یہ واقعہ سنایا۔ انہوں نے فرمایا "بیٹے تم سے بھول ہو گئی۔ اگر ایسے بزرگ سے ملاقات ہو گئی تھی تو ان سے کہنا تھا کہ آپ کو چھوڑ کر اور کون سا مرشد تلاش کروں" آپ نے والد صاحب سے عرض کی "اب فرمایئے وہ کہاں مل سکتے ہیں" آپؒ کے والد صاحب نے مراقبہ کے ذریعے معلوم کر کے بتایا کہ اس وقت وہ موضع سانڈہ میں مقیم ہیں۔ بلھے شاہؒ اسی وقت گھر سے روانہ ہوئے اور سانڈہ کی مسجد میں آکر لیٹ گئے۔ چنانچہ سید عبدالحکیم سے پھر ملاقات ہوئی تو انہوں نے بلھے شاہؒ

کو مولوی محمد عنایت قادری شطاری سے رجوع کرنے کو کہا۔ وہاں سے آپؒ گھر تشریف لاتے اور اپنے والد کو حقیقت سے آگاہ کیا اور بیعت کی اجازت طلب کی۔ انہوں نے اجازت دے دی اور ایک دستار مرشد کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے اور کچھ رقم دی اور ساتھ ہی یہ نصیحت بھی کی کہ کہیں تکبر میں نہ آجانا۔ بلکہ نہایت عجز و عقیدت کے ساتھ مرشد کی خدمت میں حاضری دینا۔ اور جو تعلیمات وہ دیں ان کو غور سے سُن کر اُن پر عمل کرنا۔ والد صاحب سے رخصت ہو کر بلھے شاہؒ لاہور کی طرف روانہ ہوتے۔ راستے میں انہیں خیال آیا کہ میں تو سید ہوں اور جدِ امجد کی طرف سے میرا روزینہ بھی مقرر ہے اس لیے شاہ عنایت کو مجھے بیعت میں لینے کے لیے کوئی عذر نہیں ہونا چاہیے۔

ان دنوں مولوی شاہ عنایت قادری بھاٹی دروازہ میں اونچی مسجد کے پیش امام تھے اور درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ جب آپ شاہ عنایتؒ کی خدمت میں پہنچے اور اپنا مدعا بیان کیا تو آپ نے فرمایا "پہلے ایک کام کر و پھر مرید کریں گے۔ اب دوپہر کا وقت ہے۔ وہ کام کر کے مغرب کی نماز ہمارے ساتھ آ کر پڑھنا کام یہ ہے کہ پانچ سو نقد روپیہ، پانچ سو کا گھوڑا، پانچ سو کی ایک پوشاک اور پانچ سو روپے کے طلائی کنگن لے آؤ پھر بیعت کریں گے۔"

آپ وہاں سے نکلے تو بہت پریشان تھے کہ ان شرائط کو کیسے پورا کروں اتنی تو میری اوقات بھی نہیں ہے اور گھر سے کچھ نقد لے کر بھی نہیں آیا ہوں جو دو ہزار روپیہ کی شرائط پوری کر سکوں۔ اسی ادھیڑ بن میں دریائے راوی کے کنارے آ کر بیٹھ گئے اور سوچنے لگے۔ یہاں تک کہ بہت ہی مایوس ہو گئے اور دل میں آیا کہ کیا ہی اچھا ہو کہ دریا میں ڈوب مروں تاکہ شرمندہ ہونے سے تو بچ جاؤں۔ اسی وقت کسی نے آپ کو آواز دی "لڑکے ذرا میری بات سنو۔"

آپؒ نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو ایک نقاب پوش سوار گھوڑے سے اُتر رہا تھا۔ اُس نے قریب آ کر آپ سے کہا "میں نہانا چاہتا ہوں ذرا میرا گھوڑا تھام رکھو اور میرے سامان کی حفاظت کرو۔" اس نقاب پوش نے پہلے آپ کو پانچ سو روپیہ کی تھیلی پکڑائی۔ پھر ہاتھوں سے طلائی کنگن اُتار کر دیتے اور پھر اپنی قیمتی پوشاک جو پانچ سو روپیہ کی تھی آپ کے حوالے کر کے دریا میں غوطہ زن ہو گیا۔ اور ایسا غوطہ لگایا کہ پھر نہ اُبھر سکا۔ آپ ظہر سے عصر تک وہاں بیٹھے رہے۔

بالآخر یہ سوچ کر وہاں سے اُٹھ آتے کہ وہ بیچارہ تو دریا میں ڈوب گیا ہے اور قدرت نے یہ چیزیں مجھے مہیا کر دی ہیں جو مُرشد نے مانگی تھیں۔ چنانچہ آپ یہ چیزیں لے کر شہر میں داخل ہوتے تو لوگوں نے مولوی شاہ عنایت کی پوشاک اور گھوڑے کو پہچان لیا اور مولوی صاحب کے پاس لے گئے۔ مولوی صاحب نے آپؒ سے سب چیزیں لے لیں اور فرمایا "برخوردار بس یہی شیخی تھی کہ ڈوب مرنے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ تم تو سید ہو اور بڑے خوبرو ہو اور تمہارا دس روپیہ روزینہ بھی مقرر ہے جبکہ میں ایک باغبانی کرنے والا آرائیں ہوں۔ میں تمہیں کیا فیض دے سکتا ہوں۔" آپ نے عرض کی "جناب میرا سب کچھ آپ کی نذر اور آپ پر نچھاور ہے۔"

بلھے شاہؒ کی یہ عقیدت مندی اور خلوص دیکھ کر شاہ عنایتؒ نے آپ کو بیعت کر لیا اور باطنی علوم سے بہرہ ور کیا۔

کچھ عرصہ کے بعد حضرت شاہ عنایت قادریؒ نے آپ کو ریاضت و عبادت کے لیے بھیجا۔ اس مقصد کے لیے آپ ضلع جھنگ میں دریائے چناب کے کنارے چلے گئے۔ کیونکہ شطاری سلسلہ کے تمام اولیائے کرام کا یہی اسلوب

رہا تھا کہ وہ جنگلوں میں سخت سے سخت ریاضتیں کرتے رہے۔ اسی وجہ سے شاہ عنایتؒ نے بھی آپ کو ریاضت کے لیے دُور افتادہ علاقے میں بھیجا۔ غرضیکہ بلھے شاہؒ بھی دریائے چناب کے کنارے ورد و ظائف پڑھتے رہے۔ وہاں ہی آپ کی ملاقات حافظ برخوردار سچیار سے ہوتی۔ وہ اہل علم بھی تھے اور اہل تقویٰ بھی اور جاگیردار بھی تھے۔ وہ بلھے شاہؒ کے بہت معتقد ہو گئے اور بعدازاں حافظ برخوردار سچیار کے ایک فرزند سلطان احمد آپؒ کے ساتھ ہی واپس آتے۔ انہی سلطان احمد کی اولاد ہی آج تک حضرت بلھے شاہؒ کے مزار کی سجادہ نشین ہے۔

اسی سفر ریاضت میں ایک اور شخص حافظ جمال جو کہ ٹھٹھہ لونا (جو آج کل ضلع فیصل آباد میں ہے) کا رہنے والا تھا، بھی آپ کا معتقد ہوا۔ اور آپؒ کے ہمراہ آیا۔ بعدازاں ان دونوں حضرات سلطان احمد اور حافظ جمال نے آپ کی خدمت میں رہ کر فیض حاصل کیا۔ یہاں تک کہ آپ نے سلطان احمد کے مُنہ میں اپنا لعاب دہن ڈال دیا جس سے وہ مستانہ ہو گیا اور اسی نام سے مشہور ہو گیا۔ وہ ہر وقت آپ کے سامنے بیٹھا رہتا اور آپ کا چہرہ مبارک دیکھا کرتا تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد آپ نے حافظ جمال کو توفیض یاب کر کے واپس بھیج دیا مگر سلطان مستانہ آخر دم تک آپ کی خدمت میں رہا اور اب تک اس کی اولاد آپ کے مزار اقدس کی سجادہ نشین چلی آ رہی ہے۔

دریائے چناب کے کنارے ریاضتیں کرنے کے بعد آپ واپس پانڈو کے میں آ کر مقیم ہو گئے۔ یہاں پر آپؒ سے کئی کرامات وابستہ ہیں۔ جن میں سے چند ایک قابل ذکر ہیں۔

ایک دفعہ پانڈو کے میں قحط پڑ گیا۔ آپ لوگوں سے مٹی کھدوانے اور مزدوری کے طور پر ہر ایک کو شام کو دو آنے دے دیتے۔ دو آنے اس زمانہ میں بہت بڑی رقم تھی۔ یہ رقم چونکہ آپ اپنی جائے نماز کے نیچے سے نکال کر دیتے تھے۔ اس لیے دو آدمیوں نے سوچا نہ جانے جائے نماز کے نیچے کون سا خزانہ موجود ہے۔ جہاں سے بلھے شاہؒ لوگوں کو رقم نکال کر دیتے ہیں۔ پس انہوں نے رات کو زمین کھود کھود کر گڑھا کر دیا۔ مگر رقم نہ ملنا تھی نہ ملی پھر اس گڑھے کو پُر کرنے میں تمام رات ہی بسر ہو گئی۔ اگلے دن جب مزدوری کی رقم تقسیم ہوتی تو ان دو آدمیوں کو آپ نے چار چار آنے دیئے۔ جب لوگوں نے وجہ پوچھی تو آپ نے فرمایا کہ "تم لوگوں نے تو صرف دن میں کام کیا ہے یہ تو تمام رات بھی کام کرتے رہے ہیں۔" یہ سُن کر وہ آدمی بہت شرمندہ ہوئے اور دوسرے لوگ آپؒ کے علم معرفت کے اور معتقد ہو گئے۔

اسی طرح ایک دفعہ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ آپ اتفاق سے اپنے گھر میں ہی تشریف فرما تھے۔ آپؒ کا مکان کچا تھا۔ اور چھت پر لکڑی کا پرنالہ لگا ہوا تھا۔ ایک راجپوت جو پانڈو کی اولاد میں سے تھا۔ اس نے وہ پرنالہ گرا دیا جس سے پانی مکان کے اندر جانے لگا۔ ایک شخص نے آپؒ کو بتایا کہ فلاں شخص نے آپ کے مکان کی چھت کا پرنالہ گرا دیا ہے تو آپؒ نے جلال میں آ کر فرمایا "تو کیا وہ بخیریت گھر پہنچ گیا ہے؟"

کہتے ہیں ابھی وہ گھر بھی نہ پہنچا تھا کہ اس کے پیٹ میں شدید درد اُٹھا اور وہ چند لمحوں میں مر گیا۔

حضرت بلھے شاہؒ نے یاد الٰہی اور مرشد کی خدمت کے لیے ہی اپنے کو وقف کر دیا۔ انہوں نے گھر والوں کے پُر زور اصرار کے باوجود شادی نہ کی۔ اور ان گھریلو ذمہ داریوں سے خود کو بچائے رکھا جو یاد الٰہی اور مرشد سے دُوری کا باعث بنتیں۔ آپؒ کی ہمشیرگان نے آپ کو شاہ عنایتؒ سے والہانہ عقیدت رکھنے سے بہت منع کیا۔ مگر آپ کی سرمستی اور مُرشد کے ساتھ والہانہ عقیدت میں کوئی فرق نہ آیا۔ آپ لکھتے ہیں۔

ع
بلھے نوں سمجھاون آیاں ‌‌‌ بھیناں تے بھرجائیاں
آل نبی، اولاد علی دی ‌‌‌ توں کیوں لیکاں لائیاں

"پانڈوکے" میں قیام کے دوران ہی آپ کے والدین کا انتقال ہوگیا۔ اور پھر آپ پانڈوکے سے دفتوہ میں رہائش پذیر ہوگئے۔ اس کے بعد آپ پھر عنایت شاہ قادری کی خدمت میں حاضر ہوتے تو انہوں نے آپ کو قصور میں قیام کرنے کے لیے کہا۔ بلھے شاہ نے قصور کی بجائے کسی اور جگہ جانے کی اجازت مانگی۔ مگر انہوں نے فرمایا "صاحبزادے تمہیں قصور کے سوا کسی اور جگہ نہیں بھیجا جائے گا۔" اور پھر بلھے شاہ نے مرشد کامل کے حکم کی تعمیل کا مصمم عزم کر لیا۔ لکھتے ہیں:۔

بُلھا کُر نام قصور ہے او تھے جانا پینا ضرور
نہ کوئی پن نہ دان ہے نہ کوئی لاگ دستور

بلھے شاہ قصور جانے میں اس لیے جھجک محسوس کرتے تھے کیونکہ وہاں پر آپ کے استاد حافظ غلام مرتضیٰ مقیم تھے۔ آپ ان کے مقابل نہیں بیٹھنا چاہتے تھے۔ اور دُوسری وجہ یہ تھی کہ بلھے شاہ اپنے مرشد سے مزید دُور نہیں جانا چاہتے تھے۔ لیکن حضرت عنایت شاہ قادری آپ کو قصور بھیجنا چاہتے تھے اس لیے کہ

۱۔ مرید صادق کی اطاعت شعاری کا امتحان لینا مقصود تھا۔
۲۔ انہیں بلھے شاہ سے قصور کی اصلاح کا کام لینا تھا۔
۳۔ وہ بلھے شاہ سے ایسے مقاماتِ سلوک طے کروانا چاہتے تھے جو صرف ہجر اور جدائی کی وجہ سے ہی طے ہو سکتے تھے۔

پس بلھے شاہ نے رختِ سفر باندھا اور قصور کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس وقت تک آپ کے والدین اور دو بہنیں وفات پا چکی تھیں۔ ایک ہمشیرہ زندہ تھیں وہ بھی آپ کے ہمراہ تھیں۔ اور جمال اور سلطان احمد بھی۔ قصور کے باہر آپ نے ایک تالاب کے کنارے ڈیرہ لگایا۔ آج کل اس کو سالانے والا تالاب کہتے ہیں جو قصور کے ریلوے سٹیشن کے قریب ہے۔ آپ نے شہر کے باہر رہائش اختیار کر لی اور اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول رہنے اور لوگوں سے بہت کم ہم کلام ہوتے تھے۔ پھر یہاں پر ہی آپ نے لنگر کا سلسلہ بھی جاری کر دیا اور لنگر کی تقسیم کا کام سلطان احمد کے سپرد کر دیا۔ آہستہ آہستہ آپ کا چرچا شہر میں بھی پہنچنے لگا اور اکثر لوگ آپ سے فیض حاصل کرنے کے لیے آنے لگے۔

بالآخر آپ کی آمد کی خبر قصور شہر کے نوابوں کے محلات تک پہنچی۔ انہی نوابوں میں سے ایک نواب کا نام رنجھے خاں تھا۔ ان کی ایک ہمشیرہ تھی۔ جو بیوہ اور عمر رسیدہ تھیں۔ جب ان تک آپ کی خبر پہنچی تو وہ آپ کی ملاقات کا شرف حاصل کرنے کے لیے آئیں اور آپ کو شہر میں قیام فرمانے کی درخواست کی اور رہائش کا بندوبست کرنے کا بھی اظہار کیا۔ مگر آپ نے فرمایا۔

"درویشوں کے لیے شہر سے باہر رہنا ہی ٹھیک ہے۔"

لیکن نواب خاتون کے پُرزور اصرار پر بالآخر آپ کو اقرار کرنا پڑا اور آپ شہر جانے کے لیے رضامند ہو گئے۔ ان خاتون نے اپنے بھائی سے کہہ کر آپ کے لیے جگہ کا انتظام کر دیا۔ نواب صاحب نے اپنے گھوڑوں کا طویلہ آپ کے رہنے کے لیے مخصوص کر دیا۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں پر آج کل مسجد ہے اور آپ کی چلہ گاہ بھی ہے۔

یہاں پر آپ نے اپنے مکان بنوا لیے۔ اس وقت بارہ کمرے، چھ چوبارے، ایک کنواں اور ایک بیٹھک تھی۔ آپ ایک علیحدہ حجرے میں رہتے تھے اور سلطان احمد مستانہ اپنے بال بچوں کے ساتھ ان کمروں میں رہتے تھے۔

نواب نے ڈیرے کے لیے شہر سے باہر جگہ دی جو ایک مربع تھی اور یہی وہ جگہ ہے جہاں پر آپ کا مزار شریف ہے۔ آپؒ کا معمول تھا کہ جب آپ عبادت سے فارغ ہوتے تو ڈیرے میں آکر بیٹھ جاتے تھے۔ اور لوگوں کو تبلیغ و ہدایت کرتے رہتے۔ عقیدت مند بھی ہر روز کثرت سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ آپ کو سماع کا بڑا شوق تھا۔ قوال دُور نزدیک سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور آپ کو سماع سے محظوظ کرتے رہتے۔ قصور کے لوگ طبعاً شر پسند تھے۔ جب آپ کی ذات میں اور کوئی عیب نہ دیکھا تو آپ کے سماع کے خلاف شہر میں پراپیگنڈہ کرنا شروع کر دیا اور شہر کے مشہور عالم دین مولوی غلام مرتضیٰ سے فتویٰ طلب کیا۔

مولوی غلام مرتضیٰ مسجد کے خطیب تھے اور آپ کے استاد بھی تھے۔ وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ میرا شاگرد علمیتی سرگرمیوں کو چھوڑ کر خانقاہی رنگ اختیار کرے۔ ویسے بھی سماع ایک متنازعہ فیہ مسئلہ ہے۔ علماء ظاہر تو تقریباً بالاتفاق اسے ممنوع قرار دیتے ہیں البتہ صوفیائے کرام کے بعض سلسلوں کے مسلک میں یہ سماع جائز ہے اور بعض میں ممنوع۔

بلھے شاہ شاہ عنایت قادری کے مرید تھے اور انہوں نے چاروں طریقوں سے فیض حاصل کیا تھا (شطاریہ، سہروردیہ، چشتیہ اور قادریہ) چونکہ شطاریہ سلسلے والے سماع کو جائز سمجھتے تھے۔ اس لیے شاہ عنایتؒ قادری بھی سماع کے بہت شوقین تھے اور یہی شوق بلھے شاہؒ میں بھی بدرجہ اتم موجود تھا۔ مولوی غلام مرتضیٰ سماع کو ناجائز سمجھتے تھے اور اپنے شاگرد سے سماع کی توقع بھی نہ رکھتے تھے لہٰذا انہوں نے فتویٰ دے دیا کہ سماع شرعاً ممنوع ہے اور سماع کرنے کرانے والوں کو روکنا جائز ہے۔

بس پھر کیا تھا ایک دن آپ قوالی سُن رہے تھے کہ قصور کے لوگوں کا ایک طوفان بدتمیزی اُمڈ آیا۔ انہوں نے بہت ہنگامہ کیا۔ جس میں بلھے شاہؒ کی دستار مبارک کا ایک پیچ بھی تیر سے کٹ گیا۔ اسی لمحہ آپ نے بے ساختہ فرمایا۔

کھرکاں چک جولاہے آتے ہن کی کراں نی میرتے مائے

اور کچھ عرصہ کے بعد ہی یہ بات سچ ثابت ہوئی کہ یہی قصور کے افغان اپنی جاگیریں کھو بیٹھے اور کھڈیاں لگا کر جولاہوں کا کام کرنے لگے۔ آج بھی قصور میں ان کی نسل کھڈیاں چلاتی ہے۔

قارئین کے ذہن میں یہ سوال اُبھر سکتا ہے کہ مولوی غلام مرتضیٰ جب آپ کے استاد تھے تو پھر انہوں نے آپ کے خلاف فتویٰ کیوں دیا تو اس کا جواب یوں ہو سکتا ہے کہ مولوی صاحب فقیہہ تھے اور فقیہوں کے نزدیک سماع ممنوع ہے اس لیے آپ نے فتویٰ تو درست دیا مگر وہ یہ ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ ان کے شاگرد کو کوئی جانی نقصان پہنچے۔ وہ صرف اس طرح سے محفل سماع کو روکنا چاہتے تھے۔ بعدازاں جب بلھے شاہؒ کی صداقت کا مولوی صاحب کو یقین ہو گیا تو وہ آپؒ کے پاس معذرت طلبی کے لیے آتے اور آپ سے آپ کا عارفانہ کلام اور کافیاں سنیں اور پھر استاد اور شاگرد کا ملاپ ہو گیا اور استاد صاحب اپنے شاگردؒ کے عقیدت مندوں میں شامل ہو گئے۔

اسی دوران حضرت شاہ عنایت قادریؒ بلھے شاہؒ سے ناراض ہو گئے اور ان سے ولایت سلب کر لی۔ ہوا یوں کہ عنایت شاہ قادریؒ کے داماد لاہور سے قصور بلھے شاہؒ سے ملنے کے لیے گئے۔ بلھے شاہ مولوی مرتضیٰ کی بیٹی کی شادی میں مصروف تھے۔ کھانے کی میزبانی کے فرائض ان کے سپرد تھے۔ وہ شاہ عنایت صاحب کے داماد اور بھتیجے مولوی ظہور محمد صاحب کے پاس بر وقت نہ پہنچ سکے جس پر وہ ناراض ہو کر واپس آگئے اور بلھے شاہؒ

Habib Bank Limited
تجارت، صنعت
اور زراعت
ہماری ترقی
کا زینہ ہیں!
اللہ تعالیٰ نے پاکستان کو بے شمار وسائل سے نوازا ہے۔
اب یہ ہم پر منحصر ہے کہ ہم ان وسائل سے زیادہ سے زیادہ
فائدہ اٹھا کر خود کفالت کی منزل سے ہمکنار ہو جائیں۔
زیادہ اگائیے
پیداوار بڑھائیے
برآمدات بڑھائیے
بہتر خدمت کی روایت
حبیب بینک لمیٹڈ

کی اس بے توجہی کا ذکر شاہ صاحب سے کیا تو شاہ صاحبؒ جلال میں آ گئے اور فوراً آپ سے تمام ولایت سلب کر لی۔ بلھے شاہؒ کو اس بات کا اتنا صدمہ ہوا کہ انہوں نے فوراً قصور کو چھوڑ دیا اور ہندوستان کے سفر پر روانہ ہو گئے اور پھر سفر کی بے پناہ صعوبتیں برداشت کرنے کے بعد بالآخر آپ گوالیار میں شیخ محمد غوث گوالیاری کے مزار اقدس پر پہنچے جو شاہ عنایت قادریؒ کے شطاری سلسلہ کے مرشد تھے۔ گویا آپ افسر بالا سے شاہ عنایت قادریؒ کے نام سفارشی چھٹی لینے گئے تھے۔ وہاں پر آپ نے مراقبہ میں شیخ محمد غوثؒ سے ملاقات کی اور اپنی آمد کا مقصد بیان کیا۔ شیخ صاحب نے آپ کو نہ صرف روحانی فیض سے مستفیض کیا بلکہ تان سین کی قبر کی بیری کے درخت سے اڑھائی پتے کھانے کا بھی حکم دیا تاکہ بلھے شاہؒ کو موسیقی میں مہارت حاصل ہو جائے۔ یہ تان سین وہی ہے جو ہندوستان کا مایہ ناز موسیقار تھا۔ اس کی قبر شیخ محمد غوث گوالیاری کے روضہ مبارک کے احاطہ میں ہی ہے۔ تان سین شیخ محمد غوثؒ کا معتقد اور پروردہ تھا۔ اور شیخ صاحب بھی اس کی فنی قابلیت کے معترف تھے۔

بلھے شاہؒ نے شیخ محمد غوثؒ کی ہدایت پر عمل کیا اور کچھ عرصہ گوالیار میں قیام کے بعد واپس قصور تشریف لائے اور پھر لاہور میں ایک طائفہ کے ساتھ مل کر شاہ عنایت قادریؒ کی محفل میں پہنچے۔ اس وقت آپ کی الہامی اور پُرسوز شاعری عروج پر تھی۔ کچھ مرشد کی جدائی کا بھی اثر تھا اور جب آپ نے عنایت شاہ صاحبؒ کی محفل سماع میں پاؤں میں گھنگرو باندھ کر ایسا پُرسوز کلام سُنایا کہ حاضرین و سامعین دم بخود رہ گئے۔ یہ آپ کا تاریخی کلام آج تک زبانِ زد عام ہے۔

تیرے عشق نچایا کر کے تھیا تھیا

ایس عشق دے کولوں سانوں ہٹک نہ مائے ۔۔۔ لاہور جاندے بیڑے کون موڑ ہٹائے

اک عشق دی جھگی وچ مور بولیندا ۔۔۔ سانوں قبلہ تے کعبہ پیارا یار دسیندا

سانوں گھائل کر کے پھیر خبر نہ لیا

تیرے عشق نچایا کر کے تھیا تھیا

جب آپ کافی گا چکے تو شاہ عنایتؒ نے فرمایا "تو بلھا ہے؟" تو آپؒ نے عرض کی نہیں میں بُھلا (بھولا) ہوا ہوں۔" مرشد نے اُٹھ کر آپ کو گلے لگایا اور یوں مرشد و مرید میں صلح ہو گئی اور آپ کی ولایت آپ کو واپس کر دی اور کہا "بے فکر رہو آئندہ تمہاری ولایت تم سے کوئی نہیں چھینے گا۔"

مرشد کو راضی کرنے کے بعد آپ واپس قصور آئے اور لوگوں کو ہدایت و تبلیغ کرنے میں مصروف ہو گئے۔ تب تک اہل قصور آپ کے تقویٰ اور فقر و درویشی کی وجہ سے آپ کا بہت احترام کرنے لگے تھے۔ اس دوران آپ شاہ عنایت صاحبؒ کے پاس بھی حاضری دیتے رہے۔ شاہ عنایت صاحبؒ کے ہاں کا ایک دلچسپ واقعہ بھی بلھے شاہؒ سے منسوب و مشہور ہے۔ شاہ عنایت صاحبؒ نے کچھ نیاز کی شیرینی بلھے شاہؒ کو تقسیم کرنے کے لیے دی۔ بلھے شاہؒ نے عرض کی "یا پیر و مرشد میں کس طریقہ پر بانٹوں۔ اللہ کی بانٹ پر یا محمدؐ کی بانٹ پر۔"

شاہ صاحب نے فرمایا "اللہ کی بانٹ پر تقسیم کر دو۔" آپ نے شیرینی تقسیم کی کسی کو بہت کم کسی کو بہت زیادہ کسی کو کچھ بھی نہ دیا اور یوں شیرینی ختم کر دی۔ شاہ عنایتؒ نہایت متعجب ہوئے اور بلھے شاہؒ سے پوچھا "یہ کیا کیا ہے" تو بلھے شاہ نے بے ساختہ جواب دیا "خدا کی تقسیم تو ایسی ہی ہے کسی کو کم کسی کو زیادہ کسی کو کچھ بھی نہیں۔ آپ نے خود ہی فرمایا تھا خدا کی بانٹ بانٹو۔" شاہ عنایتؒ اور حاضرین آپؒ کے کلمات سے بہت محظوظ ہوئے۔

آپؒ نے اپنی عمر کا باقی حصہ قصور میں ہی گزارا۔ ۱۱۴۷ھ میں حضرت شاہ عنایت قادریؒ کا انتقال ہو گیا جس کا بلھے شاہؒ کو بہت ہی دکھ ہوا۔ آپ شاہ صاحبؒ کی وفات کے بعد ۲۴ سال تک زندہ رہے مگر مرشد کی یاد کو ہر دم سینے سے لگاتے رکھا۔ بلھے شاہؒ کو اپنے مرشد کے ساتھ ایسا ہی عشق تھا جیسا مولانا روم کو شمس تبریز کے ساتھ تھا۔ مولانا روم نے حضرت شمس تبریز کی فرقت میں ایک ضخیم دیوان لکھا تھا اور تمام دیوان میں جگہ جگہ شمس تبریزی کا نام تسلی خاطر کے لیے لکھتے رہے۔ حتیٰ کہ غزلیات کے مقطع میں اپنا تخلص یا نام بھی نہ لکھا بلکہ شمس تبریز کا نام ہی لکھتے رہے۔ اسی طرح بلھے شاہؒ بھی اپنی کافیوں میں جا بجا شاہ عنایتؒ قادری کا نام لکھ لکھ کر آتش شوق کو سرد کرتے رہے۔

حضرت شاہ عنایت قادریؒ کا مزار لاہور میں ۱۰ کوئنز روڈ پر واقع ہے۔ آپ کا عرس بھی ہر سال بلھے شاہؒ نہایت عقیدت و احترام سے مناتے رہے اور پھر آج تک بھی اسی شان و شوکت سے منایا جاتا ہے۔

حضرت بلھے شاہؒ پنجاب کے سب سے بڑے صوفی شاعر تھے۔ شہرت اور ہر دلعزیزی میں کوئی اور پنجابی صوفی شاعر ان کی برابری کا دعویدار نہیں ہے۔ ان کی کافیاں بے نظیر طور پر ہر دلعزیز ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ بلھے شاہؒ دنیا کے عظیم ترین صوفیاء میں سے ہیں اور تخیل میں تو وہ جلال الدین رومی اور شمس تبریزی کے برابر ہیں۔

ایک شاعر کی حیثیت سے بلھے شاہؒ پنجاب کے دوسرے صوفی شعراء سے مختلف ہیں۔ وہ پنجابی کردار کی اس مضبوط، زندہ اور پاکیزہ نوعیت کے نمائندہ ہیں جس میں جذباتیت کم اور حقیقت پسندی زیادہ ہے۔

بلھے شاہؒ کا اکثر کلام کافیوں کی صورت میں ہے۔ کافی کی ابتدا و ایجاد اصل میں ہندوستان میں امیر خسروؒ نے کی تھی۔ اور پھر "کافی" کے نام سے شاعری کی ایک صنف پیدا ہوگئی اور پنجابی، ملتانی، سرائیکی اور سندھی زبانوں میں شعراء نے کافیاں لکھیں۔ الغرض کافی ایک راگ ہے جو سننے سے تعلق رکھتا ہے اور اگر کافی کو راگ میں گایا جاتے تو اس کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے اور حضرت بلھے شاہؒ کی کافیاں بھی "کافی راگ" میں گائی جا سکتی ہیں۔

بلھے شاہؒ کی پیدائش اچ گیلانیاں کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے کلام میں بہاولپوری اور ملتانی بولی کا رنگ جھلکتا ہے۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں۔

اسیں اُچی ساڈی ذات اُچی اسیں وچ اُچ دے وسدے ہاں
عقل ہٹی نے رمز پچھانی اسیں مڑ مڑ نیناں دسنے ہاں

بلھے شاہؒ کی شاعری الہامی شاعری تھی۔ آپ فنی پابندیوں سے آزاد ہو کر بھی شعر لکھ جاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کا کلام آج کل بھی ہر استعداد کے لوگ سن کر محظوظ ہوتے ہیں۔ آپ نے سب سے زیادہ تلقین اس بات کی کی ہے کہ سب سے اچھا انسان وہ ہے جو دوسروں کی مدد کرے۔ ایسے خشک عابد کی عبادت کسی کام کی نہیں ہے جو کسی عسرت و مصیبت میں دوسروں کی مدد نہیں کرتا مثلاً آپ فرماتے ہیں:۔

ٹھاکر ناکوں ٹھیکر چنگا جس وچ پانی پیوے کتا
بلھے ناکوں ککڑ چنگا جیہڑا لوگ جگاوے سُتا

حضرت بلھے شاہؒ کے کلام میں شیرینی اور حلاوت بدرجہ اتم موجود ہے اسی لیے اہل بصیرت آپؒ کو طوطئ پنجاب کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ کسی بھی شاعر کے کلام کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس زمانہ کے حالات کا جائزہ لیا جاتے۔ کیونکہ ہر شخص اپنے ارد گرد کے ماحول سے ضرور متاثر ہوتا ہے۔ چونکہ شاعر عام لوگوں سے زیادہ حساس ہوتا ہے۔ اس لیے وہ اپنے زمانہ کے حالات کا زیادہ اثر لیتا ہے اور یہی تاثرات اس کے

کلام میں جگہ جگہ جلوہ گر ہوتے ہیں۔
بلھے شاہؒ کا زمانہ بھی انتشار کا زمانہ تھا۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغلیہ سلطنت کا ستارہ گردش میں آگیا تھا۔ ملک میں بغاوتوں اور طائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ اس نفسا نفسی کے عالم میں اہل پنجاب کی زندگی دوزخ کا نمونہ بنی ہوئی تھی۔ آپؒ نے اس پُر آشوب زمانہ میں لوگوں کو ہمہ وقت پُرامن اور باتفاق رہنے کا سبق دیا اور بالخصوص مسلمانوں کو۔

اُٹھ جاگ گھراڑے مار نہیں ایہ سون تیرے درکار نہیں

کے ترانے سُنا سُنا کر خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کی کوشش کی اور آنے والے انقلاب سے انہیں قبل از وقت آگاہ کیا اور ترقی کے لیے یہ نسخہ بتایا کہ جب تک قرآنِ کریم اور اسوۂ حسنہ رسولؐ پر عمل پیرا نہیں ہوں گے اسی طرح تباہ ہوتے رہیں گے۔
بلھے شاہؒ کا کلام معرفت کا کلام ہے۔ بعض اشعار پڑھ کر تو یوں لگتا ہے گویا قرآن پاک کی آیت کا ترجمہ کیا گیا ہو۔

بلھا وارے جائیے انہاں توں جہڑے گلیں دین پرچا
سوئی سلائی دان کرن آہرن لیں چھپا

آپؒ طنزاً فرماتے ہیں کہ میں اُن بزرگوں پہ قربان جاؤں جو زبانی جمع خرچ سے لوگوں کو خوش کر دیتے ہیں مگر عملاً کچھ نہیں کرتے۔ اگر خیرات بھی کرنا ہو تو قیمتی چیزیں نہیں دیتے بلکہ معمولی اور نکمّی چیزیں دے دیتے ہیں اور یہ ایسے لوگ ہیں جو لہو لگا کر شہیدوں میں شریک ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔
"تم ہرگز اس وقت تک نیکی حاصل نہیں کر سکتے جب تک تم اپنی عمدہ اور پسندیدہ چیزیں خدا کی راہ میں خرچ نہ کرو اور جو کچھ بھی تم خرچ کرتے ہو اللہ اسے خوب جانتا ہے۔" (پارہ ۴ رکوع ۱)
اور مزید فرماتے ہیں۔

بلھا غین غرور نت ساڑ سٹ ہو ماکھوتے پا۔
تن من دی سُرت گرا دے گھر آپ ملے گا آ۔

اس شعر میں بھی یہی معرفت ہے کہ انسان کو دل سے تکبر اور بڑائی کو نکال کر جلا دینا چاہیئے اور حرص اور طمع کو بھی کنوئیں میں پھینک دیا جائے تو پھر محبوب حقیقی تجھے خود ہی آکر مِل لے گا۔ کیونکہ انسان اور خدا کے درمیان سب سے بڑے حجاب یہی ہیں تکبّر اور حرص، وطمع۔ اور ان کے بارے میں قرآن پاک میں یوں آیا ہے۔
"یقیناً اللہ تعالیٰ متکبّر اور غرور کرنے والے کو ہرگز پسند نہیں کرتا" (پارہ ۲۱ رکوع ۱۱)
ایک اور جگہ ارشاد ہے:۔
"ہر مغرور اور سرکش خسارے میں رہتا ہے۔" (پارہ ۱۳ رکوع ۱۵)
بلھے شاہ کا کلام قرآن پاک کی تفسیر ہے کے ضمن میں ایک اور شعر قابل ذکر ہے۔

کنک کوڈی کا منی تینوں کی تلوار
آیا سیں جس کام کو بھول گئی وہ یار

یعنی تین چیزیں دُنیا میں ایسی ہیں جس کی محبّت میں انسان دُنیا کو بھول جاتا ہے۔ وہ یہ ہیں:۔ زن، زر اور زمین۔ اور انہی تین چیزوں کے بارے میں کلام پاک میں ارشاد ہے:۔

"یعنی لوگوں کو پسندیدہ اور مرغوب چیزوں کی محبّت بھلی لگتی ہے۔ یعنی عورتوں، بیٹوں، سونے چاندی کے ڈھیروں، نشان دار گھوڑوں، مویشی اور زراعت کی محبّت بھلی لگتی ہے۔ مگر یہ تمام چیزیں تو دنیاوی زندگی کے لیے عارضی سامان ہے۔ البتہ داعمی اور حقیقی مرغوب چیزیں تو اللہ کے ہاں ہی ہیں۔"
(پارہ ۳ رکوع ۱۰)

حضرت بلھے شاہؒ کو معرفت میں وہ کمال حاصل تھا کہ انہیں اپنی خبر تک نہ ہوتی۔ وہ خدا تعالیٰ کی محبّت میں اس قدر مست اور بے خود ہو جاتے کہ اپنے سے بھی دُور ہو جاتے۔ بلھے شاہؒ فرماتے ہیں کہ حکماء کے نزدیک انسان کے عناصر اربعہ آگ، پانی، مٹی اور ہوا ہیں۔ مگر میرے اربعہ عناصر یہ نہیں ہیں بلکہ میرے اربعہ عناصر میں تمام کائنات کو بنا کر اس میں خود اللہ ہی کا جلوہ نظر آتا ہے۔ بچّے میں وہ جلوہ گر ہے، ماں باپ میں وہ جلوہ گر ہے، زندگی موت میں وہ جلوہ گر ہے، پھُول اور خوشبو میں وہ موجود ہے۔ غرضیکہ کائنات کے ہر ذرّے میں خُدا کا نُور چمک رہا ہے۔ قرآن حکیم نے بھی یہی حقیقت آشعارہ کی ہے۔ فرمایا "یعنی خُدا کی قدرت و وجود کے دلائل تمہارے اندر موجود ہیں۔ کیا تم نہیں دیکھتے۔" (پارہ ۲۶۔ رکوع ۱۸)

حضرت بلھے شاہ کے کلام کو محفوظ کرنے کے لیے لوگوں نے بھی بہت کام کیا ہے۔ ان کے کلام اور کافیوں کو مختلف کتابوں میں مختلف ناموں سے محفوظ کیا گیا ہے۔ مولوی انور علی نے آپ کی کافیوں کو قانون عشق کے نام سے رہتکی زبان میں جمع کیا تو مسٹر ضیاالدین احمد برنی تذکرہ بلھے شاہ لکھا۔ اور محمد نوازش علی نے کلیات حضرت بلھے شاہ لکھی۔ فرمائش رائے گلاب نے کافیاں بلھے شاہ جمع کر کے لکھی ہیں۔

حضرت بلھے شاہؒ یونہی تمام عمر علم و معرفت کی دولت لوگوں میں بانٹتے رہے۔

اور بالآخر ۱۷۸۵ء، ۱۱۷۱ھ میں قصور میں ہی وہ اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ آپ کی عمر تقریباً ایک سو دس سال تھی۔ اس پر تمام تذکرہ نویس متفق ہیں۔ بلھے شاہؒ نہایت خوبرو اور خوش شکل تھے۔ ڈاڑھی گھنی اور شرع شریف کے حکم کے مطابق تھی۔ سر پہ دونوں طرف پٹے رکھے ہوتے تھے۔ جو کانوں سے ذرا نیچے آ گئے تھے۔ کھُلا کُرتہ پہنتے تھے اور ہمیشہ تہہ بند باندھتے تھے۔ آپؒ کا حُسن ملاحت و صباحت کا ایک مرکب تھا۔ آنکھیں گول اور موٹی تھیں۔ نقش تیکھے اور چہرے پر جلال اور رعب تھا اور متانت ٹپکتی تھی۔ یہ بات بھی متفقہ طور پر ثابت ہے کہ آپ نے شادی بھی نہیں کی اور مجرد زندگی ہی گزاری۔

آپ کا عرس ہر سال شمسی ماہ بھادوں میں جو چاند نظر آتے اس کی گیارہ اور بارہ تاریخ کو قصور میں منعقد ہوتا ہے۔ جہاں پر مُلک کے گوشے گوشے سے عقیدت مند اپنی عقیدت کے پھول چڑھانے جوق در جوق آتے ہیں۔ قوالیاں ہوتی ہیں اور مُلک بھر کے قوال اپنے اپنے جوہر دکھاتے ہیں۔ ایک اور خاص بات قابلِ ذکر ہے کہ روزانہ کوئی نہ کوئی طبل نواز یا سارنگی نواز آپ کے مزار پر بیٹھ کر آپ کی روح کو آپ کا کلام ہی سناتا رہتا ہے۔ سبحان اللہ وہ اللہ کا سچّا عاشق وفات کے بعد بھی اپنے ذوق کو پورا کر رہا ہے۔

اس ضمن میں آپ کے مزار پر ہونے والا ایک واقعہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ آپؒ کے روضہ مبارک پر ایک شخص ہر روز اپنی کسی خواہش کی تکمیل کی دُعا کرتا تھا۔ نہ جانے کتنا عرصہ وہاں گریہ زاری کرتے ہوتے گزر گیا مگر مُراد بر نہ آئی۔ لیکن اس نے اپنا معمول نہ چھوڑا۔ مزار اقدس پر آ کر حضرت بلھے شاہؒ کے وسیلہ سے دُعا مانگتا رہا۔ ایک دن وہ انتہائی رقّت سے دُعا مانگنے کے لیے سربسجود تھا کہ گھنگروؤں کی آواز نے اس کا تسلسل توڑ دیا۔ گردن اُٹھا کر دیکھا تو ایک گانے ناچنے والی عورت اپنی تمام تر رنگینیوں کے ساتھ دربار

میں داخل ہوتی اور آپکے مزار پر آپ کی ہی کافی گاکر اور دُعا مانگ کر رخصت ہوگئی۔ چند دن بھی نہ گزر پاتے تھے کہ وہ پھر ایک دن آوارد ہوتی۔ اور اپنے ہمراہ لنگر کے لیے دیگیں بھی پکوا کر لاتی اور نیاز بھی تقسیم کی۔ لوگوں کے استفسار پر کہنے لگی کہ اس کی مراد پوری ہوگئی ہے۔ وہ شخص ہنوز اپنی دُعا کی تکمیل کے انتظار میں دربار میں موجود تھا۔ عورت کی بات سُن کر دل برداشتہ ہو کر گھر آکر لیٹ گیا کہ ایک مغنیہ کی تو اس چند دن میں پوری ہوگئی اور میں اتنے عرصہ سے گریہ وزاری میں مصروف ہوں مگر میری شنوائی نہیں ہوتی۔ اسی حالت میں وہ شخص اُونگھ گیا تو حضرت بلھے شاہؒ خواب میں اس کے پاس آتے اور تھپکی دے کر کہا کہ مغنیہ کا انداز پسندیدہ نہیں تھا اس لیے اس کی مراد اللہ نے جلد پوری کر دی تاکہ بار بار اپنا انداز دہرانے اسے نہ آنا پڑے اور تمہاری گریہ زاری اور عجز و انکسار خدا تعالیٰ کو بہت پسند ہے۔ اسی لیے وہ یہ عمل بار بار کروا تا ہے۔ دل برداشتہ نہ ہو اور اُٹھ کر نماز پڑھ کر دُعا مانگو انشاءاللہ تعالیٰ تمہارا کام ہو جائے گا۔"

دفعتاً اس شخص کی آنکھ کھلی تو دل کی وہ کیفیت نہ تھی جو سونے سے پہلے تھی۔ دل مطمئن تھا۔ اس نے پھر بعد از نماز اس طریقہ پر دُعا مانگی جو خدا تعالیٰ کا پسندیدہ ہے اور پھر خدا نے اس کی دُعا قبول کر لی تو حاصل کلام یہ ہوا کہ گریہ زاری اور عجز و انکسار خدا تعالیٰ کو بے حد پسند ہے اور اسی چیز کا اظہار بلھے شاہؒ کے عارفانہ کلام سے بھی بارہا ہوتا ہے۔ خدا تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے اور لوگوں کو دینِ حق پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

حضرت ابوبکر واسطیؒ جو بڑے عالم تھے سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سال بھر تک خاموشی سے انکی مجلس کا رنگ ڈھنگ دیکھتے رہے۔ سال کے بعد دل برداشتہ ہو کر حضرت جنید سے رخصت ہونے کی اجازت چاہی۔ حضرت نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور فرمایا: "میرے بھائی تم سال بھر تک یہاں رہے۔ نہ اپنی کہی نہ ہماری سُنی اور اب یکایک چلنے کے لیے تیار ہو گئے۔ آخر بات کیا ہے؟"

حضرت ابوبکر واسطیؒ نے عرض کی کہ سچ پوچھیں تو میں بیعت کے ارادے سے حاضر ہوا تھا، سال بھر رہ کر دیکھتا رہا کہ آپ سے کوئی کشف یا کرامت ظاہر نہیں ہوئی۔ وہی علماء کا سا طور طریق ہے۔ نماز روزہ، تہجد، اشراق، چاشت، درس و تدریس، جب آپ میں اور دوسرے علماء کے طریقوں میں کوئی فرق نہیں دیکھا تو رخصت کی اجازت چاہی

حضرت جنیدؒ نے فرمایا: "اس مدت میں تُو نے کوئی کام خلاف شریعت اور خلاف سنت مجھ سے ہوتے دیکھا؟"

حضرت ابوبکرؒ نے عرض کی کہ خلاف شریعت تو مطلق کوئی بات نہیں دیکھی۔

حضرت جنیدؒ نے اُن کا ہاتھ جھٹک کر فرمایا کہ "یا جنید کی یہی کرامت سمجھ لے جو اُسے اللہ نے اپنے خاص لطف و عنایت سے عطا فرمائی ہے" حضرت ابوبکرؒ بے اختیار آپ کے قدموں پر گر پڑے۔ آپ کی بیعت کی اور خاصانِ خدا میں شمار ہوئے۔

مدینہ کی ایک خاتون کا جب انتقال ہوا تو ایک پیشہ ور غسالہ کو بلوایا گیا تاکہ وہ میت کو غسل دے سکے۔ جب یہ غسالہ مرنے والی کو نہلا رہی تھی تو وہ قریب کھڑی عورتوں سے کہنے لگی کہ مرحومہ ایک بدکار اور گناہگار عورت تھی اور اُس نے اپنی زندگی میں بہت زیادہ پاپ کیے تھے۔ ابھی غسالہ نے اپنے الفاظ مکمل بھی نہ کیے تھے کہ غسالہ کا ہاتھ میت کے جسم سے چپک کر رہ گیا۔ چند لمحوں تک تو وہ اپنے طور پر ہاتھ چھڑانے کی کوشش میں مصروف رہی مگر جب سخت جدّوجہد کے بعد بھی اُس کا ہاتھ میت سے جدا نہ ہوا تو اُس نے چیخ وپکار شروع کر دی۔ وہاں پر جو لوگ اور سوگوار وغیرہ موجود تھے وہ یہ دہشت ناک منظر دیکھ کر کانپ اُٹھے۔ انھوں نے آج تک ایسا روح فرسا منظر نہ دیکھا تھا۔ اِس غسالہ کی حالت دیدنی تھی۔ اُس کے چہرے پر موت کی زردی چھا چکی تھی اور لگتا تھا کہ مرنے والی غسالہ کو بھی اپنے ساتھ ہی لے کر جائے گی۔

بالآخر گھر پر موجود چند بزرگوں نے یہ فیصلہ کیا کہ فوری طور پر کسی عالمِ دین سے رجوع کیا جانا چاہیے۔ چند علمائے دین سے فوری طور پر رُجوع بھی کیا گیا مگر وہ اس انوکھے اور جان لیوا مسئلے کا کوئی حل پیش نہ کر سکے۔ اب صورتِ حال یہ تھی کہ ایک طرف میت کو دفنانے میں تاخیر ہو رہی تھی اور دوسری طرف غسالہ زبردست اذیت میں مبتلا تھی۔ کچھ لوگوں نے یہ تجویز پیش کی کہ غسالہ کا ہاتھ کاٹ کر میت سے الگ کر دینا چاہیئے۔ یہ تجویز تو غسالہ پر بجلی بن کر گری اور وہ مزید چیخ وپکار کرنے لگی۔ جب کسی طور بھی صورتحال پر قابو نہ پایا جا سکا تو سوگواروں میں موجود اللہ کے ایک بندے نے کسی خاص بزرگ کا نام لے کر کہا کہ اُن سے رجوع کیا جانا چاہیے اُس کا کہنا تھا کہ یہ بزرگ فقہ کے مسائل چٹکی بجاتے ہی حل کر دیتے ہیں۔

چونکہ اس انوکھے اور اذیت ناک مسئلے کو کسی بھی طور پر نپٹانا مقصود تھا اس لیے فوری طور پر اس بزرگ سے رجوع کیا گیا۔ وہ کافی دیر تک خاموشی سے اس مسئلے پر غور و فکر کرتے رہے اور پھر کہنے لگے" غسالہ نے مرنے

والی عورت پر بہتان لگا کر یقیناً اُس کی روح کو اذیت پہنچائی ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے اُسے یہ سزا دی ہے یہ وہ عذاب ہے جسے قدرت نے اس واقعہ کے حوالے سے ظاہر کر دیا ہے۔ جب غسالہ تک ان بزرگ کے خیالات پہنچائے گئے تو اُس نے روتے روتے اعتراف کر لیا کہ اُس نے مرحومہ پر بدکاری کا جھوٹا الزام لگایا تھا۔
غسالہ کے اعترافِ جُرم پر دوبارہ ان بزرگ سے رابطہ قائم کیا گیا تو بزرگ کہنے لگے۔ بلاشبہ مرنے والی ایک پاکباز خاتون تھی۔ اُس نے زندگی میں کبھی کوئی گناہ یا بدکاری نہیں کی تھی۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے دنیا میں مرحومہ کی پاکبازی کو داغدار ہونے سے بچانے کیلئے اس غسالہ کو سزا دی ہے تاکہ دوسرے اسے دیکھ کر عبرت حاصل کریں۔ بزرگ نے یہ بھی فرمایا کہ بہتان طرازی کے جرم میں اگر غسالہ کے جسم پر سو دُرّے لگا دیئے جائیں تو اس طرح غسالہ کا ہاتھ میّت سے الگ ہو جائے گا۔
چنانچہ بزرگ کے حُکم کی تعمیل میں جب غسالہ کو سو دُرّے لگا دیئے گئے تو غسالہ کا ہاتھ خود بخود میّت سے الگ ہو گیا۔
یہ عظیم بزرگ جن کے فتوے سے اس الجھے مسئلے کو حل کیا گیا وہ حضرت امام مالک بن انسؒ تھے جن کی زندگی کے ایمان افروز واقعات آج بھی مخلوقِ خدا کے لیے مشعلِ راہ ہیں اور جن کے مُنہ سے جو بھی بات نکلتی تھی وہ پوری ہو کر رہتی تھی۔
امام مالکؒ مردِ حق پرست تھے جنہوں نے کسی بھی جابر سلطان کے سامنے کلمہ حق کہنے سے گریز نہیں کیا تھا۔ آپ کا زمانہ کڑی آزمائشوں کا تھا مگر آپ نے ایک مردِ مجاہد کی طرح ہر قسم کی دشواریوں اور مشکلات کا سامنا کیا۔ انھوں نے اپنی زندگی میں کبھی کسی جاہل یا کم عقل انسان کی صحبت اختیار نہ کی بالخصوص حصولِ علم کی راہ میں آپ نے جو اذیتیں برداشت کیں وہ شاید ہی کسی اور علم کے طالب کو اُن کا سامنا کرنا پڑا ہو مگر جب امام مالک خود درس کے منصب تک پہنچے تو انھوں نے طالبانِ علم کے لیے دروازے کھلے چھوڑ دیئے۔
روایت ہے کہ امام شافعیؒ کے لیے اپنے پست مالی حالات کے باعث علم حاصل کرنا دشوار ہو رہا تھا۔ اُن کی یہ انتہائی خواہش تھی کہ وہ حدیث پر عبور حاصل کرنے کے لیے امام مالک سے رجوع کریں مگر وہ اپنے اندر ایسا کرنے کی ہمّت نہیں پا رہے تھے۔ چونکہ دل کے ہاتھوں مجبور تھے اس لیے انھوں نے والیٔ مکّہ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی اُلجھن بیان کر دی۔ والیٔ مکّہ امام شافعی کے حصولِ علم کے جنون سے بخوبی واقف تھے، چنانچہ اُنھوں نے امام مالک کے نام ایک سفارشی خط لکھ دیا اور امام شافعی کو یقین دِلا دیا کہ امام مالک یہ خط دیکھتے ہی اُنھیں تعلیم دینے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ والیٔ مکّہ نے اس سلسلے میں والیٔ مدینہ کو بھی ایک الگ سفارشی خط لکھ دیا۔
اِدھر امام شافعی جب یہ سفارشی خط لے کر والیٔ مدینہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو وہ یہ سفارشی خط پڑھتے ہی پریشان ہو گئے۔ پھر وہ انتہائی افسردہ لہجے میں امام شافعیؒ سے کہنے لگے۔
"نوجوان! میرے لیے یہ کام تو آسان ہے کہ میں گھٹنے ٹیکے ہوئے مدینے سے مکّہ چلا جاؤں مگر میرے بس میں یہ نہیں کہ میں تمہیں امام مالک کے مکان تک پہنچاؤں۔"
اب تو امام شافعی بہت حیران ہوئے اور والیٔ مدینہ سے کہنے لگے "جناب! امام مالک کا مکان تو آپ کی اقامت گاہ سے چند قدم کے فاصلے پر ہے۔"
والیٔ مدینہ کہنے لگے "شافعی یہ معرفت کی باتیں ہیں اور تمہاری سوچ کے دائرے سے باہر ہیں۔" یہ کہتے ہوئے

والیٔ مدینہ خاصے افسردہ ہو گئے اور پھر بولے: "مَیں اس میں ذلت محسوس نہیں کرتا کہ مَیں اُن کے دروازے پر کھڑا رہوں۔ اگر وہ دن بھر انتظار کرنے کے بعد بھی مجھے شرفِ باریابی بخش دیں تو یہ میرے لیے بہت بڑا اعزاز ہوگا۔ مگر افسوس کہ ایسا بھی ممکن نہیں۔"

مگر جب امام شافعی زیادہ بضد ہوئے تو والیٔ مدینہ نمازِ عصر کے وقت اپنے ایک دوست کے ہمراہ امام مالک کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہاں پہنچ کر جب انھوں نے مکان پر دستک دی تو ایک سیاہ فام باندی نے دروازے پر آکر آمد کا سبب دریافت کیا۔ والیٔ مدینہ نے کہا "اپنے آقا سے جاکر کہو کہ مَیں شرفِ باریابی چاہتا ہوں۔"

باندی نے کچھ دیر بعد واپس دروازے پر آکر کہا کہ میرے مالک نے آپ کو سلام بھجوایا ہے اور انھوں نے فرمایا ہے کہ اگر آپ کو کوئی مسئلہ درپیش ہے تو اُسے کاغذ پر لکھ کر اندر بھجوا دیں۔ اس کا جواب آپ تک پہنچ جائے گا۔ اور اگر کوئی حدیث کا مسئلہ ہے تو مجلس کا دن معلوم کرکے مقررہ روز تشریف لے آئیں۔

امام مالک کا یہ جواب سُن کر والیٔ مدینہ پر گھبراہٹ سی طاری ہو گئی۔ تاہم اُس نے حوصلے سے کام لے کر باندی سے کہا: "اپنے آقا سے کہو کہ میرے پاس والیٔ مکّہ کا خط ہے اور مَیں آپ کے لیے ضروری پیغام لے کر آیا ہوں۔"

وہ باندی دوبارہ مکان کے اندر چلی گئی اور پھر جب واپس آئی تو اُس کے ہاتھ میں ایک کُرسی تھی۔ والیٔ مدینہ ڈرتے ڈرتے کرسی پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد امام مالک تشریف لائے۔ اس موقع پر امام شافعی نے حضرت امام مالک کو جو دیکھا تو بس دیکھتے ہی رہ گئے۔ قد آور شخصیت کے مالک ایک بزرگ جو کہ بدن پر چادر لپیٹے تھے انھوں نے امام شافعی کو بہت متاثر کیا۔ والیٔ مدینہ نے گھبراہٹ کے عالم میں والیٔ مکّہ کا خط امام مالک کی خدمت میں پیش کر دیا۔ جسے وہ پڑھنے لگے اور جب وہ ان سطور پر پہنچے کہ "امام شافعی کی مالی حالت ابتر ہے اس لیے آپ انھیں تعلیم دیجیے اور حدیث بیان کیجیے" تو امام اعظم نے بیزاری کے عالم میں وہ خط فرش پر پھینک دیا اور انتہائی ناگواری کے عالم میں فرمانے لگے: "معاذ اللہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا علم بھی ایسا ہے کہ اب سفارش سے حاصل کیا جائے گا۔"

والیٔ مدینہ نے جب امام مالک کا یہ پُرجلال انداز دیکھا تو اُس پر ایک کپکپی سی طاری ہو گئی۔ اب امام شافعی کو والیٔ مدینہ کے الفاظ کا مفہوم سمجھ آیا تھا کہ "امام مالک کا مکان میری دسترس اور پہنچ سے بہت دُور ہے"۔ چنانچہ صورتِ حال کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے امام شافعی نے خود آگے بڑھ کر عاجزی کے ساتھ عرض کیا۔ "مَیں خاندانِ مُطّلب کا ایک فرد ہوں۔ علم کا پیاسا ہوں مگر دنیا کے تمام وسائل سے محروم ہوں۔ اس لیے علم کا شوق مجھے آپ کے دروازے تک لے آیا ہے۔ اگر آپ مجھے معرفت کے دریا سے چند بوندیں عنایت فرما دیں گے تو یہ میری بہت بڑی خوش بختی ہو گی۔"

امام شافعی کا انداز اس قدر اثرانگیز تھا کہ امام مالک کچھ دیر تک تو اُن کے چہرے کو دیکھتے ہی رہ گئے اور پھر فرمانے لگے "لڑکے تمہارا نام کیا ہے؟" امام شافعی نے بتایا کہ اُن کا نام محمد بن ادریس ہے۔ یہ کہنے کے بعد امام شافعی پھر اُس دیاس کی کیفیت میں امام مالک کی طرف دیکھنے لگے۔ امام مالک نے فوراً اپنی جگہ سے اُٹھ کر امام شافعی کو اپنے گلے سے لگا لیا اور اُن کے سر پر دستِ شفقت پھیرتے ہوئے فرمانے لگے "محمد بن ادریس اللہ سے ڈرو"۔ اس کے ساتھ ہی آپ نے امام شافعی کو اپنے شاگردوں میں داخل کر لیا اور انھیں علم کی دولت سے کچھ

اس طرح نوازا کہ ایک دن محمد بن ادریس نامی یہ نوجوان خود بھی حدیث اور فقہ کا امیر بن کر زمانے کے سامنے آیا۔
حضرت امام شافعیؒ نے دوسرے شاگردوں کی نسبت بہت کم عرصے میں حدیث، فقہ کے تمام امور پر دسترس حاصل کر لی تھی۔ جس کے بعد وہ واپس لوٹ گئے۔ کافی عرصہ بعد امام شافعی جب مدینہ تشریف لائے تو اپنے استادِ محترم امام مالک کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے۔ آپ نے انھیں دیکھ کر انتہائی خوشی اور مسرت کا اظہار فرمایا۔ اور شہر مقدس میں رہنے والوں کے بارے میں اُن سے تفصیلات دریافت کرتے رہے اور جب رات ہوئی تو امام مالک یہ کہہ کر اُٹھ کھڑے ہوئے کہ اب مسافر کو آرام کرنا چاہیے۔
امام شافعی بیان کرتے ہیں کہ میں تو خود بھی زیادہ تھکا ہوا تھا۔ اس لیے لیٹتے ہی مجھے گہری نیند نے آلیا مگر رات کے آخری حصے میں مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے میرے دروازے پر کوئی دستک دے رہا ہے۔ جب میری آنکھ کھلی تو میرے کانوں میں امام مالک کی شیریں آواز پڑی وہ فرما رہے تھے "محمد تم پر خدا کی رحمت ہو۔ نماز کا وقت ہو گیا ہے۔" امام شافعی فرماتے ہیں کہ میں یہ سنتے ہی فوراً گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا اور جب دروازے سے باہر آیا تو امام مالک ہاتھ میں پانی کا برتن لیے کھڑے تھے جس پر مجھے بہت شرمندگی اور ندامت ہوئی۔ اس پر امام فرمانے لگے محمد تم کچھ اور خیال نہ کرنا کیونکہ مہمان کی خدمت کرنا ہر میزبان کا فرض ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ امام مالک نے امام شافعی کی یہ عزت و تکریم محض اُن کی علم دوستی کی وجہ سے کی تھی ورنہ امام مالک نے کبھی کسی [illegible] کی اس قدر عزت و تکریم نہیں کی تھی۔
حضرت امام مالکؒ کے فتووں پر وقت کے نامور دانشور بھی سر دُھنتے رہ جاتے تھے اور عرب کے لوگوں کو یہ بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ ایک دن یہ نوجوان علم و فضل کی تعبیر بن کر دنیا کے سامنے آئے گا۔
آپ حدیث اور فقہ کی روشنی میں ایسے ایسے مسائل کا حل بتا دیا کرتے تھے جن کے بارے میں دوسرے علمائے حضرات سخت مایوسی کا اظہار کیا کرتے تھے۔ مثلاً ایک مرتبہ جب آپ سے طلاق کے بارے میں مسئلہ دریافت کیا گیا تو آپ نے واضح طور پر بغیر کسی لگی لپٹی کے فرمایا: "میرے نزدیک جبری طلاق بہرحال طلاق نہیں ہے۔" لوگوں نے جب دوسرے اماموں کے فیصلوں کا حوالہ دیا جن میں طلاق کو بہر طور طلاق ہی قرار دیا گیا تھا تو امام مالک فرمانے لگے میں کسی دوسرے فقیہہ کے فیصلے پر نکتہ چینی نہیں کرنا چاہتا مگر جو میرے پاس کوئی مسئلہ لے کر آتا ہے اس کا حل میں اپنے مسلک کے مطابق ہی بتاؤں گا۔
اُس دور کے تنگ نظر اور مادہ پرست مخالفین نے امام مالک کے طلاق کے بارے میں فتوے کو سیاسی رنگ دے کر خلافت عباسیہ کے دربار میں پیش کیا۔ جس پر حاکم وقت کے ماتھے پر بل پڑ گیا۔ اس کے بعد تو امام مالک کے علم کی رسوائیوں کا باقاعدہ انتظام کر لیا گیا۔ ایک فتوے نے آپ کو شہرت بخشی تھی مگر دوسرا فتویٰ آپ کے لیے باعث عذاب بن گیا تھا۔
وہ لوگ جنہوں نے کبھی امام مالک کے علم بحر کے سمندر سے چند قطرے لے کر اپنی پیاس بجھائی تھی وہی لوگ اب اُن کے مخالفین میں شامل ہو گئے۔ جو لوگ ایک عرصہ تک امام مالک کی روحانی مجالس میں بیٹھتے رہے تھے اور اب وہی لوگ خلیفہ منصور کے دربار میں جا کر فریاد کر رہے تھے کہ امیر المومنین! مالک بن انس نامی ایک شخص ملک میں مذہبی فتنوں کو ہوا دے رہا ہے اگر اُسے روکا نہ گیا تو اندیشہ ہے کہ پورا عالم اسلام فسادات کی زد میں آجائے گا۔
دراصل خلیفہ منصور کے دربار میں جا کر فریاد کرنے والوں کا تعلق اہلِ علم کے اُس قبیل سے تھا جو علم کی ابجد

کو جہالت کے ہاتھوں فروخت کر رہے تھے۔ بہرطور ان لوگوں کی باتیں سُن کر خلیفہ منصور بھی کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اور وہ ماضی کے کچھ واقعات کو ایک ایک کرکے اپنے ذہن میں دہرانے لگا۔ اُسے یاد آیا کہ ایک مرتبہ جب وہ امام مالک کا درس سننے کے لیے حاضر ہوا تھا تو امام مالک نے اُسکے لیے کسی خصوصی نشست کا اہتمام نہیں کیا تھا اور نہ ہی ادب سے جُھک کر اُس کے ہاتھ پر بوسہ دیا تھا۔ پھر خلیفہ منصور کو اپنا ایک سوال بھی یاد آیا جس پر اُس نے امام مالک کا فتویٰ حاصل کرنا چاہا تھا۔

خلیفہ کا سوال یہ تھا کہ اگر کسی کے لباس پر مچھر کا خون لگ جائے تو کیا وہ ناپاک ہو جائیں گے۔ یہ سوال سُن کر امام مالک کا چہرہ غصّے سے سُرخ ہو گیا تھا اور انھوں نے فرمایا تھا کہ جس کا لباس ان گنت بندگانِ خدا کے خون سے سُرخ ہو وہ مجھ سے مچھر کے خون کے بارے میں فتویٰ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ جیسے ہی امام مالک نے یہ الفاظ فرمائے تھے پوری مجلس پر ایک لرزہ سا طاری ہو گیا تھا۔ خلیفہ منصور کے چہرے پر بھی ندامت اور خجالت کے آثار نمایاں تھے جسے وہ چھپانے میں بُری طرح ناکام رہا تھا۔

بہرطور اب امام مالک نے طلاق کے بارے میں جو فتویٰ دیا تھا خلیفہ کو اپنے سابقہ تجربے کی روشنی میں وہ فتویٰ کو عجیب محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ کیونکہ فتویٰ ایسا نہ تھا کہ جس سے خلیفہ منصور کی حکومت خطرے میں پڑ جاتی۔ اس لیے وہ خاموش رہا۔ لیکن جس روز امام مالک نے حضرت نفس زکیہؒ کی حمایت میں چند کلمات کہے پس اُسی روز سے امام مالک خلیفہ منصور کی نگاہوں میں کانٹے کی طرح سے کھٹکنے لگے۔ پھر یہ بدگمانی اس حد تک بڑھی کہ جعفر بن سلیمان نے امام مالک کو دُرّے لگوائے اور دوسرے طریقوں سے بھی آپ کی توہین کی مگر امام مالک نے اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی کے باوجود لوگوں کے سامنے بار بار یہ الفاظ دہرائے "مجھے جاننے والے تو جانتے ہی ہیں لیکن جو مجھے نہیں جانتے وہ بھی جان لیں کہ میں مالک بن انس ہوں۔"

تاریخ کے صفحات پر درج یہ الفاظ اس بات کا اشارہ دیتے ہیں کہ حضرت امام مالک کو مدینہ والوں کے سامنے صحیح شکل میں پیش نہیں کیا گیا۔ شاید اسی لیے آپ کو پہچانتے اور سمجھنے میں اہلِ مدینہ کو دشواری پیش آ رہی تھی۔

جعفر بن سلیمان نے امام مالک کو جو دُرّے لگوائے تھے اُس کے بارے میں بعض کتابوں میں درج ہے کہ خلیفہ منصور کے اشارے سے امام مالک کو یہ سزا دی گئی تھی۔ دراصل امام اعظم کا یہ فتویٰ کہ جبری طلاق، طلاق نہیں ہے۔ اس سارے واقعہ کا محرک ہے۔

درحقیقت یہی وہ دَور تھا جب خاندانِ سادات پر خلیفہ منصور کی طرف سے مظالم ڈھائے جا رہے تھے۔ اسی پُرآشوب دَور میں جب امام مالک نے اپنے مسلک کے مطابق لوگوں کے مسائل پر فتوے جاری کرنے شروع کیے تو خلیفہ نے امام مالک کو ایسا کرنے سے باز رہنے کے لیے کہا تھا مگر امام مالک نے اس کے جواب میں کہا تھا کہ وہ قرآن و سنت کے احکامات کو اللہ کے بندوں تک پہنچانے کا فریضہ انجام دیتے رہیں گے۔

چونکہ خلیفہ منصور امام مالک کی عادت سے واقف تھا اس لیے خاموش رہا مگر جب اسی دوران خاندانِ سادات کے ایک معزز فرد حضرت محمد نفس زکیہؒ نے دورِ منصور کے ظالمانہ نظامِ حکومت کے خلاف کلمہ حق بلند کیا۔ مگر چونکہ وہ جنگی حکمت عملی سے ناواقف تھے اس لیے وہ شکست خوردہ حالت میں مارے گئے۔

تاریخ میں بعض جگہ درج ہے کہ امام مالک نے طلاق کے مسئلے پر جو فتویٰ دیا تھا دراصل وہی زکیہ نفس کی شہادت کا سبب بنا۔ اس سلسلے میں مشہور مؤرخ طبری لکھتا ہے کہ لوگ امام مالک سے خلافت عباسیہ کا شکوہ کرتے ہوئے

کہتے تھے کہ ہمارے گلے میں منصور کی بیعت کا طوق ہے جس کے جواب میں امام مالک نے فرمایا تھا کہ تم سے جبراً بیعت لی گئی ہے جب کہ بیعت جبراً نہیں ہوتی۔" چنانچہ امام مالک کے اس فتوے پر لوگوں نے حضرت محمّد بن عبداللہ سے بیعت کر لی جب کہ امام گھر میں بیٹھے رہے۔

دوسری جانب جبری طلاق کے سلسلے میں مؤرخین نے یہ اخذ کیا کہ شاید امام مالک نے جبری بیعت کے خلاف فتویٰ دیا ہے حالانکہ امام مالک تو انتہائی صاف نیّت کے ساتھ اپنا مسلک بیان فرما رہے تھے مگر خلیفہ منصور کی یہ خواہش تھی کہ امام مالک اس سلسلے میں خاموشی اختیار کیے رکھیں۔

اُس زمانے کے بعض اہلِ علم اور چشمِ بینا رکھنے والوں کا نظریہ یہ تھا کہ خلیفہ منصور ہی امام مالک کا اصل مخالف اور دُشمن تھا۔ مختلف فرقوں اور طبقوں کی جانب سے امام مالک کی جو توہین یا مخالفت کی گئی اُس کے پیچھے خلیفہ ہی کا ہاتھ تھا۔ وہ امام کی تمام نقل و حرکت اور کارروائیوں پر کڑی نگاہ رکھتا تھا، دراصل خلیفہ انتہائی مکّارانہ چال چل رہا تھا۔ اُس نے اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لیے اپنے کارندوں کو آلۂ کار بنا رکھا تھا۔ امام مالک پر جعفر بن سلمان کا تشدّد بھی خلیفہ کی اسی حکمتِ عملی کا ایک حصّہ تھا۔

امام مالک سب کچھ جاننے کے باوجود صبر و شکر کے ساتھ اپنے مشن کی تکمیل میں لگے رہے، ایک روز آپ نے منبر پر کھڑے ہو کر فرمایا۔

لوگو! مجھے چکنی چپڑی باتیں نہیں آتیں میری نیّت صاف ہے۔ مَیں دُنیا میں حق پرستی اور انصاف پسندی کے لیے آیا ہوں۔ اس کے جواب میں میرے ساتھ جو بھی سلوک ہو مَیں اُس کے لیے ہمیشہ تیار ہوں۔ جس وقت امام مالک لوگوں کے سامنے یہ تقریر کر رہے تھے وہاں خلیفہ کے مخبر بھی موجود تھے اور انھوں نے فوراً جا کر خلیفہ کو ساری رپورٹ پہنچا دی۔ اب تو خلیفہ دل ہی دل میں خود اپنی مذمت کرنے لگا کہ اُس نے ناحق امام مالک کے ساتھ اس قسم کا گھٹیا سلوک ہونے دیا۔

اتفاق سے خلیفہ منصور نے اسی سال حج کا قصد کیا مگر جانے سے پہلے اُس نے اپنے ایک کارندے کے ہاتھ امام مالک کو معذرت نامہ بھجوایا جس میں خلیفہ نے تحریر کیا۔

"اے امام مالک! آپ کے ساتھ جو افسوسناک واقعہ ہوا مَیں اس پر سخت نادم ہوں"۔ امام مالک نے فراخ دلی کا ثبوت دیتے ہوئے خلیفہ منصور کو معاف کر دیا اور فرمایا

"خلیفہ منصور مَیں نے اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعے کو ذہن کے گوشوں سے نکال دیا ہے مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں حتیٰ کہ مَیں نے اپنا معاملہ خدا پر چھوڑتے ہوئے سلمان بن جعفر کو بھی معاف کر دیا ہے۔"

حضرت امام مالک علم و عرفان کے ایک ایسے سمندر تھے جس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ انھوں نے حصولِ علم اور تعلیمِ علم کے لیے جو طریقہ کار اپنایا تھا وہ سب سے جدا اور منفرد تھا۔ آپ کی عظمت و برتری اور علمیت کا یہ حال تھا کہ ہارون الرشید اور خلیفہ مہدی بھی آپ سے علم حاصل کرنے کے متمنی تھے۔ وہ اکثر خود کو امام مالک کا شاگرد کہا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ امام مالک سے کہا۔ "میری یہ دلی خواہش ہے کہ خانہ کعبہ کے اندر امام صاحب کی کتاب کی شہرۂ آفاق رہنما کتاب مؤطا آویزاں کر دی جائے اور دنیا کے تمام مسلمانوں سے کہا جائے کہ وہ احکامِ فقہی کی تکمیل کے لیے اس کتاب کی پیروی کریں۔ بلاشبہ دُنیا میں عزت و توقیر حاصل کرنے کا کوئی اور موقع نہیں ہو سکتا تھا مگر امام مالک نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی رہنمائی کے لیے صحابہ کرام کو اس دُنیا میں بھیج رکھا ہے اور اُن میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ جب چاہیں اور جہاں بھی چاہیں وہاں جا کر

لوگوں کو راہِ حق پر چلنے کی ہدایت کر سکتے ہیں۔ امام مالک کی علمی عظمت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس دنیا میں جہاں بڑے بڑے عالم فاضل بھی ایک دوسرے کے نظریات کی مخالفت کر کے اپنے نظریے کے مستند ہونے پر مُصر رہتے ہیں وہاں امام مالک نے ہر قسم کے مواقع میسّر آنے کے باوجود اپنے علم اور نظریے کو لوگوں پر زبردستی ٹھونسنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔

حضرت امام مالک اپنی مرضی اور منشا کے بغیر ہر بات برداشت کرنے کے عادی تھے۔ خلیفہ منصور کی جانب سے ہونے والی ہر قسم کی زیادتیوں کو بھی آپ نے ہنستے ہوئے برداشت کیا مگر ایک بات واضح تھی کہ وہ کسی طور بھی علم کو رسوا ہوتے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اُن کے آدابِ درس میں کبھی تغیّر نہیں آتا تھا وہ علم و عرفان کا ایک ایسا چراغ تھے جس کی روشنی امیروں، غریبوں، شاہوں اور گداؤں کے لیے یکساں تھی۔

تاریخی کتابوں کے حوالے سے پتہ چلتا ہے کہ امام اعظم کے لیے خلیفہ ہارون الرشید اپنے دل میں بہت قدر و منزلت رکھتا تھا۔ اُس نے ایک بار امام اعظم سے انتہائی عاجزانہ طور پر یہ درخواست کی کہ وہ بغداد میں تشریف لا کر لوگوں کو حدیث کا درس دیں مگر امام صاحب نے صاف انکار کر دیا۔ چونکہ خلیفہ کو امام صاحب سے بے پناہ عقیدت تھی اس لیے وہ ہر قسم کے مقام و مرتبے کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنے دونوں بیٹوں کے ہمراہ بغداد سے مدینہ تشریف لایا اور امام صاحب سے درخواست کی کہ وہ اُس کے دونوں بچوں کو علم حدیث کی روشنی عطا فرمائیں۔

امام اعظم نے خلیفہ کی تعظیم و تکریم کی اور اُسے اپنے ہمراہ مسند پر بٹھایا۔ ہارون الرشید نے آپ سے گزارش کی کہ آپ خود حدیث شریف کی قرأت فرمائیں مگر امام مالک نے انکار کرتے ہوئے کہا کہ مَیں نے کبھی کسی طالبِ حدیث کے سامنے قرأت نہیں کی۔ دستورِ مجلس یہی ہے کہ شاگرد قرأت کرتے ہیں، آپ بھی سماعت فرمائیں۔ اس پر ہارون الرشید نے دوبارہ عرض کیا کہ برائے مہربانی آپ مجھے تنہائی میں حدیث کے درس سے مستفید فرمائیں۔ یہ بات سُن کر امام صاحب کے چہرے پر ناراضگی کے آثار نمودار ہوئے اور وہ کہنے لگے۔ خلیفہ! ایسا کرنا تنگ نظری کے مترادف ہوگا۔ تم خود ہی سوچو یہ بھلا کس طرح ہو سکتا ہے کہ سورج کی روشنی میں محض ایک شخص استفادہ کرے اور دوسرے بندگانِ خدا اس کی دھوپ سے محروم رہیں۔

امام مالک اُن افراد یا مفکرین میں سے نہیں تھے جو اپنے نظریات پر بلا وجہ ڈٹے رہتے ہیں خواہ وہ غلط ہی کیوں نہ ہوں۔ امام مالک کی خوبی یہ تھی کہ وہ اعترافِ حقیقت میں کبھی عار محسوس نہیں کرتے تھے۔

روایت ہے کہ ایک روز معروف عالمِ دین عبدالرحمٰن بن قاسم آپ کی خدمت میں حاضر تھے۔ فقہ کے مسائل پر بحث و مباحثہ ہو رہا تھا۔ ایک موقع پر ابن قاسم نے حضرت امام مالک سے عرض کیا کہ مسائل بیع پر جتنی دسترس مصر کے لوگوں کو حاصل ہے اتنا عبور کسی اور کو نہیں ہے۔ ابن قاسم کو امام اعظم نے جب اس جملے کی وضاحت کرنے کے لیے کہا تو ابن قاسم نے جواب دیا کہ اہلِ مصر چونکہ آپ کی پیروی کرتے ہیں اس لیے میرے خیال میں مسائل بیع پر اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ بات سن کر امام مالک نے فرمایا۔

"ابن قاسم یہ تُو نے کیا بات کہہ دی ہے، مَیں تو خود مسائل بیع سے ابھی تک نا آشنا ہوں پھر اہلِ مصر بھلا کیونکر میری پیروی کرنے لگے"۔ امام کی بات سُن کر ابن قاسم وغیرہ حیرت میں ڈوب گئے۔

روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن مبارک امام اعظم کی مجلس میں موجود تھے۔ حضرت عبداللہ بن مبارک وہی ہیں جنہیں حدیث کا امیر المومنین بھی کہا جاتا ہے۔ بہرکیف جس وقت حضرت عبداللہ آپ کی مجلس میں موجود تھے اُس وقت امام مالک حدیث کا درس دے رہے تھے۔ بالآخر جب درس کا یہ سلسلہ ختم ہوا اور حاضرین

وہاں سے رخصت ہوگئے تب ابنِ مبارک نے امام صاحب سے اُن کے چہرے کے بدلتے ہوئے رنگوں کی بابت دریافت کیا۔

حضرت امام مالک نے ابنِ عبداللہ کے سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔ خاموشی سے اُٹھے اور گھر کے اندر تشریف لے گئے۔ جب آپ نے اپنا پیراہن اُتارا تو آپ کی اہلیہ یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئیں کہ آپ کے کپڑوں کے اندر ایک زہریلا بچھو موجود تھا۔ جب امام صاحب کے سارے جسم کا بغور جائزہ لیا گیا تو معلوم یہ ہوا کہ بچھو نے آپ کے جسم پر سولہ مقامات پر ڈنک مارا تھا۔ پھر تھوڑی دیر بعد امام مالک نے ابنِ عبداللہ کے سامنے جب یہ واقعہ سرسری طور پر بیان کیا تو ابنِ عبداللہ سناٹے میں آگئے اور انتہائی جذباتی انداز میں کہنے لگے۔ امام صاحب اللہ تعالیٰ آپ کو سلامت رکھے آپ نے جس صبر و سکون سے اُس موذی بچھو کے ڈنکوں کو اپنے جسم مبارک پر برداشت کیا۔ کوئی دوسرا اس بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ اس پر امام اعظم نے فرمایا۔ ابنِ عبداللہ یہ سب کچھ سرورِ کائنات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شرفِ غلامی کی وجہ سے ہوا۔ دراصل میرا صبر و سکون صرف اور صرف حدیثِ رسولؐ کی تعظیم کے سبب تھا وگرنہ اس قسم کے موذی کیڑے کی ڈنک زنی برداشت کرنے کی تاب بھلا کس میں ہو سکتی ہے۔

یوں تو اس دنیا میں ایسے ایسے عاشقانِ رسول پیدا ہوئے ہیں جن کی تاریخی صفحات پر مثال ملنا بہت مشکل ہے۔ مگر امام مالک کا عشقِ رسولؐ اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ اگرچہ خلیفہ منصور کی سیاسی چالبازیوں کے باعث امام مالک کو ناقابلِ برداشت تکالیف کا سامنا کرنا پڑا مگر اس کے باوجود انھوں نے حضرت محمد نفس زکیہؒ کا محض اس لیے ساتھ دیا تھا کہ وہ خاندانِ رسالت سے تعلق رکھتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ امام مالک کو جہاں بھی نقشِ رسالت نظر آجاتا تھا وہیں آپ کی جبیں جھک جاتی تھی۔ آپ اکثر یہ دُعا کرتے کہ اے باری تعالیٰ تُو نے مجھے مدینہ کی جس خاک سے اُٹھایا ہے اُسی خاک میں ہی مجھے ملا دے۔

منصور کے بیٹے خلیفہ مہدی کو آپ سے بہت زیادہ عقیدت اور محبت تھی۔ ایک بار خلیفہ مہدی کی جب مدینہ منورہ میں آمد ہوئی تو امام مالک خود اُس سے ملاقات کے لیے تشریف لے گئے۔

مہدی نے انتہائی عقیدت و احترام سے امام مالک کا استقبال کیا اور ہر طرح سے اُن کے آرام و آسائش کا خیال رکھا۔ پھر جب امام مالک وہاں سے رخصت ہونے لگے تو خلیفہ مہدی نے آپ سے درخواست کی کہ کوئی نصیحت فرمائیں۔

اس پر امام مالک نے فرمایا "خلیفہ مہدی! میں تجھے پُرسشِ اعمال سے ڈراتا ہوں۔ اپنے دل میں ہمیشہ خوفِ خدا رکھو۔ روزِ محشر کے تصوّر سے ڈرتے رہو کیونکہ جسے خوفِ خدا نہیں سمجھ لو کہ وہ ہلاکت کے بہت قریب پہنچ گیا ہے۔" پھر امام مالک نے فرمایا "میری دوسری نصیحت یہ ہے کہ دُنیا میں جو بھی شخص سرورِ کائنات کے پڑوسیوں سے کمالِ مہربانی اور ہمدردی سے پیش آئے گا ابدی دُنیا میں اُسے معزز اور محترم تصوّر کیا جائے گا۔ مجھ تک یہ روایت پہنچی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ مدینہ میری ہجرت کی جگہ ہے۔ یہی میری قبر بنے گی اور اسی جگہ سے روزِ محشر مجھے اُٹھایا جائے گا۔ اس کے باشندے میرے پڑوسی ہیں لہٰذا میری اُمّت پر یہ حق ہے کہ وہ میرے پڑوسیوں کی حفاظت کرے کیونکہ میں ان کا شفیع بھی ہوں اور گواہ بھی۔"

روایت ہے کہ حضرت امام مالک کی یہ ایمان افروز باتیں سُن کر خلیفہ مہدی کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو

سحری کی سنت رسول ہو یا افطار کا مقررہ وقت
صبح کاذب ہو یا وقت غروب آفتاب

رمضان المبارک میں

رُوح پرور
ہمدرد چائے

ایک نہایت رُوح پرور ضرورت ہے

بہہ نکلے۔ اس کے بعد تو اُس نے مدینہ کے لوگوں پر کچھ اس طرح سے مہربانی کی کہ خلیفہ مہدی کا یہ عمل ایک تاریخ ساز اہمیت اختیار کر گیا۔ کہتے ہیں کہ اس کے بعد عباسی خلیفہ نے شہر مدینہ کا والہانہ طواف کیا اور دوران طواف وہ با آواز بلند کہتا جاتا تھا۔ "خدا کی قسم اگر امام مالک مجھ پر نظرِ کرم نہ کرتے تو میں زندگی کی اس بڑی سعادت سے ہمیشہ کے لیے محروم رہ جاتا۔"

چنانچہ اس کے بعد خلیفہ مہدی نے سرورِ کائنات کے پڑوسیوں کا اپنے سے بڑھ کر خیال رکھا۔

چونکہ امام مالک خلیفہ مہدی کو اُس کی عادات اور اعمال کی وجہ سے اچھا سمجھتے تھے اس لیے خلیفہ مہدی نے ایک بار اپنے ایک خاص مصاحب ربیع کو تین ہزار اشرفیاں دے کر آپ کی خدمت میں بھجوایا۔ امام مالک نے بغیر کسی تامل کے خلیفہ مہدی کی جانب سے بھجوائی گئی اس نذر کو قبول کر لیا۔ ربیع نے رخصت ہونے سے پہلے امام مالک سے کہا۔ "خلیفہ کی یہ خواہش ہے کہ آپ اُن کے ہمراہ بغداد تشریف لے چلیں۔"

اس پر امام مالک نے ربیع سے پوچھا۔ "کیا تم میرے آقا کے فرمان سے آگاہ ہو؟"

جب ربیع نے اس سے لاعلمی کا اظہار کیا تو امام مالک نے اُن کے سامنے وہ حدیث بیان کر دی جس کا مفہوم تھا "مدینہ اُن کے حق میں بہتر ہے اگر وہ اس بات کو سمجھیں۔" خلیفہ مہدی کے مصاحب ربیع آپ کا اشارہ سمجھ چکے تھے۔ انھوں نے احترام کے جذبے سے امام صاحب کے سامنے اپنا سر جھکا لیا۔

پھر امام مالک نے فرمایا کہ بغداد جانے کی بات دوسری ہے اگر مجھے ایک دن بھی سرورِ کائنات کا روضہ نظر نہ آئے تو دل پر قیامت سی گزر جاتی ہے۔ امام کے اِن الفاظ میں کچھ ایسا رُعب و جلال تھا کہ ربیع کانپ اُٹھے۔ انھوں نے اس عاشقِ رسولؐ کی بہت باتیں سُنیں تھیں مگر آج اپنی آنکھوں سے دیکھ کر انھیں امام مالک کے عشق کا اندازہ ہو گیا تھا۔ امام مالک کہہ رہے تھے "ربیع میں نور کے اس حصار سے نکل کر بھلا کہاں جا سکتا ہوں۔ میں تو پہچانا ہی اُسی کی ذات کے حوالے سے جاتا ہوں۔ اگر اُس کا دامن چھوٹا تو یہ مالک بے نشاں ہو جائے گا۔" یہ کہتے ہوئے امام مالک نے ربیع کو تین ہزار اشرفیوں کی وہ تھیلی واپس لوٹا دی جو خلیفہ مہدی نے انھیں نذرانے کے طور پر بھجوائی تھی اور فرمانے لگے۔ "ربیع اپنے امیرالمومنین سے کہہ دینا کہ مالک مدینہ کی خاک کے ایک ذرّے کے بدلے میں ساری دنیا کی دولت ٹھکرا دینے کا جذبہ رکھتا ہے۔"

ربیع نے جب امام مالک کا یہ طرزِ عمل دیکھا تو وہ خاصے گھبرا گئے اور انھوں نے بمشکل یہ کہا کہ اعلیٰ حضرت! ہمارے امیرالمومنین کا یہ مقصد ہرگز نہ تھا۔ آپ اپنی خوشی سے جہاں کہیں بھی رہیں بس اتنی التجا ہے کہ ہمارے خلیفہ کے حق میں دُعا فرماتے رہیں۔"

امام مالک نے دونوں ہاتھ اُٹھا کر دُعا کی۔ "اے باری تعالیٰ تُو خلیفہ کو اُس کے حُسنِ نیّت کا صلہ عطا کر۔"

اس کے بعد ربیع انتہائی گھبراہٹ کے عالم میں امام مالک کے مکان سے باہر نکل آئے۔ اور واپس جا کر اپنے امیرالمومنین کو ساری صورتحال سے آگاہ کر دیا۔ تب خلیفہ کو احساس ہوا۔ واقعی اُس نے امام مالک کو بغداد آنے کی دعوت دے کر اُن کے عشقِ رسولؐ کے جذبے میں حائل ہونے کی کوشش کی تھی۔ بعد میں خلیفہ نے اپنے ایک خاص مصاحب کی وساطت سے تحریری طور پر امام مالک سے اپنے اس رویّے کی معافی طلب کی۔

اگرچہ امام مالک اپنے اصولوں پر چٹان کی طرح ڈٹ جایا کرتے تھے اور اس سلسلے میں بڑے بڑے

اُمرا اور سلاطین کو بھی خاطر میں نہ لایا کرتے تھے مگر فطرتاً امام مالک ایک صلح پسند انسان تھے۔ آپ نے کبھی لوگوں کو کسی خلیفہ کے خلاف نہ تو بھڑکایا اور نہ کسی خلیفہ کی ناجائز تائید کی حمایت کی۔ آپ بنیادی طور پر لوگوں کی تعلیم و تربیت پر زور دیتے تھے اور انھیں اس بات کا قوی یقین تھا کہ اس طرح ہدایت یافتہ لوگوں کی ایک ایسی جماعت تیار ہو جائے گی جس سے صحیح معنوں میں اسلامی انقلاب کی راہیں ہموار ہو سکیں گی۔

امام مالک نے اپنی تمام زندگی میں بڑے صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا۔ کئی مواقع ایسے بھی آئے کہ لوگوں نے آپ کو مختلف فتنوں اور نظریاتی بحثوں میں اُلجھانا چاہا مگر آپ بڑی احتیاط سے ایسے لوگوں سے بچتے رہے۔ آپ کے نظریاتی مخالفین اور مفسدین اس بات سے بخوبی آگاہ تھے کہ آپ لوگوں کے دلوں پر حکمرانی کرتے ہیں۔ اس لیے وہ ہر وقت آپ کے نظریات کو کوئی معنی پہنا کر آپ کو نیچا دکھانے کے لیے طرح طرح کے مکروہ منصوبے بناتے رہتے مگر خدا کے فضل سے ہمیشہ ایسے مفسدین کو منہ کی کھانا پڑتی تھی۔

ایک مرتبہ آپ کی مجلس میں موجود کسی شخص نے آپ سے سوال کیا " جو لوگ فتنہ خیزی کو ہوا دیتے ہیں کیا اُن کے خلاف جنگ کرنا جائز ہے ؟"

اس پر امام مالک نے فرمایا ' ایسے لوگوں کے خلاف کوئی کیا جنگ کریگا جو کہ عمر بن عبدالعزیز کے خلاف بھی شر انگیزی سے باز نہیں آئے تھے۔"

پھر سوال کیا گیا کہ اگر ابن عبدالعزیز جیسا حکمران نہ ہو تو اُس صورت میں کیا کیا جائے۔ جواب میں امام مالک نے فرمایا کہ پھر بھی ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو کیونکہ اللہ تعالیٰ ظالم کے ذریعے ہی ظالم سے بدلہ لیتا ہے اور پھر بعد میں دونوں سے بدلہ لیتا ہے۔

حضرت امام مالک نے زندگی کا ایک خاص حصہ انتہائی تنگدستی اور کسمپرسی کے عالم میں گزاری مگر اس کے باوجود کبھی کسی خلیفہ بادشاہ یا امیر کی جانب سے نذرانہ وغیرہ قبول نہ کیا۔ آپ پر ایک نازک لمحہ ایسا بھی آیا جب آپ کی معصوم بچّی کو روٹی کے دو نوالے بھی میسّر نہ تھے مگر اس سنگین گھڑی میں بھی امام مالک نے کسی کو اپنا حالِ زار نہ بتایا لیکن جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو خوشحالی سے نوازا تو اُس صورت میں بھی آپ کے دل میں رتّی برابر غرور و تکبر نہ آیا۔ آپ کے پاس جس قدر نقد رقم آتی اُسے آپ حاجت مندوں پر صرف کر دیا کرتے تھے۔ آپ کا معمول تھا کہ آپ اپنے شاگرد امام شافعی کو سالانہ گیارہ ہزار دینار بھجوایا کرتے تھے مگر آپ کے بعض مخالفین نے آپ کی خوشحالی کو بھی ہدفِ تنقید بنانے سے گریز نہ کیا۔

امام مالک کی علمیت کو اُن کے مخالفین بھی چیلنج کرنے کی ہمت نہیں رکھتے تھے اس لیے وہ دوسرے بہانوں سے آپ کو پریشان اور بدنام کرنے کی مکروہ کوششوں میں لگے رہتے تھے۔ روایت ہے کہ آپ کے دروازے سے زیادہ کسی اور دروازے پر علم حاصل کرنے والوں کا ہجوم نہیں ہوتا تھا۔ حج کے زمانے میں تو لوگوں کی گنتی کسی شمار میں ہی نہ آتی تھی۔ بادشاہوں اور بڑے بڑے راجاؤں کی طرح آپ کے دروازے پر بھی سنتری موجود رہتے تھے جن کا کام اُس عظیم مجمع کو قابو میں رکھنا ہوتا تھا جو آپ کے دروازے کے باہر علم کی پیاس لیے جمع ہو جاتے تھے شاگردوں کی ایک جماعت بھی نظم و نسق سنبھالنے کے کام پر مامور رہتی تھی۔ بعض تاریخی حوالوں سے یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ امام مالک کے ہاں ایک قید خانہ بھی تھا۔ جو شخص کوئی بے اصولی کرتا تھا اُسے پابندِ سلاسل کر لیا جاتا تھا۔ جب امام مالک سے اس بارے میں پوچھا جاتا

تو آپ فرماتے: "اُس نے جو کچھ کیا ہے اُس کی تصحیح کرے پھر چلا جائے۔"

حضرت امام مالک کا عشقِ رسول اسلامی تاریخ میں ایک خاص مقام رکھتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ کبھی آپ نے مدینہ کی سرزمین سے دُور جانے کا تصوّر بھی نہیں کیا تھا۔ حضرت مصعبؒ کے والد بیان کرتے ہیں۔ "میں ایک روز مسجدِ نبوی میں امام مالک کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا کہ اتنے میں وہاں ایک شخص آیا اور اُس نے آتے ہی سوال کیا کہ تم میں سے مالکؒ کون ہے؟

حاضرین نے امام مالک کی طرف اشارہ کیا۔ پھر وہ شخص امام مالک کی جانب بڑھا۔ ادب سے سلام کیا اُن کی پیشانی پر بوسہ دیا اور دیوانوں کی مانند امام مالک سے لپٹ گیا۔ اجنبی کی حرکات پر دیوانوں کا سا گمان ہو رہا تھا۔ ادھر حاضرینِ مجلس اپنی اپنی جگہ ساکت بیٹھے ہوئے تھے۔ جب اُس شخص کا جوش قدرے کم ہوا تو وہ لرزتی ہوئی آواز میں کہنے لگا: "خدائے بزرگ و برتر کی قسم میں نے گزشتہ رات خواب میں سرورِ کائنات کی زیارت کی ہے۔ کیا دیکھتا ہوں کہ سرورِ کائنات اس جگہ تشریف فرما ہیں اور پھر وہ فرماتے ہیں کہ جاؤ مالک کو بلاؤ۔" حکم سنتے ہی مالک کو بلوایا گیا پھر آپ نے فرمایا "مالک بیٹھ جاؤ۔" آپ آقا کے سامنے بیٹھ گئے۔ پھر آپ نے فرمایا "مالک اپنی آغوش کھولو۔" آپ نے حکم کی تعمیل میں اپنی آغوش وا کر دی۔ پھر سرورِ کائنات نے آپ کی آغوش کو مشک سے بھر دیا اور تب فرمایا "مالک اسے بدن پر مَل لے اور میری اُمّت کو معطر کر دے۔"

اُس شخص کی زبانی یہ خواب سن کر حضرت امام مالک کی آنکھوں سے اشکوں کا ایک سمندر رواں ہو گیا۔ کافی دیر بعد جب ذرا سنبھلے تو وہاں پر موجود حاضرین سے کہنے لگے۔ "یہ خواب اگرچہ بہت اچھا ہے مگر تمہیں کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں رہنا چاہیئے۔ تم اللہ اور اُس کے محبوب پاک حضرت محمّد صلی اللہ وآلہٖ وسلّم کے احکامات کی پیروی کرتے رہو۔" یہ کہنے کے بعد حضرت امام مالک نے خواب سُنانے والے اجنبی سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا: "اے اللہ کے نیک بندے! اگر تُو نے صحیح طور پر اپنا خواب بیان کیا ہے تو یہ علم کی بشارت ہے جسے خدا تعالیٰ نے بطورِ امانت میرے پاس رکھا ہوا ہے۔"

اسی سلسلے میں اپنے زمانے کے مشہور عالم اور بزرگ سہل ابنِ مزاحم کا بیان ہے کہ جب مجھے حالتِ خواب میں سرورِ کائنات کا دیدار نصیب ہوا تو میں نے آپ سے عرض کیا۔ "یا رسول اللہ آپ کا خیر و برکت والا زمانہ تو گزر گیا ہے۔ اگر اب کسی قسم کے مذہبی معاملات کے متعلق ہمارے دل میں شکوک و شبہات پیدا ہوں تو ہمیں تصدیق اور رہنمائی کے لیے کس شخص سے رجوع کرنا چاہیے۔"

اس پر آپ نے فرمایا: "اگر تمہیں دینی امور کی ادائیگی میں کوئی مشکل یا رکاوٹ پیش آئے تو تمہیں مالک بن انس سے دریافت کرنا چاہیے۔"

حضرت امام مالک کی فہم و فراست، علمی بصیرت اور ان کے نظریات و افکار سے ہر شخص نے رہنمائی حاصل کی۔ مشہور بزرگ یحییٰ بن خلف سے روایت ہے کہ میں ایک دن حضرت امام بن انس کی خدمت میں حاضر تھا اور اُن کے درس سے مستفید ہو رہا تھا۔ اُس وقت درسِ حدیث ختم ہونے کے بعد فقہ کی مجلس آراستہ تھی۔ لوگ مختلف قسم کے شرعی مسائل پر آپ سے رہنمائی حاصل کر رہے تھے اور امام مالکؒ بھی بڑی توجہ اور انہماک سے حاضرین کو اُن کے مسائل کا حل بتا رہے تھے۔ اتنے میں اچانک ایک شخص اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا اور امام مالک سے سوال کیا کہ قرآن کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ وہ مخلوق ہے یا غیر مخلوق۔

اگرچہ حضرت امام مالک فطرتاً بہت نرم مزاج واقع ہوئے تھے مگر یہ سوال سننے کے بعد وہ جلال میں آ گئے

اور انتہائی غصے کے عالم میں فرمانے لگے۔

"اُس زندیق کو قتل کر ڈالو. خدا کی قسم اس کے کلام سے بڑے بڑے فتنے اور فسادات اُٹھ کھڑے ہونگے۔"

وہ شخص تو اپنا جواب سُن کر چل دیا مگر وہاں پر موجود لوگ امام مالک کے اس قہر وغضب اور اُن کے الفاظ کے مفہوم کو ذرا بھی نہ سمجھ پائے۔ مگر امام مالک کی وفات سے ٹھیک اڑتیس برس بعد خلیفہ مامون رشید کے آخری دَور میں فتنہ خلق قرآن نے سر اُٹھایا۔ جب معتصم کے زمانہ خلافت میں معتزلہ کی یہ تحریک اپنی انتہا کو پہنچی تو اہلِ سُنت کا ایک بڑا گروہ مغضوب ہوا اور امام احمد بن حنبل نے سخت اذیتیں اور تکالیف برداشت کیں۔ اس وقت ماضی کے جو لوگ حیات تھے انہیں حضرت امام مالک کی بہت یاد آئی کیونکہ اُس مردِ قلندر اور مردِ روشن ضمیر نے تیس برس قبل جو کچھ فرمایا تھا وہ حرف بحرف پورا ہوا۔ درحقیقت امام مالک کا بھی وہ فہم و ادراک تھا جو قدرت کی جانب سے آپ کو خصوصی طور پر عطا کیا گیا تھا۔

حضرت امام مالک عُمر کے آخری حصّے میں خاصے کمزور اور ناتواں ہو چکے تھے مگر اس کے باوجود طالبانِ علم آپ کے دَر پر حاضری دیتے رہتے تھے۔ اگرچہ آفتاب میں اب پہلے جیسی گرمی اور تپش نہیں رہی تھی لیکن روشنی کا سفر ابھی بھی جاری رہا۔ آپ کے اندازِ خطابت کا یہ عالم تھا کہ بیماری کی حالت میں بھی جب آپ جمعہ کے روز مسجد نبوی میں تشریف لے جاتے تو انسانی ہجوم آپ کے گرد سمٹ آتا۔ آپ اپنی کمزور صحت کے پیشِ نظر حاضرین کو چند نصیحتیں فرماتے اور گھر واپس چلے جاتے مگر آپ کے مفسدین کو اب بھی بے قراری تھی۔ مثلاً وہ کہتے تھے کہ انسان کو معمولی سی کمزوری اور ناتوانی کی شکایت تو ہو ہی جاتی ہے لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ انسان مسجد نبوی چھوڑ کر گھر میں جا بیٹھے۔

حضرت سلیم چشتیؒ کی کرامتوں میں سے ایک یہ ہے کہ میرے پیدا ہونے سے پہلے حضرت عرش آشیانی (اکبر) کو اس نیاز مند کی ولادت کی خوش خبری کے ساتھ ہی دو اور بھائیوں کا امیدوار کیا تھا۔ دوسرے یہ کہ ایک دن حضرت عرش آشیانی نے پوچھا کہ تمھاری عمر کتنی ہے اور زمانۂ رحلت کب آئے گا؟ جواب میں کہا کہ حق تعالیٰ پوشیدہ باتوں کا عالم ہے، لیکن اصرار کرنے پر اس نیاز مند کی طرف اشارہ فرمایا کہ یہ شہزادہ کسی معلم کی تعلیم سے یا کسی شخص سے کچھ یاد کر لے اور باتیں کرنے لگے تو یہ میرے وصال کے آثار ہیں۔ حضرت والا نے ان لوگوں کو جو میری خدمت میں رہتے تھے تاکید فرما دی کہ کوئی آدمی شہزادے کو نظم و نثر سے کچھ تعلیم نہ کرے یہاں تک کہ دو برس اور چھ مہینے گزر گئے ایک دن ایک عورت خادمہ جو اس محلے میں رہتی تھی اور ہمیشہ چشم بد کے واسطے سپند جلایا کرتی تھی اور اس بہانے سے میری خدمت میں راہ رکھتی تھی مجھ کو تنہا پاکر بے خبری میں یہ شعر مجھ کو تعلیم کر گئی ہے۔

الٰہی غنچۂ امید بکشا   گلے از روضۂ جاوید بنما

میں نے شیخ کی خدمت میں جاکر یہ بیت پڑھی۔ شیخ بے اختیار اپنی جگہ سے اچھل کر حضرت عرش آشیانی کی خدمت میں دوڑے اور اس واقعے سے آگاہی بخشی۔ قضائے الٰہی سے اسی رات کو بخار کے آثار ظاہر ہوئے۔ ایک آدمی کو حضرت والا کی خدمت میں بھیجا اور تان سین کلاونت کو جو قوالوں میں بے نظیر تھا بلایا۔ تان سین نے خدمت میں جاکر قوالی شروع کی۔ اس کے بعد پھر ایک آدمی حضرت عرش آشیانی کو بلانے کے لیے بھیجا۔ جب حضرت والا تشریف لائے تو فرمایا کہ وعدہ وصال کا آپہنچا اور تم سے وداع ہوتا ہوں۔ اپنے سر سے پگڑی اتار کر میرے سر پر رکھی اور کہا "ہم نے سلطان سلیم کو اپنی جگہ بٹھایا اور اسے خدا کو سونپا" ان کا ضعف دمبدم زیادہ ہونے لگا اور آثارِ مرگ ظاہر ہونے لگے حتیٰ کہ واصل بحق ہو گئے۔

(تزک جہانگیری)

جب دل آزاری کی باتیں امام مالک کے کانوں تک پہنچتی تو وہ بدستور خاموشی اختیار کیے رکھتے زیادہ سے زیادہ آپ حاضرین سے صرف یہ کہتے کہ لوگوں کو کیا معلوم کہ ہر شخص اپنی مجبوریاں بیان کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔" امام مالک کا یہ طرزِ بیان اگرچہ خاصا معنی خیز تھا مگر کوئی بھی آپ کے الفاظ کے پیچھے چھپے ہوئے دکھ درد کو نہ پہچان سکا تاہم اس حالت کے باوجود بھی کئی برسوں تک آپ نے درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔

آخری ایام میں امام مالک کی بیماری اور نقاہت اس حد تک بڑھی کہ تمام طبیبوں اور معالجوں نے اپنی مایوسی کا اظہار کر دیا آپ کی علالت کا سن کر مدینہ منورہ اور دیگر دور دراز کے شہروں سے بڑے بڑے عالم دین آپ کی تیمار داری کے لیے بیتاب ہو گئے۔ روایت ہے کہ زندگی کے آخری لمحات میں امام مالک کے گرد تقریباً ڈیڑھ سو کے لگ بھگ علمائے دین اداس و پریشان کھڑے تھے۔ ہر کوئی امام مالک کی آخری وصیت آخری الفاظ اور آخر کلمات سننے کے لیے بیتاب تھا۔

جب آپ نے اپنے گرد اپنے غم خواروں اور چاہنے والوں کا ہجوم دیکھا تو انتہائی نحیف آواز میں فرمانے لگے۔

خدا کا شکر ہے کہ جس نے کبھی مجھے رلایا اور کبھی ہنسایا' میں بھی اس کے حکم سے زندہ رہا اور اسی کی مرضی سے جان دے رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ میں آج تم لوگوں سے رخصت ہو کر اپنے رب کے حضور چلا جاؤں گا۔ اگر میرا آخری وقت نہ آتا تو میں ہرگز اپنا یہ راز ظاہر نہ کرتا کہ کافی عرصہ تک میں مسجد میں حاضر کیوں نہ ہوتا رہا چوں کہ دمِ آخر ہے اس لیے ضروری سمجھتا ہوں کہ لوگوں کے سامنے حقیقتِ حال بیان کروں تاکہ میرے بعد میرے مفسدین کو مزید بہتان طرازی کا موقع نہ ملے۔

پھر فرمانے لگے۔" لوگو! حقیقت یہ ہے کہ میں پچھلے کئی سال سے پیشاب نکل جانے کے مرض میں مبتلا تھا اور میں یہ گوارہ نہ کر سکتا تھا کہ بغیر وضو کیے اپنے آقا کی مسجد میں قدم رکھوں اور مجھے اس بات سے بھی شرم محسوس ہو رہی تھی کہ لوگوں کو اپنی بیماری کا حال بتا کر اپنے اللہ سے شکایت کروں۔"

اتنا کہنے کے بعد حضرت امام مالک نے اپنی آنکھیں بند کر لیں، آپ کے ہونٹوں پر آپ کے مرید نے جو آخری الفاظ سنے اُن کا مفہوم یہ تھا۔

"اے جہانوں کے پالنے والے تیرا مجھ پر یہ احسانِ عظیم ہے کہ تو نے اپنے عاجز اور گناہگار بندے مالک بن انس کو مدینہ کی خاک سے اٹھایا اور خاکِ مدینہ میں ہی ملا دیا۔"

ان الفاظ کے ساتھ علم و عرفان کا یہ سورج ابدی دنیا کے بادلوں میں پنہاں ہو گیا۔ انتقال کے وقت آپ کی عمر ۸۶ برس تھی اور آپ کو جنت البقیع میں دفن کیا گیا۔

حضرت سالم رضی اللہ تعالیٰ اپنے باپ عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "دو ہی آدمی قابلِ رشک ہیں ایک وہ جسے اللہ نے قرآن کا علم دیا اور وہ اُسے پڑھتا پڑھاتا ہے اور اس پر عمل کرتا ہے راتیں بھی اور دن میں بھی، دوسرا شخص وہ ہے جس کو اللہ نے مال دیا جسے وہ راتوں اور دن کے اوقات میں حق کے ساتھ جائز مصارف میں خرچ کرتا ہے (مسند احمد)

ریواڑی نامی بستی میں ایک پنڈت نے غوث علی کے بارے میں سُنا کہ وہ ایک خدارسیدہ بزرگ ہیں۔ اس لیے پنڈت کو اُن سے ملنے کا اشتیاق ہُوا۔ جب پنڈت کی غوث علی سے ملاقات ہُوئی تو پنڈت نے کہا: "جناب میں آپ کا ہاتھ دیکھنا چاہتا ہوں۔"

غوث علی نے پوچھا: "تُو میرے ہاتھ میں کیا دیکھے گا؟"

پنڈت نے جواب دیا: "میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ کیا آپ واقعی خدارسیدہ بندے ہیں یا محض دُنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے یہ ڈھونگ رچا رکھا ہے۔"

غوث علی نے یہ بات سُنی تو پنڈت کو اپنا ہاتھ دِکھا دیا۔ پنڈت نے جب غوث علی کا ہاتھ دیکھا تو بہت متاثر ہُوا اور یقین کے ساتھ کہنے لگا: "واقعی یہ ایک کامل بزرگ کا ہاتھ ہے۔"

جب پنڈت آپ کا ہاتھ دیکھ چکا تو آپ نے پنڈت سے کہا: "لاؤ اب مجھے اپنا ہاتھ دکھاؤ۔ شاید میں تمہارے بارے میں کچھ بتا سکوں۔"

پنڈت جی بولے "صاحب کیا آپ کو ہاتھ دیکھنا آتا ہے؟"

غوث علی شاہ نے جواب دیا: "تم مجھے اپنا ہاتھ تو دِکھاؤ پھر جو کچھ میں تمہیں بتاؤں گا اس سے اندازہ لگا لینا کہ مجھے ہاتھ دیکھنا آتا ہے یا نہیں۔" غوث علی نے پنڈت کا ہاتھ دیکھا اور فرمایا: "سنو پنڈت! ریواڑی میں تمہاری آمد کی وجہ اس علاقے میں کسی لڑکی کا عشق ہے اور تم چاہتے ہو کہ اس عشق میں کامیاب ہو جاؤ۔"

پنڈت یہ سُن کر تلملا اُٹھا: "تو کیا میں اس عشق میں کامیاب ہو جاؤں گا ——" پنڈت حیرانی سے غوث علی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

غوث علی نے جواب دیا: "معلوم نہیں مگر میں تمہیں ایک ترکیب بتا سکتا ہوں جسے اختیار کرلے سے شاید تم کامیاب ہو جاؤ۔"

پنڈت نے عاجزی سے کہا "آپ مجھے یہ ترکیب ضرور بتائیں۔ کیونکہ میں کامیابی حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ اور اب تو آپ ہی مجھے اپنا آخری سہارا نظر آ رہے ہیں۔"

آپ نے فرمایا "کسی درخت سے ایک شاخ توڑ کر لے آؤ۔" پنڈت فوراً بھاگا بھاگا گیا اور ایک شاخ لے آیا۔ آپ نے وہ شاخ لی اور اس پر دم کر کے فرمایا "یہ شاخ لے کر تم اس لڑکی کے گھر کی طرف چلے جاؤ۔ آپ نے اُسے تنبیہہ کی کہ اس بات کا خاص خیال رکھنا کہ جب تم یہ شاخ لے کر لڑکی کے گھر کی طرف جا رہے ہو تو راستے میں کسی جگہ گوز نہ نکلنے پائے ورنہ سارا اثر زائل ہو جائے گا اور تم کو کامیابی بھی حاصل نہیں ہوگی۔

پنڈت جی شاخ کو لے کر بہت خوش ہوئے اور دوڑتے ہوئے اپنی محبوبہ کے گاؤں کی طرف روانہ ہوگئے۔ جب پنڈت جی بھاگتے بھاگتے اپنی محبوبہ کے گاؤں کے قریب پہنچے تو انہیں ٹھوکر لگی اور وہ زمین پر ڈھیر ہو گئے۔ زمین پر گرنے کی دیر تھی کہ ان کی گوز نکل گئی۔ پنڈت جی بہت مایوس ہوئے اور فوراً غوث علی شاہ کے پاس دوبارہ حاضر ہوئے اور تمام ماجرا سنا دیا۔ پھر کہا "میاں جی اب میں کیا کروں۔"

آپ نے شاخ لے کر دوبارہ دم کیا اور فرمایا "اب تو دوبارہ وہی عمل کر اور یہ شاخ اپنی محبوبہ کے گھر کے صحن میں پھینک کر واپس آ جا۔ اللہ نے چاہا تو ضرور کامیاب ہو جائے گا۔"

پنڈت جی ایک بار پھر اپنا سامان سمیٹ کر محبوبہ کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے مگر راستے میں دوبارہ ٹھوکر کھائی اور گر پڑے۔ گرتے ساتھ ہی ان کی گوز نکل گئی۔ اسی دوران غوث علی ریواڑی چھوڑ کر جا چکے تھے۔ آپ نے فرمایا "دنیا دار تو دنیا داری ہی میں الجھا رہے۔"

آپ خدا تعالیٰ کے برگزیدہ بندے تھے۔ آپ نے ساری عمر سیاحت میں گزاری اور ہمیشہ تقویٰ اور صبر کی راہ پر چلتے رہے۔

ایک دفعہ آپ نے راج گڑھ نامی قصبے میں جانے کا ارادہ کیا۔ راستے میں ایک جنگل پڑتا تھا۔ جب آپ اس جنگل میں سے گزر رہے تھے تو آپ نے ایک گائے کو ندی کے قریب مگرمچھ کی گرفت میں دیکھا۔ گائے کے منہ سے رمبھانے کی آواز مسلسل نکل رہی تھی۔ آپ نے یہ منظر دیکھا تو بہت گھبرائے اور گائے کو رحم طلب نگاہوں سے دیکھا۔ مگرمچھ نے گائے کی تھوتھنی کو اپنے منہ میں دبا رکھا تھا اور اُسے اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ غوث علی کو گائے پر بہت رحم آیا اور انہوں نے گائے کے حق میں دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے: "یا اللہ! اس مگرمچھ کو سزا کیوں نہیں دیتا۔"

آپ کے دعا کرنے کی دیر تھی کہ ایک شیر جو پیاسا تھا اس ندی پر پانی پینے کے لیے آیا۔ شیر نے ابھی تھوڑا پانی ہی پیا تھا کہ اس کی نظر مگرمچھ اور گائے پر پڑی۔ شیر غراتا ہوا آگے بڑھا اور گائے کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچنا شروع کر دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں شیر اور مگرمچھ دونوں تھک گئے۔ شیر نے گائے کو چھوڑا اور چھلانگ لگا کر مگرمچھ کی پیٹھ پر جا بیٹھا۔ پھر شیر نے بڑی مضبوطی سے مگرمچھ پر پنجہ جما اور تیزی سے اچھلا۔ نتیجتاً شیر، مگرمچھ اور گائے سمیت دور جا گرا۔ گرتے ہی اس نے مگرمچھ پر طمانچوں کی بارش کر دی اور اس کے نتیجے میں مگرمچھ کا برا حال ہو گیا اور تھوڑی ہی دیر بعد مگرمچھ کا کام تمام ہو گیا۔ مگرمچھ مر گیا مگر گائے بے چاری بھی نہ بچی اور وہ بھی مر گئی۔

یہ سب دیکھ کر غوث علی کو اپنی ناقص دعا پر بہت رنج ہوا۔ پھر آپ نے آسمان کی طرف منہ کر کے

فرمایا: "یارب اللعالمین! میں نے مگر مچھ کو سزا دینے کی دعا ضرور کی تھی مگر میں یہ بھی چاہتا تھا کہ گائے بیچاری بچ جائے مگر وہ نہیں بچی۔ میں اپنی ناقص دعا پر بہت شرمندہ ہوں۔"
اس واقعہ کے بعد آپ نے جب بھی کوئی دعا مانگی تو اس کے ہر پہلو پر غور کرنے کے بعد مانگی۔

آپ نے اپنی ساری زندگی فقیرانہ انداز سے گزاری اور کبھی بھی کسی قسم کی طمع یا لالچ نہ کیا۔ سیاحت کے دوران آپ شہر بنارس میں پہنچ گئے۔ یہاں ان دنوں آپ کے ایک بھائی فیض الحسن رہا کرتے تھے۔ جو کہ تھانیدار کے منصب پر فائز تھے۔ آپ کی ملاقات اپنے بھائی سے ہوئی تو ان سے مل کر آپ کو بہت خوشی ہوئی اور روح کو قرار آیا۔ آپ کے بھائی نے کہا "غوث علی تم قیام کہاں کر رہے ہو؟"
آپ نے جواب دیا: "بھائی! فقیر کا ٹھکانہ اللہ کے گھر کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔"
اس پر فیض الحسن نے کہا: "لیکن میرے گھر کے ہوتے ہوئے ایسا نہیں ہو سکتا آپ کو میرے گھر میں قیام کرنا پڑے گا۔"
غوث علی نے فرمایا: "بھائی اس بات کا اتنا اصرار نہ کرو کیونکہ میں تمہارے گھر میں قیام نہیں کر سکتا۔"
فیض الحسن نے آپ کی ضد کے آگے سر جھکا دیا۔ اس کے بعد غوث علی ایک مسجد میں مقیم ہو گئے جس کے ایک طرف گنگا (دریا) تھی اور دوسری طرف شارعِ عام تھی۔ آپ کے بھائی نے مسجد میں حاضری دی اور کہا: "بھائی آپ نے میری ایک بات نہیں مانی مگر دوسری بات ضرور ماننا پڑے گی۔"
غوث علی نے کہا: "کیا بات ماننا پڑے گی۔" تب آپ کے بھائی نے کہا کہ کھانا آپ کو میرے گھر کا کھانا پڑے گا بھلے آپ میرے گھر نہ رہیں۔ آپ نے فرمایا: "ٹھیک ہے تم روزانہ کھانا گھر سے بھجوا دیا کرو میں کھا لیا کروں گا۔"
فیض الحسن نے اس پر ہی بات ختم نہ کی بلکہ پھر کہا "اور ایک بات بھی آپ کو ماننا پڑے گی کہ میں روزانہ آپ سے ملاقات کے لیے آیا کروں گا کہیں آپ مجھے دھتکار نہ دینا۔"
آپ نے فرمایا کہ بشوق آیا کرو میں تمہیں ضرور ملوں گا۔
اس کے بعد فیض الحسن نے اپنا یہ دستور بنا لیا کہ روزانہ آپ کو کھانا بھجوا دیا کرتے تھے اور خود بھی ملاقات کے لیے آ جایا کرتے تھے۔ غوث علی اس مسجد کے حجرے میں سارا سارا دن اور ساری رات زہد و تقویٰ کے لیے عبادت و ریاضت کرتے رہتے اور جب بھی دل میں اداسی پیدا ہوتی تو مسجد کی دیوار کے ساتھ بیٹھ کر آنے جانے والوں کا تماشہ دیکھتے رہتے۔ ایک دفعہ اسی طرح آپ مسجد کی دیوار کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے کہ آپ نے ایک حسین و مہ جبین لڑکی کو ایک طرف جاتے دیکھا۔ اس لڑکی کے ارد گرد اور بھی لڑکیاں تھیں وہ لڑکی سب سے زیادہ خوبصورت اور ان لڑکیوں میں ممتاز تھی۔ اس لڑکی کو دیکھ کر آپ کے ہوش و حواس جاتے رہے۔ آپ اس لڑکی کو دور تک دیکھتے رہے پھر تھکے تھکے مسجد میں اپنے حجرے کی طرف آ گئے۔ پھر آپ نے اپنے آپ سے سوال کیا: "کیا تو اسی لیے بنارس آیا تھا کہ ساری عمر کی کمائی اس چنچل، شوخ و شریر، نوخیز لڑکی پر نثار کر دے"۔ آپ کی اس حالت کو دیکھ کر مسجد کے ملا نے کہا۔ "حضرت خیریت تو ہے آپ کی طبیعت اچھی معلوم نہیں ہوتی۔"
آپ نے فرمایا: "طبیعت تو ٹھیک ہے۔ میں چلے میں بیٹھنے جا رہا ہوں اگر میرا بھائی مجھ سے ملنے آئے تو

کہہ دیجیے گا کہ میں چلہ کاٹ رہا ہوں اب میرے لیے کھانا بھی نہ بھیجا کرے۔ میں مسجد کے کھانے پر ہی گزارہ کر لوں گا۔" یہ کہہ کر آپ نفس کشی کیلئے حجرے میں بند ہو گئے۔ آپ اُس برہمن زادی کا تصوّر کر کے بیٹھ گئے اور خدا تعالیٰ سے گریہ زاری شروع کر دی۔ اس دوران آپ نے کھانے پینے کو روزہ رکھنے کو اس کے علاوہ نماز، سب کو بالائے طاق رکھ دیا اور صرف خُدا کے آگے جُھکے رہے۔ آپ بار بار یہی کہتے "میرے اللہ! میرے ساتھ یہ کیا ہو رہا ہے؟ کیا مجھ سے سب کچھ چھن جائے گا صرف ایک نازک اندام کی وجہ سے۔ یاخدا میں کیا کروں؟" مسلسل آٹھ دن کی گریہ زاری کے بعد آپ نے اس برہمن لڑکی کو دیکھا وہ مجسّم نہیں تھی بلکہ وہ اس لڑکی کا مکمل ہیولا تھا۔ وہ غوث علی کو دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ آپ نے اسکی طرف سے مُنہ پھیر لیا مگر وہ ہیولا دوسری جانب آکر کھڑا ہو گیا۔

غوث علی نے طیش میں آکر کہا۔ "تُو کیا چاہتی ہے؟" مگر لڑکی پر کوئی اثر نہ ہُوا اور مسلسل مسکراتی رہی پھر آپ نے اُس کو ڈانٹ دیا۔ "چل دفع ہو جا یہاں سے میں تجھ سے نفرت کرتا ہوں۔" اتنا کہنا تھا کہ وہ ہیولا فوراً غائب ہو گیا۔ آپ نے سکون کا سانس لیا اور خدا کا شکر ادا کیا۔ پھر اچانک دروازے پر کسی نے دستک دی۔ آپ نے پوچھا "کون ہے؟" جواب میں کسی مرد نوجوان کی آواز آئی۔ آپ نے اُٹھ کر دروازہ کھول دیا اور آپ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اُس نوجوان کے ساتھ وہی نازک اندام، پری چہرہ لڑکی کھڑی ہے۔ نوجوان کے ہاتھ میں شیرینی کی تھالی تھی۔ ان دونوں نے اندر آنے کی اجازت طلب کی۔ آپ نے اُنہیں اجازت دے دی۔ آپ نے نوجوان کو بغور دیکھا، وہ بھی بہت حسین تھا۔ آپ نے اُن دونوں سے فرمایا "تم کون لوگ ہو اور یہاں کس غرض سے آئے ہو؟"

لڑکی نے جواب دیا۔ "میں کوشلیا ہوں ایک برہمن کی بیٹی یہ میرا پتی ہے۔ ہمیں اولاد درکار ہے اس لیے آپ سے دُعا منگوانے کے لیے حاضر ہوئے تھے۔ امید ہے آپ ہمیں ناراض نہیں لوٹائیں گے۔"

آپ نے لڑکی سے پوچھا۔ "تیری شادی کو کتنا عرصہ ہُوا ہے؟"

"صرف ایک سال۔" لڑکی نے جواب دیا۔

آپ نے فرمایا۔ "پھر تُو فکر کیوں کرتی ہے؟"

لڑکی غوث علی کی طرف بغور اور مسلسل دیکھے جا رہی تھی۔ لگتا تھا وہ غوث علی سے کچھ اور بھی کہنا چاہتی ہے۔ غوث علی نے نوجوان سے کہا۔ "تم ذرا باہر جاؤ میں اس لڑکی سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔" نوجوان فوراً باہر چلا گیا۔

نوجوان کے جانے کے بعد آپ نے فرمایا۔ "ہاں اب بتا تو میرے پاس کیونکر آئی تھی اور کیا چاہتی ہے؟"

لڑکی نے کہا۔ "مجھے اولاد چاہیئے میاں جی۔"

آپ نے فرمایا۔ "میں نے کہا جو ہے کہ اولاد مل جائے گی تو اس میں پریشان کیوں ہوتی ہے۔"

لڑکی نے شرما کر جواب دیا۔ "میں اولاد ضرور چاہتی ہوں مگر اپنے شوہر سے نہیں۔"

آپ شش و پنج میں پڑ گئے۔ آپ نے محسوس کیا کہ آپ کے اندر ہیجان کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے آپ نے دل سے کہا۔ "غوث علی! اب بتا تُو کیا چاہتا ہے۔ لڑکی نے تو اپنے دل کی بات بتا دی ہے۔" اس پر آپ کے دل نے جواب دیا۔ "میں اس کو بیوی تو بنا نہیں سکتا کیونکہ میری عمر اس وقت پینتالیس سال ہے

یہ ابھی سولہ سترہ کی ہے۔"
نفس نے ورغلایا "اس کے علاوہ بھی تو کوئی صورت ہوگی" دل نے کہا "مجھے کوئی صورت منظور نہیں۔"
نفس نے دوبارہ کوشش کی "پھر کچھ نہیں تو بہن ہی بنالے" مگر دل نے کہا "نہیں ایسا تو ممکن ہی نہیں کیونکہ میں نے خدا کو پانے کے لیے اپنے حقیقی بہن بھائیوں کو چھوڑ دیا ہے۔ تو اس لڑکی کو میں کیسے بہن بنا سکتا ہوں۔" نفس نے کہا "ایسے اچھے موقعے بار بار نہیں آتے ابھی فائدہ اٹھالے۔" دل نے جواب دیا "بے شک بربادی کے ایسے اچھے مواقع بار بار نہیں آتے" اب میں ایک بڑی آزمائش سے گزر کر کامران ہوا۔"
لڑکی نے پوچھا "کیا سوچنے لگے میاں جی کچھ بولیے بات کیجئے۔"
آپ فوراً اپنی ہیجانی حالت سے آزاد ہوئے اور جا کر اس لڑکی کے شوہر کو اندر بلا لیا۔ اس کے بعد ایک تعویز انہیں لکھ کر دیا اور فرمایا "جا اللہ نے چاہا تو ضرور کامیابی ہوگی۔"
لڑکی نے حسرت سے آپ کی طرف دیکھا اور کہا "بس یا اور کچھ؟"
آپ نے فرمایا "بس اتنا ہی کافی ہے تم لوگوں کے لیے۔"
لڑکی کو قرار نہیں آرہا تھا بولی "اب کب آؤں؟"
آپ نے فرمایا "اب تمہیں یہاں آنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔"
لڑکی اس جواب سے مطمئن نہ ہوئی اور اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔ شوہر نے کہا "میاں جی! کیا دوبارہ آنے کی اجازت نہیں دیں گے۔"
آپ نے فرمایا "ویسے آنا چاہو تو آجایا کرو میں ملاقات کرلوں گا۔"
نوجوان نے کہا "ویسے آپ کا مستقل قیام کہاں ہے؟"
آپ نے فرمایا "میرا مستقل قیام کہیں بھی نہیں بس جہاں رل گئے رل گئے" لڑکی نے کہا "میاں جی میں آپ سے ایک بار اور ملنا چاہتی ہوں۔" آپ نے فرمایا "تیری مرضی ہے۔ جب چاہے آجانا اگر موجود ہوا تو مل لوں گا۔"
آپ نے ان دونوں کو رخصت کردیا مگر نفس نے آپ کا پیچھا نہ چھوڑا۔ "غوث علی! تو نے جس سے پیچھا چھڑایا ہے وہ اتنی جلدی تیرا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔"
آپ نے فرمایا "جب میں ہی اس کو منہ نہیں لگاؤں گا تو وہ میرا کیا بگاڑے گی۔" اس کے بعد آپ نے فوراً بنارس کو خیر باد کہہ دیا اور چالیس میل دُور جا کر قیام کیا۔
کچھ دنوں بعد مسجد کے آگے ایک یکہ آکر رُکا۔ اس میں سے دونوں میاں بیوی، جو بنارس میں غوث علی کے پاس آئے تھے، اُترے۔ لڑکی کا چہرہ بجھا ہوا تھا۔ اداسی، مایوسی، کرب و اضطراب سے وہ مجسمۂ حرماں و یاس بنی ہوئی تھی۔
آتے ہی کہنے لگی "میاں جی! آپ بغیر بتائے کیوں یہاں چلے آئے؟"
آپ نے فرمایا "بھئی میں نے کوئی تم لوگوں سے وعدہ تو نہیں کیا تھا کہ میں ہمیشہ بنارس میں ہی رہوں گا۔"
اس لڑکی نے آپ کو واپس بنارس چلنے کے لیے اصرار کیا۔ آپ نے فرمایا "یہ میرے سفر کی ایک اہم کڑی ہے اس کے علاوہ میں نے کچھ اہم کام یہاں پر نمٹانے ہیں اس لیے میں بغیر کام ختم کیے بنارس نہیں جاسکتا۔"

اس پر لڑکی نے کہا: "پھر آپ بنارس کب تشریف لائیں گے؟"
"میں جلد ہی تمام کام نمٹا کے آؤں گا۔ تم میرا انتظار کرنا میں بس جلد آجاؤں گا" اُن دونوں کو بھیجنے کے بعد آپ نے فوراً اس علاقے کو چھوڑ دیا اور لکھنؤ کی طرف روانہ ہو گئے۔

غوث علی کا شجرۂ نسب جناب شیخ عبدالقادر جیلانی سے جا ملتا ہے۔ عالمِ اسلام کے صاحبانِ جلال و جمال برِصغیر میں آمد پذیر ہو رہے تھے۔ تمام صوفیائے کرام دینِ اسلام کی ترویج و اشاعت کے لیے پورے برِصغیر میں بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ اسی طرح کا ایک خاندان بغداد سے روم کی طرف پھر روم سے خراسان میں اور پھر ملتان پہنچا۔ اس کے بعد ضلع بہاولپور کے ایک اُچ نامی قصبے میں اقامت اختیار کی۔ یہی خاندان خدا کے برگزیدہ بندے شاہ غوث علی کا تھا۔ اسی خاندان کے کچھ لوگ پنجاب کے مختلف علاقوں میں بس گئے۔ اسی خاندان کے ایک بزرگ حضرت سید ظہور الحسن نے ہندوستان کے صوبہ بہار کو چُنا اور وہاں کے ایک گاؤں استھوان میں اقامت پذیر ہوئے۔ آپ کے ایک چھوٹے بھائی بھی تھے جن کے متعلق آپ کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کیا پیشہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔ ایک دن چند لوگ ظہور الحسن کے چھوٹے بھائی سے ملنے آئے ظہور الحسن نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا اور اُن لوگوں کو کمرے میں بٹھایا۔ ظہور الحسن کی بیوی نے دروازے سے کان لگا کر سُنا تو معلوم ہوا کہ اُن کے دیور شادی وغیرہ کے موقعوں پر حال کھیلتے ہیں اور اس کے عوض ٹکے لیتے ہیں۔ بڑے بھائی نے چھوٹے بھائی کو سمجھایا کہ وہ ایسا نہ کرے مگر چھوٹے بھائی نے کہا: "میں شیخ عبدالقادر جیلانی کے حکم کی تعمیل کر رہا ہوں۔"

بھابی نے ناراضی سے کہا: "ہم شریف خاندان کے لوگ ہیں۔ تمہیں اس حال میں جو لوگ دیکھتے ہوں گے وہ کیا کہتے ہوں گے۔"

دیور نے کہا: "بھابی میں آپ لوگوں کو کیسے سمجھاؤں کہ میں شیخ جیلانی کے حکم کی تعمیل کرنے پر مجبور ہوں کیونکہ انہوں نے مجھ سے کہا ہے کہ میں چار ٹکے لے کر شادیوں میں حال کھیلا کروں۔ بڑے بھائی نے کہا "ہم کیسے مان لیں کہ تم شیخ جیلانی کے حکم کی تعمیل کر رہے ہو جبکہ تمہارے پاس اس کا ثبوت بھی نہیں ہے"

چھوٹا بھائی بولا۔ "آپ کو جلد اس بات کا ثبوت مل جائے گا۔ آپ شادیوں میں میرا حال ضرور دیکھا کریں —"

☆☆

شام کا وقت تھا شادی کی تقریب شروع ہو چکی تھی تمام مہمان موجود تھے۔ ظہور الحسن اپنی بیوی کے ساتھ اس تقریب میں شمولیت کے لیے آئے تھے۔ انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی کو حال کھیلتے ہوئے دیکھنا تھا۔ باراتیوں نے کھانا تناول کیا اور رات گئے قوالوں نے قوالی شروع کی۔ ظہور کے چھوٹے بھائی سامعین میں سب سے آگے بیٹھے تھے۔ خواتین بھی اس قوالی کو دیکھنے کے لیے پردے کی آڑ میں موجود تھیں قوالوں نے مولانا جامی کی نعت شروع کی۔

دلم پژمردہ آوارہ ز عصیاں یا رسول اللہ

لوگ لطف اندوز ہونا شروع ہوئے قوالوں نے جھومنا شروع کیا۔ اس کے ساتھ ہی ظہور کے چھوٹے بھائی پر وجد کی سی کیفیت طاری ہو گئی اور ان پر قوالی کے ساتھ ساتھ اس وجد کی کیفیت زیادہ سے زیادہ

اثر دکھاتی گئی۔ ظہور کے چھوٹے بھائی اب پوری طرح کھڑے ہو کر رقص میں مشغول ہو گئے۔ ان کے ساتھ دوسرے لوگ بھی احتراماً کھڑے ہو گئے مگر چند نوجوان لڑکوں نے رقص کرتے ہوئے انہیں چھیڑنا شروع کر دیا۔ ایک لڑکا آگے بڑھا اور انہیں چٹکی کاٹ لی۔ اس پر انہوں نے کہا "لونڈو یہ کیا بیہودگی ہے۔"

ظہور الحسن نے یہ سب دیکھا تو بیوی کو ساتھ لے کر فوراً گھر چلے آئے۔ جب رات گئے ظہور الحسن کے چھوٹے بھائی واپس گھر پہنچے تو آپ نے ان سے سخت لہجے میں بات کی اور کہا کہ اگر مجھے بابا شیخ جیلانی کا خیال نہ ہوتا تو میں تمہیں کبھی معاف نہ کرتا مگر یہ سب باتیں چھوٹے بھائی کے لیے بے اثر تھیں۔

اس کے کچھ دن ہی بعد ظہور الحسن کے چھوٹے بھائی کو ایک اور تقریب میں بلایا گیا۔ ظہور الحسن کو بھی اس تقریب میں مدعو کیا گیا تھا آپ اپنی بیوی کے ساتھ بعد میں گئے جبکہ آپ کے چھوٹے بھائی پہلے سے ہی وہاں پہنچ چکے تھے۔ طعام کے بعد باقاعدہ تقریب شروع ہونے والی تھی۔ کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ حال کھیلنے والا ظہور الحسن کا چھوٹا بھائی ہے۔

کچھ دیر بعد قوالوں نے شیخ سعدی کا کلام شروع کیا۔

بلغ العلیٰ بکمالہ ۔۔۔ کشف الدجیٰ بجمالہ

حسنت جمیع خصالہ ۔۔۔ صلو علیہ و آلہ

ظہور الحسن نے دیکھا ان کے چھوٹے بھائی وجد کی کیفیت میں ہیں اور مسلسل جھوم رہے ہیں قوالوں کی تالیوں میں بھی اس قدر تاثیر تھی کہ تمام سامعین مع نوشہ کے جھوم رہے تھے۔ پچھلی تقریب کی طرح آج پھر نوجوان لڑکوں نے ظہور الحسن کے چھوٹے بھائی کو اس وقت چھیڑنا شروع کر دیا جب وہ مکمل طور پر وجد کی کیفیت میں تھے اور کھڑے ہو کر رقص کرنے میں مصروف تھے۔ ظہور الحسن کو یہ سب کچھ بہت عجیب لگ رہا تھا۔ اس کے بعد اچانک نوشہ کو، جو سب سے آگے بیٹھا ہوا تھا، نہ جانے کیا خیال آیا کہ اس نے بھی رقص کرتے ہوئے ظہور الحسن کے چھوٹے بھائی کو چٹکی کاٹ دی۔ ایسا کرنے پر انہوں نے وجد ہی کی کیفیت میں نوشہ کو ڈانٹ دیا۔

"ارے یہ کیا لونڈیوں کی طرح چھیڑ رہا ہے۔" ان کے منہ سے یہ الفاظ نکلنے کی دیر تھی کہ فوراً ہی نوشہ نے اپنے بدن میں تغیر سا محسوس کیا پھر رفتہ رفتہ اسے یہ احساس ہوا کہ وہ مرد سے عورت کی جنس میں بدل چکا ہے۔ وہ بہت سٹپٹایا اور فوراً ہی اپنی ماں کے پاس پہنچا۔ ماں کو وہ دوسرے کمرے میں لے گیا اور شیروانی اتار کر ماں سے پوچھا "کیا آپ کو میرے جسم میں کوئی تبدیلی محسوس ہو رہی ہے۔"

ماں نے جب دیکھا تو وہ بھی حواس باختہ ہو کر بولی۔ "ارے بیٹا یہ کیا مذاق کر رہے ہو چلو فوراً یہ بہروپ اتارو اور اپنی اصلی حالت میں آؤ۔" مگر یہ مذاق تو تھا نہیں اس لیے نوشہ نے جلدی سے ماں کو سارا ماجرا سنایا۔ ماں نے جب یہ سب کچھ سنا تو فوراً نوشہ کے باپ کو بلا کر سارا ماجرا اسے کہہ سنایا پھر پریشانی سے کہنے لگی "اب کیا ہوگا؟"

نوشہ کا باپ بھی بہت حیران ہوا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہنے لگا۔ "اب میں کیا بتاؤں کہ اب کیا ہوگا۔" نوشہ زار و قطار رونے لگا۔ آخر باپ کچھ سوچ کر بولا "بیٹا تم اسی کمرے میں بند رہو میں ابھی اس کا علاج دریافت کر کے آتا ہوں۔ جب تک میں واپس نہ آؤں تم اس کمرے سے باہر نہ نکلنا۔" ماں بھی پریشانی سے بولی "خدا کے لیے کچھ کیجیے ورنہ میرے بیٹے کی زندگی تباہ ہو جائے گی۔"

نوشہ کا باپ کمرے سے باہر نکلا اور سید حا ظہور الحسن کے پاس پہنچ کر بولا۔" جناب میرے بیٹے کے لیے کچھ کریں وہ بہت بڑی مصیبت میں پھنس گیا ہے۔"

ظہور الحسن نے پوچھا "کیا ہوا آپ کے بیٹے کو؟"

باپ نے پورا واقعہ سنا دیا اور کہا "میں اس کو کمرے میں بند کر آیا ہوں اب آپ ہی اس کے لیے کچھ کر سکتے ہیں۔"

ظہور الحسن نے حیرانی سے کہا۔" میں تو اپنے چھوٹے بھائی کو ایسا نہیں سمجھتا تھا۔"

باپ نے فوراً کہا۔" آپ اپنے بھائی کے پاس اسی وقت چلئے اور اس سے میرے بیٹے کے واسطے کچھ کرنے کو کہیے۔"

ظہور الحسن نے جواب دیا "اگر میرا بھائی اتنا ہی بلند مرتبہ ہے تو چلئے میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں، اور حقیقتِ حال صحیح کرنے کی کوشش کرتا ہوں تاکہ ساری باتیں تمہارے سامنے ہی ہو جائیں۔"

باپ نے کہا "میں بھی یہی چاہتا ہوں کیونکہ میں ان کو مزید ناراض کرنا نہیں چاہتا اور یہ مناسب بھی ہو گا۔"

جب ظہور الحسن نوشہ کے باپ کے ساتھ اپنے چھوٹے بھائی کے پاس پہنچے تو انہوں نے کہا "خیریت تو ہے بھائی۔ کیسے آنا ہوا۔"

ظہور الحسن نے نوشہ کے باپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا "کیا تم ان صاحب کے بارے میں جانتے ہو؟"

انہوں نے جواب دیا۔"جی ہاں یہ نوشہ کے والد ہیں۔"

ظہور الحسن نے کہا "تب تو تم یہ بھی جانتے ہوگے کہ ہم لوگ تمہارے پاس کس لیے آئے ہیں۔"

چھوٹے بھائی نے حیرانی سے جواب دیا "میں کچھ نہیں جانتا کہ آپ لوگ میرے پاس کیونکر آئے ہیں۔"

ظہور الحسن نے ڈانٹ کر کہا۔" دیکھو مجھے بے وقوف مت بناؤ اور تجاہلِ عارفانہ سے کام مت لو۔"

چھوٹے بھائی نے سر جھکا لیا اور بولے "جس دوران یہ واقعہ رونما ہوا ہے اس وقت نہ تو میرے پاس زبان ہوتی ہے اور نہ ہی میرا اختیار ہوتا ہے۔ اس لیے جو کچھ نوشہ کے ساتھ ہوا اس میں میں بے قصور ہوں اور بے بس ہوں۔"

ظہور الحسن نے کہا "میں نہ تو خود زیادہ باتیں کروں گا اور نہ تمہیں اس کی اجازت دوں گا۔ تم فوراً نوشہ کے لیے علاج دریافت کرو۔" "قہر درویش بر جانِ درویش"۔

چھوٹے بھائی نے کہا "خیر میں جو کچھ کر سکتا ہوں ضرور کروں گا" پھر نوشہ کے باپ سے کہا "آپ لوگ ایک بار پھر مجلس منعقد کروائیں۔ اس کے علاوہ حال کھیلنے کے چار ٹکے بھی مرحمت فرمائیں۔ جب میں دوبارہ وجد کی کیفیت میں ہوں گا تو تب نوشہ سے کہیے گا کہ وہ مجھے چھیڑے شاید میرے منہ سے اس کے لیے کوئی اچھے الفاظ نکل جائیں جو اس کے لیے سود مند ہوں۔

باپ واپس گیا۔ مجلس دوبارہ منعقد کرائی گئی۔ پھر ظہور الحسن کے چھوٹے بھائی کو چار ٹکے پیشگی ادا کر کے بلوا لیا گیا۔ نوشہ کو ان کے پاس بٹھایا گیا۔ قوالی شروع ہوئی اور انہوں نے آہستہ آہستہ قوالی کے ساتھ ساتھ رقص کرنا شروع کر دیا۔ حتیٰ کہ ان پہ وجد کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ نوشہ نے جب یہ دیکھا تو دوبارہ ظہور الحسن کے چھوٹے بھائی کو چٹکی کاٹی۔ اس بار ان کے منہ سے یہ الفاظ برآمد ہوئے: "یہ کیا

لونڈوں کی طرح چھیڑ رہا ہے۔" اس کے ساتھ ہی نوشہ نے اپنے جسم میں تغیر محسوس کیا اور وہ ایک بار پھر نوجوان مرد بن چکا تھا۔

ظہور الحسن نے فرطِ مسرت سے کہا۔ "بھائی تم نے آج تک خود کو چھپائے کیوں رکھا؟"

چھوٹے بھائی نے نہایت عاجزی سے جواب دیا۔ "بھائی صاحب! میں کسی کا راز کیونکر فاش کر سکتا تھا۔"

اس کے بعد چھوٹے بھائی نے گھر آکر اپنا سامان اکٹھا کرنا شروع کیا۔

بڑے بھائی نے پوچھا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟"

چھوٹے بھائی نے جواب دیا۔ "میں اب یہاں نہیں رہ سکتا۔"

بڑے بھائی نے پوچھا۔ "پھر تم کہاں جاؤ گے۔"

اس پر چھوٹے بھائی نے جواب دیا۔ "میں یہاں سے دور کہیں بھی چلا جاؤں گا۔ کیونکہ یہاں پر میرا راز فاش ہو چکا ہے اس لیے میں اب یہاں کسی صورت بھی نہیں رہ سکتا۔"

بڑا بھائی چھوٹے بھائی کی ضد کے آگے جھک گیا اور اُسے جانے دیا۔ چھوٹا بھائی ظہور الحسن کے ایک بیٹے احمد علی کو بھی اپنے ساتھ لے گیا اور اُس کی پرورش اور تربیت پر خاص توجہ دی۔

احمد علی اپنے چچا کے ہاں پرورش پاتے گئے یہاں تک کہ وہ نوجوان ہو گئے۔ چچا کی نظر اور تربیت نے احمد علی کو بھی باکمال بنا دیا تھا۔ احمد علی نے انگریزی فوج میں ملازمت اختیار کر لی۔ اس ملازمت کے کچھ عرصہ بعد ہی انگریزی فوج کا رسالہ لکھنؤ سے نصیر آباد آ گیا۔ اس رسالے میں احمد علی بھی شامل تھے نصیر آباد چھاؤنی کے چاروں طرف بڑی بڑی جھاڑیاں تھیں۔ انگریز کرنل نے اپنے رسالے کو بتایا۔ "سپاہیو! مجھے یہاں آکر معلوم ہوا ہے کہ یہ چھاؤنی بہت خطرناک ہے۔ کیونکہ یہاں پر ایک موذی سانپ رہتا ہے۔ یہ جس کسی کو بھی کاٹتا ہے اس کی کھوپڑی پھٹ جاتی ہے اور وہ فوراً ہلاک ہو جاتا ہے۔" کرنل نے مزید کہا۔ "ہمیں اس معاملے میں نہایت احتیاط سے کام لینا ہوگا۔"

اس تنبیہ نے سب کو پریشان کر دیا۔ مگر اُن میں ایک مردِ کامل ایسا تھا جو یہ سب کچھ سُن کر ذرا بھی پریشان نہ ہوا تھا۔ وہ تھے احمد علی۔ احمد علی نے کرنل سے کہا۔ "آپ لوگ سانپ سے اتنا ڈرتے ہیں کہ اُس کے لیے اعلان کرنا پڑا ہے، حالانکہ میں اس سانپ سے بالکل نہیں ڈرتا۔" احمد علی نے مزید کہا۔ "اس فوجی رسالے میں میرا چچا زاد بھائی میر عباس بھی ہے وہ اس سانپ کو زندہ پکڑوا سکتا ہے اگر آپ کہیں تو میں اس کو اس کام کے لیے حکم دوں۔ اندھے کو کیا چاہیئے دو آنکھیں۔" کرنل فوراً راضی ہو گیا۔ کرنل اب بھی ہچکچا رہا تھا۔ بولا "کیا تمہارا بھائی واقعی سانپ کو پکڑ دے گا حالانکہ میں اس کے بارے میں خوفناک لرزہ براندام موذیوں کی بابت سنتا آیا ہوں۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔"

احمد علی نے جواب دیا۔ "جو بات اس وقت آپ کی سمجھ میں نہیں آ رہی اُس کو آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیجئے گا۔" اس کے بعد احمد علی نے اپنے چچا زاد میر عباس کو بلایا اور حکم دیا۔ "عباس علی! اس موذی سانپ کو جس نے اس چھاؤنی میں قیامت برپا کر رکھی ہے بلواؤ اور اسے قرار واقعی سزا دو۔"

میر عباس نے کہا۔ "اگر یہ آپ کہہ رہے ہیں تو میں ضرور اُس موذی کو سزا دوں گا۔"

کرنل نے کہا۔ "اگر آپ واقعی سچ کہہ رہے ہیں اور اُس سانپ کو بُلوا کر سزا دینے لگے ہیں تو میں چند

اور افسران کو بلوا لوں ؟
"کیوں نہیں ۔" احمد علی نے جواب دیا۔
کرنل نے تمام افسران کو بھی وہاں بُلا لیا اور میر عباس سے پوچھا "تمہیں سانپ کو بُلوانے کے لیے کِن کِن چیزوں کی ضرورت پیش آئے گی ؟"۔
میر عباس نے جواب دیا "ہمیں صرف ایک من دودھ ، ایک من چینی اور تقریباً سو کونڈے منگوا دیں ۔"
جب یہ اشیاء آگئیں تو میر عباس نے تمام کونڈوں میں دوُدھ بھرا اور ان میں چینی بھی ملا دی۔ اس کے بعد میر عباس نے ایک بڑا چینی کا پیالہ منگوایا اور اس میں بھی کچھ دوُدھ اور چینی ڈالی اور ایک ریشمی کپڑے سے ڈھانپ کر سامنے رکھ دیا۔ اس تمام کام سے فارغ ہو کر میر عباس نے بیٹھ کر بانسری بجانی شروع کر دی۔ پھر تمام لوگوں نے ایک عجیب تماشا دیکھا۔ تمام راستوں سے سانپ آنے شروع ہو گئے اور آہستہ آہستہ جمع ہو کر میر عباس کے سامنے پھن پھیلا کر بیٹھ گئے تھے۔
کرنل اور دوسرے افسران اِس عجیب تماشے سے خوف زدہ بھی تھے اور حیران بھی۔
جب سارے سانپ آچکے تو ایک اور سانپ آیا جو ان سب سانپوں سے مختلف تھا۔ اس کا قد تقریباً ڈیڑھ بالشت کا تھا اور اس کا رنگ بھی سنہری تھا۔ وہ ایک دوسرے بڑے سانپ پر سوار تھا۔ جب یہ سانپ میر عباس علی کے قریب آیا تو دوسرے سانپ کی پشت سے اُتر آیا اور پھن پھیلا کر عباس علی کو سلام کیا۔
میر عباس علی نے قریب پڑی ایک چوکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "جناب اس پر بیٹھ جائیں۔" عباس علی کا یہ کہنا تھا کہ یہ سانپ نہایت اطمینان سے چوکی پر بیٹھ گیا۔ دوسرے تمام سانپوں نے اِس ڈیڑھ بالشت کے سانپ کو سلام کیا۔
کرنل یہ سب دیکھ کر فرطِ حیرت میں مبتلا ہو گیا اور عباس علی سے پوچھنے لگا "یہ چھوٹا سانپ کون ہے ؟"
عباس علی نے اُسے بتایا "یہ اِن سانپوں کا بادشاہ ہے اس کو کلی ناس کہتے ہیں ۔" اس کے بعد عباس علی نے پیالے پر سے رومال ہٹا کر کہا "لو اب دودھ پیو ۔"
سانپوں کے بادشاہ نے جیسے ہی دودھ پینے کے لیے پیالے میں پھن ڈالا تو دوسرے سانپوں نے بھی کونڈوں سے دوُدھ پینا شروع کر دیا۔ کلی ناس بڑے ـــــ ناز و ادا کے ساتھ دودھ پی رہا تھا۔ وہ ایک گھونٹ پیتا پھر اِدھر اُدھر دیکھتا۔ جبکہ دوسرے سانپ لگاتار دودھ پینے میں مصروف تھے۔ جب کلی ناس دودھ پی کر فارغ ہوُا تو میر عباس نے اس کا منہ ریشمی رومال سے صاف کر دیا اور کہا "تمہیں پتا ہے میں نے تمہیں یہاں کیوں بلایا ہے ۔" اس وقت تمام سانپ دودھ پی چکے تھے۔ کلی ناس نے سر اٹھا کر نفی میں سر ہلا دیا۔ میر عباس علی نے کہا "ٹھیک ہے اگر تمہیں معلوم نہیں تو مجھ سے سنو، میں نے آپ سب کو اس لیے بُلایا ہے کہ آپ ہمارے چار آدمیوں کے قاتل کو پکڑ دیں۔ کیونکہ وہ ہمارے ہاتھ نہیں آ رہا۔" کلی ناس نے یہ سُنا تو اپنے قریب کھڑے سانپوں کی طرف دیکھا۔ پھر کچھ سانپ اپنی جگہ سے ہلے اور سانپوں کے اژدھام میں سے ایک سبز سانپ کو پکڑ کر لے آئے۔ اِن کے پیچھے پیچھے پندرہ بیس سانپ اور آگئے۔ یہ سانپ جو پیچھے آئے تھے فوراً عباس علی کے قدموں میں لوٹنے لگے۔ قاتل سانپ کو لایا جا چکا تھا۔
کرنل نے عباس سے پوچھا "یہ کیا تماشا ہے یہ سانپ تمہارے قدموں میں کیوں لوٹ رہے ہیں ۔"

میر عباس علی نے جواب دیا " جناب یہ مجرم سانپ کے رشتہ دار ہیں اور اس کی سفارش کے لیے ایسا کر رہے ہیں۔ یہ پھر عباس علی نے کہا کہ میں تم سب کی سفارش کو ــــ نہیں مانوں گا اور جیب سے ایک رومال نکال کر اس کو دو ٹکڑے کر دیا ۔ اس کے ساتھ ہی مجرم سانپ کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ اس کام سے فارغ ہو کر عباس علی نے تمام سانپوں کو حکم دیا کہ وہ جا سکتے ہیں۔ حکم سنتے ہی تمام سانپ وہاں سے روانہ ہو گئے۔

کرنل نے جب یہ کرامت دیکھی تو فوراً میر عباس کے پاس آیا اور کہا "تم نے اتنا بڑا عجیب وغریب کام کیا ہے کہ میں اس کے بدلے جو بھی انعام دوں وہ کم ہو گا۔"

اس پر عباس نے کہا " میں نے انعام کی لالچ میں یہ سب کچھ نہیں کیا۔" کرنل نے جب اصرار کیا تو میر عباس نے کہا " جناب میں نے کہہ دیا کہ میں انعام نہیں لوں گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو کوئی بھی اس واقعہ کو سنے گا وہ یہی کہے گا کہ انگریز کی فوج میں سپیرے بھی ملازم ہیں اور یہ بات میرے لیے بے عزتی کا باعث بنے گی۔" یہ سن کر کرنل نے مجبوراً انعام نہ دیا اور اس کا ذکر بھی نہ کیا۔

غوث علی شاہ انہی صاحب کرامت بندے میر عباس علی کے بھتیجا زاد بھائی احمد علی، جو بذات خود انگریز فوج میں تھے، کے بیٹے تھے۔ جب غوث علی کی پیدائش ہوئی تو کبھی کبھی ان کی والدہ (احمد علی کی بیوی) کو جذب وکیف کا دورہ پڑ جاتا ہے۔ اس لیے غوث علی کے دادا ظہور الحسن نے اپنی بہو کی اس کیفیت کی بنا پر بچے کو ماں کا دودھ پلانا مناسب نہ سمجھا اور انہیں ایسی عورت کی جستجو ہوئی جو ان کے پوتے کو دودھ پلا سکتی۔

کچھ دنوں بعد کسی نے ظہور الحسن کو اطلاع دی کہ رام سنہی نامی پنڈت کسی گاؤں میں اپنی بیوی کے ساتھ رہتا ہے۔ اس پنڈت کی بیوی نومولود کو دودھ پلا سکتی ہے۔ جب آپ نے ان دونوں کی نیکی اور شرافت کے بارے میں معلوم کروایا تو دونوں کی حیثیت کے متعلق معلوم ہوا کہ بہت مثالی ہے اس کے علاوہ وہ دونوں نہایت سنجیدہ اور شریف ہیں۔ ظہور الحسن کو جب اطمینان ہو گیا تو اپنی بہو کو اس بات پر راضی کر لیا کہ غوث علی کو اس پنڈت کی بیوی سے دودھ پلوایا جائے۔

ظہور الحسن نے اپنے پوتے کا نام خورشید علی رکھا جبکہ باپ (احمد علی) نے آپ کا نام ابوالحسن رکھا مگر ماں نے آپ کا نام غوث علی رکھا اور یہی نام آگے چل کر لوگوں میں مشہور ہوا اور جانا گیا۔

جب غوث علی چار سال کے ہوئے تو ان کی ماں نے بسم اللہ کرائی اور قرآن پاک کی تعلیم شروع کرائی۔ پنڈت جی نے آپ کو شاستر کی تعلیم دی۔ غوث علی کے والد احمد علی دہلی میں مقیم تھے۔ اسی دوران غوث علی نے نصف قرآن حفظ کر لیا۔ جب احمد علی کو اپنے بیٹے کے متعلق معلوم ہوا تو بہت خوش ہوئے۔ غوث علی نے فارسی کی تعلیم اپنی ماں سے ہی حاصل کی۔

غوث علی کی کم سنی میں ایک دفعہ آپ کے نانا محمد حیات ایک مشہور بزرگ حاجی لعل کی خدمت میں جا رہے تھے۔ غوث علی کی والدہ نے ان سے کہا " باوا جان! اپنے ساتھ غوث علی کو بھی لیتے جائیے اس پر بھی کچھ کرم ہو جائے گا۔"

محمد حیات نے کہا۔" مجھے اس کو حاجی لعل کے پاس لے جانے میں کوئی اعتراض نہیں بیٹی مگر اس کی عمر ابھی کیا ہے، صرف آٹھ سال۔"

ان دنوں غوث علی کے والد احمد علی بھی دہلی سے آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے بھی سسر سے کہا۔

"باداجان! مَیں خود بھی آپ کے ساتھ حاجی لعل کے پاس چلوں گا اور غوث علی کو بھی اُن سے ملواؤں گا۔"

اس اصرار کی وجہ سے مخدجہات خاموش ہو گئے۔ پھر تینوں حاجی لعل صاحب کی طرف چل دیے۔ جب یہ تینوں اُن مقبر بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اُنہوں نے نانا اور باپ دونوں کو نظر انداز کرتے ہوئے غوث علی کی طرف دیکھا۔ حاجی لعل غوث علی کو دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے اور آگے بڑھ کر اُن کا ہاتھ پکڑ لیا۔ باقی دونوں بزرگ بہت حیران ہوئے کہ یہ حاجی صاحب کو کیا ہو گیا ہے۔

غوث علی کا ہاتھ حاجی لعل کے ہاتھ میں تھا۔ حاجی لعل کہہ رہے تھے "صاحبزادے تم کہاں تھے۔ میرے پاس تمہاری ایک امانت پڑی ہوئی ہے اور مَیں اس امانت کو تمہارے حوالے کرنے کے واسطے تمہیں تلاش کر رہا تھا۔"

اس کے بعد کمرے کے سب دروازے بند کر دیے گئے اور وہاں موجود قوالوں نے قوالی شروع کر دی اس دوران کسی نے بتایا کہ حضرت حاجی لعل کسی کو اپنے اتنا قریب نہیں آنے دیتے مگر تمہاری قسمت بہت اچھی ہے کہ تمہیں حاجی لال نے اپنے پاس بٹھایا اور اپنی خاص توجہ تمہیں دے رہے ہیں۔

قوال نہایت انہماک سے قوالی سُنا رہے تھے۔ حاجی لعل حسین پر وجد کی سی کیفیت طاری ہو گئی پھر اسی کیفیت میں آپ نے غوث علی کی طرف خاص نظروں سے دیکھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے حاجی صاحب غوث علی پر اپنی نظرِ کرم کر رہے ہیں۔ اس کے بعد غوث علی کو بھی اپنی ہوش نہیں رہی۔ یہ سب دیکھتے ہوئے غوث علی کے نانا نے شکایتاً کہا۔

"حاجی صاحب یہ آپ نے کیا کر دیا ابھی اس بچے کی عمر ہی کیا ہے۔ آپ نے اتنی سخت نظریں اس بچے پر کیوں ڈالیں؟"

اس سے پہلے کہ حاجی صاحب کچھ کہتے احمد علی نے اپنے سُسر کو سمجھایا "باداجان! آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ ہمیں تو حاجی صاحب کا شکرگزار ہونا چاہیے کہ اُنہوں نے ہمارے بیٹے کو اتنی کم سنی میں اس دولت سے مالا مال کر دیا۔ میرا بچہ بہت خوش نصیب ہے۔"

غوث علی کو اسی غشی کی حالت میں وہ گھر لے گئے۔ گھر والے بہت پریشان ہوئے۔ یہ غشی تقریباً آٹھ روز تک غوث علی پر طاری رہی۔ جب نویں دن آپ کو ہوش آیا تو اُس وقت آپ بہت سنجیدہ ہو چکے تھے۔ چہرے پر جلال اور بُردباری کا راج تھا۔

اس واقعہ کے بعد غوث علی کا چرچا ہونا شروع ہو گیا۔ بعض بزرگوں نے کوشش کی کہ غوث علی کو بدنام کیا جائے تاکہ وہ ہم پر کسی طرح بھی اثرانداز نہ ہو۔ مگر اُن کی سب کوششیں ناکام ہوئیں۔

✠

انہی دِنوں کا واقعہ ہے کہ آپ نے ایک چمار کے لڑکے سے پوچھا "تم روزانہ کہاں جاتے ہو اور سارا سارا دن کیا کرتے رہتے ہو۔"

اُس لڑکے نے جواب دیا "مَیں جہاں بھی جاتا ہوں یا جو کچھ بھی کرتا ہوں، ایک دن اس کے متعلق ہر کسی کو معلوم ہو جائے گا۔"

آپ نے کہا "مگر اس میں رازداری کی کیا بات ہے؟"

چمار کے لڑکے نے کہا "مَیں نے کہہ جو دیا کہ یہ بات زیادہ دیر راز نہیں رہے گی۔"

آپ نے فرمایا "کیا تم یہ چاہتے ہو کہ یہ راز میں خود اپنی کوشش سے معلوم کر لوں۔"
آخر کار چار کے لڑکے نے ہار مان لی اور سارا ماجرا سنانے لگا "بات صرف اتنی ہے کہ میں ایک منتر سدھ کر رہا ہوں اور اس منتر کا جاپ میں دریا کے کنارے کھڑے ہو کر کرتا رہتا ہوں۔"
غوث علی نے جواب دیا "اچھا جس روز تم اپنا یہ منتر سدھ کر لوگے تو مجھے ضرور بتا دینا میں بھی تمہارے منتر کا کمال دیکھوں گا۔"
اس کے بعد آپ اپنے گھر چلے آئے۔ کافی دنوں کے بعد وہ لڑکا آپ کے گھر پہنچا اور بتایا کہ میں نے اپنا جاپ مکمل کر لیا ہے اگر دیکھنا چاہو تو میرے ساتھ آ جاؤ۔ غوث علی اُسی وقت لڑکے کے ساتھ چل دیئے۔ لڑکے نے دریا کے کنارے پہنچ کر چاول پکائے اور پھر ایک بکرے کو قربان کیا۔ پھر پوجا کرنے کے بعد منتر پڑھنا شروع کر دیا۔ جب اُس نے منتر مکمل کیا تو بہت خوش ہوا اور بولا "میاں جی بھگوان کی کرپا سے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔"
غوث علی نے کہا "میں کس طرح اس بات پر یقین کروں کہ تم کامیاب ہو گئے ہو؟"
لڑکے نے جواب دیا "میں جو کہہ رہا ہوں۔"
غوث علی نے کہا "جب تک میں سب کچھ اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھوں گا یقین نہیں کروں گا۔"
لڑکے نے کہا "چلو پھر تمہیں ابھی اپنے منتر کا تماشا دکھاتا ہوں۔"
لڑکے نے ایک کنکر زمین سے اُٹھایا کچھ پڑھا اور پڑھ کر اس کنکر کو درخت پر دے مارا۔ درخت کو فوراً آگ لگ گئی اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے راکھ ہو گیا۔ غوث علی نے کہا۔ "کیا تم کسی آدمی کو بھی راکھ کر سکتے ہو۔"
لڑکے نے جواب دیا "کیوں نہیں، میں ہر چیز کو جلا کر راکھ کر سکتا ہوں۔"
غوث علی نے لڑکے سے کہا "تم مجھے راکھ کر کے دکھاؤ تو مانوں۔"
لڑکے نے گھبرا کر کہا "اگر میں نے تمہیں جلا دیا تو تمہارے گھر والوں کو کیا جواب دوں گا؟"
آپ نے سینہ تان دیا اور کہا "تم اپنا کمال تو دکھاؤ ویسے بھی میں تو راکھ ہو جاؤں گا اور کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا۔"
لڑکے کو بھی اس بات پر غصہ آ گیا اور بولا "میاں جی آپ مجھے غصہ نہ دلائیں ورنہ آپ اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔"
آپ نے جواب دیا "تم بے فکر رہو مجھے کچھ نہیں ہو گا۔"
اس پر لڑکے کو طیش آ گیا اور اُس نے کہا "پھر تیار ہو جائیے "میاں جی" مرنے کے لیے۔"
پھر لڑکے نے کنکر پکڑ کر اس پر منتر پڑھنا شروع کر دیا۔ غوث علی اس لڑکے پر اپنی نظریں جمائے کھڑے تھے۔ جب لڑکے نے منتر مکمل کر لیا تو کنکر کو غوث علی کی طرف پھینکا۔ غوث علی نے اپنے گرد حصار کھینچ لیا۔ جس کی وجہ سے وہ محفوظ رہے مگر غوث علی نے اپنے دل میں سوچا کہ حصار میں قید ہو کر اس کے منتر سے بچے تو کیا بچے۔ آپ نے اس لڑکے سے کہا "تم دوبارہ منتر پڑھو میں پہلے حصار میں قید تھا اب میں آزاد تمہارے منتر کا سامنا کروں گا۔"
لڑکے نے دوبارہ منتر پڑھا اور کنکر غوث علی کی طرف پھینکا۔ کنکر غوث علی سے ٹکرایا اور واپس گیند

کی طرح اُچھل کر چمار کے لڑکے کو لگا اور وہ بے ہوش ہوگیا۔ غوث علی پریشان ہوگئے۔ اسی پریشانی کی حالت میں چمار کے پاس پہنچے اور اُسے سارا واقع سُنایا۔ چمار بے چارہ بھاگم بھاگ وہاں پہنچا۔ اُس کا لڑکا اوندھے مُنہ زمین پر پڑا تھا اور اُس کے جملہ مساموں سے خون جاری تھا۔ چمار لڑکے کو اُٹھا کر سیدھا غوث علی کے نانا کے پاس شکایت لے کر گیا۔ آپ کے نانا نے جب سارا ماجرا سُنا تو غوث علی کو فوراً طلب کیا اور اُن سے کہا۔ "غوث علی میں کیا سن رہا ہوں۔"

"نانا جان آپ نے جو سُنا ہے بالکل درست سُنا ہے" غوث علی نے جواب دیا۔ "یہ لڑکا اپنی قوت اور طاقت مجھ پر آزما رہا تھا جبکہ میں بھی اس کے مقابلے میں اپنی قوت آزما رہا تھا۔ اس میں میرا کوئی دوش نہیں ہے۔" یہ سب سن کر آپ کے نانا نے غوث علی کو کئی طمانچے رسید کر دیے۔ "تو نے شیخ عبدالقادر جیلانی کو کوئی معمولی ہستی سمجھ رکھا ہے اور وہ تیری کہاں کہاں مدد کرتے رہیں گے۔"

اس کے بعد انہوں نے سورۃ المزمل پڑھنا شروع کر دی۔ پڑھتے جاتے اور چمار کے لڑکے پر دم کرتے جاتے۔ یہ عمل کافی دن تک جاری رہا تب کہیں جا کر وہ لڑکا درست ہوا اور بالکل اچھا ہوگیا۔

✻

غوث علی نے بہت سی یگانۂ روزگار ہستیوں سے علم دینی حاصل کیا۔ ان نیک ہستیوں میں مولوی محمد اسمٰعیل نے آپ کو کافیہ پڑھائی۔ مولوی شاہ اسحاق اور شاہ عبدالعزیز سے آپ نے حدیث کا درس سیکھا۔ اس کے علاوہ باقی تمام علوم مولوی فضل امام خیر آبادی سے حاصل کیے۔

ایک دن احمد علی اپنے بیٹے کو شاہ فدا حسین کے پاس لے گئے۔ شاہ فدا حسین رسول شاہی کہلاتے تھے۔ غوث علی نے اُن کی خدمت میں نذرانے کے طور پر ایک روپیہ پیش کیا۔ فدا حسین نے ایک چھوٹی سی آیت پڑھی اور غوث علی سے وہ نذرانہ لے لیا اس وقت آپ کی عمر ۱۰ سال تھی۔

اس کے بعد فدا حسین نے اپنے ایک مُرید توکل شاہ سے کہا۔ "ایک چھڑا ایک کنٹھا اور ایک سبز کاہی رومال فوراً لے آؤ۔"

جب یہ چیزیں آگئیں تو فدا حسین نے سبز کاہی رومال غوث علی کے سر پر رکھ دیا اور باقی دونوں چیزیں اُسے دیتے ہوئے کہا۔ "اب جا خدا تیرے تمام معاملات درست کرے۔"

✻

اس کے بعد غوث علی کو سیاحت سوجھی اور پھر آپ نے ساری عمر سیاحت میں ہی گزاری۔ جب آپ آگرے پہنچے۔ ان دنوں وہاں کے شاہ ابوالبرکات کو بڑی شہرت حاصل تھی۔ اس لیے آپ اُن کے پاس اکثر تشریف لے جاتے۔ انہوں نے بھی غوث علی پر اپنی خاص توجہ فرمائی۔

ایک دفعہ ایک موٹا تازہ بیل شاہ صاحب کے سامنے سے گزرا تو غوث علی نے کہا۔ "شاہ صاحب اس بیل پر اپنی توجہ فرمائیں۔"

شاہ صاحب نے بیل کو نظر بھر کر دیکھا تو بیل کا دل پھٹ گیا اور اُس کے ہر بُن مو سے خون جاری ہوگیا اور بیل مرگیا۔ بیل کے مالک نے عاجزی کے ساتھ شاہ صاحب سے عرض کی "حضرت میری آمدنی کا صرف یہی ذریعہ تھا۔ میں تو اب کہیں کا نہیں رہا۔"

شاہ صاحب نے فرمایا۔ "ذرا بیل کے گوشت کو سونگھو۔" جب اُس آدمی نے بیل کے گوشت کو سونگھا،

تو اس میں سے بدبو کی بجائے بہت اچھی خوشبو آ رہی تھی اور سارا بیل خوشبو سے مہک رہا تھا۔ اُس آدمی نے گوشت کو بہت سے امیر لوگوں میں بانٹ دیا اور اسے اتنے نذرانے ملے کہ اُس آدمی نے بہت سے بیل خرید لیے۔ مگر یہ بات غوث علی کو پسند نہ آئی۔

آپ کچھ دن مزید آگرے میں رہے پھر وہاں سے گولیار کی طرف چل دیے۔ راستے میں کسی گاؤں سے گزر ہُوا۔ اس گاؤں میں تقریباً تمام لوگ ہندو تھے۔ آپ کو کسی مسلمان کی تلاش تھی تاکہ رات بسر کر سکیں۔ کسی شخص نے آپ کو ایک تیلی کا پتہ بتایا۔ آپ فوراً اُس تیلی کے گھر پہنچے اور رات بسر کرنے کے واسطے اس شخص سے کہا۔

تیلی نے کہا "میاں جی! مجھے خوشی ہے کہ آپ جیسے برگزیدہ بندے نے مجھے خدمت کا موقع دیا ہے مگر مجھے افسوس ہے کہ میرے گھر میں بالکل جگہ نہیں ہے۔ ویسے اگر آپ مجبور کرتے ہیں تو رہ جائیے میرے گھر میں۔"

غوث علی اس گھر میں رہ گئے مگر اُنہیں جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ اس گھر میں واقعی نہیں رہ سکتے۔ اس لیے اُنہوں نے تیلی سے کہا۔ "تمہارے گھر کے سامنے درخت کے نیچے ایک چبوترہ ہے اگر تم اجازت دو تو مَیں وہاں لیٹ جاؤں۔"

تیلی نے جواب دیا "مجھے تو کوئی اعتراض نہیں مگر چوکیدار نے اگر آپ کو تنگ کیا تو آپ کو تکلیف ہوگی۔"

آپ نے جواب دیا۔ "اگر اُس نے مجھے تنگ کیا تو مَیں اُس کو کہہ دوں گا کہ مَیں تیلی کا رشتے دار ہوں۔" یہ کہتے ہُوئے آپ کے دل کو بہت رنج ہُوا۔ اس کے بعد آپ چبوترے پر جا کر لیٹ گئے۔ رات کو جب چوکیدار نے آکر آپ کی بابت پوچھا۔ آپ نے اُسے تیلی کے پاس بھیج دیا۔ چوکیدار تیلی کو ساتھ لے کر چبوترے پر پہنچا اور تیلی سے پوچھا "کیا یہ تیرا مہمان ہے۔ مجھے تو تمہارا مہمان نہیں لگتا۔ کیونکہ اس کے اور تیرے حُلیے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ مجھے تو لگتا ہے یہ آدمی دہلی سے آیا ہے۔"

غوث علی نے جواب دیا "تم ٹھیک کہتے ہو۔ مَیں واقعی اس آدمی کا مہمان نہیں بلکہ یہ سب اس نے میرے کہنے پر کیا ہے اور مَیں دہلی ہی سے آیا ہوں۔" چوکیدار نے یہ سُنا تو بہت خوش ہُوا اور آپ کو اپنے گھر لے گیا۔ راستے میں چوکیدار سے تفصیلی تعارف بھی ہُوا۔ چوکیدار نے بتایا "مَیں بھی دہلی کا رہنے والا ہوں۔" چوکیدار نے گھر پہنچ کر آپ کو کھچڑی پکا کر کھلائی اور پھر آپ سے نمازِ تہجد کی ترکیب پوچھی۔ غوث علی نے اس کو نماز کی ترکیب بتا دی۔ چوکیدار آپ کی تین دن تک خاطر مدارت کرتا رہا۔ اس کے بعد آپ گاؤں چھوڑ کر آگے روانہ ہو گئے۔

⁂

آپ نے اپنی سیاحت کا یہ سلسلہ جاری رکھا اور بّرِصغیر سے باہر بھی گئے۔ آپ مدینہ منوّرہ اور مکّہ معظمہ بھی تشریف لے گئے۔ غوث علی نے لاتعداد بزرگوں سے فیض حاصل کیا۔ آپ نے اپنی آخری عمر میں پانی پت میں قیام کیا۔ آپ نے ساری عمر شادی نہ کرائی اور آپ نے فرمایا ہے کہ دُنیا میں تین فساد کی جڑ ہیں۔ ایک زن، دوسرا زر اور تیسرا زمین۔ پھر فرمایا۔ "زن تو ہم نے اختیار ہی نہیں کیا، زمین اپنے پاس ہے نہیں اور باقی رہا زر تو وہ اِدھر سے آیا اور اُدھر چلا گیا۔"

ایک بار آپ نے توحید پر زور دیتے ہوئے فرمایا "توحید کی چار قسمیں ہیں۔ اوّل توحیدِ شریعت۔ یعنی

اس بات کا یقین کرنا کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات سے قدیم ہے۔ دوم توحیدِ طریقت۔ یعنی جمیع موجودات ذات واحد میں دیکھنا۔ سوم توحیدِ حقیقت، یعنی ماسوائے اللہ کے ہر کسی کی نفی۔ یہاں تک کہ اپنے و کا ادراک بھی نفی ہو جائے۔ چہارم توحیدِ معرفت۔ یعنی توحید ازلی۔ ذاتی اور قدیمی۔ جب کوئی عارف مق مراتب سیرالی اللہ کے عروج سے حاصل کرتا ہے تو وہ مقام عین الجمع میں پہنچ جاتا ہے۔ اس وقت وہ خو سے بے خود ہو جاتا ہے۔

آپ نے ہمیشہ سوال کرنے کو بُرا عمل قرار دیا ہے۔ آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ غیر اللہ سے التجا انتہائی ذلیل فعل ہے۔ آپ نے اسلام کی بابت فرمایا ہے کہ اس کی ترقی کا دارو مدار اتفاق الوالعزمی غیرت پر ہے۔

آپ شاندار سیاح اور کامل بزرگ جیسی عجیب و غریب زندگی گزار کر ۲۶ ربیع الاول ۱۲۹۷ھ میں اس دُنیا فانی سے رخصت ہو گئے آپ نے ۸۰ سال کی عمر پائی اور آپ کا مزار پانی پت میں واقع ہے۔

ایثار

جب یہ سوال زیرِ غور تھا کہ خلیفۃ المسلمین کا وظیفہ کیا ہونا چاہئے تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے دریافت فرمایا کہ مدینہ میں ایک مزدور کی کم از کم اُجرت کیا ہے؟ وہی اُجرت آپ نے اپنے لئے بطورِ وظیفہ مقرر کر لی۔ رفقا میں سے کسی نے آپؓ سے کہا: "اتنے کم روزینے میں آپ کا گزارہ کیسے ہوگا؟" تو آپ نے فرمایا: "اس میں میرا گزارہ اسی طرح ہوگا جس طرح ایک مزدور کا گزارہ ہوتا ہے۔ اگر گزارہ نہ ہوا تو میں اس مزدور کی اُجرت بڑھا دوں گا۔"

ایک دن کھانے کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنی بیویؓ سے کہا: کیا کوئی میٹھی چیز نہیں ہے؟ انہوں نے فرمایا: "بیت المال سے جو راشن آتا ہے اس میں میٹھی کوئی چیز نہیں ہوتی"۔ چند دنوں کے بعد آپؓ نے دیکھا کہ کھانے میں حلوہ بھی موجود ہے۔ آپ نے بیوی سے کہا: "تم نے تو کہا تھا کہ ہمارے راشن میں میٹھی چیز نہیں آتی آج یہ حلوہ کیسے پک گیا۔" انہوں نے جواب دیا: "میں نے جو اُس دن محسوس کیا کہ آپ کو میٹھی چیز کی خواہش ہے تو میں نے یوں کیا کہ راشن میں جتنا آٹا روزانہ آتا تھا اُس میں سے مٹھی بھر آٹا الگ رکھتی گئی۔ آج اتنا آٹا جمع ہو گیا کہ اُس کے بدلے میں نے بازار سے کھجور کا شیرہ منگوایا اور اس طرح یہ حلوہ پک گیا۔" آپؓ نے شوق سے تناول فرمایا اور بیوی کا شکریہ ادا کیا۔ کھانے کے بعد آپؓ سیدھے بیت المال کے مہتمم کے پاس پہنچے اور فرمایا: "ہمارے ہاں راشن میں جس قدر آٹا جاتا ہے آج سے اُس میں سے ایک مٹھی کم کر دینا کیونکہ ہفتہ بھر کے تجربے نے بتایا ہے کہ ہمارا گزارہ مٹھی بھر کم آٹے میں بھی ہو جاتا ہے۔"

سیہون پر ہندو راجہ جیبسر جس کا لقب "چوپٹ" تھا کی حکومت تھی۔ اُس کے ظلم و استبداد نے
ں کی زندگیوں کا قافیہ تنگ کر رکھا تھا۔ ہر شخص دل سے راجہ کا مخالف تھا۔ مگر مخالفت میں آواز اُٹھانا
ی کے بس میں نہ تھا ——— رعایا اس کے ظلم کی بھٹی میں چُپ چاپ جل رہی تھی۔ لوگوں کو
بس اور لاچار دیکھ کر ایک درویش جس کا نام طالب سکندر تھا وہ ایک نعرہ مستانہ لگایا کرتے تھے
را مرشد لعل سائیں آرہا ہے۔" ان مجذوب درویش کا قیام اگرچہ کسی ایک جگہ نہ تھا لیکن اکثر ان کو سیہون
ریف میں دیکھا جاتا تھا۔ اِن کا معمول تھا کہ قلعہ کے باہر جا کر کھڑے ہو جاتے اور اپنا قلندرانہ نعرہ لگاتے۔
واحد فلک شگاف نعرہ تھا جو نہ صرف راجہ جیبسر کو مشتعل کرتا بلکہ خوفزدہ بھی کر دیتا تھا۔ اور لوگوں کے دلوں
ے دُعا اُٹھتی کہ خدا کرے ہمارا نجات دہندہ لعل سائیں جلد آ جائے اور ہمیں ستم آگیں زندگی سے چھٹکارا
دلائے۔ راجہ جیبسر نے ایک روز طالب سکندر درویش کے نعروں سے تنگ آ کر ایک ظالم ہندو قصاب
کو حکم دیا کہ وہ کسی بہانے سے اس درویش کو ٹھکانے لگا دے۔ مگر خدا نے اس قصاب کو ایسا کرنے
ی مہلت ہی نہیں دی۔ ایسا کرنے سے پہلے وہ خود ہی مر گیا اور راجہ کو سلطان ناصر الدین کے مقرر کردہ حاکم
لغ خان نے قتل کر کے ۶۴۹ھ میں سیہون شریف میں اپنی حکومت قائم کر لی۔

یہ وہی زمانہ تھا جب حضرت شہباز قلندرؒ سیہون میں تشریف لائے اور یہ آپ کی آمد کا اعجاز تھا کہ سیہون
کے باسیوں کو ہندو راجہ کے ظلم سے سکون و آرام نصیب ہوا۔ اور آپ کی برکت سے فضا اسلام کی خوشبو
سے معطر ہو گئی اور آپ نے کفرستانِ ہند کو اپنی ضیا باریوں سے منور کیا۔

حضرت لعل شہباز قلندرؒ آذربائیجان (آرمینیا) کے ایک گاؤں مروند میں پیدا ہوئے۔ تذکرہ نویسوں اور
ریخ نگاروں کے مطابق آپ کا سن ولادت ۵۳۸ھ ثابت ہوتا ہے۔ آپ کا حقیقی نام سید عثمان تھا
ن آپ نے لعل شہباز قلندرؒ کے نام سے شہرت پائی۔ آپ کے والدِ گرامی کا نام سید کبیر الدین تھا۔ آپ

کا سلسلۂ نسب مختلف واسطوں سے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے جا ملتا ہے۔ بعض کتابوں اور تاریخ نگاروں نے آپ کے والد محترم کا نام سید ابراہیم بھی بتایا ہے۔ بعض نے سید ابراہیم کبیرالدین بتایا۔ آپ کے والد کو ابراہیم جوابی بھی کہا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ مسائل غسل و وضو پر طالب علموں کی ایک جماعت نے آپ پر بہت سے سوال کیے جن کے آپ نے جوابات انتہائی سہل اور جامع لفظوں میں دیے جس کی بنا پر آپ جوابی کہلانے لگے۔ حضرت شہباز قلندر کے والد کو سیر و سیاحت کا بڑا شوق تھا۔ آپ حضرت امام حسینؑ کے مزارِ اقدس کی زیارت کے لیے کربلا معلیٰ تشریف لے گئے اور وہاں سے معرفت و ولایت کے اسرار و رموز میں آگہی حاصل کی۔

عبادت و ریاضت میں سید کبیرالدین اس قدر مشغول رہے کہ انھوں نے شادی کا خیال ترک کر دیا لیکن ایک رات خواب میں اُن کو حضرت شہباز قلندر نظر آئے اور انھوں نے عرض کی "بابا! مجھے باہر نکالو۔" اس پر آپ نے جواب دیا "کیا جنت سے باہر نکلنا افضل ہے۔" عرض کی "ہاں دنیا میں ظہور ہونا احسن ہے۔" اس غیبی اشارہ کے بعد سید کبیرالدین نے شادی کا ارادہ کیا۔ ادھر مروند کے حاکم سلطان کو باطنی طور پر حکم ملا کہ اپنی بیٹی کی شادی سید کبیرالدین سے کر دو۔ چنانچہ اس طرح سید کبیرالدین کی شادی ہوئی اور یوں حضرت لعل شہباز قلندر رہبرِ روحانی مولود ہوتے۔

خداوندِ عالم نے آپ کو حسن و جمال سے اس قدر نوازا تھا کہ آپ کی پیشانی کے نور کے آگے چاند کی چمک مات تھی۔ آپ بلا کے ذہین تھے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے والدِ بزرگوار سے حاصل کی۔ سات سال کی عمر میں آپ نے قرآن مجید حفظ کر لیا تھا۔ عربی اور فارسی میں آپ نے بہت کم عرصہ میں خاصی مہارت حاصل کر لی۔ آپ کی والدہ صاحبہ آپ کی اوائل عمری میں وفات پا گئیں اور والد کا سایہ بھی اُن کی وفات کے کچھ عرصہ کے بعد آپ کے سر سے اُٹھ گیا۔

آذربائیجان اور تبریز سے ۴۰ میل کے فاصلہ پر مروند واقع ہے۔ اس میں ایک چھوٹا سا قلعہ اور خوبصورت سی مسجد ہے اور مروند کو چہار اطراف سے باغات نے گھیرا ہوا ہے۔ انہی باغات، مسجد اور دوسری جگہوں پر روحانیت کے ایک پروانے نے اپنی زندگی کے ابتدائی دن گزارے اور ریاضت و ولایت کی منازل طے کرتا ہوا ایک دن شہباز قلندر کے نام سے چمکا جس کی ضوفشانی سے آج بھی سیہون شریف منور اور تاباں ہے۔

ابتدائی تعلیم کی تکمیل کے بعد آپ نے اپنا قدم گھر سے باہر نکالا۔ آپ کی ملاقات سیاحت کے دوران اس زمانے کے بادشاہ غیاث الدین بلبن سے ہوئی۔ وہ عارفین اور عالموں کا بڑا قدردان تھا۔ قیام کے دوران سلطان بلبن نے آپ کے علم و حکمت سے متاثر ہو کر آپ کو بیش بہا تحائف دیے اور یہیں قیام کرنے کی درخواست بھی کی۔ مگر آپ تحصیلِ علم کے لیے ابھی آگے جانا چاہتے تھے اس لیے آپ نے شہنشاہ کی پیش کش قبول کرنے سے معذوری ظاہر کی۔

آپ کو کسی مرشد کامل کی تلاش تھی۔ سیاحت کے دوران آپ مشہد میں امام موسیٰ کاظم کے مزار پر پہنچے۔ یہیں پر ہی آپ کی شیخ جمال مجرد کے مرید کامل بابا ابراہیم سے ملاقات ہوئی۔ بابا ابراہیم کو آپ کے پہنچنے سے پہلے ہی آپ کی آمد کے متعلق باخبر اور بیعت کر لینے کا حکم دے دیا گیا تھا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بابا ابراہیم کو خواب میں سید عثمان (شہباز قلندر) کو سُرخ لباس میں ملبوس دکھایا اور حکم دیا کہ اس خوبرو نوجوان کو اپنی بیعت

لو۔اس خواب کے بعد جب حضرت لعل شہباز، بابا ابراہیمؒ کی خدمت میں پہنچے تو آپ نے انہیں فوراً
ان لیا اور فرمایا "سیّد عثمان! آؤ میں تمہارا ہی منتظر ہوں۔ تمہیں قلندری طریقت کے مطابق مرید کرنے
بھے حکم ربّی ملا ہے۔" اس کے بعد لعل شہباز کو قلندری طریقت کا مرید کیا گیا۔ آپ نے مُرشد کی خدمت میں
علوم ظاہری و باطنی کی تکمیل کی۔ روحانیت، ولایت اور قلندریت کی معرفت اگیں منازل طے کرکے
ت کے اسرار و رموز سے بہرہ ور ہوتے۔ آپ نے مرشد کی از حد خدمت کی اور حقِ مریدی ادا کیا۔
آپ کے مُرشد بابا ابراہیم نے آپ کو ایک گلوبند عطا فرمایا جو کہ اُن کو اُن کے پیر صاحب سیّد جمال مجرّد
ملا تھا۔ یہ گلوبند اس وقت بھی درگاہ حضرت لعل شہباز میں موجود ہے۔ ہر سال عرس کے موقع پر
ین کو اس کی زیارت کرائی جاتی ہے۔ اس گلوبند سے حضرت لعل شہباز کو بڑی محبت تھی۔ اس میں ان
پنے مُرشدِ عالی کی تصویر نظر آتی تھی۔ آپ نے اس کو ہمیشہ عقیدت سے اپنے پاس رکھا۔ اس کے علاوہ
خرقہ خلافت اور ایک عصا عطا کی گئی۔ یہ عصا جو کہ بادام کی لکڑی کی ساختہ ہے اور آج بھی آپ
دربار میں محفوظ و موجود ہے۔ اس عصا کے متعلق راوی بیان کرتے ہیں کہ حضرت امام زین العابدینؓ
عصا کو اپنے دست رحمت میں رکھا کرتے تھے۔ اور ان کے بعد یہ مختلف اکابرین و اولیائے کرام کے
طوں سے حضرت بابا ابراہیم تک پہنچی پھر اُن کے بعد حضرت لعل شہباز کو ملی۔

⁂

آپ کے دادا پیر حضرت سیّد جمال مجرّد کے متعلق سیّد نصیر الدین محمود المعروف چراغ دہلوی رحمتہ اللہ علیہ
ایک لمبے عرصے تک مفتی کے عہدہ پر فائز رہے۔ دقیق سے دقیق مسئلہ اور کٹھن سے کٹھن الجھن آن واحد میں
فرمادیا کرتے تھے۔ آپ کا مطالعہ خاصا وسیع تھا۔ آپ کے کُتب خانے میں اعلیٰ سے اعلیٰ کُتب کا ایک خزانہ
تھا۔ اس عمیق مطالعہ اور تجسس و تحقیق کی بدولت ہی آپ پر جذب کی کیفیت طاری ہوگئی۔ آپ نے مجذوبوں
ی وضع قطع اختیار کرلی۔ ڈاڑھی ترشوالی اور کفن پہن کر ایک طویل عرصہ تک ایک شکستہ قبر میں سکونت اختیار
رکھی۔ آپ کا معمول تھا کہ آپ ہر وقت آسمان کی طرف غور سے دیکھتے رہتے تھے۔ حضرت بہاالدین ذکریا
فرماتے ہیں "سیّد جمال مجرّد کی مجذوبیت پر اُن کا اپنا کوئی اختیار نہ تھا۔ یہ بے خودی کی کیفیت ان پر ہاتفِ
نے خود طاری کی تھی۔"

⁂

حضرت لعل شہباز کا سلسلۂ طریقت بابا ابراہیم اور سیّد جمال سے حضرت امام زین العابدین اور حضرت علیؓ
ہوتا ہوا سرورِ کائناتؐ تک جا پہنچتا ہے۔ کئی تذکرہ نگاروں نے آپ کو حضرت غوث الاعظمؒ سے منسوب
ہے اور اس طرح آپ کو قادریہ سلسلے کا بزرگ کہا ہے۔
مجذوبیت و قلندری دراصل سُکر کا مظہر ہے۔ اہلِ سُکر و جذب رسوم و عادات کی نفی کرتے ہیں۔ ریاء اور ر
تے ین پر ضرب کاری لگاتے ہیں۔ حُسنِ نیت اور اخلاص کا پرچار کرتے ہیں۔ اسی طرح قلندری، جذب اور
کی دو رُخی حیثیت اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ تصوف کی تاریخ اور تصوف کی تاریخ اتنی ہی پُرانی ہے جتنا کہ اسلام
سا الیسا مذہب ہے جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ نبی آخرالزماں و ذی شان صلی اللہ علیہ وسلم
نے کامل دین قرار دیا ہے۔ اسلام کے اندر کسی غیر اسلامی فلسفہ کو دخل نہیں۔ پھر قلندرانہ افعال اور سُکر و جذب
لیات غیر اسلامی کیونکر ہوسکتی ہیں۔ کیونکہ ایمان کا نور جب عقل اور پھر قلب میں جذب ہو کر اس حد تک غالب

آجاتے کہ وہ دُنیا کے مصالح اور اس کے نفع و نقصان کو بھول جاتے تو ایسی حالت اس انسان سے مشابہ ہے جس پر نشہ چڑھا ہوا ہو، جیسے رب تعالیٰ سے ملاقات کے شوق میں انسان موت کو محبوب سمجھتا ہے۔ مرض کو اس لیے محبوب سمجھتا ہے کہ وہ گناہ سے دُور رکھتی ہے۔ فقر و مسکینی اس وجہ سے اس کو اچھی لگتی ہے کہ اُس کی بدولت وہ حق تعالیٰ کے سامنے متواضع رہتا ہے۔

شہباز قلندر بھی اسی قلندرانہ رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ اقبال کی شاعری نے بھی اسی قلندر اور قلندر کی رمزیت کو بیان کیا ہے۔ قلندر اولیآ اللہ میں الیسا طبقہ ہوتا ہے جو ایک خاص مزاج اور ایک مخصوص رنگ نسبت سے مشرف ہوتا ہے۔ ان لوگوں کو خُدا کے ساتھ ایک خاص کیفیت انحصاری نصیب ہوتی ہے۔ یہ ہر وقت اپنے سروں پر نسبت کا ایک پہاڑ رکھا ہوا تصوّر کرتے ہیں۔ نوافل کی تکسر، وظائف کی بہتات ان نہیں ہوتی۔ یہ ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے دل کو حق تعالیٰ سے غافل نہیں رکھتے۔ معاشرتی ریاکاری، طبقاتی کے خلاف مجاہدانہ سعی و عمل کو فروغ دینا ان کا اصل نقطۂ فکر ہوتا ہے۔

مسلک قلندرانہ کی تعلیم حضرت لعل شہباز قلندر نے انہی خطوط پر حاصل کی۔ آپ ہمیشہ سُرخ لباس زیب کرتے تھے۔ آپ کے رفیق حضرت جلال الدین بخاری بھی آپ کی تقلید میں سُرخ کپڑے پہنا کرتے تھے۔ سُرخ لباس کی نسبت سے آپ کو لعل شہباز کہا جاتا ہے۔ آپ کا فرمان ہے کہ تارک الدنیا تہجد گزار اور لذّتوں سے پاک فرد کو قلندر کہتے ہیں۔ ایک سندھی شاعر نے اس قول کو اس طرح بیان کیا ہے۔

"تارک الدنیا و مافیھا قلندر تنجھو نام"

لعل شہباز فرماتے ہیں "قلندروں کا طریق ہے کہ وہ دُنیا سے آزاد ہو کر صرف معبود میں محو ہو جاتے ہیں"۔ آپ کے انہی اوصاف کے پیش نظر آپ کے مُرشد نے آپ کو شہباز کا خطاب دیا تھا۔

حافظ شیرازی نے اس موضوع کو اس طرح بیان کیا ہے:-

فرض ایزد بگزاریم و بکس | و آنچہ گویند روا نیست بگوئیم رواست

حضرت لعل شہباز قلندر کے برصغیر میں آنے کے بعد آپ کا حضرت بہاء الدین ملتانی سے خصوصی تعلق بعض لوگوں کے خیال کے مطابق آپ حضرت بہاء الدین ذکریا کے مرید تھے مگر تاریخ میں اس قسم کے موجود نہیں ہیں۔

حضرت لعل شہباز نے سیاحت کے دوران دُنیا کا کونا کونا دیکھا۔ بہت سارے بزرگان دین سے ملیں۔ فیض و برکات کی دولتوں سے اپنا دامن مراد بھرا۔ اور پھر مکّہ معظمہ پہنچے وہاں حج کیا۔ پھر حضور کے روضہ مبارک پر حاضری دی۔ یہاں سے آپ مشہد اقدس پہنچے اور حضرت موسیٰ کاظم کے مزار پر آئے۔ پر ہی آپ کی ملاقات حضرت بابا ابراہیم سے ہوئی جن سے آپ نے بیعت و خلافت حاصل کی۔ ان آپ نے برصغیر کی طرف قدم بڑھایا اور سیہون شریف میں اپنا ٹھکانہ بنایا۔

اسی سفر میں آپ کی مُلاقات حضرت بوعلی قلندر سے بھی ہوئی۔ اسی طرح شیخ صدرالدین ملتانی کے آپ نے صحبت اختیار کیے رکھی۔ حضرت جلال الدین بخاری اور شیخ فرید جیسے اکابرین آپ کے نہ صرف تھے بلکہ آپ کی از حد عقیدت و احترام فرمایا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ آپ گرنار میں قیام فرماتھے۔ایک روز آپ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور عرض کی "میرا لڑکا گم ہوگیا ہے۔آپ اُس کو تلاش کر دیں"۔ آپ نے وعدہ کیا کہ میں تمہارے بیٹے کی تلاش میں ضرور تمہاری مدد کروں گا۔اس کے بعد آپ اس شخص کو لے کر ایک خانقاہ میں گئے۔اُس خانقاہ کے اندر سات بزرگ بیٹھے اور اپنی عبادت اور ذکرِ الٰہی میں مشغول تھے۔آپ نے اُن بزرگوں میں سے ایک کو بازو سے پکڑا اور ان کو اپنے ساتھ خانقاہ سے باہر لے آئے۔لڑکے کا باپ بڑا حیران ہوا کہ خانقاہ سے جو بزرگ شخص باہر لائے گئے تھے دراصل وہی اُس کا لڑکا تھا۔آپ نے اس شخص کو بتایا "تمہارا لڑکا دراصل ولی ہے اور یہ گم نہیں ہوا بلکہ یہ عبادت کی غرض سے آبادی سے دُور آکر خُدا کو یاد کرنے میں مگن تھا"۔ اس شخص نے اپنے لڑکے کو آپ کے حوالے کر دیا۔آپ نے اس کی تربیت کی اور وہ آپ کے تلطف و فیض سے روحانیت میں نہایت اعلیٰ مقام حاصل کر گیا۔

❖

کراچی سے آگے منگھو نامی پہاڑ پر حضرت شیخ بہا۔الدین ملتانی کے ایک ہمعصر بزرگ دفن ہیں۔اس پہاڑی پر حضرت لعل شہباز قلندر نے بھی چلہ کشی کی ہے کیونکہ اس پہاڑ پر ایک شہر حضرت لعل قلندر کے نام پر ہے جس کے دونوں طرف خوبصورت باغ ہیں۔یہ درویشوں کا مسکن ہے۔آپ کے متعلق ایک بات بڑی مشہور ہے کہ آپ نے بہت سے علاقوں میں چلہ کشی کی، وہاں کے لوگوں کو اپنی سحر انگیز شخصیت سے متاثر کیا، انہیں اسلام کی دولت سے مالا مال کیا۔اور سندھ کے علاقے پر آپ نے اپنی شخصیت کے گہرے نقوش چھوڑے۔
آپ کی کرامات کی لاتعداد کہانیاں لوگوں میں مقبول ہیں۔آپ کی ظاہری و باطنی خصوصیات لاثانی ہیں۔ آپ نے برسوں خلقِ خُدا کی درس و تدریس اور وعظ و تلقین میں گزار دیئے تھے۔تصوّف اور معرفت کے پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل بڑی خوش اسلوبی سے بیان کرتے تھے۔ آپ سیف اللسان تھے۔یعنی جو بات آپ کی زبان سے نکل جاتی رب تعالیٰ اس کو پوری فرمادیا کرتے تھے۔آپ کا ارشاد ہے کہ اگر انسان کے دل میں درد ہو اور وہ بنی نوعِ انسان کو فائدہ پہنچانے کی تڑپ محسوس کرتا ہو تو حقیقت میں انسانیت کی یہی معراج ہے۔آپ کی تعلیم قابل ہے کہ ہر مسلمان کو اپنی روزمرہ زندگی میں اُسے پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔

❖

حضرت لعل شہباز قلندر جب سیہون شریف میں تشریف لاتے تو اُن کے ساتھ بہت سارے فقرا تھے۔اُن میں ایک ہندو بنیا بھی تھا۔جس کا نام کانو نگو تھا۔پہلے پہل وہ دُکانداری کرتا تھا۔پھر رفتہ رفتہ اس نے صرف آپ کی صحبت میں رہنا شروع کر دیا۔آپ اس پر بہت تلطف فرمایا کرتے تھے۔اس نے آپ کی اسقدر خدمت کی کہ اس کے خاندان کو آج بھی یہ اعزاز حاصل ہے کہ عرس کے موقع پر جہاں مسلمان اپنی رسومات ادا کرتے ہیں وہاں اس کانو نگو کے خاندان کے ہندو بھی آکر آپ کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں۔
یہ آپ کی شخصیت کی سحرانگیزی کا اعجاز تھا کہ کسی بھی نظریہ اور مکتبۂ فکر کا فرد آپ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا تھا۔ آپ میں دیگر اوصاف کے علاوہ سخاوت کا جذبہ بھی بدرجہ اتم موجود تھا۔یہی وجہ ہے آپ کو سخی شہباز قلندر بھی کہا جاتا ہے۔سیہون شریف کے جس محلہ میں آپ کا قیام تھا اس میں کسبیوں اور فاحشہ عورتوں کے گھر کافی تعداد میں تھے۔وہ علاقہ شراب و شباب کا مرکز تھا۔جہاں راتیں جاگتی تھیں اور دن سوتے تھے۔آپ کی عبادات اور آپ کی ریاضت کے اوقات بھی رات کے ہی ہوتے تھے۔اس لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کی آمد کے تھوڑے عرصہ

کے بعد ہی ایسا نقشہ بدلا کہ وہ ساری کی ساری طوائفیں از خود آپ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور اپنے گناہوں سے توبہ کر کے گناہ آلود زندگی سے کنارہ کش ہو گئیں۔

آپ نے سیہون شریف میں رہ کر اسلام کا نور پھیلایا۔ ہزاروں لوگوں کو راہ ہدایت دکھائی۔ لاتعداد بھٹکے ہوئے افراد کا رشتہ خدا سے جوڑا۔ لوگوں کو اخلاق کی تعلیم دی۔ سچائی اور نیکی کی لگن انسانوں کے دل میں پیدا کی۔ یہی وجوہات ہیں جس طرح ہندوستان میں خواجہ غریب نواز، حضرت معین الدین چشتی اجمیری کی وجہ سے اجمیر شریف کو شہرت و عزت اور عظمت حاصل ہے اسی طرح سندھ میں سیہون شریف کو مخدوم لعل شہباز قلندر کی وجہ سے غیر معمولی عظمت حاصل ہے اور سیہون کو سندھ کا اجمیر کہنا بے جا نہ ہوگا۔ آپ کے ساتھ سلطان محمد تغلق کو اتنی عقیدت تھی کہ اس کی وفات کے بعد اس کی میت کو ٹھٹھے سے سیہون لایا گیا اور آپ کی خانقاہ کے قرب و جوار میں دفن کیا گیا۔ مشہور سیاح ابن بطوطہ نے اپنی سیاحت کے دوران خاص طور پر آپ کی درگاہ پر حاضری دی۔

اُس عہد کا ایک مشہور واقعہ ہے جس کے متعلق غور کیا جائے تو حضرت لعل شہباز قلندر کی عظمت اور روحانیت میں اُن کی شان نمایاں نظر آتی ہے۔

آپ کی درگاہِ عالیہ کے موجودہ سجادہ نشین سے پہلے جو سجادہ نشین تھے ان کا انتقال ہو گیا۔ اب نئے جانشین کے انتخاب کا مسئلہ تھا۔ اس انتخاب میں تین افراد امیدوار تھے۔ تینوں کو روحانیت میں بڑی دستگاہ حاصل تھی۔ ہر ایک کے ماننے والے بے شمار تھے۔ اور تینوں کو بیک وقت منتخب کرنا بھی بہت مشکل تھا۔ تاہم یہ بات بعید از قیاس نہ تھی کہ اس انتخاب کے نتائج باعثِ تنازعہ بنتے۔

تینوں امیدواروں کو انتخاب سے چند روز پہلے ایک رات ایک جیسا ہی خواب آیا۔ جس میں ان کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ اس درگاہِ عالیہ کا سجادہ نشین تم تینوں میں سے کوئی بھی نہ ہوگا بلکہ اس کے لیے کسی اور کو منتخب کیا گیا ہے۔ تینوں حضرات خواب دیکھنے کے بعد خاموش ہی رہے اور اپنے خواب کو ایک دوسرے کے سامنے بیان کرنے سے گریز کیا۔ اللہ تعالیٰ نے دُوسرے روز دوبارہ تینوں کو وہی خواب دکھایا اور اس میں اس شخص کا پتہ بھی بتایا مگر اُن تینوں نے پھر بھی سکوت طاری رکھا۔ تیسرے روز اللہ تعالیٰ نے ایک مرتبہ پھر خواب میں حکم دیا کہ "تم تینوں میرے حکم کی تعمیل کیوں نہیں کرتے۔ جاؤ اور اس شخص کو ڈھونڈ کر لاؤ جس کو ہم نے حضرت شہباز قلندر کی مجاوری کے لیے منتخب کیا ہے۔ اب تو تینوں امیدواروں نے ایک دوسرے کو اپنے خواب جو تواتر سے انہیں آتے تھے سنائے اور اس شخص کا پتہ بھی بتایا جس کے متعلق اللہ میاں نے اُن تینوں کو سجادہ نشینی کے لیے لانے کا حکم دیا تھا۔

وہ خوش نصیب شخص جن پر خُدا کی عنایات بے پایاں ہوئی تھیں۔ پشاور کے کسی ہسپتال میں ڈاکٹر تھے اور ماہر امراضِ چشم تھے۔ بظاہر ایک ڈاکٹر کا سجادہ نشینی کے ساتھ کوئی تعلق تو ہو نہیں سکتا لیکن پھر بھی حکم ایزدی وہ تینوں صاحبان جو خود سجادہ نشینی کے امیدوار تھے اللہ کے منتخب کردہ سجادہ نشین کو لینے کے لیے چل پڑے۔ انہوں نے پہنچ کر وہ اُن ڈاکٹر صاحب کو ملے جن کے متعلق اللہ نے حکم دیا تھا۔ ان کا نام ڈاکٹر عارف تھا۔ جب ڈاکٹر صاحب نے اُن تینوں سے سجادہ نشینی کے بارے میں سُنا تو کہا بھائی لوگو! میرا اور جانشینی کا کیا واسطہ میں ڈاکٹر ہوں میرا کام تو مریضوں کا علاج کرنا ہے۔ میں تم لوگوں کے ساتھ ہرگز نہ جاؤں گا۔ ان تینوں اشخاص نے بیک زبان ہو کر کہا۔

"ڈاکٹر صاحب ہم خدا کے حکم سے آپ کے پاس آتے ہیں اور انشاء اللہ آپ کو لے کر جائیں گے"۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا "دیکھو! تم لوگوں کو بے شک خدا نے حکم دیا ہے لیکن مجھے تو خدا نے کوئی حکم نہیں دیا اس لیے میں ابھی خدا کے حکم کا انتظار کروں گا اور جب تک مجھے خدا کی طرف سے کوئی حکم نہیں ملے گا میں تم لوگوں کے ساتھ نہیں جاؤں گا"۔

یہ بات سن کر تینوں صاحبان ڈاکٹر صاحب کے ساتھ متفق ہو گئے کہ آپ درست کہتے ہیں۔ آپ بے شک خدا کے حکم کا انتظار کریں۔ ہم اس وقت تک یہیں رہتے ہیں۔ دو تین روز کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان ڈاکٹر صاحب کو خواب میں بتایا کہ تمہیں میں نے اس وجہ سے حضرت لعل شہباز قلندر کے آستانہ عالیہ کا سجادہ نشین منتخب کیا ہے کہ تمہارے والد نے حضرت موصوف کی بڑی خدمت کی تھی چنانچہ تم اسی وقت سیہون شریف روانہ ہو جاؤ"۔

اب ڈاکٹر صاحب کا دل مطمئن ہو گیا اور انہوں نے ان تینوں افراد کو بلایا اور کہا "بھئی! تم تینوں سچ کہتے ہو۔ کیونکہ یہ واقعی اللہ کا حکم ہے اس لیے اب مجھے جانے میں کسی قسم کا تردد نہیں۔ میں اب بخوشی تم لوگوں کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہوں"۔ ڈاکٹر صاحب نے جا کر سجادہ نشینی کی سیٹ سنبھال لی اور آج بھی وہی درگاہ مقدسہ کے سجادہ نشین ہیں۔ ان فرائض کے علاوہ وہ لوگوں کی آنکھوں کا مفت علاج بھی کرتے ہیں۔ اس بات سے پتہ چلتا ہے کہ جن لوگوں نے خدا کو حاصل کرنے کے لیے لوہے کے چنے چبائے ہوں اللہ تعالیٰ اُن کی شب بیداریوں اور گریہ زاریوں کو ضائع نہیں کرتا۔ اور ان کو دنیا میں بھی بھلائی عطا فرماتا ہے اور آخرت میں بھی۔

سید میراں کلاں حضرت شہباز قلندر کے مرشد زادے تھے۔ ان کے ساتھ آپ کو بڑی عقیدت تھی۔ آپ کی ایما پر ہی وہ کربلا سے قندھار کے راستے سندھ تشریف لائے اور آپ کے ساتھ ایک مدت گزاری۔ ان کا زہد و تقویٰ بے نظیر تھا۔ انہوں نے سیہون شریف میں ہی شادی کی اور ان کی اولاد ہی ایک طویل مدت تک حضرت لعل سائیں کے مزار پرنور کی گدی نشین رہی۔ تاہم اس معاملہ میں بھی مورخین میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔

حضرت خواجہ فرید گنج شکر کے ملفوظات میں بھی حضرت شہباز قلندر کا ذکر پایا جاتا ہے۔ خواجہ صاحبؒ جب سیاحت کے دوران سیوستان آئے تو انہوں نے لعل سائیں کی صحبت میں وقت گزارا۔ آپ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ جس شخص کو سعادت بخشتا ہے اس پر وہ ذکر کے دروازے کھول دیتا ہے اور وہ علاوہ تقاضائے حاجت کے ہر وقت ذکر میں مشغول رہتا ہے"۔ یہ بات خواجہ صاحبؒ نے حضرت لعل شہباز کے متعلق ہی فرمائی۔

❖

حضرت شہباز قلندر اپنے ایک ہمعصر بزرگ شیخ رکن الدین ملتانی کے ہمراہ سندھ کے ایک گاؤں جس کا نام "ریحان" تھا اور جو بعد میں شیخ رکن الدین کی نسبت سے رکن پور کہلانے لگا، میں پہنچے تو یہ بے آباد اور بنجر علاقہ تھا۔ اس میں آپ دونوں کی برکت سے قدرت نے قدرتی حسن پیدا کر دیا اور اس ویرانے کو اللہ تعالیٰ نے آپ حضرات کی ضیاباریوں سے منور کر دیا۔ آپ کے قیام کے آثار اب بھی رکن پور میں ملتے ہیں۔

حضرت لعل شہباز قلندر کو شاعری سے بھی غیر معمولی دلچسپی تھی۔ آپ کے مجموعہ کلام پر ایک کتاب "عشقیہ" منسوب ہے۔ حضرت کبھی کبھی وجد کی حالت میں بڑے بے مثال اور بے نظیر اشعار کہا کرتے تھے۔

ڈاکٹر ہر دل سداز نگانی نے اپنے پی۔ایچ۔ڈی کے مقالہ

PERSIAN POETS OF SIND

میں آپ کو سندھ کا پہلا شاعر قرار دیا ہے۔ آپ کا لب ولہجہ، عقائد اور مسائل قلندرانہ تھے۔ آپ کے کلام میں مستی حد درجہ تک شامل تھی۔ جذبہ انانیت اور جوش کا اظہار آپ کھل کر کرتے تھے۔ آپ کے خیالات عام صوفیاء کے کلام سے مختلف ہوتے تھے۔ مثلاً

وجودِ محض مطلق را ہمہ جا ہر زماں دیدم
بہر سوئے بہر کوئے بہر صورت عیاں دیدم
ہمہ وحدت، ہمہ کثرت زکثرت ہم ہماں وحدت
بیک پرواز می بینم کہ شہباز م بگویم حق!
بنور چشم باطن عین خود را عین آں دیدم

عثمان آپ کا تخلص تھا۔ اور بعض جگہوں پر آپ نے اپنا ذکر اشعار میں شہباز کے طور پر بھی کیا۔ آپ کے کلام میں عشقِ الٰہی کے پرتو اور تصوف کی جھلک نمایاں تھی اور عشق وکیف کی کیفیات کو آپ نے بڑے عمدہ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ آپ کے کلام کو بہت سارے تذکرہ نگاروں نے اپنے اپنے تذکروں میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ آپ کا کلام پڑھ کر ایمان تازہ ہو جاتا ہے۔ جن قابلِ ذکر شخصیتوں اور صوفیوں نے آپ سے فیض حاصل کیا ان میں حضرت بُچل سرمست کا نام قابلِ ذکر ہے۔ یہ آپ کے دوست حضرت سید جلال الدین سرخ پوش کے فرزند تھے۔ یہ حضرت شہباز قلندر کے مرید بھی تھے۔ اور اُن کو حضرت کا وزیر بھی کہا جاتا تھا۔ حضرت لعل سائیں ان پر بہت مہربان تھے۔ آپ کے وصال کے بعد حضرت بُچل سرمست آپ کے مزار پر ایک مدت تک رہے اور آپ نے جب پردہ کیا تو آپ کو بھی حضرت لعل سائیں کے مزار کے اندر روضہ مبارک کے باہر چھوٹے گنبد کے نیچے دفن کیا گیا۔

❖

مشہور بزرگ حضرت موج دریا کو بھی حضرت لعل شہباز قلندر کے سجادہ نشین ہونے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ یہ حضرت بڑے کامل فقیر ہو گزرے ہیں۔ آپ بڑے عابد وزاہد تھے۔ حضرت لعل شہباز کو اللہ تعالیٰ نے اس قدر بلند مراتب اور درجات عطا فرمائے تھے کہ حضرت موج دریا جیسی کامل ہستیاں ان کے دربار پر حاضری دینا باعث سعادت سمجھتی تھیں۔

❖

بلخ بخارا کے بادشاہ ایک مرتبہ حضرت لعل شہباز قلندر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی "اے شہنشاہِ ولا میرے پاس خدا کی دی ہوئی ہر نعمت موجود ہے۔ میری بادشاہت میں میرے حکم کے بغیر کوئی کام ممکن نہیں ہو نعمتِ خداوندی سے میں مالا مال ہوں لیکن ایک چیز کی کمی میں شدت سے محسوس کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ میں اولاد سے محروم ہوں۔ آپ میرے لیے دُعا فرمائیں کہ خداوندِ کریم مجھ کو اس نعمت سے بھی نواز دے۔"

حضرت لعل سائیں نے بادشاہ کے لیے دُعا فرمائی اور ساتھ ہی یہ بشارت بھی دی کہ بہت جلد اللہ تعالیٰ تمہیں ایک فرزندِ صالح دے گا لیکن اس میں ہمارا سا جھا ہوگا۔ بادشاہ نے عرض کی "حضرت مجھے آپ کی ہر شرط منظور ہے۔" میں یہ چاہتا ہوں کہ میری سلطنت کا ولی عہد پیدا ہو جائے۔ کچھ ہی عرصہ کے بعد اللہ پاک نے بادشاہ پر مہربانی کر دی او اس کو ایک فرزندِ ارجمند عطا کیا۔

بادشاہ نے بیٹے کی پیدائش کی خوشی میں زر و جواہر لاکر حضرت لعل سائیں کی خدمت میں پیش کیے۔ مگر آپ نے ا تمام چیزوں کو رد کرتے ہوئے فرمایا" ہمیں دنیا کی دولت سے کیا سروکار، ہم درویش لوگ ہیں ان جھگڑوں سے

ہمارا دُور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ ہمارا تو تمہارے بیٹے میں ساجھا ہے ہم اس میں حصہ لیں گے"۔ یہ کہہ کر آپ نے حکم دیا "بچے کو ہمارے سامنے لایا جاتے"۔ بادشاہ نے فوراً آپ کے حکم کی تعمیل کی۔ آپ نے بچے کو اُٹھایا اور اپنی گود ڈی میں چھپا کر بادشاہ سے کہا کہ اب تم جو کچھ مرضی کرو اس میں آدھا حصہ میرا ہو گا۔ آپ نے ہی اس بچے کا نام "ادھم" رکھا۔ یہ بچہ کافی بڑا ہو کر سلطان ادھم کے نام سے مشہور ہوا۔ لیکن کچھ عرصہ حکومت کرنے کے بعد اس نے دُنیا ترک کر دی اور اپنی آدھی عمر فقیری میں گزار دی۔ سلطان ادھم نے حضرت لعل سائیں کے حکم سے خیر پور کے پاس پہاڑی پر قیام کیا اور وہاں پر ہی وفات پائی۔ آپ کا مزار خیر پور میں موجود ہے۔ سلطان ادھم ہیں سے حضرت لعل سائیں نے اس کی درویشی کی شکل میں آدھا حصہ لیا۔

اسی حوالے سے تذکرہ نگار اور راوی سلطان ادھم کو شاہ گودڑ کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں۔ البتہ اس واقعہ پر بھی بیشتر تاریخ نگار اختلاف رائے رکھتے ہیں۔

❖

حضرت لعل شہباز قلندر کی ذات بابرکات کے بہت سے گوشے آج بھی تاریخ کے گمشدہ اوراق میں ہیں۔ آپ جیسے قدسی صفات بزرگوں نے اسلام کی بہت خدمت کی۔ محبّت اور مہربانی سے آپ نے لوگوں کو اسلام کی دولت سے ہمکنار کیا۔ آج بھی جب حضرت لعل سائیں کے مزار کے اندر قدم رکھا جاتے تو طبیعت میں ایک جاودانی طمانیت سی پیدا ہو جاتی ہے۔ آپ کے مزار کے اندر بیٹھنے والے کو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے آپ اُس کے سامنے بیٹھے ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے مزار پر آنے والوں کی نگاہیں ادب و احترام سے جھک جاتی ہیں۔ کسی نگاہ کو آنکھ اٹھانے کا یارا نہیں ہوتا کہ وہ اٹھ سکے۔ آپ کے مزار کے چاروں طرف رحمت ہی رحمت برس رہی ہوتی ہے۔ وہاں پر بیٹھ کر یوں معلوم ہوتا ہے کہ شیطانیت یکسر اس دُنیا سے عنقا ہو گئی ہے۔

❖

مشہور صوفی شاعر اور بزرگ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کو حضرت لعل شہباز قلندر کے ساتھ بڑی عقیدت تھی۔ آپ بڑی پابندی کے ساتھ حضرت لعل سائیں کی درگاہ پر حاضری دیا کرتے تھے۔ آپ نے اپنے کلام کے ذریعہ حضرت کو خراج عقیدت پیش کیا۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے حضرت لعل سائیں کی درگاہ سے فیوض و برکات کے خزانے حاصل کیے ہیں۔

❖

پاکستان کے مشہور محقق شیخ محمد اکرم نے اپنی کتاب موج کوثر میں برٹن کی ہسٹری آف سندھ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ حضرت لعل شہباز قلندر بڑے عالم لسانیات تھے۔ آپ حرف و نحو کے بھی ماہر تھے۔ چنانچہ برٹن کے زمانے میں حرف و نحو کی جو کتابیں مروج تھیں ان میں دو مشہور کتابیں "میزان الصرف اور صرف صغیر" حضرت لعل سائیں کی تحریر کردہ تھیں۔ ان کتب کو بڑی تاریخی حیثیت حاصل رہی ہے۔ ان کتابوں سے یہ بات اخذ کی جاسکتی ہے کہ اللہ پاک نے روحانیت اور ولایت کے شہنشاہوں سے صرف دین کے ہی کام نہیں لینا بلکہ اُن کو دیگر غیر معمولی فرائض دنیاوی سونپ دیتا ہے۔

سیہون شریف کے ریلوے اسٹیشن کے جنوب میں ایک پہاڑ ہے۔ اس کے اندر ایک غار ہے جس کے مشہور تاریخ نگار دوارکا پرشاد نے لکھا ہے کہ ۲۵ ہزار سال قبل جب انسان غاروں میں رہتے تھے تو یہ غار انسان کی آماجگاہ تھی۔ اس غار میں لعل شہباز قلندر نے چلہ کشی کی تھی۔ غار کے اندر درمیان میں ایک بڑی سی چٹان نما

سِل رکھی ہے۔ جس کو یک ٹھپی کہتے ہیں۔ اور غار میں قبلہ رُخ ایک محراب بھی ہے۔ اس سل پر بیٹھ کر اور قبلہ رُو ہو کر حضرت عبادت کیا کرتے تھے۔ اس کے نیچے ہموار پہاڑی ہے جو فرش کے طور پر استعمال ہوتی ہوگی۔ اس پر تقریباً چار سو افراد کے بیٹھنے کی گنجائش ہے۔

۱۰۰۹ھ میں میر ابوالقاسم نمکین سیہون کے صوبیدار تھے تو وہ چاندی راتوں میں اسی جگہ کچہری لگا کر لوگوں کے مسائل سُنا کرتے تھے۔ اس یک ٹھپی کے متعلق ایک روایت یہ بھی ہے کہ یہاں حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے بھی قدم رنجہ فرمایا کیونکہ تاریخ شاہ جہانی میں میرک یوسف نے تحریر کیا ہے کہ

"میگویند کہ نظر گاہ حضرت علیؓ است"

غار کے شمال کی سمت میں ایک قبر بھی ہے جس کے متعلق راوی بیان کرتے ہیں کہ یہ حضرت لعل سائیں کے ایک دولت مند مرید کی قبر ہے۔ جس نے اپنی ساری دولت اور جائداد چھوڑ کر ساری زندگی حضرت لعل شہباز قلندر کی خدمت میں بسر کر دی تھی۔

❖

اسی طرح سیہون کے اسٹیشن کے پاس ہی ایک لعل باغ ہے۔ اس کا نام بھی حضرت لعل سائیں کے نام کی نسبت پر ہی رکھا گیا ہے۔ اس باغ کے قریب ایک پہاڑی بھی ہے جس کو حضرت علیؓ کی پہاڑی کہا جاتا ہے۔ یہاں پر بھی حضرت لعل شہباز ایک لمبے عرصہ تک چلہ کش رہے۔ اس لعل باغ کا رقبہ تقریباً ۵۰۰ ایکڑ ہے۔ اس باغ میں مختلف انواع کے درخت ہیں۔ لیموں، کھجور اور بیر کے درخت باغ کے اندر عجیب رونق پیش کرتے ہیں۔ اس باغ کو لعل واہی کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ اسی باغ میں ایک جگہ لعل جو لٹو بھی ہے۔ یہاں پر بھی حضرت نے چلہ کشی کی تھی۔ اسی باغ میں ایک پہاڑ بھی ہے جس میں سے ایک چشمہ بھی بہتا ہے۔ جس سے باغ کے حوضوں میں پانی آتا ہے۔ حضرت لعل سائیں کی سیہون آمد سے قبل نہ یہ باغ تھا نہ ہی چشمہ تھا۔ یہ سب حضرت لعل شہباز کی آمد کی برکت سے ہوا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت و برکت اولیاء کرام پر خصوصی طور پر نازل کرتا ہے اور لوگوں کے لیے ایسی مثالیں پیدا کرتا ہے کہ "تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں" اور یوں اس کی یاد کرنے والے فرد بھی امر ہو جاتے ہیں۔

حضرت لعل شہباز قلندر کے مزار پر آج بھی دن میں سہ مرتبہ نوبت لگتی ہے۔ پہلی صبح صادق کے وقت اور دوسری شام کے وقت اور تیسری تہجد کے وقت۔ جب مزار کا دروازہ بند کیا جاتا ہے اور پھر پہلی نوبت پر صبح صادق کے وقت کھولا جاتا ہے۔ یہ نوبت کا دستور قدیم زمانہ سے رائج ہے بلکہ اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت کے زمانے سے ہی اوقات کا اندازہ اس نوبت سے کیا جاتا تھا۔ آپ کے زمانے میں وقت کا اندازہ کرنے کے لیے ایک دیگ میں پانی بھر کر رکھ دیا جاتا تھا اور دیگ کے اندر ایک سوراخ ہوتا تھا جس میں سے پانی ایک ایک قطرے کی شکل میں رِستا رہتا تھا اور پانی کی سطح سے اوقات معلوم ہو جایا کرتے تھے۔ یہ سلسلہ اب بھی قائم و دائم ہے۔ پانی کی دیگ آج بھی آپ کے مزار کے پاس موجود ہوتی ہے جس سے اوقات کا اندازہ آج کے جدید دور میں بھی بالکل درست ہوتا ہے۔

❖

حضرت لعل شہباز کے ایک عقیدت مند بین شاہ تھے جو خود بھی بہت بڑے سندھی کے بزرگ شاعر تھے۔ انہوں نے حضرت لعل سائیں سے بڑا فیض حاصل کیا۔ آپ نے حضرت کی عقیدت میں اپنا آبائی وطن اور جائداد وغیرہ چھوڑ کر سیہون شریف میں پکے ڈیرے لگا لیے۔ آپ حضرت کی شان میں کافیاں بھی لکھتے تھے۔ اور پھر بڑے ہی دلگداز انداز میں خود ہی یہ کافیاں گایا کرتے تھے۔

سندھ کے کافی بزرگوں کی درگاہوں پر دھمال لگانے کا اہتمام ہوتا ہے۔ دھمال ایک سُر کا نام ہے۔ دھمال میں ڈھل نقارہ خاص وجد پیدا کرتا ہے۔ اس راگ کے بلند ہوجانے کے بعد فقرا وجد میں آجاتے ہیں اور حلقہ باندھ کر مست قلندر مست قلندر کا نعرہ بلند کرتے ہیں۔

"عبدالرحمٰن شاہ موسوی نے اپنی کتاب سرہان میں بیان کیا ہے۔ لعل شہباز قلندر کے شیدائی عملی طور پر ذکر وفکر کے قائل ہوتے ہیں اور جب ان پر نیند اپنا غلبہ طاری کرنے لگتی ہے۔ تو یہ لوگ یہ راگ الاپتے ہیں اور دھمال کرتے ہیں۔ اس طرح ان کو دوبارہ ذکر وفکر کرنے کا از سرِ نو موقع مل جاتا ہے۔"

حضرت لعل شہباز خود بھی دھمال کو پسند فرماتے تھے۔ آپ کا یہ طریقہ کار مولانا رومیؒ کے مریدوں کی محفلِ سماع سے ملتا جلتا ہے کیونکہ مولانا کے ہاں بھی سماع کے وقت لوگ دف بجاتے تھے اور پھر ان میں سے بعض کھڑے ہوکر چکر لگاتے ہوتے رقص کرتے تھے۔ ان باتوں سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ مولانا رومیؒ کی محفلِ سماع اور حضرت لعل سائیں کی دھمال میں کافی مشابہت موجود ہے۔ صرف زمان ومکان کا فرق ہے۔

حضرت لعل سائیں کی درگاہ پر یوں تو دن میں تین مرتبہ دھمال لگائی جاتی ہے۔ لیکن عُرس اور میلہ کے دنوں میں اس کا خصوصی اہتمام کیا جاتا ہے۔ لوگ دُور دُور سے آتے ہیں۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں میں مختلف رنگوں کے جھنڈے پکڑے ہوتے ہوتے ہیں۔ بعض لوگوں نے اپنے پاؤں میں گھنگھرو باندھے ہوتے ہیں۔ عام دنوں میں نوبت کو مزار کے اندر رکھ کر ہی اس پر چوٹ لگائی جاتی ہے۔ جبکہ عرس کے دنوں میں نوبت کو باہر میدان میں رکھ دیا جاتا ہے اور یوں دھمال ڈالی جاتی ہے۔ نوبت کی آواز سے دھمال میں ایک کیف وسُرور پیدا ہوجاتا ہے۔ لوگ زبان سے مست قلندر مست قلندر کے نعرے لگاتے ہوتے دھمال ڈالتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان کو اپنا ہوش بھی نہیں رہتا۔

اس سماع اور مشربِ دھمال کے متعلق حضرت شہباز فرماتے تھے "سماع اور رقص وسرود جائز ہے۔ اس سے قلب میں نرمی پیدا ہوجاتی ہے۔ اور نرمی سے محبوب کی توجہ حاصل ہوجاتی ہے۔ اور اس طرح سرود وسماع محبوبِ حقیقی کے وصال کا وسیلہ بن جاتا ہے۔" آپ نے اس مخصوص سماع کو عبادت کا درجہ عطا کر رکھا تھا۔

قلندر نامہ کے مصنف "ردالمختار" نوبت اور دھمال کا جواز نکال یوں رقمطراز ہیں کہ نوبت چوکس اور بیدار رکھنے کے لیے بجائی جاتی ہے۔ سہ پہر سے شام تک لگنے والی نوبت نزع کے عالم کی تفسیر بیان کرتی ہے۔ شام سے تہجد تک لگنے والی نوبت موت کی حقیقت بیان کرتی ہے اور تہجد سے صبح تک لگنے والی نوبت قیامت کی آمد کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

برصغیر کے مشہور بزرگ شاہ شرف الدین ایک مرتبہ حضرت لعل شہباز کی زیارت کرنے کے لیے آئے۔ آپ کو دیکھتے ہی شاہ شرف کے دہنِ مبارک سے یہ اشعار نکلے جن میں حضرت لعل سائیں کی سیرت اور عالی مرتبے کا ذکر بیان کیا گیا ہے:۔

عجب دیدم بدرگاہ قلندر	نجف چوں مشہد نور منور
طوافِ تربت آل شاہِ سرور	ثوابِ نمازیاں حج اکبر

ایک مشہور کتاب تحفۃ الکرام میں روایت ہے کہ حضرت لعل سائیں کی درگاہ کی کلید قدیم زمانے سے سیہون کے شیخوں کے پاس تھی۔ ایک مرتبہ مقامی سادات برادری نے وہ چابی زبردستی شیخوں سے لے لی مگر اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ سے وہ چابی باوجود کوشش کے درگاہ کا تالا نہ کھول سکی۔ غرضیکہ لوہاروں کو بلوایا گیا مگر اس کے باوجود بھی تالا نہ کھل سکا۔

اس کے بعد سادات نے چابی مجبوراً شیخوں کے حوالے کر دی۔ اور اس وقت شیخ لکھن نامی نے آ کر درگاہ کا تالا کھولا۔ ایک عرصہ تک چابی ان شیخوں کے پاس رہی۔ پھر انہوں نے اپنی مرضی سے چابی سادات کے ایک بزرگ سید ولی محمد کے حوالے کر دی تب سے اب تک سادات کلید بردار ہیں۔ شیخوں کے پاس چابی رہنے کی وجہ یہ تھی کہ ان کے اسلاف میں سے کسی شخص نے حضرت لعل سائیں کی بہت خدمت کی تھی۔ اور حضرت کے لطف و کرم اور انوار کی بارش نے شیخوں کو کلید برداری کا اعزاز بخشے رکھا۔ اولیاء کرام کی صحبت میں رہ کر اللہ تعالیٰ انسان کو کس قدر بلند درجات عطا کرتا ہے کہ وہ ہر چیز کو تسخیر کر دیتا ہے۔

آپ کی آخری زندگی مکمل جذب و سکر میں گزری۔ ہزاروں مرید اور عقیدت مند آپ کی خدمت میں ہر وقت حاضر رہتے تھے۔ مگر آپ نے گوشہ نشینی اختیار کیے رکھی۔

آپ کے وصال کے متعلق تاریخ نگاروں میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔ تاریخ سندھ کے مطابق آپ کی تاریخ وفات ۲۱ شعبان ۶۵۰ھ بمطابق ۱۲۵۲ء بتائی جاتی ہے۔ جب دیگر مورخ ۱۸ شعبان یا ۲۱ شعبان بتاتے ہیں۔

معتبر تاریخ کی رُو سے ۱۸ تا ۲۱ شعبان تک ہر سال ماہ شعبان المعظم میں آپ کا عُرس منایا جاتا ہے۔ عُرس میں آپ کے عقیدت مند بڑی تعداد میں شرکت کرتے ہیں۔ پنجاب، سندھ، بلوچستان، سرحد اور مکران سے لوگوں کے قافلے سیہون شریف پہنچ جاتے ہیں اور عُرس کی رسومات بڑی آن، بان اور شان کے ساتھ منائی جاتی ہیں۔

آپ کا روضہ مبارک سلطان فیروز شاہ تغلق کے زمانے میں اُس کے مقرر کردہ سیوستان کے والی اختیار الدین نے تعمیر کروایا جو چھ گنبدوں پر مشتمل ہے۔

قدرت کا سارا نظام اصولوں کے تابع ہے۔ بڑے آدمیوں کی پیدائش کے بھی تو کچھ اصول ہوں گے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بڑے آدمی انعام کے طور پر دیے اور سزا کے طور پر روک لیے جاتے ہیں۔ عطا تو اسی کے حق میں ہوتی ہے جو حقدار ہو۔ آخر قدرت ایک سپاس ناآشنا قوم کو بڑے آدمی کیوں عطا کرے؟ اسے اپنے عطیے کی رسوائی اور بے قدری ناگوار گزرتی ہے۔ عطا کا پہلا حق یہ ہے کہ انسان اس کا شکر ادا کرے۔ دل شکر سے لبریز ہو تو روشن ہو جاتا ہے، شکوہ کیجیے تو بجھ جاتا ہے۔ ناشکر گزار ہو تو پتھر بن جاتا ہے۔ شکر گزار ہمیشہ روشن ضمیر اور روشن دماغ ہوتا ہے۔ ناشکر گزار بے ضمیر اور بد دماغ ہو جاتا ہے۔ مارکس اور بلیس بادشاہ بھی تھا اور فلسفی بھی۔ اس کی حیثیت ایک صاف گو اور عظیم انسان کی ہے جس کے جسم کا ہر رُواں اگر زبان بن جاتا تو وہ بھی حرفِ شکر کے لیے وقف رہتا۔ اپنے افکار میں اس نے بزرگوں، دوستوں، استادوں، غلاموں اور کتنے ہی دوسرے انسانوں کا شکر ادا کیا اور اس کی وجہ بھی لکھی ہے۔ مثلاً اُس شخص کا شکر جس نے اسے احساس دلایا کہ اس کے کیریکٹر میں اصلاح اور ضبط کی گنجائش ہے۔ اس دوست کا شکر جس نے جتایا کہ مصروفیت کو قطع تعلقات کا بہانہ بنانا شیوۂ مردانگی نہیں۔ اس فلسفی کا شکر جس نے نفس پر حکومت کرنی سکھائی اور باپ کا شکر جس نے ملک پر حکومت کرنے کا راز بتایا۔ اپنے والد کے بارے میں مارکس نے لکھا ہے کہ وہ صحت کو عزیز رکھتا تھا نہ کہ زندگی کو اور جستجو سے صحیح راہ حاصل کرنا چاہتا تھا نہ کہ محض آرزو سے۔۔۔ وہ دوسروں کی صلاحیتوں کا اعتراف کرتا تا کہ ہر شخص کو اس کے حصے کا شرف حاصل ہو۔ باپ کا یوں شکر ادا کرنے کے بعد، مارکس دیوتاؤں کا شکر ادا کرتا ہے جن کی بدولت اسے ہر نعمت ملی، جن کے سہارے وہ نفس پر غالب آیا اور جن کی وجہ سے اسے زندگی کو عین فطرت کے مطابق بسر کرنے کا موقع ملا۔ اگر کوئی کمی یا کوتاہی اس کی زندگی میں ابھی باقی ہے تو وہ خود اس کا ذمے دار ہے۔۔

"آوازِ دوست"
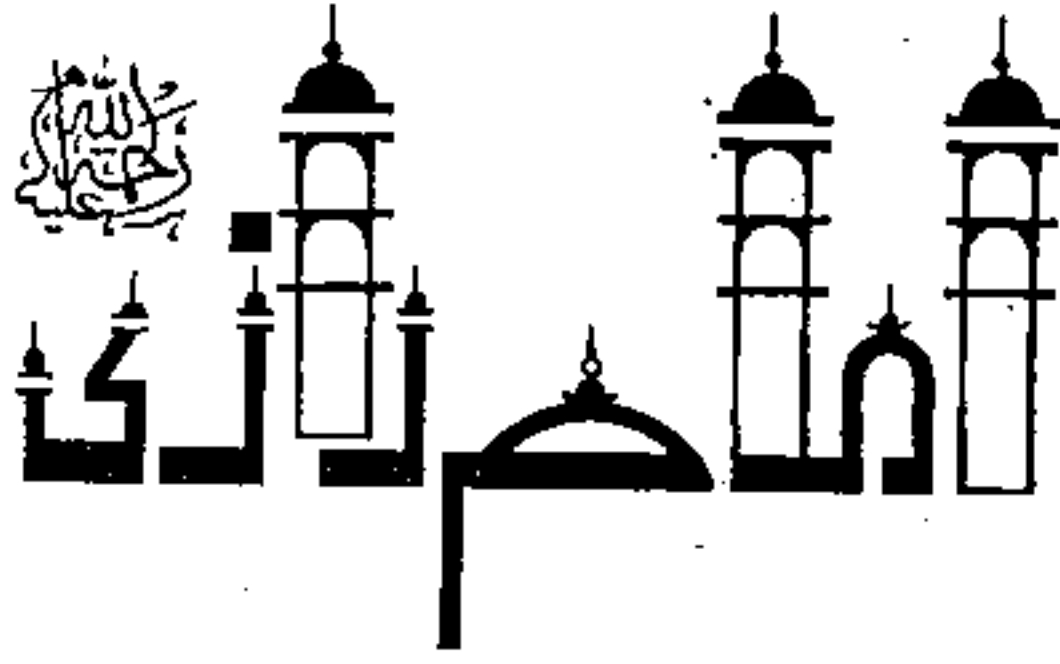
بامیان سے ہرات پہنچنے پر والیٔ ہرات حُسین خرمیل نے امام رازی کا نہایت شان و شوکت اور تزک و احتشام کے ساتھ استقبال کیا۔ جامع مسجد کے ایوانِ صدر میں ایک خاص منبر نصب کروایا گیا۔ تاکہ امام رازی اس منبر پر متمکن ہوں اور لوگ ان کی زیارت سے شرف اندوز ہوں اور اُن کے کلام کو سُن سکیں۔ امام رازی ایوانِ صدر میں رونق افروز ہوتے۔ اُن کو دیکھنے کے لیے لوگ کثرت سے وہاں موجود تھے۔ آپ کے دونوں طرف شہنشاہ فروکش تھے۔ ایک طرف سُلطان حسین خرمیل شاہِ ہرات اور دُوسری طرف سلطان شہاب الدین غوری کا بھانجا سلطان محمود شاہ فیروزکوہ بیٹھے تھے۔ ترک غلاموں کی دو صفیں تلواروں سے ٹیک لگائے ایوان کے اندر مسلح ہیکل کی طرح جمی ہوئی تھیں۔ امام رازی نے "نفس" کے موضوع پر ایک جامع اور مدلّل تقریر شروع کی۔ تقریر خاصی طویل تھی۔ دورانِ تقریر ایک باز ایک کبوتر پر جھپٹا اور وہ بدحواسی کی حالت میں اِدھر اُدھر مسجد میں اُڑنے لگا۔ یہاں تک کہ تھک کر امام صاحب کے پاس گر پڑا اور باز کے حملہ سے محفوظ رہا۔ شرف الدین ابن عینن مشہور شاعر بھی اس جلسے میں موجود تھا۔ اُس نے اس موقع پر فی البدیہہ دو شعر کہے۔ جس کا مفہوم تھا۔ یعنی وہ کبوتر سلیمان زماں کے پاس اپنی فریاد لے کر اسی حالت میں آیا کہ اُچک لینے والے باز کے پروں کے درمیان اُس کی موت نظر آ رہی تھی۔ کبوتر کو کس نے بتایا کہ آپ کا محل حرم ہے اور آپ خوف زدوں کے لیے جائے پناہ ہیں۔

امام رازیؒ ان اشعار کو سُن کر نہایت محظوظ ہوتے اور شرف الدین ابن عینن کو اپنے پاس بُلا کر بٹھایا اور جب مجلسِ وعظ برخاست ہوئی تو اُس کو خلعت اور بہت سی اشرفیاں عطا کیں۔

❖

سلیمانِ زماں حضرت امام فخر الدین رازی ۲۵ رمضان ۵۴۳ھ یا ۵۴۴ھ میں "رے" شہر میں پیدا ہوتے۔ آپ کے والدِ گرامی کا نام عُمر تھا اور ان کی کنیت ابوالقاسم اور لقب ضیاء الدین تھا۔ وہ اپنے زمانے کے بہت بڑے واعظ، متکلم، صُوفی، محدّث، ادیب اور اُستادِ پرداز تھے۔ انہوں نے علم کلام اور فقہ کی تعلیم ابوالقاسم انصاری اور ابوامجد الحسین بن

مسعود فرا البغوی سے حاصل کی تھی۔ انہوں نے علم الکلام میں "غایتہ المرام" کے نام سے دو جلدوں پر مشتمل ایک نہایت محققانہ کتاب بھی لکھی۔ اس کے علاوہ انہوں نے فنِ اصول و وعظ پر نہ صرف متعدد کتابیں لکھیں بلکہ شہر "رے" میں ان کا درس و تدریس کا بھی شغل ایک طویل عرصہ تک رہا۔ ان کی فصاحت بیانی کی وجہ سے بکثرت لوگ ان کے درس میں شریک ہوا کرتے تھے اور ان کو خطیب "رے" کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ امام رازی کو بھی اسی بنا پر ابن خطیب بھی کہا جاتا ہے۔

امام رازی کا اصل نام محمدؒ ابو عبداللہ تھا۔ مفسرین تفسیروں کا حوالہ دیتے ہوتے آپ کو ابو عبداللہ رازی لکھتے ہیں۔ آپ کی کنیت ابو الفضل اور لقب فخر الدین تھا۔ ہرات میں آپ کو شیخ الاسلام کے لقب سے بھی پکارا جاتا تھا۔ آپ کے سلسلۂ نسب کے متعلق مشہور مؤرخ البکری شہرزاری نے تاریخ الحکما میں تحریر کیا ہے کہ آپ حضرت ابو بکر صدیقؓ سے نسبی سلسلہ رکھتے تھے مگر امام رازی نے خود اپنی تصانیف میں تصریح کی ہے کہ وہ حضرت عمرؓ بن خطاب کی اولاد سے ہیں۔ اور ظاہر ہے اس ضمن میں امام صاحب کا قول ہی زیادہ معتبر ہوسکتا ہے چنانچہ پہلی بات پر یقین نہیں کیا جاسکتا۔

امام رازی نے ابتدائی تعلیم اپنے محترم پدر گاہی سے حاصل کی۔ بلکہ جب تک وہ زندہ رہے آپ نے کسی اور معلم کی طرف رجوع نہ کیا۔ یوں علم کلام اور علم فقہ کی تعلیم آپ کو آپ کے والد صاحب نے ہی دی۔ والد کی وفات کے بعد امام صاحب ایک طویل عرصہ تک کمال سمنانی سے علم فقہ پڑھتے رہے۔ اسی طرح ایک اور بزرگ جن کا نام تاریخ میں نہیں ملتا اُن سے بھی آپ تعلیم حاصل کرتے رہے۔ امام صاحب نے مرند کے قاضی محی الدین کے والد سے بھی فقہ کی تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد آپ نے علم حکمت کی طرف توجہ دی۔ آخر آپ "رے" میں واپس تشریف لاتے اور مجد جیلی جو ایک نامور اُستاد تھے اُن سے تعلیم حاصل کرتے رہے۔ جب مجد جیلی کو مراغہ میں درس و تدریس کے لیے بلایا گیا تو امام رازی بھی ان کے ساتھ وہاں گئے اور ایک لمبے عرصہ تک مراغہ میں مجد جیلی کے ہمراہ رہے اور علم کلام اور علم حکمت میں ان سے اسباق لیتے رہے۔

امام رازی کی ابتدائی زندگی سخت مفلسی اور تنگدستی میں گزری تھی۔ آپ نے حصولِ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد کچھ ایک سفر بھی کیے لیکن مالی تنگی کی بناء پر آپ کو سفر میں کافی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اسی پریشان کن مسافرت میں ایک مرتبہ آپ مشہور طبیب ثقۃ الدین شرف الاسلام عبدالرحمٰن بن عبدالکریم السرخی کے مہمان ہوتے۔ انہوں نے آپ کی نہایت اچھے طریقے سے پذیرائی کی اور خاطر مدارت کی۔ امام صاحب نے اُن کے شکریے میں قانون شیخ کے متعلق الفاظ کی شرح کی اور اس شرح کو اُن کے نام سے منسوب کر دیا اور اس کے مقدمہ میں اُن کی بڑی تعریف کی اور لکھا کہ اس علم و فضل کے ساتھ انہوں نے مجھ پر بہت احسانات کیے۔ زمانہ قیام اور زمانہ سفر میں میری فارغ البالی اور اصلاحِ حال سے ان کے قلب کا تعلق رہا۔

خوارزم اور ماوراء النہر کے سفر کے بعد امام صاحب کی غربت اور تنگدستی کا دور ختم ہوگیا۔ اور ماوراء النہر سے واپس پہنچتے ہی آپ کے دروازے پر فارغ البالی اور دولت نے دستک دینا شروع کر دی۔ اس قصے کا پس منظر یوں ہے کہ "رے" میں ایک نہایت صاحب ثروت طبیب رہتا تھا۔ اُس کی دو لڑکیاں تھیں۔ اچانک وہ طبیب بیمار پڑ گیا۔ باوجود کوشش اور علاج معالجے کے اُس کو شفایابی نہ ہوسکی۔ موت اُس کے قریب آگئی۔ اس نے مرنے سے پہلے اپنی دونوں لڑکیاں امام رازی کے دونوں لڑکوں کے ساتھ بیاہ دیں۔ یوں اُس دولت مند طبیب کی تمام دولت امام صاحب کے گھر منتقل ہوگئی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی تنگدستی ختم کرکے ان کو رئیسِ زمانہ بنا دیا۔

مشہور کتاب للسان المیزان میں تحریر ہے کہ امام رازی اس قدر متمول ہوگئے کہ چالیس غلام سنہری کمربند باندھے اور منقش پوشاک پہنے ہر وقت آپ کے ارد گرد ایستادہ رہتے تھے۔ مال و دولت کے ساتھ جاہ و اعزاز میں بھی آپ کی ترقی ہوگئی۔ اور صورت حال یہ ہوگئی کہ آپ جہاں جاتے ' امیر غریب سب آپ کی ملاقات و زیارت کو آتے تھے۔ ہرات

میں جب آپ کی تشریف آوری ہوئی تو وہاں کے تمام علماء، صلحاء، امراء وسلاطین آپ کی ملاقات کو آتے۔ اور شہر میں کوئی ایسا آدمی نہ رہا جو آپ کی ملاقات کو نہ آیا ہو۔ سوائے ایک شخص کے جو کہ نہایت صالح اور اپنے زاویہ میں گوشہ نشین تھا۔ امام رازی کو جب اس شخص کے متعلق خبر ہوئی تو آپ نے لوگوں سے فرمایا "میں مسلمانوں کا امام ہوں اور واجب التعظیم شخص ہوں۔ پھر پورے شہر میں صرف ایک شخص ایسا ہے جو میری ملاقات کو نہیں آیا تو اس کی کوئی خاص وجہ ہی ہو سکتی ہے۔" آپ نے اپنے خدام کو اس مرد صالح کے پاس بھیجا اور اُس کے نہ آنے کی وجہ پوچھی۔ مگر اس نے امام رازی کے سوال کا جواب دینا بھی مناسب نہ سمجھا اور سکوت طاری کیے رکھا۔

ایک روز اہل ہرات نے اُس مرد صالح کی دعوت کی اور اس دعوت میں امام رازی کو بھی مدعو کیا۔ یہاں امام صاحب کی تارک دُنیا ہونے والے ایک شخص سے ملاقات ہو گئی۔ آپ نے اُس سے ملاقات نہ کرنے کی وجہ دریافت کی تو اُس نے کہا "میں ایک فقیر آدمی ہوں۔ نہ میری ملاقات سے کسی کو کوئی شرف حاصل ہو سکتا ہے۔ نہ میرے ملنے سے کسی میں کوئی نقص پیدا ہو سکتا ہے۔" امام صاحب یہ جواب سُن کر کچھ دیر خاموش رہے پھر اُس نیک شخص سے مخاطب ہوتے اور کہا۔ یہ جواب جو آپ نے دیا ہے یہ تو اہلِ ادب یعنی صوفیا۔ کا ہو سکتا ہے۔ آپ مجھے اپنی حقیقتِ حال سے آگاہ کریں تاکہ میں آپ کے متعلق کچھ جان سکوں۔"

اس مرد صالح نے امام رازی سے پوچھا "آپ سے کس بناء پر ملاقات واجب تھی۔" امام صاحب نے جواب دیا "میں مسلمانوں کا امام ہوں اور واجب التعظیم شخص ہوں۔" اس شخص نے جواباً کہا "آپ کا سرمایہ فخر علم ہے۔ لیکن خُدا کی معرفت راس العلوم ہے۔ پھر آپ نے خدا کو کیونکر پہچانا۔" امام رازی نے فرمایا "سو دلیلوں سے" اس مردِ صالح نے کہا "دلیل کی ضرورت تو شک کو زائل کرنے کے لیے ہوتی ہے مگر خُدا نے میرے دل میں ایسی روشنی ڈال دی ہے کہ اس کی وجہ سے میرے دل میں شک کا گزر نہیں ہو سکتا کہ مجھ کو کسی دلیل کی ضرورت ہو۔"

امام صاحب کے دل پر اس کلام نے بڑا اثر کیا اور اسی مجلس میں اس مرد صالح کے ہاتھ پر آپ نے توبہ کی۔ بیعت کی اور خلوت نشین ہو گئے۔ برکاتِ تصوف امام رازی کو جس مردِ صالح سے ملیں اس کا نامِ گرامی حضرت نجم الدین کبریٰ تھا اور یہ وہ شخص تھے جو نہ صرف امام رازی کے پیر و مرشد تھے بلکہ انہیں اللہ تعالیٰ نے ایسے اوصاف سے نوازا تھا کہ جس شخص کو دیکھ لیتے وہ ولی ہو جاتا تھا۔ اسی وجہ سے حضرت نجم الدین کبریٰ" کو ولی ساز یا ولی گر کہا جاتا ہے۔ اس ولی گر کی مریدی کا شرف امام رازی" کو حاصل ہوا۔

امام رازی کو اللہ تعالیٰ نے بڑے بلند مراتب عطا فرماتے تھے۔ آپ علماء اور عام مسلمانوں میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ جہاں امام رازی کی قدردانی اہل روحانیت و ریاضت میں تھی وہاں بادشاہان وقت بھی امام صاحب کو بڑی عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے۔ آپ کے زمانے میں خراسان، غور، غزنہ اور خوارزم وغیرہ پر غوری اور خوارزم شاہی خاندان نے حکومتیں کی ہیں۔ ان حکومتوں کے ممتاز فرمانرواؤں نے امام رازی کی نہایت قدر و منزلت کی۔

غوری خاندان میں سلطان غیاث الدین غوری نہایت فیاض، علم دوست، بے تعصب اور خوش عقیدہ انسان تھا۔ اس نے خراسان میں بہت سے صدقات و اوقاف کیے۔ بہت سے مدرسے، مسجدیں قائم کیں۔ اسی طرح راستوں میں بہت ساری خانقاہیں تعمیر کرائیں۔ جس شہر میں بھی غیاث الدین غوری جاتا وہاں کے عام باشندوں، فقہا اور اہل علم پر بہت بذل و کرم کرتا۔ اپنے خزانوں سے ان کے لیے سالانہ وظائف مقرر کر دیا کرتا تھا۔ فقرا پر زرپاشی اور شعرا وغیرہ کے ساتھ خصوصی مراعات کرتا تھا۔ اس کے ساتھ خود نہ صرف عبادت گزار تھا بلکہ نہایت خوش خط بھی تھا۔ اپنے

ہاتھ سے قرآنِ حکیم تحریر کرنا اس کا معمول تھا۔ غیاث الدین غوری نے اپنی سلطنت میں سلطان شہاب الدین غوری جو آپ کا برادرِ خورد تھا اور شجاعت اور تدبر و سیاست میں بڑی دست برُد رکھتا اس کو بھی حکومت میں شریکِ کار بنا لیا۔ ان حکمرانوں نے امام رازی کی بڑی قدردانی کی۔ ہرات کی جامع مسجد کے قریب ان کے لیے ایک عالی شان مدرسہ تعمیر کر گیا۔ امام صاحب نے بھی ان کا حقِ نعمت ادا کیا۔ اور اس کے نام پر لطائف غیاثیہ اور دُوسری کتابیں تصنیف کیں۔ ان دنوں کرامیہ فرقہ جو کہ ظاہر پرست لوگوں پر مشتمل تھا اور خدا کو مجسم مانتا تھا نے غوریوں اور ہرات کے باشندوں میں اثر پیدا کر لیا۔ یہ فرقہ ابو عبداللہ محمد بن اکرم المتوفی ۲۵۵ھ کی طرف منسوب ہے۔ یہ شخص سجستان کا رہنے والا تھا۔ بڑا عابد و زاہد تھا۔ اس نے پانچ سال تک مکہ میں اعتکاف کیا۔ لیکن اس عبادت و ریاضت کے باوجود نہایت ضعیف حدیثیں روایت کیا کرتا تھا۔ وہ خدا کو مجسم اور عرش پر متمکن مانتا تھا۔ امام رازی نے اس اساس التقدیس میں اس کے اسی عقیدے کو باطل قرار دیا۔ اس کرامیہ فرقے کے لوگوں نے امام رازی کے جاہ و جلال کو اس قدر بلند دیکھا تو وہ آپ کے مخالف ہو گئے۔ امام صاحب پہلے ہی ان لوگوں کے باطل عقیدے کی وجہ سے ان کو ناپسند کرتے تھے۔ اسی باہمی شکر رنجی کی وجہ سے امام رازی کو ایک منظم جماعت کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا جس میں سلطان غیاث الدین غوری کا برادرِ عم زاد اور اس کا داماد ضیاء الدین شامل تھے۔ اسی مخاصمت و مخالفت کے نتیجہ میں امام صاحب کو کرامیہ فرقے کے اکابرین کے ساتھ ۵۹۰ھ میں کوہ فیروز کے مقام پر ایک مناظرہ کرنا پڑا۔ مناظرہ میں فقہائے کرامیہ، حنفیہ، شافعیہ سلطان غیاث الدین غوری کے پاس جمع ہوتے۔ مناظرہ میں ایک طرف امام رازی اور دوسری طرف قاضی مجد الدین عبدالمجید بن عمر المعروف بابن قدوہ جو کرامیہ فرقہ کا بانی تھا، گفتگو کے دوران ابن قدوہ نے بہت سی باتوں پر اعتراضات اُٹھاتے جن کا جواب امام رازی بڑے تحمل اور نرمی سے دیتے رہے۔ بعد میں قدوہ نے نرم روی اور نرم گوئی اختیار کی لیکن اُس کے باطل عقائد کی بنا پر امام صاحب سخت جلالیت میں آ گئے۔ اور انہوں نے قدوہ کو سخت بُرا بھلا کہا۔ جس کی شکایت ضیاء الدین نے سلطان غیاث الدین غوری سے کی مگر سلطان نے اس بات کو کوئی اہمیت نہ دی جس کا ابن قدوہ کو بڑا رنج ہوا۔ اس مناظرہ سے اگلے روز جامع مسجد میں وعظ کیا۔ حمد و نعت کے بعد اس نے لوگوں سے کہا "ہم وہی بات کہتے ہیں جو رسول اللہ کی احادیث سے ہمارے نزدیک صحیح ثابت ہوتی ہے۔ ارسطو کے علم ابن سینا کی کفریات اور فارابی کے فلسفہ سے ہم ناواقف ہیں۔ پھر ایک شیخ الاسلام کو جو خدا کے دین اور اس کے پیغمبر کی سنت کی جانب سے مدافعت کرتا تھا اس کو کیوں بُرا بھلا کہا گیا۔ یہ کہہ کر ابن قدوہ رو پڑے۔ اُن کو دیکھ کر کرامیہ فرقہ کے تمام لوگ بھی رو پڑے۔ شہر میں فتنہ فساد پھیل گیا اور کشت و خون کا خطرہ پڑ گیا۔ چنانچہ سلطان غیاث الدین غوری نے فتنہ دبانے کے لیے امام صاحب کو ہرات واپس بھیج دیا۔

بعض تاریخ دانوں نے اس واقعہ اور مناظرہ کے متعلق کہا ہے کہ یہ بالکل غلط ہے بلکہ حقیقت یوں ہے کہ امام رازی سلطان غیاث الدین غوری اور اس کے بھائی شہاب الدین غوری کے پاس پہنچے جو بلادِ غور کے بادشاہ تھے۔ بلادِ غور کے اطراف کے اکثر باشندے کرامیہ مجسمہ فرقہ سے متعلق تھے۔ سلطان غیاث الدین غوری امام صاحب کی قوتِ استدلال سے کسی قدر کرامیہ مذہب سے منحرف ہو گیا۔ اتفاق سے ایک روز امام صاحب نے اپنے وعظ میں ضمناً ایسی باتیں کہیں جو کرامیہ مذہب کے خلاف تھیں اس لیے ان لوگوں نے امام رازی پر حملہ کرنے کی کوشش کی مگر سلطان غیاث الدین نے آپ کی مدد کی اور آپ کو اُن سے بچایا۔ اور یوں غزنہ میں تشریف لے گئے۔ سلطان غیاث الدین کی طرح سلطان شہاب الدین غوری بھی امام رازی کا قدردان تھا۔ ایک مرتبہ امام رازی نے سلطان کے سامنے وعظ میں فرمایا "اے سلطان عالم! نہ تیرا اقتدار قائم رہے گا اور نہ ہی رازی کا تملق و نفاق باقی رہے گا۔ اس پر بادشاہ زار و قطار رونے لگ گیا۔

عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں لکھا ہے کہ سلطان شہاب الدین غوری کے دربار میں بہت سے علماء

شعرائے تربیت پائی جن میں امام فخرالدین رازی مستقلاً اس کے لشکر گاہ میں قیام رکھتے تھے اور ہر ہفتہ وعظ کہتے تھے۔ بادشاہ باقاعدگی سے وعظ میں شرکت کرتا تھا۔

غوری خاندان کی طرح خوارزمشاہی خاندان میں علاالدین خوارزمشاہ اور اس کا بیٹا محمد بن تکش خوارزمشاہ نہایت جاہ و جلال والے بادشاہ گزرے ہیں۔ سلطان علاالدین ۵۶۸ھ میں تخت نشین ہوا اور اپنا رقبہ سلطنت سندھ، ہند، ماورالنہر خراسان اور بغداد تک وسیع کر لیا۔ اس کی فوج کی تعداد ایک لاکھ تھی اس نے سلجوقیوں کا خاتمہ کیا اور ۵۹۶ھ میں وفات پائی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا محمد بن تکش خوارزمشاہ فرمانروا ہوا۔ اس نے خوارزمشاہی حکومت کو اور بھی وسیع اور طاقتور بنا دیا۔ اس نے تقریباً اکیس سال تک حکومت کی۔ اس کے دور میں اس کا رقبہ سلطنت عراق سے ترکستان، بلاد غزنہ، ہندوستان کے بعض حصے سجستان، کرمان، طبرستان، جرجان، خراسان اور فارس تک پھیل گیا۔ یہ بادشاہ خود بھی عالم تھا اور علما و فضلا کی تعظیم و توقیر بھی کرتا تھا۔ ان کی صحبتوں اور مناظروں میں اکثر شریک ہوتا تھا۔ ان مذکورہ بالا دونوں بادشاہوں نے بھی امام رازی کی بڑی قدر دانی کی۔ بلکہ محمد بن تکش خوارزمشاہ تو امام صاحب کا شاگرد بھی تھا۔ اس کے دور میں امام صاحب کو بہت زیادہ جاہ و جلال اور عزت و تکریم حاصل ہوئی۔ امام صاحب کے بیان اور علمیت میں اللہ تعالیٰ نے وہ تاثیر پیدا کر رکھی تھی کہ آپ کی باتیں سماعت پر گراں بھی نہ گزرتی تھیں اور زود دل نشین ہو جاتی تھیں اور وعظ سننے والا آپ کی علمیت کا بے اختیار معترف ہو جاتا تھا۔

❖

حضرت نجم الدین کبریٰ کی ملاقات کے بعد امام رازی نے خلوت نشینی اختیار کر لی اور خلوت سے نکلنے کے بعد آپ نے تفسیر کبیر لکھنی شروع کی۔ اس میں فلسفیانہ اور متکلمانہ مباحث کے ساتھ جا بجا صوفیانہ حقائق و معارف بھی پاتے جاتے ہیں جو ان کی تصریحات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس تفسیر کے لکھنے کے بعد اور علوم کی وقعت آپ کے دل سے جاتی رہی۔ وہ صرف قرآن حکیم کو ہی دینی و دنیوی سعادت کا منبع سمجھتے رہے۔

آپ تفسیر کبیر میں ایک موقع پر تحریر فرماتے ہیں "اگرچہ میں نے مختلف قسم کے علوم نقلیہ و عقلیہ کی کتابیں لکھی ہیں لیکن اس علم کی خدمت کی وجہ سے مجھ کو مختلف قسم کی جو دنیوی اور دینی سعادتیں حاصل ہوئیں۔ وہ اور دوسرے علوم کی وجہ سے حاصل نہیں ہوتیں"۔ اسی طرح آپ نے سورۃ یوسف کی تفسیر میں لکھا ہے "میری عمر بھر کا تجربہ یہ ہے کہ انسان جب کسی کام میں خدا کے سوا کسی اور پر بھروسہ کرتا ہے تو یہ شدت، ابتلا اور مصیبت کا سبب ہو جاتا ہے اور جب مخلوق کو چھوڑ کر خدا پر بھروسہ کرتا ہے تو وہ مقصد عمدہ طریقہ سے حاصل کر لیتا ہے۔ یہ تجربہ مجھ کو ابتدائی عمر سے آج تک برابر حاصل ہوتا رہا ہے جبکہ اب میری عمر ۵۷ سال ہو گئی ہے۔ اس سے میرے دل پر یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ خدا کے فضل و احسان کے علاوہ کسی چیز پر بھروسہ کرنے میں انسان کا کوئی فائدہ نہیں ہے"۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ امام رازی ہر وقت مراقبہ میں رہتے تھے اور اپنے نفس کا بھرپور انداز میں محاسبہ کرتے تھے۔

لسان المیزان میں تحریر ہے کہ امام رازی نماز روزہ میں کبھی کمی نہیں کرتے تھے اور علم کلام میں مہارت کے باوجود کہا کرتے تھے کہ جو شخص بوڑھی عورتوں کے دین کا پابند ہو وہی کامیاب ہوتا ہے۔

آپ نے تفسیر کے باب میں ابومسلم کے اقوال کو تعجب تعبیر کیا ہے۔ ایک جگہ امام صاحب تحریر فرماتے ہیں "میرے نزدیک ابومسلم کا کلام تفسیر میں عمدہ ہوتا ہے۔ ان اقوال میں معقولیت ہوتی ہے اور وہ تہ میں ڈوب کر خوب خوب لطائف و دقائق نکالتے ہیں"۔ اسی طرح قفال کی نسبت آپ نے فرمایا "قفال رحمۃ اللہ کا کلام شاندار ہوتا ہے اور تفسیر میں نہایت اچھا ہوتا ہے اور وہ الفاظ کی تاویلات میں نہایت دقیق النظر تھے"۔

آپ نے تفسیر کبیر کے مختلف مباحث میں امام غزالی کی تصنیفات سے خاص طور پر فائدہ اُٹھایا اور جا بجا ان کے نام کی تصریح کی۔ ایک موقع پر نبوت کی بحث میں لکھتے ہیں "مَیں نے شیخ ابو حامد غزالی کے کلام میں ایک عمدہ بحث دیکھی جس کا خلاصہ یہ ہے انسان یا تو ناقص ہوگا یا کامل یا پھر دونوں خوبیوں سے خالی ہو گا۔ پھر ناقص بذاتِ خود اگر ناقص ہے اور دوسرے کے حالات کے ناقص بنانے کی کوشش نہیں کرتا تو پہلا شخص گمراہ ہے اور دوسرا گمراہ اور گمراہ ساز۔ اس طرح کامل شخص بھی اگر بذاتِ خود کامل ہے لیکن دوسروں کی تکمیل نہیں کر سکتا تو یہی لوگ اولیا۔ ہیں اور اگر بذاتِ خود کامل ہونے کے ساتھ ناقصوں کی تکمیل بھی کر سکتا ہے تو یہی لوگ انبیا ہیں اور چونکہ نقصان و کمال اور کامل کرنے اور گمراہ کرنے کے مراتب کمیت و کیفیت کے لحاظ سے غیر متناہی ہیں اس لیے ولایت و نبوت کے مراتب بھی لازمی طور پر کمال و نقصان کے لحاظ سے غیر متناہی ہیں۔ اور ولی وہ انسانِ کامل ہے جو تکمیل کی قدرت نہیں رکھتا۔ جبکہ نبی وہ انسان ہے جو کامل بھی ہے اور کامل بنانے کی قدرت بھی رکھتا ہے۔ پھر اس کی رُوحانی طاقت کبھی صرف دو ناقص انسانوں کی تکمیل کر سکتی ہے اور کبھی اس کی اس سے بھی زیادہ طاقت ہوتی ہے۔

اس خلاصہ کو نقل کرنے کے بعد امام رازی لکھتے ہیں کہ یہ اسرارِ عالیہ قرآن مجید کے الفاظ میں چھپے ہوتے ہیں۔ جو شخص قرآن مجید کے علم پر نظر تو ڈالتا ہے لیکن ان اسرار و رموز سے غافل رہتا ہے۔ درحقیقت وہ قرآنِ حکیم کے اسرار سے محروم رہتا ہے۔

امام رازی کی تصنیفات کی روزانہ کی تعداد جو تفسیر کبیر کی بعض سورتوں کی تفسیر معلوم ہوتی ہے۔ نہایت حیرت انگیز ہے مثلاً سورۃ انفال کی تفسیر کے خاتمے پر آپ لکھتے ہیں "اس سورۃ کی تفسیر رمضان ۶۰۱ھ میں اتوار کے روز تمام ہوئی۔ اس کے بعد سورۃ توبہ کی تفسیر شروع ہوئی۔ اس کی تکمیل ۴ار رمضان ۶۰۱ھ جمعہ کے روز ہوئی۔ ان کا حساب لگایا جائے تو آپ کی تصنیف کی روزانہ کی مقدار ۱۴ صفحات ہوتی ہے۔

امام صاحب نے تصنیف و تالیف کا زمانہ نہایت بے اطمینانی اور پریشانی کی حالت میں گزارا۔ آپ نے تفسیر کبیر میں جا بجا اپنی پریشانیوں کا ذکر کیا ہے۔ سورۃ یونس کی تفسیر کے خاتمے پر آپ نے لکھا ہے کہ اس سورۃ کی تفسیر مَیں نے رجب ۶۰۱ھ میں مکمل کی اور فرزند صالح محمد کی وفات کی وجہ سے مَیں ان دنوں تنگدل اور غمزدہ تھا۔ اسی طرح سورۃ یوسف کے خاتمے پر بھی آپ نے اپنی غمزدگی کا اظہار کیا ہے۔ طوائف الملوکی اور خانہ جنگی کی وجہ سے بھی بے اطمینانی اور پریشانی آپ کو لاحق رہی لیکن اس کے باوجود آپ نے تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس کے لیے سفر و حضر کی بھی کوئی تخصیص نہ تھی۔ بلکہ تفسیر کبیر میں بہت سی سورتوں کی تفسیر آپ نے حالتِ سفر میں ہی مکمل کی۔ سورۃ انفال کی تفسیر آپ نے ایک گاؤں بغدان میں ختم کی اس کے آخر پر آپ نے خدا سے دُعا کی "اے خُدا تعالیٰ زمانے کی سختی ظالموں کے داؤ گھات اور خوف و ہراس سے نجات دے" سورۃ ابراہیم کی تفسیر کو آپ نے بغداد میں مکمل کیا۔ سورۃ بنی اسرائیل کی تفسیر شہر غزنی میں تمام ہوئی اور سورۃ کہف کی بھی تفسیر غزنی ہی میں مکمل ہوئی۔ امام رازی کی تصنیفات کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان کی وجہ سے مسلمانوں کی تصنیفی تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوا کیونکہ امام صاحب نے اندازِ تحریر میں ایک جدت اور شگفتگی پیدا کی۔

مولانا شبلی خاص طور پر آپ کی تفسیر کبیر کے متعلق قلم آرائی کرتے ہیں کہ جیسے امام رازی کا عام انداز ہے وہ وسعت اور تبحر علمی رو میں رطب و یابس کی تمیز نہیں کرتے تھے۔ سینکڑوں سرسری باتیں لکھ جاتے ہیں جو ان کے شایان شان نہیں ہوتیں تاہم ان خشو و زاہد کے ساتھ سینکڑوں ایسے دقیق اور معرکۃ الآرا۔ مسائل انہوں نے حل کیے جن کا کسی اور کتاب میں نام و نشان نہیں ملتا۔

امام رازی کی تصانیف میں تفسیر کبیر بہت مشہور ہے۔ اس کے علاوہ آپ نے علوم و فنون پر عربی اور فارسی میں نہا

کثرت سے کتابیں لکھیں جن میں اسرار التنزیل وانوار التاویل۔ یہ بھی ایک قسم کی تفسیر ہے۔ سورۃ فاتحہ کی تفسیر، سورۃ البقرہ جو صرف عقلی طرز پر تحریر کی گئی۔ سورۃ اخلاص کی تفسیر میں بعض اسرار بیان کیے جن سے اکثر مفسرین ناواقف تھے۔ خداوند تعالیٰ کے اسماء وصفات کی شرح میں لوامع البینات فی شرح اسماء اللہ تعالیٰ وصفات لکھی۔ محصل یہ کتاب علم کلام کے اصول وفوائد کے موضوع پر لکھی۔ ربعین فی اصول الدین۔ معالم۔ الخمسین فی اصول الدین۔ اس کتاب میں آپ نے علم کلام کے پچاس اصول بیان کیے ہیں۔ نہایۃ العقول۔ کتاب القضاء والقدر۔ اساس التقدیس۔ اس کتاب میں جسمانیت اور عوارض جسمانیت کا ذکر کیا گیا ہے۔ لطائف الغاثیہ۔ عصمۃ الدنیا۔ اس کتاب میں ایک خاص مسئلہ یعنی پیغمبروں کی عصمت کو ثابت کیا گیا ہے۔ مطالب العالیہ۔ یہ امام صاحب کی آخری کتاب ہے۔ رسالہ فی النبوات۔ اس میں نبوت کے متعلق اہم مسائل کا ذکر ہے۔ مباحث مشرقیہ۔ شرح عیون الحکمۃ۔ الاحکام العلائیہ فی الاعلوم السماویہ۔ اس طرح آپ نے کوئی اسّی کے قریب کتابیں مختلف موضوعات پر تحریر کی ہیں۔ آپ نے اپنی تصانیف میں مختلف علوم کے متعلق ان لوگوں کے خیالات ومسائل سے فائدہ اٹھایا جو آپ کے دور سے پہلے اس علم میں خاص طور پر شہرت وامتیاز رکھتے تھے۔ فلسفہ وحکمت میں انہوں نے بوعلی سینا اور ابونصر فارابی کی تصانیف سے فائدہ اٹھایا۔ قفطی نے ان کے حالات میں لکھا ہے کہ" امام رازی نے خراسان جا کر ابونصر فارابی اور بوعلی سینا کی تصانیف سے واقفیت حاصل کی۔ اور ان کے علم میں اس طرح بہت اضافہ ہوا۔" اسی طرح ابوبرکات بغدادی کی کتاب المعتبر سے امام صاحب نے خاصا فائدہ اٹھایا اور جا بجا اپنی فلسفیانہ تصانیف میں اس کا حوالہ دیا ہے۔ بلکہ شہرزوری کی تصریح کے مطابق امام صاحب نے حکما پر جو اعتراضات کیے ہیں ان میں اکثر ابوبرکات بغدادی ہی سے ماخوذ ہیں۔

تفسیر کبیر میں بہت سے مواقعوں پر آپ نے حکما کے اقوال تحریر کیے ہیں اور بعض جگہوں پر صاف صاف تصریح بھی کی ہے۔ ان اقوال کے نقل کرنے سے معقول اور منقول میں تطبیق دینا مقصود ہے۔ قیامت کے حساب وکتاب کے متعلق حکمائے اسلام کی نقل کرتے ہوئے امام رازی تحریر فرماتے ہیں کہ یہ وہ اقوال حکمت ہیں جو فلسفہ کے ساتھ حکمت نبویہ کی تطبیق دینے کے لیے بیان کیے گئے ہیں۔ امام صاحب نے اپنی تصانیف میں کسی جگہ بھی اپنے پیش رو حکما کے ناموں کا ذکر نہیں کیا۔ اس لیے یہ تحریر کرنا ممکن نہیں۔ البتہ شہرزوری نے جن حکماء کا تذکرہ امام رازی کے حوالے سے کیا ہے ان کے نام حسب ذیل ہیں۔

عبدالکریم شہرستانی، یعقوب کندی، ابوزید بلخی اور ابوالقاسم الحسن بن فضل الراغب بن خلکان نے امام رازی کے حالات کے متعلق تحریر کیا ہے کہ وہ پہلے شخص ہیں جن کی کتابوں میں ترتیب کی ایجاد ہوتی ہے اور ایسی باتیں انہوں نے بیان کی ہیں جن کو ان سے پہلے کسی نے بیان نہیں کیا۔ اس بناء پر قدماء کے بعد تصنیف وتالیف کا جو نیا انداز قائم ہوا ہے اس کا پہلا خاکہ امام رازی نے ہی قائم کیا ہے اور بعد میں لوگوں نے امام صاحب کی تقلید کی۔ امام صاحب کی تصنیفات نے جو حسن قبول کیا اس کی وجہ سے لوگوں نے قدماء کی کتابیں بالکل چھوڑ دیں۔ اس بناء پر امام رازی کے بعد علوم اسلامیہ کا جو نیا دور شروع ہوا وہ آپ کا ہی پیدا کردہ ہے۔ علم کلام اور فلسفہ میں متاخرین کا ماخذ درحقیقت امام صاحب کی تصنیفات ہیں۔ آپ کی تحریروں میں سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ آپ نے مشکل سے مشکل مسائل کو اس قدر سہل اور آسان پیرائے میں بیان کیا ہے کہ ایک بچے کو بھی ان کے سمجھنے میں دقت پیش نہیں آتی۔ آپ سے پہلے فلسفہ وحکمت کے مسائل نہایت پیچیدہ اور دقیق لفظوں میں بیان کیے جاتے تھے۔ پہلے امام غزالیؒ نے اس طلسم کو توڑا اور ان مسائل کو آسان الفاظ میں بیان کیا کہ معمولی استعداد کا آدمی بھی ان کو آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ اس کے بعد امام رازیؒ نے اور بھی زیادہ ترقی کی اور فلسفہ وحکمت کو بازیچہ اطفال بنا دیا۔ آپ ہر مسئلہ پر نہایت جامعیت سے بحث کرتے تھے

توحید کے باب میں امام رازی نے "مباحث مشرقیہ" میں بیان کیا ہے کہ اگر دو چیزیں وجوب وجود میں شریک اور ماہیت و تعین میں مختلف ہوں تو ہر ایک کا وجوب وجود ہر ایک کے تشخص و تعین سے مختلف ہوگا۔
اوّل تو یہ کہ ان میں ہر ایک کے وجوب وجود اور تعین میں تلازم ہوگا یا پھر دونوں میں تلازم ہوگا۔ اگر دونوں میں تلازم نہیں ہے تو بذاتِ خود وجوب وجود اس تعین کو نہ چاہے گا۔ اسی طرح وہ تعین بھی وجوب وجود کو نہ چاہے گا۔ اس بنا پر وجوب وجود کو اس تعین کے ساتھ متصف کرنے کے لیے ایک خارجی سبب کی ضرورت ہوگی۔ اس لیے جن دو ذاتوں کو واجب الوجود تسلیم کیا گیا ہے وہ ممکن الوجود اور اپنی ایجاد اور تعین میں ایک دوسرے کی محتاج ہو جاتیں گی۔ پہلی صورت میں یعنی جب وجوب وجود اور تعین میں تلازم ہو تو یہ تلازم یا تو وجوب وجود اور تعین کی نفسِ حقیقت کا نتیجہ نہ ہوگا یا یہ کہ ان کی نفسِ حقیقت کا نتیجہ ہوگا۔ اگر ان کی نفسِ حقیقت کا نتیجہ نہ ہو تو اس کا کوئی خارجی سبب ہوگا اور جو چیز خارجی سبب کی محتاج ہوتی ہے وہ ممکن ہوتی ہے۔ اس لیے دونوں ذاتوں کو واجب الوجود قرار دیا گیا ہے وہ ممکن ہو جاتیں گی۔ اور اگر یہ تلازم دونوں کی تعین حقیقت کا اقتضاد ہو تو لازمی طور پر ایک دوسرے کی علت ہوگا اور دوسرا اس کا معلول ہوگا۔ کیونکہ اگر ہر ایک دوسرے کی علت ہو تو اس سے دور لازم آتے گا۔ لیکن تعین اور وجوب وجود کی علت نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ اس صورت میں اگرچہ وجوب وجود اس ذاتِ خاص میں داخل ہے تاہم وہ اس تعین سے خارج ہے کیونکہ وجوب وجود ان دونوں میں مشترک طور پر پایا جاتا ہے۔ اور دونوں کو ایک دوسرے سے امتیاز صرف تعین سے ہوتی ہے۔ اس بنا پر وجوب بالذات دوسری ماہیت کا تابع ہوگا اور یہ محال ہے۔
ارشادِ ربانی ہے کہ اگر زمین آسمان میں خدا کے سوا اور خدا ہوتے تو دونوں برباد ہو جاتے۔ اسی آیت کے متعلق فارسی کا ایک مقولہ ہے "دو بادشاہ در اقلیمے نگنجد" یعنی اگر زمین و آسمان میں متعدد خدا ہوتے تو ان میں جیسا دنیوی بادشاہوں میں باہم اختلاف ہوا کرتا ہے ہوتا اور اختلاف کے بعد جنگ و جدل تک نوبت پہنچتی اور دنیا کا نظم و نسق قائم نہ رہتا۔
جیسے خُدا تعالیٰ نے قرآن مجید میں ایک اور جگہ فرمایا

> "اور نہ اس کے ساتھ کوئی اور خُدا ہے ورنہ ہر ایک خدا اپنی مخلوق کو الگ لیے پھرتا اور وہ آپس میں لڑتے اور آخر کار ایک دوسرے پر غالب آجاتے۔ اے پیغمبر ان لوگوں سے کہہ دیجئے کہ اگر خُدا کے ساتھ جیسا کہ یہ لوگ کہتے ہیں اور بھی معبود ہیں تو ان معبودوں نے اس صورت میں کبھی کا مالکِ عرش (یعنی خُدا) تک پہنچنے کا راستہ ڈھونڈ نکالا ہوتا" (بنی اسرائیل)

امام رازی نے تفسیر کبیر میں اور علم کلام کی کتابوں میں اس دلیل کو برہانی دلیل قرار دیا ہے۔ اور فرمایا ہے "اگر دو خدا کا وجود فرض کر لیا جاتے تو ہر ایک تمام مقدور انتہا پر قادر ہوگا۔ اس لیے ہر ایک زید میں حرکت اور سکون پیدا کر سکے گا۔ اب اگر ایک نے زید میں حرکت اور دوسرے نے سکون پیدا کرنا چاہا اور دونوں اپنے اپنے ارادوں میں کامیاب ہو گئے تو اس سے ضدیں یعنی حرکت و سکون کا اجتماع لازم آتے گا اور یہ محال ہے۔
اسی طرح اگر دونوں اپنے اپنے ارادے میں ناکام رہے تو یہ بھی محال ہے کیونکہ ہر ایک کے ارادہ کی کامیابی میں دوسرے کا ارادہ باہم متضاد ہونے کی وجہ سے مانع ہے۔ اس لیے ایک اپنے ارادہ میں اس وقت کامیاب ہوگا جب دوسرا اپنے ارادے میں ناکام ہو۔ اسی طرح جب دوسرا اپنے ارادے میں کامیاب ہوگا تو پہلا ناکام ہوگا۔ اگر دونوں اپنے ارادے میں کامیاب ہو جاتیں تو یہ بھی مشکل ہے اور اگر صرف ایک کا مقصد حاصل ہو اور دوسرا اپنے ارادہ میں ناکام رہے یہ صورت بھی ناممکن ہے کیونکہ اوّل تو دونوں خُدا یکساں طور پر قدرت رکھتے ہیں۔ اس لیے ایک کی قدرت کو دوسرے

رت پر ترجیح دینے کی کوئی وجہ نہیں۔ دُوسرے یہ کہ جو خدا اپنے ارادہ میں ناکام رہتا ہے وہ عاجز ہوگا اور خدا کی ذات
عجز ایک عیب ہے۔

لیکن اس دلیل کی صحت اس پر موقوف ہے کہ ان دونوں معبودوں میں اختلاف کا ہونا لازمی اور قطعی ہو۔ حالانکہ وہ
ہی ولازمی نہیں بلکہ ممکن ہے۔ اس لیے دو معبودوں کی موجودگی میں نظام عالم کی ابتری ممکن ہوگی مگر لازمی نہ ہوگی حالانکہ
بتِ مذکورسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لازمی اور قطعی ہے۔

امام صاحب آگے چل کر بیان کرتے ہیں کہ ایک چیز کی دو علت تامہ نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ علت کی موجودگی میں معلول کا
د ضروری ہو جاتا ہے۔ اگر زید کا خالق ایک خُدا ہے تو اس کے وجود کے ساتھ زید کا وجود ضروری ہو جائے گا اور اس کو
سرے خُدا کی ضرورت نہ ہوگی۔ لیکن چونکہ یہ فرض کیا گیا ہے کہ زید کو دونوں خُدا نے مل کر پیدا کیا ہے۔ اس لیے وہ دُوسرے
ا کا بھی محتاج ہوگا اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ ہر ایک خُدا سے بے نیاز بھی ہوگا اور ہر ایک خدا کا محتاج بھی ہوگا
ر یہ محال ہے۔ لیکن اس دلیل پر بھی اعتراض ہوتا ہے کہ یہ صرف اس صورت میں کارآمد ہوسکتی ہے جب ان میں ہر
ب خدا چاہے کہ ہر ایک چیز مثلاً زید کو صرف وہی پیدا کرے اور یہ استبداد و اختلاف کی صورت ہے۔ لیکن یہ صورت
ن ہوسکتی ہے کہ ہر ایک دوسرے خُدا کی مخلوقات میں کسی قسم کی مداخلت کرنے کا ارادہ نہ کرے۔ مثلاً ایک زمین کو پیدا
ے، ایک آسمان کو، ایک حیوانات کو پیدا کرے۔ ایک نباتات کو اسی طرح تقسیمِ عمل کے اصول پر دونوں دُنیا کے
ر وبار کو چلائیں۔

امام رازی نے تفسیر کبیر میں توحید پر چودہ عقلی دلیلیں اور قائم کی ہیں لیکن ان کی نسبت خود تصریح کر دی ہے کہ وہ
ی اور خطابی ہیں۔ لہٰذا انھوں نے اس دلیل کی جو دوسری تفسیر کی ہے اس پر انہیں کامل اعتماد ہے اور اس کی
بت تحریر فرماتے ہیں کہ "تم کو جاننا چاہیے کہ جب تم اس دلالت کی حقیقت سے واقف ہوگئے تو تمہیں معلوم ہوگا کہ
ن عالم علوی وسفلی میں جس قدر مخلوقات اور محدثات ہیں وہ خُدا کی واحدنیت کی دلیل ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے اپنی
اب میں بیان فرمادیا ہے۔

لیکن ایک ایسا گروہ بھی ہے جس کے نزدیک اس آیت سے صرف بُت پرستی کا ابطال مقصود ہے۔ یعنی اس آیت
مطلب صرف یہ ہے کہ اگر آسمان و زمین میں جیسا کہ بُت پرستوں کا خیال ہے اور بھی معبود ہوتے تو نظامِ عالم خراب
جاتا کیونکہ یہ بُت جمادات سے بنائے گئے ہیں اور ان میں مدبرِ عالم ہونے کی حیثیت اور قدرت نہیں ہے۔ اس لیے
نظامِ عالم کو قائم نہیں رکھ سکتے کیونکہ اس آیت سے پہلے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:۔

"کیا ان لوگوں نے ایسے معبود بنا رکھے ہیں جن کو یہ لوگ خود زمین کی (چیزوں، مٹی اور پتھر وغیرہ)
سے بنا کر کھڑا کرتے ہیں۔"

اس کے بعد حق تعالیٰ نے فرمایا:۔

"اگر زمین و آسمان میں خُدا کے سوا اور بھی خُدا ہوتے تو دونوں برباد ہو جاتے۔"

اس بیان سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ اس دلیل سے صرف بُت پرستوں کے خیال کی تردید مقصود ہے۔ عام طور
شریک باری کی مقصود نہیں ہے۔ امام صاحب اس بارے میں فرماتے ہیں کہ خُدا نے جو دلیل بیان کی ہے وہ تمام
لفین کے مقابلے میں استعمال کی جاسکتی ہے۔

✠

عرفی لباب الالباب میں رقمطراز ہے کہ امام رازیؒ نے جاہ وجلال کے باوجود کبھی امراء کی طرح بیکاری عیش پسندی میں

زندگی بسر نہیں کی۔ بلکہ ہمیشہ علمی مشاغل میں مصروف رہے۔ وہ کھانے پینے کے بھی شوقین تھے۔ مگر ان کا علمی شوق اس سے بھی زیادہ بڑھا ہوا تھا۔ آپ نہ زیادہ حلیم و بردبار تھے اور نہ ہی آپ کے مزاج میں زیادہ تندی اور سختی پائی جاتی تھی۔ آپ کو اپنے عزیز و اقارب سے کافی تکالیف پہنچیں۔ مگر آپ اُن کے ساتھ ہمیشہ نرمی سے پیش آتے۔ آپ کے بڑے بھائی جن کا لقب رکن الدین تھا انہوں نے کسی قدر علم خلاف، علم فقہ اور علم کلام کی تعلیم حاصل کر رکھی تھی لیکن ان کی دماغی حالت خراب تھی۔ اس لیے امام صاحب جس شہر میں جاتے یہ بھی ان کے پیچھے پیچھے جاتے۔ اور لوگوں میں انہیں بُرا بھلا کہتے۔ جو لوگ امام صاحب کی کتابیں پڑھتے تھے اُن کو بیوقوف کہتے تھے اور لوگوں کو مجبور کرتے کہ میں امام رازی کا بڑا بھائی ہوں اور اُن سے زیادہ عالم ہوں لیکن تم لوگ فخر الدین فخر الدین کرتے رہتے ہو۔ تم لوگوں کو رکن الدین کیوں نہیں یاد رہتا۔ اِن باتوں سے لوگ رکن الدین کا مذاق اُڑاتے۔ اگرچہ یہ باتیں امام رازی کو سخت ناگوار گزرتیں مگر وہ اس پر سکوت فرما دیتے اور اس کے باوجود اپنے بھائی کے ساتھ ہمیشہ اچھا سلوک کرتے تھے۔ انہوں نے بسا اوقات اپنے برادرِ کلاں سے درخواست کی آپ "رے" یا کسی اور جگہ پر قیام فرمائیں اور آپ کے مصارف کا تمام تر بار میں برداشت کروں گا۔" مگر آپ کے بھائی کو تو آپ سے خدا واسطے کا بَیر تھا۔ انہوں نے اپنی مخالفانہ مہم جاری رکھی۔

آخر کار امام رازی نے سُلطان خوارزمشاہ سے کہہ کر ان کو شاہی قلعہ میں نظر بند کروا دیا۔ اور اُن کے معاش و ضروریات کا انتظام کر دیا۔ اور ایک ہزار دینار سالانہ منافع کی ایک جاگیر بھی اُن کو دلوا دی۔ یوں رکن الدین تامرگ اس قلعہ میں نظر بند رہے۔ امام رازی اس طرح سکون کے ساتھ وعظ و تقریر میں مشغول رہے۔ تعلیم و تربیت اور درس و تدریس کے دوران امام صاحب قدرے سختی سے کام لیتے تھے۔ جیسے محمد بن تکش شاہ خوارزم آپ کا شاگرد تھا۔ آپ اس کو پڑھاتے وقت کبھی کبھی سخت کلامی بھی کر دیتے لیکن اُس نے ان باتوں کو کبھی ماتھے کی شکن نہیں بنایا تھا۔ آپ کو علم کا بڑا ہی شوق تھا اکثر فرمایا کرتے تھے کہ وقت اور زمانہ نہایت عزیز چیز ہے کیونکہ اس میں زیادہ سے زیادہ علم حاصل کیا جا سکتا ہے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ میں ایک علم دوست آدمی ہوں اور ہر فن کے متعلق جس کی کمیت اور کیفیت سے میں ناواقف تھا۔ خواہ وہ حق ہو یا باطل، نیک ہو یا بد کچھ نہ کچھ لکھتا رہتا تھا۔

دُنیا کے رنج والم کے بارے میں امام رازی فرماتے ہیں:۔

"خدا تعالیٰ کی حکمت کی بنیاد اس اصول پر قائم ہے کہ سعادت اور راحت بغیر تکلیف و مصیبت کے حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس لیے جنت مصیبتوں سے اور دوزخ شہوت پرستوں سے گھری ہوتی ہے۔ خدا نے جنت کو اگر حضرت آدم علیہ السلام کے لیے پیدا کیا تھا تاہم اُن کو جنت سے اسی اصول کی بنا پر نکالا کہ وہ تکلیف اور مصیبت کو برداشت کر کے دائمی طور پر جنت میں داخل ہوں۔ اس لیے اُن کو جنت سے نہیں نکالا گیا تھا کہ وہ دُنیا میں رہ کر محض تکلیف و مصیبت برداشت کریں۔ بلکہ اس لیے کہ وہ جنت میں پہلے سے بہتر طریقہ پر داخل ہوں اور جنت کے پہلے اور دوسرے داخلہ میں کس قدر فرق ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مطعم بن عدی کی پناہ میں مکہ میں داخل ہوتے تھے لیکن مکہ فتح کرنے کے بعد آپ کا جو دخول ہوا کیا ان دونوں میں فرق نہیں ہے؟ دُنیا میں تکلیف اور مصیبت اُٹھانے کے بعد مسلمانوں کو جنت میں جو راحت و لذت نصیب ہوگی کیا اس راحت اور لذت سے زیادہ نہیں ہے جو ان کو اس وقت حاصل ہوئی جب وہ ابتداء سے جنت میں پیدا کیے گئے ہوتے؟ جو شخص مرض کی تکلیف اُٹھانے کے بعد اچھا ہو جاتا ہے اس کو صحت کی لذت اس شخص سے زیادہ حاصل ہوگی جو کبھی بیمار ہی نہیں ہوا۔ اور علماء کا اتفاق ہے کہ کمالات کے حاصل کرنے کے سبب تکلیف اُٹھانا

مستحسن فعل ہے اور جو لوگ اس مقصد کے لیے تکلیف اٹھانے سے گریز کرتے ہیں وہ ادنیٰ اور پست ہمت خیال کیے جاتے ہیں۔

اس بارے میں ارشادِ ربانی بھی یہی ہے کہ :-

"ہم نے انسان کو تکلیف میں پیدا کیا"۔

امام صاحب فرماتے ہیں دُنیا میں کوئی لذت نہیں بلکہ جس چیز کو لذت خیال کیا جاتا ہے وہ کسی تکلیف سے بچنے کی ایک صورت ہے۔ کھانے اور پہننے کی لذت، بھوک، سردی اور گرمی کی تکلیف سے بچنے کا نام ہے۔ اس لیے انسان کے لیے صرف دو چیزیں ہیں یا تکلیف یا تکلیف سے بچنا۔ اور مذکورہ بالا آیت کے یہی معنی ہیں کہ انسان کے لیے قیامت ایک ضروری چیز ہے کیونکہ جس ذات نے انسان کو پیدا کیا اگر اس تخلیق سے اس کا صرف یہ مقصد ہو کہ وہ تکلیف اٹھائے تو یہ رحمت کے مخالف ہے۔ اور اگر یہ مقصد ہے کہ نہ تکلیف اٹھائے اور لذت حاصل کرے تو اُس کی تخلیق کی کیا ضرورت تھی۔ اگر یہ مقصد ہے کہ وہ لذت و لطف حاصل کرے تو یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ دُنیا لذت و لطف کا نہیں بلکہ رنج و الم کا گھر ہے۔ انسان کے لیے اس دُنیا میں تکلیف و مصیبت کے سوا کچھ نہیں اس لیے ایسی دُنیا کے بعد ایسی دُنیا کا وجود ضروری ہے جو سعادت، لذت اور عزت کا مرکز ہو لیکن خلقتِ انسانی کے مقصد کی تعین میں ہمیں ان احتمال آفرینیوں کی ضرورت نہیں۔

کیونکہ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ :-

"ہم نے انسان اور جنوں کو صرف اس غرض سے پیدا کیا ہے کہ وہ ہماری عبادت کریں"۔

قرآن و حدیث میں جنت کی جو حقیقت بیان کی گئی ہے وہ صرف اس قدر نہیں ہے کہ اہلِ جنت تمام دنیوی شدائد و آلام سے محفوظ رہیں گے اور ان کی حالت اس بچے کی سی ہوگی جو ماں کے پیٹ میں رہتا ہے بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ وہ کھانے پینے، رہنے سہنے اور اوڑھنے پہننے غرض ہر قسم کی لذتوں سے بہرہ اندوز ہوں گے اور جیسا کہ بیان کیا گیا ہے کہ لذت کے معنی رنج و الم کے ازالہ کے سوا کچھ نہیں اس لیے اگر جنت میں رنج و الم کا وجود ہی نہیں رہتا تو فلسفیانہ حیثیت سے اس میں لذت کا بھی وجود نہیں۔ خیر و شر، لذت و الم، تکلیف و آرام ایک مفہوم اضافی ہیں جن میں ایک کا تصور دوسرے کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا۔ جنت کی لذت کو ابدی کہا جاتا ہے اور کوئی لذت ابدی نہیں ہو سکتی۔ اگر ایک شخص صبح سے شام تک مستقل برف کا پانی پیتا رہے تو اس کو کوئی لذت حاصل نہ ہوگی۔

دورِ جدید کا فلسفی کہتا ہے کہ لذت و الم میں استمرار و دوام نہیں پایا جاتا۔ ان کی طبیعت کا خاصا یہی ہے کہ یہ زود فنا ہوں۔ اس لیے اگر لذت ہمیشہ قائم رہے تو لذت میں لذت باقی نہ رہے۔ اور اگر الم میں استمرار و دوام پیدا ہو جائے تو اس میں کمی محسوس ہونے لگتی ہے اور کبھی الم کی کمی لذت بن جاتی ہے۔ اس بناء پر لذت اسی وقت لذت ہے جب تک اس استمرار و دوام نہ ہو۔ اور الم کے بغیر لذت کا تصور نہیں کیا جا سکتا اور لذتِ ابدی کا وجود جیسا کہ لوگوں کا قول ہے بے معنی بات ہے۔ افلاطون کہتا ہے "دیوتا لوگ الم سے ناواقف ہیں اس لیے وہ لذت کا احساس بھی نہیں کرتے"۔

✖

امام رازی عالم اور جاہل کے درمیان فرق بتاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جتنا سونے اور مٹی کے درمیان فرق ہے اتنا ہی جاہل اور عالم کے درمیان ہے۔ علم تمام اوصافِ حمیدہ سے اعلیٰ صفت ہے اور جہالت تمام صفاتِ رذیلہ سے بدتر چیز ہے۔ کیونکہ ہر چیز کوئی چیز ہے مگر جہالت کوئی چیز نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے علم و ہدایت کو اپنے ہاتھ میں رکھا ہے اور

س کو وہ چاہتا ہے اپنی منشا کے مطابق علم و ہدایت کے خزانے عطا فرماتا ہے۔ امام صاحب اس بارے میں امام غزالیؒ
ایک حکایت نقل کرتے ہوتے لکھتے ہیں:۔

"ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک اعرابی آیا اور اُس نے پہلے نہایت خوشی سے رقص کیا اور
س کے بعد رونے لگ گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس سے رونے اور خوشی کا سبب دریافت فرمایا تو اس نے
ض کی "حضورؐ آپ پر میرے ماں باپ قربان! میں ایک چرواہا ہوں۔ ایک روز میں نے ایک شتر سوار سے آپ کا نام
تو میں مسلمان ہو گیا۔ اور اس سے آپ کی جائے قیام کے متعلق پوچھا' اس نے اپنے ہاتھ سے (اس طرف) اشارہ کیا
ر چلا گیا۔ میں نے اسی وقت اپنے مال و اسباب کو وہیں چھوڑا اور اس طرف روانہ ہو گیا۔ ہر منزل پر صبح شام خداوند تعالیٰ
جھے غیب سے روٹی پانی دیتے رہے۔ جو درندہ میرے سامنے آتا مجھے سجدہ کرکے چلا جاتا۔ محض حق تعالیٰ کی ہدایت
ے میں آپ کی زیارت سے مشرف ہوا ہوں حالانکہ آپ نے میری طرف کوئی قاصد نہیں بھیجا۔ اس سبب سے میں نے
شی میں رقص کیا اور میرے رونے کا سبب یہ ہے کہ قبیلہ قریش آپ سے دُشمنی رکھتا ہے۔ آپ کی عداوت کی سبب
لوگ دوزخ میں جائیں گے۔ میں حق تعالیٰ کی بے پرواہی سے ڈرتا ہوں اور روتا ہوں۔

گہے با چناں گوہر خانہ خیز — چو بوطالبے را کنی سنگ ریز

امام رازی نے عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہے ہیں۔ اُس زمانے میں حکماء فلاسفہ زیادہ تر اپنے اشعار
ر حکیمانہ خیالات رباعی میں ظاہر کرتے تھے۔ اس لیے امام صاحب نے بھی اپنے خیالات کے اظہار کے لیے رباعی کا
ی انتخاب کیا ہے۔ طبقات الاطبا میں امام صاحب کے بہت سے عربی اشعار کو نقل کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ آپ
کے بہت سے اشعار اور رُباعیاں فارسی میں بھی ہیں۔ ایک قلمی بیاض جو دارالمصنفین میں موجود ہے۔ اس میں آپ کی
ند رُباعیوں کا انتخاب کیا گیا ہے جن میں ایک حسب ذیل ہیں۔

کہ خردم در خور اثبات تو نیست — و آرائش جان بجز مناجات تو نیست
من ذات ترا بواجبی کے دانم — دانندہ ذات تو بجز ذات تو نیست

عربی اشعار جن میں دُنیا کی تحقیر اور بے ثباتی کا مضمون ادا کیا گیا ہے۔ اُسی طرح سلطان علاالدین علی خوارزمشاہ
نے جب غوری کو شکست دی تو آپ نے اس کی مدح میں ایک عربی قصیدہ لکھا جس کو ابن ابی اصیبعہ نے طبقات الاطبا
میں نقل کیا ہے اور اس کے بعض اشعار میں فارسی ترکیبیں بھی آگئی ہیں مثلاً۔

امروز تو ملک الزمان باسرہ — لاشئی مثل خلاک انت الاواحد

آپ کی فارسی شاعری میں معرفت و علم کی کئی باتیں نظر آتی ہیں۔ روحانیت و ریاضت کے اسرار و رموز کو بھی شاعرانہ
زبان میں آپ نے بیان کیا ہے جیسے کہ:

ہرگز دل من ز علم محروم نشد — کم ماند ز اسرار کہ مفہوم نشد
ہفتاد و دو سال فکر کردم شب و روز — معلوم شد کہ ہیچ معلوم نشد

امام رازی نے شاہانہ مجلسوں میں بادشاہوں کی ذاتی اغراض کے لیے کبھی مدح سرائی سے کام نہیں لیا۔ مثلاً حضرت
داؤد علیہ السلام کی نسبت مشہور ہے کہ وہ اوریا کی بی بی پر فریفتہ ہوتے اور اس کو حیلے سے قتل کروا کے اس کی بی بی سے
نکاح کر لیا۔ لیکن امام صاحب نے اپنی تفسیر میں اس کی تردید کی ہے اور اس پر بہ کثرت دلائل قائم کیے ہیں۔ اس
سلسلہ میں آپ لکھتے ہیں کہ:

"میں ایک مجلس میں گیا جس میں اکابر سلاطین میں سے ایک بادشاہ بھی شریک تھا اور ایک خاص وجہ سے اس قول فاسد اور اجنبیت کے قصے کی تائید کرتا تھا۔ مَیں نے اس سے کہا کہ حضرت داؤد علیہ السلام یقیناً اکابر انبیاء میں سے تھے۔ خداوند تعالیٰ فرماتا ہے "اللہ تعالیٰ ہی اس کو بہتر جانتا ہے کہ اپنا پیغمبر کس کو بناتے" پس خداوند تعالیٰ جس شخص کی اس طرح تعریف کرے، ہمارے لیے اس پر اس قدر طعن کرنا جائز نہیں۔ نیز اگر مان لیا جائے کہ وہ پیغمبر نہ تھے تاہم اس میں شبہ نہیں کہ وہ مسلمان تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اپنے مردوں کا ذکر صرف بھلائی کے ساتھ کرو، اگر ہم ان دلائل سے قطع نظر بھی کرلیں تب بھی یہ ہدایت ہے کہ اگر یہ قصہ صحیح بھی ہو تو اس کی روایت سے کوئی ثواب نہ ملے گا کیونکہ برائی کی اشاعت سے گو عذاب نہ ہوگا تاہم ثواب بھی نہیں ہوتا۔ لیکن اگر قصہ جھوٹا ہو تو اس کا بیان کرنے والا سخت عذاب کا مستحق ہوگا۔ اس لیے جس واقعہ کی حالت یہ ہو اس کی نسبت صریح عقل کا فتویٰ یہ ہے کہ اس میں خاموشی اختیار کرلی جائے۔ اس سے ثابت ہوا کہ حق ہمارا قول ہے اور اس حصہ کا بیان کرنا حرام اور ممنوع ہے چنانچہ جب بادشاہ نے یہ بات سنی تو خاموش ہوگیا اور کچھ نہیں بولا۔"

امام رازی کو اللہ تعالیٰ نے دینی اور دنیاوی دونوں قسم کی برکتیں اور سعادتیں عطا فرمائی ہیں۔ ایک طرف طبقات الشافعیہ میں آپ کا شمار اہلِ تصوف میں کیا ہے جب کہ دوسری طرف شہر زوری نے لکھا ہے "امام صاحب کے انتقال کے وقت اُن کے پاس دنیاوی ساز و سامان میں مال، اولاد، لونڈی اور غلام سب کچھ موجود تھا۔ ان لونڈیوں اور غلاموں کو آپ نے موت سے قبل آزاد کر دیا تھا اور ہر ایک کو تھوڑا تھوڑا مال بھی دیا۔

آپ نے اپنی زندگی نہایت جاہ و جلال سے بسر کی۔ بعد میں آپ کی اولاد نے بھی اسی عزت و احترام سے وقت گزارا۔ آپ کی اولاد کی صحیح تعداد تو معلوم نہیں ہوسکی لیکن طبقات الاطباء میں آپ کے دو لڑکوں کا ذکر ہے جن کے نام بالترتیب ضیاء الدین اور شمس الدین تھے۔ بڑا لڑکا ضیاء الدین بھی آپ کی طرح علمی مشاغل رکھتا تھا۔ مگر چھوٹا لڑکا شمس الدین غیر معمولی ذہانت و فطانت کا مالک تھا۔ امام رازی کو اپنے چھوٹے لڑکے کی ذہانت پر بجا طور پر ناز تھا۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ اگر میرا یہ لڑکا زندہ رہا تو یہ مجھ سے زیادہ عالم ہوگا غالباً اسی شمس الدین کی ہی کنیت ابوبکر تھی۔ آپ کی وصیت میں اس کی ذہانت اور طباعی کی بنا پر اس کی مزید تربیت کرنے کی تاکید کی ہے۔ اور تاریخ الحکماء کے مطابق یہی لڑکا آپ کا درس و وعظ میں جانشین بنا۔

اس کے علاوہ آپ کا ایک اور لڑکا بھی تھا۔ جس کا نام محمد تھا۔ اس کے ساتھ امام صاحب کو بڑی محبت تھی آپ نے اکثر کتابیں اس کے لیے لکھیں۔ بعض کتابوں میں تو اس کے نام کی تصریح بھی کی ہے لیکن یہ لڑکا آپ کی زندگی میں ہی وفات پاگیا۔ اس کی وفات کا امام صاحب کو شدید صدمہ ہوا۔ جس کا ذکر آپ نے تفسیر کبیر میں کیا ہے۔

امام رازیؒ اور امام غزالیؒ نے عقلی علوم میں غیر معمولی شہرت حاصل کی۔ اس سے پہلے مسلمانوں میں جو مشاہیر پیدا ہوتے ان میں کچھ نے تو خالص فلسفہ اور حکمت میں ناموری حاصل کی اور کچھ نے علم کلام میں شہرت حاصل کی۔ اُن کی تحریر کردہ کتابیں جو کہ علم کلام و فلسفہ پر تھیں، بڑی پیچیدہ، مبہم اور مغلق تھیں۔ اُن کے خیالات و نظریات نہایت پراگندہ، منتشر اور نامکمل تھے۔ سب سے پہلے امام غزالیؒ نے اس پیچیدہ گرہ کو کھولا اور ان خیالات و نظریات کے انتشار اور پراگندگی کو دُور کیا۔ اس کے بعد امام رازی پیدا ہوتے اور انہوں نے امام غزالی سے بھی زیادہ وضاحت اور تفصیل سے

کام کیا۔ علم کلام اور فلسفہ سے متعلق جو خیالات و نظریات ان سے پہلے پیدا ہو گئے تھے ان سب کو یکجا کیا اور ان پر تنقیدی نگاہ ڈالی۔ اس لیے جو جامعیت اور وضاحت امام رازیؒ کی تصنیفات میں پائی جاتی ہے۔ وہ قدماء و متاخرین میں سے کسی کتاب میں نہیں پائی جاتی۔

امام رازیؒ نے اگرچہ تقریباً تمام علوم و فنون کے متعلق کتابیں لکھیں لیکن ان کا اصلی سرمایہ صرف فلسفہ و علم و کلام تھے۔ آپ نے اُن لوگوں کے لیے جو قرآن مجید پر خالص فلسفیانہ حیثیت سے غور و فکر کرنے کے داعی ہیں اُن کے لیے بڑی تحقیق کی ہے۔

امام رازیؒ نے شدت مرض میں اپنے شاگرد ابراہیم بن ابی بکر سے ایک وصیت نامہ تحریر کروایا جس میں آپ نے خدا تعالیٰ کی بڑھائی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کی تعریف کی۔ موت سے قبل انسان کی ذہنی و قلبی حالت کا جائزہ پیش کیا۔ اور فرمایا کہ جب انسان مرجاتا ہے تو مخلوق سے اس کا تعلق منقطع ہو جاتا ہے۔ لیکن دو وجہوں سے اس عالم کی تخصیص ہو جاتی ہے۔ ایک تو یہ کہ اگر اس کا کوئی نیک عمل باقی ہے تو یہ دُعا کا سبب ہو گا۔ اور خدا کے یہاں دُعا کا اثر ہوتا ہے۔ دُوسری بات اہل و عیال کے مصالح اور ادائے حقوق سے تعلق رکھتی ہے۔ پہلی بات کے بارے میں آپ نے وضاحت کی ''میں ایک علم دوست آدمی تھا۔ اس لیے ہر چیز کے متعلق کچھ نہ کچھ لکھتا رہا۔ خواہ وہ حق ہو یا باطل ہو۔ بُری ہو یا بھلی تاکہ میں اس کی کمیت و کیفیت کو معلوم کر سکوں۔ میں نے متخیر کُتب میں ثابت کیا ہے کہ دُنیا ایک ایسے مدبر کے زیر تدبر ہے جو تغیرات اور اعراض کی مماثلت سے منزہ اور کمال قدرت، علم اور رحمت کے ساتھ متصف ہے۔ میں نے کلامیہ اور فلسفیانہ طرز و روش کو جانچا ہے لیکن ان میں وہ فائدے میں نے نہیں دیکھے جو قرآن مجید میں پاتے ہیں۔ کیونکہ قرآن حکیم خدا کی تمام تر عظمت کو تسلیم کرواتا ہے۔ اس کے وجوب وجود، اس کی توحید، قدم، ازلیت، تدبر اور فعالیت میں شرکا سے برات کے متعلق جو چیز ظاہری دلائل سے ثابت ہے آپ نے اپنے آپ کو اسی کا قائل بنا لیا ہے۔

✠

طبقات الشافیہ میں لکھا ہے کہ امام فخر الدین رازی جب شدید بیمار ہو گئے تو آپ خوارزم سے ''رے'' میں تشریف لے آئے اور ۶۰۶ھ میں دوشنبہ کے روز آپ نے وفات پائی۔ اس روز عید الفطر کا دن تھا۔ وفات کے وقت آپ کی عمر ۶۳ سال تھی۔ آپ کے مقام دفن کے متعلق اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ مگر شہر زوری نے لکھا ہے کہ آپ ہرات میں پہاڑ کے نیچے دفن ہوتے ہیں۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ کرامیہ فرقے کے لوگوں نے آپ کو خفیہ طریقے سے زہر دلوا کر مروایا ہے۔ آپ کی وصیت کے مطابق آپ کی موت کو لوگوں سے چھپایا گیا اور آپ کو رات کے وقت دفن کیا گیا۔

امام رازیؒ اپنے وقت کے بڑے ولی، عالم اور مفسر تھے۔ آج کے دور میں بھی آپ کی حیات طیبہ سے راہ نمائی اور استدلال حاصل کیا جاتا ہے۔ آپ نے اپنی پہلی زندگی حصول علوم ظاہری کے حصول میں گزاری جبکہ دوسری زندگی جو کہ حضرت نجم الدین کبریٰ کی ملاقات کے بعد شروع ہوئی۔ آپ نے روحانیت میں پرواز کرنے میں بسر کی اور آپ نے روحانیت کے مبادیات، شب بیداریوں اور گریہ زاریوں میں وہ کمالات حاصل کیے کہ آج بھی پیچ و تاب رازی عملی زندگی میں مشعل راہ ہے۔ اسی وجہ سے علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ نے فرمایا ہے۔

عطار ہو، رومی ہو، رازی ہو، غزالی ہو — کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی

✠ ✠ ✠

ہندوستان پر ۱۵۵۶ء تا ۱۶۰۵ء مغل شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کی فرمانروائی تھی۔ ان دنوں ہوشیار پور میں دیوان بوہڑمل کاردار کھتری مقرر تھے۔ شام چوراسی نامی گاؤں کا مالیہ وصول کر کے سرہند شریف کے سرکاری خزانے میں جمع کرانا ان کی ڈیوٹی تھی۔ دیوان صاحب کو تمام دنیاوی نعمتیں میسر تھیں مگر اولادِ نرینہ جیسی نعمت سے وہ محروم تھے۔ اس بات کا غم ان کو برابر کھائے جا رہا تھا۔ وہ اکثر سنیاسیوں اور ہندو فقیروں سے دُعا کے طلب گار رہتے تھے۔ حسنِ اتفاق سے ایک مرتبہ موصوف سرہند شریف مالیہ جمع کروانے گئے تو بغرضِ زیارت حضرت مجدد الف ثانیؒ کے آستانے پر بھی حاضر ہوئے اس وقت حضرت مجدد صاحب عبادت میں مشغول تھے۔ سرکار مجدد کے خادم نے دیوان صاحب سے کہا "آپ تشریف رکھیں اور انتظار کریں"، چند ثانیے کے بعد حضرت مجدد الف ثانی اپنے حجرۂ مبارک سے باہر تشریف لائے۔ اور دیوان سے بکمالِ شفقت ملے۔ دیوان صاحب یہ سن کر بہت خوش ہوئے۔ خدام حیران تھے کہ حضرت صاحب تو بادشاہوں سے بھی یوں لطف و عنایت سے پیش نہیں آتے لیکن یہ کیا کہ آپ خلافِ معمول ایک غیر مسلم سے یوں تلطف سے ملے ہیں حضرت مجدد کو اپنے خدام کے وسوسے کا علم بذریعہ کشف ہو گیا۔ آپ نے فرمایا "اس بندے پر اللہ تعالیٰ کا خاص کرم ہونے والا ہے اس کے ہاں ایک مردِ کامل پیدا ہوگا۔"

✖

۳۰ اگست ۱۶۱۹ء بمطابق ۲۹ رمضان المبارک ۱۰۲۸ھ بروز پیر حضرت مجدد الف ثانی کی پیش گوئی پوری ہوئی۔ اور اللہ تعالیٰ نے دیوان بوہڑمل کو بیٹا عطا فرمایا اس ساعت تمام گھر میں ایک روشنی نمودار ہوئی جس سے گھر کا گوشہ گوشہ منور ہو گیا نومولود نے سارا دن اپنی والدہ کا دودھ نہ پیا البتہ افطاری کے وقت دودھ پیا اس طرح اس بچے نے گویا پہلا روزہ رکھا۔

بچہ ذرا بڑا ہوا تو اس کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا گیا۔ دیوان صاحب نے بیٹے کی تعلیم پر ایک مسلمان استاد کو معمور کیا۔

گلستان اور بوستان بچے نے سات سال کی عمر میں پڑھ لیں۔ گلستان کے ان اشعار نے بچے کو تجسس میں مبتلا کر دیا۔

خلاف پیغمبر کسے رہ گزید کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید
محال است سعدی کہ راہِ صفا توان یافت جز در پئے مصطفیٰ

ان اشعار نے بچّے کے دل پر ایسا اثر کیا کہ اس کا سکھ چین برہم ہوگیا۔ اس کا کسی چیز میں دل نہ لگتا تھا۔ آخر کار اس بچّے نے مجبور ہوکر اپنے اُستاد سے گذارش کی کہ مجھے دائرۂ اسلام میں داخل کرکے راہِ صفا دکھائیں۔ آپ کے استاد نے آپ کو کافی عرصہ ٹالے رکھا۔ مگر اس ٹال مٹول سے بچّے کے دل کی حالت دگرگوں ہونے لگی۔ ایک مرتبہ اس بچّے کو رات خواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت ہوئی۔ حضور نے بچّے کو بنفسِ نفیس کلمہ طیبہ پڑھایا اور اس کے مسلسل ذکر کی تلقین کی۔ بچّے نے اپنے خواب کا ذکر اپنے مسلمان معلّم سے کیا۔ استاد بہت مسرور ہوئے اور اس کو مبارک دی۔ اس کے بعد اُستاد بچّے کو سیّد عبدالوہاب قادریؒ کے پاس لے گئے جنہوں نے بچّے کو باقاعدہ کلمہ طیبہ پڑھا کر دینِ اسلام کے ارکان کی تعلیم دی اور آپ کا الہامی نام عبدالنبی رکھا۔

یہ عبدالنبی ہی وہ بچہ تھا جس نے آگے جاکر حضرت باباجی اور تاج العارفین کے نام سے شہرت پائی۔ جناب عبدالنبی شروع سے ہی اپنے دل پر ایسی کیفیات محسوس کرتے کہ آپ کی حالت عجیب ہوجاتی تھی آپ کی حالت دیکھ کر آپ کے گھر کے لوگ حیران و پریشان ہوجایا کرتے تھے انہوں نے آپ کو اسلام اور دینِ حق سے دور رکھنے کی بہت کوشش کی مگر بے سُود۔ آپ کو راہِ حق سے ہٹانے کے لیے بڑی بڑی مشکلات اور تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر آپ کے پائے ثبات میں مطلق لغزش نہ آئی۔ اسلام کی محبّت میں سختیاں برداشت کرتے کرتے آپ جوان ہوگئے۔

ایک روز آپ کے والد دیوان صاحب نے آپ پر کسی بات پر سختی کی۔ آپ دل برداشتہ ہوکر گھر سے بھاگ نکلے اور اپنے گھر، آبائی گاؤں چوراسی کو خیرباد کہہ دیا۔ چلتے چلتے سلطان پورہ لودھی (ضلع کپورتھلہ) جا پہنچے۔ یہ علاقہ مشرقی پنجاب میں واقع ہے راستے میں آپ کی ملاقات ایک مردِ طریقت حضرت حاجی عبداللہؒ سے ہوئی جو پالکی میں سوار ہوکر شہر سے کہیں باہر جارہے تھے۔ آپ کے قریب آنے سے پہلے آپ نے مریدوں کو حکم دیا "پالکی کو روک لو کیونکہ ایک مردِ خدا آرہا ہے ہم اس کا استقبال کریں گے"۔

حاجی صاحبؒ نے عبدالنبیؒ کا استقبال کیا اور اپنے ساتھ اپنے آستانے پر لے گئے ان دنوں سلطان پورہ لودھی علومِ اسلامیہ کا بڑا مرکز تھا مسلم سلاطین کے عہد میں بھی یہ شہر بڑا بارونق ہوا کرتا تھا۔ یہاں کی اسلامی تعلیمات کا چرچا اس قدر تھا کہ شہزادہ داراشکوہ اور شہزادہ اورنگ زیب نے بھی یہاں پر اسلامی تعلیمات حاصل کیں۔ حضرت عبدالنبیؒ کا انوارِ الٰہی سے باطن تو ان کی پیدائش سے پہلے ہی روشن ہوگیا لیکن آپ کے علومِ ظاہری کی تکمیل حضرت حاجی عبداللہ صاحب کے ہاتھوں ہوئی اس کے بعد آپ نے حاجی صاحب موصوف کی بیعت کی اور سلسلہ نقشبندیہ میں داخل ہوگئے۔ حضرت حاجی صاحبؒ نے آپ پر خصوصی توجہ فرمائی اور ہمیشہ اپنے دستِ شفقت سے نوازا۔ مگر خرقۂ خلافت آپ کو اپنے پیر بھائی قطبِ عالم حضرت حاجی سیّد محمد طاہر عالم پوری سے دلوایا۔ یہ عجیب اتفاق کی بات ہے کہ حضرت حاجی عبداللہ صاحب کو بھی خرقۂ خلافت آپ کے پیر حضرت سیّد آدم بنوریؒ کے پیر بھائی حضرت زمان حضرت حاجی محمد شریف متقی شاہ آبادی سے حاصل ہوا تھا۔ حضرت سیّد آدم بنوریؒ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے براہِ راست مرید تھے اور پہلے خلیفہ بھی تھے اس ناطے سے حضرت عبدالنبی صاحب حضرت مجدد الف ثانی کے پڑپوتے مرید تھے۔ اس کے بعد حضرت عبدالنبی کا سلسلہ طریقت حضرت سیّد طاہر صاحب سے ہی رہا اور ان کے ہی مرید شمار ہوئے ہیں۔

حضرت سیّد طاہر صاحب عالم پوری بڑے جیّد عالم اور جلیل القدر بزرگ تھے انہیں ایک مجذوب سے جو کہ دہلی کے باشندے

تھے بڑا فیض حاصل ہوا تھا اس کے بعد آپ کے اندر عجیب سی مجذوبانہ کیفیت پیدا ہوگئی آپ نے اپنا سارا اسباب خدا کی راہ میں تقسیم کر دیا۔ اور خود لوگوں کے کپڑے دھو کر اور حجامت بنا کر اپنی گذر اوقات کرتے تھے آپ خدا کی یاد میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔ ایک روز آپ کی ملاقات ایک درویش شاہ محمد نقشبندی سے ہوئی انہوں نے آپ کی بڑی شاندار روحانی تربیت کی۔ آپ نے چھ سال حضرت شاہ محمد نقشبندی کی مسجد کا پانی بھرا۔ آپ روزانہ ایک سو چالیس گھڑے بھرا کرتے تھے مسلسل گھڑے اٹھا اٹھا کر حضرت سید طاہر صاحب کے سر پر زخم ہو گئے تھے اور زخموں میں کیڑے پڑ گئے تھے۔ ایک دفعہ آپ کے سر پر سے گھڑا گر کر ٹوٹ گیا اور ساتھ ہی سر سے ایک کیڑا بھی گر پڑا۔ آپ نے فوراً وہ کیڑا اپنے سر کے اندر رکھ لیا اور اس کو مخاطب ہو کر کہا "میں تو بے وطن ہوں تو کیوں بے گھر ہو رہا ہے" اس طرح آپ نے حضرت ایوب علیہ السلام کی سنت ادا کر دی آپ کے مرشد حضرت شیخ عالم کو جب آپ کے زخموں کا پتہ چلا تو انہوں نے آپ کے سر پر اپنا لعاب دہن لگایا جس سے سارے زخم از خود اچھے ہو گئے۔

حضرت سید طاہر حج پر تشریف لے گئے اور واپسی پر آپ کو اللہ تعالیٰ نے باخبر کر دیا کہ دو تین روز کے بعد آپ کا وصال ہو جائے گا مگر آپ یہ خبر حضرت عبدالنبی سے چھپانا چاہتے تھے اس لیے آپ نے اپنے خادم کو ایک گلاس پانی پر دم کر کے دیا اور ساتھ اپنا عمامہ اور کرتہ دے کر تاکید فرمائی کہ میرے وصال کے بعد یہ چیزیں حضرت عبدالنبی تک پہنچا دی جائیں۔

آپ کے واصل حق ہونے کے بعد جب عبدالنبی صاحبؒ کو امانتیں ملیں اور حضرت محمد طاہرؒ کے وصال کی خبر ملی تو آپ شدید ملول ہوئے لیکن دم کردہ پانی نے آپ کی اضطراری ——— حالت بہتر کر دی۔ آپ کو اپنے مرشد سے "تاج العارفین" کا لقب ملا تھا۔

حضرت تاج العارفین نے تزکیہ نفس کی خاطر عبادت و ریاضت کے ساتھ خدمت خلق بھی کی۔ آپ نے مساجد میں سالوں وضو خانوں کا پانی بھرا مساجد کے لیے مزدوری کرتے رہے۔ آپ نے روحانیت کی ایک لاکھ چالیس ہزار منازل طے کیں تھیں اسی لیے آپ کو بلند ترین درجہ عطا ہوا۔

حضرت تاج العارفین نے پہلے اپنے مرشد اول سلطان العارفین حاجی عبداللہ سلطان پوری سے فیوض و برکات حاصل کیں لیکن زیادہ مدت آپ نے حضرت محمد طاہر قطب عالم کے ساتھ گذار دی۔ آپ نے اپنے دونوں مرشدوں کی جس طرح خدمت کی اس کا صلہ آپ کو یہ ملا کہ آپ کو اعلیٰ کمالاتِ باطنی حاصل ہوئے۔ آپ پر اللہ تعالیٰ نے علم و معرفت کے دروازے کھول دیئے اور علمِ لدنی آپ کو عطا فرمایا۔

حضرت عبدالنبی کی شادی موضع سری گوبندپورہ ضلع امرتسر (بھارت) میں ہوئی آپ کے سسرال کا تعلق بیدی کھتری قبیلہ سے تھا جب آپ کے سسرال والے آپ کے مسلمان ہونے کی وجہ سے آپ سے ناراض تھے تو آپ نے اپنی بیوی کو بلا بھیجا وہ اپنے ماں باپ سے چوری آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی آپ نے اس کو مسلمان ہونے کا حکم دیا وہ مسلمان ہوگئی۔ اور آپ کے ساتھ چلی آئی جب آپ کے سسرال والوں کو پتہ چلا تو انہوں نے آپ دونوں کا پیچھا کیا۔ آپ نے دریائے بیاس پر اپنا مصلیٰ بچھایا اور اس پر اپنی بیوی سمیت دریا عبور کر کے دوسری طرف چلے گئے۔ یہ کرامت دیکھ کر آپ کے سسرال اور دیگر لوگ ٹھٹک کر رہ گئے اور ان میں سے اکثر مشرف بہ اسلام ہوئے۔ آپ یوں دوبارہ شام چوراسی پہنچے اور وہاں پر مستقل سکونت اختیار کر لی۔

ایک دفعہ آپ کے ایک مرید کو حضرت خضر علیہ السلام کی زیارت کا اشتیاق ہوا۔ انھوں نے اپنی خواہش حضرت عبدالنبی صاحب کی خدمت میں پیش کی آپ نے فرمایا "اوّل تو امرِ مقاصد نہیں اور اگر تمہارے دل میں زیادہ ہی اشتیاق ہے تو ایک ندی کے کنارے بیٹھ کر یہ وظیفہ پڑھو۔ اس کو آپ نے ایک وظیفہ بتایا۔ سات یوم کے بعد اس مرید کی ملاقات حضرت خضرؑ سے ہوئی انہوں نے اس سے پوچھا "تمہیں ہماری ملاقات کا کیوں شوق ہوا جب کہ تمہارا پیر ہم سے کم نہیں" یہ بات سن کر وہ مرید بے ہوش ہوگیا۔ اور جب اس کو ہوش آیا تو حضرت خضرؑ جا چکے تھے۔

ایک یہودی عربی نژاد اس تذبذب کا شکار تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج روحانی ہوئی یا جسمانی۔ وہ سوچتا تھا کہ آپ سات آسمانوں کی سیر کر کے جب واپس آئے تو رات کا وقت تھا بستر گرم تھا اور وضو کا پانی رواں تھا یہ بات عقل کے خلاف ہے وہ یہودی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنا مسئلہ بیان کیا آپ اس وقت عشاء کی نماز پڑھ کر فارغ ہوئے تھے اس وقت بارش ہو رہی تھی۔ آپ نے یہودی کی بات سن کر اس کو کہا "تم میرا کرتہ لے جاؤ"۔ اس یہودی نے کہا "حضرت رات زیادہ ہوگئی ہے بارش بھی ہو رہی ہے اس وقت دھوبی کہاں ہوں گے"۔ آپ نے فرمایا "میں نے جو کہا ہے اس پر عمل کرو" چنانچہ وہ یہودی مجبور ہو کر کرتہ لے کر چل دیا۔ جس وقت اس نے مسجد سے باہر قدم رکھا تو کیا دیکھتا ہے کہ دوپہر کا وقت ہے تیز دھوپ نکلی ہوئی ہے وہ حیران اور پریشان ندی کے کنارے جا پہنچا۔ اس نے وہاں دیکھا کہ دھوبی کپڑے دھو رہے ہیں۔ ایک دھوبی نے اس شخص کو دیکھ کر کہا "لاؤ میاں میں تمہارا کرتہ دھو دوں"، چنانچہ وہ شخص کرتہ دھلوانے کے بعد اسے سوکھا کر واپس مسجد میں آگیا جب اس نے مسجد میں قدم رکھا تو دیکھا کہ وہی رات کا وقت ہے اور بارش ہو رہی ہے اس شخص کی حیرت کی کوئی انتہاء نہ تھی۔ لیکن اس نے حضرت باباجی کو کرتہ دیتے ہوئے کہا "سرکار! آپ نے میرے سوال کا جواب ابھی نہیں دیا۔ لیکن جو کچھ میں نے دیکھ لیا ہے بیحد حیران کن ہے"۔ آپ نے فرمایا "احمق! کیا ابھی تمہارے سوال کا جواب نہیں ملا؟ تو ابھی کرتہ لے کر گیا اتنی دیر ٹھہرا! کرتہ دھلوا کر سکھایا۔ ان سب باتوں کے باوجود جب تم واپس یہاں پہنچے تو وہی وقت اور کیفیت تھی جب تم کرتہ لے کر یہاں سے روانہ ہوئے کیا ابھی تک یہ بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئی۔ جب حق تعالیٰ نے مجھ جیسے ادنیٰ اور ناچیز بندے کو اس قدر قدرت بخشی کہ رات کو دن اور دن کو رات دکھا سکتا ہوں تو کیا اس حاکم الحاکمین اور رب العالمین کو یہ قوت نہیں کہ اپنے پیارے محبوب کو معہ جسم کے آسمانوں کی سیر ایک لمحے میں کرا دے کیا تو "کُن فیکون" کو بھول گیا ہے"۔ یہ بات سن کر وہ یہودی مکمل طور پر مطمئن ہوگیا اور آپ کی بے پناہ علمی قوت اور کرامت کی برکت سے اس قدر متاثر ہوا کہ آپ کے قدم پکڑ لیے اور دینِ اسلام میں داخل ہوگیا۔ اور آپ کی بیعت کرلی۔

حضرت تاج العارفینؒ ایک دفعہ بٹالہ تشریف لے گئے تو اس وقت حضرت سید فاضل الدین شاہ صاحب قادری بٹالوی اپنے حلقہ نشینوں میں تشریف رکھتے تھے فرمانے لگے کہ اس وقت اللہ تعالیٰ کے خاص آدمیوں میں ایک صاحب تشریف لا رہے ہیں اُن

خواجہ حسن بصریؒ ایک روز مسجد کی چھت پر بیٹھے ہوئے تھے اور خوفِ خدا سے آپ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اتفاق سے آپ نے چھت سے نیچے گلی میں جھانکا تو آپ کے آنسو ایک راہگیر پر جا پڑے۔ اس آدمی نے اُوپر دیکھ کر کہا بھئی یہ قطرے پاک تھے یا ناپاک۔ آپ نے فرمایا میرے بھائی کپڑے دھو لو۔ یہ قطرے پاک نہیں ہیں، یہ مجھ گنہگار کے آنسو ہیں۔ تم کو جو بھی تکلیف پہنچی ہے اس لیے خدارا معاف کردو۔

لیے جگہ چھوڑ دو۔ حاضرین نے آگے پیچھے دیکھا تو کوئی نظر نہ آیا تو لوگ وہیں بیٹھے رہے آپ نے تھوڑی دیر کے بعد پھر اسی طرح
مگر حاضرین ادھر اُدھر دیکھ کر بیٹھے رہے آخر کار آپ نے تیسری مرتبہ بہت ہی تاکید سے فرمایا تو حلقہ نشینوں نے جگہ
چھوڑ دی اسی اثناء میں اچانک حضرت تاج العارفین حضرت عبدالنبی شامیؒ تشریف لے آئے۔ مرید حیران تھے کہ ایک ولی
کی آمد کا دوسرے ولی کامل کو کس طرح پتہ چل جاتا ہے۔

آپ کے مکتوبات شریف کی اگر تشریح کی جائے تو ایک ایک مکتوب کی بڑی بڑی ضخیم کتابیں مرتب ہو جائیں۔ اگر حضور کے
ت وکرامات کا تذکرہ کیا جائے تو شمار سے باہر ہیں۔ پروفیسر جناب میاں مشتاق احمد بھٹی جنہوں نے آپ کے مکتوبات شریف
عۃ الاسرار" کا اردو ترجمہ عرصہ تیرہ ماہ میں مکمل کر کے اپنی علمی استعداد وقابلیت کا عمدہ نمونہ پیش کیا ہے "مجموعۃ الاسرار"
یباچہ میں آپ کے حوالہ سے یوں رقمطراز ہیں کہ،

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ۔
غالب وکار آفریں، کارکشا، کارساز۔

یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں اور لوگوں کو بھی ویسی ہی زندگی بسر کرنے کی تلقین فرماتے
اللہ تعالیٰ کے ان بندوں کی زندگیاں سراپا دین ہوتی ہیں۔ برصغیر ہند میں اسلام کی روشنی انہی نفوس قدسیہ کی بدولت
۔ اسلام میں یہ صوفیاء کا سلسلہ ایسا ہے جو اپنے قول وفعل سے اکثر وبیشتر دل کی توجہ کو جذب کرتا ہے اور دل کے ذریعے
پر اثر ڈالتا ہے ان لوگوں کی باتیں مرورِ ایام سے پراسرار بن جاتی ہیں اور عام آدمی کی سمجھ سے ماوراء ہونے کی وجہ سے
وضاحت طلب بن جاتی ہیں۔ ان کے اقوال وافعال کرامتیں بن جاتی ہیں۔ وہ لوگ جو صرف عقل وخرد کی رہنمائی کے
ہوتے ہیں نہ سمجھتے ہوئے انکار کر دیتے ہیں۔ حالانکہ کسی شے کے نہ سمجھنے سے ان کا وجود کالعدم نہیں ہوتا۔ حضرت عبدالنبی
بھی انہی نفوس قدسیہ میں سے ہیں جنہوں نے اسلام کے نور سے روشنی پائی اور اس سے مستفیض ہو کر نہ صرف اپنے زمانے
ق خدا کو اسلام کے نور سے فیض یاب کیا۔ بلکہ آج بھی ان کا فیض جاری ہے۔
اللہ تعالیٰ کی قدرت کے کرشموں کا کیا کہنا۔ آذر بُت پرست کے گھر میں ابراہیم علیہ السلام بت شکن پیدا ہوئے اور حضرت
علیہ السلام کے ہاں فاتحر ان بیٹا جنم لیتا ہے حضرت شیخ عبدالنبی بھی اپنے علاقے کے ایک ہندو پرست کاردار کے
پیدا ہوتے لیکن سلامتی طبع کی بدولت انہوں نے عہد طفولیت میں ہی اسلام کی حقانیت کو قبول کیا۔ اس دور میں فارسی
ری زبان اور عربی علمی اور دینی زبان تھی چنانچہ آپ نے مروجہ علوم کی تحصیل مسلمان علماء اور صوفیاء سے کی اور انہی
ولت اسلام کی دولت سے فیض یاب ہوئے آپ نے دینی مسائل کو ان کی سادہ وپاکیزہ شکل میں سیکھا اور مدت العمر
ئے عصر اور علمائے عصر کی خدمت میں حاضر رہے۔ پھر تبلیغ دین میں ہمہ تن مصروف اور مشغول ہو گئے آپ کے بیشتر مکتوبات
ئی تصوف والہامات کے بارے میں ہیں جو مسائل حضرت علی ہجویریؒ کے زمانے میں ابھی سادہ تھے۔ صدیاں گذر جانے
بعد پیچیدہ اور مبہم ہو گئے تھے۔ مختلف قسم کی موشگافیوں کا سلسلہ لامتناہی ہو رہا تھا چنانچہ آپ نے سلوک کے رہ نوردوں
ان حقیقت کی مختلف منزلیں طے کرنا سکھایا۔
آپ نے تصوف کے جن مختلف مسائل کی تعلیم دی۔ ان مسائل میں زیادہ تر اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات، جمال وجلال،
بدو مشہود، غیب وحضور، نور وظلمت، وحدت الوجود، وحدت الشہود، جبر وقدر، تقلید وتحقیق
معروف ونہی عن المنکر، صحتِ جسمانی اور صحتِ روحانی ہے۔

حضرت تاج العارفین رحؒ نے عربی زبان میں ایک دُرود شریف سرورِ کائنات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ اقدس میں تحریر فرمایا جس میں آپ نے تقریباً ۳۰ معجزات قلم بند کیے ہیں جس سے آپ کی عربی زبان میں قابلیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

✖

حضرت مولانا جان محمد جالندھری کو علوم باطنی کی تحصیل کا شوق دامن گیر ہوا تو پہلے وہ دہلی میں حضرت سید حسن —— کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پھر جب آپ نے فرمایا کہ پنجاب میں ایک کامل قطب حضرت عبدالنبی شام چوراسی میں ہیں اور آج قطب حضرت شیخ نجم الدین موضع میانوالی ضلع جالندھر میں ہیں۔ ان کے پاس جاؤ۔ چنانچہ مولانا موصوف شام چوراسی پہنچے حضرت عبدالنبی کے آستانہ عالیہ کا رخ کیا۔ وہاں جاکر کیا دیکھتے ہیں کہ بہت سے لوگ جمع ہیں اور لنگر تقسیم ہو رہا ہے نفیس حضرت کھانا تقسیم کر رہے ہیں۔ حالانکہ اس وقت آپ کی عمر شریف ۱۰۰ سال سے اوپر تھی۔ یہ ماجرا دیکھ کر مولانا جان محمد میں خیال پیدا ہوا کہ ان کو تو میں قطب سمجھ کر آیا تھا اور ان کو تو ذکر و اشغال میں مشغول ہونا چاہیے تھا مگر یہ تو کھانا تقسیم کر رہے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی طبیعت میں فخر کا مادہ موجود ہے جونہی مولانا کے دل میں یہ وسوسہ گذرا تو حضرت العارفین نے فوراً فرمایا "مولوی صاحب! ہمیں کوئی فخر یا بدلہ مقصود نہیں۔ ہم تو ان سب کو اللہ کے واسطے کھانا کھلا رہے ہیں۔" یہ بات سن کر مولوی صاحب کی طبیعت درست ہوگئی۔ تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے اپنا ارادہ بیعت ہونے کا ظاہر کیا آپ نے مراقبہ فرمایا اور بیعت ان کی قبول نہ فرمائی بلکہ یہ فرمایا کہ آپ کا حصہ حضرت شیخ نجم الدین صاحب ساکن موضع میانوالی کے ہاں معلوم ہوتا ہے۔ ان کی خدمت میں چلے جاؤ۔ اس جواب سے مولوی جان محمد صاحب کو مایوسی ہوئی اور انہوں نے دل میں ارادہ کیا کہ اب کسی کے پاس نہیں جاؤں گا۔ اتفاق سے اسی روز حضرت شیخ نجم الدین رحؒ جالندھر تشریف لائے۔ مولوی صاحب نے جب ان کی آمد کی خبر سنی تو وہ حضرت نجم الدین کی خدمت بابرکت میں پہنچے۔ مکان پر جاکر دستک دی اس وقت حضرت نجم الدین مراقبہ میں تھے۔ دستک سن کر ایک خادم نے فرمایا کہ باہر ایک مولوی صاحب آئے ہیں ان کا نام جان محمد ہے "اس کو کہہ دو کہ ہم تو ظاہری علوم سے فارغ التحصیل نہیں ہیں دوسرے ہم آدھے کچے ہیں۔ ہمارے مرید تو اکثر دیہاتی اور غریب لوگ ہوا کرتے ہیں۔ تم کسی دوسری جگہ چلے جاؤ۔" خادم کی زبانی باتیں سن کر مولوی جان محمد دم بخود رہ گئے اندر حضرت نجم الدین نے اسم ذات "اللہ" کا ذکر بلند آواز میں فرمایا۔ ادھر گھر سے باہر مولوی جان محمد مرغِ بسمل کی طرح تڑپنے لگے۔ کچھ دیر کے بعد طبیعت میں سکون آیا تو دل کے تمام شکوک و شبہات دور ہو چکے تھے۔ چنانچہ صدقِ دل سے حضرت کے مرید ہوئے جب بیعت سے فراغت ہوئی تو حضرت نجم الدین رحؒ نے فرمایا "مولانا! آپ اسکے قابل تو نہ تھے کہ آپ کو مرید کیا جائے مگر کیا کریں حضرت تاج العارفین رحؒ نے آپ کے اوپر ترحم فرماکر آپ کی سفارش کی ہے اس طرح مولوی جان محمد کو حضرت نجم الدین نے بیعت فرمایا۔

✖

ایک دفعہ حضرت تاج العارفین، حضرت مولوی جان محمد کے ہاں جالندھر تشریف لے گئے تو وہاں ایک نابینا حافظ آپ کی شہرت سن کر کسی گاؤں سے جالندھر آپ کی زیارت کرنے کے لیے پہنچا اور دل میں خیال کیا کہ اگر حضرت کو ہماری آمد کی خبر نہ ہوئی تو ملاقات کا کیا فائدہ۔ آخر کار اس نے دل میں یہ ٹھہرایا کہ حضرت نے مجھے اپنے پاس بٹھا کر کھانا کھلایا اور میری اچھی طرح خاطر کی تو میں سمجھوں گا کہ آپ صاحب کمال ہیں۔ یہ سوچ کر وہ نابینا پوچھتا پوچھتا آپ کی خدمت میں حاضر ہوا آپ کے عقیدت مند اس وقت مجلس میں خاصی تعداد میں موجود تھے اس نابینے کو اندر جانا نصیب نہ ہوا وہ دل میں افسوس کرنے لگا۔ حضرت اس وقت اندر تشریف رکھتے تھے اس وقت آپ کے سامنے کھانا لگا تھا آپ نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا اور مراقب ہو گئے۔ پھر حضرت جان محمد کو حکم دیا" باہر ایک نابینا ہماری ملاقات کو آیا ہے اس کو اندر لے آؤ" پھر آپ نے اس نابینے

پاس بٹھایا اور کھانا کھلایا۔ وہ نابینا ہمیشہ کے لیے آپ کا خادم بن گیا۔

اس زمانے کے دو بڑے شاعر مقبل اور واقف تھے ایک مرتبہ وہ دونوں حضرت تاج العارفین کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس وقت حضرت کی طبیعت ناساز تھی آپ کو ان دونوں شعراء کی آمد کی اطلاع دی گئی آپ نے دونوں شاعروں سے ملاقات سے معذوری کا اظہار کیا اور ارشاد فرمایا "جو کہنا ہے لکھ کر بھیج دیں"۔

ان دونوں کے دل میں یہ خیال آیا کہ حضرت بہت بوڑھے ہو گئے ہیں اب تو آپ کی توجہ اور قوتِ جذب میں ضعف آگیا ہوگا۔ انہوں نے اسی خیال سے ایک عریضہ لکھا جس میں شوقِ ملاقات اور اپنی عقیدت اور بیعت کا ارادہ ظاہر کیا۔

جب عریضہ حضرت تاج العارفین کے پاس پہنچا تو آپ نے اس کی پشت پر تحریر فرما دیا کہ میں اب ضعیف ہو گیا اور میرے جذب میں کمی ہو گئی ہے لہٰذا آپ کسی دوسری جگہ تشریف لے جائیں اور صاحب جذبہ کی تلاش کر لیں۔ یہ دیکھ کر دونوں شاعر صاحبان بہت شرمندہ ہوئے اور اتنی دیر حضرت کے در پر ہی مقیم رہے جب تک آپ رُو بصحت نہ ہو گئے جب آپ کی طبیعت بالکل ٹھیک ہو گئی اور آپ نے گھر سے باہر آنا جانا شروع کر دیا۔ تو ان دونوں شاعروں نے آپ سے دست بستہ ہو کر معافی مانگی اور صدق دل سے آپ کی بیعت کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ آپ نے ان دونوں کو معاف کر کے اپنے خاص خادموں میں شامل کر لیا۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے کشف و جذب کی قوت سے مالا مال کر رکھا تھا۔ آنکھیں بند کر کے ہی آپ کو تمام اسرار خداوند تعالیٰ واضح دکھا دیتا تھا۔

✖
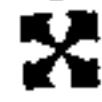
حضرت مولانا غلام حسین ہوشیار پوری فارسی اور حساب میں اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ ایک سکھ کے ہاں ملازمت کرتے تھے اور سال چھ ماہ کے بعد گھر جاتے اور گھر والوں کو نقدی اور پارچات دے آتے تھے۔ دورانِ ملازمت ایک دن اچانک منشی خانے کی چھت گر پڑی اور اللہ تعالیٰ کے خاص فضل سے آپ اس طرح محفوظ رہے کہ چھت کی کڑیاں آپ کے سامنے دیوار کے ساتھ کھڑی ہو گئیں۔ اپنی حالتِ غنودگی میں انہیں حضرت عبدالنبی شامی کی زیارت نصیب ہوئی۔ حضرت نے فرمایا "غلام حسین اگر تم اس مصیبت سے بچ گئے تو کیا کرو گے"؟ عرض کی۔ "حضور! میں دین کی خدمت کروں گا"۔ تھوڑی دیر کے بعد ہی لوگوں نے چھت کا گرا ہوا ملبہ اٹھایا تو بفضلہ تعالیٰ مولانا بخیریت نیچے سے برآمد ہوئے جب کہ ایک دربان مرا ہوا پایا گیا۔ مولانا غلام حسین نے وہ ملازمت فوراً ترک کر دی اپنا سامان خدا کی راہ میں خیرات کر کے جالندھر کے مضافات میں پہنچ گئے اور علماءِ وقت سے علوم شرعیہ کی تحصیل و تکمیل میں مشغول ہو گئے اور منصبِ ولایت پر سرفراز ہوئے۔

✖

حضرت سید علم الدین چشتی جالندھری اپنی ایک کتاب میں تحریر فرماتے ہیں "میں بعض لوگوں سے حضرت تاج العارفین کی تعریف سن کر شام چوراسی حضرت کی خدمت میں بغرض بیعت پہنچا۔ اس وقت دن تقریباً چار گھنٹے باقی تھا۔ اور میں عصر کی نماز سے فارغ ہو کر حضرت کی خدمت میں بیٹھ گیا تو مغرب تک میں نے ان سے چھبیس کرامتیں سرزد ہوتے دیکھیں۔ پھر حضرت نے مراقبہ فرما کر میری طرف خصوصی توجہ فرمائی اور اپنا دستِ مبارک میرے قلب کی طرف لائے تو میرے حواسِ ظاہری بالکل معطل ہو گئے میں نے عالمِ غیب سے ایک ہاتھ نمودار ہوا۔ اس نے آپ کا ہاتھ میری طرف سے ہٹا دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد آپ نے مراقبہ سے سرِ مبارک اٹھایا اور فرمایا کہ سید صاحب! آپ کا حصہ اہل چشت کے ہاں ہے آپ میراں سید بھیک کرٹھامی کی خدمت میں تشریف لے جائیں۔

✖

آپ کو دنیاوی علوم پر کامل عبور تھا۔ آپ نے اپنی حیاتِ مبارکہ میں نہ صرف قرآن مجید کا بغور مطالعہ فرمایا۔ بلکہ آپ نے گیتا

زبور، توریت اور انجیل مقدس کا بھی مطالعہ کیا تھا چنانچہ اس زمانے کے اولیاء اللہ، مفتی، علماءِ دین، مشائخ اور اعلیٰ حکام اپنے مسائل میں آپ سے رجوع کیا کرتے تھے اور اپنے اپنے مسائل حل کرواتے۔ الغرض کوئی علمی مسئلہ خواہ وہ علم فقہ، حدیث و علم تفسیر کا ہو یا ہندومت کا ہو آپ اسے نہایت سادہ اور عام فہم انداز سے حل فرما دیا کرتے تھے آپ کے مکتوبات شریف "مجموعۃ الاسرار" اس ضمن میں آپ کی قابلیت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ ذاتِ حق سبحان تعالیٰ نے آپ پر اپنے خاص فضل و کرم سے علم و معرفت کے در کھول رکھے تھے بلکہ علمِ لدنی سے بھی مالا مال کر دیا تھا۔ مثال کے طور پر آپ نے شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کی کتاب "فصوص الحکم" جو کہ وحدت الوجود کے بارے میں ہے ایک فاضلانہ تشریح تحریر فرمائی۔

"وحدت الوجود سے مراد یہ ہے کہ کل کائنات اللہ سبحان تعالیٰ کی پیدا کردہ ہے نہ کہ بذاتِ خود اللہ ہے بلکہ اس میں وحدت لیے پائی جاتی ہے کہ اس کا خالق ایک ہے وحدت الوجود کے قائلین اپنے نظریہ کو ہمہ اوست و بعد از اوست کی صورت پیش کرتے ہیں۔ آپ نے مسئلہ ہمہ اوست کی گمراہ کن تبلیغ کی پوری تردید فرمائی اور صحیح مفہوم اور صحیح عقیدے کی تعلیم دی کہ ہمارا مسلک ہمہ اوست نہیں بلکہ ہمہ از اوست ہے۔

✖

ایک بادشاہ اپنے ایک نواب سے ناراض ہو گیا اور حکم دیا کہ اس کو دیگ میں ڈال کر جلا دیا جائے چنانچہ نواب کو دیگ میں ڈالا گیا اور آگ جلا دی گئی جو کئی گھنٹوں تک جلتی رہی جس وقت بادشاہ نے خیال کیا کہ اب اس کی ہڈیاں بھی گھل گئی ہوں تو حکم دیا کہ دیگ کا ڈھکن اتار دیا جائے جب دیگ کا ڈھکن اتارا گیا تو سب لوگ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ نواب صاحب بالکل صحیح و سلامت ہیں۔ بادشاہ نے اس کا سبب نواب صاحب سے پوچھا تو انہوں نے جواب دیا "مجھ پر میرے مرشد حضرت العارفین کی نظرِ کرم ہے۔ اس وجہ سے حق تعالیٰ مجھ پر یہ آگ ٹھنڈی کر دی۔"

✖
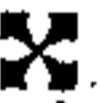
ایک مرتبہ شیخ عبدالنبی کے پیر و مرشد حضرت قطب عالم شاہ چوراسی تشریف لائے اور فرمایا کہ ہمارا ہندوستان جانے کا ارادہ ہے حضرت شیخ عبدالنبی نے اپنے مرشد کے ساتھ سفر کرنے کی سعادت حاصل کرنا چاہی۔ مرشد عالی نے آپ کو اجازت دے دی۔ آپ نے جاتے ہوئے گھر کی گذر اوقات کے لیے ایک روپیہ اپنی بیوی کو دیا اور خود اپنے پیر صاحب کے ساتھ عازم سفر ہوئے۔ آپ دونوں اصحاب صالح ۱۲ سال تک ہندوستان کی سیاحت میں مصروف رہے اس طرح آپ نے سنتِ ابراہیمی کی ادائیگی کی۔ جس طرح حضرت ابراہیمؑ اپنے بیٹے اسمٰعیل اور بیوی ہاجرہ کو چھوڑ کر ان سے بارہ سال جدا رہے۔

بارہ سال کا طویل عرصہ گذارنے کے بعد حضرت شیخ عبدالنبی اپنے مرشدِ مکرم کے ہمراہ واپس لوٹے تو آپ کو فکر دامن گیر ہوئی کہ گھر میں نہ جانے کھانے پینے کو کچھ ہے بھی یا نہیں اپنی تو خیر ہوتی ہے مگر ساتھ حضرت بھی ہیں ان کی خاطر مدارات تو از حد ضروری ہے اسی سوچ پریشاں میں غلطاں آپ نے گھر کی دہلیز پر قدم رکھا۔ آپ کی بیوی آپ کی ملول طبیعت کو بھانپ گئیں اور آپ سے کوئی بات پوچھے بغیر آپ کی خدمت میں ایک روپیہ پیش کر دیا۔ آپ نے اس روپے سے حضرت کی خاطر مدارت کا سامان اور ان کے لیے پر تکلف کھانا تیار کروایا۔ کھانا وغیرہ کھا چکنے کے بعد آپ نے اپنی اہلیہ سے پوچھا "یہ روپیہ کہاں سے آیا" انہوں نے عرض کی "یہ وہ والا روپیہ ہے جو آپ بارہ سال قبل مجھے دے گئے تھے" اس پر آپ نے استفسار کیا "تو پھر گھر کی گذر کیسے چلتی رہی اور اسی طرح ہم نے بارہ سال کاٹ دیئے۔" آپ کو بیوی کی باتیں سن کر بہت خوشی ہوئی۔ آپ نے یہ سارا ماجرا اپنے مرشدِ محترم کے گوش گذار کیں۔ وہ بھی بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے شیخ عبدالنبی، ان کی اہلیہ اور دونوں فرزندوں کو دعائے خیر کی جس سے ان کی روشن زندگیاں اور زیادہ ضیاء بار ہو گئیں۔

حج کے ایام میں ایک یہودی حضرت تاج العارفین کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ اس وقت مسجد میں تھے۔ اس نے عرض کی "حضرت
ج کل حج کے ایام ہیں۔ اس دفعہ آپ مجھے حج ہی کروا دیں" آپ نے اسے کہا "تم آنکھیں بند کر لو اور جب تک میں تمہیں آنکھیں
ولنے کا حکم نہ دوں۔ آنکھیں بند ہی رکھنا"۔ اس یہودی نے آپ کے حکم کی تعمیل کی اور آنکھیں بند رکھیں جب آپ نے اس کو آنکھیں
ولنے کا حکم دیا۔ تو وہ حیران رہ گیا کہ وہ بمعہ آپ کے حرم پاک میں تھا۔ حج کرنے کے بعد اس یہودی نے آپ کے ہاتھ پر اسلام
ل کیا اور پھر وہیں مکہ معظمہ میں ہی رہائش اختیار کر لی اور وہاں ہی اپنا مکان تعمیر کروالیا۔ اور آپ کے ساتھ عقیدت وابستہ کرتے ہوئے
محلہ کا نام محلہ شامیاں رکھا۔

یہ اللہ والے خدا سے لو لگانے کے بعد حیرت انگیز کرامات رونما کرنے کی صلاحیت حاصل کر لیتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے
روشن رکھنے کیلئے ان کو ایسی قوتیں عطا کر رکھی ہوتی ہیں جن سے لوگ خدا کی قدرتِ کاملہ کے مظاہرے کھلی آنکھوں سے ملاحظہ
سکتے ہیں۔

✖

ایک حیرت انگیز بات یہ بھی آپ سے وابستہ تھی کہ نماز عصر اور مغرب کے درمیان اگر کوئی غیر مسلم آپ کے سامنے آجاتا تو آپکی
ن مبارک دیکھ کر خود بخود اس کی زبان پر کلمۂ طیبہ جاری ہو جاتا۔ اللہ اللہ کی صدائیں اس کے قلب سے جاری ہو جاتیں۔ ایک
ر دو ہندو لڑکیاں جن کی شادیاں شام چوراسی میں ہوئی تھیں۔ اتفاق سے اس خاص ساعت میں آپ کے سامنے سے گذریں انکی
ن سے اسی وقت کلمہ شریف کا ذکر جاری ہو گیا اور وہ دونوں مسلمان ہو گئیں۔ ان کے سسرال والوں نے خود بھی اور ان کے
ن بھی ان کو دینِ اسلام سے کنارہ کش ہونے کا حکم دیا مگر انہوں نے اسلام چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ ان کے سسرال اور والدین
ن نے ان لڑکیوں کو گھر سے نکال دیا۔ وہ دونوں بیچاری کشتۂ غم حضرت تاج العارفین کے گھر آگئیں حضرت نے ان
نے گھر میں نہ صرف پناہ دی بلکہ ان کی شادیاں بھی اپنے دو خلفاء سے کر دیں۔ اسلام کے طالبوں کی اللہ تعالیٰ جس طرح پشت
کرتا ہے اس کی زندہ مثالیں حضرت نے لوگوں کے سامنے پیش کیں۔

✖

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ سو جوگیوں کا ایک قافلہ آپ کی شہرت سن کر شام چوراسی آیا اور ایک باغ میں جلسہ عام منعقد کیا۔ آپ کو
کے مذموم ارادوں کا جب پتہ چلا تو آپ بھی اپنے خادم خاص اللہ دین کے ہمراہ جلسہ گاہ میں تشریف لے گئے۔ وہاں آپ نے
جوگیوں کا سردار سرس کے درخت کے نیچے ایک تخت پوش پر فروکش ہے اور اپنے ایک کاہن کی کرامات بیان کر رہا ہے کہ
نے آپ کو متعدد مثالی اجسام کی شکل میں ظاہر کر سکتا ہے اس کی تیرہ سو عورتیں تھیں۔ وہ ہر ایک کے پاس ایک ہی وقت میں
جسام مثلیہ کے ساتھ موجود ہوتا تھا۔ ایک دفعہ ایک شخص نے اس کاہن سے کہا "تو بڑا سخی آدمی ہے کسی سائل کو اپنے
ے خالی واپس نہیں لوٹاتا۔ تمہارے پاس تیرہ سو عورتیں جب کہ میرے پاس ایک بھی نہیں۔ تو مجھے ایک عورت دے دے اس
نے اس سائل سے کہا" تو میری سب عورتوں کے پاس چلا جا۔ جہاں تو مجھے نہ پائے تو اس عورت کو لے جانا" چنانچہ وہ سائل
کے پاس گیا مگر وہ کاہن ہر عورت کے پاس موجود تھا" جب وہ جوگی تمام حکایت نما کرامت سنا چکا تو حضرت سلطان
نے اس کو مخاطب کر کے فرمایا "جوگی صاحب! یہ کمال کی بات ہے اگر اس قسم کے کمالات آپ لوگوں کا ــــ وصف ہے
اسلام میں معمولی لوگ بھی یہ تماشا دکھا سکتے ہیں۔ اس سے ہندو دھرم کی کوئی خاص خوبی تو ظاہر نہیں ہوتی اسکے بعد آپ نے
ے جوگیوں کو اشارہ کیا کہ وہ درخت پر نظر ڈالیں۔ سب نے درخت پر دیکھا تو سب حیران رہ گئے کہ حضرت تاج العارفین
ے پر نظر آ رہے ہیں۔ حالانکہ اصل میں آپ مجمع میں ان کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ کرامت دیکھ کر ان میں سے تیرہ
وزا ایمان لے آئے۔

حضرت تاج العارفین کے روضہ مبارک کے احاطے میں ایک کنواں تھا جس کے متعلق روایت ہے کہ اس میں آپ نے اپنا لعاب دہن ڈالا تھا۔ اس پانی کے استعمال سے ہر قسم کی بیماری دور ہو جایا کرتی تھی۔ اس کنویں کا پانی ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں لوگ کپّیوں میں بھر بھر کے لے جانے لگے۔ ۱۹۰۵ء میں جب ہندوستان میں طاعون پھیلا اور گھر گھر میں اموات واقع ہونے لگیں تو ملک بھر میں کہرام مچ گیا۔ اس وقت اس کنویں میں سے آواز آئی کہ جو کوئی اس کنویں کا پانی پیئے گا اس پر طاعون کا اثر ہرگز نہیں ہوگا لہٰذا اس کنویں کے پانی پینے والوں پر طاعون کا اثر ہرگز نہ ہوا۔ اس کنویں کو وہ شہرت ملی کہ یہاں سے پانی خیبر اور کلکتہ تک جانے لگا جس نے پانی پیا وہ طاعون جیسے موذی مرض سے محفوظ رہا۔ ۱۹۲۵ء میں نامعلوم وجوہات کی بنا پر اس کنویں کا پانی خشک ہو گیا اور تمام کوششوں کے باوجود اس کا پانی دوبارہ نہ جاری ہو سکا۔

✖

پشت در پشت یہ روایت چلی آتی ہے کہ آپ کے روضہ مبارک پر ایک ببر شیر صفائی کے لیے آتا تھا۔ اسی طرح ایک بہت بڑا سانپ بھی ہر جمعرات کو آیا کرتا تھا۔ ساری رات مزار پر وہ سانپ رہتا اور صبح سویرے جب لوگ مزار پر آنا شروع کرتے تو یہ سانپ روپوش ہو جایا کرتا تھا۔ شیر بھی ایک طویل مدت تک مزار پر آتا رہا۔ ایک مرتبہ اس شیر نے آپ کے مزار کے نواحی گاؤں میں کسی کی گائے کھالی۔ اس کے بعد شیر کا داخلہ مزار پر بند کر دیا گیا۔ شیر جاتا جاتا اپنا پنجہ ایک بہت لمبی کھجور پر لگا گیا جس سے کھجور کا درخت ٹیڑھا ہو گیا اور اس درخت کا پھل بھی ٹیڑھا ہی آنے لگا۔ اس درخت کی کھجوریں نہایت ہی میٹھی ہوتی ہیں اس بات سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آپ کے مزار پر انسان ہی نہیں چرند، پرند بھی حاضر ہوا کرتے تھے روحانیت کے اوصاف انسانوں میں ہی نہیں جانوروں میں بھی ظاہر ہوتے تھے۔

✖

۱۹۴۷ء کے فسادات میں جن لوگوں نے آپ کے مزار کے اندر پناہ لی نہ صرف وہ محفوظ رہے بلکہ کئی ایک نے تو وہاں سے ولایت بھی حاصل کی جن میں ایک مائی رڈڑی تھی جس نے اگست ۱۹۴۷ء میں روضہ مبارک پر پناہ لی اور آخر دم تک وہاں پر ہی رہی اور بالآخر وہاں پر ہی دفن بھی ہوئی۔ ان ایام میں جو آپ کے مزار کی طرف بری نیت سے آتا۔ وہ اللہ کے حکم سے اندھا ہو جایا کرتا تھا۔ آپ نے مسلمانوں کو اپنی زندگی میں بھی بے پناہ فوائد سے بہرہ ور کیا اور پردہ کر جانے کے بعد بھی آپ مسلمانوں کی بھلائی کے کام سرانجام دیتے رہے آپ کی خدمت میں فرق مراتب سے بالاتر تمام لوگ جن میں ہندو مسلم کا کوئی اعتبار نہ تھا۔ آتے اور انوار سے اپنی جھولیاں بھر کر جاتے تھے۔

✖

حضرت تاج العارفین کو اپنے شیخ سے بے پناہ محبت تھی۔ آپ کے متعلق ایک واقعہ مشہور ہے کہ آپ اپنے پیر و مرشد کے لیے ایک مٹی کی بھڑولی میں اوپلے ڈال کر اس میں آگ جلا لیتے اور اس بھڑولی پر مٹی کی ہنڈیا میں دودھ، میٹھا اور کاجو وغیرہ ڈال کر اس کا منہ بند کر کے شام چوراسی سے پیدل چل پڑتے اور آپ کے منزل مقصود تک پہنچنے تک کھچریلا پک کر تیار ہو چکا ہوتا تھا۔ آپ نے بارہ سال تک یہ معمول بنائے رکھا۔ ایک مرتبہ رات کے وقت آندھی اور طوفان کا اس قدر شور اٹھا کہ آپ کا گھر سے نکلنا دشوار ہو گیا۔ مگر آپ نے دل میں عہد کیا کہ اپنے معمول میں کوتاہی نہ ہونے دوں گا۔ چنانچہ آپ طوفان کی پرواہ کیے بغیر گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ ابھی نصف منزل پر ہی تھے کہ طوفان کی وجہ سے آپ ایک اندھیرے اور ویران کنویں میں گر گئے اس میں بہت سارے سانپ تھے۔ انہوں نے آپ کو اپنے سروں کی مدد سے کنویں سے باہر نکالا اور آپ کو کوئی گزند نہ پہنچی نہ ہی ہنڈیا بھی آپ کے سر سے گری۔ اور آپ بخیریت اپنے مرشد کی خدمت میں پہنچ گئے۔ آپ کے مرشد نے جب آپ کو اس طوفان اور باد و باراں میں آتے دیکھا تو خوشی سے اٹھ کر آپ کو گلے لگا لیا اور فرمایا "عبدالنبی! آج تمہاری منزل مکمل ہو گئی۔ آپ آ

لایا کرو ہم خود آپ کے پاس پہنچ جایا کریں گے لیکن جب ہم آپ کے پاس آئیں گے تو تمہارے دروازے پر ہمارا جھگڑا
ہے گا،،

ں کے بعد آپ کے مرشد اپنے قول کے مطابق خود تاج العارفین کے گھر آئے آپ اس وقت اپنے حلقۂ ارادت منداں میں
بیٹھے اور اپنے خادم کو حکم دے رکھا تھا کہ کسی کو بھی ہمارے پاس نہ آنے دینا،، اسی اثناء میں حضرت تاج العارفین کے مرشد
رف لائے اور خادم سے کہا کہ میں تمہارے مرشد سے ملاقات کا متمنی ہوں خادم آپ کے مراتب اور شخصیت سے ناواقف
ھا اس نے حضرت سلطان العارفین کے حکم کے مطابق کہہ دیا کہ آپ کی ملاقات اس وقت حضرت سے نہیں ہو سکتی۔ اس بات
ڑھ گئی۔ خادم نے گستاخی سے آپ کو جھڑک دیا اس پر حضرت قطب عالم نے خادم سے کہا "جاؤ عبدالنبی سے کہو کہ ایک
طاہر نامی آپ سے ملنے آیا ہے" خادم اس بات پر رضامند ہو گیا اور اندر جا کر حضرت عبدالنبی سے عرض کی" باہر ایک طاہر
ں آپ سے ملاقات کا خواہشمند ہے" یہ سننا تھا کہ حضرت تاج العارفین، تسبیح مصلی اور مریدوں کو چھوڑ چھاڑ کر خانقاہ
رھا گے اور فوراً اپنے مرشد کے قدموں میں گر گئے حضرت قطب عالم نے آپ کو اٹھا کر سینہ سے لگایا۔ آپ کا سینہ نور معرفت
ر دیا۔ اس کے بعد حضرت تاج العارفین نے اپنی پگڑی اپنے مرشد کے راستے میں بچھا دی اور مرشد عالی پگڑی پر قدم رکھتے
پ کی خانقاہ میں پہنچے یہ چیز ایک جم غفیر نے دیکھی اپنے مرشد کی انوکھی عقیدت کی ایسی مثال تاریخ میں نہیں ملتی جس بے نظیر
حضرت تاج العارفین نے اپنے مرشد حضرت قطب عالم کا استقبال کیا اور ان کی پذیرائی کی۔ حضرت قطب عالم حاجی
اہر حضرت تاج العارفین کے مرشد جب خانقاہ کے اندر پہنچ گئے تو ان کو چارپائی پر بٹھایا گیا ان کے طعام و آرام کا انتظام
کھانا کھانے سے پیشتر سنتِ رسولؐ کے مطابق ان کے ہاتھ دھلوانے کے لیے حضرت تاج العارفین کی بیٹی پانی لے کر
رت قطب عالم نے جب اپنے مرشد کی بیٹی کو دیکھا تو دیکھتے ہی رہ گئے آپ کی محویت کا یہ عالم تھا کہ اس لڑکی نے تین مرتبہ
نی کا لوٹا آپ کے ہاتھوں پر رونڈھا مگر آپ کو اپنی خبر ہی نہ رہی۔ آپ کی اس محویت پر حضرت تاج العارفین کے دل میں خیال
ہ شاید میرے پیر و مرشد کی نظر میری بیٹی پر آ گئی۔ چنانچہ انہوں نے اپنے مرشد سے عرض کیا "حضرت آپ پہلے میری بیٹی سے
ح کر لیں، کھانا بعد میں کھا لیں گے۔ میرے جیسا خوش نصیب کون ہو گا جس کا داماد ایک کامل انسان ہو گا" آپ کی بات سن کر حضرت
عالم جوش میں آ گئے اور فرمانے لگے" عبدالنبی تمہارے دل میں یہ خیال کیسے پیدا ہو گیا ہے کہ میں تمہاری بیٹی پر عاشق ہو گیا ہوں
ہاری بیٹی تو میری بیٹی ہے میں اس وجہ سے بچی کی طرف غور سے دیکھ رہا ہوں کہ میں نے لوحِ محفوظ پر دیکھا ہے کہ اس کی
د کار ہوگی۔ فقیر نے تین لوٹوں کے پانی سے صاحبزادی صاحبہ کی تین پشتوں تک کی اولاد کے گناہ دھو ڈالے ہیں تا کہ ان کی
یت نیک، صالح اور متقی و پرہیزگار ہو۔ آپ کے مرشد کی پیش گوئی دعا حرف بہ حرف پوری ہوئی۔ حضرت تاج العارفین کی
لاد آج بھی دنیا کے ہر کونے میں عزت و وقار کے ساتھ قائم ہے اور ان کو اللہ تعالیٰ صاحب ثروت و حشمت بھی کیا ہے اور
ر صالح بھی۔

یک دفعہ ایک کھتری کی بیٹی رفع حاجت کے لیے کھیتوں میں گئی۔ شام کا وقت تھا اور اندھیرا چاروں طرف پھیل رہا تھا۔ اجابت سے
ر جب وہ لڑکی گھر کی طرف آ رہی تھی تو ایک طرف سے ایک قافلہ آ رہا تھا۔ اس میں سوار لوگوں نے لڑکی کو اکیلا جان کر اٹھا
پنے ساتھ لے گئے۔ لڑکی نے بہت منت سماجت کی مگر انہوں نے اس کی ایک نہ سنی۔ اپنی منزل پر پہنچ کر اہلِ قافلہ نے
کی ایسے مکان کے ایک کمرے میں بند کر دیا جس کے صحن میں اناروں کے درخت تھے۔ اور اس کمرے کے اندر آموں کے
ے تھے۔ لڑکی کی گمشدگی سے اس کے ماں باپ سخت پریشان ہوئے اور انہوں نے آکر حضرت تاج العارفین کی خدمت
ں واقعہ عرض کیا۔

حضرت باباجی عبدالنبی نے فرمایا "تم لوگ بالکل بے فکر رہو۔ اللہ تعالیٰ لڑکی کو ضرور واپس لائے گا" اس کے بعد آپ نے ایک رقعہ لکھا اور فرمایا "تم لوگ میرا رقعہ فلاں بازار میں لے جاؤ وہاں ایک خواجہ سراء ناچ رہا ہے اس کو دے دیں۔ وہ لوگ باباجی کا خط لے کر بازار میں لے گئے وہاں واقعی ایک خواجہ سراء ناچ رہا تھا۔ اس کو جب رقعہ دیا گیا تو اس نے پہلے رقعہ کو چوما اور آنکھوں سے لگایا پھر وہ یہ فقرہ اپنی زبان پر الاپنے لگا۔

امباں والی کوٹھڑی اناراں والا ویہڑہ
چل نی نڈھیے گھر تیرا کیہڑہ

یہ فقرہ الاپتے الاپتے اس نے اپنے ہاتھ ہواؤں میں پھیلا دیے اور اپنی پھیلے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ لڑکی کو بالوں سے پکڑ کر محفل میں حاضر کر دیا۔ لوگ اس حیرت انگیز کارکردگی سے انگشت بدنداں ہو گئے۔ سب نے لڑکی سے پوچھا کہ یہ کیا قصہ ہے تم کیسے آئی جب لڑکی زبان کھولنے لگی تو وہ خواجہ سراء وہاں سے غائب ہو گیا اور پھر کبھی کسی کو نظر نہ آیا۔ لڑکی نے بتایا کہ میں ایک کوٹھڑی میں تھی اچانک وہاں پر سخت طوفان آیا اور مجھے کوئی غیبی ہاتھ اٹھا کر یہاں لے آیا مجھے کوئی علم نہیں کہ یہ سب کس طرح ہوا ہے سب لڑکی کو حضرت باباجی کی خدمت میں لے گئے۔ باباجی نے فرمایا کہ دراصل وہ خواجہ سراء بڑا ولی اللہ ہے۔ اور میرا مرید ہے۔ اور اس نے لوگوں کی نظروں سے بچنے کے لیے اپنا یہ روپ اختیار کر رکھا ہے آپ کی باتیں سن کر اس وقت آپ کے ارد گرد جتنے سکھ اور ہندو موجود تھے۔ سب کے سب مسلمان ہو گئے۔

حضرت باباجی کے ہاتھوں پر بہت سے ہندو اور سکھوں نے اسلام قبول کیا۔ آپ نے کفرستان میں توحید کے ڈنکے بجائے آپ کا فیض ہر ایک کے لیے اب تک جاری و ساری ہے اللہ تعالیٰ نے آپ کو اتنی عزت و شان بخشی ہے کہ آپ کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔

ایکدن حضرت باباجی مسجد میں اپنے مریدوں کے درمیان تشریف فرما تھے۔ بیٹھے بیٹھے آپ اچانک اُٹھ کر حجرے کے اندر چلے گئے۔ کچھ وقفے کے بعد آپ باہر تشریف لے گئے تو آپ کے کندھوں اور چہرے پر ریت لگی ہوئی تھی۔ جب لوگوں نے پوچھا کیا "حضرت یہ ریت کیسے لگی ہے"، تو آپ نے جواب دیا "میرا ایک معتقد جو ایک سوداگر ہے اس کا جہاز بھنور میں پھنس گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا کہ جا کر جہاز کو بھنور سے نکالو چنانچہ میں خدا کے حکم سے وہاں گیا تھا اور اس کے جہاز کو بھنور سے نکالا اور کنارے لگا کر آیا ہوں۔ ۶ ماہ کے بعد وہ سوداگر سفر سے واپس شام چوراسی میں آپ کی قدم بوسی کو آیا اور حاضرین کو سارا واقعہ کہہ سنایا کہ آپ نے کسطرح اس گرداب میں پھنسے ہوئے کی مدد کی۔

ایک مرتبہ حضرت باباجی کی ملاقات ایک جذامی کے ساتھ ہو گئی اس وقت حضرت اپنے سر پر گجریلے کی ہنڈیا اُٹھا کر اپنے مرشد کی خدمت میں جا رہے تھے۔ جذامی نے عرض کی "خدا کے نام پر مجھے تھوڑا سا گجریلا کھلا دو" آپ نے فرمایا "ہانڈی کا منہ بند ہے اور جب میں اپنے مرشد کی خدمت میں حاضری دے کر واپس آؤں گا تو تمہارے لیے بچا کر لیتا آؤں گا تب تک تم انتظار کرو" یہ کہہ کر آپ آگے بڑھ گئے جب آپ حضرت قطب عالم اپنے مرشد کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے فرمایا تم سائل کو محروم چھوڑ آئے ہو" آپ نے عرض کی "حضرت! ہنڈیا کا منہ بند تھا اب میں واپس جاتا ہوا اس کا حصہ لیتا جاؤں گا۔ چنانچہ واپسی پر آپ اس جذامی سائل کے لیے گجریلا لیتے گئے اور اس کو اپنے ساتھ بٹھا کر کھلایا جب وہ اچھی طرح کھا چکا تو باقی بچا ہوا گجریلا آپ نے اس کے سارے جسم پر مل دیا اور خدا سے اس کے حق میں دعا کی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ

ی برکت سے اس کا سارا جزام ٹھیک کر دیا اور وہ بالکل صحت یاب ہوگیا۔ اس کے بعد اس نے آپ سے بیعت کی درخواست ی مگر آپ اس کو اپنے مرشد حضرت قطب عالم کی خدمت میں لے گئے اور ان سے ہی بیعت کروایا۔ وہ شخص عمر بھر حضرت قطب عالم کی خدمتِ اقدس میں رہا اور معرفت و علم میں اس نے بلند ترین درجات حاصل کیے اس طرح اس نے ساری عمر عالم پور میں گزار دی اور وہیں پر دفن ہوا۔

حضرت باباجی جنگل میں عبادت وریاضت میں مشغول تھے کہ آپ کو چند سپاہی نظر آئے انہوں نے ایک اچار کا بڑا سا برتن ایک غریب آدمی کے سر پر رکھا ہوا تھا۔ اور اس سے بیگار لے رہے تھے وہ شخص بیچارہ تھک چکا تھا مگر سپاہیوں کو اس کی تھکاوٹ کا کوئی احساس نہ تھا اور اگر وہ تھکاوٹ کا اظہار کرتا تو سپاہی اس کو زدوکوب کرتے۔ آپ نے ان سپاہیوں کو آواز دے کر روکا اور ان کو اس طرح بیگار لینے سے منع کیا۔ سپاہیوں نے نہایت بدتمیزی سے آپ کو کہا "اگر آپ کو اس شخص کا زیادہ ہی خیال ہے تو اس کی جگہ یہ برتن آپ اٹھالیں۔ آپ نے فرمایا" مجھے کوئی عذر نہیں لاؤ میں برتن اٹھالیتا ہوں" آپ برتن اٹھا کر سوار سپاہیوں کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ چند لمحوں کے بعد سپاہیوں نے مڑ کر دیکھا کہ پیچھے بیگاری آ رہا ہے یا نہیں تو ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ آپ سر مبارک سے نیزے بھر اونچا برتن ہوا میں معلق جا رہا ہے سوار سپاہیوں نے یہ حال دیکھا تو آکر آپ کے قدموں میں گر گئے آپ سے معافی مانگی۔ آپ نے فرمایا" تم اب عالم پور کے نزدیک ہو چلو میرے مرشد کے پاس چلو وہاں پر ہی تمہاری معافی ہوگی چنانچہ وہ لوگ آپ کے پاس عالم پور میں پہنچے اور حضرت شیخ عالم کے ساتھ پر بیعت کی اور فیض وتلقین حاصل کی اور روحانیت کے کارواں میں شامل ہوگئے۔

نواب جانی، نواب قمرالدین خان دہلی کے بادشاہ وزیر احمد شاہ کے فرزند تھے اس کے دل میں اسلامی تعلیم کا بے حد شوق تھا۔ اولیائے کرام کی صحبت میں بیٹھنے کا بھی وہ مشتاق تھا۔ حضرت تاج العارفین کی شہرت جب اس نے سنی تو وہ آپ کی خدمت میں بھی حاضر ہوا اور آپ سے عرض کی کہ مجھے بیعت کیا جائے۔ آپ نے فرمایا" کچھ عرصہ انتظار کرو۔ نواب جانی بظاہر انتظار کرتے تھے لیکن انتظار والا عرصہ آپ نے حضرت کے لنگر خانے میں خدمات سرانجام دینے میں گذارا۔ ایک روز دوسرے خدام سے حضرت کو سفارش کروائی کہ انہیں سلسلہ میں داخل کرلیا جائے اس پر حضرت باباجی نے نواب جانی کو طلب کیا اور فرمایا "جانی خان! تم جانی بننا چاہتے ہو یا خان بننا چاہتے ہو" اس بات پر جانی خان نے عرض کی" سرکار! میں جانی بننا چاہتا ہوں" آپ نے تین مرتبہ سوال کیا اور جانی خان نے تینوں مرتبہ ایک ہی جواب دیا کہ میں صرف جانی بننا چاہتا ہوں اسی اثناء میں ایک شخص حضرت کی خدمت میں خربوزوں کا ایک ٹوکرہ لے کر آیا۔ آپ نے تمام حاضرین کے درمیان ایک ایک خربوزہ تقسیم کر دیا۔ ایک خربوزہ آپ نے جانی خان کو بھی دیا۔ سب لوگ خربوزہ ویسے ہی کھانے لگ گئے مگر نواب جانی خان نے خربوزہ کاٹنے کے لیے چاقو مانگا۔ یہ بات سن کر حضرت نے ذرا ترش سے کہا" جانی خان ابھی تک تمہاری خانی نہیں گئی۔ اس لیے کچھ عرصہ اور لنگر خانے کی خدمت کرو پھر تمہیں بیعت کریں گے"۔ کچھ عرصہ بعد نواب جانی کی طبیعت درست ہوگئی، تو ان کو بیعت کرلیا گیا۔ اور پھر وہ دوسرے خادموں کے ساتھ رہ کر علوم ظاہری وباطنی حاصل کرتے رہے۔ اس عرصہ میں ان کو اپنے گھر جانے کا مطلق خیال نہ آیا۔ کچھ عرصہ کے بعد حضرت تاج العارفین نے پھر نواب جانی سے پوچھا" اے جانی! کیا تم جانی ہی رہنا چاہتے ہو یا تمہیں جانی خان بنا دیا جائے" انہوں نے عرض کی" حضرت! میں جانی ہی رہنا چاہتا ہوں" آپ نے فرمایا" نہیں تمہیں جانی خان بننا پڑے گا کیونکہ تمہارے والد کا انتقال ہوگیا ہے اور جانشینی کا مسئلہ کھڑا ہو چکا ہے۔ تمام لوگوں کا خیال ہے کہ بڑے لڑکے کو بادشاہت ملنی چاہیے لیکن تمہارے لاپتہ ہونے کی وجہ سے تمہیں بادشاہی سے محروم رکھا جانے کی

سازش ہو رہی ہے اس لیے اب تم گھر جانے کے لیے تیار ہو جاؤ" یہ فرمانے کے بعد حضرت نے جانی خان کو حکم دیا "آنکھیں بند کر لو اور جب تک میں نہ کہوں آنکھیں نہ کھولنا" جب جانی خان کو آنکھیں کھولنے کا حکم ملا تو وہ حیرت زدہ رہ گئے کیونکہ وہ اپنے محل کے اندر پہنچ چکے تھے پھر ان کو دستخط اور ضابطے کے مطابق باپ کی گدی پر متمکن کیا گیا۔ لیکن جانی خان بادشاہ بننے کے بعد بھی روحانیت کے ساتھ منسلک رہے اور اپنے مرشد کی خدمت میں ہمہ تن مصروف رہے اور اپنی خدمت کا اعجاز ہے کہ جانی خان کو ان کی وفات کے بعد ان کے مرشد حضرت باباجی کے قدموں میں دفن کیا گیا۔

حضرت تاج العارفین نے زندگی کے تقریباً آخری چالیس سال شام چوراسی میں گزارے۔ مجاہدات اور مراقبہ و عبادات کو آپ نے اپنا معمول بنائے رکھا ایک درس گاہ قائم کی جس میں متعدد علمائے کامل درس کی خدمت کے لیے حاضر ہوتے تھے۔ آپ کے مدرسہ میں حفاظ کی تعداد ایک سو چالیس سے متجاوز تھی۔ آپ کے لنگر خانے سے حاضرین کے علاوہ ہزاروں معتقدین کھانا کھایا کرتے تھے رکھانے میں اللہ تعالیٰ اس قدر برکت ڈالتا کہ آپ کی درگاہ پر کھانا کبھی کم نہ ہوتا تھا۔ دور دراز سے لوگ آتے اور اپنے من کی مرادیں حاصل کرتے تھے۔

۱۷۰۷ء تا ۱۷۱۲ء کے زمانے میں ہندوستان پر بہادر شاہ اول کی حکومت تھی۔ بادشاہ خود حضرت تاج العارفین کی خدمت میں حاضری دیا کرتا تھا۔ اس نے آپ کی خدمت میں ایک لاکھ روپیہ اور لعل گراں بطور نذرانہ پیش کیے اس زمانے میں صوبہ لاہور کا گورنر نواب عبدالصمد خاں تھا جو ۱۷۱۳ء سے ۱۷۳۲ء تک حکمران رہا۔ وہ حضرت ناصر الدین، خواجہ عبداللہ احرارؒ کی اولاد میں سے تھے انتظام الدولہ نواب جانی خان اور میر معین الملک عرف میر منو جو بالترتیب افواج کے سالاران اعلیٰ تھے۔ اور پنجاب کے حا[کم] تھے سب حضرت کے مرید تھے۔

۱۷۱۹ء تا ۱۷۵۳ء عنایت اللہ خان وزیر اور ان کے علاوہ خاں صاحب میر لطف اللہ خان، خاں صاحب اختر خان، میاں رستم خاں اور مہربان خان جو حکومت کے ارباب حل و عقد تھے یہ سب مندرجہ بالا صاحبان حضرت تاج العارفین کے مریدین خا[ص] میں شمار ہوتے تھے جنہوں نے عنانِ اقتدار سنبھالنے کے ساتھ روحانیت میں بھی اعلیٰ ترقی حاصل کر رکھی تھی۔

جناب گورشرن سنگھ شامی نے اپنے آپ کو حضرت تاج العارفین کی خدمت کے لیے وقف کر رکھا تھا اس نے ۲۳ سال تک آپ کی خدمت کے فرائض سرانجام دیے اس نے حضرت تاج العارفین کے روضہ کی چار دیواری از سرِ نو تعمیر کروائی اس پر نقش و نگار بنوائے اور ایک خوبصورت گرل لگوائی اس شخص نے اپنی تمام پونجی اس کام پر صرف کر دی۔

حضرت تاج العارفین کا وصال بروز بدھ مورخہ ۲۲ ربیع الاول ۱۱۴۶ھ بمطابق ۲۲ اگست ۱۷۳۳ء کو شام چوراسی میں ہوا جہا[ں] آپ کا روضہ مبارک پچاس کنال رقبہ میں واقع ہے آپ نے تقریباً ۱۱۸ سال عمر پائی اور ساری عمر اسلام کی سربلندی کے لیے کو[شا]ں رہے حتیٰ کہ آپ نے ابتدا میں وطن مالوف شام چوراسی کو بھی خیرباد کہا اور اپنے بیوی بچوں اور والدین سے بھی کافی عر[صہ] تک جدا رہے۔

ایک شب خلیفہ منصور نے اپنے وزیر کو حکم دیا کہ فلاں بزرگ کو فوری طور پر گرفتار کرکے اُن کے رُوبرُو پیش کیا جائے۔ خلیفہ کے تیور بتا رہے تھے کہ اُس کے ارادے بہت خطرناک ہیں۔ وزیر نے ڈرتے ڈرتے پوچھا کہ اے امیرالمومنین آخر معاملہ کیا ہے کہ رات گئے آپ اُن بزرگ کو طلب کرنا چاہتے ہیں؟

خلیفہ منصور نے کہا: "مَیں اُسے قتل کر دینا چاہتا ہوں۔"

وزیر نے کہا کہ اے امیرالمومنین جس شخص نے دنیا کو ہمیشہ کے لیے ترک کر دیا ہو اور ہمیشہ کے لیے گوشہ نشین ہوگیا ہو اُس کے قتل کرنے کی منطق میری سمجھ میں نہیں آئی۔ ویسے بھی ایسے شخص کو قتل کرنا قرینِ مصلحت نہیں۔

وزیر کی بات سن کر خلیفہ خاصا غضبناک ہوگیا کہنے لگا "تم اپنے کام سے کام رکھو مَیں خلیفہ کی حیثیت سے تمہیں جو حکم دے رہا ہوں اُس کی فوری طور پر تعمیل کر دو۔"

وزیر چونکہ خلیفہ کا جائز و ناجائز حکم ماننے پر مجبور تھا اس لیے وہ خاموشی سے سر جھکائے اُن بزرگ کو لینے چلا گیا۔ وزیر کے چلے جانے کے بعد خلیفہ منصور نے اپنے غلاموں کو حکم دیا کہ جس وقت وزیر اُس بزرگ کو لے کر دربار میں آئے اور پھر اس موقع پر جیسے ہی مَیں اپنا تاج سَر سے اُتاروں تم فوری طور پر اُسے قتل کر دینا لیکن وہاں تو معاملہ ہی اُلٹ ہوگیا۔ متعلقہ وزیر جیسے ہی اُن بزرگ کو ہمراہ لے کر دربار میں پہنچا تو اُن کی عظمت وجلال کو دیکھ کر خلیفہ اس قدر متاثر ہوا کہ تمام آدابِ شاہی بھول کر اضطراری کیفیت میں اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا اور آگے بڑھ کر نہ صرف بزرگ کا پُرجوش استقبال کیا بلکہ آپ کو صدر مقام پر لا بٹھایا۔ خلیفہ منصور نے اسی پر بس نہیں کی بلکہ وہ انتہائی مؤدبانہ انداز میں آپ کے سامنے بیٹھ کر آپ کی حاجات و ضروریات دریافت کرنے لگا۔

وہ بزرگ چند لمحے تو خلیفہ منصور کے انداز کا جائزہ لیتے رہے اور پھر انھوں نے فرمایا: "مجھے کسی دنیا وی آرام و آسائش کی طلب نہیں ہے۔ مَیں تم سے صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ آئندہ کبھی مجھے اپنے دربار میں طلب

نہ کرنا کیونکہ اس طرح میری عبادات میں خلل واقع ہوتا ہے۔
چنانچہ خلیفہ منصور نے وعدہ کیا کہ آئندہ وہ کبھی ایسی حرکت نہیں کرے گا۔ اس کے ساتھ ہی خلیفہ نے اُن بزرگ کو عزت و احترام کے ساتھ رخصت کر دیا لیکن ان بزرگ کے جلال اور دبدبے کا خلیفہ پر کچھ ایسا اثر ہوا کہ وہ لرزہ براندام ہو کر تین روز تک مکمل بیہوشی کی حالت میں رہا۔
ادھر اپنے خلیفہ کی یہ حالت دیکھ کر سارے وزراء اور غلام حیرت زدہ رہ گئے اور جب ایک غلام نے ڈرتے ڈرتے خلیفہ سے اُس کا حال دریافت کیا تو خلیفہ نے بتایا کہ جب یہ بزرگ میرے پاس لائے گئے تو ان کے ساتھ ایک بڑا اژدھا بھی تھا جو کہ اپنے بڑے بڑے جبڑوں میں پورے چبوترے کو اپنے گھیرے میں لے سکتا تھا اور وہ خوفناک اژدھا مجھے اپنی زبان میں کہہ رہا تھا کہ اگر تُو نے ذرا سی بھی گستاخی کی یا بزرگ کو ذرا برابر بھی تکلیف پہنچائی تو میں تمہیں اس چبوترے سمیت نگل جاؤں گا۔ چنانچہ اس اژدہے کی دہشت سے مجھ پر اس قدر لرزہ طاری ہوا کہ میرے پاس اس کے سوا کوئی اور چارہ کار نہ رہا کہ میں اُن بزرگ سے معافی طلب کر کے انھیں عزت و آبرو کے ساتھ رخصت کر دوں۔
خلیفہ منصور نے دراصل جن بزرگ کو اپنے دربار میں قتل کرنے کی نیت سے طلب کیا تھا اُن کا نام حضرت ابو امام جعفر صادق تھا۔ آپ نہ صرف مجموعۂ کمالات و پیشوائے مشائخ تھے بلکہ اربابِ ذوق اور عشاق و زہاد کے مقتدا بھی تھے صرف یہی نہیں بلکہ آپ نے اپنی بے شمار تصانیف میں رموزِ خداوندی کو بڑے اچھے پیرائے میں واضح فرمایا ہے۔
آپ کا نام جعفر صادق اور کُنیت ابو محمد تھی۔ آپ کے مناقب و کرامات بے شمار ہیں۔ حضرت امام جعفر صادق نہ صرف اُمتِ محمدی کیلئے اور نہ صرف بادشاہ اور حجتِ نبوی کے لیے روشن دلیل ہیں بلکہ صدق و تحقیق پر عمل پیرا اور اولیائے کرام کے باغ کا ثمر بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جس قدر عظمت بزرگی اور شان و شوکت عطا کی اُس کے پیشِ نظر آپ کو جو خطابات ملے انھیں کسی طور پر غیر موزوں نہیں کہا جا سکتا۔
حضرت امام جعفر کا درجہ صحابہ کرام کے بعد آتا ہے لیکن اہلِ بیت میں شمولیت کی وجہ سے بابِ طریقت میں ہی آپ سے ارشادات منقول ہیں بلکہ بہت سی روایات بھی مروی ہیں۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جو لوگ آپ کے مسلک پر عمل پیرا ہیں وہ ایک اعتبار سے بارہ امام کے مسلک پر گامزن ہیں کیوں کہ آپ کا مسلک بارہ امام کا قائم مقام ہے لہٰذا اس لیے اگر صرف تنہا آپ ہی کے حالات و مناقب بیان کر دیئے جائیں تو وہ بارہ اماموں کے مناقب کا ذکر تصور کیا جائے گا۔
حضرت امام جعفر صادق کے نزدیک انسان کی نجات صرف اور صرف اُس کے عمل پر موقوف ہے اس کے علاوہ راہِ نجات کا اور کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔ روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت داؤد طائی آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور امام جعفر صادق سے عرض کی، چونکہ آپ اہلِ بیت ہیں اس لیے مجھے کوئی نصیحت فرمایئے۔ تو امام جعفر صادق بدستور خاموش رہے مگر جب داؤد طائی نے دوبارہ آپ سے عرض کی کہ اہلِ بیت ہونے کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو فضیلت بخشی ہے اس لحاظ سے نصیحت کرنا آپ پر فرض ہے۔ تو اس پر امام جعفر صادق نے فرمایا: "مجھے تو ہر وقت یہی خوف لاحق رہتا ہے کہ کہیں روزِ حشر میرے جدِ اعلیٰ ہاتھ پکڑ کر یہ سوال نہ کر بیٹھیں کہ تُو نے خود میری اتباع کیوں نہیں کی اس لیے کہ نجات کا تعلق نسبت سے نہیں بلکہ اعمالِ صالحہ پر موقوف ہے۔ آپ کا جواب سُن کر داؤد طائی کو بہت عبرت ہوئی اور اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ جب اہل

ہیبت پر خوف کے غلبے کا یہ عالم ہے تو پھر میں بھلا کس گنتی میں آتا ہوں اور کس چیز پر فخر کر سکتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ کی ذاتِ بابرکات کے بارے میں آپ کا نظریہ بہت واضح اور ٹھوس تھا۔ ایک مرتبہ کسی شخص نے آپ کے پاس آکر اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ خدا کا دیدار کرنا چاہتا ہے۔ آپ نے اُس شخص سے فرمایا کیا تجھ کو معلوم نہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا گیا تھا کہ "تُو مجھے کبھی نہیں دیکھ سکتا۔" پھر تُو نے کس لیے اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ تجھے خدا دکھایا جائے۔ اگر کوئی باطن کی نگاہ سے دیکھے تو اسے ہر شے میں خدا نظر آئے گا۔

وہ شخص بھی آسانی سے ٹلنے والا نہ تھا۔ اُس نے حضرت امام جعفر صادق سے کہا: "حضرت موسیٰ کا معاملہ اور تھا لیکن یہ تو اُمتِ محمدی ہے جس کے بارے میں ایک شخص کہتا ہے "رَاٰنِیْ قَلْبِیْ رَبِّیْ" یعنی میرے قلب نے اپنے پروردگار کو دیکھا اور دوسرا شخص یہ کہتا ہے کہ "لَمْ اَعْبُدْ رَبًّا لَمْ اَرَاہُ" یعنی مَیں ایسے رب کی عبادت نہیں کرتا جو مجھے نظر نہیں آتا۔

اُس شخص کی یہ باتیں سُن کر حضرت امام جعفر صادق نے حکم دیا کہ اس شخص کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اُسے دریائے دجلہ میں ڈال دیا جائے۔ چنانچہ جب اس شخص کو ہاتھ پاؤں باندھ کر اُسے دریائے دجلہ میں ڈال دیا گیا اور پانی نے اس کو اُوپر پھینکا تو اُس نے حضرت امام جعفر صادق سے بہت التجا کی مگر آپ نے اُس کی ایک نہ سُنی اور دریا کے پانی کو حکم دیا کہ اُس شخص کو خوب اچھی طرح غوطے دیئے جائیں۔ دریائے دجلہ کے پانی نے آپ کے حکم کے مطابق جب اس شخص کو کئی مرتبہ پانی میں غوطے دے دیئے اور وہ لب جان ہو گیا تب وہ گڑگڑا کر اللہ تعالیٰ سے اعانت کا طلبگار ہوا۔ حضرت امام جعفر نے جب یہ دیکھا کہ خدا کے دیدار کا مطالبہ کرنے والا راہِ راست پر آگیا ہے تو آپ نے اسے پانی سے باہر نکلوا لیا۔

تھوڑی دیر بعد پانی سے نکلنے کے بعد جب اُس شخص کے حواس قدرے دُرست ہوئے اُس وقت حضرت امام جعفر نے اُس سے دریافت فرمایا: "اب بتاؤ کیا تم نے اللہ تعالیٰ کو دیکھ لیا۔"

وہ شخص کہنے لگا: "اے پیرومُرشد! جب تک میں دوسروں کی اعانت کا طلبگار رہا اُس وقت تک تو میرے سامنے ایک حجاب کا پردہ تھا لیکن جب میں اللہ تعالیٰ سے اعانت کا طالب ہوا تو میرے دل میں کچھ ایسی روشنی اور سکون پیدا ہوا جس سے میری ساری اضطراری کیفیت جاتی رہی جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے کہ "کون ہے جو حاجت مند کے پکارنے پر اُس کا جواب دے۔"

اس پر امام جعفر صادق نے اُس شخص سے فرمایا: "اے بندے! جب تک تُو نے اللہ تعالیٰ کو نہ پکارا اس وقت تک تُو جھوٹا تھا لیکن اب تمہارا دل ایمان کی روشنی سے منوّر ہو چکا ہے۔

حضرت امام جعفر کی تمام زندگی حق سچ کے بول بالا کے لیے جہاد کرتے ہوئے گزر گئی۔ مثلاً ایک مرتبہ جب امام شافعی کے مخالفین نے اُن پر رافضیت کا الزام لگایا تو آپ نے اس پر دُکھ کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ کس قدر تاسف آمیز بات ہے کہ اہلِ بیت ہی کی محبت کی وجہ سے حضرت امام شافعیؒ کو رافضی کا خطاب دے کر قید و بند کی صعوبتوں میں ڈال دیا گیا۔ جس کے متعلق امام صاحب خود ہی اپنے ایک شعر میں ارشاد فرماتے ہیں کہ "اگر اہلِ بیت سے مؤدت کا نام رفض ہے تو پھر پورے عالم اسلام کو میری رافضی پر گواہ رہنا چاہیے"۔ اور اگر بالفرض اہلِ بیت اور صحابہ کرام سے محبت کرنا ارکانِ ایمان میں داخل نہ ہو تب بھی ان سے محبت کرنے اور ان کے حالات سے باخبر رہنے میں کیا حرج واقع ہوتا ہے، اسی لیے ہر اہلِ ایمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ جس طرح دل و جان سے سرورِ کائنات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مراتب سے آگاہی حاصل کرتا ہے

اسی طرح خلفائے راشدین اور دیگر صحابہ کرام اور اہلِ بیت کے مراتب کو بھی اُن کے مقام اور مرتبے کے مطابق افضل و اعلیٰ تصور کرے۔

جس دور میں حضرت امام جعفر صادق نے گوشہ نشینی اختیار کرلی اور تارکِ دُنیا ہوگئے تو اُس وقت حضرت ابوسفیان ثوری نے آپ کی خدمت میں حاضر ہوکر فرمایا۔ "امام صاحب! آپ نے تارکِ دنیا ہوکر لوگوں سے بڑی نعمت چھین لی ہے۔ وہ آپ کے فیوض و برکات سے محروم ہوگئی ہے۔ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ آپ اُن کی خاطر گوشہ نشینی ترک کرکے انھیں دوبارہ اپنی صحبت سے فیض یاب فرمائیں۔

حضرت ابوسفیان ثوری کی ساری بات سُن کر آپ کے ہونٹوں پر ایک پُرمعنی مسکراہٹ پھیل گئی۔ چند لمحے خاموشی اختیار کرنے کے بعد آپ نے حضرت ابوسفیان ثوری کو اپنے دو اشعار پڑھ کر سُنائے جن کا ترجمہ کچھ اس طرح سے ہے۔

"کسی جانے والے انسان کی وفا بھی چلی گئی اور لوگ اپنے خیالات میں غرق ہوگئے۔ اگرچہ وہ ظاہری طور پر ایک دوسرے کے ساتھ محبت کرتے ہیں لیکن ان کے دلوں میں زہریلے سانپوں اور بچھوؤں کا زہر بھرا ہوا ہے۔"

گویا آپ کے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ اس نفسانفسی اور افراتفری کی دنیا میں انسان کو انسان کے دُکھ درد سے کوئی واسطہ نہیں رہا۔ وہ محض دکھاوے اور دنیا داری کی خاطر ایک دوسرے سے محبت کا اظہار کرتے ہیں جبکہ حقیقت میں وہ زہریلے جانوروں سے بھی خطرناک ہیں اور کسی بھی وقت ایک دوسرے کی ہلاکت، تباہی اور بربادی کا سبب بن سکتے ہیں۔ اس کے بعد حضرت ابوسفیان ثوری خاموشی سے واپس چلے گئے۔

آپ کا نظریہ یہ تھا کہ انسان کا ظاہر مخلوق کے لیے اور اُس کا باطن اپنے خالقِ حقیقی کے لیے ہونا چاہیے لیکن جب انسان ان دونوں چیزوں میں گڈمڈ کر دیتا ہے تب وہ سراسر نقصان کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔

ایک مرتبہ کسی شخص نے آپ کو بیش بہا قیمتی لباس میں دیکھ کر سخت اعتراض کیا۔ وہ کہنے لگا کہ اہلِ بیت کو اس قسم کی قیمتی اور آرام دہ پوشاک پہننا زیب نہیں دیتا۔ اس پر امام جعفر صادق نے اُس شخص کا ہاتھ پکڑ کر جب اپنی آستین سے پھیرا تو اُس پر یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ آپ کا لباس تو ٹاٹ سے بھی کھردرا ہے۔ اس موقع پر آپ نے فرمایا کہ میرا جو لباس مخلوق کی نگاہوں میں عمدہ اور نفیس ہے حق کی نظروں میں وہ انتہائی کھردرا ہے۔

ایک مرتبہ کسی نے آپ سے سوال کیا کہ اگرچہ آپ علم و عرفان کا سمندر ہیں صاحبِ کرامت بھی ہیں اور آپ کے فضل و کمال سے ایک زمانہ واقف ہے اور اس قسم کے نیک انسانوں کے بارے میں اکثر یہ سننے میں آیا ہے کہ وہ عاجز، منکسر المزاج اور بہت نرم دل واقع ہوئے ہیں جب کہ آپ کے معاملے میں یہ بات اس کے قطعی برعکس ہے۔ آپ میں تو حد درجہ غرور اور تکبر پایا جاتا ہے آخر اس کا سبب کیا ہے؟

امام جعفر صادق نے اُس شخص کے جواب میں فرمایا۔ "میں قطعی طور پر متکبر نہیں ہوں البتہ جب میں نے کبر ترک کر دیا ہے تو میرے رب کی کبریائی نے میرا احاطہ کر لیا ہے اس لیے میں اپنے کبر پر نازاں نہیں ہوں بلکہ میں تو اپنے رب کی کبریائی پر فخر کرتا ہوں۔"

حضرت امام جعفر صادق کے فرمودات اور ارشادات پر عمل کرنے سے انسان پر علم و عرفان کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ آپ دنیا والوں کو دوسرے علماء اور فضلا کی طرح صرف زبانی کلامی نصیحتیں نہیں کرتے تھے بلکہ عملی طور پر بھی اس کا مظاہرہ فرماتے تھے۔ روایت ہے کہ ایک مرتبہ کسی شخص کی دیناروں والی تھیلی گم ہوگئی مگر اس نے غلط فہمی کی بنیاد پر امام صاحب پر الزام عائد کردیا کہ انھوں نے اُس کی تھیلی چرائی ہے۔ اُس شخص کا الزام سُن

ذائقے میں رنگت جو لاتا ہے
ماڈا ہے وہی
ماڈا
بناسپتی
۵ کلو
ایم ایچ آئل ملز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
ای ۳۲ سائٹ کراچی فون 4-2560091 فیکس 2582561
KIMCO

حضرت امام جعفر نے کسی قسم کے غصّے کا اظہار نہ کیا بلکہ اُس سے دریافت کیا کہ تھیلی میں کتنے دینار تھے۔ اُس شخص نے جواب دیا "میری تھیلی میں دو ہزار دینار تھے۔" یہ سُنتے ہی آپ فوراً اپنے گھر چلے گئے اور دو ہزار دینار لاکر اس شخص کے حوالے کر دیئے۔ اس واقعہ کے تھوڑی ہی دیر بعد اُس شخص کو اپنی کھوئی ہوئی تھیلی کسی جگہ سے مل گئی۔ اب تو وہ دل ہی دل میں بہت نادم ہوا اور فوراً امام جعفر صادق کی خدمت میں حاضر ہو کر سارا ماجرا بیان کر کے معافی مانگی۔ پھر اُس نے آپ سے درخواست کی کہ آپ اپنے دو ہزار دینار واپس لے لیں مگر آپ نے لاپرواہی سے فرمایا "ہم ایک مرتبہ جب کوئی چیز کسی کو دے دیتے ہیں تو پھر اُسے کبھی واپس نہیں لیتے۔" اتفاق کی بات یہ ہے کہ وہ شخص جس نے آپ پر تھیلی چرانے کا الزام لگایا تھا وہ آپ سے واقف نہ تھا مگر جب لوگوں کی زبانی اُسے آپ کا اسمِ گرامی معلوم ہوا تو اُسے بے انتہا ندامت ہوئی اور وہ آپ کے قدموں میں گر کر بے اختیار رو پڑا۔

آپ ہمیشہ لوگوں کو تلقین کیا کرتے تھے کہ انسان کو صرف اللہ تعالیٰ کے سامنے ہی ہاتھ پھیلانا چاہیے۔ کیونکہ ایک انسان دوسرے کو کچھ نہیں دے سکتا۔ روایت ہے کہ ایک مرتبہ آپ اللہ اللہ کا وِرد کرتے ہوئے تنہا کہیں جا رہے تھے کہ اتنے میں ایک اور شخص بھی خدا کے پاک کلام کا وِرد کرتے ہوئے آپ کے ساتھ شریک سفر ہو گیا۔ دورانِ سفر حضرت امام جعفر صادق کے مُنہ سے اچانک نکلا کہ اے اللہ تعالیٰ! میرے پاس کوئی مناسب پوشاک نہیں ہے۔"

ابھی آپ کے الفاظ مکمل بھی نہ ہوئے تھے کہ غیب کی جانب سے ایک بیش قیمت اور خوبصورت لباس عطا ہو گیا۔ آپ نے وہ لباس زیب تن کر لیا مگر وہ شخص جو اللہ اللہ کا وِرد کرتے ہوئے آپ کے ساتھ ساتھ جا رہا تھا اُس نے عرض کیا کہ میں بھی تو اللہ اللہ کا وِرد کرتے ہوئے آپ کا شریکِ سفر تھا مگر مجھے کچھ نہیں ملا۔ اس پر امام جعفر صادق نے اپنا پُرانا لباس اتار کر اُسے عنایت کر دیا۔

اُس شخص نے کہا "یہ کیا بات ہوئی ہم دونوں ہی اللہ کا وِرد کرتے ہوئے جا رہے تھے۔ آپ کو تو نیا لباس مل گیا مگر مجھے آپ اپنا پُرانا لباس دے رہے ہیں۔ اس پر امام صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ میں نے اللہ سے شکوہ کیا تھا اور تم نے مجھ سے شکوہ کیا ہے۔ لہٰذا یہ بات اچھی طرح سے سمجھ لو کہ اللہ کی عطا میں اور بندے کی دین میں بڑا فرق ہوتا ہے۔

آپ کی یہ بات سُن کر وہ شخص بہت شرمندہ ہوا اور اُس نے آئندہ کے لیے عہد کر لیا کہ وہ ہر شے کی طلب کے لیے صرف خدا کے سامنے ہی ہاتھ پھیلائے گا۔

✖

آپ کی غیر معمولی علمیت اور قابلیت کا شہرہ دُور دُور تک پھیل چکا تھا اور لوگ اپنی مختلف دینی و دنیاوی مسائل اور اُلجھنوں کے لیے آپ سے رجوع کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی نے آپ سے پوچھا "صحیح معنوں میں سُنّی کسے کہا جاتا ہے؟"

آپ نے فرمایا "صحیح معنوں میں سُنّی ہونے کا دعویٰ وہی کر سکتا ہے جو سرورِ کائنات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم سے رشتہ رکھنے والوں میں سے کسی کی فضیلت کا بھی منکر نہ ہو۔ اس بات کی تصدیق حضرت امام ابو حنیفہ نے بھی فرما دی ہے جب اُن سے دریافت کیا گیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے متعلقین میں سے افضل کون ہے تو آپ نے فرمایا کہ بوڑھوں میں حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق ہیں، جوانوں میں

حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہیں جب کہ عورتوں میں حضرت عائشہ صدیقہ اور لڑکیوں میں حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہم ہیں۔

ایک مرتبہ مومن کی تعریف کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ جو شخص نفس کی سرکشی کا مقابلہ کرتا ہے وہی صحیح معنوں میں مومن اور عارف کی تعریف میں آتا ہے۔ آپ نے فرمایا' جو شخص یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی خاص شے میں موجود ہے وہ کافر ہے اور جس معصیت سے قبل انسان میں خوف پیدا ہو جائے اور اگر وہ توبہ کرلے تو اس کو اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہو جاتا ہے لیکن جس عبادت کی ابتدا مامون رہنا اور آخر میں خود بینی پیدا ہونا شروع ہو جائے تو اُس کا نتیجہ بُعدِ الٰہی کی شکل میں نمودار ہوتا ہے اور جو شخص عبادت پر فخر کرے وہ گناہگار ہے مگر جو معصیت پر اظہارِ ندامت کرے وہ فرمانبردار ہے۔ کسی نے آپ سے سوال کیا کہ صبر کرنے والے درویش اور شکر کرنے والے مالدار میں آپ کے نزدیک کیا فرق ہے اور اُن میں سے کون افضل ہے؟ آپ نے فرمایا کہ صبر کرنے والے درویش کو اس لیے فضیلت حاصل ہے کہ مالدار کو ہر وقت اپنے مال کا خیال رہتا ہے جب کہ درویش کو صرف اللہ تعالیٰ کا خیال رہتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے کہ توبہ کرنے والے ہی صحیح معنوں میں عبادت گزار ہیں۔ امام جعفر صادق فرماتے ہیں' ذکرِ الٰہی کی تعریف یہ ہے کہ جس میں مشغولیت کے بعد دنیا کی ہر شے بھول جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہر شے کا نعم البدل ہے۔

ایک شخص نے دریافت کیا کہ اللہ تعالیٰ کہاں پوشیدہ ہے آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے سے اس سے بھی زیادہ پوشیدہ ہے جتنا کہ رات کی تاریکی میں سیاہ پتھر پر چیونٹی رینگتی ہے۔

آپ نے عمر بھر لوگوں کو نیکی اور بھلائی کی جانب راغب ہونے کی تلقین کی۔ ایک مرتبہ کسی محفل میں بُرائی اور بھلائی کی تعریف پر بحث چل نکلی۔ وہاں پر موجود ایک شخص نے کہا دانشمند وہ ہوتا ہے جو بُرائی کو اچھائی کے ساتھ اور بدی کو نیکی کے عمل سے ختم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ حضرت امام جعفر صادق اور حضرت امام ابو حنیفہ بھی اس محفل میں موجود تھے۔

اس موقع پر امام ابو حنیفہ سے امام جعفر صادق نے پوچھا کہ اُن کے نزدیک دانشمند کی تعریف کیا ہے؟ امام ابو حنیفہ نے جواب دیا۔ دانشمند وہ شخص ہے جو بھلائی اور بُرائی میں امتیاز کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اس پر امام جعفر صادق نے کہا کہ یہ امتیاز تو جانور بھی کر لیتے ہیں کیونکہ جو شخص کسی جانور کی خدمت کرتا ہے اور اُس سے پیار محبت کے ساتھ پیش آتا ہے جانور اُسے کبھی ایذا نہیں پہنچاتے لیکن جو شخص جانوروں کو تکلیف دیتا ہے یا انھیں اذیت پہنچاتا ہے جانور اُسے کاٹ کھاتے ہیں۔

امام جعفر صادق کے اس سوال پر امام ابو حنیفہ نے اُلٹا اُن سے سوال کر دیا کہ اُن کے نزدیک دانشمندی کی کیا علامت ہے؟

امام جعفر صادق نے کہا "میرے نزدیک اصل دانشمند وہ ہے جو دو بھلائیوں میں سے بہتر بھلائی اختیار کرے اور دو بُرائیوں میں سے مصلحتاً کم بُرائی پر عمل کرے"۔ آپ کے اس خیال کی امام ابو حنیفہ بھی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکے۔

کسی نے آپ سے دریافت کیا کہ صوفی کی تعریف کیا ہے۔ اس کے جواب میں حضرت امام جعفر صادق نے فرمایا: اللہ نے بندے کو صبر و معرفت سے زیادہ عظیم شے اور کوئی نہیں عطا کی اور اہلِ معرفت ہی خدا کے مخصوص بندے ہوتے ہیں لہٰذا جو بندہ اللہ کے ساتھ اپنے قلب کو صاف رکھتا ہے اس کو صوفی

کہتے ہیں۔"

اُس نے پھر عرض کی کہ آپ اہلِ معرفت کی بھی تعریف فرمائیں۔

حضرت امام جعفر صادق نے فرمایا: "اہلِ معرفت وہ ہیں جن کو خدا کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔ لہٰذا جو شخص حلاوت آزادی کے ساتھ ہمکنار ہونا چاہے۔ اس کو اپنے خیالات پاکیزہ بنانے چاہئیں۔ اس کے ساتھ ہی آپ نے فرمایا کہ جو شخص صدقِ دل کے ساتھ عبادت کرتا ہے وہ ہمیشہ دنیا سے بیزار اور کھنچا کھنچا سا رہتا ہے کیونکہ عبادت و ریاضت کی وجہ سے اُسے آخرت کی دنیا بہت حسین اور دلکش دکھائی دے رہی ہوتی ہے۔

ایک مرتبہ حضرت امام جعفر صادق نے اہلِ محفل سے فرمایا کہ پانچ لوگوں کی صحبت سے ہمیشہ پرہیز کرنا چاہیے۔ اوّل جھوٹے سے کیونکہ اُس کی معیت سے انسان مکر و فریب میں مبتلا ہو کر بالآخر ذلیل و خوار ہوتا ہے۔ دوئم بے وقوف سے دُور رہنا چاہیے کیونکہ وہ جس قدر آپ کا فائدہ سوچے گا دراصل وہ آپ کا اتنا زیادہ ہی نقصان کرے گا۔ سوم کنجوس آدمی کو بھی اپنے قریب نہیں رکھنا چاہیے کیونکہ اُس کی صحبت سے بیش قیمت وقت رائیگاں چلا جاتا ہے۔ چہارم، بزدل کی دوستی سے ہمیشہ اجتناب کرنا چاہیے کیونکہ وہ قابلِ اعتبار نہیں ہوتا۔ اور مصیبت کے وقت میں آپ کو دھوکہ دے سکتا ہے۔ آخر میں امام جعفر صادق نے فرمایا کہ جہاں تک ممکن ہو سکے فاسق آدمی سے بھی دُور رہو کیوں کہ وہ محض ایک نوالے کی طرح میں کنارہ کش ہو کر دوسروں کو مصیبت میں مبتلا کر دیتا ہے۔

اہلِ مجلس میں سے کسی نے عرض کیا "امام صاحب جنّت اور دوزخ کے بارے میں بھی کچھ ارشاد فرمائیں"

اس پر امام جعفر صادق نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تو دنیا میں ہی جنّت و جہنّم کا نمونہ پیش کر دیا ہے کیونکہ جنّت کا نام آسائش اور تکلیف کا نام جہنّم ہے۔ جنّت کا حق دار صرف وہی شخص ہے جو اپنے تمام امور اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دے اور دوزخ اُس کا مقدر ہے جو اپنے امور سرکش نفس کے حوالے کر دے۔

حضرت امام جعفر صادق کا مسلک انسانیت کی بھلائی اور راہِ حق پر چلنے کا مسلک تھا۔ اس سلسلے میں آپ کی تصانیف بھی ہیں۔ جن میں قانونِ قدرت اور خدائی اسرار و رموز کو پوری وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

اسحٰق بن محمد صباح کوفے کا امیر تھا۔ اس کے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ اس وجہ سے امیر بہت رنجیدہ اور غمگین ہوا اور اس نے کھانا پینا چھوڑ دیا بہلول نے جب یہ سُنا تو فوراً امیر کے پاس پہنچا اور کہنے لگا: "اے امیر! یہ رنج و الم کس لیے ہے؟" امیر نے جواب دیا: "میں بیٹے کی تمنا رکھتا تھا لیکن افسوس کہ میرے ہاں لڑکی پیدا ہوئی ہے۔" بہلول نے کہا: "کیا تجھے یہ اچھا لگتا کہ خدا اس خوبصورت، ہاتھ پاؤں کی درست اور صحیح و سالم لڑکی کی جگہ تجھے مجھ جیسا پاگل بیٹا دیتا؟"

امیر کو بہلول کی بات پر بے اختیار ہنسی آگئی۔ خدا کا شکر بجا لایا، کھانا کھایا اور پھر لوگوں کو اجازت دی کہ مبارک باد کے لیے اس کے پاس آئیں۔

بہلول عاقل

امیر تیمور نے ۸۰۰ھ میں ہندوستان کا رُخ کیا اور وہ اٹک سے ہوتا ہوا دہلی کی جانب بڑھا۔ ۸۰۱ھ میں اُس نے دہلی کو تاخت و تاراج کیا۔ اس شہر کی تباہی، بربادی اور باشندوں کے قتلِ عام کا منظر ایسا دلدوز تھا کہ اس سانحہ پر کوئی ایسی آنکھ نہ ہوگی جو پُرنم نہ ہوتی ہوگی۔ تغلق خاندان کے آخری تاجدار سلطان ناصر الدین محمود نے امیر تیمور کا مقابلہ کیا مگر اس کو شکست ہوتی۔ یوں تیموری لشکر شہر میں داخل ہوگیا اور پھر اہلِ دہلی کی جس قدر تباہی اور خونریزی ہوئی اس کا ذکر تاریخوں میں مذکور ہے۔

اسی زمانہ میں حضرت سلطان العرفاء الکاملین، امام اولیاء، الواصلین سیّد السادات مخدوم سیّد محمد حسینی گیسو دراز قدس اللہ سرہ العزیز دہلی میں سجادہ ارشاد پر متمکن رہ کر خلقِ خدا کی ہدایت میں مشغول تھے۔ امیر تیمور کی آمد کا سُن کر دہلی اور اس کے مکینوں کی بربادی کا روح فرسا منظر آپ کی چشمِ بصیرت کے سامنے پھر گیا۔ آپ نے دہلی کو چھوڑ کر دکن روانگی کا قصد کیا۔ روانگی سے قبل آپ نے تمام شہر کے سادات و علماء اور عام خلائق کو آنے والی بلا سے متنبہ کیا اور دہلی سے چلے جانے کا مشورہ دیا۔ سلطان فیروز شاہ بہمنی کو جب روضہ خلد آباد میں آپ کی تشریف آوری کا علم ہوا تو اس نے اپنے گورنر عضد الدولہ کو حضرت کی خدمت میں نذر دے کر روانہ کیا اور گلبرگہ تشریف لانے کی درخواست کی۔ آپ نے سلطان کی گزارش کو منظور کیا اور اپنا رُخ گلبرگہ کی طرف کر دیا۔ سلطان فیروز شاہ بہمنی نے گلبرگہ سے کئی منزل آگے بڑھ کر از خود آپ کا استقبال کیا اور آپ کو نہایت عقیدت و احترام کے ساتھ گلبرگہ لایا۔ اس نے آپ کی خدمت میں عرض کی کہ آپ مستقل قیام گلبرگہ میں ہی فرمائیں۔ حضرت نے سلطان کی خواہش پر اپنا مستقل قیام گلبرگہ میں کرنے کا ارادہ فرمایا اور آپ دمِ واپسیں تک یہیں رہے۔ درمیان میں آپ نے کئی سفر کیے مگر مستقل رہائش یہیں رکھی۔

حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز ۴ رجب المرجب ۷۲۱ھ میں دہلی میں پیدا ہوتے۔ آپ کے والد محترم کا نام حضرت سیّد یوسف حسینی چشتی عرف سیّد راجا تھا۔ وہ خود بھی بڑے کامل انسان تھے۔ ان کا تعلق حضرت محبوب الٰہی سے تھا۔ حضرت گیسو دراز حضرت زین العابدین کی اولاد میں سے تھے۔ آپ کا سلسلۂ نسب بائیسویں واسطے سے حضرت سرکارِ دو عالم محمدؐ

سے جا ملتا ہے۔ آپ کا نام محمدؐ کنیت ابوالفتح اور لقب صدرالدین ولی الاکبر الصادق تھا۔ آپ کی والدہ ماجدہ بھی سید تھیں اور اُن کا نام بی بی رانی تھا۔

آپ کے والد صاحب حضرت محبوب الٰہی کے وصال کے بعد ۷۲۸ھ میں سلطان محمد تغلق کے حکم سے اپنے اہل وعیال کے ساتھ دہلی سے دولت آباد تشریف لے گئے۔ دہلی سے سفر کا آغاز ۲۰ رمضان ۷۲۸ھ میں کیا گیا اور چار ماہ کے سفر کے بعد ۱۷ محرم الحرام ۷۲۹ھ کو دولت آباد پہنچے۔ یہاں سے شمال کی جانب بالاتے کوہ ایک جگہ ہے اس کو اب روضہ خلد آباد کے نام سے یاد کیا جاتا ہے وہاں سکونت پذیر ہوئے۔ حضرت بندہ نواز گیسو دراز کی عمر جب دس سال تین ماہ اور ایک روز ہوئی تو آپ کے والد کا سایہ آپ کے سر سے اٹھ گیا۔

آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے والد محترم اور نانا جان سے حاصل کی جو خود بھی نابغہ عصر ہستی تھے۔ اور حضرت سلطان المشائخ کے مرید تھے۔ آپ نے نہایت کم عمری میں قرآن پاک حفظ کر لیا۔ آپ نے صرف ونحو اور فقہ کی کتابیں اس وقت کے جید علماء سے پڑھیں۔ فارسی اور عربی میں آپ کو عبور حاصل تھا۔ آپ کو علم کا اس قدر شوق تھا کہ ہر وقت کامل استاد کی تلاش میں رہتے۔ ظاہری علوم کے ساتھ ساتھ باطنی علوم کے لیے بھی آپ کی طلب اور جستجو دن بدن بڑھ رہی تھی۔

آپ نے اپنے نانا اور والد صاحب سے حضرت نصیرالدین چراغ دہلوی کے فضائل اور کمالاتِ ظاہری و باطنی کی باتیں سن رکھی تھیں۔ یہ رُوح پرور باتیں سُن سُن کر آپ کو حضرت چراغ دہلوی کی ذات پاک کے ساتھ غائبانہ عشق ہو گیا آپ کا دل چاہتا تھا کہ پَر لگ جائیں اور آپ اُڑ کر حضرت چراغ دہلوی کی خدمت میں پہنچ جائیں۔ لیکن کم عمری کے باعث اتنی زیادہ مسافت طے نہیں کر سکتے تھے۔ اتفاقاً حضرت مخدوم گیسو دراز کی والدہ ماجدہ کو اپنے بھائی ملک الامرا سید ابراہیم مستوفی جو بادشاہ کی طرف سے صوبہ دولت آباد کے صوبہ دار (گورنر) تھے رنجش ہو گئی۔ وہ اس قدر برخاستہ خاطر ہوئیں کہ اپنے دونوں بیٹوں (یعنی حضرت مخدوم گیسو دراز اور اُن کے بڑے بھائی حضرت سید حسین عرف سید چندن حسینی) کو ہمراہ لے کر دہلی روانہ ہو گئیں۔ اور یہ مختصر سا قافلہ ۴ رجب ۷۳۶ھ کو دہلی پہنچا۔ اس وقت مخدوم گیسو دراز کی عمر پورے پندرہ سال ہو چکی تھی اور اُن کا دل حضرت خواجہ چراغ دہلوی کی محبت سے لبریز تھا۔ آپ اُن کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے بے تاب تھے۔ آخر وہ دن بھی آ گیا جب مطلوب کے پاس طالب پہنچ گیا۔ حسنِ جہاں سوز کو عشقِ جاں سوز نے دیکھا۔ جمعۃ المبارک کا دن تھا۔ حضرت چراغ دہلوی سلطان قطب الدین کی جامع مسجد میں نماز جمعہ ادا کرنے کے لیے تشریف لے چکے تھے۔ وہاں حضرت مخدوم گیسو دراز بھی پہنچ گئے۔ آپ نے حضرت چراغ دہلوی کو دیکھا اور اُن پر وارفتہ ہو گئے۔ بس پھر تھا وصل کی تڑپ نے آپ کو تڑپا دیا۔ آپ ۱۶ رجب ۷۳۶ھ کو اپنے برادرِ کلاں سید چندن حسینی کے ہمراہ حضرت چراغ دہلوی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور اُسی روز یہ دونوں بھائی حضرت نصیرالدین چراغ دہلوی کے مرید ہو گئے۔ اب آپ کی تعلیم وتربیت نے نئے رُخ اختیار کر لیے۔ سلسلہ درس کے ساتھ آپ ریاضت و مجاہدات میں بھی مشغول ہو گئے۔ آپ نے حضرت چراغ دہلوی کے علاوہ مولانا شرف الدین کیتلی، مولانا تاج الدین بہادر، قاضی عبدالمقتدر بن قاضی رکن الدین الشریحی الکندی اور بعض دُوسرے اساتذہ سے تعلیم حاصل کی۔ اثنائے تعلیم کے دوران دو ایک بار آپ پیر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ بقدر ضرورت میں نے پڑھ لیا ہے اب اگر آپ حکم دیں تو میں سلسلۂ درس کو چھوڑ کر تمام تر اشغال باطنی میں مشغول ہو جاؤں لیکن حضرت چراغ دہلوی نے اس کی اجازت نہیں دی اور فرمایا کہ اب سلسلہ درس کو تمام کرو۔

انیس سال کی عمر میں حضرت گیسو دراز تمام علوم کی تحصیل سے فارغ ہوئے اور مکمل طور پر ریاضت و مجاہدہ اور اشغال باطنیہ میں مصروف ہو گئے۔ جس قدر مجاہدہ اور ریاضت شاقہ انہوں نے کی اور دنیا کو پس پشت ڈال کر جس طرح وہ ہمہ تن الی اللہ ہوتے اس کو بیان کرنا قلم و قرطاس کے بس میں نہیں۔ جب تک حضرت نصیرالدین محمود چراغ دہلوی اس دارِ فانی

وجود رہے حضرت گیسو دراز اُن کی خدمت میں رہ کر فیضِ تربیت سے مستفید ہوتے رہے۔
۱۸ رمضان المبارک ۷۵۰ھ کو حضرت چراغ دہلوی نے پردہ کیا۔ مخدوم گیسو دراز نے اپنے مُرشدِ عالی کی نعش مبارک کو غسل دیا اور کفن پہنایا۔ رحلت سے چند روز پیشتر پیرِ عالی مقام نے حضرت گیسو دراز کو خلافت عطا فرما کر اپنا جانشین بنایا۔ حضرت مخدوم کی عمر اس وقت چھتیس ۳۶ سال سے متجاوز تھی۔ جب آپ چالیس سال کے ہوتے تو ابھی آپ مجرد تھے۔ آپ کو شادی کی مطلق خواہش نہ تھی مگر آپ کی والدہ صاحبہ نے اصرار کر کے آپ کی شادی سیّد احمد بن حضرت مولانا سیّد جمال الدینؒ مغربی کی صاحبزادی سے کی۔ حضرت مولانا جمال الدینؒ مغربی نہایت بلند پایہ اور فقیہ تھے اور مخدوم گیسو دراز کے دادا خسر تھے۔ آپ کے دادا خسر اگرچہ آپ کے مُرید بھی تھے مگر اپنی بعض تصانیف میں احتیاطاً ان کا ذکر کیا ہے اور مُرید کی بجائے ان کے لیے برادرم کا لفظ استعمال کیا ہے۔ مشہور اور صاحبِ سلسلہ بزرگ حضرت میراں جی شمس العشاق قدس سرہٗ کے حضرت کمال الدین واحد الاسرار بیابانی حضرت سیّد جمال الدین مغربی کے مرید اور خلیفہ تھے۔

✖

اس زمانے میں سادات سر کے بال بڑھایا کرتے تھے۔ حضرت مخدوم گیسو دراز کی کاکلیں نہایت طویل تھیں اس لیے ان کو گیسو دراز کہا جاتا ہے اور یہ لفظ آپ کے نام کا جزو لاینفک ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس نام کی ہی بدولت آج تک آپ کے نام کو زندہ رکھا ہوا ہے۔ تاریخ کی کتب ہوں یا تصوّف کے ملفوظات اُن میں جہاں بھی آپ کا ذکر آیا ہے آپ گیسو دراز کے نام سے پکارے گئے ہیں۔

✖

خواجہ گیسو دراز فرماتے ہیں "صوفیا جو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اس غلطی کا احتمال ممکن ہے۔ لیکن جو کچھ وہ نیند میں دیکھتے ہیں اس میں کوئی غلطی کا امکان نہیں ہوتا۔ بعض صوفیا قصداً اور ارادتاً سو جاتے ہیں تاکہ خواب میں وہ جو کچھ چاہیں معلوم کریں اور ہر چیز سے آگاہ ہو جائیں۔ اسی بناء پر علما نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو دُنیا میں اس کے بندے خواب میں دیکھ سکتے ہیں۔ اس لیے خواب کو بیداری پر ترجیح دینا چاہیئے جیسا کہ حضرت جنید قدس اللہ روحہ نے فرمایا۔ "خواب اللہ کی طرف سے ہے اور اللہ کے فعل پر کوئی اختیار نہیں ہے۔ اس بناء پر بھی خواب کو بیداری پر ترجیح ہے۔ صبح کو حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سو رہی تھیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بیدار کیا اور فرمایا کہ یہ کیسی نیند تھی کہ نماز کا وقت بھی جا رہا ہے۔ اس پر حضرت علیؓ نے عرض کی "یا نبیؐ اللہ ہمیں سُلا دیا گیا تھا۔

مگر یہ مقام ہر کس و ناقص کو نہیں حاصل ہوتا۔ ان منازل کو سر کرنے کے لیے لوہے کے چنے چبانے پڑتے ہیں۔ خار دار راہوں میں پاؤں لہولہان کرنے پڑتے ہیں۔ پھر کہیں جا کر بلند و ارفع مقام نصیب ہوتے ہیں اور ایسی کیفیت سے کریم ہمکنار کرتا ہے۔

✖

آپ فرماتے ہیں کہ تمام اوصاف میں درجہ کمال پر پہنچنے کے بعد بھی صوفیا کا ورد و وظائف ختم نہیں ہوتا۔ حضرت بغدادیؒ ایک مرتبہ تسبیح پڑھ رہے تھے۔ لوگوں نے ان سے پُوچھا آپ نے تو تمام مراتب کر لیے ہیں اب آپ کو ورد کی کیا ضرورت ہے۔ انہوں نے فرمایا "ہمارے مشائخ تمام کمالات کے باوجود اپنے ورد و وظائف میں ذرا کمی نہ کرتے اور یہ نظر ڈالو گے تو معلوم ہو گا کہ عارف ہر چیز میں اس کو دیکھتے ہیں۔ پھر بڑے اور عظیم کاموں سے کیوں رُوگردانی کرتے کیونکہ انبیاؑ اور اولیا جس راستہ پر چلے ہیں وہ بہت اہم ہے۔

اللہ والوں نے سیاحت کو اپنا شیوہ بناتے رکھا ہے۔ حضرت مخدوم گیسو دراز نے بھی سیاحت فرما کر سنتِ اولیاء کی پیروی کی ہے۔ ۱۰ ربیع الثانی ۸۰۱ھ کو آپ اپنے اہل و عیال سمیت دہلی سے بہادل پور پہنچے۔ یہاں مولانا علاء الدین گوالیری جو آپ کے مرید تھے انہوں نے آپ کا شاندار استقبال کیا اور آپ نے گوالیر میں کچھ عرصہ قیام کیا۔ یہاں آپ نے مولانا علاء الدین کو خلافت سے سرفراز فرمایا۔ مولانا آپ کے پہلے خلیفہ تھے۔ اس سے آپ نے کسی کو خلافت نہیں دی تھی۔ گوالیر سے آپ بھاندیر اور ایرچہ سے ہوتے ہوتے چندیری پہنچے۔ اس جگہ پر آپ نے کچھ روز قیام کیا اور ۸۰۱ھ عید الفطر کے روز آپ بڑودہ تشریف لاتے۔ یہاں پر بھی آپ نے مختصر سا قیام فرمایا اور کھنبایت تشریف لے گئے۔ ذی قعدہ کا مہینہ آپ نے یہاں گزارا اور واپس بڑودہ آ کر سلطان پور سے ہوتے ہوتے دولت آباد کی جانب روانہ ہوتے۔ یہاں سے آپ روضہ خلد آباد پہنچے اور اپنے والدِ بزرگوار کے مزار پر حاضری دی۔ اس طرح ایک لمبی سیاحت کے بعد واپس دہلی پہنچے۔

✖

حضرت مخدوم گیسو دراز کے دو صاحبزادے اور تین صاحبزادیاں تھیں۔ بڑے فرزند حضرت مخدوم سید حسین المعروف سید محمد اکبر حسینی تھے۔ ان کے کمالات ظاہری و باطنی کے متعلق خود اُن کے والد بزرگوار نے اپنی عظیم القدر تصنیف خطائر القدس میں نہایت جامع طور پر اُن کی تعریف کی ہے۔ اواخر ۸۱۱ھ میں حضرت مخدوم نے اِن کو خلافت عطا فرما کر سجادہ پر بٹھایا مگر اُن کی عمر نے وفا نہ کی اور وہ سات ماہ کی خلافت کے بعد بروز چہار شنبہ پانزدہم ماہ ربیع الآخر ۸۱۲ھ اُن کی رحلت ہوئی۔ حضرت نے ان کو اپنے ہاتھوں سے غسل دیا۔ اُن کا مزار بھی حضرت مخدوم گیسو دراز کے مزار کے پائیں میں علیحدہ گنبد میں ہے۔ آپ کے دُوسرے فرزند سید یوسف المعروف سید اصغر حسینی تھے۔ آپ نے انہیں اپنی عمر کے آخری حصہ میں خلافت عطا کی۔ یہ بھی اپنے برادر کلاں کی طرح نہایت باکمال بزرگ تھے۔ ان پر کبھی نہ کبھی جذب کی کیفیت غالب ہو جایا کرتی تھی۔ باقی اولاد میں کوئی قابلِ ذکر شخصیت نہیں ہوئی اور نہ ہی اُن کے متعلق تاریخ نے کوئی قلم آرائی کی ہے۔

✖

آپ فرماتے ہیں ہر چیز میں کوئی نہ کوئی آفت ضرور ہوتی ہے۔ عشق میں دو آفتیں ہوتی ہیں۔ ایک شروع میں دُوسری آخر میں ہوتی ہے۔ شروع کی آفت تو یہ ہے کہ عاشق بہت جد و جہد کرتا ہے لیکن مطلوب کو نہیں دیکھتا تک کہ اس کا حصول بہت مشکل بلکہ محال سمجھ لیتا ہے اور پھر اس پر ایسی مکمل ناامیدی طاری ہو جاتی ہے کہ اس کے حصول سے ہی دستبردار ہو جاتا ہے اور ہجر ہی پر اپنے آپ کو راضی کر لیتا ہے۔ حرماں نصیبی اس کے ذوقِ طلب کو ختم کر دیتی ہے۔ شادمانی، فرحت اور اضطراب و اضطرار سب ہی غائب ہو جاتے ہیں اور انسان بالکل فارغ ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ دوسری آخری آفت یہ ہے کہ محبوب کا وصل نصیب ہو جاتا ہے۔ وہ فارغ ہو جاتا ہے اور دل میں کہتا ہے اب وہ ہے جو میں چاہتا تھا پا لیا۔ یہاں تک کہ لذّتِ وصال اور وجدان اس سے مکمل طور پر رخصت ہو جاتا ہے اور وہ ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ اور یہی اس کی حرماں نصیبی ہے اگر وہ وجدان یعنی وصل و ہجر کی درمیانی کیفیت میں ہے تو درد سے درد و درماں کا حصّہ زیادہ سے زیادہ حاصل کرتا رہے گا اور جب آدمی درد کا خوگر ہو جاتا ہے تو یہی درد ہو جاتا ہے۔ جو عاشق معشوق کے حاصل کر لینے کے بعد وصل سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔

✖

مخدوم گیسو دراز بیان فرماتے ہیں "اسناد شاہین عنقاء اللہ" اس مقولہ کو بعض لوگوں نے حدیث بھی لکھا ہے لیکن یہ انسک ہے۔ باری تعالیٰ کا طریقہ اس طرح جاری ہے کہ اپنے بندوں کے درمیان اس نے جن صفات کو مختص

ہے وہ سب کی سب صفات اس ذات میں موجود ہیں۔ اگر کوئی غلام اپنے مالک کی خدمت میں بوڑھا ہو جاتا ہے اور اس نے اپنی ساری زندگی اس کی خدمت گزاری کی ہے تو آقا کی شفقت دامن گیر ہوگی کہ اس کو اپنے یہاں سے نکال دے۔ اللہ سبحانہٗ تعالیٰ بھی جب دیکھتا ہے کہ اس کے بندے کی عمر اسی برس تک پہنچ گئی ہے تو اس کو اپنے رعب و دبدبہ سے آزاد کر دیتا ہے۔

شیخ لقمان سرخسی کا سر زندہ کا قصہ بھی اسی معاملہ سے نسبت رکھتا ہے اور یہ میں نے کئی بار بتایا ہے۔ اس مقولہ کے دوسرے معنی ہیں کہ جب آدمی اسی برس کی عمر میں پہنچتا ہے تو اس کو جوڑوں کا درد، دل کی سستی اور طبیعت کا ضعف گھیرتا ہے اور یہ تو معلوم ہی ہے کہ اللہ تعالیٰ جس بندے کو درد اور تکلیف دیتے ہیں اس کے گناہوں کا کفارہ بھی اس تکلیف کے ذریعہ کرا دیتے ہیں۔ یہی فعل عتیق اللہ یا عتقاء اللہ ہوتا ہے۔ اس کو یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ آدمی اسی سال کے سن کا ہونے کے بعد سخت قسم کے دکھ درد، بلا، مصیبت اور تکالیف میں گھر جاتا ہے اور دن بدن وہ بڑھتا ہی جاتا ہے لیکن یہی درد و تکلیف اور مصیبت اس کے گناہوں کا کفارہ بھی کر دیتے ہیں۔ ایک بات اور بھی ہے مرد مومن اسی برس کی عمر تک پہنچنے کے دوران کسی مغفور کا چہرہ ضرور دیکھ لیتا ہے اور اس سے مصافحہ کا موقع اس کو ضرور مل جاتا ہے اور احادیث میں آیا ہے کہ جو مغفور (یعنی جس کی اللہ نے بخشش فرما دی ہو) کے ساتھ بیٹھا یا اس سے مصافحہ کیا وہ بھی مغفور ہو گیا۔"

اعتکاف کی فضیلت اور طریقہ کار کے متعلق مخدوم گیسو دراز نے فرمایا۔ "صوفیا اعتکاف کا بھی بڑا خیال رکھتے ہیں بعض ایک اربعین (چلہ) بعض دو اربعین اور بعض تین اربعین رکھتے ہیں۔ بعض اولیائے کرام دس دن شعبان اور تیس دن رمضان المبارک کے اعتکاف کرتے ہیں اس کو اربعین محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں۔ تیس دن رجب اور دس دن شعبان کے اس کو اربعین عیسیٰ علیہ السلام کہتے ہیں۔ تمام سال اربعین کا خیال رکھتے ہیں اور خلوت گزیں رہ کر ذکر و مراقبہ میں مشغول رہتے ہیں۔ بعض لوگ رمضان المبارک کے آخری دس روز کے اعتکاف پر اکتفا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ سنت موکدہ ہے۔ ہدایہ میں فقہا نے یہی لکھا ہے۔ لیکن صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے اس طرح کی کوئی روایت نہیں دیکھی گئی۔ ان لوگوں نے اس سنت پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ میں یا ان کے وصال کے بعد عمل کیا ہو۔ شاید اسی وجہ سے بعض مشائخ اعتکاف میں نہیں بیٹھتے۔ بعض صوفیا یہ بھی کہتے ہیں کہ اس میں شہرت ہوتی ہے کہ اس شخص معتکف رہتا ہے۔ وقت کا تعین کر دینا زیادتی ہی معلوم ہوتی ہے۔

بعض بزرگوں نے اعتکاف کی تین قسمیں بتائی ہیں۔ ایک تو وہ اعتکاف مقررہ جیسا کہ عام لوگ کرتے ہیں۔ دوسرا دائمی اعتکاف جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، تیسرا اعتکاف دلی یعنی دل کا اعتکاف، صاحب دل اسی اعتکاف کو پسند کرتے ہیں۔ ہم بھی دل کے اعتکاف پر عمل پیرا ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ بھی روایت ہے کہ آپ نے سوائے ماہ رمضان کے کسی مہینے میں پورے ماہ کا روزہ نہیں رکھا۔ اور نہ کوئی مہینہ ایسا گزرا ہے جس میں آپؐ نے کچھ روزے نہ رکھے ہوں۔ آپ نے روزے کے لیے کوئی خاص دن کا تعین نہیں فرمایا اور اعتکاف بھی آپ زیادہ تر رمضان میں کرتے تھے۔

ایک محفل سماع میں حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلوی تشریف فرما تھے۔ اور قوال اس شعر کو گا رہے تھے۔

قلم بر بے دلاں گفتی نخواہم راند ہم راندی
جفا بر عاشقاں گفتی نہ خواہم کرد ہم کردی

یعنی۔ تو نے کہا تھا کہ بے دلوں پر قلم نہیں چلائے گا پھر بھی چلا دیا۔ تو نے کہا تھا کہ عاشقوں پر ظلم نہیں کرے گا پھر

بھی کر دیا۔
اس مجلس میں بہت سے صوفیاء کرام موجود تھا۔ ہمارے خواجہ قدس اللہ سرہ بھی تشریف فرما تھے۔ ہر ایک پر ذوق، اضطراب اور گریہ طاری تھا۔ ایک احمق شاعر بھی یہاں موجود تھا۔ اس نے اپنے دل میں سوچا کہ اس کو حقیقت پر کس طرح محمول کیا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بارے میں کیسے کہا جا سکتا ہے کہ تو نے ظلم کیا ہے اور کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ تو نے بے دلوں پر قلم چلایا یہ تو کفر ہو جائے گا۔
حضرت مخدوم گیسو دراز فرماتے ہیں اس کم علم کو یہ بات نہیں معلوم کہ صوفیا ایک مال سے دُوسرے مال کی طرف جاتے ہیں۔ ایک قصے سے دوسرا قصہ نکالتے ہیں اور کل سے کل کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اس لیے یہ بات قطعی دل میں نہیں لانی چاہیے کہ اللہ کے ولی خلافِ شرع یا خُدا کی منشا کے خلاف کوئی بات یا عمل کرتے۔ ان لوگوں کی تو زندگیاں اور زندگی کا ہر لمحہ صرف اور صرف کی رضا و منشا کے مطابق بسر ہوتا ہے۔

تصوف اور صوفی کی تعریف مخدوم صاحب یوں بیان کرتے ہیں کہ صوفیوں کا کوئی علیحدہ مذہب و ملت اور فرقہ نہیں ہوتا بلکہ اہل سنت کی ایک جماعت ہے جس کا مطمع نظر یہ ہے کہ کتاب و سنت کے ہر جزئیات پر قولاً و فعلاً اور حالاً عمل کیا جائے۔ ریاضت اور مجاہدہ کر کے دُنیا کی محبت اور خلق کے تعلقات کو دل سے کامل طور پر دُور کر دیا جائے۔ خواہشات و جذبات نفسانی پر بدرجہ اتم غلبہ حاصل کر کے انہیں مقہور و مغلوب کیا جائے تاکہ صوفی طالب کا دل تمام تعلقات کی کثافتوں اور غلاظتوں سے پاک و صاف ہو کر محبت اور عشق الٰہی سے معمور ہونے کی صلاحیت پیدا کر سکے۔ انسان کی خلقت کا مدعا عبادات الٰہی کا بجالانا اور معرفت الٰہی کا حاصل کرنا ہے۔ اکابر صوفیہ اس مقدس جماعت میں شریک ہیں جو ایک مکمل دستور العمل کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں۔ حضرت مخدوم گیسو دراز نے ہر شخص کے لیے عبادات معاملات نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان فرماتے ہیں۔ جوان، بوڑھے، مرد، عورت، شاہ، گدا، آزاد اور غلام غرض ہر طبقہ کے انسان کے لیے جو طلب حق کے سلوک میں قدم رکھے ہدایتیں موجود ہیں۔ اکثر اکابرین طریقت کا خیال ہے کہ چالیس سال کی عمر کے بعد قویٰ میں انحطاط شروع ہو جاتا ہے۔ اس زمانے میں طریقت میں قدم رکھنا سُود مند نہیں ہوا کرتا اس لیے کہ محنت و مشقت، مجاہدہ و ریاضت کا زمانہ باقی نہیں رہتا۔ مگر مخدوم صاحب ہی وہ بزرگ ہیں جنہوں نے پیر تا تک کے لیے بھی راستہ بنایا ہے اور اُسے حصول مقصود کا امیدوار کیا ہے۔
چشتیہ خاندان کے بزرگوں میں حضرت سید التابعین خواجہ حسن بصری رضی اللہ عنہ سے حضرت خواجہ نصیر الدین محمود چراغ دہلوی علیہ الرحمۃ تک کسی نے تصنیف و تالیف کی جانب توجہ نہیں کی حالانکہ یہ بزرگان بھی علوم ظاہری میں بھی محققین اور مجتہدین کا درجہ رکھتے تھے۔ اس سلسلہ میں مخدوم سید محمد حسینی گیسو دراز ہی پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے اس جانب توجہ کی اور بڑی بڑی کتابیں اور چھوٹے چھوٹے رسائل بکثرت تصنیف کیے۔ دکن میں عام طور پر مشہور ہے کہ ان کی عمر ۱۰۵ تھی اور ان کی تصانیف کی تعداد بھی ۱۰۵ ہے۔
حضرت کی ایک خصوصیت جو اُن کے تذکرہ نگاروں نے لکھی ہے یہ تھی کہ اپنی تصانیف کردہ خود اپنے ہاتھ سے نہیں لکھتے تھے بلکہ کاتب سے لکھوایا کرتے تھے اور کسی کتاب کو لکھوانے کے بعد اس کی نظر ثانی کبھی نہیں کی اور کبھی پڑھوا کر نہیں سُنا۔ جو ایک مرتبہ تحریر کر دیا وہی مستند ٹھہرا۔ اس کے علاوہ آپ کے مکتوبات کا بھی ایک مجموعہ ہے جو آپ کی رحلت کے بعد آپ کے ایک مرید نے جمع کیا۔

حضرت بندہ نواز گیسو دراز کو مشائخ اور اولیاء میں ایک خاص مقام ہے۔ دکن کی سرزمین آپ کی تعلیمات اور دینی اشاعت کا گہوارہ رہی ہے۔ روضہ خلد آباد اور گلبرگہ شریف کو آپ کی روحانی خدمات، شفقت و محبت کے پیغام اب تک یاد ہیں اور وہاں کے ذرات اپنی ضیا پاشیوں میں کبھی مہر و ماہ پر بھی چشمک زنی کرتے تھے۔ آپ کا قیام اگرچہ گلبرگہ شریف میں کم ہی رہا لیکن آپ نے دائمی آرام گاہ کے لیے اسی سرزمین کو پسند کیا۔ آپ نے زندگی بھر لاکھوں انسانوں کو روحانی سکون عطا کیا۔ سینکڑوں بھٹکے ہوئے مسافروں کو ان کی منزل کا پتہ بتایا اور ہزاروں کی کشتی منجدھار سے نکال کر ساحل تک پہنچاتے رہے۔ علم و فضل اور معاشی خوش حالی بہمنیوں کا دورِ حکومت، دکن کا سنہرا دور کہلاتا ہے۔ عرب و عجم کے بڑے بڑے علماء، صلحا، شعرا اور صوفیاء کو اس خاندان کے حکمرانوں نے اپنے دامن میں سمیٹ لیا تھا۔ اور ان کی خدمت، دلجوئی اور عزت و احترام کو وہ ہمیشہ اپنے لیے باعثِ افتخار اور سرمایہ حیات سمجھتے رہے تھے۔ علامہ تفتازانی کے شاگرد میر فیض اللہ انجو، محمود وزدانی، حسن گیلانی، ملا عبدالغنی، مفتی نجم الدین، شیخ آذری، محمود گاواں، سید العلماء، سلامت اللہ، شمس الدین سامی اور عبدالکریم ہمدانی اور ملا نظری کے علمی کارناموں سے اس وقت دکن کا چپہ چپہ منور تھا۔ حضرت گیسو دراز کی سلطان فیروز شاہ بہمنی کی عقیدت اور محبت کو نظر انداز نہ کر سکے اور جب وہ خود اپنے امراء اور عمائدین سلطنت کے ساتھ ان کے استقبال کے لیے قصبہ الہند کے قریب تک پہنچا تو وہ اس کے ساتھ گلبرگہ تشریف لے گئے اور پھر وہیں کے ہو کر رہے۔

حضرت خواجہ گیسو دراز حضرت سلطان ابراہیم ادھم شنیدہ قدس اللہ روح کے متعلق ایک حکایت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ وہ بلخ کے بادشاہ تھے۔ ایک روز شکار کھیلنے کی غرض سے باہر گئے اور اپنے گھوڑے کو ایک لومڑی یا خرگوش کے پیچھے ڈال دیا۔ یکایک غیب سے آواز آئی کہ اے ابراہیم کیا تو اسی کام کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور کیا تجھے اسی کام کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ سنتے ہی وہ گھوڑے سے نیچے اتر آئے۔ اسی وقت اپنا لباس اتار کر ایک چرواہے کو دے دیا۔ اور اپنا گھوڑا اور دوسری اشیاء بھی اسی چرواہے کو دے دیں اور خود اس چرواہے کا لباس پہن کر جنگل کی راہ لی اور اسی

حضرت خواجہ حسن بصریؒ وعظ فرما رہے تھے، یکایک حجاج بن یوسف مع اپنے خدم و حشم اور جاہ و جلال کے شمشیر برہنہ ہاتھ میں لیے آپ کی مجلسِ وعظ میں آ گیا اور بیٹھ کر وعظ سننے لگا۔ حجاج کا رعب و داب اور سفاکی مشہور ہے، لوگ اس کے نام سے تھرّاتے تھے۔ حاضرینِ مجلس میں سے ایک شخص کے دل میں خیال آیا کہ دیکھیں خواجہ حسن بصریؒ پر حجاج کا رعب غالب آتا ہے یا نہیں اور ان کے وعظ کا رنگ بدلتا ہے یا نہیں لیکن حضرت خواجہ حسن بصریؒ نے حجاج اور اس کے خدم و حشم کو پر کاہ کے برابر بھی وقعت نہ دی اور اپنے وعظ کو پورے جوش و خروش کے ساتھ جاری رکھا۔ یہاں تک کہ وعظ ختم ہو گیا۔

وہ شخص جس کے دل میں خیال گزرا تھا پکار اٹھا کہ واقعی حسن حسن ہے۔ وعظ کے خاتمہ پر حجاج بھی آپ کے پاس آیا اور آپ کے ہاتھوں پر بوسہ دیا پھر اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر کہا "اگر مردانِ حق میں سے کسی کو دیکھنا چاہتے ہو تو حسنؒ کو دیکھو۔"

بھی کر دیا۔ چلتے چلتے مکہ معظمہ جا پہنچے۔ یہاں پہنچ کر آپ امام سفیان ثوریؒ اور خواجہ فضیل بن عیاضؒ کی صحبت سے فیض یاب
خواجہ گیسو دراز کا یہ حکایت بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت بے پایاں جب کسی پر نازل ہوتی ہے
اُس شخص کی کایا پلٹ جاتی ہے۔

✖

حضرت جنید بغدادیؒ کے مریدوں میں کلیب واصحابؒ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ ان کو جذام کی بیماری تھی۔ اس وجہ
وہ شہر چھوڑ کر جنگل میں زندگی گزارنے لگے۔ ایک روز لوگوں نے سوچا جنگل میں جاکر دیکھا جائے کہ کلیب کس طرح کی زن
بسر کر رہے ہیں۔ جب دیکھنے والے جنگل میں پہنچے تو انہوں نے سُنا "یا اللہ میرا نام کُتا ہے۔ میرا جسم جذام سے گل گیا ہے
کئی کئی دن کے فاقوں کے بعد مجھے کچھ کھانے کو مل جاتا ہے۔" اللہ تعالیٰ نے جواب دیا اے میرے بندے میں نے تیری با
کو سُن لیا ہے۔ تکالیف اور مصیبت میں اپنوں کو مُبتلا کرکے اُن کی محبّت کی آزمائش کی جاتی ہے۔ غیروں کو ہمیشہ سُکھ
سکون دیا جاتا ہے۔ خواجہ گیسو دراز فرماتے ہیں "اللہ تعالیٰ اپنے جن بندوں کو مقرب جانتا ہے ان کو کسی نہ کسی آزمائش
مُبتلا کر دیا ہے اور تکالیف میں گرفتار ہونے کے بعد جب بندہ حق بندگی ادا کرتا ہے تو پھر حق تعالیٰ فرشتوں کو مخاطب
کرتے ہیں کہ دیکھو میرے بندے کو جس نے اتنی تکلیف و ابتلا میں بھی مجھ سے منہ نہیں موڑا۔" یوں اللہ تعالیٰ اپنے اس بند
کے درجات کو بلند تر فرما دیتا ہے۔

✖

آپ فرمایا کرتے تھے کہ بہت زیادہ نفل نماز پڑھنے سے مراقبہ زیادہ بہتر ہے اور ذوق و راحت جو میسّر آجاتے
غنیمت ہے۔ اسی طرح صوفیا کے نزدیک وضو میں حضوری اور شگفتگی یہ ہے کہ ہر عضو کو دھونے کے وقت منفصل
علیحدہ سمجھیں۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ بغیر وضو کے آدمی کو ہرگز نہیں سونا چاہیے۔ اور حالت بیداری کے فوراً بعد دوبار
کر لینا چاہیے۔ اسی طرح قیلولے کے بارے میں آپ نے فرمایا ہے کہ یہ مسنون ہے۔
حضرت گیسو دراز نے پندرہ سال کی عمر میں بیعت کی اور حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ کا لطف حاصل کیا۔ اور
دہلویؒ نے اپنی جوہر شناس نگاہ سے آپ کے اندرونی اوصاف دیکھتے ہوتے نہایت احسن طریقے سے آپ کی
اور باطنی تربیت کی۔ اور بہت جلد بندہ نواز پر مکاشفات اور تجلیات کی بارش ہونے لگی۔ آپ پر جو بھی واردات گز
فوراً اپنے پیر صاحب کی خدمت میں عرض کر دیتے۔

✖

جب سلطان فیروز شاہ بہمنی نے آپ کو گلبرگہ میں سکونت پذیر ہونے کی درخواست کی جو آپ نے منظور کر لی ا
نے اپنی عمر کا زیادہ تر دور گلبرگہ میں ہی بسر کیا۔ اور ۱۶ ذی قعدہ ۸۲۵ھ کو آپ معمولی بیماری کے باعث بوقت ا
چاہت اس دار فانی سے رحلت فرما گئے اور عالم جاودانی میں تشریف لے گئے۔ مولانا بہاء الدین امام نے آپ کو غس
دیا اور کفن پہنایا اور اسی روز گلبرگہ میں دفن کیا گیا۔ آپ کا روضہ آج بھی مرجع خاص و عام ہے۔ سلطان فیروز شا
برادرِ خورد سلطان احمد شاہ نے آپ کا عالی شان روضہ تعمیر کرایا جس کو کئی جگہ سے طلائی نقش نگار سے آراستہ کی

حضرت مولانا فخر الدین اورنگ زیبؒ آبادی نے فرمایا کہ کوہستان سلیمان کی بلند چوٹیوں پر ایک شہباز بلند پرواز ہے جس کو مقیّد کر کے سدھایا جائے تو اس کی پرواز سدرۃ المنتہیٰ تک ہوگی۔ حضرت نے اپنے خلیفۂ اعظم جناب خواجہ نور مہارویؒ کو حکم دیا "جاؤ اور اس گوہر مقصود کو ہاتھ میں لاؤ۔ کیونکہ کوہستان سلیمان کا یہ سلیمان ملک سلیمان کا وارث ہوگا۔" مرشدِ مکرم کے حکم کی بجا آوری کے لیے خواجہ نور محمدؒ ہر سال شمالی ہندوستان آتے اور اس سلیمان ملک کی تلاش کرتے؛ آپ کی بیتاب نظریں بارہ تراج شریف اور کوٹ مٹھن میں اس شہباز کو تلاش کرتیں بالآخر آپ نے وہ گوہر نایاب حضرت خواجہ سلیمان تونسوی کی شکل میں پالیا۔ سلیمان تونسویؒ کو بیعت کیا اور اس کے بعد آپ کبھی شمالی ہندوستان کی طرف نہیں آئے۔

یہ خواجہ سلیمان تونسویؒ وہی ولیٔ کامل ہیں جنہوں نے شمالی ہندوستان میں عشق کی ایک بہت بڑی دکان کھول رکھی تھی جہاں سے ہندوستان، ایران، افغانستان، بلوچستان اور عرب کے طالبانِ حق دولتِ عشق سے جھولیاں بھر بھر کر جایا کرتے تھے۔ دہلی سے مولانا محمد حیاتؒ، سید حسن عسکریؒ، صاحبزادہ نصیر الدینؒ۔ راجپوتانہ سے حاجی نجم الدینؒ۔ اودھ سے حافظ سید محمد علیؒ۔ کابل سے سید مستان شاہؒ اور عرب سے سید احمد مدنیؒ آئے اور اس پٹھان کی عشق کی دکان سے عشق کا سودا خریدا اور کامیاب و کامران واپس آئے۔

✕

حضرت سلطان التارکین، برہان العاشقین، خواجۂ خواجگان محمد سلیمان تونسویؒ کوہستان گڑگوجی میں ۱۷۶۴ء مطابق ۱۱۸۲ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والدِ گرامی کا نام نامی جناب ذکریاؒ تھا جو کہ افغانوں کے جعفر قبیلے کے سردار تھے۔ جناب ذکریاؒ خود بھی صاحبِ علم و فضل تھے اور انہیں اہلِ علم خاندان سے ایک خاص نسبت تھی۔ آپ کا نسب نامہ اس طرح ہے۔ ذکریاؒ بن عبد الوہابؒ بن عمر بن محمدؒ۔ حضرت سلیمان تونسویؒ کے سر سے والد کا سایہ عہدِ

بھی کر دیا چلتے چلتے ہی اُٹھ گیا۔ آپ کی والدہ نے اقبال مند فرزند کی تعلیم کا اہتمام بڑے ہی تدبر سے کیا۔
خواجہ گڈ... عث جعفرؒ سے قرآن مجید حفظ کیا۔ اپنے ایک ہم قوم حاجی صاحبؒ سے کبھی تعلیم قرآن میں مدد حا...
اور ساتھ ساتھ فارسی کی چند کتب بھی انہی سے پڑھیں۔ پھر میاں حسن علی صاحبؒ کے پاس تونسہ میں آ کر
کرنا شروع کیا۔ یہاں آپ نے فارسی نظم و نثر پر دست گاہ حاصل کی۔ یہیں سے آپ لانگھ چلے گئے
سے پانچ کوس مشرق کی طرف ہے اور میاں ولی محمد صاحبؒ آف لانگھ کی خدمت میں رہ کر آپ نے م...
تعلیم حاصل کی۔

ان دنوں کوٹ مٹھن میں قاضی احمد علیؒ اور اُن کے محترم پدر گرامی قاضی محمد عاقلؒ نے ایک دارالعلو...
کر رکھا تھا جہاں علوم دینیہ کی انتہائی تعلیم دی جاتی تھی۔ چنانچہ حضرت سلیمان تونسویؒ نے کوٹ مٹھ...
کر یہاں سے منطق اور فقہ کی کتب پڑھیں۔ تصوف کی بعض کتابیں آداب الطالبین، فقرات، عشرہ کا...
پر عبور حاصل کیا۔ کوٹ مٹھن میں قیام کے وقت آپ کی عمر پندرہ سال تھی۔

یہاں سے حضرت سلیمان تونسویؒ اپنے شوق کی تکمیل کے لیے اُچ شریف تشریف لے گئے۔
طرف حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ صاحب اپنے مرشد مولانا فخرالدینؒ اورنگ زیب آبادی کے حکم سے
سلیمان کے شہباز بلند پرواز کی تلاش میں اُچ شریف پہنچ چکے تھے تاکہ اس شہباز کو مقید کر کے س...
اور سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچائیں۔

حضرت سلیمان تونسویؒ کو اُچ شریف پہنچ کر خواجہ نور محمد مہاروی کی آمد کی خبر ہوئی۔ آپ نے ا...
امر بالمعروف و نہی المنکر کے شوق کی تکمیل کی غرض سے سماع کے مسئلہ پر حضرت خواجہ صاحب سے
کرنے کا ارادہ کیا۔ مگر حضرت کی بارگاہ میں پہنچ کر آپ کے اندر ہمت ہی نہ رہی کہ کوئی سوال کر سکیں
تین روز تک اسی کش مکش میں رہے کہ کس طرح سوال و جواب کریں۔ آخر ایک روز حضرت خواجہ نو...
کی نظر آپ پر پڑی آپ تاڑ گئے کہ یہی وہ شہباز ہے چنانچہ قاضی محمد عاقلؒ سے آپ کی بابت پوچھا
نوجوان کون ہے۔ قاضی صاحب نے آپ کے بارے میں بے کم و کاست سب کچھ بیان کر دیا اور سا...
یہ بھی بتلایا کہ یہ فقیر امر معروف کے ارادہ سے یہاں آیا ہے۔ خواجہ صاحب نے ساری باتیں سُنیں او...

"آرے بسیار بلند ہمت و وسیع نہضت بنظر مے آید"

حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور ڈرتے ڈرتے حضرت خ...
نور محمد مہارویؒ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ حضرت قبلہ عالمؒ نے آپ کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے او...
سید جلال الدین بخاریؒ کے مزار کے سرہانے کی طرف سے جا کر آپ کو بیعت کیا۔ یوں خواجہ نور محم...
نے اپنے مرشد مولانا فخرالدینؒ کے حکم سے کوہستان سلیمان کے شہباز بلند پرواز حضرت سلیمان تو...
کو قابو کیا۔

حضرت خواجہ سلیمانؒ تونسوی نے چھ سال حضرت قبلۂ عالم کی خدمت میں گزارے۔ تصوف
اور فقہ کی تمام کتابیں آپ سے از سر نو پڑھیں۔ حضرت قبلۂ عالمؒ سے آپ نے باطنی استفادہ حا...
اور تھوڑے ہی عرصہ میں تمام روحانی منازل طے کر لیں۔ بائیس سال کی عمر میں آپ کو اجازت و خلا...
ہوئیں اور مسند ارشاد پر بیٹھنے کا حکم ملا۔

حضرت نور محمد مہارویؒ نے آپ کے بارے میں فرمایا:

"اس لڑکے نے روحانی اسرار اور نعمت الٰہی کے حاصل کرنے میں ہمیں متعجب و حیران کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے کس قدر وسیع حوصلہ عطا فرمایا ہے جو کچھ حاصل کرتا ہے اس کی استعداد قابلیت اس سے کئی گنا بڑھ کر ہوتی ہے۔"

پنے مرشدِ عالی کے حکم سے حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ نے تونسہ شریف میں قیام فرمایا۔ سب سے پہلے ے شیخ جمال الدین چشتیؒ اور خلیفۂ اعظم مولانا محمد بارانؒ صاحب نے بیعت کی۔ آپ کا سلسلۂ طریقت چشتیہ ناندان سے منسلک ہے۔ آپ تیرہویں صدی کے عظیم الشان اور ہر دل عزیز بزرگ تھے۔ آپ سلمانوں اور سینکڑوں مشائخ کے روحانی پیشوا تھے۔ آپ کا روحانی فیض اس قدر عام تھا کہ جو بھی آیا اس بانی سے سیر ہوئے بغیر نہ گیا۔ آپ نے لاکھوں کی تعداد میں لوگوں کو کلمہ طیبہ پڑھایا اور ہزاروں نے آپ کی و برکت سے اپنی زندگیاں سنواریں، بے شمار درویشوں نے عشق کی چاشنی اور معرفت حق کی روشنی آپ صل کی۔ تاریخ شاہد ہے کہ آپ نے ساٹھ سال تک مسندِ ارشاد پر بیٹھ کر تعلیم و تلقین کا جو ہنگامہ برپا رکھا سے ہند و پاک کا کونہ کونہ نورِ اسلام سے منور ہو گیا۔ ہندوستان سے باہر افغانستان، ایران اور عرب تک فیض پہنچا۔

✠

کرہ نگار لکھتے ہیں کہ حضرت سلیمان تونسویؒ کی شکل و صورت حضرت عبدالقادر جیلانیؒ سے مشابہ تھی۔ آپ گول اور قدرے کتابی بھی تھا۔ آپ کی پیشانی کشادہ اور رنگ سفیدی مائل تھا۔ آنکھیں خوب صورت شش تھیں جبکہ پلکیں دراز تھیں۔ کان متوسط اور ریش مبارک نہ بہت گھنی نہ پتلی تھی۔ قد اوسط درجے تھا۔ جسامت قدرے بھاری تھی۔ دیکھنے والے پر آپ کی شکل و صورت کا نہایت دلکش اثر پڑتا تھا۔ کے مزاج میں نفاست اور طبیعت میں لطافت تھی۔ اس لیے آپ کو لباس میں خوب صورتی اور کا خیال خاص رہتا تھا۔ بھدے اور میلے لباس کو آپ بالکل پسند نہ فرماتے تھے۔ گرمی کے موسم میں سر پر قادری ٹوپی پہنتے تھے جو نہایت خوب صورت کٹی ہوئی ہوتی تھی اور اس کے گرد حاشیہ لگا ہوا ہوتا تھا۔ ململ یا لٹھے کا پیراہن زیبِ تن فرمایا کرتے تھے۔ نواب بہاول پور کا دستور تھا کہ سردیوں کے موسم میں روئی ے قبا تیار کروا کر بھیج دیتے جس کے گریبان پر زردوزی کا کام ہوتا تھا۔ آپ اس کو بہت شوق سے استعمال رتے تھے۔ اس کے نیچے کبھی تہہ بند باندھتے اور کبھی پاجامہ استعمال فرمایا کرتے تھے۔

چارپائی پر غالیچہ یا رلی کی خوب صورت تو شک بچھی رہتی تھی جس پر آپ استراحت و آرام فرمایا کرتے تھے۔ حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ فرماتے ہیں کہ میرے مرشد حضرت قبلۂ عالمؒ کو ان کی والدہ ماجدہ صغیر سنی میں ع کی طرف لے کر جا رہی تھیں کیونکہ وہ سخت بیمار تھے۔ راستے میں ان کی ملاقات حضرت میاں محمد ماہؒ سے ں۔ انہوں نے حضرت کی والدہ محترمہ کو روک کر فرمایا "اے محترم خاتون! مجھے اس بچے کی زیارت تو کراؤ۔" ت کی والدہ صاحبہ نے بچہ اُن کی گود میں رکھ دیا۔ زیارت کر چکنے کے بعد حضرت میاں محمد ماہ صاحبؒ نے "محترمہ! آپ اس بچے کو کہاں لے کر جا رہی ہیں۔" انہوں نے بتایا "بچہ سخت بیمار ہے اس کو طبیب س لے کر جا رہی ہوں۔" حضرت میاں محمد ماہؒ صاحب نے فرمایا۔ "آپ اس بچے کو لے کر گھر واپس جائیں۔ حق تعالیٰ خود بخود شفا دے گا۔" نیز پیش گوئی فرمائی کہ یہ لڑکا بڑا ہو کر اہلِ مشرق و مغرب کا معالج ہو گا لہٰذا کسی علاج کی ضرورت نہیں۔"

یہ سُن کر حضرت قبلہ عالم کی والدہ ماجدہ اُن کو واپس گھر لے گئیں۔ آپ اسی روز شفایاب ہو گئے اور بڑے ہو کر آپ نے جو مقام حاصل کیا اُس کو پوری دنیا جانتی ہے۔ حضرت میاں محمد ماہ صاحبؒ کی پیش گوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی۔

ایک مرتبہ ایک مولوی غلام حیدر صاحب حضرت خواجہ تونسویؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے عرض کیا "غریب نواز جب مَیں نے شہر پرواز میں سکونت اختیار کی تو ایک قطعہ زمین میں باجرہ کاشت کیا لیکن وہ بھی خشک ہو گیا۔" حضرت نے فرمایا "کہ آدمی خواہ شام میں چلا جائے یا روم میں جو کچھ اس کی قسمت میں ہے اس میں کمی بیشی نہیں ہوگی جو کچھ حق تعالےٰ نے ازل سے اس کے لیے مقدر فرما دیا ہے وہ مل جائے گا اسے پہنچ جائے گا۔

اللہ تعالےٰ کی قدرتوں اور مہربانیوں کا ذکر کرتے ہوئے حضرت خواجہ تونسویؒ حضرت ابراہیمؑ کا ذکر فرماتے ہیں کہ نمرود بادشاہ کی بیٹی نے جب حضرت ابراہیمؑ پر ایمان لانے کا ارادہ کیا تو نمرود نے اس کی سختی سے سرزنش کی۔ لیکن چونکہ اعیان ثابتہ پر ایمان لانا اس لڑکی کے نصیب میں تھا لہٰذا وہ حضرت ابراہیمؑ پر ایمان لائی اور اُن سے نکاح کیا۔ اس کے بطن سے حق تعالےٰ نے حضرت اسحاق، یعقوب اور یوسف علیہ السلام ایسے پیغمبر پیدا فرمائے۔ نمرود کے دل پر خدا کی طرف سے مہر لگ چکی تھی۔ اس لیے کفر کی جانب مائل ہو گیا۔ اس کے بعد خداوند عالم نے نمرود پر ایک مچھر کو مسلط کر دیا۔ اس نے اس کے لشکر کو بمعہ نمرود تین یا چار گھڑیوں میں نیست و نابود کر دیا۔ ایک مچھر جو اندھا اور لنگڑا تھا وہ نمرود کے دماغ میں گھُس گیا اور اس کو عذاب دینے لگا حتیٰ کہ اس کو ہلاک کر دیا۔ اسی طرح فرعون ملعون کا ذکر حضرت خواجہ فرماتے ہوئے بیان کیا ہے کہ فرعون نمرود سے بھی بڑا کافر تھا۔ اس نے خدائی کا دعوےٰ کر رکھا تھا مگر اس کے گھر میں حضرت آسیہؑ جیسی صاحب ولایت بی بی تھیں۔ اللہ نے فرعون کو غرق کر دیا اور حضرت آسیہ کو بچا لیا۔ حضرت خواجہ صاحبؒ نے اس ضمن میں مزید فرمایا "نیکوں کے گھر بدوں اور بدوں کے گھر نیکوں کی پیدائش خدا کی قدرت اور شان ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام خود صفی اللہ تھے مگر ان کا ایک بیٹا کافر تھا اور تمام کافر اس کی اولاد میں سے ہیں۔ پھر حضرت نوح علیہ السلام خود کتنے جلیل القدر پیغمبر گذرے ہیں مگر ان کا بیٹا مشرک تھا۔ لہٰذا وہ غرق ہو گیا۔ واعلہ حضرت نوح علیہ السلام کی بیوی تھیں اور واہلہ حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی تھیں۔ دونوں اللہ کے صالح بندوں کے ماتحت تھیں مگر دونوں نے خدا کے برگزیدہ بندوں کی حد سے زیادہ مخالفت کی ——— حضرت نوحؑ کی بیوی اُن کو دیوانہ کہا کرتی تھیں۔ جبکہ حضرت لوطؑ کی بیوی نے قوم کو حضرت کے مہمانوں کی خبر کر دی تھی۔ پس ان دونوں پیغمبروں کی عورتوں پر خدا نے عذاب مسلط کر دیا اور حضرت نوحؑ کی بیوی طوفان میں غرق ہو گئی جبکہ لوطؑ کی بیوی کے سر پر ایک پتھر گرا اور وہ ہلاک ہو گئی۔"

حضرت خواجہ صاحب فرماتے ہیں "قیامت کے روز اللہ تعالےٰ پکارے گا واعلہ اور واہلہ جاؤ دوزخ میں داخل ہو جاؤ اور وہ کافروں کے ساتھ دوزخ میں داخل ہو جائیں گی۔ جبکہ فرعون کی بیوی مومنہ تھیں اور فرعون کے عمل سے بیزار تھیں۔ اللہ تعالےٰ نے اس کے متعلق فرمایا "ایک مثل ان کے لیے جو ایمان

ہ مثل فرعون کی بیوی یعنی آسیہ بنت مزاحم کی ہے۔" اس نے کہا اے میرے پروردگار میرے لیے ایک
پنے گھر یعنی بہشت کے قریب بنا اور مجھے ظالم قوم سے نجات دے۔ کیونکہ جب وہ ایمان لائیں تو فرعون
ان کو دھوپ میں لٹا کر اُن میں چار میخیں گاڑ دیں۔ مگر اللہ تعالےٰ نے چار فرشتوں کو حکم دیا کہ آسیہ کے
اپنے پروں سے سایہ کرو۔ پھر فرعون نے اُن کے سینے پر بھاری پتھر رکھنے کا حکم دیا۔ اُس پر حضرت
نے خدا سے دُعا کی "اے اللہ مجھے فرعون خبیث سے نجات دے اور میرا گھر اپنے گھر کے قریب بنا چنانچہ
نے ان کو فرعون سے نجات دے کر اُن کا مرتبہ بلند کیا۔ مطلب یہ ہے کہ جو خدا کے ہو جاتے ہیں
راِن کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔
خواجہ صاحب نے راضی برضا رہنے کا حکم متعدد جگہ دیا ہے۔ ۱۲۶۱ء میں بارش برسنا موقوف ہو گئی۔
ق خدا نے حضرت کی خدمت میں بڑی عاجزی کے ساتھ دعا کی درخواست کی۔ آپ نے فرمایا "بندے
پنے خدا کی رضا پر راضی رہنا چاہیئے کیونکہ تمام کاموں میں کوئی کام بھی بغیر حکمتِ کاملہ کے نہیں ہوتا۔

✖

آپ فرمایا کرتے تھے کہ ایک سالک کو ہمیشہ رحمتِ پروردگار کا اُمیدوار رہنا چاہیئے۔ اس لیے کہ وہ
ت رحمان ہے اور اُسی نے خود فرمایا ہے کہ میری رحمت غضب پر سبقت لے گئی ہے۔ اس لیے
روں کو چاہیئے کہ وہ اللہ تعالےٰ کی رحمت سے کبھی نا اُمید اور مایوس نہ ہوں کیوں کہ خدا نے فرمایا ہے
للہ کی رحمت سے مایوس ہونا کفر ہے۔"

✖

حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ نے سجادۂ مشیخت پر بیٹھ کر ظاہری و باطنی علوم کے دریا بہائے۔ تونسہ
آپ نے ایک دارالعلوم بنا دیا۔ سینکڑوں علماء دور دراز مقامات سے یہاں آکر مقیم ہو گئے اور آپ سے
حانی فیض حاصل کر کے اسلامی دنیا میں پھیل گئے۔ آپ کے مدرسہ میں درس و تدریس کے واسطے مستقل طور
پچاس پچاس جید علماء مقیم رہتے تھے۔ جہاں علوم دینیہ کی انتہائی تعلیم دی جاتی تھی۔ آپ خود بھی تصوف
ی کتابوں کا درس دیتے تھے۔ آپ احیاء العلوم الغزالی۔ فتوحاتِ مکیہ۔ فصوص الحکم جیسی کتابوں کا درس
بنفسِ نفیس دیا کرتے تھے۔ یہی حال آپ کے لنگر خانے کا تھا دو ہزار طالب علم کم از کم صبح و شام آپ کے
ارالضیافت سے کھانا کھایا کرتے تھے۔ آپ نے لنگر چلانے کے لیے ایک پورا محکمہ تشکیل دے رکھا تھا جہاں
ورت کی ہر شے موجود تھی۔ حجام۔ لوہار۔ موچی۔ آب کش۔ طبیب۔ منشی وغیرہ باقاعدہ ماہانہ تنخواہ پاتے تھے
ویشوں کو کسی قسم کی کوئی تکلیف اور احتیاج باقی نہ رہتی۔ ایک مرتبہ طالب علموں اور اساتذہ کی ادویات کا خرچ
ک ماہ میں پانچ سو روپے نکلا۔ منشی نے آکر آپ کو اطلاع دی کیونکہ اس زمانے میں پانچسو روپے بہت
ی رقم ہوا کرتے تھے۔ آپ منشی پر برہم ہوئے اور فرمایا "اگر درویشوں کے دوا دارو پر پانچہزار روپے بھی خرچ
ں تو مجھے نہ اطلاع کی جائے کیونکہ درویشوں کی جان کے مقابلے میں روپیہ کی کوئی حقیقت نہیں۔

✖

خواجہ صاحبؒ کی عوام میں مقبولیت اس قدر تھی کہ آپ کے ہم عصر سر سید احمد خاں مرحوم اپنی کتاب
صنادید میں تحریر کرتے ہیں کہ خواجہ سلیمان تونسویؒ کی شہرت قاف سے قاف تک ہے۔ اسی طرح شیخ العرب والعجم
حضرت مولانا حسین احمد مدنی چشتی دیوبندی فرمایا کرتے تھے کہ خواجہ صاحب اپنے زمانے کے آفتاب تھے۔

آپکی زندگی میں اور بعد از وفات بے شمار شعراء نے ہندی، فارسی اور عربی میں نعتیں اور قصائد لکھے۔ یہ سب نعتیں اور قصائد عقیدت اور ارادت کی تصاویر ہیں۔ محمد نعزی پشاوری فرماتے ہیں۔

سلطان چار طاق وسلیمان شہ رواق، عمان جہان و جان و جہانیان جن و ناس
نفزی اگر بہ لطف کنی خدمتش قبول، منت نہد بجان و بجا آورد سپاس

ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ جس نے دنیا کو چھوڑ دیا وہ خدائے ذوالجلال کا محبوب و مقبول ہو گیا۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "دنیا کی محبت تمام گناہوں کی جڑ ہے اور دنیا کا چھوڑنا تمام عبادتوں کا اصل ہے۔"

اس کی وضاحت کرتے ہوئے آپ نے فرمایا "کسی شہر میں ایک بزرگ رہتے تھے وہ ہمیشہ یہ لفظ دہرایا کرتے تھے کہ دیگچہ میں گوشت ہونا چاہیئے دوسرے لوازمات ہوں یا نہ ہوں۔ جھوٹا شوربہ کام نہیں آتا۔" ایک روز مریدوں نے اُن بزرگ سے دریافت کیا کہ اے غریب نواز اور اے رہنمائے گمراہاں ان الفاظ کا کیا مطلب ہے جو آپ اکثر دہراتے ہیں۔" اس پر انہوں نے فرمایا "گوشت سے مراد ترک ہے اور شوربہ جو کہ پیاز اور لہسن سے بنتا ہے اس کو "شوربائی" یعنی جھوٹا شوربہ کہا جاتا ہے۔" جب سالک نے دل سے دنیا کو نکال دیا۔ پھر اس کو نماز روزہ کافی ہے دوسرے وظائف چاہے ہوں نہ ہوں۔

✖

آپ اپنے مرشد حضرت قبلہ عالم کا ایک ارشاد اکثر بیان فرماتے تھے کہ جو شخص اپنے مرشد کے ارشاد پوری توجہ سے سنتا ہے اور پھر اُن کو لکھ لیتا ہے اُس کو بے شمار برکات عطا کی جاتی ہیں۔

✖

اللہ تعالےٰ اپنے بندوں کا اس طرح خیال رکھتا ہے کہ اتنا زیادہ ایک ماں بھی اپنے بچے کا خیال نہیں رکھ سکتی۔ ایک مرتبہ حضرت خواجہ صاحب نے اس موضوع کو بیان کرتے ہوئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے کا ایک واقعہ سنایا کہ اس زمانے میں بارش کی بندش ہو گئی۔ لوگ حضرت موسیٰؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بارش کے لیے نہایت عاجزی سے درخواست کی۔ حضرت موسیٰؑ نے اللہ کے حضور دعا فرمائی تو اسی وقت جبرائیلؑ وحی لے کر آگئے اور فرمایا کہ فلاں جگہ ایک عاجز و ضعیف بڑھیا سکونت پذیر ہے۔ اس کی گھاس پھوس کی کٹیا پرانی ہو چکی ہے۔ اگر بارش برسے گی تو وہ ضعیفہ تباہ و برباد ہو جائے گی۔ اس وجہ سے ہم نے بارش کو روک رکھا ہے۔" یہ سُن کر حضرت موسیٰؑ نے چند آدمیوں کو اس بڑھیا کی کٹیا کی جانب بھیجا تاکہ اس کی مرمت کر دی جائے چنانچہ جب اس بڑھیا کی کٹیا درست ہو گئی تو اللہ تعالےٰ نے خوب بارش برسائی۔ خواجہ صاحب اس حکایت کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی حکمت ہوتی ہے لیکن ہماری ناقص عقلیں اس کو سمجھ نہیں سکتیں۔

✖

حضرت خواجہ غریب نواز فرماتے ہیں کہ ایک کامل بزرگ کو اطلاع دی گئی کہ ان کا ایک مرید فتنہ میں ہے۔ آپ خاموش ہو گئے۔ جب وہ مرید ان کی زیارت کو آیا تو اس کامل شخص نے اس مرید سے کہا "جو کوئی برائی کرنی ہو وہ ہمارے حجرے میں کر لیا کرو کیونکہ درویش پہ پردہ پوشی کا غلبہ ہوتا ہے۔ پھر انہوں نے کہا کہ میرے اندر خود کوئی عیب ہیں جس کی وجہ سے میرا یہ مرید گمراہ ہو گیا۔ کیونکہ ایک مدرس کا شاگرد اپنا آموختہ

نہیں کرتا تھا تو اُستاد نے اس کو کہا کہ مجھ سے کون سا گناہ سرزد ہوگیا ہے جو تم اپنا سبق یاد نہیں کرتے۔

آخر کم از انحہ گاہ گاہے۔ آئی و بہ ما کنی منگا ہے

قاضی حسن علی صاحب ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ہمارے دل میں ایک مرتبہ خیال آیا کہ حضرت ہم غریبوں کا کچھ خیال نہیں رکھتے اور اسی خیال میں مجھ پر نیند طاری ہوگئی اور خواب میں مجھے خواجہ صاحب تونسوی ؒ کی زیارت ہوئی تو انہوں نے فرمایا "اے حسن علی!" مجھے تو یہ بھی خبر ہے کہ تمہارے دانتوں میں سے ایک دانت ہلتا ہے۔

"کیمیائے سعادت" میں آیا ہے کہ سالک کو چار چیزوں سے اپنا حصار کر لینا چاہیئے۔ اوّل تنہائی میں رہنے کی کوشش کرے دوسرے کم بولے اور زیادہ گفتگو کرنا ترک کر دے۔ کیونکہ زیادہ بولنے سے سالک کا دل تاریک ہو جاتا ہے۔ تیسرے کم کھانا کھائے کیونکہ کم کھانے سے شیطانی راستے بند ہو جاتے ہیں اور چوتھے نہایت کم سویا کرے کیونکہ سونے سے غفلت پیدا ہوتی ہے۔ ابدال لوگ جو درجۂ ابدالیت پر پہنچے ہیں وہ انہی چار چیزوں کو ترک کر کے یہ مقام حاصل کرتے ہیں۔

صحیح مسلمان ہونا اور اسلام کا درجۂ کمال حاصل کرنا بہت مشکل ہے۔ ایک مرتبہ ایک یہودی جو حضرت بایزید بسطامیؒ کا پڑوسی تھا اُسے لوگوں نے کہا "تم مسلمان کیوں نہیں ہو جاتے۔" تو اس یہودی نے کہا کہ جو اسلام بایزید کا ہے وہ تو مجھے حاصل نہیں ہو سکتا اور جو اسلام تمہارا ہے اس کو میں قبول نہیں کرتا۔ یہ حکایت سنانے کے بعد خواجہ صاحبؒ نے یہ شعر پڑھا۔ جو حسبِ حال حکایت ہے۔

سالکان اسلام اگر آساں بُدے
ہر کسے چوں شبلی داد ہم شُدے

ایک مرتبہ مولوی علی محمد جراح نے حضرت خواجہ صاحبؒ کی خدمت میں عرض کیا کہ غریب نواز مجھے ڈیرہ اسماعیل خاں کا قاضی مقرر کیا گیا ہے اور میری تنخواہ بھی مقرر کر دی گئی ہے لیکن میں قضاء کے کام سے ڈرتا ہوں۔ حضرت قبلہ نے اس کے جواب میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ کے قصیدہ غوثیہ کا یہ مصرع پڑھا۔

مُریدی لاتخف اللہ ربی

اس کے بعد مولوی علی محمد کو پہلے زمانے کے ایک قاضی صاحب کا واقعہ سُنایا جو کہ بڑے عالم و زاہد، متقی، خدا ترس اور خدا پرست آدمی تھے۔ ایک دفعہ اُن کے پاس ایک بقال آیا اور کہنے لگا کہ اے نائب رسول اللہ! تم قاضی ہو۔ میرے پاس ایک گائے تھی اسے شیر کھا گیا ہے۔ آپ اس معاملے میں انصاف فرما دیں۔" قاضی صاحب نے یہ سُن کر تبسم کیا اور کہنے لگے شیر تو جنگل میں ہے، میں کس طرح اس معاملہ کا فیصلہ کروں۔ ابھی یہ بات کر ہی رہے تھے کہ اچانک شیر قاضی صاحب کے سامنے آ گیا انہیں سجدہ کیا اور چلا گیا اور بقال راضی ہوگیا۔

حضرت خواجہ صاحبؒ حضرت حسن افغان جو حضرت بہاؤالدین ذکریا ملتانی کے مرید تھے کا واقعہ بیان

کرتے ہیں کہ وہ بالکل ناخواندہ تھے حتیٰ کہ انہیں قرآن مجید بھی نہیں آتا تھا۔ عام لوگ امتحان کی غرض سے چند سطور قرآن مجید کی اور چند سطور دوسری کتابوں کی ایک کاغذ پر لکھ کر آپ کے سامنے رکھ دیتے اور پوچھتے کہ ان میں قرآن مجید کے الفاظ کون سے ہیں۔ حضرت حسن مذکور نور معرفت سے قرآن کے الفاظ پہچان لیتے اور ان پر انگلی رکھ دیتے۔ امتحان لینے والے لوگ حیران ہو جاتے اور کہتے اے حسن! آپ تو بالکل ناخواندہ ہیں تو یہ قرآن مجید کے الفاظ کے متعلق کیسے آپ کو پتہ چل جاتا ہے۔ اس پر وہ فرماتے "قرآن مجید کے حروف کا نور زمین سے عرش معلیٰ تک جاتا ہے اور اس نور کی وجہ سے میں ان حروف کو پہچان لیتا ہوں۔" حضرت بہاؤالدین فرمایا کرتے تھے کہ قیامت کے روز جب حق تعالےٰ مجھ سے پوچھیں گے کہ بہاؤالدین ہمارے لیے تم کیا تحفہ لائے تو میں عرض کروں گا کہ اے باری تعالےٰ میں تیری درگاہ میں حسن افغان کو لایا ہوں حضرت خواجہ صاحب اس واقعہ کو اس وجہ سے بیان کرتے ہیں کہ خدا تعالےٰ کی معرفت کی جو شخص آگاہی کر لیتا ہے اس کو دنیاوی علوم کی ضرورت نہیں رہتی۔

آپ فرمایا کرتے تھے کہ حق تعالےٰ اپنے بندوں کا جو بھی گناہ دیکھتے ہیں اس سے درگذر فرماتے ہیں۔ لیکن اگر بندہ کسی میں کوئی عیب وگناہ دیکھتا ہے تو اسی وقت وہ اس کو اس کی پاداش میں ذلیل و خوار کرتا ہے۔ لیکن حق سبحانہ وتعالےٰ اپنے فضل سے اسکی پردہ پوشی کرتے ہیں اور معاف کر دیتے ہیں۔ اس لیے بندوں کو بھی چاہیئے کہ وہ ایک دوسرے کی پردہ پوشی کریں تاکہ ان کی پردہ پوشی کی جائے۔ آج اگرچہ روحانیت، عشق اور دوائے دل بیچنے والوں کی دکانیں بھری پڑی ہیں اور ہر طرف مادی اجناس اور متاع مکروفن کے لین دین کی گرم بازاری ہے۔ تاہم عشق ومحبت اور سوز وگداز کی جنس کمیاب ابھی بالکل نایاب نہیں ہوئی۔ اس گئے گذرے دور میں بھی اس متاع گراں مایہ کے مخازن کا پتہ چلتا ہے یا چلایا جا سکتا ہے۔ مگر تلاش شرط ہے۔ جو لوگ تلاش وجستجو کے باوجود بھی اس گوہر مقصود کا سراغ نہیں پا سکتے ان کے لیے اہل اللہ کی صحبت کے برابر فیض حاصل کرنے اور اہل اللہ سے ایک قسم کی ملاقات کرنے کا نہایت آسان طریقہ یہ ہے کہ وہ ان کے ملفوظات ومکتوبات کا مطالعہ کریں۔

اہل اللہ کے ملفوظات ومکتوبات میں آج بھی دلوں کو گرمی پہنچانے اور معرفت حق کی چاشنی کا مزہ دینے کی تاثیر موجود ہے۔ ان کے مطالعہ سے اللہ اور اس کے رسول کا عشق حاصل ہوتا ہے دنیا پرستی سے نفرت اور آخرت کی طلب ویاد دلوں میں پیدا ہوتی ہے۔ بلاشبہ ان ملفوظات میں وہ سب کچھ موجود ہے جس پر عمل پیرا ہونے کے بعد آج بھی ہماری سماجی اور معاشرتی برائیوں کا قلع قمع ہو سکتا ہے۔ اسلامی معاشرہ کی تطہیر کے لیے ان ملفوظات میں مجرب نسخے درج ہیں۔ حضرت خواجہ سلیمان تونسوی نے بھی اپنے ملفوظات، مکتوبات اور کتب میں زمانے کی برائیوں کا ذکر اور ان کو دور کرنے کی تدابیر بیان فرمائی ہیں۔ بڑے ہی شگفتہ اور دلچسپ انداز میں ایک لائحہ عمل اور ہدایت تحریر فرمائی ہے جس سے عوام وخواص، علماء فضلاء، عشاق ورندان، شعراء اور امراء غرض ہر طبقہ کے لوگ ان سے بہرہ ور ہو کر دنیا کو سلف صالحین کا نمونہ دکھا سکتے ہیں۔ ہر نصیحت کے ساتھ ایک حکایت تمثیلاً بیان کی گئی ہے۔

میاں یار محمد بلبانی روایت کرتے ہیں کہ خواجہ سلیمان تونسوی درگ (ایک جگہ کا نام) میں تشریف فرما تھے کہ ایک روز ایک شخص اپنی بیوی کو لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میری بیوی پر جن

کا سایہ ہے۔ آپ خدا کے لیے اس کا کوئی علاج فرما دیں۔ حضرت خواجہ صاحب نے جن کو حکم دیا "تم نے اس بیچاری عورت کو کیوں گرفتار کر رکھا ہے اس کی جان چھوڑ دو۔" جن نے عرض کی "اے خواجہ خواجگان! چند روز سے میرا بچہ سخت بیمار ہے۔ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے بچے کی بیماری دور کرنے کا تعویز حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن اس کام کی کوئی صورت نہ نظر آئی تو میں نے اس عورت کو گرفتار کر لیا تاکہ اس کے وسیلہ سے آپ کی زیارت بھی ہو جائے اور میں اپنے بچے کے لیے تعویز بھی حاصل کر سکوں۔"

حضرت غریب نوازؒ نے فرمایا "تم تعویز کس طرح حاصل کرو گے۔" اس جن نے عرض کی آپ تعویز کو فلاں پتھر کے نیچے رکھ دیں میں وہاں سے حاصل کر لوں گا۔ چنانچہ خواجہ صاحبؒ نے مطلوبہ تعویز پتھر کے نیچے رکھ دیا۔ جن نے اس طرح اس عورت کی جان چھوڑ دی اور خود تعویز لے کر مفقود ہو گیا۔ عورت اچھی ہو گئی اور اپنے شوہر کے ساتھ چلی گئی۔ اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سلیمان ملک سے انسان ہی فیضیاب نہیں ہوتے تھے بلکہ جن بھی آپ کے در سے درد کا درماں حاصل کیا کرتے تھے۔

ایک روز خواجہ غریب نوازؒ اپنے مریدوں کے حلقے میں تشریف فرما تھے۔ یہ واقعہ موضع جسرور کا ہے۔ ذکر فکر کی باتیں ہو رہی تھیں۔ اچانک آپ کا روئے مبارک متغیر ہو گیا۔ آپ نے سر زانو میں جھکا لیا اور کافی دیر مراقبہ میں بیٹھے رہے۔ کافی دیر کے بعد آپ نے پھر سر اٹھایا اور خداوند کریم کا شکرانہ نوافل کی صورت میں ادا کیا۔ حاضرین اس امر سے متعجب ہوئے کہ چہرہ مبارک کی تغیری کا کیا موجب ہے۔

نور خاں گرمانی آپ کا مرید و مشیر تھا اور اس پر آپ کی کمال عنایت بہت زیادہ تھی اور وہ بے تکلف بھی تھا۔ اس نے ہمت کر کے پوچھا۔ "حضرت آپ کو یکایک کیا ہو گیا تھا کہ آپ کا چہرہ متغیر ہو گیا تھا۔" آپ نے فرمایا "اوائل عمری میں ایک شخص عمر خاں جو مکول کا رہنے والا تھا میرا مرید ہوا۔ وہ شخص خاصا متمول تھا اس نے مجھے ایک گھوڑی تحفۃً دی اور چند کے مکان میرے لیے تیار کروائے کچھ کنوئیں بھی میری نذر کیے مگر میں نے سوائے گھوڑی کے کچھ قبول نہ کیا۔ گھوڑی بھی اس کے اصرار کی وجہ سے مجھے قبول کرنا پڑی۔ میں اس کے لیے ہمیشہ دعائے خیر کرتا تھا اور وہ بھی تونسہ میں میرے پاس اکثر آیا جایا کرتا تھا۔ ایک خاص بات یہ تھی کہ وہ بالکل ان پڑھ تھا۔ آخری عمر میں اس کے دشمنوں نے اس کی جاہلیت سے فائدہ اٹھایا اور اس کو بہکایا "تم نے ایک افغان روہیلہ کی مریدی اختیار کی ہے جبکہ تمہارے اپنے شہر میں ایک سے ایک بڑھ کر مرشد موجود ہیں۔" وہ شخص لوگوں کے بہکاوے میں آ گیا اور اس نے تونسہ شریف آنا جانا بند کر دیا۔ کچھ عرصہ کے بعد وہ سخت بیمار ہو گیا۔ اس کی شکل مسخ ہو گئی اس نے کتے کی طرح لوگوں پر بھونکنا اور کاٹنا شروع کر دیا اور حتیٰ کہ اپنے کپڑے پھاڑ کر گلیوں میں بھاگنے لگا۔ ہر وقت اس کی زبان پر کفر کے کلمات رہنے لگے۔ اس کی یہ بدتر حالت دیکھ کر ایک شخص موسیٰ نامی نے اس عمر خاں کو کہا "تم نے اپنے مرشد کی توہین کی ہے۔ یہ اس کی تمہیں سزا مل رہی ہے۔ لہٰذا اب بھی تم توبہ استغفار کر کے اپنے مرشد کی طرف رجوع کرو تو تمہاری مشکلیں آسان ہو جائیں گی۔ عمر خاں نے موسیٰ کی بات کو توجہ سے سنا اور دل سے توبہ کر لی چنانچہ اللہ تعالےٰ نے اس پر رحم کیا۔ اس کی مشکلیں آسان ہو گئیں اور اس کی زبان پر کلمہ شریف جاری ہو گیا۔ پھر اسے احساس ہو گیا کہ میں نے لوگوں کے کہنے سے جو غلط کام کیا اس کی مجھے سزا ملی ہے۔" آج عمر خاں پر وقت نزع آ گیا اور جان کنی کے عالم میں اس کو شدید تکلیف ہو رہی تھی۔ اور اس نے مجھے یاد کیا تھا۔ میں نے اس کے واسطے درگاہ الٰہی

میں دعا کی اور اللہ تعالیٰ نے اس پر اپنی مہربانی کی اور دولتِ ایمان لے کر فوت ہوا ہے۔" خواجہ صاحب نے فرمایا کہ ایک مرشد کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ اپنے مُرید کا ہر حال میں خیال رکھے اور اس کی دستگیری کرے

✕

ایک مرتبہ ایک دولت مند مال وزر کے نشے میں چُور حضرت غریب نواز کی خدمت میں آیا اور کہنے لگا "یا خواجہ! یا مجھے موسیٰؑ بنا دو یا فرعون بنا دو۔ حضرت نے سکوت طاری کیے رکھا۔ اُس شخص نے دوبارہ اپنا مدعا دُہرایا۔ آپ پھر خاموش رہے۔ تیسری مرتبہ جب اُس شخص نے اپنی بات دُہرائی تو آپ نے فرمایا "تم نے کہا ہے کہ تمہیں موسیٰؑ بنا دیا جائے یا فرعون، جہاں تک موسیٰؑ کا تعلق ہے تو وہ اللہ کے نبی تھے اور نبوّت تو ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو چکی ہے۔ اس لیے تمہارا موسیٰؑ بننا ممکن نہیں ہاں البتہ فرعون بننا چاہتے ہو تو وہ بن سکتے ہو۔" وہ شخص سخت شرمندہ ہوا اور آپ سے معافی کا طلب گار ہوا۔ آپ نے اس کے حق میں دعائے خیر فرمائی اور اُس کو ظاہری و باطنی دولت سے مالا مال کیا اور نصیحت کی کہ ایسی خواہش آئندہ مت کرنا۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے کہ اُس نے تم پر کرم کر دیا ہے۔ ورنہ تم فرعون بنا دیے جاتے تو تمہاری دنیا و آخرت دونوں برباد ہو جاتیں۔

✕

حضرت غریب نوازؒ کے سجادہ نشین بیان فرماتے ہیں حضرت سلیمان تونسویؒ نے ہمیں اپنے بچپن کا ایک واقعہ سُنایا جو اس بات کی دلالت کرتا ہے کہ آپ مادر زاد ولی تھے۔ قصہ یوں ہے کہ تونسہ کے امراء اور روساء نے ایک روز طوائفوں کا مُجرا کروایا۔ حضرت کو ان باتوں کے بارے میں کچھ علم نہ تھا۔ وہ محض تماشا دیکھنے چلے گئے تھے۔ یہ رنگ و لہو کی محفل رات گئے تک جاری رہی۔ آپ بھی وہاں پر کھڑے ناچ گانا دیکھتے رہے اچانک آپ کو نیند آ گئی اور آپ اسی جگہ جہاں کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے سو گئے۔ خواب میں آپ نے ایک بزرگ کو دیکھا جو آپ پر سخت ناراض تھے۔ انھوں نے آپ کے منہ پر زور سے طمانچہ مارا اور فرمایا "تم ان طوائفوں کا تماشہ دیکھنے آئے تھے تمہیں معلوم نہیں یہ کتنی بُری بات ہے یہ کہہ کر وہ بزرگ غائب ہو گئے۔"

خواجہ صاحبؒ فرماتے ہیں میری جب آنکھ کھُلی تو طوائفیں جا چکی تھیں لیکن میرے رُخسار پر طمانچے کے واضح نشان تھے بلکہ اُس بزرگ کی اُنگلیاں میرے گال پر جم گئی تھیں۔ حضرت فرماتے ہیں کہ اس واقعہ سے کئی سالوں بعد میں جب حضرت قبلہ عالم خواجہ نور محمد مہاروی صاحبؒ سے بیعت ہوا تو میں دیکھ کر حیران و پریشان ہو گیا کہ یہ وہی بزرگ تھے جن کو میں نے خواب میں دیکھا تھا۔ اور انھوں نے مجھے تھپڑ مار کر مجھے طوائفوں کا تماشا دیکھنے کی سرزنش کی تھی۔

✕

آپ فرمایا کرتے تھے کہ درویش وہ جو شب و روز مجاہدہ میں رہے۔ اپنا وقت زیادہ تر ذکر و فکر میں بسر کرے۔ اس کی طلب فقط رضائے الٰہی ہونی چاہیئے۔ اور اس حالت میں اس کو کچھ انوار یا اسرار یا کشف قبور وغیرہ ہویدا ہوں تو ان کو مخفی رکھے اور کسی کو نہ بتائے۔ وصال اور مقصود و حقیقی کی اُمید پر ہر روز اسی طرح محنت و مجاہدہ کرتا رہے۔ کیونکہ جو شخص غیر شرعی افعال سے پرہیز نہیں کرتا وہ ترقی کی پہلی سیڑھی پر ہوتا ہے۔ اور وہ منزلِ مطلوب پر نہیں پہنچ سکتا اور جو شخص لقاءاللہ کے درپے ہے وہ منزل

کے آخری درجہ پر ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ حلقۂ شریعت سے ایک قدم بھی باہر نہیں نکالتا۔ بلکہ شب و روز حسب معمول مبتدیوں کی طرح مجاہدہ اور ریاضت میں لگا رہتا ہے۔ چنانچہ کہا گیا ہے۔

ع نہایت قدم سالکان ہدایت اوست

اسی طرح آپ حضرت محبوب الٰہی کا فرمودہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ حضرت نے فرمایا "خاندانِ چشت میں سلوک کے پندرہ مدارج ہیں اور پانچویں درجہ میں کشف و کرامات ہیں۔ اگر کوئی شخص اس درجہ پر پہنچ کر سب کچھ ظاہر کردے تو بس اس کی ترقی کی انتہا یہی۔ مگر کامل وہ ہے جو آخری درجے پر پہنچ کر بھی اپنے آپ کو ظاہر نہ کرے جیسے امیر خسرو۔"

مگر کئی لوگ تو ایسے ہیں کہ ابھی نفس کی پلیدی سے آزاد بھی نہیں ہو پاتے اور شیخی بگھارنا شروع کر دیتے ہیں۔ ایسے لوگ ہی ہیں جو ناموس درویشی کے لیے ایک لعنت ہیں۔ ایسے لوگوں سے بچنا چاہیئے۔

حضرت خواجہ صاحبؒ کے مکارمِ اخلاق کو بہ حالتِ تمام پیش کرنا قلم و قرطاس کے بس سے باہر ہے مگر آپ کے ملفوظات آپ کے اخلاق کی تفسیر و تشریح ہیں۔ آپ کے زہد و اتقاء۔ صبر و توکل علی اللہ۔ جود و سخا مسکین نوازی اور غرباء پروری۔ قناعت و ایثار۔ عفو و صبر و تحمل۔ تسلیم و رضا۔ اتباع سنت۔ استغناء و سیر چشمی۔ استغراق و محویت دنیا سے بے تعلقی اور تبلیغ و ترویج دین سے متعلق واقعات کی تفصیل میں بے شمار تذکرے اور تاریخیں مرتب کی جا چکی ہیں۔ سب سے اعلیٰ صفات میں سے جود و سخا اور مسکین پروری کی صفت آپ میں بدرجہ اتم موجود تھی۔

خواجہ خضر علیہ السلام سے حضرت غریب نوازؒ کی اکثر ملاقات ہوا کرتی تھی بلکہ دونوں میں بڑی دوستی تھی اکثر خواجہ خضر از خود جناب سلیمان تونسویؒ کی ملاقات کو آتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ حضرت قبلہ عالم نور محمد مہارویؒ کی خانقاہ سے رخصت ہو کر صاحبزادگان مہاروی سے ملنے مہار شریف جا رہے تھے آپ کے ہمراہ مریدین میاں جمال محمد چشتی اور میاں صالح محمد بھی تھے جب آپ نالہ ہرباری کے کنارے پہنچے تو وہاں ایک شخص جس کا لباس اور شکل و صورت درویشوں جیسی تھی آپ سے آ کر ملا۔ مصافحہ کیا اور مختصر سی گفتگو کے بعد چلا گیا۔ آپ نے اپنے مرید سے دریافت کیا جانتے ہو یہ بزرگ کون تھے۔ انہوں نے انکار کیا تو آپ نے فرمایا یہ حضرت خضر علیہ السلام تھے۔

حضرت خواجہ تونسویؒ پر اکثر وجد و محویت کی حالت طاری رہتی تھی۔ آپ کی آنکھیں جذبۂ شوق سے اکثر نم رہتی تھیں۔ اکثر اوقات کسی قوال سے کوئی عمدہ سا شعر سن کر گھنٹوں بے خود بے ہوش پڑے رہتے تھے آپ اکثر اپنے قوال احمد نامی سے تخلیہ میں کلام سنا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ نے احمد کو حکم دیا کہ مجھے ہندی غزل سناؤ چنانچہ اس ایک غزل جو کہ ہندی تھی سنائی اس کا ایک شعر یہ ہے:

پریم پیالہ اساں ہنس رس پیتا
جو کچھ کیتا سانوں تیرے نیناں کیتا

آپ پر یہ سن کر رقت طاری ہو گئی اور کئی گھنٹے آپ روتے رہے۔ آپ نے حجرے کا دروازہ بند کر لیا اور ساری رات سوزشِ عشق میں جلتے رہے۔ آپ پر جب مستی اور عشق کی آگ غالب آتی تو باوجود سخت

سردی کے آپ کا کمرہ بھٹی کی طرح تپ جایا کرتا تھا۔
ایک دن آپ نے مولوی نور جہانیاں بہاولپوری سے پوچھا عشق کیا ہے۔ انہوں نے جواب دیا "العشق نار یحرق ماسوی اللہ" بعض لوگوں کو خواجہ صاحب حصولِ عشق کے لیے یہ دعا سکھاتے تھے۔

اللھم ارزقنا حلاوۃ الحب فی محبت اللہ

حضرت خواجہ صاحب نے عورتوں کے متعلق تحریر فرمایا ہے کہ ان کو مسندِ ولایت پر نہیں بٹھایا جا سکتا۔ کیونکہ ان سے نہ پیغمبری ثابت ہے۔ نہ عہدۂ قضا، نہ بیعت اور نہ ہی سجادہ نشینی۔ حضرت بہاؤالدین ذکریا ملتانی کی مسندِ سجادگی پر ایک عورت کو مقرر و مسلط کر دیا اور ایک بزرگ جن کا نام حاجی شیخ احمد تھا وہ مردِ صالح بھی تھے اور مستحقِ سجادگی بھی تھے۔ اُن کو حکومتِ خراسان نے درگاہ سے اُٹھا کر ایک عورت کو وہاں پر متمکن کیا۔
حضرت بہاؤالدین ذکریاؒ کئی بزرگوں کو خواب میں نظر آئے انہوں نے مزارِ مبارک سے باہر آ کر حکم دیا کہ ان کتوں کو مار مار کر باہر نکالو جنہوں نے میرے مزار پر عورتوں کو بٹھایا ہے۔ کتوں کا لفظ حضرت ملتانی نے خراسانی حکمرانوں کی بابت استعمال کیا تھا۔ چنانچہ عورتوں کو مسندِ سجادگی سے ہٹایا گیا اور حضرت ملتانی کے حکم کی تعمیل میں ایک مردِ صالح کو سجادہ نشین بنایا گیا۔

✖

آپ فرماتے ہیں کہ جو شخص یہ چاہے کہ وہ حق سبحانہٗ و تعالےٰ کا محبوب و مقبول بندہ بن جائے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ متابعتِ شریعت میں ظاہراً و باطناً کوشش کرے تاکہ اس کو خدا کی قربت نصیب ہو جائے۔
ایک مرتبہ جب ایک صوفی کی لڑکی بالغ ہو گئی تو لوگوں نے اُس سے پوچھا "آپ اس بچی کا نکاح کیوں نہیں کر دیتے۔ انہوں نے جواب دیا "میں کسی مسلمان کا طلب گار ہوں تاکہ اُس سے بیٹی کا نکاح کروں۔" لوگوں نے جواباً کہا۔ "مسلمان تو بہت ہیں۔" اُن صوفی صاحب نے جواب دیا "میرے نزدیک مسلمان وہ ہے جو اپنے آپ سے گزر کر ذاتِ حق تعالےٰ میں فانی ہو چکا ہو۔ کیونکہ بعض صوفیائے کرام کے نزدیک فنائیت اسلام کی ابتداء ہے۔ اس حکایت کو بیان فرماتے ہوئے حضرت خواجہ تونسویؒ فرماتے ہیں کہ سالک کو چاہیئے کہ زہد و ریاضت میں اتنی کوشش کرے کہ اُس کو فنا کلی نصیب ہو جائے کیونکہ اس مرتبہ کے حصول کے بغیر صوفیاء کرام کے مشرب میں وہ صحیح مسلمان نہیں ہو سکتا۔

✖

حضرت خواجہ صاحبؒ نے فرمایا کہ شیخ محی الدینؒ ابن عربی نے مراقبہ میں دیکھا کہ نبی علیہ السلام کتاب فصوص الحکم نامی جو کہ وحدت الوجود کے مسئلہ پر مشتمل ہے اپنے دستِ مبارک میں لیے ہوئے ہیں اور کو حکم دیتے ہوئے فرماتے ہیں "اس کتاب کو مسئلہ وحدتِ وجود کے بیان میں تصنیف کرا دو کہ ذات واحد ہے۔ جس نے کہ ذات اور اسماء اور صفات سے مختلف تعینات اور لباسوں میں ظہور فرمایا ہے۔ انہوں نے بموجب تعمیلِ حکم کتاب مذکورہ تصنیف کی اور مسئلہ مذکور کو اس میں بیان کیا۔ اللہ تعالےٰ نے کلام میں اپنے سارے اسماء کو ظاہر کر دیا ہے۔ جیسے آدم علیہ السلام کے متعلق اللہ تعالےٰ نے فرمایا کہ ان سے اسماء ربانی ظاہر ہوتے ہیں۔
خواجہ تونسوی صاحبؒ کو پوری عمر اتباع سنت کا بہت خیال رہا۔ عبادات و معاملات میں بھی

کوئی فعل خلاف سنت نہیں کرتے تھے۔ ساری عمر آپ نے نماز کبھی دیر سے یا وقت آخر میں نہیں پڑھی۔ اور کوئی نماز بغیر جماعت کے نہیں پڑھی۔ استغراق و محویت اور عشق الٰہی کی مستی کے باوجود کبھی آپ کے منہ سے کوئی کلمہ خلاف شریعت نہیں نکلا۔ آپ کا قول تھا کہ ہمارا اصلی کام نبی مکرم رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرنا ہے۔ اگر کوئی شخص ہوا میں اڑتا ہوا بھی نیچے آئے لیکن اس کا کوئی بھی فعل خلاف سنت ہو تو اس کی پیروی مت کرو۔ کیونکہ صحیح معنوں میں عبادات کی معراج و تکمیل سنت رسول اللہ کی ادائیگی سے ہوتی ہے۔ آنحضرتؐ سے محبت اور عشق اس بات کا متقاضی ہے کہ حضور سرور کائنات نور مجسم کی سنت کی ہر لحاظ سے اتباع کی جائے۔ آپ نے اپنے مریدوں کو بھی نصیحت کی کہ نماز و روزہ خدا تعالےٰ کی عبادات ہیں۔ ان کی بجاآوری ہم پر فرض ہے لیکن ان کی ادائیگی میں ہمیں رسول اللہ کی سنت کو سامنے رکھنا ہوگا۔ کیونکہ خدا کی رضا اسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے کہ ہم اس کے حبیبؐ کی سنت اور فرمودات کی پوری طرح پابندی کریں۔

✠

ایک مرتبہ ۱۲ ربیع الاوّل کو دامان کے ہزارہا لوگ مرد عورتیں تونسہ شریف میں جمع ہو گئے اور حضرت غریب نواز خواجہ تونسویؒ کی خانقاہ مبارک کا طواف کرنا شروع کر دیا۔ جب ان سے ایسا کرنے کا سبب پوچھا گیا تو انہوں نے بیان کیا کہ ہم نے اپنے وطن میں ایک غیبی آواز سنی کہ ۱۲ ربیع الاوّل کو جو شخص حضرت خواجہ سلیمانؒ کی زیارت کرے گا وہ ضرور بہشت میں جائے گا۔ اس لیے ہم حضرت کی زیارت کے واسطے اپنا گھر بار چھوڑ کر اتنا طویل سفر کر کے اس جگہ آئے ہیں تاکہ اللہ تعالےٰ بطفیل خواجہ صاحب ہمیں بخش دے۔ اس مجمع میں ایک عورت ایسی بھی تھی جو اپنے گھر میں روٹیاں پکا رہی تھی جب ہاتف غیبی نے یہ نوید سنائی کہ حضرت خواجہ صاحبؒ کی زیارت کرنے والا جنتی ہو گا تو وہ روٹی پکاتی پکاتی بچوں کو چھوڑ چھاڑ کر تونسہ شریف پہنچ گئی جبکہ اس کا گھر تونسہ سے ۳۰ کوس کے فاصلہ پر تھا۔ جب لوگوں کا ہجوم بڑھ گیا تو حضرت جو اس وقت اپنے حجرہ میں مشغول عبادت تھے اپنے خادم محمد اکرم کو باہر بھیجا کہ پتہ کر کے آؤ یہ شور کیسا ہے، تو خادم نے عرض کی "حضرت آپ بلواتے تو لوگوں کو خود ہیں اور پوچھتے ہم سے ہیں۔" باہر آپ کی دید کے پیاسوں کا ایک جم غفیر جمع ہو چکا ہے۔ یہ سن کر حضرت حجرہ سے باہر تشریف لے گئے اور لوگوں کو اپنی زیارت کروائی جو غیبی آواز سن کر اس غرض سے دیدار خواجہ کے لیے آئے تھے کہ اس طرح وہ بہشت میں جا سکیں گے۔ دیدار کے بعد ان لوگوں کا ہجوم تمام کا تمام آپ کے ہاتھ پر بیعت ہوا اور خدام میں داخل ہو گیا۔

✠

آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ایک عام شخص اور خاص شخص میں صرف اتنا فرق ہے کہ جو کوئی خدا کے دیے ہوئے رزق پر قناعت کرتا ہے اس کے دل میں زیادتی کی طلب اور حرص نہیں ہوتی وہ خواص میں سے ہوتا ہے اور جس کا حال اس کے برعکس ہو وہ عوام میں سے ہوتا ہے۔

✠

آپ کی سخاوت کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ ایک شخص محمد واصل جو کہ سیاح تھا اس نے آپ کی خدمت میں عرض کی "حضرت میں نے عرب و عجم کی سیاحت کی ہے لیکن آپ کی ذات مبارک کی نظیر میں نے کہیں نہیں دیکھی آپ گھوڑے اور اونٹ اور دوسرے جانور مع نقد جنس، کپڑے آٹا اور طعام لوگوں کو دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ لوگوں

کو دوا دارو کا بھی بندوبست کرتے ہیں اس کے علاوہ گمراہوں کو فلاح کی راہ بھی دکھاتے ہیں۔" یہ باتیں سن کر خواجہ صاحبؒ مسکرائے اور فرمایا۔ "اے میاں واصل! میری بات توجہ سے سنو! جب میں اپنے وطن کوہ درگ سے علم حاصل کرنے کے لیے شہر میں آ کر مسجد سفید میں سکونت پذیر ہوا تو ایک نورباف نے میرا وظیفہ مقرر کیا۔ اس کے دروازے پر ایک کتا ہوتا تھا میں اُس سے بہت ڈرتا تھا۔ وظیفہ لینے کے لیے پہلے مسجد کے صحن سے جو کہ اُس نورباف کے گھر سے اونچا تھا۔ میں دیکھتا اگر کتا اس وقت دروازے پر نہ ہوتا تو میں دوڑ کر اپنا وظیفہ لے آتا اور کھا لیتا ورنہ سارا دن فاقہ میں گزار دیتا۔ میں تو وہی ہوں لیکن حق تعالےٰ کی ذات کریم ہے کہ جس نے مجھے اپنی عنایات سے نوازا ہے۔" یہ بات قابلِ غور ہے کہ مردانِ خدا باوجودیکہ ان کا مقام بہت بلند ہوتا ہے لیکن یہ ہمیشہ خدا کا شکر بجا لاتے ہیں۔ ان کے کلام اور ان کے وجود میں نفسانیت کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔

حضرت قبلہ خواجہ محمد سلیمان تونسوی صاحبؒ پہاڑی علاقے کے پٹھان تھے لیکن آپ نے عمر بھر لوگوں کی بھلائی کے لیے بے شمار فلاحی کام کیے اور پٹھانوں اور پہاڑی علاقوں کی روایتی سختی جو عام روایت ہے اسے باطل کر دیا۔ آپ کے رویّیں رویّیں میں محبّت، نرمی اور مہربانی رچی اور بسی ہوئی تھی۔

۱۲۶۷ء میں صفر کا چاند نمودار ہوا تو آپ نے فرمایا ہمارے سفر کا مہینہ آ گیا ہے۔ یکم صفر کو آپ کو سخت زکام ہوا جو رفتہ رفتہ بخار کی شکل میں تبدیل ہو گیا۔ اس دوران آپ نے اپنے معمولات کو بالکل نہ ترک کیا۔ صفر ۱۲۶۷ء کو بوقت تہجد جب آپ پاس انفاس کے شغل میں مشغول تھے تو آپ کا وصال ہو گیا۔ بیماری کے دوران آپ نے باوجود شدید تکلیف کے لوگوں کی خدمات برقرار رکھیں۔ آخری رات آپ نے اپنے تمام مریدین کے لیے دعائیں کیں اور یہ فقرہ بار بار آپ کی زبان پر آتا رہا۔

"مُنہ توں پلڑا دُور کر گلاں کرائیں رج"

تونسہ شریف جو کہ ایک دارالعلوم ہے۔ ایک ولی خیز سرزمین ہے۔ وہاں پر آج بھی حضرت خواجہ صاحبؒ اپنے پُرنور روضہ میں استراحت فرما رہے ہیں۔ لوگ دور دور سے آ کر یہاں سے انوار کی جھولیاں بھرتے ہیں۔ آپ کے مریدین خاص میں حضرت خواجہ اللہ بخش تونسوی، حضرت مولانا فخر الدین دہلوی، حضرت مولانا محمد مکھڈی اور حضرت خواجہ شمس الدین سیالوی صاحب قابلِ ذکر ہیں۔

ایک دفعہ ایک شخص ماتھے پر پٹی باندھے حضرت رابعہ بصریؒ کے سامنے سے گزرا۔ آپ نے اس سے دریافت کیا کیوں بھئی کیا بات ہے سر پر پٹی باندھ رکھی ہے۔ اس نے جواب دیا: میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔" حضرت رابعہؒ نے پوچھا کہ تمہاری عمر کیا ہے؟"
اس نے کہا، "تیس برس"
آپ نے دریافت کیا کہ تم اس مدت میں بیمار رہے یا تندرست۔ اس نے جواب میں کہا میں ہمیشہ تندرست رہا ہوں کبھی بیمار نہیں ہوا۔
حضرت رابعہؒ نے فرمایا "تیس برس صحت کی دولت سے مالا مال رہنے کے باوجود تو نے کبھی اپنے سر پر شکر کی پٹی نہیں باندھی۔ آج تیرے سر میں درد ہو گیا ہے تو مخلوقِ خدا کے سامنے شکایت کی پٹی سر پر باندھے پھر رہا ہے۔"

خواجہ فرید الدین عطارؒ ایک روز اپنی دُکان میں تشریف فرما تھے۔ کاروبار چل رہا تھا۔ لوگ آجا رہے تھے۔ آپ نے ایک فقیر کو دیکھا جو مسلسل کئی گھنٹوں سے ان کی دُکان کے سامنے کھڑا دُکان کے سازو سامان اور آرائش کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ خواجہ عطار نے کئی مرتبہ اُس کو نظر انداز کیا مگر پھر آپ کا خیال اُس کی طرف چلا ہی گیا۔ فقیر بھی ٹکٹکی باندھے دُکان کی طرف تک رہا تھا۔ آخر خواجہ صاحب سے نہ رہا گیا اور انھوں نے اس فقیر کو مخاطب کر کے کہا۔

اے خدا کے بندے! تم مسلسل کئی گھنٹوں سے یہاں کھڑے اپنا وقت ضائع کر رہے ہو۔ اگر تمہیں کوئی کام ہے تو بتاؤ کوئی چیز خریدنی ہے تو خریدو نہیں تو اپنا راستہ لو۔"

فقیر نے مسکرا کر خواجہ عطارؒ کی طرف دیکھا اور بولا۔ "تم میری فکر نہ کرو میرا وقت اتنا قیمتی نہیں جتنا تمہارا ہے۔ اس لیے اپنے وقت کو ضائع ہونے سے بچاؤ۔ رہی بات میرے جانے کی تو وہ کوئی مشکل کام نہیں میں ابھی چلا جاتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ فقیر خواجہ عطار کی دُکان کے سامنے ہی لیٹ گیا۔ کچھ دیر تو خواجہ صاحب انتظار کرتے رہے کہ ابھی اُٹھ کھڑا ہوگا مگر جب کافی دیر وہ نہ اُٹھا تو آپ کو تشویش ہوئی۔ آپ نے اُس کو ہلایا جلایا مگر وہ تو راہی عدم ہو چکا تھا۔ اب خواجہ صاحب کو اُس کی باتوں کی سمجھ آئی جن میں معرفت اور ولایت کے راز پنہاں تھے۔ آپ اُس کی گفتگو سے اس قدر متاثر ہوئے کہ اُسی روز کوچۂ تصوف و فقر میں داخل ہوگئے۔

حضرت خواجہ فرید الدین عطارؒ شعبان ۵۱۳ھ میں نیشاپور کے ضلع میں ایک گاؤں کدگن میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد محترم کا نام ابراہیم بن اسحاقؒ تھا۔ آپ کا اصل نام محمد تھا اور لقب فرید الدین تھا۔ آپ کے والد صاحب عطاری کا کاروبار کرتے تھے۔ یہ کاروبار وسیع بنیادوں پر پھیلا ہوا تھا اور عطاری کی نسبت سے خواجہ فرید الدینؒ کے نام کے ساتھ لفظ عطار لگا دیا گیا تھا۔ والد کی وفات کے بعد تمام کاروبار خواجہ عطارؒ نے سنبھالا۔ نیشاپور کے تمام کارخانے آپ ہی کے زیرِ اختیار تھے۔ آپ نے اس کاروبار کی باگ دوڑ سنبھالنے کے

بعد اُس کو اتنی ترقی دی کہ یہ کاروبار سارے نیشاپور میں پھیل گیا۔ تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ خواجہ صاحب کارزار فقر و تصوف میں قدم رکھنے کے بعد بھی اپنے دنیاوی کاروبار میں مشغول رہے مگر ایک فرق یہ ضرور پڑگیا کہ آپ دیگر مصروفیات کے ساتھ عبادت و ریاضت بھی کرتے اور اسرار و عرفان کے حقائق پر کتابیں بھی تحریر فرمانے لگے۔

مجاہدات اور ریاضتیں خواجہ عطار کو ورثے میں ملیں تھیں کیونکہ آپ کے والد محترم ابراہیم بن اسحاقؒ ایک مشہور مجذوب قطب الدین حیدرؒ کے مُرید تھے۔ ان مجذوب کا انتقال ۵۹۷ء میں ہوا۔ ان سے خواجہ عطار کے والد صاحب کو روحانیت کے بڑے بلند مقامات حاصل ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ خواجہ عطار بچپن سے ہی درد آشنا تھے اور آپ کو عبادتِ الٰہی سے غیر معمولی شغف تھا اور اسی شغف کی بدولت آگے چل کر اُس فقیر سے ملاقات ہوئی جس کا ذکر اوپر آیا ہے اور آپ پر معرفت کے دروازے وا ہوگئے۔

خواجہ صاحبؒ اس حکم پر کاربند تھے کہ اسلام رہبانیت کو گوارہ نہیں کرتا۔ اس لیے صوفیہ حضرات کو ان کے مجاہدات اور ریاضتیں مشاغل دنیاوی سے مانع نہیں آتیں۔ خواجہ عطارؒ نے باوجود فقر و تصوف کے عطار خانہ اور مطب کا تعلق قائم رکھا۔ آپ کے متعلق تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ آپ اعلیٰ درجے کے طبیب بھی تھے۔ آپ کا مطب بڑے زور شور کا تھا۔ تقریباً پانچ سو مریض روزانہ آپ کے مطب میں آتے اور آبِ حیات کا جام نوشیدہ نوش کرتے تھے۔

بعض مؤرخین نے یہ بھی لکھا ہے کہ جب آپ کے والد صاحبؒ کے مُرشد قطب الدین حیدرؒ جو کہ مجذوب تھے کا وصال ہوا اُس وقت خواجہ صاحب کا عہدِ طفولیت تھا چنانچہ خواجہ صاحب نے اُس مجذوب سے فیض بھی حاصل کیا اور یہ اُسی فیض کی کارفرمائی ہے کہ اُن کا نام آج روحانیت و عبادت کے حوالوں سے لیا جاتا ہے یوں تو خواجہ فریدالدین عطار نے بہت سے بزرگوں سے ملاقاتیں کیں۔ بہت سے اولیاء کرام کے جوتے سیدھے کئے۔ مگر آپ کی انگلی پکڑکر جو ہستی آپ کو کوئے روحانیت میں لائی اُس کا نام حضرت مجدالدین بغدادی ہے۔ یہ بزرگ روحانیت و ولایت میں یکتا تھے۔ پیشہ یہ بھی طبیب تھے اور شاہ خوارزم کے معالج خاص تھے۔ آپ نے حضرت مجدالدین بغدادی کی خدمت میں ایک طویل عرصہ گزارا۔ سلوک کی تمام منازل طے کیں اسرار و معرفت میں جب آپ کے تمام اسباق مکمل ہوگئے تو آپ کے مُرشدِ عالم نے خصوصی تلطف و مہربانی فرماتے ہوئے آپ کو خرقۂ فقر عطا کرکے مسندِ خلافت پر متمکن ہونے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

حضرت خواجہ عطارؒ نے حضرت موسیٰؑ کے زمانے کا ایک واقعہ بیان فرماتے ہوئے عورت کی ناقص عقلی کے باعث اُس کی مشاورت سے ممانعت کا درس دیا۔ آپ فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ کے زمانے میں ایک کامل ولی ہوا کرتے تھے۔ اُن کی زبان میں خدا نے ایسی تاثیر پنہاں کر رکھی تھی کہ جو دعا بھی مانگتے وہ دربار خداوندی سے اسی وقت مستجاب ہو جاتی تھی۔ ایک مرتبہ حضرت موسیٰؑ کو خدا کی طرف سے کسی علاقے میں کفار سے جنگ کا حکم ملا۔ انھوں نے اپنی افواج کو تیار کیا اور خدا کی راہ میں جہاد کرنے کے لئے نکلے۔ اب جس علاقے میں موسیٰؑ جنگ کرنا تھی اس میں مذکورہ ولی اللہ کی بیوی کے رشتہ دار رہتے تھے، موصوف کی بیوی کو خدشہ ہوا کہ موسیٰؑ کو جنگ میں فتح ہوگئی تو میرے عزیز و اقارب بھی جنگ کی نذر ہو جائیں گے۔ اس خیال سے اُس عورت نے اپنے خاوند جو کہ ولی کامل تھے عرض کی۔

"آپ خدا سے دعا مانگیں کہ حضرت موسیٰؑ کو شکست ہو جائے۔"

ولی اللہ نے یہ سوچے بغیر کہ خدا تعالیٰ کے حکم کی بجا آوری کرنے کے لیے موسیٰ علیہ السلام آ رہے خدا کے حضور یہ دُعا کر دی کہ میرے مولا تُو نے مجھے کبھی مایوس نہیں کیا، آج بھی میری دُعا قبول فرمائے اور موسیٰ علیہ السلام کے لشکر کو شکست دے دے۔ اللہ تعالیٰ کو اپنے ولی کی اس عجیب و غریب دُعا پر بڑا تعجب ہوا۔ لیکن خدا نے اُن کی دُعا اس وجہ سے منظور کر لی کہ اس نے بڑی اُمید سے خدا کے آگے دستِ سوال دراز کیا تھا اگر میں اُس کو نا اُمید کروں گا تو یہ میری عنایات سے مایوس ہو جائے گا اور مایوسی واحد ایسی چیز ہے جو خدا کے ہاں بالکل ناپید ہے ورنہ خدا ہر چیز پر قادر ہے لیکن وہ کسی کو مایوس نہیں کرتا۔ چنانچہ خدا نے اُس ولیٔ بزرگ کی دُعا قبول کر لی اور یوں موسیٰ علیہ السلام کو شکست ہو گئی۔

موسیٰ علیہ السلام بھی خدا کے لاڈلے نبی تھے وہ فوراً دربارِ ایزدی میں حاضر ہوئے اور عرض کی۔
"اے مولا پاک! مجھے خود ہی جنگ کا حکم دیا اور خود ہی شکست دے دی اس میں تیری کون سی مصلحت پوشیدہ ہے؟"

اللہ تعالیٰ نے جواب دیا" اے موسیٰ! بے شک میں نے ہی جنگ کا حکم دیا تھا مگر میرے آگے جب میرے ایک ولی نے دستِ سوال دراز کیا تو میں نہیں چاہتا تھا کہ میں اُس کی دُعا اور خواہش کو رد کروں اس لیے میں نے اُس کی دُعا کو اپنے حکم پر ترجیح دی۔"

موسیٰ علیہ السلام سخت غصّہ میں تھے۔ انھوں نے خدا سے عرض کی" ربّ العزّت! جو تیرا ولی تیرے احکام کو ہی منسوخ کروانے کا خواہاں رہتا ہے۔ جس کو تیری خوشنودی کی بجائے تیرے دشمنوں کی رضا جوئی منظور رہے تو ایسے ولی سے اپنی ولایت اور بزرگی چھین لے۔"

اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی دُعا سُنی' ناراض تو خداوند اس ولی سے پہلے ہی تھا کہ اس شخص نے دوستی کا دعویٰ میرے ساتھ کر رکھا ہے لیکن اپنی بیوی کی خواہش اور تمنّا کو میرے احکام پر فوقیت دے رہا تھا۔ اللہ نے اُس ولیٔ کامل سے ولایت چھین لی۔

اب اُس ولی کو بڑا دُکھ ہوا۔ اُس نے خدا سے بڑی معافیاں مانگیں اور کئی سال ریاضت میں مصروف رہا مگر اُس کو چھینی ہوئی ولایت اور مقامِ ریاضت دوبارہ نہ مل سکا۔ آخر ایک روز خدا کو اس پر ترس آ ہی گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اُسے فرمایا۔

"دیکھو! اب تمہیں ولایت تو واپس نہیں مل سکتی لیکن تم پر اتنی مہربانی ہو سکتی ہے کہ تم مجھ سے تین دُعائیں مانگو میں اُن کو ضرور پوری کروں گا۔"

اللہ کا وہ بندہ جو ولایت تو کھو ہی چکا تھا یہاں بھی اپنی بیوی کے دامِ فریب میں پھنس گیا اور غلطی سے اپنی بیوی کو بتا بیٹھا کہ خدا نے میرے ساتھ تین دعائیں قبول کرنے کا وعدہ کیا ہے۔

اب بیوی نے فوراً پہلے اپنی خواہش منوانے کی کوشش کی اور اپنے خاوند سے کہا۔" تم اللہ سے پہلی بات کرو کہ وہ مجھے دُنیا کی حسین ترین عورت بنا دے۔"

اس شخص نے بیوی کی آرزو اللہ کے حضور میں بیان کر دی۔ اللہ نے اُس عورت کو دُنیا کی حسین ترین عورت بنا دیا۔

اتّفاق کی بات کہ وہاں سے ایک بادشاہ کا گزر ہوا۔ اُس نے اتنی خوبصورت عورت دیکھی تو اُس کے مُنہ میں پانی بھر آیا۔ اُس نے اُس عورت سے کہا۔" تم کیا اس بوڑھے آدمی کے ساتھ رہ رہی ہو تمہیں کسی محل میں

رہ کر راج کرنا چاہیئے۔ اگر چاہو تو میرے ساتھ چلو۔"
اُس عورت نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور اپنے خاوند کو چھوڑ کر اُس بادشاہ کے ساتھ گھوڑے پر سوار ہو کر چلی گئی
اُس سابق ولی اللہ کو بڑا غصہ آیا کہ اُس عورت نے میرے ساتھ کس قدر بے وفائی کی ہے اُس کے پاس خ
کی طرف سے دو مزید دعائیں منظور کرانے کی پیشکش موجود تھی اُس نے اللہ سے عرض کی۔
"خداوندکریم اس بے وفا عورت کو کُتیا بنا دے۔"
حق تعالیٰ نے اُس عورت کو کُتیا بنا دیا۔ اب جب بادشاہ نے دیکھا کہ وہ حسینہ قیامت خیز تو کتیا کی شک
میں تبدیل ہو چکی ہے۔ اُس نے اُس کو مار کر بھگا دیا۔ اب وہ دوبارہ اپنے آدمی کے پاس پہنچ گئی اور س
دن گھر کے باہر دروازے پر بیٹھی رہتی۔ اب گھر میں بچے ماں کو یاد کر کے روتے تو وہ شخص بڑا پریشان
اور بچوں کو روتا ئسن کر وہ کُتیا (عورت) زور سے بھونکتی۔ اس صورتِ حال نے اُس شخص کا جینا حرام کر دیا۔
تنگ آ کر خدا سے اُس شخص نے اپنی تیسری بات یعنی خواہش کا اظہار کر دیا کہ اے خدا اس عورت کو و
ہی عورت بنا دے تاکہ یہ اپنی اولاد کو تو سنبھال سکے۔ اللہ نے وعدہ کے مطابق اُس شخص کی دُعا قبول کر
ہوئے اس عورت کو دوبارہ ویسی عورت بنا دیا۔
خواجہ عطارؒ یہاں یہ بات واضح کرنا چاہتے ہیں کہ عورت کی مکاری اور ناقص العقلی بڑے بڑے او
کو آزمائش میں ڈال دیتی ہے۔ اس لیے عورت کے معاملے میں خدا سے ڈرتے رہنا چاہیئے اور خدا کی پناہ
کرنی چاہیے۔ مذکورہ واقعہ میں اُس خدا کے ولی نے عورت کی ادنیٰ سی خواہش پر پہلے اپنی ولایت برباد
اور اپنی ریاضت کے بدلے خدا کی پیش کش کا عورت کے ہاتھوں بیڑا غرق کروا لیا۔ اگر وہ خدا سے لو لگا ر
اور عورت کے معاملے میں خدا سے پناہ مانگتا تو کم از کم پہلی مرتبہ ناکامی اور بربادی کے بعد دوسری مرتبہ
کو خدا کی درگاہ میں ضرور کامیابی ہوتی لیکن یہ ولایت کے منصب، یہ ریاضت کی مسند اور یہ عبادت کے
صرف اُس کو ملتے ہیں جس کو خدا کی رضا اور خوشنودی حاصل ہوتی ہے۔

☆

ایک مرتبہ کسی نے جگنو سے پوچھا: "تم صرف رات کو چمکتے ہو دن کو کیوں نہیں چمکتے؟"
اس پر جگنو نے جواب دیا: "میں تو دن رات چمکتا ہوں مگر سورج کی روشنی کی وجہ سے دن میں نظر نہ
آتا۔" یہی حال تمام عالم کا ہے کہ خدا کی ہستی کے مقام میں ان کا وجود اہلِ حال کو نظر نہیں آتا۔ بعض جگہ تو
الوجود اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ خدا کے سوا کوئی اور چیز سرے سے موجود ہی نہیں۔ یا یوں کہہ لیجیے کہ
موجود ہے سب خدا ہی ہے۔ آگے چل کر آپ نے فرمایا ہے کہ یہ دنیا ظاہری طور پر دھوئیں کے مانند ہے
وجود آگ کی وجہ سے ہے۔ خود اس کا اپنا کوئی وجود نہیں۔ عام حقیقت کا کھوج لگانے اور وحدت کو سم
بے علم، عقل اور قیل وقال سے دست بردار ہونے کی ضرورت ہے۔ چوں وچرا کو ترک کر کے اور خود
ہو کر ہی انسان حقیقت کا جلوہ دیکھ سکتا ہے۔ قیل وقال عقل کے موافق ہوتی ہے لیکن حقیقت ہماری
سے بالا ہے۔ اس لیے ہمیں ذوقِ وجدان کی تلاش کرنی چاہیے۔ جو عقل وخرد سے بالاتر ہے۔
وحدت الوجود کے مسائل صوفیانہ شاعری کی روح رواں ہیں۔ صوفیانہ شاعری میں جو ذوق وشوق
گداز، جوش وخروش اور زور واثر ہے سب اسی بادہ مرد افگن کا فیض ہے۔ تمام اولیاء اور صوفیاء
پر اس مسئلہ پر اپنی ایک ہی رائے رکھتے ہیں کہ جو کچھ ہے ایک ہی ذات ہے۔ موجوداتِ خارجیہ سب

شئونات ہیں۔

اس مسئلہ پر بعض علماء نے بڑی دقیق اور مشکل دلیلیں دی ہیں جو عام فہم سے بالاتر ہیں۔ اس لیے وہ ہیں جو صوفی شعراء جیسے خواجہ عطار نے بیان کیں وہ واضح، صاف اور شگفتہ انداز میں بیان کی گئیں جن کو ضا کسی کے لیے مشکل نہیں۔

وحدت الوجود کے بارے میں خواجہ عطار اپنی شاعرانہ زبان میں جو طرزِ بیان اختیار کرتے ہیں وہ ب ذیل ہے۔

جہاں از تو پُر و تو در جہاں نہ ہمہ در تو گم و تو درمیان نہ
خموشی تو از گویائی تست نہانی تو از پیدائی تست

خواجہ عطار فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ درِ بخشش ہر وقت کھلا ہے جو چاہے آئے اور اپنے سامانِ آخرت حاصل کرے۔"

اس ضمن میں ایک واقعہ بیان کرتے ہیں" ایک مرتبہ ایک مست، نشہ کے زور میں مسجد میں گھس گیا ر رو رو کر پکارنے لگا کہ اے خداوند مجھ کو بہشت میں لے جا۔"

مؤذن نے جب اُسے دیکھا تو اُس کا گریبان پکڑ کر کہا" او سگِ نجس مسجد میں تیرا کیا کام، تُو نے کون اچھا عمل کیا ہے جس کی بنا پر تمہیں بہشت کا دعویٰ ہے۔"

مست رو پڑا اور بولا "اے مؤذن آپ کو خدا کے لطفِ عمیم سے تعجب معلوم ہوتا ہے کہ ایک گنہگار اس مغفرت کا امیدوار ہو۔ میں نے مغفرت کی خواہش آپ سے تو نہیں کی۔ توبہ کا در تو ہر وقت کھلا ہے خدا دستگیر ہے۔ مجھ کو تو شرم آتی ہے کہ خدا کے عفو کے مقابلے میں اپنے گناہ کو زیادہ سمجھوں۔"

اس واقعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دربار میں کوئی تخصیص نہیں، ہر شخص کو وہاں توبہ استغفار کرنے اور خیر و بخشش مانگنے کی اجازت ہے کیوں کہ خدا رحیم و کریم اور غفور الرحیم ہے اور واقعی ندے کے گناہوں کے مقابلہ میں اُس کی بخشش اور عفو و درگزر کہیں زیادہ ہے۔

آپ فرماتے ہیں" ایک کامل کا قول ہے کہ بولنے اور تقریر کرنے کے لیے بہت عقل اور حکمت درکار ہے لیکن چُپ رہنے کے لیے اس سے بھی کہیں زیادہ عقل درکار ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان انتہائی کمال تک جب پہنچتا ہے تو تب جا کر یہ سمجھتا ہے کہ میں نے کچھ نہیں سمجھا اور اسی بنا پر چُپ ہو جاتا ہے۔ کیفیت اس کے اہلِ علم ہونے کی دلیل ہے۔ کیونکہ انسان کی تکمیل اسی میں نہیں کہ وہ یہ کہے کہ میں مکمل ہو و ہمیشہ مکمل ہونے کی جستجو میں رہے تو یہ بات اُس کے درجات میں بلندی پیدا کرتی ہے۔ تکمیل کر لینے ہو جانے کا دعویٰ تکبّر اور سرکشی کو ظاہر کرتا ہے۔ جب کہ خدا تعالیٰ کو تکبّر و سرکشی بالکل پسند نہیں ہے اور و عجز وہ منازل ہیں جن کو سَر کر لینا انسان کو اوجِ کمال تک پہنچا دیتا ہے جب کہ تکبر و سرکشی انسان ت الثریٰ میں دھکیل دیتے ہیں۔

پروفیسر براؤن' مرزا محمد قزوینی کے حوالے سے خواجہ عطار کی کتاب "مظہر العجائب" کا ذکر کرتے ہوئے یں کہ اس کتاب سے آپ کے انتہائی رجحانات کا پتا چلتا ہے۔ انہی رجحانات کی وجہ سے سمرقند کے ایک

عالم نے خواجہ صاحب پر کفر کا فتویٰ لگا دیا اور اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس نے برقان ترکمان جو خوارزم شاہی امرا میں سے تھا کے رُوبرو خواجہ صاحب پر کفر کا الزام لگا کر انھیں جلا وطن کرنے کا مشورہ بھی دیا۔ خواجہ صاحب نے یہاں سے مکہ معظمہ کا قصد کیا اور کافی عرصہ تک آپ حرم پاک کی سرزمین میں تشریف فرما رہے۔ اپنی کتاب "لسان الغیب" آپ نے مکہ معظمہ میں ہی تصنیف کی۔ اس کتاب میں آپ نے اپنے آپ کو ناصر خسرو سے تشبیہہ دی ہے۔ یعنی جس طرح ناصر خسرو لوگوں کی نظر سے اوجھل ہو کر بدخشاں میں ایک طویل مدت تک عزلت نشین ہوا۔ اسی طرح خواجہ عطار نے بھی مکہ معظمہ میں ایک لمبی مدت تک گوشہ نشینی اختیار کیے رکھی۔

◇

خواجہ فریدالدین عطارؒ کی مولانا رومؒ سے اس زمانے میں ملاقات ہوئی جب مولانا طفل مکتب تھے۔ خواجہ عطار نے مولانا روم کو ہونہار پا کر اُن کی فضیلت کی پیشین گوئی کی اور انھیں دُعا دی۔ اپنی کتاب "اسرار نامہ" کا ایک نسخہ بھی مولانا روم کو تحفے کے طور پر پیش کیا۔ بعض مؤرخین یہ بھی لکھتے ہیں کہ مولانا روم کے والد کے بھی اور دوست بھی تھے۔

تذکرہ نگار خواجہ عطار کے بارے میں لکھتے ہیں کہ انھیں روحانیت سے بڑا لگاؤ تھا۔ اہل اللہ کی تلاش میں آپ نے بے شمار سفر کیے۔ آپ کے مشہور سفر، کوفہ، رے، مصر، دمشق، ہندوستان اور ترکستان شمار کیے جاتے ہیں۔ آپ صرف عارفوں کے حالات کی جستجو نہیں کرتے تھے بلکہ خود بھی معرفت کی منازل طے کرتے جاتے تھے۔ مولانا روم نے آپ کی شان میں کہا ہے کہ

هفت شهر عشق را عطّار گشت
ما هنوز اندر خم یک کوچه ایم
من آں ملدی رومی ام که از نطقم شکر ریزد
ولیکن در سخن گفتن غلام شیخ عطارم

◇

بعض اور مشائخ نے بھی اپنے اشعار میں خواجہ عطار کی فضیلت کا اعتراف کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ دل آپ کی بزرگی کے بے حد قائل تھے۔ اولیاؤں کا یہ خاصہ رہا ہے کہ وہ کسی بھی سچے اور بلند پایہ اولیاء کے متعرف و معتقد رہے ہیں۔ کیونکہ خدا کے نیک بندے حسد جیسے قبیح جذبے سے ہمیشہ عاری رہے ہیں۔ اس لیے جن جن لوگوں نے یعنی صوفیاء و اولیاء نے خواجہ عطارؒ کے متعلق تحریر کیا ہے کھلے دل سے تحریر کیا ہے۔ آپ کے اوصاف اور خصائل کی تعریف کی ہے جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ خواجہ عطار اپنے دور کے ولیٔ کامل تھے اور زہد و رکوع میں بہت زیادہ دسترس رکھتے تھے۔

انبیاء اور اولیاء کو جو غیب کی باتیں معلوم ہوتی ہیں ان کا وقوف مختلف صورتوں میں ہوتا ہے۔ کبھی لکھی سطروں میں کبھی ڈراؤنی آوازوں میں۔ حقائق کائنات ان کو صورت پذیر ہو کر نظر آتے ہیں۔ کبھی خوبصورت شکلیں دکھائی دیتی ہیں جو ان کو مخاطب کر کے غیب کی باتیں بتاتی ہیں۔ ان معاملات میں خواجہ عطار کا ہے: زمانہ قدیم سے لوگ ہر قسم کے خواب کو محض بے تکا اور بے جوڑ تخیل نہیں سمجھتے رہے ہیں بلکہ عقیدہ آرہا ہے کہ بعض اوقات خواب کے گزشتہ یا آئندہ واقعات کا انکشاف براہ راست ہوتا ہے اور بعض گہری نفسی حقیقتوں اور روح کی گہرائیوں کے میلانات اور تاثرات تمثیل کی صورت میں پیش ہوتے ہیں۔

کی زبان حسی اور عقلی ہے لیکن انسان کے باطنِ مکتوم کی زبان تمثیلی ہوتی ہے۔ انسان کا تحت الشعور تمثیل ساز اور صورت گر ہے۔ تحت الشعور کے بہت سے طبقے انسان کی ذاتی کشاکشِ حیات سے تعلق رکھتے ہیں اور یہی کشاکش خواب میں بہروپیوں کی طرح مختلف لباسوں میں متمثل ہوتی ہے لیکن روحِ انسانی کی گہرائیوں کا کون اندازہ ہو سکتا ہے۔ انہی گہرائیوں میں شیاطین بھی ہیں اور ملائکہ بھی اور انہی گہرائیوں میں صفات الٰہیہ کے پرتو اور اسرارِ غیب کے انکشافات بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی نسبت خود فرماتا ہے: "ھوالظاھر ھوالباطن" موجودات کا ظاہر اس کے باطن سے الگ نہیں۔ ہر جگہ باطن کا آئینہ ہے۔ علمائے ظاہر کی نظر ظاہر پر زیادہ پڑتی ہے اور باطن پر کم اس کے برعکس اہلِ باطن صوفیۂ کرام حکمائے حق پسند انبیا علیہم السلام کی نظر سطحوں سے نیچے موجودات و مظاہر کے باطن در باطن پر پڑتی ہے۔"

دل سے تیری نگاہ جگر تک اتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

خواجہ عطار نے اسلامی تاریخ میں تصوف کا جو رنگ پیدا کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ تصوف سیکھنے سکھانے کی چیز نہیں۔ یہ الہامِ ازلی ہے اور یہ جس کے خمیر میں ہے وہ اس سے فائدہ مند ہو سکتا ہے۔ تصوف کے دقیق مسائل کے باوجود خواجہ صاحب کی زبان سادہ اور رواں ہے۔ آپ کے کلام میں کہیں ابہام و پیچیدگی نہیں۔ تشبیہات جو آپ استعمال کرتے ہیں بہت واضح اور شگفتہ ہیں "تصوف کی بنیاد دنیا و مافیہا کی بے قدری اور بے حقیقتی ہے۔ یہ سب کو آنکھوں سے نظر آجاتی ہے۔ اس حالت میں جو دل متاثر اور قابل ہوتے ہیں ان کو خدا سے زیادہ لو لگ جاتی ہے۔ انابت، خضوع، تفرع، رضا بالقضا توکل، جو تصوف کے مقامات ہیں سے اکثر مقامات ایسے ہیں جن سے جذبات کا تعلق ہے مثلاً وحدت، محویت، استغراق اس لیے ان مقامات کے ادا کرنے میں خود بخود کلام میں زور بپا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ رضا کے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ عالم میں خیر و شر، نیک بد، حسن و قبیح، رنج و راحت ہے۔ سب فاعلِ مطلق کے حکم سے ہے۔ اس کے لیے ہم کو چون چرا کا حق، گلا اور شکایت کا موقع نہیں ہے۔ جب حقیقت پرستی کا ذوق دل میں پیدا ہو جاتا ہے تو ہر چیز میں حقیقت کی تلاش ہوتی ہے۔ وہی چیزیں محبوب معلوم ہوتی ہیں جو حقیقی ہوں۔ مثلاً حسن، لذت اور مسرت انسان کے اصل مطلوب ہیں۔ انسان ان چیزوں پر اپنی جان دیتا ہے۔ جن چیزوں کے لیے جدوجہد کرتا ہے جن چیزوں کا شیفتہ ہوتا ہے وہ اس وجہ سے ہوتا ہے کہ ان میں حسن، لذت، مسرت ہے لیکن ان چیزوں میں بھی حقیقت اور مجاز کے مراتب ہیں۔ بچہ کھیل تماشے، جھوٹی اور مصنوعی چیزوں کو پسند کرتا ہے۔ جیسے ذرا بڑا ہوتا ہے اور اس کا مذاق کسی قدر صحیح ہونے لگتا ہے تو پسند کا معیار بھی ترقی کر جاتا ہے اور اب وہ ان چیزوں کو پسند کرتا ہے۔ جن میں فی الجملہ واقعیت اور اصلیت ہوتی ہے۔ جب اس کی عقل و ادراک میں اور زیادہ ترقی ہوتی ہے۔ تو یہ معیار اور ترقی کر جاتا ہے۔ ان مدارج میں جو فرق ہوتا ہے وہ دو چیزوں کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ ایک وہی حقیقت اور مجاز یعنی بچوں اور نوجوانوں کے نزدیک جو چیزیں حسین اور خوش نما ہوتی ہے۔ ان میں حقیقی حسن، حقیقی لذت اور حقیقی خوشنمائی نہیں ہوتی بلکہ عارضی اور ظاہری ہے۔ خواجہ فرید الدین عطار کی طبیعت میں روانی اور فکر میں جولانی تھی، چنانچہ نظم و نثر کی متعدد کتابیں کی یادگار ہیں۔ قاضی نور اللہ اپنے "تذکرے" مجالس المومنین" میں لکھتے ہیں کہ خواجہ عطار کی کتابوں کی

کلامِ مجید کی سورتوں کے برابر ہے، جو تعداد میں ایک سو چودہ ہیں اور اس بیان میں کچھ مبالغہ ہے کیونکہ اُن کی صرف تیس کتابوں کا پتہ چلتا ہے۔ تذکرۃ اولیاء اور منطق الطیر قابلِ ذکر ہیں۔ تذکرۃ اولیاء میں صوفیائے مشائخ کے اخلاق و کردار اور سوانح حیات درج ہیں۔ اسی طرح منطق الطیر۔ یہ ایک تمثیلی مثنوی ہے جو ۴۶۰۰ اشعار پر مشتمل ہے۔ مثنوی کے آغاز میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا، رسول اکرمؐ کی نعت اور صحابہ کرام کی منقبت میں اشعار تحریر کئے گئے ہیں۔ مثنوی میں پینتالیس مقالے ہیں۔ آخر میں ایک خاتمہ ہے۔ مضمون پرندے کے اجتماع سے شروع ہوتا ہے۔ آپ پرندوں کا خیال بیان کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ پرندوں کے خیال میں دنیا میں کوئی ملک بادشاہ کے بغیر خوش حال نہیں رہ سکتا۔ اس لیے پرندے بھی اپنے بادشاہوں کے بغیر زندگی نہیں گزار سکتے۔ اور وہ اپنا بادشاہ سیمرغ کو خیال کرتے ہیں۔ اُس کو تلاش کرنے کے لیے تمام پرندے ہُدہُد کی راہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ ہُدہُد یہ وعدہ کرتا ہے وہ پرندوں کو سیمرغ تک پہنچا دے گا۔ مگر راستے کی سب صعوبتیں برداشت کرنے کے لیے اگر وہ قوّتِ برداشت رکھتے ہیں۔ ان پرندوں میں تیس پرندے ایسے ہوتے جن کی طلب صادق ہوتی ہے۔ ان کو سالک کہا جاتا ہے۔ سالک جو صعوبتیں برداشت کرتے ہیں وہ حقیقت میں عارفوں کی ریاضتیں اور مجاہدے ہیں۔ سالک کی راہِ سلوک میں سات وادیاں ہوتی ہیں پہلی وادی طلب و جستجو ہے۔ جب تک کوئی سالک اپنے اندر طلب پیدا نہ کرے گا وہ کمال کے راستے پر گامزن نہیں ہو سکتا۔ عشق کی منزل سالک کی دوسری منزل ہے۔ اس کے لیے سالک کو منزلِ مقصود سے اتنی وابستگی ہو کہ راہِ طریقت میں بلا اندیشہ چل نکلے اور راستے کی تکلیفوں سے نہ ڈرے۔ معرفت سلوک کی تیسری وادی ہے۔ معرفت ہر سالک کے عقل و خرد کے اندازے کے مطابق ہوتی ہے۔ استغنا چوتھی وادی ہے۔ اس وادی میں سالک کو دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہونا پڑتا ہے۔ جو شخص خواہشاتِ دنیا کا اسیر ہو اس وادی تک نہیں پہنچ سکتا۔ سالک بلند نظر ہوتا ہے اس کی نظر میں دنیا اس نقش کی مانند ہے جو کسی تختی پر بنا کر مٹا دیا جاتا ہے۔ سلوک کی پانچویں وادی توحید کی وادی ہے۔ یہاں پہنچ کر سالک اگر اس مقام کو پہچان لیتا ہے تو اسے کثرت میں وحدت نظر آنے لگتی ہے۔ وہ ہر شے میں اللہ تعالیٰ کا مشاہدہ کرتا ہے "من و تو" کا امتیاز بالکل اٹھ جاتا ہے۔

سلوک کی چھٹی وادی میں سالک بے خودگی اور آوارگی کی حالت میں گھومتا رہتا ہے۔ یہاں جب اس کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ساری معلومات محدود تھیں اور وہ محض لا علم تھا تو وہ مبہوت ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اپنی ہستی سے بھی بیگانہ ہو جاتا ہے۔

ساتواں مقام فنا کا ہے۔ یہاں آکر سالک کی جسمانی خواہش، تکبّر، غرور و خود پرستی سب کچھ زائل ہو جاتا ہے اس لحاظ سے وہ اپنے آپ کو کھو کر عالمِ وحدت کا ایک حصّہ بن جاتا ہے اور اصلِ حق ہو جاتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس فنا سے اُس کو بقا حاصل ہو جاتی ہے۔

یہی سالک کے راستے کی سات منازل ہیں جنہیں خواجہ عطارؒ نے پرندوں کی سات وادیوں اور منزلوں کی صورت میں ظاہر کیا۔ چنانچہ تیس پرندے بھی راستے کی صعوبتیں برداشت کرتے ہوئے بالآخر وادیٔ فنا میں پہنچتے ہیں۔ یہی وادیٔ فنا سیمرغ کی بارگاہ ہے جہاں سیمرغ اور سی مرغ میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ تیس پرندے خود اپنی حقیقت پا لیتے ہیں۔

خواجہ عطار کے قصائد نعت اور زہد و معرفت پر مشتمل موضوعات کو انھوں نے آیاتِ قرآنی سے مؤثر و

مزین کیا ہے۔ قصائد میں دنیا کی ناپائیداری کا ذکر ہے اور انسان کو بیدار ہونے کی تلقین کی گئی ہے۔

خطاب ہاتف دولت رسید دوش بما
کہ ہست عرصہ بی دولتی سرای فنا

آلِ رسولؐ اور اولادِ علیؓ کی فضیلت و بزرگی کے متعلق خواجہ عطارؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی ذریت کو ہمیشہ سرخرو کیا ہے۔ آزمائش، امتحان اور ابتلا اگرچہ انسان کی زندگی سے عبارت میں لیکن آلِ رسولؐ اور اہلِ بیت کی بزرگی اور عظمت میں خدا نے کبھی کمی واقع نہیں ہونے دی۔

حضرت امام باقرؒ کا ایک قصہ خواجہ عطار نے اس طرح بیان کیا کہ ایک بادشاہ نے ایک مرتبہ حضرت امام باقرؒ سے کہا۔

"میں نے سُنا ہے کہ اولادِ علیؓ میں بڑے بڑے نشانہ باز ہوئے ہیں مگر میں نے اُن کی نشانہ بازی اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھی۔"

اُس وقت حضرت باقرؒ عمر رسیدہ ہو چکے تھے۔ پیراں سالی کی وجہ سے اُن کی بینائی بالکل کمزور ہو چکی تھی چنانچہ انھوں نے فرمایا۔ "نشانہ بازی میں تو ہمارے خاندان کا جواب نہیں تھا لیکن اب اس سال خوردگی میں تمہیں کیا مثال پیش کر سکتا ہوں۔"

بادشاہ بضد ہوا کہ آپ اگر واقعی نشانہ باز تھے تو اب بھی تیر چلا کر اپنی صلاحیت کا مظاہرہ کر سکتے ہیں۔ آخر حضرت امام باقرؒ کو بادشاہ کی ضد تسلیم کرنا پڑی آپ نے ایک مخصوص نشان پر دس تیر چلائے ہر تیر پہلے تیر کو پھاڑتا ہوا چلا گیا۔ بادشاہ حیران رہ گیا اور اُس کو اپنی فضول خواہش پر سخت شرمندگی ہوئی۔ خواجہ صاحب نے یہ واقعہ بیان کرنے کی ضرورت اس لیے محسوس کی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ کی اولاد کو ہمیشہ بزرگی، شان اور جلیل القدری سے ہمکنار کیے رکھتا ہے۔

۶۲۷ھ میں نیشاپور میں تاتاریوں کے ہاتھوں جو قتلِ عام ہوا اُس میں آپ بھی شہید کئے گئے۔ راوی یوں قصہ بیان کرتے ہیں کہ تاتاریوں نے پہلے آپ کو گرفتار کیا۔ ابھی وہ آپ کو قتل کا ارادہ کر رہے تھے کہ ایک تاتاری نے دوسرے سے کہا۔

"اس بوڑھے کو مت قتل کرنا اُسے ایک ہزار درہم کے عوض میرے ہاتھ بیچ دو۔"

قاتلوں نے آپ کے قتل کا ارادہ ترک کر کے آپ کو بیچ دینا بہتر خیال کیا مگر خواجہ صاحب نے فروخت کرنے والے سے کہا۔

"مجھے ہزار میں ہرگز نہ بیچنا میری قیمت اس سے کئی گنا زیادہ ہے۔" یہ باتیں ایک اور تاتاری سُن رہا تھا اُس نے کہا۔

"اس بڈھے کا خون بہا ایک توبڑہ گھاس کا تو میں بھی دے سکتا ہوں"

خواجہ صاحب نے قاتلوں سے کہا: "اس گھاس کے توبڑے کے عوض مجھے بیچ دو کیونکہ میری قیمت تو اس سے بھی کم ہے۔"

خواجہ صاحب معرفت کی گفتگو کر رہے تھے جس سے قاتل سخت برافروختہ ہوئے اور آپ کا سر اڑا دیا۔

اس واقع کے مطابق خواجہ عطارؒ ۶۲۷ھ ہجری واصل حق ہوئے اور آپ کو شہادت کی موت نصیب ہوئی آپ کی مشہور کتاب "تذکرۃ الاولیاء" کے توسط سے خواجہ عطارؒ ہمیشہ زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔
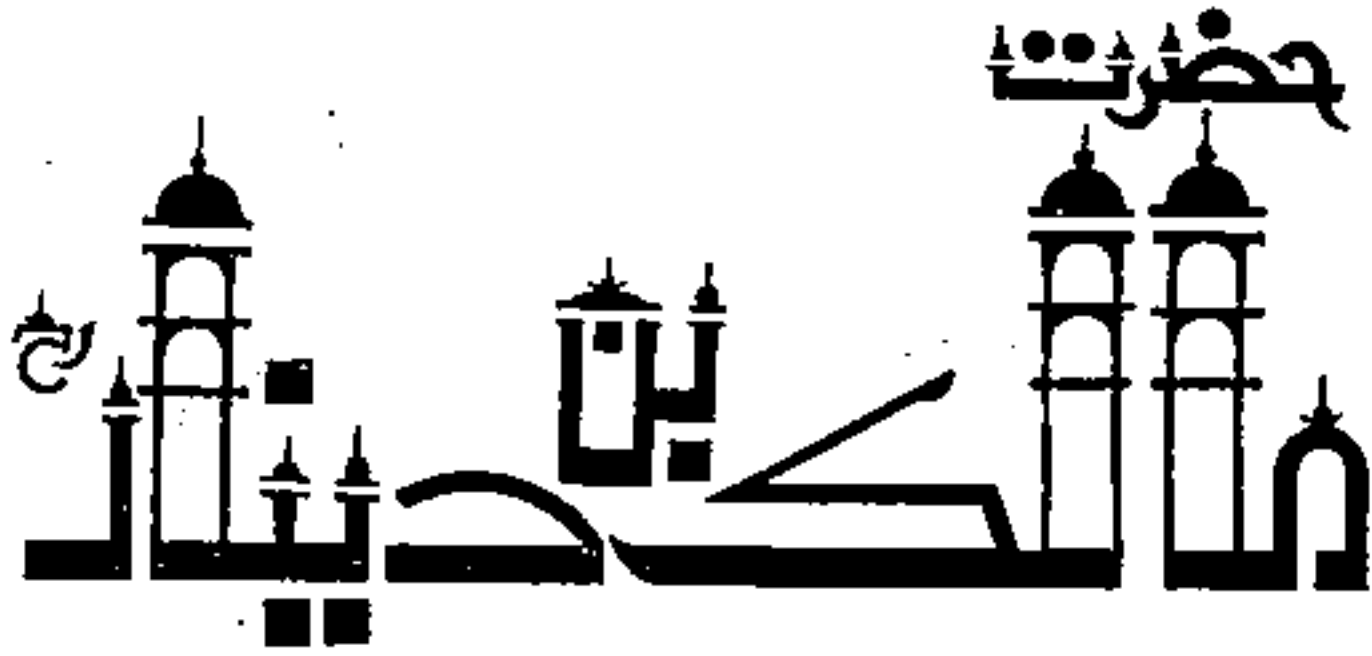
ایک مرتبہ کوئی بزرگ کشتی میں سفر کر رہے تھے۔ جب کشتی عین منجدھار میں پہنچ گئی تو ملاح نے ان بزرگ سے کرایہ طلب کیا۔ بزرگ نے فرمایا کہ میرے پاس تو تمہیں دینے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ اگر ایسی ہی بات تھی تو مجھے کشتی میں سوار کرنے سے پہلے کہہ دیا ہوتا تاکہ میں سفر کے لیے کوئی اور وسیلہ تلاش کر لیتا۔ بزرگ کی بات سُن کر کشتی کا مالک سخت بدتمیزی اور بدکلامی پر اُتر آیا۔ اس نے اللہ کے اس نیک اور عاجز بندے کو اس قدر مارا کہ اس پر غشی طاری ہو گئی۔ کشتی والا کوئی بہت ہی ظالم اور سنگدل انسان معلوم ہوتا تھا۔ اس نے اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ جب بزرگ کی غشی دُور ہوئی تو اس نے بزرگ سے دوبارہ کرایہ طلب کرتے ہوئے کہا کہ اگر تم نے کشتی میں سفر کرنے کا معاوضہ ادا نہ کیا تو میں تمہیں دریا کی طوفانی موجوں کے سپرد کر دوں گا۔ ابھی اس ملّاح نے اپنی بات بھی مکمل نہ کی تھی کہ اچانک کچھ مچھلیاں مُنہ میں ایک ایک دینار دباتے پانی کے اوپر کشتی کے پاس آئیں اور ان بزرگ نے ایک مچھلی کے مُنہ سے دینار لے کر کرایہ ادا کر دیا۔ ادھر ملّاح یہ ساری صورتِ حال دیکھ کر تھر تھر کانپنے لگا اور فوراً آپ کے قدموں میں گر کر معافی طلب کرنے لگا مگر یہ بزرگ کشتی میں سے دریا پر اُتر گئے اور پانی پر چلتے ہوئے نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

اللہ کے اس نیک صاحبِ کرامت بزرگ کا نام حضرت مالک بن دینار تھا۔ آپ کے نام کے ساتھ لفظ "دینار" لگنے کی وجہ تسمیہ بھی یہی تھی۔

حضرت مالک بن دینار خواجہ حسن بصری کے ہمعصر تھے اور ان کا شمار دینی پیشواؤں اور مساکین میں ہوتا تھا۔ آپ کی پیدائش اپنے والد محترم کے دورِ غلامی میں ہوئی۔ اگرچہ ظاہری طور پر آپ غلام زادے ہیں لیکن باطنی طور پر آپ فیوض و برکات کا سرچشمہ ہیں اور آپ کا شمار باعتبار صاحبِ کرامت و صاحب ریاضت میں ہوتا ہے۔

شکل و صورت کے اعتبار سے مالک بن دینار انتہائی حسین و جمیل تھے۔ دمشق میں سکونت پذیر ہونے کی وجہ سے آپ حضرت امیر معاویہؓ کی مسجد میں اعتکاف کیا کرتے تھے۔ ایک روز عبادت کے دوران اچانک آپ کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ کاش کچھ اس قسم کے حالات پیدا ہو جائیں کہ مجھے اس مسجد کا متولی بنا دیا جائے۔ چنانچہ دل میں یہ نیت

رکھ کر آپ نے اس مسجد میں اس قدر نمازیں پڑھیں اور اتنے زیادہ اعتکاف کیے کہ جن کا کسی طور بھی شمار ممکن نہیں مگر اس عبادت و ریاضت کے باوجود مسجد میں آنے والے دوسرے نمازیوں نے کبھی آپ پر توجہ نہ دی۔ آپ مسلسل ایک سال تک اس مسجد میں پوری یکسوئی سے نمازیں پڑھتے رہے۔

ٹھیک ایک سال گزر جانے کے بعد جب آپ مسجد سے باہر برآمد ہوتے تو غیب سے یہ آواز آئی کہ اے مالک بن دینار تجھے اب تائب ہو جانا چاہیئے۔ یہ سنتے ہی آپ کو قلبی طور پر سخت صدمہ ہوا کیونکہ غیب سے ندا آنے کا مقصد یہ تھا کہ آپ مسلسل ایک سال تک خودغرضانہ عبادت میں مصروف رہے تھے جس پر اب آپ بجا طور پر شرمندگی اور ندامت محسوس کر رہے تھے۔

چنانچہ مالک بن دینار کے دل کو یہ بات ایسی لگی کہ انہوں نے ایک رات اپنے قلب کو ہر قسم کی ریا اور خودغرضی کے جذبے سے پاک کر کے خلوصِ نیت سے عبادت کی اور اگلی صبح جب وہ مسجد کے دروازے پر تشریف لاتے تو انہوں نے وہاں ایک بہت بڑے ہجوم کو کھڑے پایا۔ یہ لوگ آپس میں کہہ رہے تھے کہ مسجد کا نظام ٹھیک طریقے پر استوار نہیں ہے۔ اس میں بہت سی بے ضابطگیاں اور بے قاعدگیاں ہیں لہٰذا مناسب ہوگا کہ مسجد کے نظام کو چلانے کے لیے اسی شخص کو متولی بنا دیا جائے جو مسلسل ایک سال سے اس مسجد میں ذکرِ الٰہی میں پوری یکسوئی کے ساتھ مصروف ہے۔

چنانچہ یہ تمام لوگ اکٹھے ہو کر آپ کے پاس پہنچے اور جب آپ نماز سے فارغ ہو چکے تو لوگوں نے عرض کیا کہ ہم باہمی اور متفقہ فیصلے سے آپ کو مسجد کا متولی بنانا چاہتے ہیں۔

یہ سنتے ہی مالک بن دینار نے اللہ تعالیٰ سے عرض کی کہ اے خُدا! میں ایک سال تک محض اس لیے ریاکارانہ اور خودغرضی کی عبادت میں مصروف رہا کہ مجھے مسجد کی تولیت حاصل ہو جاتے مگر ایسا نہ ہوا لیکن اب جبکہ میں صدقِ دل سے تیری عبادت میں مشغول ہو گیا ہوں تو تیرے حکم سے تیرے بندے مجھے اس مسجد کا متولی بنانے آ پہنچے ہیں اور مجھ پر یہ بھاری ذمہ داری ڈالنا چاہتے ہیں لیکن اے خُدا! میں تیری قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اب نہ تو میں تولیت قبول کروں گا اور نہ ہی تیرے اس پاک گھر سے باہر قدم رکھوں گا۔" یہ عہد کرنے کے بعد آپ دوبارہ عبادت و ریاضت میں مصروف ہو گئے۔

بحیثیت ایک انسان کے حضرت مالک بن دینار کو اپنی کمزوریوں، خامیوں اور کوتاہیوں کا بھی پورا احساس تھا۔ آپ کے بارے میں کوئی شخص اچھا یا بُرا جو کچھ بھی کہتا آپ اسے انتہائی صبر و تحمل سے سُنتے اور کئی کئی روز تک اس بات کو عقل کی کسوٹی پر رکھ کر پرکھتے۔ مثلاً ایک مرتبہ جب کسی عورت نے آپ کو ریاکار کے نام سے آواز دی تو حضرت مالک بن دینار نے فرمایا کہ کسی نے بیس سال سے مجھے میرے اصلی نام سے نہیں پکارا تھا لیکن اے خاتون! آفرین ہے تجھ پر کہ تُو نے مجھے پہچان لیا کہ میں کون ہوں۔ پھر آپ نے فرمایا کہ جب میں نے مخلوق کو اچھی طرح سے پہچان لیا تو مجھے اس کی قطعاً خواہش نہ رہی کہ کوئی مجھے بد کہے یا نیک کہے کیونکہ میں نے ہر اچھا کہنے والے یا بُرا کہنے والے کو مبالغہ آرائی کرتے ہوتے پایا ہے۔ لہٰذا لوگ مجھے نیک کہیں یا بد کہیں میں روزِ حشر کسی سے بدلہ نہیں لوں گا۔

خودشناسی کے ساتھ ساتھ آپ میں لوگوں کو پرکھنے اور ان کے باطن کو بھی سمجھنے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود تھی مثلاً ایک مرتبہ حضرت مالک بن دینار کسی مریض کی مزاج پرسی کے لیے تشریف لے گئے۔ وہاں پہنچ کر جب آپ نے دیکھا کہ مریض قریب المرگ ہے اور زندگی کے آخری سانس گن رہا ہے تو آپ نے اُسے کلمہ پڑھنے کی تلقین فرمائی لیکن جب وہ کلمہ پڑھنے کے بجائے بار بار "دس اور گیارہ" کہتا رہا تو آپ نے اس کا سبب دریافت کیا۔ آپ نے جب ایک مرتبہ پھر کلمہ پڑھنے کے لیے کہا تو مریض نے نقاہت کے عالم میں بتایا کہ جب وہ کلمہ پڑھنے کی کوشش کرتا

ہے تو اُس کے سامنے آگ کا پہاڑ آجاتا ہے اور آگ کے شعلے اُس کی جانب لپکتے ہیں۔ حضرت مالک بن دینار نے مریض کے پاس کھڑے دُوسرے لوگوں سے پُوچھا کیا یہ شخص سُود کا کاروبار کرتا ہے۔ لوگوں نے کہا۔ اعلیٰ حضرت یہ تو بالکل سچ ہے لیکن آپ نے کیسے جانا؟ اس پر حضرت مالک بن دینار نے فرمایا کہ جس شخص کو دمِ آخر دشواری نظر آئے تو سمجھ لو کہ وہ کم تولنے والا اور سُود کھانے والوں میں سے تھا۔

بعض اوقات سیدھے سادے انداز میں آپ اس قدر گہری اور معرفت کی بات کہہ جاتے تھے کہ آپ کے معتقدین اور اہلِ مجلس ورطۂ حیرت میں پڑ جایا کرتے تھے۔ روایت ہے کہ ایک مرتبہ بصرہ شہر میں کسی مقام پر آگ لگ گئی اور خلقِ خُدا چیخ و پکار کرنے لگی۔ حضرت مالک بن دینار جب اپنا عصا لے کر چھت پر چڑھے تو لوگوں کو بہت زیادہ مصیبت میں دیکھا۔ کچھ تو آگ میں جل رہے تھے اور کچھ کُود کر باہر نکلنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ اسی طرح بعض افراد آگ میں سے اپنا مال و اسباب نکالنے کی فکر میں تھے۔ یہ دیکھ کر آپ نے فرمایا کہ ہلکے پُھلکے لوگ تو نجات پا گئے مگر بھاری بھر کم لوگ ہلاک کر دیئے گئے اور روزِ محشر بھی یہی منظر دیکھنے کو ملے گا۔

حضرت مالک بن دینار کا نظریہ یہ تھا کہ نفس کے خلاف جہاد کرنا انسان کے لیے سب سے زیادہ مشکل ہے اور جو شخص نفس پر قابو پانے پر قادر ہے تو سمجھ لو کہ اُس نے اپنی آخرت کے لیے بہتر سامان کر لیا۔ روایت ہے کہ آپ نے بصرہ میں چالیس سالہ قیام کے دوران کبھی ایک کھجور بھی نہیں کھائی تھی۔ آپ لوگوں سے فرمایا کرتے تھے کہ کھجور نہ کھا سے نہ تو میرا پیٹ کم ہو گیا ہے اور نہ ہی تمہارا پیٹ بڑھ گیا ہے۔ لیکن چالیس سال بعد ایک مرتبہ جب آپ کے د میں کھجور کھانے کی خواہش شدت اختیار کر گئی تو آپ نے نفس سے فرمایا کہ میں تمہاری اس خواہش کی تکمیل کبھی بھی کر پاؤں گا۔ لیکن جب آپ کو خواب کی حالت میں غیب سے کھجور کھانے کا اشارہ ہوا اور یہ فرمایا گیا کہ نفس پر سے ختم کر دو تب آپ نے بیداری کے بعد اپنے نفس سے کہا کہ میں اس شرط پر تمہاری یہ خواہش پوری کروں گا کہ تم سات روز تک مسلسل روزے رکھتا ہوں گے۔ چنانچہ روایت ہے کہ مالک بن دینار نے نفس کشی کی نیت سے ایک کے لیے روزے رکھے۔ اس کے بعد آپ نے بازار سے کچھ کھجوریں خریدیں اور مسجد تشریف لے گئے۔ ابھی آپ کھج کھانے کا ارادہ ہی فرما رہے تھے کہ ایک لڑکے نے اپنے باپ کو آواز دے کر کہا کہ "بابا مسجد میں کوئی یہودی و گیا ہے۔ لڑکے کا باپ یہ سُنتے ہی ڈنڈا لے کر مسجد کی طرف دوڑا لیکن آپ کو شناخت کر کے انتہائی معذرت خو اور کہنے لگا" اعلیٰ حضرت! بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے محلّے میں دن کے وقت ماسوائے یہودیوں کے کوئی کچھ کھاتا اور سب لوگ روزہ رکھتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ لڑکے کو آپ کے یہودی ہونے کا شُبہ ہوا۔ لہٰذا میں سے التجا کرتا ہوں کہ آپ اس کی خطا معاف فرما دیں۔" اس آدمی کی بات سُن کر آپ نے عالمِ جوش میں فرمایا کہ غیبی زبان ہوتی ہے وہ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتے۔ پھر مالک بن دینار نے اللہ تعالیٰ سے مخاطب ہوتے ہو "اے دو جہانوں کے مالک تُو نے مجھے بغیر کھجور کھاتے ہی یہودیوں میں شامل کر دیا اور اگر میں کہیں بھولے سے لیتا تو کون جانتا ہے کہ میرا انجام کفار سے بھی بُرا اور بدتر ہوتا۔" چنانچہ اس کے بعد حضرت مالک بن دینار کبھی چھُونے کی خواہش بھی نہ کی۔

آپ لوگوں کو ہمیشہ نیکوں اور پرہیزگاروں کی صحبت میں بیٹھنے کی تلقین کیا کرتے تھے۔ ایک روز آپ نے سے فرمایا کہ جس شخص سے قیامت کے روز کوئی فائدہ حاصل نہ ہو اس کی صحبت میں بیٹھنا فضول ہے۔ دنی ایک خوبصورت دھوکہ ہے جو کہ بڑے بڑے عالموں اور دین داروں کو بھی فریب و مکر سے اپنا تابع بنا لی آپ نے مزید فرمایا کہ جو شخص لغو باتیں زیادہ اور عبادت کم کرتا ہے اس کا علم قلیل قلب اندھا اور عمر

ہے کیونکہ میرے نزدیک اخلاص سے بہتر کوئی دُوسرا عمل نہیں ہے۔

حضرت مالک بن دینار کے بارے میں کسی بزرگ نے خواب میں دیکھا کہ آپ کو اور حضرت محمد واسع کو بہشت کی جانب لے جایا جا رہا ہے۔ اس بزرگ کے دل میں خیال آیا کہ دیکھیں بھلا مالک بن دینار جنّت میں پہلے پہنچتے ہیں یا محمد واسع۔ چنانچہ یہ دیکھ کر مالک بن دینار کو محمد واسع سے پہلے جنّت میں داخل کیا گیا ہے۔ بزرگ نے ملائکہ سے دریافت کیا کہ محمد واسع تو مالک بن دینار سے زیادہ عامل و کامل تھے۔ مگر اس کے باوجود مالک بن دینار کو جنّت میں اُن سے پہلے داخل کیا گیا آخر اس کی کیا منطق ہے۔ اس پر ملائکہ نے بزرگ کو جواب دیا کہ تم صحیح کہتے ہو لیکن تمہیں شاید یہ علم نہیں کہ محمد واسع کے پاس پہننے کے لیے دو لباس تھے جبکہ مالک بن دینار کے پاس صرف ایک لباس تھا لہٰذا اسی لیے مالک بن دینار کو بہشت میں پہلے داخل کیا گیا ہے کیونکہ اُن میں محمد واسع کی نسبت صبر و ضبط اور قناعت پسندی کا جذبہ زیادہ ہے۔

سادہ اور درویشانہ زندگی بسر کرنا آپ کا خاصا تھا۔ پُر تکلف پکوانوں کے بجائے آپ رُوکھی سُوکھی روٹی کھا کر روزہ افطار کیا کرتے تھے لیکن ایک مرتبہ بیماری کے باعث جب آپ کو گوشت کھانے کی خواہش ہوئی تو آپ نے بازار جا کر کچھ گوشت خریدا اور گھر کی جانب روانہ ہو گئے مگر قصاب کے جی میں نہ جانے کیا آئی کہ اس نے ایک شخص اس غرض سے پیچھے بھیجا کہ جا کر دیکھو وہ گوشت کا کیا کرتے ہیں۔ ادھر مالک بن دینار نے کچھ دُور چل کر گوشت کو سُونگھا اور پھر فرمایا کہ اے نفس سونگھنے سے زیادہ تیرا حصّہ نہیں اور یہ کہہ کر انہوں نے وہ گوشت ایک فقیر کو دے دیا۔ حضرت مالک بن دینار نے ایک بار پھر نفس کو مخاطب کرتے ہوتے کہا "اے نفس مَیں تجھے کسی معاندت کی وجہ سے اذیت نہیں دیتا بلکہ تجھ کو صبر کا مقام دلوانے کے لیے ایسا کرتا ہوں تاکہ اس کے بدلے میں تمہیں لازوال نعمت حاصل ہو جاتے۔

حضرت مالک بن دینار نے ایک مرتبہ حاضرینِ محفل سے فرمایا "یہ مثل میرے لیے ناقابلِ فہم ہے کہ جو شخص چالیس دن تک گوشت نہیں کھاتا اس کی عقل کمزور پڑ جاتی ہے جبکہ میں نے بیس سال تک گوشت نہیں چکھا لیکن اس کے باوجود میری عقل میں کمی آنے کے بجائے اس میں کچھ اضافہ ہی ہوا ہے۔

روایت ہے کہ ایک مرتبہ شدید بیماری کے بعد جب آپ صحت یاب ہوتے تو کسی ضرورت کے تحت انتہائی مشکل سے گرتے پڑتے بازار تشریف لے گئے۔ حُسنِ اتفاق سے اس وقت سامنے سے بادشاہ سلامت کی سواری آ رہی تھی۔ سواری کو راستہ دلوانے کے لیے پہریداروں نے لوگوں کو اِدھر اُدھر ہٹانے کے لیے ایک شور بلند کیا۔ حضرت مالک بن دینار اس قدر کمزوری محسوس کر رہے تھے کہ انہیں راستے سے ہٹنے میں تھوڑی سی تاخیر ہو گئی۔ چنانچہ ایک پہریدار نے آپ کو اس زور سے کوڑا مارا کہ تکلیف کی حالت میں آپ کے مُنہ سے اس پہریدار کے بارے میں یہ کلمہ نکل گیا کہ خُدا تیرے ہاتھ کٹوا دیتے جائیں۔ کرنا خدُا کا کیا ہوا کہ چند ہی روز بعد کسی جُرم کی پاداش میں اس پہریدار کے ہاتھ کٹوا دیتے گئے۔ تاہم آپ کو اس کی یہ حالت دیکھ کر انتہائی قلق ہوا اور آپ نے دل میں کہا کہ کاش کرب کی حالت میں میرے مُنہ سے پہریدار کے بارے میں بُرا کلمہ نہ نکلا ہوتا۔

آپ دُنیا داری سے ہمیشہ دُور رہتے تھے۔ یہاں کی رنگینیوں اور دلکشیوں کو دیکھ کر مالک بن دینار پر ایک قسم کا خوف طاری ہو جایا کرتا تھا۔ منقول ہے کہ بصرہ میں کوئی امیر آدمی انتقال کر گیا اور اس کی وسیع جائداد اور مال و دولت کی وارث اس کی اکلوتی لڑکی ٹھہری جو کہ انتہائی خوبصورت اور قیامت خیز شخصیت کی مالک تھی۔ ایک دن اس لڑکی نے حضرت ثاقب نبانی کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا کہ وہ نکاح کرنا چاہتی ہے۔

"تم کس سے نکاح کرنے کی آرزومند ہو؟" حضرت ثابت نبانی نے پوچھا۔ اس پر لڑکی نے جواب دیا "میری خواہش ہے کہ مالک بن دینار سے میرا نکاح ہو جاتے کیونکہ وہ پرہیزگار، دین دار اور ذکرِ الٰہی میں مصروف رہنے والے انسان ہیں۔ میں اُن سے اس لیے شادی کرنا چاہتی ہوں تاکہ دینی کاموں میں وہ میری معاونت کر سکیں۔

چنانچہ حضرت ثابت نبانی نے اُس لڑکی کا پیغام مالک بن دینار تک پہنچا دیا جس پر آپ نے فرمایا کہ میں تو دُنیا کو طلاق دے چکا ہوں اور چونکہ عورت کا شمار بھی دُنیا میں ہوتا ہے اس لیے طلاق شدہ عورت سے نکاح جائز نہیں ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اگر نظرِ کرم ہو جاتے تو بڑے بڑے گنہگار اور پاپ کرنے والے بھی نیکوکار اور پرہیزگار بن جاتے ہیں۔ روایت ہے کہ ایک بدمعاش قسم کا نوجوان حضرت مالک بن دینار کے پڑوس میں رہتا تھا اور شرفا اس نوجوان کے ہاتھوں خاصے پریشان تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ لوگوں نے آپ سے اس کے مظالم کی شکایت کی۔ مگر آپ نے جب اُس نوجوان کے پاس جا کر اُسے نصیحت کی تو وہ آپ کے ساتھ خاصی گستاخی سے پیش آتے ہوئے بولا کہ میں حکومت کا آدمی ہوں اور کسی کو میرے کاموں میں دخل دینے کی قطعی ضرورت نہیں ہے کیونکہ میں اپنے اچھے بُرے فعل کا خود ذمّہ دار ہوں۔ حضرت مالک بن دینار نے جب اس سے فرمایا کہ میں بادشاہ سے تیری شکایت کروں گا تو اُس نے جواب دیا کہ بادشاہ بہت رحمدل اور نرم مزاج ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ میرے خلاف کسی کی بات سُننا گوارا نہیں کرے گا۔

"اگر بادشاہ نے تمہارے خلاف شکایت نہ سُنی تو میں اللہ تعالیٰ سے تیری شکایت کروں گا۔" مالک بن دینار نے کہا۔

اس پر نوجوان نے فخریہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا کہ اللہ تعالیٰ تو بادشاہ سے بھی زیادہ رحیم و کریم ہے۔"

نوجوان کی یہ بات سُن کر مالک بن دینار واپس لوٹ آتے لیکن چند ہی روز بعد جب لوگوں نے دوبارہ اس نوجوان کے مظالم کی شکایت کی تو آپ پھر اُس نوجوان کو نصیحت کرنے تشریف لے گئے لیکن اتنے میں غیب سے ندا آئی کہ "میرے دوست کو پریشان مت کرو۔"

غیب کی یہ ندا سُن کر حضرت مالک بن دینار حیرت زدہ رہ گئے اور انہوں نے اس نوجوان سے جا کر کہا کہ میں اس غیبی آواز کے متعلق تجھ سے پوچھنے آیا ہوں جو کہ میں نے راستے میں سُنی ہے۔ نوجوان یہ سُن کر خود بھی حیرت زدہ رہ گیا اور پھر ایک مصمم ارادے کے ساتھ پُرعزم انداز میں کہنے لگا کہ اگر یہ بات ہے تو میں اپنی تمام دولت خدا کی راہ میں قربان کرتا ہوں۔ چنانچہ کچھ ہی دن بعد وہ نوجوان اپنا پورا اثاثہ خیرات کر کے نامعلوم سمت کی جانب روانہ ہو گیا۔ پھر ایک مرتبہ مالک بن دینار جب مکہ معظمہ پہنچے تو انہوں نے اُس نوجوان کو وہاں انتہائی کمزور اور قریب المرگ حالت میں دیکھا جو اس وقت سجدے میں پڑا کہہ رہا تھا "خُدا نے مجھ کو اپنا دوست فرمایا ہے اس لیے میں بھی اس کے احکام پر اپنا تن من دھن سب کچھ قربان کروں گا اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس کی رضا اور خوشنودی صرف عبادت سے ہی حاصل ہوتی ہے اور آج سے میں کوئی بھی ایسا کام کرنے سے سچی توبہ کرتا ہوں۔ جو اُس کی تسلیم کے خلاف ہو گا۔ پھر حضرت مالک بن دینار نے دیکھا کہ اتنا کہنے کے بعد وہ نوجوان اُسی وقت اپنے مالک حقیقی سے جا ملا۔

حضرت مالک بن دینار کے بارے میں ایک واقعہ مشہور ہے کہ کسی ملحد سے آپ کا مناظرہ ہو گیا۔ آپ بھی اپنے موقف کو حق سچ سے تعبیر کرتے رہے اور ملحد بھی اپنے موقف کو درست ثابت کرنے پر تُلا رہا۔

یہ صورتِ حال دیکھ کر لوگوں نے فیصلہ کیا کہ آپ کے اور اُس ملحد کے ہاتھوں کو آگ میں ڈالا جائے لہذا جس کے ہاتھ آگ سے محفوظ رہیں گے اس کو حق سچ پر تصور کیا جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ دونوں میں سے کسی کے ہاتھ کو بھی کوئی نقصان نہ پہنچا۔ اس پر طے یہ پایا کہ ملحد اور مالک بن دینار دونوں ہی حق سچ پر ہیں۔ مگر آپ اس صورتِ حال سے بہت افسردہ ہوئے اور اللہ تعالیٰ سے عرض کرنے لگے کہ اے باری تعالیٰ میں نے پورے ستر سال تیری عبادت و ریاضت میں گزار دیئے مگر تُو نے مجھے ایک ملحد کے برابر قرار دیا۔ اس پر غیب سے آواز آئی کہ اے مالک! تمہارے ہاتھ کی وجہ سے ایک ملحد کا ہاتھ جلنے سے بچ گیا ہے کیا تمہیں اس کی خوشی نہیں ہے۔ اگر وہ تنہا اپنا ہاتھ آگ میں ڈال دیتا تو یقیناً وہ جل جاتا۔

حضرت مالک بن دینار کی تعلیمات اور فرمودات آج کے دور میں بھی بسنے والے انسانوں کے لیے مشعل راہ ہیں۔ آپ ہمہ وقت عبادت میں مصروف رہتے تھے اور ہر لمحے آپ پر خوفِ خدا طاری رہتا۔ آپ جب بھی اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِین قرآت کرتے تو مضطرب و بے قرار ہوکر رونے لگتے تھے۔ کسی نے جب آپ سے اس کا سبب پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اے اللہ میں تیری عبادت کرتا ہوں اور تجھ سے ہی مانگتا ہوں لیکن مجھے رونا اس بات پر آتا ہے کہ ہمارے اعمال اس قرآنی آیت کے بالکل برعکس ہیں۔ ہم خدا سے مدد مانگنے کے بجائے اپنے نفس کے پجاری ہو چکے ہیں اور رحمتِ خداوندی کو چھوڑ کر دوسروں سے مدد و اعانت طلب کرتے ہیں۔

◇

حضرت مالک بن دینار قہرِ الٰہی سے اس قدر خوفزدہ رہتے تھے کہ آپ رات کو زیادہ اطمینان کے ساتھ سو بھی نہ پاتے تھے۔ ایک روز آپ کی صاحبزادی نے کہا کہ آپ تھوڑی دیر آرام فرما لیا کریں تو بہتر ہے۔ اس پر آپ نے فرمایا "اے دُخترِ نیک! میرے نزدیک زیادہ سکون کے ساتھ نہ سونے کی دو وجوہات ہیں۔ اوّل یہ کہ میں قہرِ الٰہی سے ڈرتا ہوں اور دوم مجھے یہ اندیشہ رہتا ہے مبادا مجھے سوتا دیکھ کر سعادت کی دولت واپس لوٹ جائے۔ آپ کی عظمت و برتری کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ اس قدر عبادت و ریاضت کے باوجود آپ خود کو ایک خطاکار بندہ تصور کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ نے حاضرینِ محفل سے فرمایا کہ اگر مسجد کے دروازے پر کوئی یہ صدا لگائے کہ تمام لوگوں میں کمتر اور بدتر کون ہے تو اسے مجھ سے بدتر اور کوئی نہیں ملے گا۔"

بلاشبہ یہی عاجزی اور انکساری ہی اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کی پہچان ہوتی ہے۔ حضرت مالک بن دینار کی تمام زندگی بھی ایسی ہی صفات سے عبارت ہے۔ زندگی کے آخری لمحات میں جب کسی نے آپ سے عرض کیا کہ پیرومرشد کوئی وصیت فرمائیں تو آپ نے فرمایا کہ تقدیرِ الٰہی پر راضی رہ تاکہ روزِ حشر تمہیں عذاب سے نجات مل سکے۔ حضرت مالک بن دینار اللہ کی اُن برگزیدہ ہستیوں میں سے ایک تھے جنہوں نے اپنی ساری زندگی یادِ الٰہی اور مخلوقِ خدا کی بہتری میں صرف کردی۔

جوؤں کا مکمل خاتمہ — مکمل حفاظت کیساتھ

جوئیں جلد کے ساتھ چپک کر خون چوستی رہتی ہیں۔

ایڈن روک لائس شیمپو

ان جوؤں کو بے جان بنا دیتا ہے اور جب شیمپو کرنے کے بعد آپ کنگھی کرتے ہیں تو کنگھی کے ساتھ تمام جوئیں نکل آتی ہیں۔

بال چمکدار، گھنے خشکی سے پاک اور جاندار نظر آتے ہیں۔

ایڈن روک لائس شیمپو

میں کوئی ایسا کیمیکل شامل نہیں جو بالوں کو نقصان دے بلکہ اس میں جڑی بوٹیوں کے Extract شامل ہیں

Eden Roc LICE shampoo

ایڈن روک لائس شیمپو

شیمپو کی تمام خوبیوں کے ساتھ

لائس شیمپو کے ساتھ بچوں کیلئے خوبصورت اسٹیکر کا تحفہ مفت

Admen
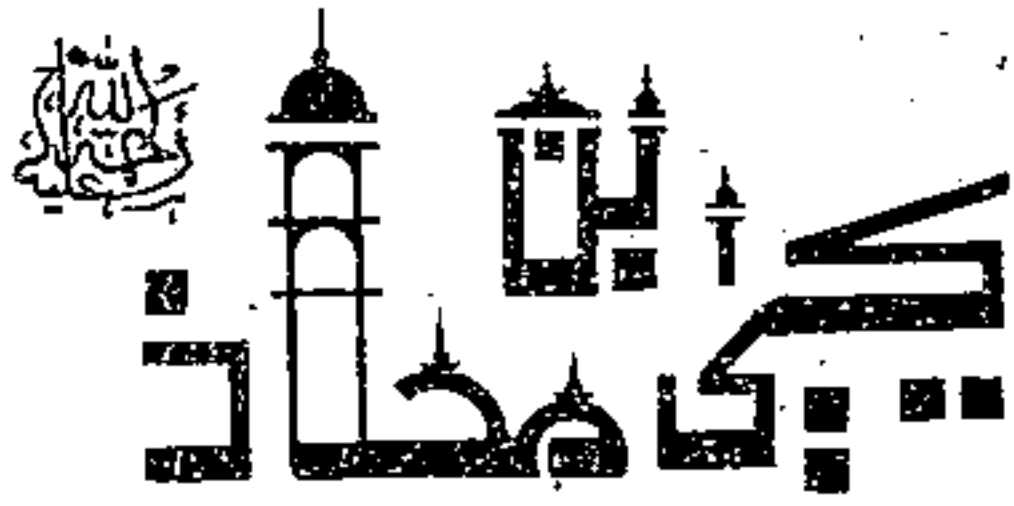
بعض عظیم روحانی ہستیوں کے بقول اس دُنیا میں صرف دو ہی یحییٰ ہوتے ہیں۔ ایک حضرت یحییٰ بن ذکریا علیہ الصلوٰۃ والسلام اور دوسرے یحییٰ بن معاذ۔ فرق صرف اتنا ہے کہ حضرت یحییٰ کو تو خوف کی منازل طے کرنے کا شرف حاصل ہوا جبکہ یحییٰ بن معاذ نے رجا کی جادہ پیمائی میں مقام حاصل کیا۔

خلفائے راشدین کے علاوہ آپ ہی کو برسرِ منبر وعظ گوئی کی اوّلیت حاصل ہوئی۔ تاریخی کتب کے حوالے سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کے ایک بھائی مکہ معظمہ میں بطور مجاور مقیم تھے اور انہوں نے وہاں سے ایک خط کے ذریعے یہ تحریر کیا کہ انہیں تین چیزوں کی آرزو تھی۔ اوّل یہ کہ کسی متبرک مقام پر مستقل قیام کا موقع مل جائے اور دوسرا یہ کہ میری خدمت کے لیے ایک خادم بھی ہو۔ لہٰذا میری یہ دونوں خواہشیں تو پوری ہو گئیں۔ اب میری تیسری اور آخری خواہش یہ ہے کہ مرنے سے قبل مجھے آپ سے شرفِ ملاقات ہو جائے۔ آپ کے بھائی نے اپنے خط میں آپ کو لکھا "خُدا سے دعا فرمائیں کہ میری یہ آرزو پوری ہو جائے۔" اپنے بھائی کے اس خط کے جواب میں یحییٰ بن معاذ نے تحریر فرمایا۔

"انسان کو بذاتِ خود متبرک ہونا چاہیے تاکہ اس کی برکت سے قیام کی جگہ بھی متبرک ہو جائے۔ دُوسرے یہ کہ آپ کو تو خادم بننا چاہیے نہ کہ مخدوم۔ سوم یہ کہ اگر آپ خدا کی یاد سے غافل نہ ہوتے تو میں آپ کو ہرگز یاد نہ آتا لیکن آثار بتا رہے ہیں کہ آپ کے عشقِ حقیقی اور یادِ الٰہی میں کہیں کوئی کمی رہ گئی ہے جس کے باعث آپ کو اپنے عزیز رشتہ دار اور دوست احباب یاد آ رہے ہیں جبکہ انسان کو یادِ الٰہی میں بہن بھائیوں اور بیوی بچوں کو بھی فراموش کرنا پڑتا ہے کیونکہ وصالِ خداوندی کے بعد بندہ خود بخود سب کو بھول جاتا ہے اور اگر آپ خُدا ہی کو نہ پا سکے تو پھر مجھ سے ملاقات کرنا بے سُود ہوگا۔"

اللہ کے برگزیدہ بندوں کی یہ شان ہوتی ہے کہ وہ عشقِ الٰہی میں دُنیا کی تمام رنگینوں جھمیلوں عزیز رشتہ داروں حتّٰی کہ اپنی اولاد تک کو بھلا دیتے ہیں۔ تب ہی انہیں تصوف و معرفت کی منزل ملتی ہے۔ حضرت یحییٰ بن معاذ کا قول ہے کہ صوفیوں کے لیے بیم اور رجا یہ دونوں چیزیں بہت ضروری ہیں۔ اس کے دل میں اللہ کا خوف بھی ہو لیکن ساتھ ہی وہ پُرامید بھی رہے۔

حضرت یحییٰ بن معاذ کے بعض نظریاتی مخالفین نے یہ دلیل پیش کی کہ جو شخص خدا سے ڈرتا ہے وہ اُمید کیونکر رکھ سکتا ہے مگر آپ نے پوری زندگی اس پر کاربند رہ کر ثابت کر دیا کہ یہ کوئی اتنا مشکل اور کٹھن کام نہیں ہے۔ آپ کے خوف کا یہ عالم ہوتا تھا کہ ایک مرتبہ جب آپ کے گھر کا چراغ بجھ گیا تو آپ محض اس خیال سے روتے رہے کہ کہیں توحیدِ خدا کی شمع بھی غفلت کے جھونکوں سے نہ بجھ جائے۔

یحییٰ بن معاذ طہران کے جنوب مشرق میں واقع ایک شہر "رے" میں پیدا ہوئے۔ ابھی تک تاریخ اس سلسلے میں خاموش ہے کہ آپ نے تصوف و معرفت کی تربیت کس سے حاصل کی مگر آپ کو شہرت ایسی حاصل ہوئی کہ بایزید بسطامی ایسی عظیم روحانی ہستیاں بھی آپ کی انتہائی عزت و تکریم کیا کرتی تھیں۔ "رے" میں کافی عرصہ گزارنے کے بعد یحییٰ بن معاذ نے بلخ کا رُخ کیا۔ اور اس شہر کو آپ نے اپنی عبادات و ریاضت کے لیے پسند فرمایا۔

جب یحییٰ بن معاذ بلخ تشریف لے جا رہے تھے تو شہر بسطام میں عارضی قیام کے دوران آپ کی ملاقات بایزید بسطامی سے ہو گئی۔ بایزید نے یحییٰ سے پوچھا کہ آپ کون ہیں جس پر انہوں نے جواب دیا "یحییٰ بن معاذ رازی"

اس پر بایزید فرمانے لگے تمہاری شکل و صورت مجھے کچھ شناسا سی لگتی ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے پہلے بھی تمہیں کہیں دیکھا ہے۔

بایزید بسطامی کا یہ مشفقانہ انداز دیکھ کر یحییٰ بن معاذ کو بہت روحانی خوشی ہوئی اور انہوں نے بایزید سے دریافت فرمایا "کیا میں آپ کے پاس رہ سکتا ہوں؟" بایزید نے کہا۔ میں تو خود یہی چاہتا تھا اور کافی عرصہ سے تمہارا انتظار کر رہا تھا۔

چنانچہ یحییٰ بن معاذ مستقل طور پر بایزید کے پاس ہی رہنے لگے۔ اس دوران یحییٰ کا یہ اصول رہا کہ وہ بایزید بسطامی کے معمولاتِ زندگی کا بغور مشاہدہ کرتے اور پھر اُن پر عمل پیرا ہونے کی کوشش بھی کرتے۔

ایک دن یحییٰ بن معاذ حسبِ معمول بایزید کے پاس بیٹھے اُن کی تعلیمات سے مستفید ہو رہے تھے کہ اچانک بایزید نے آپ سے سوال کیا "یحییٰ میرے پاس رہ کر تمہیں کچھ حاصل بھی ہوا ہے یا یوں ہی بیکار وقت گزرنے کا احساس ہو رہا ہے۔

یحییٰ بن معاذ نے جواب دیا "اعلیٰ حضرت! آپ کی نظرِ التفات کے بغیر مجھے بھلا کیا حاصل ہو سکتا ہے لیکن اگر آپ مجھے کچھ عطا کرنا چاہیں تو یہ میری خوش بختی ہو گی"۔ بایزید نے کہا "دراصل میں خود بھی یہی چاہتا ہوں کہ تم اپنی پوری توجہ میری جانب مرکوز رکھو"

چنانچہ اس روز کے بعد یحییٰ بن معاذ نے بایزید بسطامی کے معمولاتِ زندگی پر پوری توجہ مرکوز کر دی اور اُن کے ہر فعل کا بغور جائزہ لینے لگے۔ بایزید بسطامی جب مراقبے میں مشغول ہوتے تھے تو ان کی حالت دیدنی ہوتی تھی۔ آپ عشاء کی نماز کے بعد پنجوں کے بل ایڑیاں اُٹھا کر کھڑے ہو جاتے تھے اور پھر جب صبح کا اُجالا پھیلنے لگتا تو دیوار یا کسی درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتے۔ اس کے بعد دوبارہ سجدے میں چلے جاتے جو خاصا دراز ہوتا تھا۔ سجدے سے سر اُٹھانے کے بعد آپ طویل دُعا مانگتے تھے۔

ایک روز بایزید بسطامی طویل سجدے کے بعد دُعا مانگ رہے تھے کہ "اے اللہ تجھ سے ایک قوم نے تجھ کو طلب کیا۔ تُو نے اس کی دُعا قبول کی۔ اس کو پانی پر چلنا، ہوا میں اُڑنا، زمین کو طے کرنا اور ماہیت کو بدل دینا بطورِ کرامت سکھایا اور وہ اس پر راضی بھی ہو گئی لہٰذا میں ان تمام باتوں سے پناہ مانگتا ہوں۔

ابھی آپ دُعا مانگ ہی رہے تھے کہ آپ کی نظر یحییٰ بن معاذ پر پڑ گئی۔ آپ نے اُن سے پوچھا "تم کون ہو؟"

یحییٰ نے جواب دیا "میں آپ کے در کا درباری ہوں، یحییٰ بن معاذ"

بایزید نے پھر سوال کیا "تم یہاں کب سے کھڑے ہو؟"

"میں یہاں بہت دیر سے کھڑا ہوں"۔ یحییٰ بن معاذ نے جواب دیا۔
آپ کا جواب سُن کر بایزید بسطامی تو خاموش ہو گئے مگر یحییٰ بن معاذ نے سلسلہ کلام جاری رکھا اور بایزید سے دریافت کیا کہ اعلیٰ حضرت یہ آپ نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے۔ کیا مجھے اپنی اس کیفیت کے بارے میں کچھ بتانا پسند فرمائیں گے۔" میں اکثر سوچتا ہوں کہ آپ اتنی دیر مراقبے کی حالت میں اور پھر سجدے میں کیوں پڑے رہتے ہیں۔ بایزید بسطامی کچھ دیر خاموش رہے اور پھر فرمانے لگے۔
سنو یحییٰ! مراقبہ کے دوران مجھے قدرت نے آسمانوں کی سیر کراتی ہے۔ پھر غیب سے مجھے آواز آتی "بتا تجھے کون سی شے پسند ہے تاکہ وہی تیرے حوالے کر دی جاتے۔" میں نے جواب میں کہا "اے میرے خُدا تیری قدرت دیکھ کر میں حیران ہوں کہ تجھ سے کیا شے مانگوں"۔ میرے اس سوال پر غیب کی طرف سے مجھے مطلع کیا گیا کہ تو اللہ کے محبوب اور پیارے بندوں میں شامل ہے۔ اور تو جس طرح صدقِ دل سے اللہ کی عبادت کرتا ہے اُسے قدرت نے بہت پسند کیا ہے۔"
بایزید بسطامی نے یحییٰ بن معاذ کو مراقبے کے دوران کی ساری کیفیت بتا کر کہا کہ آسمانوں کی سیر اور غیب سے آنے والی آواز نے مجھے رشک میں مبتلا کر دیا ہے۔"
روایت ہے کہ بایزید کی یہ باتیں سُن کر یحییٰ بن معاذ کی حالت غیر ہو گئی۔ وہ چند روز مزید وہاں رہے اور پھر نیشاپور چلے گئے۔ جہاں پر آپ لوگوں کے دلوں میں گھر کر گئے کیونکہ لوگ آپ کے پاس اپنے جن مشکل سے مشکل مسائل کے حل کی تلاش میں آتے آپ کمالِ مہارت سے انہیں اُن کے مسائل کا حل بتا دیا کرتے تھے مگر کچھ لوگوں کو آپ کی لیاقت اور ذہانت پر تھوڑا سا شبہ ہوا حالانکہ وہ آپ کے مریدوں میں شامل ہو چکے تھے۔ ایک دن وہ لوگ آپس میں کہنے لگے "پیر و مُرشد دورانِ گفتگو ایسی باتیں کر جاتے ہیں کہ شاید انہیں ان کی معنویت کا خود بھی احساس نہ ہو۔ ایک نے پوچھا "مثلاً کون سی بات؟" اس پر دوسرے نے جواب دیا "مثلاً یہ کہ پیر و مُرشد اکثر بیم و رجا کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ بیم کے معنی ہیں خوف اور رجا کے معنی اُمید کے ہیں۔ ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ جب یہ دونوں لفظ مناجات میں استعمال کرتے ہیں تو اِن سے اُن کا کیا مطلب ہوتا ہے؟
اس موقع پر ایک اور شخص بولا "پیر و مُرشد ایک روز کہہ رہے تھے کہ میں خُدا سے بیم و رجا کا تعلق رکھتا ہوں۔ معلوم نہیں کہ اِس سے ان کا کیا مطلب تھا۔"
آخر کار طے یہ پایا کہ یہی سوال پیر و مُرشد سے براہِ راست کیا جاتے۔ چنانچہ ان لوگوں نے یحییٰ بن معاذ کے پاس جا کر عرض کیا کہ اعلیٰ حضرت ہم آپ سے ایک سوال کا جواب حاصل کرنے آتے ہیں۔
آپ نے فرمایا پھر یہ تامل کس لیے کیا جا رہا ہے جو پوچھنا چاہتے ہو پوچھ ڈالو۔ آپ کی جانب سے اجازت ملنے کے باوجود کسی میں سوال کرنے کی ہمت نہ تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اُن کی قوتِ گویائی سلب ہو گئی ہو۔ جب یہ لوگ بدستور خاموش رہے تو یحییٰ بن معاذ نے عاجز آ کر کہا۔ یہ بیم و رجا کس لیے؟ جو کچھ کہنا چاہتے صاف صاف کہہ ڈالو۔
اس پر ایک آدمی ہمت کر کے بولا "پیر و مرشد ہم آپ سے یہ جاننا چاہتے ہیں کہ جب آپ خدا کو مخاطب کرتے ہیں تو بیم و رجا کی بات کیوں کرتے ہو؟ آخر اس سے آپ کی کیا مُراد ہے؟
حضرت یحییٰ بن معاذ نے مسکراتے ہوتے جواب دیا "اس میں دشوار بات کون سی ہے؟ کسی نے عرض کیا "حضرت آپ جس بات کو آسان سمجھ رہے ہیں وہ ہمارے لیے بہت دشوار ہے۔" اس شخص کے سوال کے جواب میں آپ نے فرمایا۔
"دیکھو یہ کتنی سیدھی سی بات ہے کہ یہ دونوں چیزیں اسلام کے ارکان میں شامل ہیں اور جو شخص ان کو نظرانداز کرتا ہے وہ کبھی اپنے ایمان کو مستحکم نہیں رکھ سکتا۔ یاد رکھو کہ جس کے دل میں خوف ہو گا اس کے دل میں ہی حداتی کا غم ہو گا۔ اور یوں جب وہ عبادت کرے گا تو اُس کے دل میں رجا پیدا ہو جاتے گا اور وہ ہمیشہ پُرامید رہے گا کہ اللہ تعالیٰ کے حضور اُس کی عبادت قبول

ہو گی اور وہ وصل سے ہمکنار ہو گا۔ بس تم یہ سمجھ لو کہ عبادت کی تکمیل اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ بیم و رجا اس میں شامل نہ ہوں۔" آپ کی اس وضاحت سے سوال کرنے والے مطمئن ہو گئے اور اب مزید کسی وضاحت کی ضرورت نہ رہی تھی۔

حضرت یحییٰ بن معاذ دوسروں کی مشکلات اور پریشانیوں کو حل کرنے میں اس قدر دلچسپی لیتے تھے کہ اُن کی وجہ سے کئی کئی دِنوں تک آپ خود پریشانیوں میں مبتلا رہتے تھے مگر کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہ لاتے تھے۔ آپ ایک لاکھ درہم کے محض اس لیے مقروض ہو گئے کہ حاجیوں، نمازیوں، فقرا، صوفیا اور علما وغیرہ کو دوسروں سے قرض لے کر دیا کرتے تھے۔ چنانچہ جب قرضہ دینے والوں نے تقاضا شروع کیا تو آپ کو جمعہ کی شب خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی۔ آپ فرما رہے تھے "اے یحییٰ رنجیدہ نہ ہو، تیرے لیے حکم ہے کہ تُو ہر شہر میں جا کر وعظ کر اور میں ایک شخص کو حکم دے دوں گا کہ وہ تجھے تین لاکھ درہم دے دے۔"

چنانچہ یحییٰ بن معاذ نے سب سے پہلے نیشاپور میں پہنچ کر فرمایا "میں خدا کے نبی کے حکم پر شہر در شہر وعظ گوئی کے لیے نکلا ہوں کیونکہ میں ایک لاکھ درہم کا مقروض ہو چکا ہوں اور حضور نے فرمایا ہے کہ ایک شخص تیرا قرض ادا کر دے گا۔"

یحییٰ بن معاذ کی یہ بات سُن کر ایک شخص نے پچاسی ہزار درہم، دوسرے نے چالیس ہزار درہم اور تیسرے نے دس ہزار درہم کی پیش کش کی لیکن آپ نے فرمایا کہ مختلف لوگوں سے مجھے قرض کی ادائیگی منظور نہیں کیونکہ مجھے تو حکم یہ ملا ہے کہ صرف ایک شخص میرا قرض ادا کرے گا۔ اس کے بعد آپ نے ایسے متاثر انداز میں وعظ فرمایا کہ مجلس میں موجود سات افراد پر غشی طاری ہو گئی۔

پھر وہاں سے آپ بلخ پہنچے اور تونگری کے فضائل کچھ اس انداز میں بیان فرماتے کہ ایک ہی شخص نے آپ کو ایک لاکھ درہم کا نذرانہ پیش کر دیا لیکن ایک بزرگ نے فرمایا کہ درویشی کے مقابلہ میں تونگری کی فضیلت بیان کرنا آپ کی شان کے منافی ہے۔ چنانچہ بلخ سے روانگی کے بعد راستہ میں ڈاکوؤں نے آپ سے ساری رقم چھین لی۔ اس وقت آپ کو خیال آیا کہ یہ حادثہ انہی بزرگ کے قول کی وجہ سے پیش آیا ہے۔ پھر جب آخر میں یحییٰ بن معاذ ملک ہری پہنچے تو آپ نے وہاں پر بھی اپنا خواب بیان کیا۔ چنانچہ وعظ کے دوران حاکم ہری کی لڑکی نے بیان کیا کہ اس دن مجھے بھی حضورِ اکرمؐ نے آپ کے قرض کی ادائیگی کا حکم دیا تھا اور جب میں نے عرض کیا کہ اگر حکم ہو تو خود وہاں جا کر ان کا قرض ادا کر دوں تو حضورؐ نے فرمایا کہ وہ خود یہاں آتے گا۔ لہٰذا میری آپ سے استدعا ہے کہ صرف چار یوم تک آپ یہاں پر وعظ فرمائیں۔ چنانچہ آپ کے مواعظ کا ایسا اثر ہوا کہ چار یوم میں ۱۴۵ افراد آپ کا وعظ سُن کر بے ہوش ہو گئے۔ پھر جب یحییٰ بن معاذ وہاں سے رخصت ہونے لگے تو اس امیر زادی نے ہزاروں دینار اور ساڑھے اونٹ آپ کے ساتھ کر دیئے۔

وطن واپس پہنچ کر آپ نے اپنے بیٹے کو ہدایت کی کہ تمام قرض کی ادائیگی کے بعد جو رقم بچ جائے اس کو فقرا میں تقسیم کر دو کیونکہ میرے لیے خُدا کی ذات ہی کافی ہے۔

حضرت یحییٰ بن معاذ ایک پاکباز انسان تھے۔ معاشرتی بُرائیوں اور بے حیائیوں سے آپ کوسوں دُور رہتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ نے اپنے ایک ارادت مند کو لکھا کہ میں کافی دنوں سے اس مسئلے پر سوچ بچار کر رہا ہوں کہ مجھے امرا خواتین اور درویشوں کو کس نظر سے دیکھنا چاہیے۔ اپنے خط میں آپ نے مزید لکھا۔ خواتین سے میری مراد عورت ہے۔ وہ عورت جو مرد کی کمزوری ہے اور مرد اس سے ہمیشہ ایک جیسی امید رکھتا ہے۔ آپ نے مزید لکھا کہ اس دور میں عورت کو شہوت کی نظروں سے اور درویش کو غرور و تکبر کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے لیکن میں نے ایک عرصہ کے غور و خوض کے بعد سوچ کے اس انداز میں تبدیلی کر دی ہے۔ میں امرا کو حسد کے بجائے عبرت و نصیحت کی نظر سے دیکھتا ہوں۔ عورت کو شہوت کے بجائے شفقت کی نظروں سے دیکھتا ہوں اور درویشوں میں انہیں غرور اور تکبر کے بجائے تواضع کی نگاہوں سے دیکھتا ہوں۔ یاد رکھو میں نے تجھے جو کچھ بھی لکھا ہے یہ محض

نظاروں کا ہی ذکر نہیں بلکہ دانشمندی کی تین علامتیں ہیں صرف ایسے لوگوں کے لیے جن کو اللہ نے عقلِ سلیم عطا فرمائی ہو اور جن میں کچھ جاننے اور سمجھنے کی جستجو ہو۔

آپ اپنی مناجات اس طرح سے شروع کرتے تھے کہ اے اللہ! اگرچہ میں بہت معصیت کار ہوں مگر پھر بھی تم سے مغفرت کی اُمید رکھتا ہوں کیونکہ میں سرتاپا معصیت اور تو مجسم عفو ہے۔ اے اللہ تو نے فرعون کے خدائی دعوے پر بھی حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کو نرمی کا حکم دیا۔ لہٰذا جب تو اَنَا رَبُّکُمُ الاَعلیٰ کہنے والے پر کرم فرما سکتا ہے جو بندے سُبحَانَ رَبِّیَ الاَعلیٰ کہتے ہیں اُن پر بھلا تیرے لطف و کرم کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ اے اللہ میری ملکیت ایک کمبل کے سوا اور کچھ نہیں لیکن اگر یہ بھی کوئی طلب کرے تو میں اسے دینے پر تیار ہوں۔ اے اللہ تیرا ارشاد ہے کہ نیکی کرنے والوں کو ان کی نیکی کی بدولت بہتر صلہ دیا جاتا ہے اور میں تجھ پر ایمان رکھتا ہوں جس سے افضل دُنیا میں کوئی نیکی نہیں ہے لہٰذا اس کے صلہ میں تو مجھے اپنے دیدار سے نواز دے۔ آپ اکثر فرماتے کہ اے اللہ جس طرح تو کسی سے مشابہ نہیں اسی طرح تیرے امور بھی دوسروں سے غیر مشابہ ہیں اور جب یہ دستور ہو کہ طالب اپنے مطلوب کو راحتیں پہنچاتا ہے تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ تو اپنے بندوں کو عذاب میں مبتلا کر دے گا اس لیے کہ تجھ سے زیادہ محبوب رکھنے والا اور بھلا کون ہو سکتا ہے۔ ایک مرتبہ آپ نے دعا کی "اے باری تعالیٰ چونکہ تو گناہ بخشنے والا ہے اور میں گناہگار ہوں اس لیے تجھ سے طالبِ مغفرت ہوں۔ لہٰذا میں تیری غفاری اور اپنی کمزوری کی بنا پر ارتکاب معصیت کرتا ہوں اس لیے مجھے اپنی غفاری یا میری کمزوری کے پیشِ نظر بخش دے۔

ایک دن آپ بازار میں سے گزر رہے تھے کہ ایک جگہ آپ کو لوگوں کا بہت بڑا ہجوم نظر آیا۔ جب قریب پہنچے تو ہجوم کے اندر آپ کو ایک شخص زار و قطار روتا ہوا نظر آیا۔ آپ نے وہاں پر موجود لوگوں سے دریافت فرمایا کہ یہ شخص کیوں رو رہا ہے۔

ہجوم میں ایک بداخلاق اور مسخری طبیعت کا آدمی بھی موجود تھا اس نے آپ کو طنزیہ لہجے میں کہا۔ واہ میاں جی! رونے والے شخص سے تو آپ پوچھ نہیں رہے اور لوگوں سے کہہ رہے ہیں کہ اسے کیا ہوا ہے۔" حضرت یحییٰ بن معاذ نے فرمایا "میں نے کسی ایک شخص سے یہ سوال نہیں کیا بلکہ ہجوم میں موجود تمام لوگوں سے پوچھا ہے کہ وہ یہاں کس لیے مجمع لگائے ہوئے ہیں۔ اگر تمہیں کچھ معلوم نہیں تو یہاں پر کیوں کھڑے ہو؟"

اس پر دوسرے شخص نے پھر کہا "ہمیں کچھ معلوم نہیں آپ خود اس شخص سے دریافت کریں۔

چنانچہ آپ نے رونے والے شخص سے براہِ راست دریافت فرمایا کہ اے شریف انسان تیری آواز میں یہ دُکھ درد اور کرب کیسا ہے۔ کیا تو ہمیں بتائے گا کہ کیوں روئے جا رہا ہے؟" رونے والا شخص چند لمحوں سے خاموش ہو کر ٹکٹکی باندھے آپ کی طرف دیکھتا رہا اور پھر بولا۔

"یحییٰ بن معاذ تم اس ہجوم میں واحد شخص ہو جو دل کی گہرائیوں سے میرے دل کی کسک سمجھتے ہو۔ بات یہ ہے کہ میں اپنے گھر سے ایک دینار لے کر چلا تھا جس سے مجھے بعض ضروری چیزیں خریدنا تھیں۔ تم یہ بھی جانتے ہو کہ دینار کے وزن کا ایک معیار مقرر ہے مگر جب میں نے تمام اشیاء خرید کر وہ دینار دکاندار کو دیا تو اس نے دینار کا وزن کر لیا جو مقررہ وزن سے کم تھا لہٰذا اس نے مجھے دینار واپس کر دیا اور اپنی چیزیں واپس لے لیں۔ بس اسی بات پر مجھے رونا آ رہا ہے۔

وہاں پر ہجوم میں شامل تمام لوگ بھی بڑے غور سے اس آدمی کی باتیں سن رہے تھے مگر اس وقت تو ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب آپ بھی اس شخص کے ساتھ رونے لگے۔ چنانچہ لوگوں نے یک نہ شد دو شد کا تماشا دیکھا تو وہ فلک شگاف قہقہے لگانے لگے۔

ہجوم میں ایک بوڑھا شخص بھی موجود تھا جس نے یحییٰ بن معاذ کی طرف دیکھا تو سختی سے ہجوم کو ڈانٹ دیا اور کہا لوگو!

یہ تم پاگلوں کی طرح کیوں ہنس رہے ہو۔ اپنے ہوش و حواس قابو میں رکھو"۔ مگر لوگوں کی طرف سے ہنسی مذاق کا سلسلہ بدستور جاری رہا۔ بوڑھے نے جب لوگوں کو دوبارہ ہنسی سے منع کیا تو ایک شخص تنگ کر بولا "ہم کیوں ہنسنا بند کریں جب یہ دو آدمی خواہ مخواہ رو رہے ہیں۔ تو کیا ایسے میں ہمیں ہنسنے کی اجازت بھی نہیں ہے؟"

پھر وہ بوڑھا شخص بولا "اگر بات یہ ہے تو میں آپ کے سامنے ان دونوں آدمیوں سے رونے کا سبب معلوم کرتا ہوں"۔

چنانچہ عمر رسیدہ شخص نے حضرت یحییٰ بن معاذ سے دریافت کیا کہ حضرت آخر آپ کے رونے کا سبب کیا ہے۔ اگر دینار کے وزن میں تھوڑی بہت کمی ہو گئی ہے تو اس میں رونے والی کون سی بات ہے۔

اس بزرگ کی بات سن کر یحییٰ بن معاذ نے جواب میں فرمایا "اس اجنبی نے ہمیں جو کچھ بتایا ہے اس میں ہمارے لیے عبرت کا سامان ہے۔ بزرگ آدمی نے پھر کہا کہ براہ مہربانی آپ اپنے جواب کی ذرا مزید وضاحت کر دیں کیونکہ ہم ابھی تک ٹھیک سے آپ کی بات سمجھ نہیں پائے۔

آپ نے جواب دیا۔ بزرگوار یہ رمز کی باتیں ہیں۔ اگر باتیں اثر کر گئیں تو گویا ہم اپنے مقصد میں کامیاب و کامران ہو جائیں گے۔ بزرگ نے اصرار کرتے ہوئے کہا کہ اب آپ ہمیں جو کچھ بتائیں گے ہم بحیثیت ایک راسخ العقیدہ مسلمان اس کو صحیح معنوں میں دوسروں تک پہنچائیں گے۔

حضرت یحییٰ بن معاذ نے کہا "میں نے اس شخص سے جب رونے کی وجہ دریافت کی تو اس نے مجھے بتایا کہ وہ گھر سے سونے کا جو دینار لے کر چلا تھا بازار میں پہنچتے اس کی قیمت کم ہو گئی اور وہ چل نہ سکا یعنی مطلب یہ ہوا کہ گھر کی بات بازار تک آتے آتے بے اعتبار ہو گئی۔ اس میں سوچنے والی بات یہ ہے کہ ہمارے سارے اعمال اور اس دنیا کی ساری باتیں قیامت کے روز اگر اسی طرح بے اعتبار ہو گئیں تو ہمارا پھر کیا انجام کار ہو گا۔ بس یہی بات سوچ کر میری آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے تھے۔

یحییٰ بن معاذ کی بات سے مطمئن ہو کر بزرگ نے پھر اس شخص سے رونے کا سبب پوچھا جس کے دینار کا وزن کم ہو گیا تھا۔ اس نے جواب دیا "میرے رونے کی وجہ یہی ہے کہ یحییٰ بن معاذ روشن ضمیر انسان ہیں"۔

اب بزرگ کی سمجھ میں ساری بات آ چکی تھی۔ اس نے لوگوں سے کہا "تم نے ان دونوں کا جواب سن لیا۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ تم بھی سب مل کر رونا شروع کر دو کیونکہ تم اپنی آخرت سے غافل ہو چکے ہو۔" اب تو مجمع پر ایک خوف سا طاری ہو چکا تھا۔ بہت سے لوگوں کی آنکھوں میں نمی آ چکی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یحییٰ بن معاذ کی باتوں نے ان پر گہرا اثر چھوڑا ہے۔

اس موقع پر یحییٰ بن معاذ نے لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا "اے خدا کے بندو یقین جانو تم میں سے جو شخص اللہ تعالیٰ کو جان لے گا اس پر کبھی عذاب نہیں آتے گا اور جو خدا شناسی میں ناکام رہے گا تو سمجھ لو کہ اس پر جہنم کے دروازے کھول دیئے جائیں گے۔ اب تم ہی بتاؤ لوگو کہ میں اس سے کیونکر غافل ہو جاؤں جو مجھ سے ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہیں ہوتا۔ میں جانتا ہوں کہ جس نے اپنے معبود حقیقی کو پہچان لیا وہ خود دوزخ کی آگ کے لیے ایک عذاب بن جائے گا لیکن جس نے اللہ تعالیٰ کو پہچاننے میں کوتاہی کی دوزخ کی آگ اس کا مقدر بن جائے گی"۔ کہتے ہیں کہ یحییٰ بن معاذ کی اس ایمان افروز تقریر نے سارے مجمع کو رلا کر رکھ دیا اور سب کی آنکھوں سے اشکوں کا سیلاب بہہ نکلا اور اس وقت مجمع میں جتنے بھی لوگ موجود تھے بیشتر آپ کے وعظ کی وجہ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نیکی کی طرف لوٹ آئے۔

ایک مرتبہ کسی نے عرض کیا کہ موت کے مقابلے میں دنیا کی ایک حبہ سے زیادہ قدر نہیں۔ اس کے جواب میں یحییٰ بن معاذ نے فرمایا کہ اگر موت کا وجود نہ ہوتا تو دنیا کی اور بھی زیادہ بے قدری ہوتی کیونکہ موت کی مثال ایک پل جیسی ہے جو ایک حبیب کو دوسرے حبیب سے ملا دیتی ہے۔

کسی نے آپ کے سامنے پڑھا آمنّا بِرَبّ العالمین۔ اس کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ جب ایک لمحہ کا ایمان دو سو سال کی معصیتوں کو ختم کر دیتا ہے تو پھر ستر سال کا ایمان ستر سال کی معصیت کو کس طرح ختم کر سکتا ہے۔ ایک اور موقع پر آپ نے فرمایا کہ روزِ حشر جب اللہ تعالیٰ مجھ سے سوال کرے گا کہ تیری کیا تمنا ہے تو میں عرض کروں گا کہ مجھے جہنم میں بھیج کر دوسروں کے لیے جہنم کی آگ سرد کر دی جاتے جیسا کہ باری تعالیٰ کا یہ قول ہے کہ مومن کا نور آگ کے شعلوں کو سرد کر دیتا ہے۔

یوں تو ہر ولی اللہ کے مریدوں اور ارادت مندوں کا ایک وسیع حلقہ ہوتا ہے مگر یحییٰ بن معاذ کی خانقاہ میں ان کے ارادت مندوں کے علاوہ لوگوں کی اتنی کثیر تعداد موجود ہوتی تھی کہ جس سے آپ کے ہم عصروں کو خاصی حیرت ہوتی تھی۔ دراصل آپ اس قدر دلنشیں انداز میں وعظ فرماتے تھے کہ سننے والوں پر ایک عجیب قسم کا سحر طاری ہو جاتا تھا۔ آپ کے سننے والوں میں عالم فاضل، غنی درویش، امیر غریب، شاہ و گدا سبھی قسم کے لوگ شامل ہوتے تھے۔

ایک روز نمازِ فجر کے بعد آپ نے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوتے کہا "میرے پاس اقوال بھی ہیں اور افعال بھی شامل ہیں اسی لیے تم لوگ میری باتیں پوری توجہ اور انہماک سے سنتے ہو مگر میرے افعال پر تمہاری نظر نہیں پڑتی۔ اس لیے میں یہ چاہتا ہوں کہ تم میرے افعال پر بھی نگاہ رکھو کیونکہ جو شخص اپنے پیر کے افعال سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا وہ اس کے اقوال سے بھی کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے گا۔

پھر آپ نے لوگوں سے کہا کیا تمہیں معلوم ہے کہ بھوک کیا ہے؟ حاضرین میں سے ایک شخص نے انتہائی سادگی سے جواب دیا "پیر و مرشد بھوک تو محض بھوک ہے۔ اس کے علاوہ ہم اور کچھ نہیں جانتے"۔ اس پر آپ نے فرمایا۔ بھوک کا دوسرا نام نور ہے اور سیری نار ہے۔ خواہش ایندھن ہے جو کہ جلانے کے کام آتا ہے اور یہ آگ جب تک اپنے مالک کو نہ جلا دے کسی طور بھی سرد نہیں پڑتی۔

اسی مجلس میں کسی نے آپ سے پوچھا کہ حضرت یہ صوف کیا ہے اور جو لوگ صوف پہنتے ہیں وہ کیسے لوگ ہوتے ہیں؟ آپ نے فرمایا "صوف اون ہے اور اس کا پہننے والا صوفی ہوتا ہے لیکن آج کے نفسانفسی کے دور میں صوف پہننا محض ایک دوکانداری بن چکا ہے کیونکہ نفس کو شکست دیتے بغیر صوف پہن لینا جہالت کے مترادف ہے۔ اسی طرح زہد کی باتیں کرنا بھی محض پیشہ وری ہے۔ لوگو یہ بات ہمیشہ اپنے ذہن میں رکھو، ولی کی خالص نشانی یہ ہے کہ وہ منافقت اور ریاکاری سے ہمیشہ دور رہتا ہے۔

حضرت یحییٰ بن معاذ کی ساری زندگی راہِ حق سے بھٹکے ہوتے انسانوں کے لیے ایک مشعلِ راہ ہے۔ آپ کی شخصیت یکتائے زمانہ تھی۔ قوتِ وعظ گوئی میں آپ کا کوئی ثانی نہ تھا۔ دینی خدمات کے لیے آپ نے جدوجہد اور مصائب سے پُر جو زندگی گزاری وہ اس بات کی غماز ہے کہ اگر انسان کوشش کرے تو وہ محنتِ شاقہ سے باسانی منزل کو پا سکتا ہے۔

آپ ۲۸۵ ہجری کو نمازِ عشاء ادا فرما رہے تھے کہ سجدے کے دوران کسی بدبخت نے آپ کے سر پر ضرب لگائی۔ چوٹ انتہائی مہلک تھی کہ آپ جانبر نہ ہو سکے اور اسی حالت میں اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ آپ کو نیشاپور میں سپردِ خاک کیا گیا۔
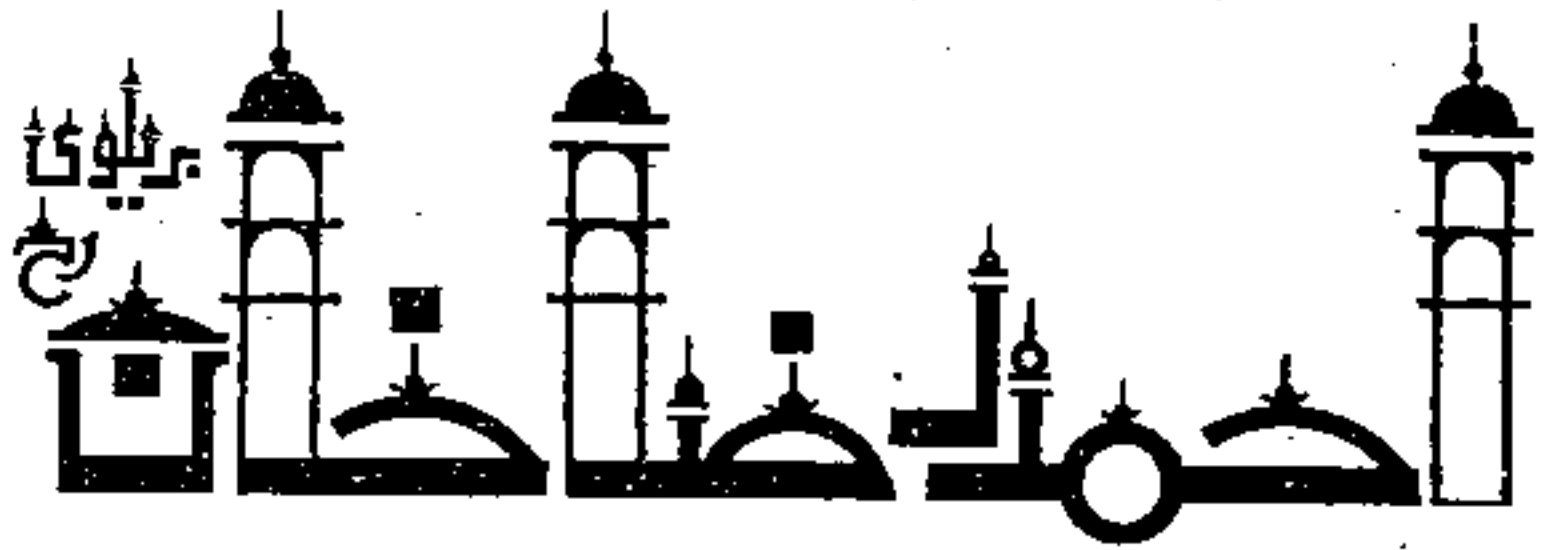
اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ ۱۴ جون ۱۸۵۹ء بمطابق ۱۰ شوال المکرم ۱۲۷۲ھ کو بمقام بریلی (یو۔پی) میں پیدا ہوئے
آپ نسباً پٹھان، مسلکاً حنفی، مشرباً قادری اور مولداً بریلوی تھے۔ آپ کے والد ماجد کا نام مولانا نقی علی خاںؒ تھا۔
یہ عالم اور صاحب عالم بزرگ تھے۔ آپ کے دادا کا نام مولانا رضا علی خاںؒ تھا کیونکہ اعلیٰ حضرت نے اپنے نعتیہ دیوان
دونوں بزرگوں کا تذکرہ اس طرح فرمایا ہے کہ احمد ہندی رضا ابن نقی ابن رضا۔

اعلیٰ حضرت کا نام محمد رکھا گیا آپ کے دادا مولانا رضا علی خاں نے آپ کا نام احمد رضا تجویز فرمایا۔ بعد میں آپ نے خود اپنے
نام کے ساتھ عبدالمصطفیٰ' کا اضافہ فرما دیا۔ چنانچہ آپ اپنے نعتیہ دیوان میں ایک جگہ فرماتے ہیں:

خوف نہ رکھ رضا تو تو ہے عبد مصطفےٰ'
تیرے لیے امان ہے تیرے لیے امان ہے

اعلیٰ حضرت نہایت ذہین اور ذکی تھے۔ اپنی اسی فطری ذکاوت کی بنا پر ۱۳ سال ۱۰ ماہ اور پانچ دن کی عمر میں آپ نے علوم مدرسیہ
سے فراغت حاصل کر لی تھی علوم عربیہ سے فراغت کے بعد آپ کے والد ماجد مولانا نقی علی خاںؒ نے افتاء کی ذمہ داریاں بھی
تفویض کر دیں۔ آپ نے اس صغیر سنی میں اپنے علم و فضل کے سبب فتویٰ نویسی کا آغاز فرمایا۔

مولانا ظفر الدین بہاری کے ایک مکتوب میں اعلیٰ حضرت نے فرمایا "بحمدہٖ تعالیٰ فقیر نے ۱۴ شعبان ۱۲۸۶ھ کو ۱۳ سال کی عمر میں پہلا فتویٰ
لکھا اگر زندگی بالخیر رہی تو دس شعبان ۱۳۳۶ھ بمطابق ۱۹۱۷ء کو اس فقیر کو فتاویٰ لکھتے ہوئے بفضلہٖ تعالیٰ پورے پچاس سال ہو جائیں
اس نعمت کا شکر فقیر کیا ادا کر سکتا ہے"۔

اعلیٰ حضرت ۱۸۷۷ء بمطابق ۱۲۹۴ھ میں اپنے والد ماجد مولانا محمد نقی کے ہمراہ حضرت شاہ آل رسول کی خدمت میں حاضر ہوئے اور
ان کی بیعت سے مشرف ہو کر اجازت و خلافت سے بھی نوازے گئے آپ نے اپنے دیوان میں اپنے مرشد طریقت
کی شان میں ایک منقبت لکھی ہے جس کا مطلع ہے۔

خوشا دے کہ دہندش ولائے آل رسولؐ
خوشا سرے کہ کندش فدائے آل رسولؐ

اس کے علاوہ آپ کو جن سلاسل طریقت میں اجازت و خلافت حاصل تھی۔ اس کی تفصیل موصوف نے اس طرح لکھی ہے۔
۱۔ قادریہ برکاتیہ جدیدہ ۲۔ قادریہ آبائیہ قدیمہ ۳ قادریہ اہدیہ ۴۔ قادریہ رزاقیہ ۵ قادریہ منوریہ ۶۔ چشتیہ نظامیہ قدیمہ ۷
چشتیہ محبوبیہ جدیدہ ۸۔ سہروردیہ واحدیہ ۹۔ سہروردیہ فضلیہ ۱۰۔ نقشبندیہ علائیہ صدیقیہ ۱۱ نقشبندیہ علائیہ علویہ ۱۲ بدلیعیہ ۱۳ علویہ
منامیہ وغیرہ۔
اس کے علاوہ آپ کو مصافحات اربعہؒ کی اسناد بھی ملیں جس کے متعلق آپ نے تحریر فرمایا ہے۔
۱۔ مصافحۃ الحسنیہ ۲۔ مصافحۃ الخضریہ ۳۔ مصافحۃ المعمریہ ۴۔ مصافحۃ المنامیہ۔
ان مصافحات و اجازات کے علاوہ مختلف اذکار، اشغال و اعمال وغیرہ کی بھی آپ کو اجازت تھی، مثلاً خواص القرآن،
اسماء الٰہیہ، دلائل الخیرات، حصن حصین اور دعاء مغنی وغیرہ وغیرہ۔
اپنے ان علوم سے آپ نے عمر بھر لوگوں کو فیض یاب کیا اور دین کی خدمت میں ہمہ تن مصروف رہے۔ آپ فرماتے
ایک شخص مجاہدات اسی سال کی عمر میں کرے یا اسی سال مجاہدہ کرے کیونکہ جس طرح اس عالم میں مسببات کو اسباب سے مربوط
گیا ہے۔ اسی طریقہ پر اگر چھوڑ دیں اور جذب و عنایت ربانی بعید کو قریب نہ کر دیں تو اس راہ کی قطع کو اسی برس درکار ہیں
توجہ فرمائے تو ایک دن میں نصرانی سے ابدال کر دیا جاتا ہے اور صدق نیت کے ساتھ اگر کوئی شخص مجاہدہ میں مشغول ہو جائے
اس کو امداد الٰہی تصور کرنا چاہیے کیونکہ ارشاد ربانی ہے "وہ ہماری راہ میں مجاہدہ کریں ہم ضرور انہیں اپنے راستے دکھائیں گے"

※

آپ نے تحیۃ الوضو کے نوافل کی فضیلت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت
فرمایا "اے بلال! کیا سبب ہے کہ میں جنت میں تشریف لے گیا تو تمہیں میں نے آگے آگے جاتے دیکھا"، عرض کی "یا
میں جب وضو کرتا ہوں تو دو رکعت نفل پڑھ لیتا ہوں" آپؐ نے فرمایا "بس تمہارے آگے آگے جانے کا یہی سبب
حضرت فرماتے ہیں "تمام روحانیت کے سلسلوں نے ان نوافل کی ادائیگی کے متعلق بڑی تاکید کی ہے۔"

※

۱۹۰۵ء بمطابق ۱۳۲۳ھ کو اعلیٰ حضرت حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے حج اور حرمین شریفین کی زیارت سے
آپ نے ایک نظم کہی جس کا مطلع یہ ہے۔

شکر خدا کہ آج گھڑی اس سفر کی ہے
جس پر نثار جان فلاح و ظفر کی ہے۔

اس سفر میں علمائے حجاز نے آپ کی بڑی قدر و منزلت کی جس کا اندازہ حسام الحرمین، الدولتہ المکیہ، کفل الفقیہ
سے ہوتا ہے حضرت شیخ اسماعیلؒ تحریر فرماتے ہیں:۔
"اہل مکہ جوق در جوق اعلیٰ حضرت کے ارد گرد جمع ہو گئے۔ بہت سے حضرات نے آپ سے التجا کی کہ ان کو
مرحمت فرمائی جائے چنانچہ ان کے اصرار کی وجہ سے ایسا ہی کیا گیا آپ کے ہمراہ مولانا حامد رضا خاںؒ بھی تھے۔ ان
کے بعد سب سے پہلے مولانا سید عبدالحی کی تشریف لائے ان کے ہمراہ ایک جوان صالح شیخ حسین جمال بن عبد
ان دونوں حضرات کو سند اجازت مرحمت فرمائی گئی اس کے بعد آپ دیار حبیبؐ میں حاضری کے لیے مدینہ تشریف
یہاں جن اکرام و اعزاز سے نوازے گئے اس کے متعلق مولانا عبدالکریم مہاجر مکی فرماتے ہیں،
"میں کئی سال سے مدینہ میں مقیم ہوں۔ ہندوستان سے ہزاروں صاحب علم آئے ہیں ان میں علماء، صلحاء، اتقیاء

ں نے دیکھا ہے کہ وہ شہر کے گلی کوچوں میں مارے مارے پھرتے ہیں کوئی بھی ان کو مڑ کر نہیں دیکھتا لیکن اعلیٰحضرت کی عجیب ہے یہاں کے علماء اور بزرگ سب کے سب ان کی طرف جوق در جوق چلے آ رہے ہیں ان کی تعظیم میں بصد تعجیل کو شاں اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہے جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے،، یہاں بھی اعلیٰحضرت نے بہت سے علماء کو سند اجازت مرحمت ہے اور شیخ عمر بن حمدان المحرسی، سیّد مامون ابری، شیخ الدلائل شیخ محمد سعید وغیرہ کا شمار ان حضرات میں ہوتا ہے جن پر اعلیٰ نے تلطف فرمایا۔

پ اپنے معتقدین کو فرماتے تھے کہ اہل اللہ کی زندگی اللہ تبارک وتعالیٰ کی ایک گراں بہا نعمت ہے ان کی ذات پاک کی طت سے اللہ تعالیٰ ہر مصیبت ٹال دیتا ہے ان نفوس قدسیہ وطاہرہ کے قدم کی برکت سے وہ عقدے چٹکی بجاتے بجاتے جاتے ہیں جنہیں قیامت تک کبھی بھی ناخن تدبیر نہ کھول سکے جس سے کیسا ہی کوئی عقیل ومدبر ہو حیران رہ جائے کچھ نہ بول سکے اِن عقل میں کوئی نہ تول سکے اللہ اکبر ان کی صورت انکی سیرت، ان کی رفتار، انکی گفتار، ان کی ہر روش، ہر ادا اور ان کا ہر اسرارِ پروردگارِ عالم کا ایک بہترین مرقع اور منہ بولتی تصویر ہے۔

دوام کسی کے لیے نہیں، ہمیشہ نہ کوئی رہا ہے نہ رہے گا۔ ہمیشگی رب العزت کے لیے ہے جو ہمیشہ سے موجود ہے جب کہ شے کو ایک دن تباہ اور فنا و معدوم ہو جانا ہے۔ اسی لیے اسلاف کرام رحمتہ اللہ علیہم نے ایسے پاک انفاس قدسیہ کے مبارکہ و مکاتیب طیبہ وملفوظات طاہرہ جمع فرمائے ہیں ہمیں چاہیے کہ اپنے اسلاف کرام کے ان گراں قدر علمی خزینوں پورا فائدہ اٹھائیں اور افکار عشق ومحبت، مسائل شریعت وطریقت کے مجموعہ معرفت وحقیقت کے گنجینہ کو اپنی الی نسلوں کے لیے چھوڑ جائیں اور یہ سلسلے تا قیامت جاری وساری رہیں،،

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد
بسا این دولت از گفتار خیزد

رتؒ کی بافیض صحبت جو بھی اختیار کرتا اس پر حقیقت و معرفت کے تمام در وا ہو جاتے تھے۔ شریعت وطریقت کے مسائل جن کو مدتوں غور و خوض کے لیے بھی بڑے بڑے اکابرین سر ٹکراتے رہتے تھے آپ ایک فقرے میں ان حل نہایت سادہ اور سہل طریقہ سے فرما دیتے تھے۔ دقائق ونکات اور مذہب وملت جو ایک چیستاں اور ایک معمّہ یں جن کا حل دشوار ہوتا ہے لیکن آپ ان مسائل کو منٹوں میں حل فرما دیا کرتے تھے۔ آپ کی محفل میں روحانیت و ولایت ر عالیہ و زواہر غالیہ اس طرح بکھرے ہوتے تھے کہ جو چاہتا اپنی جھولیاں بھر لیتا تھا۔ آپ کے فیوض وبرکات کے چشمہ انی سے ایک زمانے نے روحانیت کی تشنگی دور کی۔ آپ نے ملت اسلامیہ کی بھلائی کے لیے زبانی، تحریری اور عملی خدمات دیں۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ ہر شخص خدا سے بخشش اور خیر کا طالب ہے اس لیے ہی ساری مخلوق خدا کے دربار میں ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ ایک پری نے جو خود سلیمانی تھی شیطان کو نماز پڑھتے دیکھا تو بڑی حیران ہوئی اور شیطان سے تو انسان کے ایمان وآگہی کے دشمن ہو مگر آج نماز پڑھ رہے ہو۔ کیا تمہیں خبر ہے کہ تمہاری کوئی عبادت قبول نہیں شیطان پری کو جواب دیا کہ میں نماز پڑھتا ہوں کیونکہ یہ بخشش مانگنے کا وسیلہ ہے شاید اس سے میری بخشش ہو جائے اور پھر اللہ تعالیٰ خیر اور بخشش مانگنے سے نہیں روکا۔

ہندوستان میں گائے کا گوشت کھانا ہندو لوگ پسند نہ کرتے تھے اس لیے اکثر مسلمان بھی ان کی تقلید کیا کرتے تھے کئی ی نقطہ نظر سے اس گوشت کے مضر اثرات وضع کر رکھے تھے۔ ایک دن اعلیٰحضرت کے سامنے گائے کے گوشت ے اور اس کے مضر ہونے کا ذکر آیا تو آپ نے ارشاد فرمایا،،

ئے کا گوشت حلال اور نہایت غریب پرور گوشت ہے۔ اور بعض حالتوں میں گوشتِ بُز سے نافع تر ہے۔ عام گوشت

کے شوقین گائے کے گوشت کو ہی پسند کرتے ہیں۔ اور بکری کے گوشت کو تو بیماروں کی خوراک کہا جاتا ہے۔ گائے کی قربانی خاص طور پر قرآن کریم میں ذکر موجود ہے اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی قربانی ازواجِ مطہرات کی طرف سے فرمائی۔

بچوں کے ناموں کے بارے میں اعلیٰ حضرت ارشاد فرماتے ہیں کہ میرے پاس ایک مرتبہ کسی شخص نے آکر کہا کہ میں اپنے بچے کا کیا نام رکھوں میں نے کہا " اوّل اسمائے حسنیٰ میں سے نام رکھنا مسنون ہے۔ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو محبت کی وجہ سے اپنے بیٹے کا نام محمد یا احمد رکھے گا اللہ تعالیٰ دونوں باپ بیٹے کو بخش دے گا اور قیامت کے روز کہیں گے کہ جن کا نام محمد یا احمد ہے جنت میں چلے جاؤ۔ اور ایک مرتبہ حضور نے یہ بھی فرمایا کہ جس گھر میں کسی کا نام محمد یا احمد ہے اس گھر کی زیارت کے لیے ملائکہ دن میں ایک مرتبہ ضرور آتے ہیں۔

کسی شخص نے آپ سے سوال کیا کہ قبرستان میں کیونکہ بغیر جوتوں کے داخل ہونے کا حکم ہے اور اگر راستہ میں بول کے قطرے پڑے ہوں تو کیا پھر بھی جوتے اتارنے ضروری ہوں گے۔ اعلیٰ حضرت نے ارشاد فرمایا " شریعت مطہرہ کا عام قاعدہ ہے کہ جب کسی کام سے منع فرماتی ہے کسی مصلحت سے اور جب بندہ کو ضرورت پیش آتی ہے تو فوراً اپنی ممانعت اٹھا لیتی ہے۔ اس سے بڑھ کر کون سی چیز حرام فرمائی گئی ہے مگر ساتھ ہی مضطر کا استثناء فرما دیا کہ جنگل میں جب انسان کو شدت کی پیاس ہو پانی کہیں نہ ملے مگر شراب موجود ہو اور ایسی حالت ہو جائے کہ مرنے کا اندیشہ ہو یا منہ میں نوالہ اٹکا ہوا ہے سوائے شراب کے کوئی چیز ایسی نہیں کہ نوالہ اتر سکے اور نہ پینے سے دم گھٹ کر مر جانے کا خطرہ ہو۔ ایسی حالت میں اگر شراب نہ پئے گا تو گنہگار ہوگا۔ اور موت حرام ہوگی۔ اسی طرح سخت بھوک لگی ہوئی ہو اور سوائے خنزیر کے گوشت کے کوئی چیز دستیاب نہ ہو اور ایسی جگہ پر ہو جہاں اور کسی چیز کے ملنے کی توقع نہ ہو تو اگر خنزیر کا گوشت نہ کھایا اور مر گیا تو گنہگار ہوگا اور حرام موت مرے گا۔

ایک مرتبہ ایک شخص اعلیٰ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا " کیا مرنے کے بعد عذاب روح پر ہوتا ہے یا جسم پر" آپ نے فرمایا " روح اور جسم دونوں پر عذاب ہوتا ہے اور اسی طرح ثواب بھی۔ کیونکہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ ایک اندھا باغ کے سامنے پڑا تھا اور میوے دیکھ رہا تھا مگر اس تک جا نہ سکتا تھا۔ اتفاقاً ایک اندھے کا اس طرف سے گزر ہوا جو باغ میں جا سکتا تھا مگر میوے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ لنجھے نے اندھے سے کہا " بھائی مجھے باغ میں لے چلو وہاں جا کر ہم دونوں میوے کھائیں گے۔ اندھے نے اس کو اپنی گردن پر سوار کیا اور باغ میں لے گیا۔ لنجھے نے میوے توڑے اور دونوں نے کھائے۔ اس صورت میں کون مجرم ہوگا۔ دونوں ہی مجرم ہوں گے اندھا بھی اور لنجھا بھی۔ اس میں اعلیٰ حضرت نے جسم کو اندھے سے اور لنجھے کو روح کے ساتھ " آپ کا سمجھانے کا انداز نہایت دلنشیں اور شگفتہ ہوا کرتا تھا جب تک سائل کو اپنے سوال کا ٹھوس جواب نہ مل جاتا۔ آپ مسئلہ کو مختلف رنگوں میں بیان کیے جاتے متعدد مثالیں دیگر اشعار کی تشبیہات سے فرماتے اور بار بار بتانے اور سمجھانے سے بالکل نہیں گھبراتے تھے۔

ایک شخص نے اپنا خواب بیان کرتے ہوئے اعلیٰ حضرت کی خدمت میں عرض کی " میری بیٹی کچھ عرصہ پہلے انتقال کر گئی ہے کئی مرتبہ خواب میں اس کو علیل اور برہنہ دیکھ چکا ہوں اس لیے سخت مضطرب ہوں۔" اعلیٰ حضرت نے فرمایا " تم علیحدہ ستر ہزار مرتبہ درود شریف پڑھ کر اس کی روح کو بخش دو انشاء اللہ آئندہ اس کو تم خواب میں ایسی حالت

کیونکہ جو کلام بھی کسی کو بخشا جاتا ہے وہ دونوں کے لیے ذریعۂ نجات ہوتا ہے پڑھنے والے کے لیے بھی اور جس کو بخشا جائے اس کے لیے بھی۔ اور اگر تمام مومنین و مومنات کو ایصال ثواب بخشا جائے تو اس کا ثواب بے شمار ملتا ہے پھر آپ نے حضرت محی الدین ابن عربی کا ایک واقعہ سنایا کہ وہ کسی جگہ دعوت میں تشریف لے گئے اس دعوت میں ایک لڑکا بھی شریک تھا جو کشف میں شہر بھر میں مشہور تھا۔ اچانک کھانا کھاتے ہوئے وہ لڑکا رونے اور چلانے لگا۔ جب اس سے اسکی وجہ دریافت کی تو بولا "میری ماں کو جہنم میں لے جانے کا حکم ہوا ہے اور فرشتے اس کو جہنم میں لے جا رہے ہیں۔ حضرت ابن عربی کے پاس ستر ہزار مرتبہ کلمہ طیبہ پہلے کا پڑھا ہوا محفوظ تھا۔ آپ نے اپنے دل ہی میں اس لڑکے کی ماں کو بخش دیا اور ایصال ثواب کے لیے دعا کی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ لڑکا خوش ہو گیا اور ہنسا۔ ابن عربی نے اس سے ہنسنے کا سبب پوچھا تو اس نے عرض کی ابھی میں نے دیکھا ہے کہ فرشتے میری والدہ کو جنت کی طرف لے کر جا رہے ہیں"۔

حضرت شیخ ابن عربی فرماتے ہیں مجھے اس لڑکے کے کشف کی تصدیق ہو گئی کہ کلمہ طیبہ کے پڑھنے کے ثواب سے کیا کیا فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ حضرت اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں صاحب نے کئی مرتبہ فرمایا کہ بکثرت کلمہ طیبہ کے ذکر سے روح بالیدہ ہو جاتی ہے۔

حضرت خضر علیہ السلام کے متعلق اکثر لوگ یہ سوال کرتے تھے کہ وہ ولی ہیں یا نبی۔ آپ نے ان کے متعلق فرمایا "جمہور کا مذہب ہے اور صحیح بھی یہی ہے کہ وہ نبی ہیں اور زندہ ہیں جس طرح حضرت الیاس علیہ السلام کے ذمہ بحر کی ——— خدمت ہے اللہ تعالیٰ نے چار نبیوں کو زندہ رکھا ہوا ہے ان کا وعدہ الٰہیہ ابھی آیا ہی نہیں یوں تو ہر نبی زندہ ہے جس کے متعلق ارشاد الٰہی ہے۔ ترجمہ :۔ "بے شک اللہ نے حرام کیا ہے زمین پر کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے جسموں کو خراب کرے تو اللہ کے نبی زندہ ہیں اور ان کو باقاعدہ روزی دی جاتی ہے۔"

نبیوں پر ایک آن کو محض تصدیق وعدہ الٰہیہ کے لیے موت طاری ہوتی ہے اس کے بعد پھر ان کو حیات حقیقی حسی دنیوی عطا ہوتی ہے ان چاروں انبیاء میں سے دو آسمان پر ہیں اور دو زمین پر ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت ادریس آسمان پر زندہ موجود ہیں جب کہ حضرت الیاس علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام زمین پر زندہ موجود ہیں ان کو جب حق تعالیٰ چاہے گا موت کا ذائقہ چکھایا جائے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ ہر ایک کو موت کا ذائقہ چکھنا ہو گا۔ اور ارشاد ربانی غلط نہیں ہو سکتا۔

❊

اعلیٰ حضرت نے دینی خدمات اس قدر سرانجام دی ہیں کہ ان کا شمار کرنا مشکل ہے آپ عمر بھر علوم اسلام کے ظاہری اور باطنی اسرار کے مطالعہ میں مصروف رہے آپ نے علوم قدسیہ کے علاوہ دیگر علوم و فنون کی بھی تحصیل کی۔ اور بعض علوم و فنون میں خود آپ کی طبع سلیم نے رہنمائی کی۔ ایسے تمام علوم و فنون کی تعداد ۴۵ ہے جن میں علم قرآن۔ علم حدیث۔ اصول حدیث۔ فقہ مذاہب۔ اصول فقہ۔ جدل۔ تفسیر۔ عقائد۔ کلام۔ صرف۔ نحو۔ معانی۔ بیان۔ بدیع۔ منطق۔ مناظرہ اور فلسفہ۔ تکسیر قابل ذکر ہیں۔ ان علوم کے علاوہ آپ نے علم الفرائض۔ عروض و قوافی۔ نجوم۔ اوفاق۔ فن تاریخ (اعداد) نظم و نثر فارسی ہندی۔ خط نسخ اور خط نستعلیق وغیرہ میں بھی کمال حاصل کر رکھا تھا۔

آپ نے جن علوم و فنون پر دسترس حاصل کی ان کی تعداد ۵۴ سے متجاوز ہے عالم اسلام میں مشکل ہی سے کوئی ایسا عالم ملے گا جو اس قدر علوم و فنون میں دسترس رکھتا ہو۔ پھر یہی نہیں آپ نے ان علوم کی تحصیل کی بلکہ ہر ایک علم و فن میں اپنی کوئی یادگار چھوڑی ہے ان علوم و فنون جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے ان میں سے بعض کو اعلیٰ حضرت نے خود ترک فرما دیا تھا۔ اور بعض کو خود اپنایا تھا۔ اس ترک و قبول پر آپ روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں۔

میں نے اس وقت سے فلسفہ اولیٰ کو ترک کیا جب میں نے یہ محسوس کیا کہ اس میں سوائے ملمع کاری کے کچھ نہیں۔ اس کی ظلمت اور زنگ جب چھا جاتا ہے تو دین سلب کر لیتا ہے اور اس کی ظلمت ہی کی وجہ سے قیامت کا خوف ہلکا ہو جاتا ہے اس لیے میں نے اپنی ذمہ داریوں پر غور کیا اور ہیئت، ہندسہ، نجوم، بورگار شمات اور فنون ریاضی سے میرا شغف اس لیے نہیں کہ اس میں مجھے مزید مشق حاصل ہو بلکہ یہ توجہ تو محض تفریح طبع کے لیے ہے۔ اس کے علاوہ اس سے وقت کے تعین و تعدیل میں مدد ملتی ہے جس سے مسلمانوں کو نماز روزے کے اوقات کی جانچ کے لیے فائدے پہنچ سکتے ہیں۔"

آپ فرماتے تھے: "جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے اس قدر مجاہدات کیے ہیں مگر ہمیں کچھ حاصل نہیں ہوا ہے وہ جھوٹ بولتے ہیں کیونکہ حق تعالیٰ نے خود فرمایا ہے کہ جو لوگ ہماری راہ میں مجاہدہ کرتے ہیں ہم انہیں ضرور اپنی راہ دکھاتے ہیں" اس لیے مذکور لوگ جھوٹے ہیں حقیقتاً وہ مجاہدہ کرتے نہیں ہیں کیونکہ طلب صادق ہو تو راستہ خود بخود طے ہو جاتا ہے اور دو گام چلنے پر ہی منزل سامنے آجاتی ہے پھر اعلیٰ حضرت نے ایک حکایت بیان فرمائی۔ "ایک شخص ایک مدت سے کسی پیر کامل کی تلاش میں تھا بہت کوشش کی مگر مطلوب و مقصود نہ مل سکا ایک رات خدا کو عرض کیا "اے اللہ! کل صبح فجر کی نماز کے بعد گھر سے نکلوں گا جو سامنے آجائے گا اس کی ہی بیعت کر لوں گا"۔ صبح جب نماز پڑھ کر گھر سے نکلے تو سب سے پہلے جس شخص سے آپ کی ملاقات ہوئی وہ چور تھا اور چوری کا مال ہاتھ میں پکڑے آ رہا تھا اس طالب صادق نے چور کا ہاتھ پکڑا اور کہا حضرت بیعت لیجیے۔" وہ چور بڑا حیران ہوا اور بولا "میں تو چور ہوں، چوری کا اسباب میرے ہاتھ میں ہے میں کس بنا پر آپ کو بیعت کر سکتا ہوں"۔ وہ صاحب بالکل نہ مانے اور کہا "میں نے اپنے رب سے عہد کیا تھا صبح فجر کی نماز کے بعد گھر سے باہر نکلوں گا جو شخص ملے گا اسی کی بیعت کر لوں گا چنانچہ تم ہی پہلے شخص ہو جس سے میری ملاقات ہوئی ہے اب اللہ سے کیے ہوئے عہد کے مطابق تمہیں میری بیعت لینی ہو گی" دونوں میں ابھی کشمکش ہو رہی تھی کہ وہاں حضرت خضر علیہ السلام تشریف لے آئے انہوں نے خدا کے حکم سے اس چور کو آن کی آن میں تمام مراتب دیے اور تمام مقامات فوراً طے کروا ئے۔ ان کو ولی بنایا اور اس چور سے بیعت لی اور اب وہ حضرت خضر کی طلسمی نگاہوں کی تابش سے قطب بن چکا تھا۔ اس نے اس طالب صادق اور مرشد کامل کے متلاشی کی بیعت کی۔"

اس حکایت سے اعلیٰ حضرت نے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مجاہدات و ریاضت کرنے میں جذبہ طلب سچا اور لگن ہو تو اللہ تعالیٰ نہ صرف منازل خود طے کروا دیتا ہے بلکہ ولایت کو اپنے سچے طالب کے پاس خود بھیج دیتا ہے۔

کسی محفل میں یہ سوال اُٹھایا گیا کہ اولیائے کرام میں اکثر دیکھا گیا ہے کہ عبادات و ریاضت کے علاوہ کشتی و کسرت بھی کرتے ہیں کیا یہ صاحب اولیائے کرام کے لیے جائز ہے اعلیٰ حضرت نے فرمایا بالکل جائز ہے اس پر آپ نے حضرت بہاؤ الحق والدین نقشبندیؒ کا ایک واقعہ بیان فرمایا کہ حضرت نقشبندی نے خواجہ امیر کلال کی عبادت و ولایت کا شہرہ سنا تو ان کی ملاقات کو گئے جب ان کی خانقاہ کے قریب پہنچے تو آپ نے دیکھا کہ لوگوں کا ایک ہجوم ہے جو ایک میدان کے گرد جمع ہے جب آپ قریب پہنچے تو آپ کو معلوم ہوا ہے کہ اس میدان میں کشتی ہو رہی ہے اور حضرت میر کلال بھی شریک کشتی ہیں۔ آپ کو یہ بات گزری کیونکہ آپ عالم جلیل اور پابند شریعت تھے آپ کے دل میں جب یہ بات پیدا ہوئی اسی وقت آپ پر غنودگی طاری ہو گئی نے خواب میں دیکھا کہ معرکہ حشر بپا ہے ان کے اور جنت کے درمیان ایک دلدل کا دریا حائل ہے۔ یہ اس پار جانا چاہتے ہیں جب دریا میں اترتے ہیں تو جتنا زور آگے بڑھنے کے لیے لگاتے ہیں اتنا ہی دلدل میں دھنستے چلے جاتے ہیں یہاں تک کہ بغلوں تک دلدل میں دھنس جاتے ہیں اسی صورت میں سخت پریشان ہو جاتے ہیں کہ اس میں سے کیسے نکلا جائے اتنے میں امیر کلال آ جاتے ہیں اور آپ کا ہاتھ پکڑ کر آپ کو دلدل سے باہر نکال کے دوسری طرف جنت میں لے جاتے ہیں۔ اس کے بعد آپ کی آنکھ

ہے تو آپ اس سے پہلے کہ امیر کلال سے کچھ عرض کریں وہ خود انہیں مخاطب کر کے فرمانے لگے "بہاؤالدین! اگر ہم کشتی نہ لڑیں تو یہ طاقت کہاں سے آئے جس نے تمہیں دلدل سے نکالا جائے" یہ سن کر خواجہ بہاؤالدین امیر کلال کے قدموں میں گر پڑے اور ان کی بیعت کر لی۔

اعلیٰ حضرت کے مریدوں نے آپ کی خدمت میں عرض کی "حضرت! ایک صاحب جو پہلے محدث تھے مدرسہ میں پڑھاتے بھی تھے اب ان کی حالت یہ ہے کہ وہ اکثر مخفی باتیں بھی بتاتے ہیں۔ ہر وقت ان کے ہاں لوگوں کا ہجوم لگا رہتا ہے مگر وہ نماز کی پابندی نہیں کرتے۔

اعلیٰ حضرت یہ سن کر مسکرا دیے اور ایک واقعہ اپنے مریدوں کو سنایا "ایک صاحب اولیائے کرام میں سے تھے ان کی خدمت میں بادشاہِ وقت قدم بوسی کے لیے حاضر ہوا۔ آپ کے پاس اسی وقت کچھ سیب نذر میں آئے تھے آپ نے ان سیبوں کو بادشاہ کے سامنے رکھ کر ایک سیب اس کو پیش کیا اور ایک خود لیا۔ اچانک بادشاہ کے دل میں ایک شیطانی خیال پیدا ہوا اور اس نے سوچا کہ سیبوں میں ایک سیب جو سب سے بڑا ہے اگر حضرت وہ اُٹھا کر مجھے دیں تو پھر میں ان کو ولی مانوں گا، ان بزرگ کو اللہ تعالیٰ نے القا کے ذریعہ سب کچھ بتا دیا چنانچہ انہوں نے وہی بڑا سیب اٹھا کر فرمایا "ہم ایک مرتبہ مصر گئے تھے۔ ایک جگہ بڑا بھاری جلسہ تھا وہاں ایک شخص کے پاس ایک گدھا تھا اس کو اس کے مالک نے سدھا رکھا تھا اس گدھے کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر کہا جاتا کہ فلاں چیز (چیز کا نام لے کر) اُٹھا لاؤ۔ گدھا سارے جلسے میں گھومتا اور جس شخص کے پاس وہ مطلوبہ چیز پڑی ہوتی اس کے پاس جا کر اپنا سر ٹیک دیتا"

یہ حکایت سنا کر اس اللہ کے ولی نے بادشاہ سے کہا "اگر ہم تمہیں سیب نہ دیں تو ولی نہ ہوئے اگر دے دیں تو پھر اس گدھے سے بڑھ کر کیا کمال دکھایا یہ فرما کر سیب بادشاہ کی طرف پھینک دیا اور فرمایا "وہ صفت جو غیر انسان کے لیے کمال نہیں اور وہ جو غیر مسلم کے لیے ہو سکتی ہے مسلم کے لیے کمال نہیں۔

اعلیٰ حضرت فرمایا کرتے تھے میرا سب سے محبوب مشغلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت کرنا ہے کیونکہ وہابی مسلک کے لوگ آپ کی شان میں گستاخی بھی کرتے ہیں اور آپ کی توہین بھی کرتے ہیں آپ وہابی حضرات کی زبان درازی کا مقابلہ فرمایا کرتے ہوئے فرماتے کہ میرے اس عمل کو اللہ تعالیٰ قبول فرمائے گا کیونکہ اس نے خود فرمایا ہے کہ میں اپنے بندے سے اس کے حسن ظن سے معاملہ فرماتا ہوں اور میرا ظن یہی ہے کہ میں رسول اللہ کے مخالفوں کی زبانوں کا مقابلہ کروں۔

آپ کے دیگر مشاغل میں قابل ذکر بدعتیوں کی بیخ کنی، مفسد اور دین کے دشمنوں کی نشان دہی، حسب استطاعت اور واضح مذہب حنفی کے مطابق فتویٰ نویسی ہے۔

ایک روز اعلیٰ حضرت نے اپنے بھائیوں کو حکم دیا کہ میرے پاس بیٹھ کر سورۃ یٰسین شریف اور سورۃ رعد کی تلاوت کرو جب دونوں سورتیں تلاوت فرما دی گئیں پھر آپ نے وہ دعائیں جو سفر پر چلتے وقت پڑھی جاتی پڑھیں۔ اس کے بعد کلمہ طیبہ پڑھا آپ کے چہرہ پر نور کا ایک لمعہ چمکا جس میں ایسی چمک اور جنبش تھی جس طرح آئینے میں لمعانِ خورشید جنبش کرتا ہے اس کے بعد آپ کی روح جسم اطہر سے پرواز کر گئی۔ اس روز ۲۵ صفر المظفر ۱۳۴۰ھ جمعۃ المبارک تھا۔ آپ فرمایا کرتے تھے "جنہیں ایک جھلک دکھا دیتے تھے وہ شوق دید میں ایسے جاتے ہیں کہ جانا معلوم بھی نہیں ہوتا۔"

اعلیٰ حضرت کا مزار شہر بریلی محلہ سوداگراں میں دار العلوم منظر الاسلام کے شمالی جانب ایک پر شکوہ عمارت کے اندر ہے آپ کا عرس ہر سال ۲۴، ۲۵ صفر کو ہوتا ہے ہندوستان کے علماء و مشائخ عرس میں شرکت کے لیے آتے ہیں اور فیوض و برکات سے جھولیاں بھرتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ جب تک کسی پیرو مرشد کی رہنمائی اور سرپرستی حاصل نہ ہو کوئی بھی شخص تصوف اور بزرگی کی منزل کو نہیں پا سکتا مگر جس برگزیدہ ہستی کا ذکر یہاں کیا جا رہا ہے اُس کا کوئی مُرشد نہ تھا مگر اس ہستی نے تصوف اور معرفت کی راہوں پر چلتے ہوئے وہ مقام عظیم حاصل کیا جس کے لیے برسوں کی ریاضت اور عبادت درکار ہوتی ہے۔ سلسلۂ چشتیہ کا یہ نامور شیخ جس کا نام شیخ بدرالد غزنوی تھا اور جسے زہد و تقویٰ کا مردِ میدان بھی کہا جاتا ہے۔ اُس نے پورے برصغیر میں علم و عرفان اور روحانیت کے ایسے ایسے خزانے تقسیم کیے۔ جنہیں کئی گناہ گار اپنی جھولیوں میں سمیٹ کر نیکوکار بن گئے آپ کے واعظ میں پائے جانے والے جادو اور شیریں کلامی نے وقت کے بڑے بڑے حکمرانوں اور باد کو بھی اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔

شیخ بدرالدین غزنوی کی شخصیت کا ایک خاص پہلو ان کا وعظ تھا۔ ایک روایت کے مطابق حضرت خض علیہ السلام بھی اُن کا وعظ سننے آیا کرتے تھے۔ آپ کے والد محترم کی یہ دلی آرزو تھی کہ وہ حضرت خضر شرف ملاقات حاصل کریں۔ چنانچہ ایک روز جب اُنہوں نے بیٹے کو تنہا پایا تو انہوں نے اس خواہ کا اظہار کیا کہ وہ حضرت خضر علیہ السلام سے ملنا چاہتے ہیں۔ اگر ممکن ہو تو ان کی یہ آرزو پوری کرادی جا والد محترم کا حکم تھا جس کو ٹالنا بدرالدین گناہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ اُنہوں نے کہا۔ "بابا جان آئندہ وعظ موقع پر جب خضر علیہ السلام تشریف لائیں گے تو انشاءاللہ میں آپ کی یہ خواہش ضرور پوری کروں گا۔" وعظ کے دوران ایک موقع پر جب آپ کے والد کو خضر علیہ السلام دکھائی دیئے تو انہوں نے بیٹے سامنے دوبارہ اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ بدرالدین نے کہا بابا جان! اگر حضرت خضر آپ کو اس محفل میں د دے رہے ہیں تو آپ اُن سے مل لیں مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ لہٰذا بیٹے کی رضامندی سے جب آپ کے والد محترم حضرت خضر کے قریب پہنچے تو وہ اچانک نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

اب تو آپ کے والد بہت پریشان ہوئے اور بدرالدین سے کہنے لگے بیٹے! خضر تو مجھے دیکھتے ہی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ اگر وہ مجھ سے بات کرتے تو میں اُن سے کہتا کہ وہ تمہیں کسی مرشد کا پتہ بتائیں کیونکہ جب میں تمہیں بغیر مُرشد کے دیکھتا ہوں تو مجھے سخت دُکھ ہوتا ہے۔

بدرالدین نے جواب دیا "بابا جان میں خود بھی کسی مُرشد کی تلاش میں ہوں مگر یہ کام اتنا آسان بھی نہیں ہے کیونکہ مجھ ایسے گناہ گاروں کو پیرومرشد مشکل سے ہی ملا کرتے ہیں۔"

یہ ایک حقیقت ہے کہ شیخ بدرالدین غزنوی کو کسی ایسے مُرشد کی شدت سے تلاش تھی جس سے وہ بیعت ہونے کا اعزاز حاصل کرتے۔ آپ کا ایک ایک لمحہ اسی اضطراب کی کیفیت میں گزر رہا تھا کہ اُنہیں تصوف کی دُنیا میں رہنمائی کے لیے کوئی روحانی رہنما اور رہبر مل جائے۔ ایک رات آپ کے ذہن میں یہی سوچ گردش کر رہی تھی کہ آپ کی آنکھ لگ گئی اور خواب میں آپ کو سرورِ کائنات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی۔ آپ نے ایک کم عمر نوجوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بدرالدین سے فرمایا کہ قطب الدین نامی اس نوجوان کو تمہارا مرشد بنا دیا ہے اب تم اسی کے ہاتھ میں بیعت کر لو۔

یہ خواب دیکھتے ہی شیخ بدرالدین غزنوی کی آنکھ کُھل گئی اور خواب میں حضورؐ نے آپ کو مرشد کے لیے جس نوجوان کی طرف اشارہ کیا تھا بدرالدین غزنوی اُس کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ گھر سے رُخصت ہونے سے پہلے آپ نے باقاعدہ اپنے والدین سے اجازت طلب کی۔ وہ اپنے بیٹے کو کسی طور بھی نظروں سے اوجھل ہونے کی اجازت نہیں دینا چاہتے تھے مگر چونکہ ان کو خواب میں حضور اکرمؐ کی طرف سے بشارت ہوئی تھی اس لیے اُنہوں نے بیٹے کے ارادے میں حائل ہونا مناسب نہ سمجھا البتہ اتنا ضرور ہوا کہ جب شیخ بدرالدین غزنوی گھر سے روانہ ہونے لگے تو آپ کے والد انہیں حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولے۔

"بیٹے آخری بار مجھے اپنا درشن کر لینے دو کیونکہ تو مصائب اور آزمائشوں کے جس سفر پہ روانہ ہو رہا ہے وہ بہت کٹھن ہے۔ عین ممکن ہے کہ پھر ہم کبھی بھی تمہاری صورت نہ دیکھ سکیں۔"

یہ بات سُنکر شیخ بدرالدین غزنوی بھی آبدیدہ ہو گئے۔ انہوں نے آخری مرتبہ اپنے باپ کے قدموں کو چھوا۔ ماں کی دعاؤں سے اپنا دامن بھرا اور مرشد کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔

آپ نے ابتدا میں تو آس پاس کے شہروں اور قصبات میں مُرشد کو تلاش کرنے کی کوشش کی مگر جب کامیابی نہ ہوئی تو بڑے بڑے شہروں سے ہوتے ہوئے بالآخر دہلی پہنچ گئے۔

شیخ بدرالدین غزنوی جب مرشد کی تلاش میں روانہ ہوئے تو اُس وقت اُن کی عمر ساٹھ برس کے قریب تھی وہ نہ صرف خود شادی شدہ تھے بلکہ اُن کے بچے بھی اپنے گھروں کے ہو چکے تھے۔

بہرطور مرشد کو تلاش کرتے کرتے جب آپ دہلی پہنچے تو کسی نے انہیں بتایا کہ اُن کا داماد دہلی کے ایک قید خانے میں سزا کاٹ رہا ہے۔ یہ سُنکر انہیں انتہائی قلق ہوا۔ وہ سرائے سلطان روانہ ہو گئے اُن کا ارادہ تھا کہ وہ یہاں کے سلطان سے مل کر کسی نہ کسی طرح اپنے داماد کو رہا کروانے کی کوشش کریں گے۔

چنانچہ شیخ بدرالدین غزنوی جیسے ہی سلطان کے دربار میں پہنچے تو انہیں سامنے سے اپنا داماد آتا دکھائی دیا۔ داماد کے ایک ہاتھ میں کپڑے کی پوٹلی تھی جس میں غالباً اشرفیاں وغیرہ تھیں۔ آپ اُسے دیکھ کر انتہائی خوش ہوئے مگر ساتھ حیران بھی ہوئے کہ اگر اُن کا داماد جیل میں بند تھا تو پھر وہ اشرفیوں والی تھیلی لے کر اُن کے سامنے کیسے آ گیا۔

اِدھر داماد نے بھی جو اپنے خسر کو دیکھا تو وہ بہت خوش ہُوا اور اُنہیں اپنے گھر لے گیا۔ گھر پہنچ کر شیخ بدرالدین غزنوی نے داماد سے کہا "بیٹے کیا تم جانتے ہو کہ مَیں دہلی کس لیے آیا ہوں۔"

داماد نے جواب دیا "خیر یہ سوال تو الگ ہے کہ آپ کس لیے دہلی تشریف لائے ہیں مگر مَیں تو غیر متوقع طور پر آپ کو سامنے پاکر ویسے ہی بہت زیادہ خوشی محسوس کر رہا ہوں۔"

پھر آپ نے خود ہی داماد سے کہا "بیٹے شاید یہ بات تمہارے علم میں نہیں ہے کہ مَیں ابھی تک کسی کا مُرید نہیں ہوا۔ خواب میں مجھے حضورِ اکرم کی زیارت ہوئی تھی۔ اُنہوں نے مجھے ہدایت فرمائی تھی کہ مَیں خواجہ قطب الدین نامی ایک نوجوان کو تلاش کر کے اُسے اپنا مُرشد بنالوں۔ مَیں اِس سلسلے میں بہت سے شہروں قصبوں میں مُرشد کو تلاش کرتا ہوا یہاں تک پہنچا ہوں اور جب تک مجھے کامیابی نہیں ہوگی مَیں اپنی جستجو کا سفر جاری رکھوں گا۔

"اگر خواجہ قطب الدین آپ کے سامنے آجائیں تو کیا آپ اُنہیں پہچان لیں گے۔" آپ کے داماد نے سوال کیا۔

"کیوں نہیں مَیں ضرور اپنے مُرشد کو شناخت کرلوں گا۔" خواجہ صاحب نے بڑے اعتماد کے ساتھ جواب دیا۔ پھر داماد کے پوچھنے پر جب آپ نے اُسے بتایا کہ میری عمر اِس وقت تقریباً ستر سال ہے تو آپ کے داماد کے چہرے پر گہری سوچ کے آثار نمودار ہوئے اور پھر وہ کہنے لگا "بدرِ بزرگوار! مَیں آپ کو جن بزرگ سے ملواؤں گا اُن کی عمر بمشکل سترہ سال ہوگی تو کیا آپ اِس بڑھاپے میں ایک نوجوان کے ہاتھ پر بیعت کریں گے۔"

شیخ بدرالدین غزنوی نے فرمایا کہ حضور کی طرف سے جس بزرگ کو مجھے اپنا مُرشد بنانے کی ہدایت ہوئی تھی اُس کی عمر بھی اتنی ہی تھی لہٰذا تم مجھے فوراً اُن سے ملوا دو۔

چنانچہ آپ کا داماد آپ کو اپنے وقت کے صاحبِ حال بزرگ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے پاس لے گیا۔ شیخ بدرالدین غزنوی جب وہاں پہنچے تو اُس وقت بختیار کاکی کے ہاں سماع کی محفل جمی ہوئی تھی اس محفل میں قاضی حمید الدین ناگوری بھی تشریف رکھتے تھے۔ آپ کے داماد نے دُور ہی سے اشارہ کرتے ہوئے خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اور خواجہ حمید الدین ناگوری سے آپ کا تعارف کروا دیا۔

آپ نے داماد سے دریافت فرمایا کہ قطب الدین بختیار کاکی کے ساتھ جو دوسرے بزرگ بیٹھے ہیں۔ اُن کی عمر کیا ہوگی۔

داماد نے جواب دیا "کم از کم ایک سو بیس سال تو ہوگی۔"

اب تو بدرالدین غزنوی بہت حیران ہوئے وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ایک سترہ سالہ نوجوان کے سامنے ایک سو بیس سالہ بوڑھا یوں عقیدت و احترام سے بیٹھے گا جیسے وہ اُس کا مُرشد ہو۔

بہرکیف بدرالدین غزنوی کا داماد اُنہیں یہاں پہنچانے کے بعد واپس لوٹ گیا اور بدرالدین اس محفل سماع میں بڑے مؤدبانہ انداز میں بیٹھ گئے۔ جب سماع کی محفل اپنے اختتام کو پہنچی تو آپ نے خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے قریب پہنچتے ہی اُنہیں پہچان لیا اور جذبات سے مغلوب ہوکر اُن کے قدموں میں سر جھکا کر بولے "حضرت مَیں آپ کی مُریدی اختیار کرنا چاہتا ہوں مجھے اس کی اجازت فرمائی جائے۔"

خواجہ بختیار کاکی فرمانے لگے "بدرالدین جس رات تُو نے خواب میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا

تھا تو تو اسی رات میرا مرید بن گیا تھا۔"
یہ سنتے ہی بدرالدین نے اپنا سر خواجہ صاحب کے قدموں میں جھکا دیا اب وہ بہت خوش تھے۔ انہوں نے انتہائی عقیدت سے عرض کیا "حضرت میری یہ آرزو ہے کہ مجھے عالم رویا کے علاوہ اس دنیا میں بھی بیعت کا شرف عطا فرمایا جائے اور خواجگان چشت کی رسم ادا کی جائے۔"
خواجہ بختیار کاکی نے فرمایا کہ تیری یہ خواہش بہت جلد پوری کر دی جائے گی۔ اس کے بعد آپ نے بدرالدین کو کلاہ چہار ترکی مرحمت فرمائی اور کہا "بدرالدین اوپر دیکھ" جب بدرالدین آسمان کی طرف دیکھنے لگے تو آپ نے فرمایا "بدرالدین آسمان پر کچھ دکھائی دیا۔"
بدرالدین غزنوی کہنے لگے "میں تحت الثریٰ کو اپنے سامنے دیکھ رہا ہوں وہاں اندھیرا ہی اندھیرا نظر آرہا ہے اس کے سوا کچھ نظر نہیں آیا"
چنانچہ بختیار کاکی کو مرشد بنانے کے بعد بدرالدین نے انہی کے آستانے پر رہنا شروع کر دیا۔ بختیار کاکی نے بدرالدین کو اپنی خلافت بھی عطا کر دی اور خرقہ بھی عطا کیا۔
پھر انہوں نے بدرالدین کو چند نصیحتیں کرتے ہوئے فرمایا "اے بدرالدین ہمارے پیروں کی پیروی کرتے رہنا۔ ہمیشہ فقیروں درویشوں سے محبت کرنا فقر و فاقے کو اپنا شعار بنانا۔ چھوٹوں سے شفقت کرنا اور بڑوں کو عزت کی نگاہ سے دیکھنا۔"
بدرالدین نے مرشد سے وعدہ کیا کہ وہ زندگی بھر ان نصیحتوں پر عمل کریں گے۔ لہٰذا اس کے بعد بختیار کاکی نے خانقاہ کی امامت بھی آپ ہی کے سپرد کر دی۔
ایک روز آپ حجرے میں مصروف عبادت تھے کہ چند غزنوی نوجوان ایک وفد کی صورت میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے ان سے پوچھا کہ وہ غزنوی سے کب روانہ ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک نوجوان نے بتایا کہ ہم تقریباً آٹھ ماہ پہلے وہاں سے روانہ ہوئے تھے۔
جب بدرالدین نے ان سے اپنے والدین کا حال احوال پوچھا تو وہ کہنے لگے "حضرت آپ تو خود صاحب کشف ہیں آپ تو خود مراقبے میں جاکر اپنے خاندان کا حال معلوم کر سکتے ہیں۔"
شیخ بدرالدین غزنوی فوراً مراقبے میں چلے گئے اور پھر کچھ دیر بعد فرمانے لگے۔ "میں نے دیکھا ہے کہ غزنوی میں کوئی بھی آدمی موجود نہیں ہے۔ اس کے علاوہ میں نے پوری سطح زمین بھی تلاش کر لی ہے مگر وہاں بھی مجھے کچھ نہیں ملا البتہ میں نے انہیں زمین کے اندر سوتے ہوئے دیکھا ہے۔"
یہ سنتے ہی نوجوانوں نے شیخ بدرالدین غزنوی کے ہاتھوں کو چومتے ہوئے انتہائی دکھ بھرے لہجے میں کہا "حضرت مغلوں نے تو پورے غزنی کو برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ غزنی کے سارے باشندوں کو قتل کر دیا گیا ہے جن میں ہمارے اور آپ کے والدین بھی شامل تھے۔ اس وقت وہ سب قبروں کی گود میں سو رہے ہیں ہم بڑی مشکل سے بچتے بچاتے کسی نہ کسی طرح آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں۔"
یہ ساری باتیں سن کر شیخ بدرالدین کو بے حد قلق ہوا۔ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی نے آپ کو تسلی و تشفی دی پھر کہنے لگے "بدرالدین تم تو غزنی میں وعظ منعقد کیا کرتے تھے۔ لہٰذا میں تمہیں ہدایت کرتا ہوں کہ تم وہ وعظ یہاں بھی منعقد کیا کرو۔"
بدرالدین نے مرشد کے حکم کی تعمیل میں دہلی میں بھی وعظ کرنا شروع کر دیا جس کی شہرت تھوڑے ہی

دلوں میں دُور دُور تک پھیل گئی آپ کے وعظ میں جہاں اور بہت سی ہستیوں نے شرکت کی وہاں سید مبارک علی غزنوی شیخ ضیاالدین بابا فرید الدین مسعود گنج اور قاضی حمید ناگوری شامل تھے۔

دہلی میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے ہاں رہتے رہتے آپ کو خواجہ حمید ناگوری سے بھی حد درجہ لگاؤ ہو گیا تھا۔ ایک مرتبہ جب وہ کئی روز تک تشریف نہ لائے تو آپ خود اُن کے پاس جا پہنچے۔ وہاں آپ نے بہت عجیب وغریب منظر دیکھا۔

صورتِ حال یہ تھی کہ حمید ناگوری اپنے کپڑے دھو کر مکان کے صحن میں پھیلا رہے تھے سردی کے اس سخت ترین موسم میں اُن کے جسم مبارک پر صرف ایک لنگوٹی تھی۔ یہ ساری صورتِ حال بدرالدین غزنوی سے برداشت نہ ہو سکی وہ دوڑے دوڑے واپس اپنی خانقاہ پہنچے وہاں سے اونٹ کی کھال لی اور واپس آ کر وہ کھال حمید ناگوری کی خدمت میں پیش کر دی جسے آپ کے کہنے پر خواجہ حمید ناگوری نے خوش دلی سے قبول کر لیا جس وقت آپ نے خواجہ صاحب کو اونٹ کی کھال پیش کی۔ اُس وقت آپ کو بختیار کاکی کی نصیحتیں یاد آ رہی تھیں کہ درویشوں کی خدمت کیا کرو۔

دہلی پر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہاں بہت عرصہ تک بارش نہ ہوئی۔ خشک سالی کا خطرہ پیدا ہو گیا اور طرح طرح کی وبائی بیماریاں بھی پھیلنے لگیں۔ شہر کے لوگ اس صورتحال سے بہت زیادہ پریشان تھے۔ اُمرا نے بادشاہ سلطان شمس الدین التمش سے عرض کی "حضور والا! اگر مزید کچھ عرصہ کے لیے بارش نہ ہوئی تو ساری فصلیں برباد ہو جائیں گی۔ لہٰذا فوری طور پر اس کا کچھ حل نکالا جائے۔"

سلطان نے پوچھا "اس کے لیے ہمیں کیا کرنا ہو گا۔" وہاں پر موجود ایک شخص نے جواب دیا کہ اللہ کے کسی نیک بندے سے بارش کے لیے دُعا کرائی جائے تو بارانِ رحمت جوش میں آ سکتی ہے۔"

سلطان نے کہا "تجویز تو اچھی ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ دُعا کس سے کرائی جائے۔"

وہاں پر موجود امیر نے جواب دیا "میرے خیال میں ہمیں دُعا کروانے کے لیے مناسب آدمی مل جائے گا بلکہ ہم جب بھی چاہیں اُن کے پاس جا کر دُعا کروا سکتے ہیں۔"

ایک اور امیر نے کہا "شاید آپ لوگوں کا اشارہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی طرف ہے۔"

اس موقع پر بادشاہ نے کہا "امیر! تمہارا خیال غلط ہے مگر جس بزرگ سے یہ لوگ دُعا کروانا چاہتے ہیں میں نے انہیں پہچان لیا ہے۔ اُن کا نام نامی حضرت بدرالدین غزنوی ہو گا۔"

امیر نے کہا "حضور آپ نے بالکل سچ جانا۔"

چنانچہ بادشاہ نے اُسی وقت سواری تیار کروائی دربارِ شاہی کے چند افراد کو اپنے ساتھ لیا اور فوراً بدرالدین غزنوی کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ امرا نے آپ کو سلام کیا۔ آپ نے سلام کا جواب دینے کے بعد دریافت فرمایا کہ ہم غریبوں کے ڈیرے پر بادشاہوں کی اس حاضری کا کیا مقصد ہے۔

بادشاہ نے عرض کیا۔ "پیرومرشد آپ تو خود صاحبِ حال اور صاحبِ کشف ہیں آپ تو جان ہی گئے ہوں گے کہ ہم کس لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں۔

بدرالدین غزنوی بادشاہ کی بات سنتے ہی فوراً مراقبے میں چلے گئے۔ کچھ دیر بعد آپ نے سر اُٹھایا اور کہا "میں اس بات پر حیرت زدہ ہوں کہ ابھی تک بارش کیوں نہیں ہوئی۔ اب تک تو بارانِ رحمت شروع ہو

ہو جانی چاہیے تھی۔

بدر الدین غزنوی کی زبانی یہ الفاظ سُنکر تمام لوگوں کے چہروں پر رونق سی آ گئی۔ بادشاہ نے آپ سے عرض کیا ہمیں یقین تھا کہ آپ کی روشن ضمیری ہمیں اپنا مدعا بیان کرنے کا موقع نہیں دے گی چنانچہ اس کے بعد آپ اپنی جگہ سے اُٹھے اور باہر نکل کر آسمان تلے کھڑے ہو گئے۔ اس وقت آسمان پر بادل کا ایک ٹکڑا بھی نہیں تھا۔ اور دُور دُور تک بارش کے قطعی آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے آپ نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا "میں دہلی میں موجود ہوں اور میری موجودگی میں بارش کی کمی؟ یہ امر میرے لیے باعث حیرت ہے حالانکہ میرے رب سے میری یہ بات طے ہے کہ جہاں بھی میں ہونگا وہاں بارش بھی ہوگی اور قحط نہیں پڑے گا۔ میرے رب تجھے معلوم ہے کہ میں دہلی میں موجود ہوں، لیکن اس کے باوجود بارش نہیں ہو رہی۔

اتنا کہنے کے بعد بدر الدین غزنوی اپنے سامنے موجود بادشاہ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے "اے وقتِ سلطان! یقین رکھو کہ جب تک بدر الدین دہلی میں زندہ موجود ہے دہلی پر کبھی قحط یا خشک سالی نازل نہیں ہو گی۔ اور نہ ہی کبھی بارش میں کمی واقع ہو گی۔

ابھی بدر الدین کے الفاظ مکمل بھی نہ ہوئے تھے کہ اچانک کالی گھٹائیں جھوم کر آئیں۔ پورا آسمان سیاہ بادلوں میں چھپ گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس قدر دھواں دھار بارش شروع ہوئی کہ بادشاہ اور اس کے وفد کو واپس اپنے محل میں جانا بھی مشکل دکھائی دینے لگا۔ بادشاہ نے بدر الدین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے واپسی کی اجازت طلب کی اور جب وہ محل تک پہنچا تو اس وقت پورا شہر مکمل طور پر بارش میں نہا چکا تھا۔

بدر الدین غزنوی کو جو کشف نصیب ہوا وہ سب قطب الدین بختیار کاکی کی نظر کرم کی وجہ سے تھا۔ وہ بدر الدین کا دوسرے تمام مریدوں سے بڑھ کر خیال رکھتے تھے جس کی وجہ سے بعض دوسرے مرید آپ سے حسد بھی کرنے لگے تھے۔ انہی مریدوں میں سے چند نے ایک روز بختیار کاکی سے عرض کیا۔

"حضرت ایک مثل مشہور ہے کہ گھٹنے ہمیشہ پیٹ کی طرف جھکتے ہیں۔ کیا یہ درست ہے؟"

آپ نے فرمایا "یہ بالکل درست ہے تم جس وقت چاہو اس کا تجربہ بھی کر سکتے ہو۔"

دوسرے مرید نے کہا "اگر ہم اکڑوں نہ بیٹھیں تو؟"

خواجہ بختیار کاکی نے کہا کہ اس کے لیے اکڑوں بیٹھنا شرط ہے ورنہ گھٹنے کسی طرف بھی نہیں جھکیں گے۔

اس موقع پر ایک اور مُرید نے پوچھا "حضرت یہ فرمائیے کیا بدر الدین آپ کے رشتہ داروں میں سے ہیں؟"

"وہ میرے عزیز ہیں مگر تم نے یہ سوال کیوں کیا"۔ بختیار کاکی نے مرید سے دریافت کیا۔

اس پر تمام مریدوں کو ہنسی آ گئی۔ ایک مرید نے دوسرے کا کندھا ہلاتے ہوئے کہا "میں نے کہا تھا... نا کہ جیت میری ہو گی۔ مجھے تو کافی عرصے سے شبہ تھا کہ بدر الدین غزنوی آپ کے رشتہ داروں میں سے ہیں۔ اسی لیے تو ان کا سب سے زیادہ خیال رکھا جاتا ہے۔

مریدوں کی یہ گفتگو سن کر بختیار کاکی نے فرمایا "یاد رکھو کہ میری مہربانیاں کسی قسم کی رشتہ داری کی محتاج نہیں ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ جو شخص جتنا جلتا ہے اُس کی خوشبو اسی قدر دور دور تک پھیل جاتی ہے، لیکن اس کے باوجود اگر تم لوگوں کو اس بات کا شکوہ ہے کہ میں بدر الدین پر اس قدر التفات کیوں کرتا

ہوں تو پھر میری بات غور سے سنو۔" بدرالدین میرا کوئی عزیز رشتہ دار نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود وہ میرے عزیز رشتہ داروں سے بھی بڑھ کر ہے۔ اس کے بعد آپ نے ایک رباعی پڑھی جس کا مفہوم یہ تھا کہ جو میرا رشتہ دار نہیں ہے وہ تیرا ذکر کرنے کی وجہ سے میرا رشتہ دار بن گیا ہے اور جو میرا رشتہ دار ہے مگر تیری عبادت سے دُور ہے تو وہ میرے دشمنوں میں سے ہے۔" خواجہ بختیار کاکی کے یہ الفاظ سن کر وہ مُرید انتہائی شرمندہ ہوئے اور پھر وہ کبھی بدرالدین غزنوی کے بارے میں بختیار کاکی سے شکایت کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔

ایک مرتبہ شیخ بدرالدین غزنوی سے اُن کے ایک مرید نے سوال کیا کہ آپ شب و روز کس اُمید پر عبادت و ریاضت میں مصروف رہتے ہیں۔ کیا اس عبادت کے عوض آپ خدا سے کسی انعام کی توقع لگائے بیٹھے ہیں۔"

اس کے جواب میں آپ نے فرمایا "میں اس کے عوض کیا چاہوں گا۔ یہ مجھ سے نہیں تم اپنے دل سے پوچھو اگر میری جگہ تم عاشق ہوتے تو اپنے عشق کے عوض اور کیا چاہتے؟"

اُس مرید نے جواب دیا "اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں سے وعدہ کر رکھا ہے کہ جنت میں انہیں حوریں دی جائیں گی۔

مرید کی اس احمقانہ بات پر بدرالدین غزنوی بے اختیار مسکرا دیئے اور فرمانے لگے "تو نے آخرت کی خوب فکر کی ہے۔ اپنے عشق کے صلے میں مانگا بھی تو کیا مانگا۔ واللہ تم نے تو کمال ہی کر دیا۔ تمہارے اس احمقانہ جواب نے مجھے انتہائی غمگین کر دیا ہے۔"

"اب آپ بتائیں کہ آپ اپنی عبادت کے صلے میں اپنے خدا سے کیا چاہیں گے؟" مُرید نے سوال کیا۔

شیخ بدرالدین غزنوی نے جواب دیا۔ بھائی میں تو جمالِ ذوالجلال کا مشتاق ہوں میں حوروں کا کیا کروں گا۔ اتنی عبادت و ریاضت کا انعام میرے نزدیک حوروں کی حصولیابی ہرگز نہیں۔ مجھے تو صرف اللہ کی رضا اور خوشنودی درکار ہے۔"

آپ کی باتوں پر آپ کے ارادت مند پر اس قدر اثر ہوا کہ اُس پر غشی طاری ہو گئی اور وہ کافی دیر تک تڑپتا رہا۔

❖

ایک شخص جسے بزرگانِ دین اور علمائے کرام سے ملاقاتوں کا بڑا شوق تھا وہ مکہ اور مدینہ سے ہوتا ہُوا ایک روز دہلی آپہنچا۔ جب دہلی میں بدرالدین غزنوی سے اُس کی ملاقات ہوئی تو وہ سکتے میں آ گیا۔ وہ بار بار آپ کو سر سے پاؤں تک دیکھ رہا تھا لگتا تھا وہ آپ سے کچھ کہنے کے لیے بیتاب ہے مگر اُس کی زبان اُس کا ساتھ نہیں دے پا رہی تھی۔

جب آپ نے اُس شخص سے مقاماتِ مقدسہ کے حالات پوچھے تو اُس کی کچھ ہمت بندھی اور اُس نے دست بستہ عرض کیا۔

"حضرت میں آپ کو کس مقدس مقام کے بارے میں بتاؤں آپ تو خود بھی مقاماتِ مقدسہ کی زیارت فرما چکے ہیں۔" اس دوران وہاں پر موجود بدرالدین کے ایک مرید نے اُس شخص کی بات کو کاٹتے ہوئے

کہا "ہمارے پیرو مرشد تو کہیں گئے ہی نہیں۔"

مرید کی بات سنکر اُس شخص کو سخت حیرت ہوئی اور وہ کہنے لگا مجھے حیرانی ہے کہ تم بدرالدین غزنوی کے مرید ہو کر جھوٹ بھی بولتے ہو۔ میں نے تو ان کو اپنی آنکھوں سے مسجد الحرام میں نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تھا۔

اس شخص کی بات سنکر آپ تو خاموش رہے مگر مرید بدستور اپنی بات پر اڑا رہا۔ اس نے کہا "جناب والا! میں اپنے پیرو مرشد کے پاس بہت زیادہ وقت گزارتا ہوں میں نے آج تک انہیں کبھی اتنے لمبے سفر پر جاتے نہیں دیکھا پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ مکہ معظمہ یا مسجد الحرام تشریف لے گئے ہوں۔

وہ شخص بھی اپنی بات پر بضد تھا کہنے لگا "بھائی میرے یقین کرو جھوٹا میں بھی نہیں ہوں میں نے انہیں مکہ معظمہ میں کئی مقامات پر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے ایک بار میں نے انہیں غلاف کعبہ پکڑے دیکھا۔ دوسری مرتبہ مسجد الحرام میں باجماعت نماز ادا کرتے ہوئے دیکھا۔ تیسری مرتبہ میں نے انہیں وہاں کے ایک بازار میں سے گزرتے ہوئے دیکھا۔ میری آنکھیں کبھی دھوکہ نہیں کھا سکتیں۔

مرید اب بھی قائل نہیں ہو رہا تھا کہنے لگا خوامخواہ شیخیاں نہ بگھارو۔ میں جانتا ہوں تم سفید جھوٹ بول رہے ہو۔ اتنا کہنے کے بعد مرید تو وہاں سے چلا گیا اور وہ شخص براہ راست بدرالدین غزنوی سے مخاطب ہوا۔ "حضرت یوں تو ہماری آپ سے ملاقات ہوتی رہتی ہیں مگر دہلی میں آپ سے مل کر بے انتہا خوشی ہوئی۔

بدرالدین غزنوی نے اُس سے دریافت فرمایا "تم حجاز سے کب آئے ہو"

"حضرت میں دو دن پہلے ہی واپس آیا ہوں" اُس شخص نے جواب دیا مگر شکل سے وہ اب بھی بہت فکر مند دکھائی دے رہا تھا آخر وہ کہنے لگا "حضرت آپ کا مرید کیونکہ یہ کہہ رہا تھا کہ آپ کبھی دہلی سے باہر ہی نہیں گئے۔ حالانکہ آپ خود جانتے ہیں کہ میں مکہ میں کئی مرتبہ آپ سے مل چکا ہوں"

آپ نے اسے کہا "کچھ اور باتیں کرو جو ہو چکا سو ہو چکا اُسے بھول جاؤ۔ اُس کا مزید چرچا کرنے کی کوشش نہ کرو"

وہ شخص بولا حضرت! "میں تو صرف اپنی بات کی وضاحت چاہتا ہوں"

آپ نے فرمایا "میں انکار کب کر رہا ہوں، لیکن یہ ایسی بات نہیں کہ جس کا برملا اظہار کیا جائے" اُس شخص نے کہا "مجھے حیرت اس بات پر رہتی تھی کہ جس جگہ بھی میں آپ سے بات کرنے کی کوشش کرتا تھا آپ خاموش رہتے تھے اور کسی سے کوئی بات نہیں کرتے تھے۔

شیخ بدرالدین غزنوی نے دوبارہ اُسے یہ کہہ کر خاموش کرا دیا کہ یہ معاملات میرے اور میرے خدا کے درمیان ہیں اس لیے مزید تقاضا نہ کرو۔

شیخ بدرالدین غزنوی کی ساری زندگی اپنے خدا سے عشق کرتے ہوئے گزر گئی۔ علم و عرفان کشف اور تصوف میں جو کمال حاصل ہوا وہ آپکے کسی اور ہم عصر کو نصیب نہ ہو سکا۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ درویشی راحت و آرام کا نہیں بلکہ درویشی اذیتوں اور مشکلات کو برداشت کرنے سے ملتی ہے۔ اسلام کا یہ عظیم فرزند جس کا نام اسلامی تاریخ میں سنہری حروف سے لکھا ہے۔ ۶۵۷ ہجری کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملا۔

●●

ایک پیر صاحب کے بارے میں مشہور تھا کہ جو شخص انہیں کوئی تکلیف پہنچانے کی کوشش کرتا ہے اُس کو اپنے اُس بُرے فعل کی اُسی وقت سزا مل جاتی ہے۔ ایک مرتبہ یہ پیر صاحب غسل فرما رہے تھے کہ اِس دوران کوئی شخص موقع پا کر آپ کا لباس اُٹھا کر چلتا بنا، لیکن ابھی وہ تھوڑی دُور ہی گیا تھا کہ اُس کے دونوں ہاتھ بیکار ہو گئے مگر جب وہ شخص آپ کے کپڑے واپس لے آیا تو پیر صاحب نے اُس کے حق میں دُعا کرتے ہوئے کہا: اے اللہ تعالیٰ جس طرح اس شخص نے میرے کپڑے واپس لوٹائے ہیں اُسی طرح تو اُس کے ہاتھوں کی توانائی بھی واپس لوٹا دے۔ ابھی پیر صاحب کی دُعا ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ اُس شخص کے بازوؤں کی توانائی بحال ہو گئی۔

یہ پیر صاحب فرمایا کرتے تھے کہ جب مَیں غسل کرتا ہوں تو قدرت میرے کپڑوں کی نگرانی کرتی ہے آپ کی بات سُنکر لوگ بہت حیران ہوئے اور کہنے لگے کہ آخر یہ سب کیسے ہو جاتا ہے۔ پیر صاحب نے فرمایا کہ تم میں سے خود کوئی شخص کسی دن آزمائش کر کے دیکھ لے۔

چنانچہ ان لوگوں میں سے ایک شخص نے تہیہ کر لیا کہ وہ کسی دن پیر صاحب کے اس دعوے کی صداقت کی آزمائش کرے گا۔ لہٰذا ایک دن جب پیر صاحب نہا رہے تھے تو مذکورہ شخص وہاں آیا اور چپکے سے پیر صاحب کا لباس بغل میں دبا کر ایک سمت کو چل دیا، لیکن ابھی وہ تھوڑی دُور ہی گیا تھا کہ اُس کی ٹانگوں میں اچانک لرزہ سا طاری ہو گیا اور اُس کے قدم منوں بھاری ہو گئے۔ اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اُس کے پاؤں زمین میں گڑھے جا رہے ہوں اپنی یہ کیفیت دیکھ کر اُسے دن میں تارے نظر آنے لگے۔ مگر جب اس نے واپس پیر صاحب کو لباس لوٹانے کا فیصلہ کیا تو اس کی پہلے والی حالت واپس لوٹ آئی چنانچہ وہ بھاگم بھاگ پیر صاحب کے پاس پہنچا اور ان کے قدموں میں لوٹ کر بے اختیار پکار اُٹھا کہ پیر صاحب واقعی اللہ کے سچّے اور صاحبِ کمال بزرگ ہیں خدارا میری اس گستاخی کو معاف فرما دیں۔ دراصل میرا ارادہ

...کے کپڑوں کی چوری کا ہرگز نہ تھا بلکہ میں صرف یہ آزمائش کرنا چاہتا تھا کہ آپ کے دعویٰ کی حقیقت ...ہے۔"

اُس شخص کی باتیں سُن کر پیر صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا "اب تو تجھے میری اس بات کا یقین آگیا کہ ...میں نہار ہا ہوتا ہوں تو قدرت خود میرے کپڑوں کی حفاظت کرتی ہے۔"

یہ پیر صاحب جن کی کرامت یہاں بیان کی گئی اُن کو تصوّف و معرفت کی تاریخ میں آج بھی دنیا حضرت ...الحسن نوری کے نام سے یاد کرتی ہے۔ آپ اپنے دَور کے اُن ممتاز ترین بزرگوں میں سے ہوئے ہیں جن ...مام شیوخ نے عظمت و مرتبت کے اعتبار سے امیر القلوب کا خطاب عطا کیا۔

حضرت ابوالحسن نوری کا شمار حضرت جنید بغدادی کے ہم عصروں میں ہوتا ہے۔ آپ حضرت سری سقطی کے پیرو ...ید بھی تھے۔ دینی اور روحانی علوم پر عبور حاصل کرنے کی خاطر آپ نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ حضرت احمد حواری ...حبت میں گزارا۔ حضرت ابوالحسن نوری اپنے مسلک کے اعتبار سے تصوف کو فکر پر ترجیح دیا کرتے تھے۔ آپ ...نظریہ یہ تھا کہ جو شخص ایثار و قربانی کا جذبہ نہیں رکھتا اور جو اپنی ذات سے باہر نکلنے کی ہمت نہیں رکھتا۔ ...سی بھی شیخ کی صحبت اختیار کرنے کا مستحق نہیں۔ آپ کو نوری کا خطاب اس لیے دیا گیا تھا کہ آپ کے ...سے ایسا نور ہویدا ہوتا تھا کہ پورا مکان منور ہو جاتا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ جنگل کی جس جھونپڑی میں ...مشغول ریاضت رہتے تھے وہ آپ کی کرامت سے رات کی تاریکی میں بھی روشن ہو جایا کرتی تھی۔ آپ ...بارے میں حضرت ابواحمد لغاری کا یہ قول تھا کہ انہوں نے حضرت جنید کو بھی حضرت ابوالحسن نوری سے ...ہ عبادت کرتے دیکھا۔

عبادت کے دوران آپ اس قدر مگن ہوتے تھے کہ گردوپیش کے ماحول سے آپ قطعی بے خبر ہوتے ...۔ ابوالحسن نوری سے زیادہ کسی ولی اللہ کو اس کیف وجد کی حالت میں نہیں دیکھا گیا۔ ایک مرتبہ حضرت ...بلی نے آپ کو کچھ اس طرح محو مراقبہ پایا کہ اُن کے جسم کا ایک رواں تک حرکت نہیں کر رہا تھا۔ حضرت ...بلی کی یہ کیفیت دیکھتے ہوئے حضرت شبلی نے سوال کیا۔

"آپ نے مراقبے کا یہ ... ل کس سے حاصل کیا ہے؟"

اس کے جواب میں حضرت ابوالحسن نوری نے فرمایا کہ میں نے مراقبے کا یہ کمال ایک بلی کو دیکھ کر حاصل کیا ہے۔ ...یک مرتبہ کسی چوہے کے بل کے سامنے مجھ سے بھی زیادہ بے حس و حرکت بیٹھی ہوئی تھی۔ جبکہ میں تو پھر ...انسان ہوں اور خدا سے محبت کا دعوے دار ہوں۔ آپ کی بات سُن کر حضرت شبلی لاجواب ہو گئے۔

شروع شروع میں حضرت نوری کا طریقہ کار یہ ہوتا تھا کہ جب آپ اپنی دُکان پر جانے کے لیے گھر سے ...ہوا کرتے تھے تو آپ کے پاس کھانا بھی ہوا کرتا تھا مگر راستے میں آپ وہ کھانا کسی سائل کو خیرات ...کرتے تھے اور خود بھوکے ہی دُکان پر بیٹھے رہتے تھے۔ یہ سلسلہ تقریباً بیس برس تک جاری رہا۔ گھر ...سمجھتے تھے کہ آپ نے دُکان پر ہی کھانا کھا لیا ہوگا۔

آپ فرمایا کرتے تھے کہ میرے لیے برسوں کے مجاہدے اور خلوتیں سب بے سود ثابت ہوئیں اور جب ...یائے انبیاء کرام کے قول کے مطابق یہ غور کرنا شروع کیا کہ شاید میری عبادت میں ریا اور خود غرضی کا عنصر ...ل ہو گیا ہو تو مجھ پر یہ حقیقت آشکارا ہوئی کہ میرے نفس نے میرے قلب سے ساز باز کر رکھی ہے اور اس ...کے منکشف ہونے کے بعد جب میں نے اپنے نفس کے خلاف جنگ شروع کی تو میرے اُوپر باطنی اسرار و

رموز کا انکشاف ہونے لگا اور جب مَیں نے نفس سے اس کی کیفیت پوچھی تو اُس نے کہا۔ میری کوئی مراد پوری نہ ہو سکی۔ آپ مزید فرماتے ہیں کہ اس کے بعد مَیں نے دریائے دجلہ میں مچھلی پکڑنے کا جال ڈال دیا اللہ تعالیٰ سے عرض کی کہ جب تک اس جال میں مچھلی نہیں پھنسے گی۔ مَیں یوں ہی کھڑا رہوں گا۔ ابھی مَیں نے اپنے الفاظ بھی مکمل نہیں کیے تھے کہ مچھلی جال میں پھنس گئی۔ چنانچہ مَیں نے اس واقعہ کا ذکر جب حضرت جنید سے کیا تو آپ نے فرمایا۔ "اگر تم مچھلی کے بجائے سانپ کا شکار کرتے تو یقیناً کرامت ہوتی، لیکن ابھی چونکہ تم منزل میں ہو اس لیے تمہارے اس واقعہ کو تمہاری کرامت سے نہیں بلکہ فریب سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

عبادت و ریاضت کے ابتدائی دنوں میں آپ انتہائی بلند آواز میں خدا کا ورد کیا کرتے تھے۔ ایک روز کچھ لوگ حضرت جنید کے پاس آئے اور انہوں نے بتایا کہ گزشتہ تین روز سے مسلسل حضرت نوری ایک پتھر پر بیٹھ کر با آوازِ بلند اللہ تعالیٰ کا ورد کر رہے ہیں انہیں اور کسی چیز کا ہوش نہیں حتیٰ کہ انہوں نے کھانے سے بھی منہ موڑ رکھا ہے مگر نماز اپنے وقت پر ادا کر لیتے ہیں۔ ہمیں ڈر ہے کہ اس بھوک پیاس کی حالت مسلسل با آوازِ بلند وردِ الٰہی کرنے سے کہیں اُن کو نقصان نہ پہنچے لہٰذا آپ وہاں تشریف لے جا کر انہیں ہدایت فرمائیں۔

وہاں پر موجود ایک اور ارادت مند نے کہا کہ حضرت یہ تو فنائیت کی دلیل نہیں بلکہ ہوشیاری کی علامت کیونکہ فانی کو کسی طور بھی نماز کا ہوش باقی نہیں رہتا۔

اُن لوگوں کی باتیں سنکر حضرت جنید نے فرمایا۔

"لوگو! بات وہ نہیں ہے جو تم سمجھ رہے ہو بلکہ اس وقت نوری پر وجد کی کیفیت طاری ہے اور وجد ہوتا ہے خدا اُن کی حفاظت کرتا ہے۔"

اس کے بعد حضرت جنید اس مقام پر پہنچے جہاں حضرت نوری ایک پتھر پر بیٹھے زور و شور سے اللہ ورد کر رہے تھے۔ آپ نے حضرت نوری سے کہا کہ اگر اللہ تعالیٰ کو رضا پسند ہے تو پھر آپ شور و غوغا کرتے ہیں۔

یہ سنکر ابوالحسن نوری نے شور بلند کرتے ہوئے کہا۔

"اے جنید آپ میرے بہترین اُستاد ہیں۔"

برسوں کی عبادتوں اور ریاضتوں کے بعد جب آپ بزرگی کی انتہا کو پہنچ گئے تو دُور دُور سے لوگ آپ کے دیدار کے لیے حاضری دینے لگے۔ اسی زمانے میں اصفہان میں رہنے والے ایک نوجوان کے دل میں آپ کو دیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ اور وہ دن رات آپ کا دیدار کرنے کے لیے تدبیر سوچنے لگا مگر اسی دوران اصفہان کے شاہ کو بھی اس نوجوان کے ارادے کا علم ہو گیا۔ وہ کسی طور پر یہ نہیں چاہتا تھا کہ یہ نوجوان حضرت نوری سے ملاقات کے لیے جائے چنانچہ اُس نے نوجوان کو اُس کے عزم و ارادے سے باز رکھنے کے لیے طرح طرح کے لالچ دیئے کہ اگر تم اس سے نہ ملنے جاؤ تو مَیں تمہیں ایک محل کے علاوہ ایک ہزار ایک کنیز دوں گا صرف یہی نہیں بلکہ تم اور بھی جس چیز کی طلب کرو گے تمہیں مل جائے گی، لیکن شرط یہ کہ تم ابوالحسن نوری کے پاس جانے کا ارادہ ترک کر دو، لیکن وہ نوجوان بھی حضرت نوری سے ملنے کا تہیہ کیے ہوئے تھا۔ اُس نے شاہ کی جانب سے پیش کردہ تمام آسائشوں کو ٹھکرا دیا اور شوقِ دیدار میں

...آپ کے دیدار کے لیے چل پڑا۔
دوسری جانب حضرت ابوالحسن نوری کو بھی غیب سے یہ اشارہ ہو گیا کہ اُن کا کوئی چاہنے والا بڑی دُور سے دیوانہ وار چلا آ رہا ہے چنانچہ اُنہوں نے اپنے ارادت مندوں کو ہدایت کی کہ ایک میل تک زمین کو صاف و ...ت کر دیا جائے کیونکہ ہم اپنے عاشق کو پورے اعزاز کے ساتھ ـــــ خوش آمدید کہنا چاہتے ہیں۔ اور جب ...جوان حاضرِ خدمت ہُوا تو حضرت ابوالحسن نوری نے اُس کے سامنے بادشاہ کے ارادے اور اُس کے عزم ...را قصہ بیان کر دیا جس کو سُنکر نوجوان حیرت زدہ رہ گیا۔ پھر آپ نے اُس نوجوان سمیت تمام مریدوں ...طب کر کے فرمایا۔
"مرید کی شان یہ ہے کہ اگر اُس کے سامنے سارے جہان کی نعمتیں بھی پیش کر دی جائیں تو وہ اُن پر ...نکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔"

✻

حضرت ابوالحسن نوری ہر کام خدا کی خوشنودی اور تسلیم و رضا کے لیے کیا کرتے تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ جب ...خوش ہو جاتا ہے تو خلق خدا خود بخود خوش ہو جاتی ہے لیکن جو شخص بندوں کی رضا اور خوشنودی کے ...کوئی نیک کام کرتا ہے تو وہ اپنے ہاتھوں سے اپنی نیکی کو برباد کر دیتا ہے۔
...کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ شہر بغداد میں سخت آتش زنی کا واقعہ ہوا جس کے نتیجے میں بے شمار لوگ جل کر ...ہو گئے۔ اتفاق سے اس آگ میں ایک بہت بڑے رئیس کے کچھ خاص غلام بھی پھنسے ہوئے تھے۔ چونکہ ...کو بھی اپنی بے پناہ دولت کا غرور تھا اور وہ دولت کے بل بوتے پر جائز و ناجائز کام کروانے کا عادی ...چنانچہ اس موقع پر بھی اُس نے اعلان کر دیا کہ جو کوئی میرے غلاموں کو اس آگ سے باہر نکالے گا ...وہ دو ہزار دینار انعام دے گا۔
...ن اتفاق سے حضرت ابوالحسن نوری بھی اُس وقت وہاں سے گزر رہے تھے۔ آپ نے فوراً باآوازِ ...اللہ پڑھی اور آگ میں کود کر رئیس کے دونوں غلاموں کو پل بھر میں باہر نکال لائے۔ حیرت کی بات ...ک نے آپ کو ذرا برابر بھی نقصان نہ پہنچایا۔ اِدھر جب رئیس کو یہ بتایا گیا کہ آپ نے اُس کے ...ں کو زندہ سلامت آگ سے باہر نکال لیا ہے تو اُس نے فوراً آپ کو طلب کیا۔ جب آپ وہاں ...ف لے گئے تو رئیس نے دو ہزار دینار کی تھیلی حضرت نوری کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔ آپ نے ہمارے ...کے مطابق ہمارے غلاموں کو بچایا اب ہم اپنے وعدے کے مطابق آپ کو انعام پیش کرنا چاہتے ہیں۔
...ن کی بات سُنکر آپ سخت برہم ہوئے اور فرمانے لگے "اے امیر شخص! میرا انعام تو مجھے اللہ کی طرف ...ل گیا کہ اس نے میرے وسیلے سے دو آدمیوں کو نئی زندگی دے دی، لیکن اگر تم جیسے رئیس چند ہزار دینار ...لے میں انسانوں کی زندگیاں بچانے پر قادر ہوتے تو کبھی کوئی شخص نہ مرتا۔"
...ن آپ کی بات سُنکر اس قدر متاثر ہُوا کہ اُس نے اپنا سارا مال و اسباب اللہ کی راہ میں تقسیم کر دیا ...کے لیے آپ کے ارادت مندوں میں شامل ہو گیا۔
حضرت نوری فرمایا کرتے تھے کہ دورانِ طواف ایک مرتبہ مَیں نے دُعا مانگی کہ اے اللہ تعالیٰ مجھے وہ مقام عطا کر دے جس میں کبھی تغیّر نہ ہو چنانچہ غیب سے صدا آئی اے ابوالحسن کیا تُو ہمارے مساوی ہونا چاہتا ...یہ وصف تو ہمارا ہے کہ ہماری وضاحت میں کبھی تغیّر اور تبدل رونما نہیں ہوتا، لیکن ہم نے اپنے

بندوں میں اس لیے تغیر و تبدل رکھا ہے کہ جس سے ہماری عبودیت ——— کا اظہار ہوتا ہے۔
حضرت نوری ایک صاحب کرامت بزرگ تھے آپ کے فیض سے ایسی ایسی کرامات دوپذیر ہوئیں کہ جن کو عقل والے نہیں صرف اہل دل اور اہل خانہ ہی تسلیم کر سکتے ہیں۔ ایک مرتبہ آپ کہیں سفر پر جا رہے تھے کہ راستے میں آپ نے ایک آدمی کو دیکھا جو اپنے مُردہ گدھے کے پاس بیٹھا رو رہا تھا۔
"کیوں بھئی کیا بات ہے تم کیوں رو رہے ہو؟" آپ نے اس کے قریب جا کر پوچھا۔
وہ شخص بولا۔ حضرت کیا بتاؤں۔ میں اپنا مال اسباب لے کر کہیں جا رہا تھا کہ دورانِ سفر اچانک میرا گدھا گر کر مر گیا۔ اب میں اس تصور سے رو رہا ہوں کہ میں کس طرح یہ مال و اسباب اُٹھا کر منزل مقصود تک پہنچوں گا۔ کیونکہ میری منزل یہاں سے کوسوں دور ہے۔"
حضرت ابوالحسن نوری نے ایک نظر گدھے پر ڈالی اور پھر گدھے کو ٹھوکر مار کر فرمانے لگے "کیا یہ سونے کا وقت ہے چلو اُٹھو اور اپنے مالک کا سامان اُس کی منزل تک پہنچاؤ۔"
حضرت نوری کا حکم سُنتے ہی مردہ گدھا ایک دم اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور یوں وہ مسافر اپنا مال و اسباب اُس پر لاد کر منزل کی جانب روانہ ہو گیا۔
آپ کو مخلوق خدا سے بے پناہ محبت تھی۔ مفادِ عامہ کے لیے آپ اپنے جان و مال اور تن من دھن سب کو نثار کرنے کا جذبہ رکھتے تھے۔ خود کئی کئی دنوں بھوکے رہتے اور اپنے حصے کا کھانا دوسروں کو کھلا دیتے۔ آپ سجدے کی حالت میں کافی دیر تک رو رو کر مخلوقِ خدا کی بخشش کی دُعائیں مانگتے رہتے تھے۔ حضرت جعفر خلدی بیان کرتے ہیں کہ میں نے بذاتِ خود آپ کو یہ مناجات کرتے سُنا ہے۔
اے اللہ تو اپنے ہی پیدا کردہ بندوں کو اُن کے گناہوں کی سزا اُنہیں جہنم کی آگ میں ڈال کر دے لیکن اے خدائے کریم تیرے اندر یہ قدرت بھی ہے کہ تو صرف میرے وجود کو جہنم میں ڈال کر تمام جہنم کو بہشت میں بھیج دے۔ حضرت جعفر کہتے ہیں کہ اُسی رات میں نے خواب میں کسی کو یہ الفاظ سُنا کہ ابوالحسن نوری تک ہمارا یہ پیغام پہنچا دو کہ ہم نے مخلوق خدا کی محبت کے صلے میں تمہاری مغفرت کر دی۔
دوسروں کی جگہ نثار ہونا آپ کا خاص وصف تھا۔ آپ ہر وقت اسی موقع کی تلاش میں رہتے کہ کسی نہ کسی طرح آپ کو دوسروں کے لیے کوئی اچھا کام کرنے کا موقع میسر آ جائے۔ روایت ہے کہ ایک مرتبہ جب غلام خلیل نے بزرگ دشمنی میں خلیفہ سے یہ شکایت کرتے ہوئے کہا کہ یہاں ایک گروہ پیدا ہو چکا ہے جو رقص و سرود کی محفلیں منعقد کرتا ہے اشاروں کنایوں میں گفتگو کرتا ہے اور ایسے بدکلمات نکالتا ہے جس کی سزا کم از کم موت ہے۔
خلیفہ نے بغیر سوچے سمجھے یہ حکم جاری کر دیا کہ تمام مشائخین کو فوری طور پر قتل کر دیا جائے۔ حکم کی تعمیل کرنے کے لیے فوری طور پر کارروائی شروع کر دی گئی۔ جلاد سب سے پہلے جب حضرت کو قتل کرنے کے لیے آگے بڑھا تو حضرت نوری مسکراتے ہوئے اُن کی جگہ جا بیٹھے۔ اس پر لوگوں نے حضرت سے کہا۔
"ابھی تو آپ کا نمبر نہیں آیا پھر آپ حضرت ارقام کی جگہ پر کیوں آ بیٹھے ہیں۔"
حضرت نوری مسکراتے ہوئے فرمانے لگے۔ "میری بُنیاد طریقت اور مذہب ایثار پر قائم ہے اور دوست کی جان کے بدلے میں اپنی جان دینا زیادہ بہتر تصور کرتا ہوں حالانکہ میرے نزدیک دُنیا کا ایک لمحہ

ہزار سال سے افضل ہے کیونکہ دنیا مقامِ خدمت ہے اور عقبیٰ مقامِ قربت ہے لیکن خدمت کے بغیر قربت کا حصول ناممکن ہے"۔

حضرت نوری کی زبانی یہ عجیب وغریب کلمات سُنکر قاضی سے خلیفہ نے سوال کیا کہ ان کے بارے میں کیا شرعی حکم ہے۔ قاضی نے وہاں پر موجود حضرت شبلی کو دیوانہ تصور کرتے ہوئے سوال کیا بیس دینار پر کتنی زکوٰۃ ہوتی ہے۔

حضرت شبلی نے فرمایا "ساڑھے بیس دینار۔ یعنی نصف دینار مزید اس جرم میں ادا کرے کہ اُس نے بیس دینار کیوں جمع کیے جس طرح حضرت ابوبکر صدیق کے پاس چالیس دینار تھے اور انہوں سب کے سب زکوٰۃ میں دے دیئے تھے۔

پھر قاضی نے حضرت نوری سے سوال کیا جس کا انہوں نے برجستہ جواب دے کر قاضی سے سوال کیا کہ اب تم بھی سُن لو کہ خدا نے ایسے بندے بھی تخلیق فرمائے ہیں جن کی حیات و ممات اور قیام وکلام سب اسی کے مشاہدے سے وابستہ ہیں اور اگر ایک لمحے کے لیے بھی وہ مشاہدے سے محروم ہو جائیں تو موت واقع ہو جائے اور یہی وہ لوگ ہیں جو اسی کے سامنے رہتے ہیں۔ اسی سے کھاتے ہیں۔ اسی سے سُنتے ہیں اور اسی سے طلب کرتے ہیں۔

یہ جواب سن کر قاضی نے خلیفہ سے کہا کہ اگر ایسے افراد بھی زندیق ہو سکتے ہیں تو پھر میرا فتویٰ یہ ہے کہ پورے عالم میں کوئی بھی موحد نہیں ہے اور جب خلیفہ نے ان حضرات سے کہا کہ مجھ سے کچھ طلب کیجیے تو سب نے یہی جواب دیا۔

"خلیفہ ہماری خواہش ہے کہ آپ ہمیں فراموش کر دیں"۔
یہ سُنکر خلیفہ پر رقت طاری ہو گئی اور اُس نے سب کو تعظیم واحترام کے ساتھ رخصت کیا۔

ایک مرتبہ حضرت شبلی وعظ فرما رہے تھے۔ اس موقع پر جب حضرت نوری نے وہاں پہنچ کر اسلام علیکم یا ابوبکر کہا تو انہوں نے جواب دیا "وعلیکم السلام یا امیر القلوب"۔ پھر آپ نے فرمایا کہ بے عمل عالم سے اللہ تعالیٰ خوش نہیں ہوتے۔ لہٰذا اگر تم باعمل عالم ہو تب تو اپنا وعظ جاری رکھ سکتے ہو۔ دوسری صورت میں تمہیں منبر سے نیچے اُتر آنا چاہیے۔

یہ سُنکر جب حضرت شبلی نے آپ کے قول پر غور کیا تو انہیں محسوس ہُوا کہ عمل میں یقیناً کوئی کمی ہے چنانچہ وہ منبر سے نیچے اُتر کر گوشہ نشین ہو گئے مگر کچھ ہی عرصہ بعد لوگوں نے اُنہیں مجبور کر کے دوبارہ منبر پر لا کھڑا کیا۔

ادھر یہ اطلاع جب حضرت ابوالحسن نوری تک پہنچی تو وہ دوبارہ وہاں پہنچے اور فرمانے لگے "شبلی! جب تم نے مخلوق سے چھپنے کی کوشش کی تو وہ تعظیماً تمہیں دوبارہ منبر پر لے آئے، لیکن میں نے مخلوق خدا سے رابطہ قائم رکھتے ہوئے جب اُنہیں ہدایت کا راستہ دکھایا۔ تو انہوں نے مجھے پتھر مارنے سے بھی گریز نہ کیا۔

یہ سُنکر حضرت شبلی نے آپ سے دریافت کیا: آپ کی ہدایت اور میری پوشیدگی کا کیا مفہوم ہے؟
حضرت نوری نے فرمایا: "میری ہدایت تو یہ تھی کہ میں نے خدا کے لیے مخلوق سے رابطہ قائم کیا اور تمہاری

پوشیدگی کا مفہوم یہ ہے کہ تم خالق و مخلوق کے درمیان حجاب و واسطہ بنے رہے جبکہ تمہیں یہ حق حاصل نہیں ہے کہ تم دونوں کے درمیان حجاب و واسطہ بن سکو اور مجھے کسی واسطہ کی ضرورت نہیں اسی لیے میں تمہیں کار آمد بندہ تصور کرتا ہوں۔

ایک مرتبہ حضرت ابوالحسن نوری سخت علیل ہوگئے اور اس موقع پر حضرت جنید آپکی مزاج پرسی کے لیے آئے اور آپکو کچھ غلطیوں اور پھولوں کے تحائف پیش کیے۔ اس کے بعد ایک بار جب حضرت جنید علیل ہوئے تو حضرت نوری بھی اپنے مُریدوں کے ہمراہ اُن کی تیمارداری کے لیے تشریف لے گئے اور مریدوں سے فرمایا کہ وہ سب لوگ جنید کا مرض اپنے اوپر تقسیم کر لیں۔ ابھی آپ نے اپنے مریدوں کو ہدایت ہی کی تھی کہ حضرت جنید صحت یاب ہو گئے۔ اس پر آپ نے مسکراتے ہوئے حضرت جنید سے فرمایا کہ پھل اور پھول کی بجائے اس طرح عبادت کرنی چاہیے۔

آپ ہمیشہ لوگوں کو تلقین کیا کرتے تھے کہ مصائب کو ہنسی خوشی برداشت کرنا چاہیے کیونکہ تکالیف اور مصائب بھی اللہ کی طرف سے اپنے بندوں کے لیے ایک انعام ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ کچھ لوگ ایک ضعیف العمر شخص کو زدوکوب کرتے ہوئے قید خانے کی طرف لے جا رہے تھے اور وہ انتہائی صبر و ضبط کے ساتھ خاموشی سے یہ ظلم و ستم برداشت کرتا جا رہا تھا۔ حضرت نوری نے قید خانے میں جا کر اس شخص سے پوچھا کہ اس قدر نقاہت اور کمزوری کے باوجود اُس نے یہ ظلم کیسے برداشت کر لیا۔ اُس شخص نے جواب دیا ”صبر کا تعلق ہمت اور شجاعت سے ہوتا ہے نہ کہ طاقت اور قوت سے۔“

آپ نے اُس بوڑھے شخص سے پوچھا کہ اُس کے نزدیک مصائب کا کیا مفہوم ہے۔ اُس نے جواب دیا کہ مصائب کو اسی طرح خوشی خوشی برداشت کرنا چاہیے جس طرح لوگ مصائب سے نجات حاصل کر کے مسرور ہوتے ہیں۔ حضرت نوری نے اُس کے گراں قدر خیالات کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ آگ کے سات سمندر پار کرنے کے بعد معرفت حاصل ہوتی ہے اور جب ایسا ہو جاتا ہے تو اول و آخر کا علم ہو جاتا ہے۔

آپ کا وصال بھی بڑے عجیب و غریب انداز میں ہوا۔ آپ سفر پر جا رہے تھے کہ راستے میں آپ کو ایک نابینا شخص ملا۔ جو اللہ اللہ کرتا ہوا کہیں جا رہا تھا۔ آپ نے اُس شخص سے فرمایا تو اللہ کو کیا جانے؟ اگر اللہ کو جان لیتا تو زندہ نہ رہتا یہ فرما کر آپ پر بیہوشی کی کیفیت طاری ہو گئی۔ کچھ دیر بعد جب آپ ہوش میں آئے تو آپ نے بیابان جنگل کا رُخ کیا وہاں پہ آپ کے جسم میں بانس کی اس قدر پھانسیں چبھیں کہ جسم مبارک سے خون بہنے لگا اور خون کے ہر قطرے سے اللہ تعالیٰ کے نام کا نقش ظاہر ہونے لگا اس کیفیت میں آپ کے مریدین آپکو اُٹھا کر گھر لے آئے اور آپ لاالٰہ الا اللہ کا ورد کرتے ہوئے اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ آپ کا مزار مبارک بغداد میں ہے۔
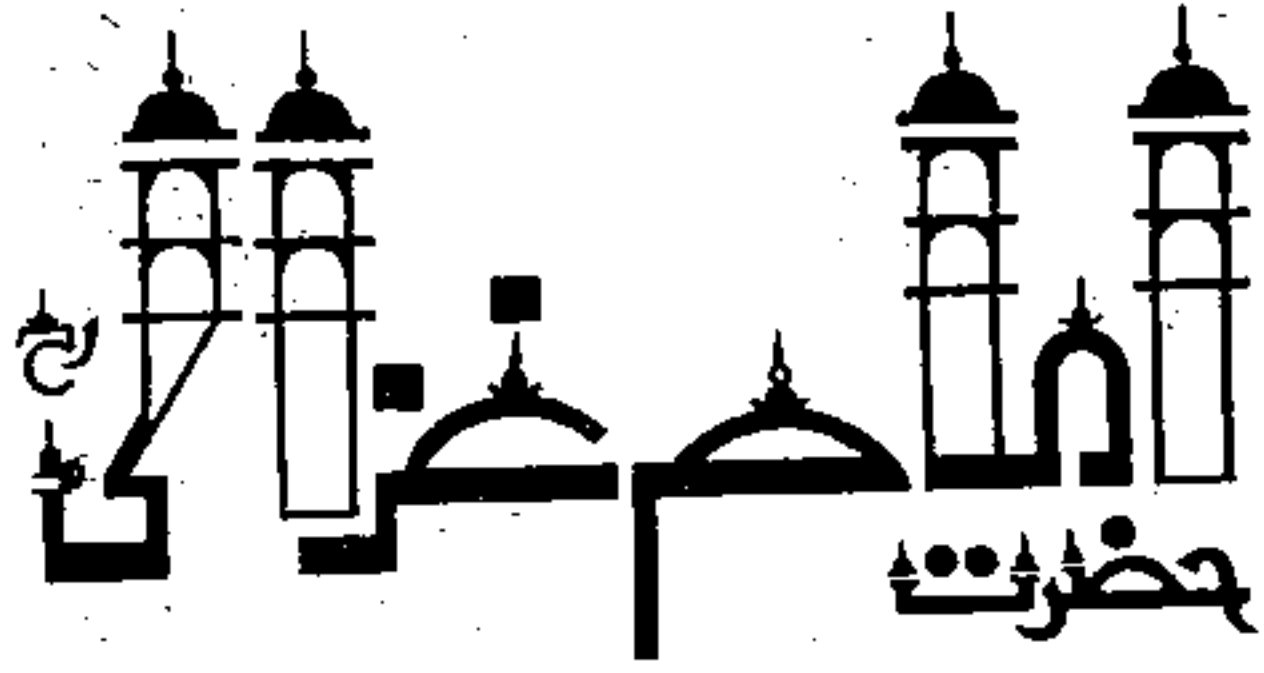
امام غزالیؒ کا پورا نام زین الدین ابو حامد محمد بن محمد بن احمد طوسی غزالی ہے۔ آپ ایک ایرانی خاندان میں طوس کے قصبے طاہران میں ۴۵۰ھ میں پیدا ہوئے۔ یہ طغرل سلجوقی کے دور کا آخری زمانہ تھا۔ امام صاحب کے والد محمد بن محمد مردِ صالح، درویش مزاج اور عبادت گزار تھے۔ [لکھنے] پڑھنے سے ناواقف ہونے کے باوجود علماء، فقہا اور صلحاء سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ دست و [ب]ازو کی محنت سے رزق حلال کھاتے تھے۔ انہوں نے ۴۶۵ھ میں وفات پائی اور اپنے ایک صوفی مشرب [د]وست ابو حامد احمد بن محمد راز کانی کو اپنا وصی مقرر کیا اور اپنے دونوں فرزند محمد اور احمد کو ان کے سپرد کر [د]یا۔ امام غزالیؒ کے ایک بھائی امام احمد غزالی بھی تھے۔

امام غزالی کے نام کے ساتھ "غزالی" کی وجہ تسمیہ جاننے کے لیے علماء نے دو توجیہات پیش کی ہیں۔ بعض [عل]ماء کے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کے والد دھاگے کا کاروبار کرتے تھے اور اسی مناسبت سے [غ]زالی کہلائے اور بعض کے نزدیک غزالہ گاؤں کی نسبت سے غزالی کہلائے تھے۔ شبلی نعمانی کی تحقیق سے [غز]الہ نامی کوئی گاؤں اس علاقے میں نہیں پایا گیا۔ لہٰذا شبلی نعمانی کے نزدیک اپنے والد بزرگوار کے پیشہ [کی] وجہ سے ہی یہ امام غزالیؒ کہلائے۔

امام غزالیؒ حد سے زیادہ ہوش مند اور ذہین تھے۔ ابتدائی تعلیم طوس میں ہی اپنے بھائی کے ہمراہ [اپ]نے والد بزرگِ محترم کی زندگی میں ہی حاصل کی۔ پھر مزید علوم دینی و ادبی حاصل کرنے کے لیے آپ [جرج]ان چلے گئے اور وہاں پر امام ابو نصر اسماعیلی کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔ تحصیل علم کے بعد آپ [جرج]ان سے طوس واپس آ گئے۔ امام غزالی نے ابتدائی تعلیم طوس اور جرجان میں رہ کر حاصل کی مگر تحصیل [علم] کی خواہش نے آپ کو سکون سے نہ بیٹھنے دیا اور آپ طوس سے نیشاپور روانہ ہو گئے۔ نیشاپور اُن [د]ن علمائے خراسان کا مرکزِ علم تھا۔ وہاں امام غزالیؒ عالم امام الحرمین ابو المعالیؒ کے حلقہ درس میں شامل ہو

گئے۔

امام الحرمین کے حلقۂ درس میں تقریباً چار سو طلباء شریک تھے۔ امام غزالیؒ انتہائی جوش و خروش اور سرگرمی سے علم کے حصول میں لگ گئے اور جلد ہی تمام علوم علم الکلام اور مقدمات فلسفہ میں بے پناہ عبور حاصل کر لیا۔

امام غزالیؒ اپنے استاد محترم امام الحرمین کی رحلت کے بعد نیشاپور سے رخصت ہو کر قریبی چھاؤنی میں خواجہ نظام الملک طوسی کی بارگاہ سے وابستہ ہو گئے۔

امام غزالیؒ کی عمر ابھی اٹھائیس سال بھی نہ ہوئی تھی کہ آپ نے اپنے عہد کے علوم و فنون متداولہ یعنی زوبیات و فقہ، اصول اور حدیث وغیرہ میں ایسی مہارت حاصل کر لی کہ استادِ وقت بن گئے۔ نظام الملک طوسی نے امام غزالیؒ کی شخصیت علم فصاحت و بلاغت نقطہ رسی بالغ نظری اور دیگر خصوصیات سے متاثر ہو کر نظامیہ بغداد کا صدر مدرسی کا عہدہ ۴۸۴ھ میں آپ کے سپرد کر دیا۔ نظامیہ بغداد عالم اسلام کی سب سے بڑی یونیورسٹی یا درس گاہ تھی اور اس وقت کا عالم اسلام علوم و فنون کا جس طرح سے پشت پناہ اور سرپرست تھا۔ اس کی کوئی مثال نہیں۔ علماء کی قدردانی کا یہ عالم تھا کہ ان کی آمد پر سلاطین اور وزراء کھڑے ہو جاتے اور اپنی مسندیں ان کے لیے خالی کر دیتے تھے اور علماء کی یہ شان تھی کہ وہ سلاطین کے مقابلے پر جس بات کو حق سمجھتے کہہ دیتے تھے۔

۴۸۴ھ میں جب امام غزالیؒ بغداد میں داخل ہوئے تو آپکی یہ شان تھی کہ پورے عالم اسلام میں کوئی بھی ہمسر نہیں تھا۔ امام غزالیؒ ۴۸۸ھ تک نظامیہ بغداد کے صدر مدرس رہے۔ یہاں پر بہت سے علماء و فضلا نے ان سے استفادہ کیا۔ ان کے حلقۂ درس میں تقریباً چار سو شاگرد تھے جو مدرس کے درجے کے تھے اور علماء اور وزراء اور دیگر لوگ اس کے علاوہ تھے۔ بغداد کے دورانِ قیام میں وعظ و تدریس کے ساتھ کتب فلسفہ کے مطالعہ میں بھی سرگرم رہے اور اس علم کے رموز و حقائق سے پوری طرح واقف ہو گئے۔

۴۸۷ھ کے بعد آپ نے خلیفہ مستظہر باللہ کی فرمائش پر فرقہ باطنیہ کے رد میں ایک کتاب مستظہری تصنیف فرمائی اور بے شمار علمی کارناموں اور مواعظ کے ذریعہ اسلامی خدمات انجام دیں، لیکن امام غزالیؒ اس مرتبہ پر فائز ہو جانے کے بعد مطمئن نہ ہوتے آپ کی طبیعت انتہائی طور پر پریشان ہوئی اور زندگی کے ۳۹ سال پورے کرنے کے بعد غزالیؒ ایک نئے مرحلۂ حیات میں داخل ہو گئے جو گزشتہ مرحلہ کے مقابلے میں بالکل جدید اور بڑی حد تک اجنبی تھا۔ ان کی روح میں تحول اور تبدیلی کے آثار پیدا ہوئے اور اس تحول اور تغیر پر انہوں نے ہر چیز نثار کر دی اور اس کے بدلے میں ایک نیا غزالی عالم وجود میں آ گیا اور پھر عین اس وقت جب وہ علم و شہرت، جاہ و منزلت اور رتبہ و مقام کی حدِ اعلیٰ پر پہنچ چکے تھے انہوں نے ہر چیز سے منہ موڑ لیا۔ انہوں نے علم کتابی کو جاہ و حشمت کو اور اعتبارات دنیاوی کو ٹھکرا دیا اور عزلت اور سیاحت کے ارادے سے صرف ایک سادہ کمبل اوڑھ کر بغداد کو خیر باد کہہ دیا۔

یہ کیا ہوا؟ کیسے ہوا؟ غزالیؒ تو عالم اور متکلم تھے وہ صوفی وارفتۂ دل گاہ کس طرح بن گئے۔

اب سے پہلے جس منزل کی طرف وہ رہروی کر رہے تھے ہم قدموں کی کثرت تھی، لیکن اب جس جہاں میں آپ نے قدم رکھا بجز آتشِ شوق کے نہ کوئی ہمدم تھا اور نہ ہم زبان، ہاں ایک سابق رفیق درس ابو القاسم حاکمی جو بغداد سے آپ کے ساتھ آیا تھا ہمسفر تھا۔
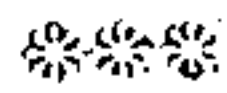
جاہ و مال اور علاقہ زن و فرزند سے روگرداں ہو جانا تو آسان ہے، لیکن اس قید علم و دانش سے روگرداں ہو جانا جس کی تحقیق و تکمیل میں ایک عمر صرف کر دی ہو۔ ہرگز آسان نہیں ہے۔ خود غزالیؒ نے اس مرحلہ کو تمام مرحلوں سے مشکل قرار دیا ہے وہ کہتے ہیں۔

"قدم اوّل ہی میں جاہ مال سے میں نے کنارہ کشی اختیار کر لی، لیکن قیودِ علم و تدریس سے جو حد درجہ سحر طراز تھیں دست بردار ہونا میرے لیے کارِ دشوار بن گیا۔"

مگر غزالیؒ نے یہ کارِ دشوار انجام دے ڈالا۔ یہ کشمکش ۴۸۸ھ میں آپ کے اندر شروع ہوئی۔ اضطراب و افکار اور تشویشِ خیال اور اندیشوں کے باعث آپ بیمار پڑ گئے۔ کوئی انہیں دیوانہ کہتا اور کوئی سودا زدہ قرار دیتا اور کوئی ۔۔۔ انتہائی تاسف سے کہتا کہ ایسا عالمِ بے نظیر کام سے جاتا رہا۔ ایسا گوہر یکتا ضائع ہو گیا۔ ان کی صحت و تندرستی کے لیے انواع معالجات کام میں لائے گئے مگر کوئی تدبیر کارگر ثابت نہ ہوئی اور چھ ماہ کی کشمکش کے بعد ذی قعدہ ۴۸۸ھ میں غزالی کی زندگی کا ورق اُلٹتا ہے اور کتابِ زندگی کا نیا باب شروع ہوتا ہے۔ اب ان کی سابقہ زندگی افسانۂ ماضی ہو جاتی ہے اور بالکل نیا دردِ حیات شروع ہوتا ہے یہ دور زندگی کی آخری سانس تک قائم رہتا ہے اس دور میں دنیا ایک بالکل نئے غزالی سے روشناس ہوئی جس کی نظیر علمائے اسلام میں مشکل سے ملے گی۔

ماہ رجب ۴۸۸ھ میں غزالیؒ کی روحانی حالت حد درجہ بڑھ گئی اور ان کے تمام افکار و عقائد اضطراب و تشویش کے بھنور میں آ گئے۔ حال یہ تھا کہ خلفائے عباسی و سلاجقہ کے قلمرو میں اور فقہائے اہلِ سُنت کے حصار میں وہ مجبورِ اطاعت تھے، لیکن باطن میں اہلِ ظاہر کے بالکل مخالف تھے مگر یہ ممکن نہ تھا کہ اربابِ مذاہب سے برسرِ جنگ ہو سکتے۔ آخر کار انہوں نے بغداد چھوڑ دیا اور ہر چیز سے درگزر ہوئے۔

بغداد سے نکل کر غزالیؒ کا ارادہ تھا کہ وہ شام جائیں اور وہاں اقامت اختیار کریں اور ریاضت میں زندگی گزاریں۔ اس زمانہ میں شام زاہدوں اور صوفیوں کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ خلیفہ اور سلطانِ وقت کے ڈر سے انہوں نے سفرِ حج کا بہانہ بنایا اور اپنے بھائی امام احمد غزالیؒ کو مدرسہ نظامیہ میں اپنا جانشین مقرر کیا۔ ذی الحجّہ ۴۸۸ھ کو ہر چیز سے منہ موڑ کر ابوالقاسم حاکم طوسی کے ہمراہ بغداد سے شام کی طرف روانہ ہوئے اور ۴۸۸ھ سے ۴۸۹ھ کا عرصہ شام اور بیت المقدس اور حجاز میں بسر کیا۔

درویشوں اور قلندروں کی صورت و سیرت اختیار کر کے ہر جگہ کا گشت کیا اور اس تمام مدت میں پیوستہ زہد و عبادت اور فکر و خلوت رہے اور ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا شغل بھی جاری رہا۔

دو سال تک شام میں اقامت رکھی اور یہاں کی مشہور جامع دمشق میں معتکف رہے۔ جس جگہ وہ عبادت و ریاضت کرتے تھے وہ مسجد کا غربی منارہ تھا۔

شام سے وہ بیت المقدس تشریف لے گئے اور ایک عرصہ تک ریاضت و حکمت اور زیارت مشاہد شریف میں مشغول رہے۔ یہاں خلوت گاہ کے طور پہ زیادہ تر قبۃ الصخرہ کو استعمال کرتے تھے۔ بیت المقدس سے تربتِ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زیارت کو روانہ ہوئے اور جیسا کہ اپنے فارسی مکاتیب میں انہوں نے لکھا ہے ۴۸۹ھ میں تربتِ خلیل پر اُنہوں نے عہد کیا کہ کسی سلطان کے دربار میں حاضر نہیں ہوں گے اور کسی بادشاہ سے مال و دولت قبول نہیں کریں گے اور نہ کبھی مناظرہ کریں گے اور نہ تعصب کا اظہار کریں۔ تاریخ گواہ ہے کہ قربتِ خلیل پہ کیے گئے ان تین عہدوں پہ آپ تازیست قائم رہے۔
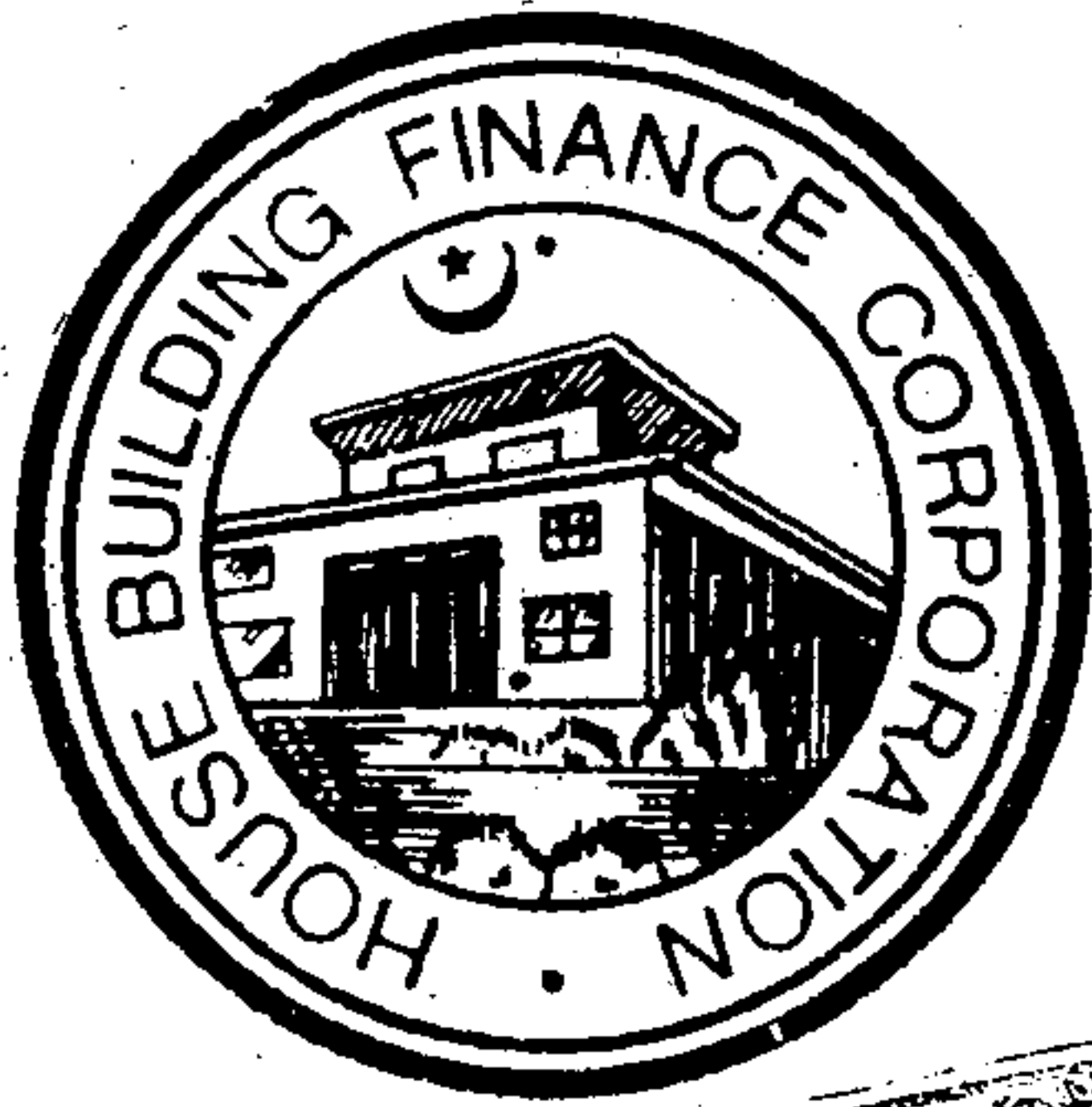
دمشق میں قیام کے دوران آپؒ نے سخت ریاضتیں کیں۔ خدمتِ خلق کو اپنا شعار بنالیا۔ مسجد اور عبادت گاہ کی صفائی اور درستی اپنے ذمے لی۔ کل تک جو شخص روئے زمین کے بڑے بڑے ملوک و سلاطین کا ہم مسند تھا آج جھاڑو اس کے ہاتھ میں تھی اور مزبلۂ مسجد و خانقاہ صاف کر رہا تھا۔

روایت ہے کہ دمشق میں قیام کے دوران امام غزالی کی رہائش جامع اموی کے زاویۂ شیخ نصیر قدسی میں رہا کرتی تھی جو بعد میں غزالیہ کے نام سے مشہور ہُوا۔

ایک دن مفتیانِ شام کی ایک جماعت صحن مسجد میں موجود تھی۔ ایک شخص آیا اور اُس نے اُن سے ایک مسئلہ پوچھا جس کے جواب میں یہ لوگ عاجز رہ گئے۔ ایک مردِ مجہول کی طرح غزالی بھی وہاں بیٹھے تھے، لیکن خاموش رہے جب مسئلہ پوچھنے والا چلنے لگا تو آپ کو خیال آیا کہیں یہ شخص تہی دامن نہ رہ جائے۔ اسے بلایا اور اس کے سوال کا جواب دے دیا۔ وہ شخص مضحکہ خیز انداز میں غزالیؒ کو دیکھنے لگا کہ جس سوال کا جواب مفتیان نہ دے سکے۔ اُس کا جواب یہ مردِ عامی کیسے دے سکتا ہے۔ مفتیوں نے سائل کا یہ حال دیکھا تو اسے بلا کر ماجرا پوچھا۔ سائل نے غزالی کا جواب سنایا تو مفتیانِ دمشق دنگ رہ گئے۔ انہوں نے محسوس کر لیا کہ یہ کوئی مردِ دانش ہے چنانچہ ان سے تدریس کی استدعا کی۔ غزالیؒ کو اندیشہ ہوا کہ کہیں پھر وہ قیل و قال کے چکر میں گرفتار نہ ہو جائیں۔ لہٰذا اُسی رات دمشق سے باہر چلے گئے۔

غزالیؒ نے زاویۂ شیخ میں اپنے افادات سے لوگوں کو ضرور مستفید کیا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ زاویۂ شیخ بعد میں "غزالیہ" کے نام سے مشہور ہُوا اور آٹھویں صدی ہجری میں مؤرخین نے اسے "غزالیہ" کے نام سے ہی موسوم کیا ہے۔ اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ ضرور غزالیؒ نے اپنے علم کی بارش کی ہوگی ورنہ ایک مجہول شخص کی نشت و برخاست کے باعث کیسے کسی جگہ کا نام بدل سکتا تھا اور پھر اُسی کے نام سے معروف ہو سکتا تھا۔ ویسے غزالیؒ نے اس سلسلے میں خود کچھ نہیں لکھا۔ البتہ چند تاریخی حقائق سے واضح ہوتا ہے کہ غزالیؒ اپنے دورانِ قیام دمشق کچھ عرصہ تک خلوت و عبادت سے فارغ ہو کر زاویہ جامع اموی میں آ بیٹھا کرتے تھے۔ اس موقع پر طالبانِ رحمت کی ایک جماعت آ موجود ہوتی اور ان سے استفادہ کرتی تھی، لیکن یہ کام کوئی باقاعدہ سلسلہ کار نہ تھا جیسا کہ انہوں نے خود اپنی کتاب "المنقذ من الضلال" میں فرمایا ہے۔ دمشق میں ان کے قیام کی مدت صرف دو سال تھی اس کے بعد ان کے عہد مسافرت کا بیشتر حصہ بیت المقدس میں گزرا جہاں ان کا مشغلہ خلوت و ریاضت تھا۔ اس سفر کی یادگار اور مسلمانانِ عالم کے لیے اہم ترین تحفہ کتاب "احیاء العلوم" ہے۔ امام غزالیؒ کی یہ کتاب تمام دنیا کی اخلاقی کتب میں اپنی مثال آپ ہے اور غزالیؒ کے بعد جس نے بھی اخلاق سے متعلق کچھ لکھا اُس نے اس کتاب سے استفادہ ضرور کیا۔ یہ کتاب انہوں نے بیت مقدس میں تحریر کی اور جس جگہ کو آپؒ نے اس کام کے لیے منتخب کیا تھا وہ قبہ صخرہ کا شرقی گوشہ تھا۔ یہ کتاب ۴۸۸ھ اور ۴۸۹ھ کے درمیان تحریر ہوئی اور دس سال کے طویل عہد مسافرت کے آثار و یادگار اس میں منقش ہیں۔ کتاب کے دیباچہ سے ہی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ کتاب احیاء العلوم غزالیؒ کے عہد تحولِ روحانی کے آثار میں سے ہے کہ کس طرح وہ عمر تلف شدہ کے اوقاتِ گراں مایہ کی تلافی و تدارک پر آمادہ ہوئے؟ کیسے علوم رسمی کے کوچہ سے نکل کر علم اور تزکیۂ النفس کی منزل میں قدم رکھا اور تاریکی سے نورِ حقیقت کی طرف کیونکر گامزن ہوتے؟ یہ سب کچھ انہوں نے اس کتاب میں لکھ ڈالا ہے اور یہ کتاب وہیں بیت المقدس میں مکمل ہوئی۔ سبحان اللہ کیا مقام تھا جہاں یہ کتاب لکھی گئی اور کیا مصنف تھا جس نے اسے تحریر کیا۔ تمام دنیا کے علوم کے سمندر اس کے سینے

میں موجزن تھے۔

ایران سے باہر غزالیؒ کا دور سفر و ریاضت دس سال تک محیط رہے۔ بیت المقدس سے ۴۹۸ھ میں غزالیؒ حجاز تشریف لے گئے اور مراسم و مناسک حج اور زیارت مشاہد متبرکہ سے فیضیاب ہوتے رہے اور پھر اپنے وطن طوس واپس تشریف لائے۔

آغاز مسافرت میں ان کی نیت یہ تھی کہ اب وطن واپس نہیں آئیں گے لیکن زن و فرزند کی محبت بالآخر اپنے ادیار میں انہیں کھینچ لائی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے طوس میں غزالی کی مراجعت کا سبب صلیبی جنگیں ہیں۔ صلیبی جنگیں ۴۹۰ھ سے شروع ہوئیں اور تقریباً اس زمانے میں ایشائے صغیر اور شام کے متعدد مسلمان شہروں پر عیسائیوں نے تسلط حاصل کر لیا تھا اور ۴۹۱ھ میں انطاکیہ پر قبضہ کے بعد انہوں نے بیت المقدس کا رُخ کیا ہے اور تاریخ گواہ ہے کہ فتح بیت المقدس میں تقریباً ستر ہزار مسلمان شہید تیغ ستم ہونے اور بہت سے علماء و فضلا بھی جس میں حافظ ابوالقاسم رملی بھی تھے اس حادثہ میں کشتہ ہوئے۔

غزالی نے اپنی آنکھوں سے آگ و خون کا یہ سمندر دیکھا۔ یقیناً وہ محسوس کر رہے ہوں گے کہ جو ستر ہزار مسلمان ان معرکوں میں ہلاک ہوئے ان میں وہ بھی شامل ہو سکتے تھے ہو سکتا تھا کہ وہ اس آتش عالم سوز سے دور تر مقام پر چلے گئے ہوں لیکن وہ مرنے سے نہیں ڈرتے تھے نہ وہ اپنے خون کو دوسرے مسلمانوں کے خون سے رنگین تر تصور کرتے تھے چنانچہ وہ اس طرح سرگرم کار مشغول و فکر رہے کہ کسی شخص یا کسی چیز سے خوف و ہراس ان کے اندر پیدا نہیں ہوا۔

مسافرت دس سالہ سے پیشتر غزالیؒ اپنے زمانے کے بہترین متکلم تھے اور بیان و خطابت اور تصنیف و تالیف کے دستوری بل پر اسلام کی حمایت و نصرت میں پیش پیش تھے اور انقلاب و تحول کے بعد علم و عمل کے اعتبار سے وہ نوع انسانی کے بہترین رہنما اور معلم بن گئے۔ لہٰذا غزالیؒ کا صلیبی جنگوں میں شرکت نہ کرنا کوئی قابل اعتراض فعل نہیں ہے۔

غزالیؒ کا اولین مجاہدہ یہ تھا کہ حقیقت تک پہنچنے کے لیے انہوں نے بالاتر مناصب و مقالات دنیوی کو ترک کر دیا اور اپنے عمل سے ثابت کر دیا کہ اس دنیا کا بزرگ ترین منصب بھی راہ معرفت کے کمترین درجہ کے مقابلہ میں ہیچ ہے۔ یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ اس زمانہ میں جو صحیح معنوں میں عہد جدل و تعصب دینی تھا، علماء و سلاطین اور خلفائے عباسی کے خوف و دہشت سے کسی کو یارا نہ تھا کہ عقائد عمومی کے خلاف ایک حرف بھی کہہ سکے محض مورد تہمت و بدگمانی سے گردنیں تن سے جدا ہو جاتی تھیں مگر امام غزالیؒ نے بے پروایانہ پردہ اوہام چاک کرنے کا معرکہ برپا کیا اور اپنے زمانے کے اوضاع علمی و دینی کو تند و تلخ تنقید کے نشانہ بنانے میں ذرا جھجک محسوس نہ کی اور وہ علماء سو جو اپنی کم علمی کی وجہ سے لوگوں میں فتنہ و شر پیدا کر رہے تھے ان کی ترتیب اور مذہب سے بھی دریغ نہیں کیا۔

غزالیؒ نے اپنی مجالس وعظ اور اپنے مؤلفات مثلاً "احیاء العلوم" اور "المنقذ من الضلال" وغیرہ میں حکمات شیریں گو سلیس زبان کہتے ہوئے کوئی تامل نہیں کیا۔ احیاء العلوم کا ایک معرکہ آرا باب جو اس کتاب کا پہلا باب ہے علم و علماء اور آداب تعلیم ـــــ سے اختصاص رکھتا ہے۔ اس زمانے میں جبکہ بقول غزالیؒ علم و دین تباہ ہو چکے تھے اور ہر طرف سے خطرات و مہالک سر اٹھا رہے تھے۔ انہوں نے اس کتاب کی تالیف کو اپنے اوپر واجب قرار دیا۔

غزالیؒ کی مدتِ ریاضت و عزلت کے بارے میں مؤرخین کی روایات مختلف ہیں مگر سب سے قوی یہ قول ہے جو امام غزالیؒ نے اپنی کتاب میں ارشاد فرمایا ہے۔

"تقریباً دس سال تک میں عزلت و خلوت کی زندگی بسر کرتا رہا پھر سلطانِ وقت کی طرف سے حکم ملا کہ تدریس و ہدایت طالبانِ علم کے لیے طوس سے نیشاپور آؤں۔ میں نیشاپور ذی قعد ۴۹۹ھ میں آیا۔ بغداد سے میں نے ذی قعد ۴۸۸ھ میں کوچ کیا تھا اس طرح مدتِ خلوت گیارہ سال ہوتی ہے۔"

غزالیؒ کی زندگی کا یہ دور آٹھ سال پر محیط ہے۔ آپ سلجوقی بادشاہ سنجر کی درخواست اور اس کے وزیر مملکت نظام الملک کے اصرار سے مجبور ہو کر طوس سے نیشاپور پہنچے اور مدرسہ نظامیہ میں کرسیٔ تدریس پر متمکن ہو گئے اور تقریباً ایک سال تک تعلیم و ہدایت کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ اس کے بعد پھر طوس واپس چلے گئے غزالیؒ کی کتاب "المنقذ من الضلال" جو ان کی معرکہ آرا کتابوں میں ہے نیشاپور میں رہ کر تالیف کی۔ غزالیؒ نے المنقذ اور اپنے فارسی مکاتیب میں لکھا ہے کہ بادشاہ اور وزیر کے اصرار کے علاوہ اس چیز نے بھی مجھے اس منصب کو قبول کرنے پر آمادہ کیا۔ مجھے عالمِ خواب اور حالتِ بیداری میں ہدایت ہوئی تھی کہ اہالیانِ نیشاپور کی ہدایت کے لیے سفر اختیار کر لوں۔

غزالیؒ کا طرزِ تدریس و تعلیم اب پہلے سے مختلف تھا۔ غزالیؒ کا بغداد سے سفر "خلعت سے حق کی طرف تھا" اور طوس سے نیشاپور میں تشریف آوری کا سفر "حق سے خلعت کی طرف تھا۔" پہلے غزالیؒ یکتائے عالم متکبر اور یگانہ متکلم جدلی تھے۔ اب غزالیؒ ایک عالم تھے مگر زاہد و صوفی بھی تھے۔ اب ان کے ارادت مندوں کی تعداد فزوں سے فزوں تر ہوتی جا رہی تھی۔ جو بول ان کے منہ سے نکلتے تھے وہ دل سے نکلتے تھے اور دل پر اثر انداز ہوتے تھے۔ غزالیؒ کا یہ آخری عہدِ تدریس بہت مختصر تھا مگر ان کے فیوضِ علمی اور روحانی اس دور میں اور زیادہ ممتاز اور نمایاں رہے۔

امام غزالیؒ کا لقب "حجۃ الاسلام" تھا۔ ان کے بارے میں یہ لقب از قبیل القاب تعارف بے معنی نہ تھا یہ لقب ان کے لیے حقیقتاً بجا اور شائستہ و درست تھا۔ غزالیؒ اس زمانہ میں تشریف لائے جو مجادلاتِ مذہبی کا زمانہ تھا انھوں نے بحرانِ جدال اور کشمکشِ مذاہب اور تفرق اہوارِ مختلفہ کے عہد میں ایک عالی مرتبت متکلم کی حیثیت سے ظہور کیا۔ وہ شافعی و اشعری تھے۔ یعنی اصول میں تابع طریقۂ اشعری اور فروع میں تابع شافعی تھے مسلک کے مخالفوں جو جملہ طوائف اہلِ سنت و معتزلہ، قرامطہ، باطنیہ، حکماء، فلاسفہ اور پیروانِ مسیحؑ اور دیگر علماء عالمار سے زبانی و قلمی مجادلہ کیا۔ گویا یہ ایک تن ساری دنیا کے مقابلہ میں چومکھی جنگ لڑ رہا تھا اور اپنی فوق قوت و مہارت کے بل پر ہر جگہ فتح و نصرت حاصل کر رہا تھا۔

دیگر اربابِ مذاہب اس کے زورِ بیان و قلم کے مقابلہ میں ہیچ اور ناچیز ثابت ہوئے۔ اسی بہت سے کا لقب "حجۃ الاسلام" پڑ گیا۔ غزالیؒ پانچویں صدی کے مجدد تھے کئی صدیوں تک جو علماء اور دانشور نمودار رہے۔ غزالیؒ کی حیثیت ان سب میں نمایاں تھی۔ علمائے درایت و رجال کی اصطلاح میں غزالیؒ سرکردہ صدی

—— حدیث نبوی ہے۔
• خدائے بزرگ و برتر ہر صدی کے آغاز میں ایسے شخص کو مبعوث کرے گا جو کارنامہ تجدیدِ دین انجام دے گا ہر صدی کے مجددوں کے بارے میں کتبِ تاریخ میں تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے اور بالاتفاق اقوال غزالیؒ صدی کے مجدد تسلیم کیے گئے ہیں۔ یعنی ان کا شمار ان نوابغ میں تھا جنھوں نے نیا عہد پیدا کیا۔

قیمت = 2550/ روپے صرف
پاکستان میں پہلی بار سپر ایشیا کی پیش کش
واشنگ مشین بڑے روٹر اور سٹرائیک بار کے ساتھ
سپر ایشیا اپنی شاندار
روایات کو برقرار رکھتے ہوئے اب
متعارف کراتے ہیں پرکشش، جدید ترین،
دیرپا اور بہترین واشنگ مشین نئی اور منفرد
خوبیوں کے ساتھ
ماڈل SA-220
واشنگ ٹب کے اندر BUILT IN
سٹرائیک بار اور واش لائنز کی
بدولت کپڑوں کو ہاتھ سے ملنے کی
زحمت سے چھٹکارا۔
پہلے سے کہیں زیادہ کشادہ
واشنگ ٹب۔
کپڑوں کی بہترین صفائی کے لیے 7" کی بجائے 14" بڑا روٹر جو کہ RPM 190 کی
رفتار سے چلتا ہے جس کے باعث کارکردگی میں سو فیصد اضافہ۔
عام مشین میں بجلی کی کھپت 400 واٹ ہے جبکہ SA-220 میں بجلی کا خرچ
200 واٹ ہے۔ اس طرح بجلی کے خرچ میں 50% بچت۔
سپر ایشیا کا نام سکون اور اطمینان کا پیغام
سپر ایشیا محمد دین سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
SUPER asia
جی ٹی روڈ نزد لاہوری چونگی، گوجرانوالہ پاکستان
فون: 51408 - 53008 ٹیلکس: 45337 SA MDS PK
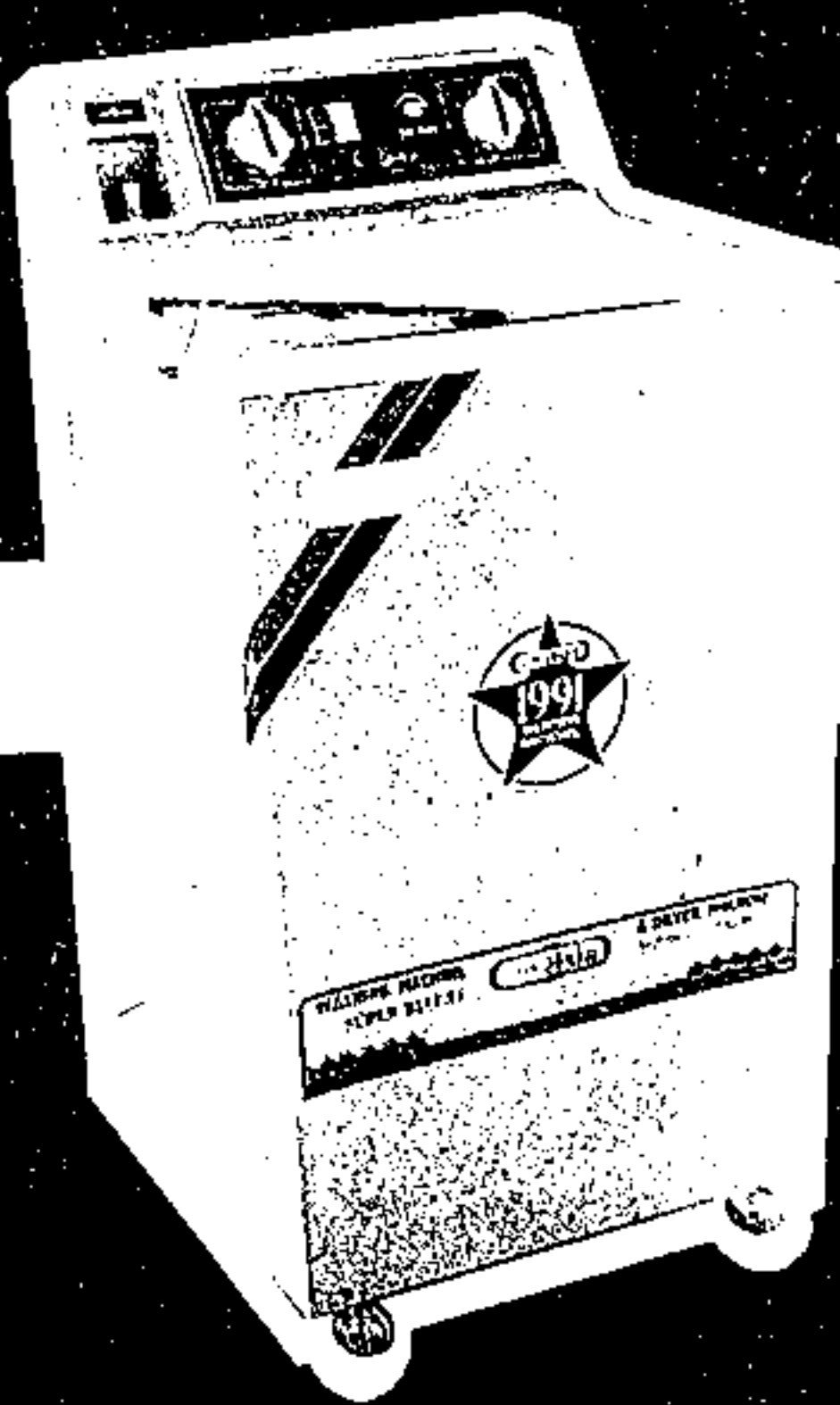
SUMMIT

غزالیؒ نے ۵۲ سال کی عمر ... میں سلطان محمد سلجوقی کے نام جو مکتوب لکھا تھا وہ اپنی افادیت اہمیت کے اعتبار سے اس قابل ہے کہ اسے عوام الناس کے سامنے پیش کیا جائے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"دنیا آنی جانی ہے۔ آخرت کی بادشاہی کے مقابلہ میں روئے زمین کی بادشاہی حقیر و ناچیز ہے، مملکت روئے زمین زیادہ سے زیادہ مشرق سے مغرب تک حاوی ہوسکتی۔ آدمی کی عمر دنیا میں زیادہ سے زیادہ سو سال ہوسکتی ہے اور جملہ روئے زمین کی بادشاہی اس بادشاہی سے جو خدا تعالیٰ آخرت میں دے گا وہی نسبت رکھتی ہے جو ایک مٹی کے ڈھیلے کی ہوئی ہے۔ روئے زمین کی تمام ولائتیں اور اس کی نعمتیں اس ڈھیلے کے گرد و غبار سے زیادہ نہیں اور ازل و ابد کے مقابلہ میں سو برس کی مدت کیا چیز ہے جس پر اظہار شادمانی کیا جائے۔

اے بادشاہ اپنی ہمت بلند رکھ اور خدائے تعالےٰ سے سوائے بادشاہی جاوید کے کسی اور چیز پر قناعت نہ کر اور یہ بات دوسرے لوگوں کی نسبت بادشاہ پر آسان ہے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا۔ "سلطانِ عادل کا ایک دن کا عدل اسّی سال کی عبادت کے برابر ہے۔"

اور آج تو وہ حال ہے کہ ایک ساعت کا عدل سو سال کی عبادت کے برابر ہے، مردانِ طوس پر رحم کر وہ ظلم بسیار برداشت کر رہے ہیں۔ قحط سالی نے انھیں تباہ کر دیا ہے، سو برس پرانے درخت جڑ سے خشک ہوگئے ہیں۔ لوگوں کے پاس کچھ باقی نہیں رہ گیا اگر تو نے ان سے مطالبات جاری رکھے تو وہ بھاگ کھڑے ہونگے اور پہاڑوں سے سر ٹکرا کر ہلاک ہو جائیں گے۔ اور تو خدا کے سامنے جوابدہ ہوگا۔

تجھے جاننا چاہیے کہ یہ شخص جو تجھے خط لکھ رہا ہے ۵۳ سال عمر کے گزار چکا ہے۔ چالیس سال تک اس نے دریائے علوم میں غوطہ زنی کی اور باقی سال سلطانِ شہید کے زمانے میں بسر کئے۔ اور کئی بار بعض اہم امور کے سلسلے میں سلطان اور امیر المومنین کے مابین سفارت کے فرائض انجام دیئے اور علوم دین میں ستّر کے قریب کتابیں تصنیف کیں، اس دنیا کو اس کے اصل رنگ میں دیکھا۔ ایک عرصہ تک بیت المقدس اور مکہ مقیم رہا اور مشہد ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام عہد کیا کہ نہ پیش سلطان رہوں گا، نہ سلطان سے مال قبول کروں گا، نہ مناظرہ اور تعصب سے سروکار رکھوں گا۔ بارہ سال بیت گئے اور اس عہد پر قائم ہوں، امیر المومنین اور دیگر سلاطین نے مجھے اس باب میں معذور جانا لیکن میں نے سُنا ہے کہ مجلسِ والا سے مجھے حاضر ہونے کا ایما ہوا ہے۔ میں مشہد خلیل علیہ السلام پر حاضر ہوا اور اپنے عہد کے خیال سے بارگاہ سلطانی میں حاضر نہیں ہوا۔ میں مشہد کے سرہانے کھڑے ہو کر عرض کیا۔ اے فرزندِ رسولؐ آپ شفاعت کریں کہ خدا تعالیٰ بادشاہ اسلام کو مملکتِ دنیا میں اپنے اسلاف کا صحیح جانشین بنا دے اور مملکتِ آخرت میں سلیمان علیہ السلام کے مرتبہ پر پہنچا دے کہ وہ بادشاہ بھی تھے اور پیغمبر بھی، اور بادشاہ اسلام کو توفیق دے کہ عہدِ خلیل علیہ السلام کی حرمت کرے اور جس شخص نے دنیا سے منہ موڑ لیا ہے اور خدائے بزرگ و برتر سے رشتہ جوڑ لیا ہے، اس کے دل کو مشوّش نہ کرے، میرا خیال ہے کہ یہ بات مجلسِ عالی میں پسندیدہ تر اور مقبول ہوگی۔ اگر میرا خیال درست ہے تو مرحبا اور اگر غلط ہے تو میں عہد شکن نہیں قرار دیا جاؤں گا کہ مجبوری کی حالت میں فرمانِ سلطان کی تعمیل کروں گا، حق تعالیٰ اُس عزیز کے دل اور زبان کو ایسے کر دے کہ کل قیامت کے دن اسے خجل نہ ہونا پڑے اور آج اسلام کو ضعف اور شکستگی نہ پہنچے۔"

والسلام
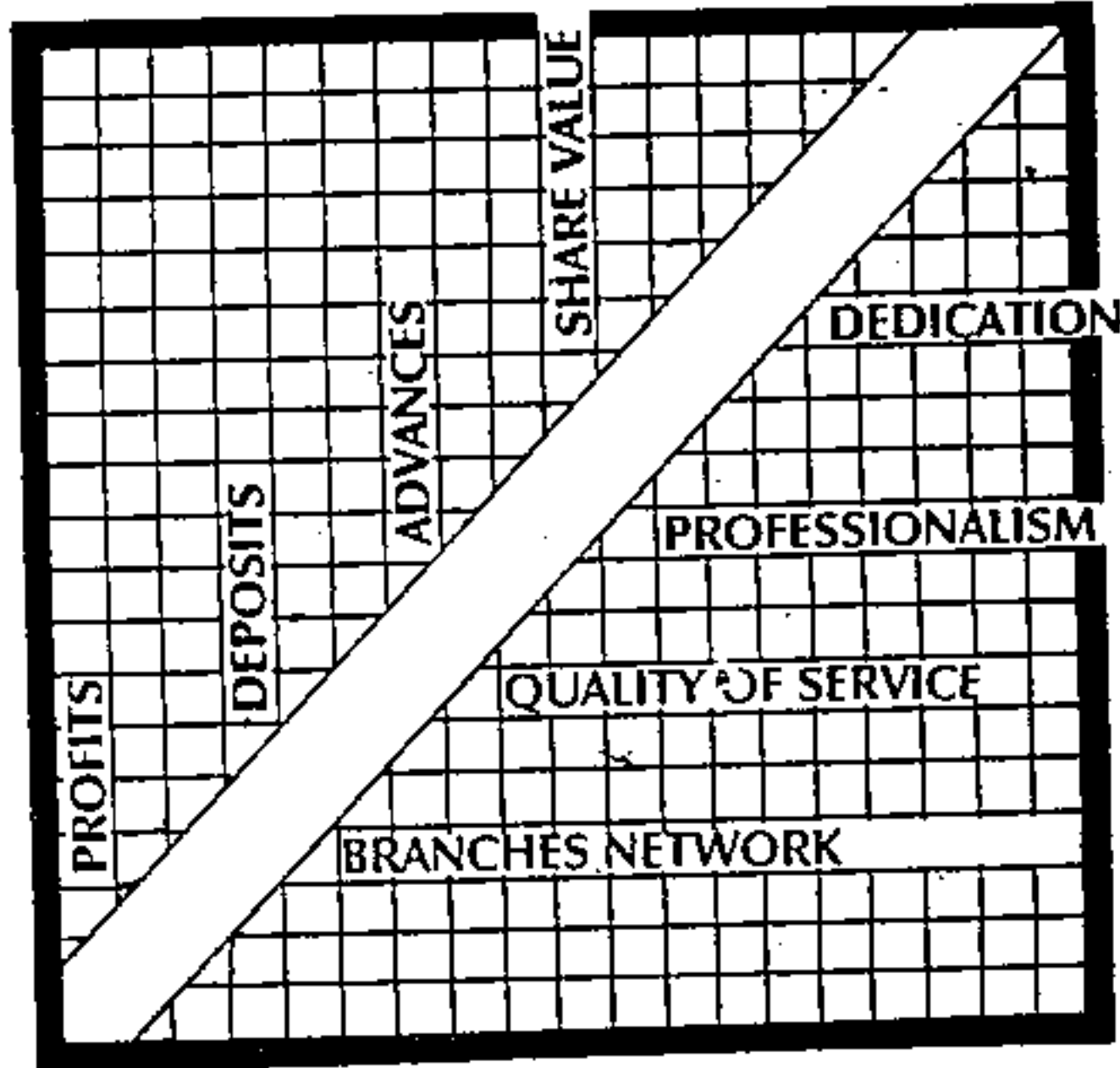
تدریس نظامیہ نیشاپور سے سبکدوش ہونے کے بعد غزالی اپنے وطن طوس واپس تشریف لے گئے۔ وہیں پر ۵۰۳ھ میں بادشاہ کی طرف سے دعوت موصول ہوئی کہ حاضر دربار ہوں تاکہ سلطان اور مقربان سلطان ان کی برکات سے مستفید ہو سکیں۔ اس بات کو ماننے میں غزالی کو قباحت نظر نہ آئی چنانچہ طوس سے مشہد رضا علیہ السلام تشریف لے گئے اور یہاں وہ نامہ لکھا جو نقل کیا گیا ہے۔ اس میں عذر خواہی کر کے دوبارہ طوس واپس تشریف لائے۔

حجۃ الاسلام غزالیؒ نے زندگی کے آخری پانچ چھ سال تمام تر عبادت و خلوت، تعلیم و تربیت اور ارشاد و ہدایت میں گزارے اور لوگوں کی کمالِ معرفت کے راستے سے راہنمائی فرمائی گھر کے قریب صوفیہ کے قریب ایک خانقاہ قائم کی اور طلباء کے لیے ایک مدرسہ قائم کیا جہاں وہ اپنے اوقاتِ شبانہ روز کو چند حصّوں میں تقسیم کر کے مصروفِ کار ہو گئے۔ ایک وقت عبادت اور اپنے خدا سے راز و نیاز کے لیے وقف تھا۔ ایک وقت طالبانِ علوم کی تعلیم و ہدایت کے لیے خاص تھا۔ کوئی وقت صوفیانِ باصفا اور صاحب دلانِ باخدا کی تربیت و تکمیل کے لیے متعین تھا۔ کم و بیش ایک سو پچاس حق طلب ان کے سایۂ تربیت میں زندگی بسر کر رہے تھے۔

مولانا روم نے سچ کہا ہے۔

جمع صورت با چنیں معنیٰ ژرف
راست ناید جز ز سلطانی شگرف

(دانشمندانِ جہاں میں ایسے لوگ بہت کم نظر آتے ہیں جو مقام صورت و معنیٰ اور ظاہر و باطن کے جامع ہوں)

جو لوگ مقام ظاہر میں ہوتے ہیں وہ ایک قدم بھی فروتر نہیں رکھ سکتے۔ اور جو لوگ عالم حقیقت میں قدم رکھتے ہیں وہ کچھ اس طرح محوِ حقائق اور مست بوئے گل ہو جاتے ہیں کہ اپنے آپ سے بے خبر ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگ بہت کم مگر انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں جو اس راہ پر اتنے پختہ اور استوار ہوتے ہیں جو مقام حقیقت پر پہنچنے کے بعد دوبارہ عالم خلق میں قدم زن ہونے کے ساتھ اور اپنے احساس دروں اور تعلق باللہ کو قائم رکھتے ہیں۔ غزالیؒ ان مردانِ کامل میں سے تھے کہ مراتبِ عرفان کو پورے طور پر تکمیل کر چکے تھے اور ایسے ظرف کے مالک تھے کہ حقائق و معانی کا یہ درجۂ اتم بلوغ و شعور حاصل کر چکنے کے بعد دوبارہ عالم صورت میں نمودار ہوئے اور مخلوقِ خداوند سے آشنا ہو کر اس کی تعلیم و تربیت میں مصروف و منسلک ہوئے۔ اور یہی حیاتِ غزالی کے وہ احوال ہیں جو انھیں عالموں، زاہدوں اور عارفوں میں ممتاز کرتے ہیں۔

جس موقع پر غزالیؒ طوس میں سرگرم عبادت و ارشاد و تعلیم و تربیت تھے، اسی دوران ان کے ایک ہم درس ابوالحسن کیائی ہراسی، طبری نظامیہ بغداد میں کرسیٔ تدریس پر فائز تھے۔ ابوالحسن کیائی کا انتقال ۵۰۴ھ کے اوائل میں ہوا۔ ان کے انتقال کے بعد پھر کوشش کی گئی کہ غزالی نظامیہ بغداد میں آکر رونق افروز ہوں اور کرسیٔ تدریس پر متمکن ہوں۔ اس سلسلہ میں غزالیؒ کو بہت خطوط لکھے گئے اور بے شمار وعدے کئے گئے مگر غزالی ٹس سے مس نہ ہوئے۔ انہیں اب اس منصب سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

عراق کے سلطان محمد کے وزیر بزرگ خواجہ ضیاء الملک نے خود بدستِ خاص غزالیؒ کو دعوت نامہ لکھا لیکن امام غزالیؒ نے وزیر خواجہ ضیاء الملک کو بھی اسی طرح کا معذرت نامہ تحریر کر دیا جیسا انھوں

سلجوقی سلطان کے نام لکھا تھا۔ اور تدریس نظامیہ بغداد کا منصب قبول کرنے سے معذرت کر لی۔ یہ خط آپ نے اپنی وفات سے ایک سال قبل تحریر کیا اور بدستور طوس میں قیام پذیر رہے۔

قرائن سے یہ بات ثابت ہوتی ہے ۴۸۴ھ میں غزالیؒ نے اپنی خانگی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ غزالیؒ کا کوئی فرزند نرینہ نہیں تھا صرف دو لڑکیاں تھیں۔ مالِ دنیا میں ان کی بہت تھوڑی سی پونجی تھی۔ طوس میں ان کی تھوڑی سی زمینداری تھی اور ان کا گھرانہ اسی معمولی سی زمینداری پر قناعت اور فقیرانہ صفات کے سات گزر بسر کرتا تھا۔ اس کے علاوہ انھیں کسی چیز کی احتیاج نہ تھی۔ انھوں نے کبھی کسی سے کوئی عطیہ امداد یا نذرانہ قبول نہ کیا۔

آپ انہی کاموں میں مصروف تھے کہ ناگہاں پیام اجل پہنچا اور طوس کے ایک مقام طاہران میں جو ان کا مولا و موطن تھا۔ دوشنبہ یعنی اتوار کو صبح چار جمادی الآخر ۵۰۵ھ بمطابق ۱۱۱۱ء میں وفات پا گئے اور وہیں دفن ہوئے۔

امام غزالیؒ کی وفات کے وقت ان کے بھائی امام احمد غزالیؒ موجود تھے ان کا قول ابن جوزی نے کتاب "الثبات عند الممات" میں نقل کیا ہے

"میرے بھائی ابو حامد نے دوشنبہ کے دن صبح کے وقت وضو کیا اور فریضہ نماز ادا کیا۔ پھر کفن مانگا اور اسے بوسہ دیا۔ اور ارشاد فرمایا "بسر و چشم" اس کے بعد قبلہ کی طرف رُخ کر کے لیٹ گئے اور جان جان آفرین کے سپرد کر دی۔" انا للہ و انا الیہ راجعون۔

اپنے دَور کا ایک حکمران اپنی خواب گاہ میں محوِ استراحت تھا کہ اچانک اُسے کمرے کی چھت پر کسی کے قدموں کی آہٹ محسوس ہوئی. حکمران نے نیچے سے باآوازِ بلند دریافت کیا کہ چھت پر
تن ہے. دوسری جانب سے ایک اجنبی آواز نے جواباً کہا " بادشاہ سلامت! مَیں آپ کا ایک جاننے والا
ں. میرا اونٹ لاپتہ ہوگیا تھا لہٰذا میں اس کی تلاش میں اس طرف نکل آیا تھا" بادشاہ نے جب اجنبی
یہ انوکھا جواب سُنا تو وہ سخت برہم ہوا اور اجنبی سے دریافت کیا کہ چھت پر اونٹ بھلا کس طرح آسکتا ہے.
س پر بادشاہ کو چھت پر موجود شخص کی جانب سے جواب مِلا کہ بادشاہ سلامت آپ مجھے یہ بتائیے کہ تخت و
ج میں آپ کو خدا کس طرح مِل جائے گا. یہ فکر انگیز جواب سُن کر بادشاہ پر خوف کے باعث کپکپی طاری ہو
ی. پھر ایک روز جب یہ بادشاہ اپنا دربار سجائے بیٹھا تھا تو وہاں غیر معمولی جاہ و جلال کا حامل ایک شخص
ن موجود ہوا. حاضرین اُس شخص کے رُعب سے اس قدر متاثر ہوئے کہ کسی کو اُس سے بات کرنے کی ہمت نہ ہوئی. پھر
شخص بادشاہ کے تخت کے قریب پہنچ کر اردگرد کا بغور جائزہ لینے لگا. اس پر بادشاہِ وقت جو کہ تخت پر رونق
روز تھا اُس نے اِس شخص کی آمد کا سبب دریافت کیا. مذکورہ شخص نے جواب دیا کہ وہ اس جگہ سکونت اختیار
نے کا ارادہ رکھتا ہے مگر اب وہ کہیں اور جا کر ٹھکانہ کرے گا کیونکہ یہ جگہ تو محض ایک سرائے کی مانند ہے
ذا یہاں پر قیام کرنا اُس کے لیے ممکن نہ ہوگا. اجنبی کی یہ بات سُن کر بادشاہ نے انتہائی نرمی اور ملائمت
ے کہا. میرے بھائی تم غلط سمجھے ہو. یہ شاہی محل ہے سرائے نہیں ہے."

آپ سے پہلے یہاں کون رہتا تھا؟" اجنبی نے پوچھا.

مجھ سے پہلے یہاں پر میرے بزرگ اور آباؤ اجداد رہا کرتے تھے." بادشاہ نے ماضی میں یہاں پر مقیم رہنے والی
ئی پشتوں کے نام گنوا دیئے.

اب یہ بتائیے کہ آپ کے بعد یہاں کون آئے گا؟" اجنبی نے دوبارہ سوال کیا.

"میرے بعد میری آنے والی نسلیں یہاں آباد ہوں گی۔" بادشاہ نے انتہائی فخریہ انداز میں کہا۔
"تب تو یہ واقعی سرائے ہے۔" اتنا کہہ کر وہ اجنبی بادشاہ کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔
اب تو بادشاہ پر ایک عجیب قسم کی ہیبت طاری ہو گئی۔ اُس نے فوراً تخت و تاراج چھوڑا اور اجنبی کی تلاش میں نکل پڑا۔ راستے میں ایک جگہ اجنبی سے ملاقات ہو گئی۔ بادشاہ کے اصرار پر اجنبی نے بتایا کہ مجھے خضر کہتے ہیں اور میں آپ کو سیدھی راہ دکھانے کے لیے آیا تھا۔ یہ سن کر بادشاہ نے اپنے تخت و تاراج کو ٹھکرا دیا اور دنیا داری کو چھوڑ کر ویرانوں کو اپنا مسکن بنا کر مجاہدوں اور ریاضتوں میں مصروف ہو گیا۔

اس بادشاہ کا نام حضرت ابراہیم بن ادھمؒ تھا جو کسی زمانے میں بلخ کے حکمران تھے۔ آپ کا شمار اللہ کے نیک بندوں اور صاحبِ کرامات بزرگانِ دین میں ہوتا ہے ایک طویل عرصہ تک آپ نے حضرت امام ابو حنیفہؒ کی صحبت میں گزارہ اور دنیا بھر کے دینی و دنیاوی علوم پر عبور حاصل کیا۔ ایک مرتبہ جب آپ حضرت امام ابو حنیفہؒ کی مجلس میں حاضری کی غرض سے تشریف لائے تو حاضرین نے انھیں تمسخرانہ نگاہوں سے دیکھا مگر امام ابو حنیفہؒ نے حضرت ابراہیم ادھمؒ کو "سیدنا" کا خطاب دے کر مخاطب کیا۔ اس پر حاضرین بہت حیرت زدہ ہوئے اور انھوں نے امام ابو حنیفہؒ سے دریافت کیا کہ آپ نے اس شخص کو اتنا بڑا اعزاز کیسے سونپ دیا۔ اس پر حضرت امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا کہ ان کا سارا وقت عبادت و ریاضت میں صرف ہوتا ہے جب کہ ہمیں دنیا داری کے جھمیلوں سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔

✖

بادشاہی ترک کرنے کے بعد جب حضرت ابراہیم ادھم نے بلخ کو الوداع کہا تو اُس وقت آپ ایک بچے کے باپ تھے۔ یہ بچہ جب جوان ہوا تو اُس نے اپنی والدہ ماجدہ سے اپنے باپ کی بابت دریافت کیا جس پر والدہ نے اپنے بیٹے کو ساری تفصیلات بتاتے ہوئے کہا کہ اس وقت تمہارے والد مکہ معظمہ میں قیام پذیر ہیں۔ اس پر حضرت ابراہیمؒ کے صاحبزادے نے ساری بستی میں یہ اعلانِ عام کروا دیا کہ جو لوگ اُن کے ہمراہ حج کے سفر پر روانہ ہوں گے اُن کے تمام اخراجات وہ خود برداشت کریگا۔ چنانچہ یہ خوش آئند اعلان سنتے ہی تقریباً تین ہزار کے لگ بھگ افراد اُس لڑکے کے ساتھ خانہ کعبہ کے سفر پر روانہ ہو گئے۔ اس سفر میں والدہ بھی آپکے ہمراہ تھیں۔ خانہ کعبہ پہنچ کر معلوم ہوا کہ اُس کے والد حضرت ابراہیم بن ادھمؒ مشائخینِ حرم کے مُرشد ہیں اور اس وقت جنگل سے لکڑیاں چننے گئے ہوئے ہیں تاکہ انھیں بیچ کر اپنے لیے کھانے پینے کا بندوبست کر سکیں۔ یہ سنتے ہی آپ کا بیٹا بھی جنگل میں پہنچ گیا اور جب اُس نے جنگل میں ایک کمزور و ناتواں شخص لکڑیوں کا بھاری گٹھا سر پر اٹھائے دیکھا تو وہ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا مگر اپنا تعارف کروانا مناسب تصور نہ کیا تاہم وہ خاموشی سے آپ کے پیچھے پیچھے بازار تک پہنچ گیا اور جب وہاں جاکر حضرت ابراہیم نے لکڑیاں بیچنے کے لیے صدا لگائی تو ایک شخص نے چند روٹیوں کے عوض اُن سے وہ لکڑیاں خرید لیں۔ آپ نے وہ روٹیاں اپنے مُریدین کے سامنے سے جاکر رکھ دیں اور خود نماز میں مشغول ہو گئے۔ آپ اپنے ارادت مندوں کو ہمیشہ یہ ہدایت فرمایا کرتے تھے کہ کبھی کسی نامحرم عورت اور بے ریش لڑکے کو نگاہ بھر کر نہ دیکھو خصوصاً اُس وقت زیادہ احتیاط کرو جب کہ حج کے موقع پر کثیر تعداد میں عورتیں اور بے ریش لڑکے جمع ہوتے ہیں۔ حضرت ابراہیمؒ کے تمام ارادت مند آپ کی ہدایات پر سختی سے عمل کرتے۔ لیکن ایک مرتبہ طواف کی حالت میں جب آپ کا لڑکا بھی آپ کے سامنے آگیا تو بے ساختہ آپ کی نگاہیں اُس پر مرکوز ہو گئیں اور فراغت طواف کے بعد آپ کے ارادت مندوں نے آپ سے عرض کیا کہ باری تعالیٰ آپ پر اپنا کرم فرمائے' آپ نے ہمیں جس کا

سے باز رہنے کی تلقین فرمائی تھی آپ خود ہی اس میں ملّوث ہوگئے ہیں۔ اس پر حضرت ابراہیم ادھم نے فرمایا "بھائیو! یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ جب میں بلخ سے رخصت ہوا تھا تو اس وقت میرا ایک شیر خوار بچہ تھا مجھے یقین ہے کہ جس لڑکے کو میں نے دیکھا ہے وہ میرا ہی بچہ ہے۔ پھر اگلے روز آپ کا ایک مُرید جب بلخ کے قافلہ کی تلاش کرتا ہوا وہاں پہنچا تو اُسے خیمے کے نزدیک ایک لڑکا بیٹھا دکھائی دیا جو خوش الحانی سے قرآن پاک کی تلاوت میں مشغول تھا اور جب اُس نے آپ کے مُرید سے آمد کا مقصد دریافت کیا تو مُرید نے سوال کیا کہ آپ کس کے صاحبزادے ہیں۔ یہ سُنتے ہی اُس لڑکے نے روتے ہوئے کہا کہ میں نے اپنے والد کو نہیں دیکھا لیکن کل ایک بوڑھے لکڑہارے کو دیکھ کر یوں محسوس ہوا کہ جیسے وہ میرے والد محترم ہیں اور اگر میں اُس سے کچھ پُوچھ گچھ کرتا تو ڈر تھا مبادا وہ فرار ہو جاتے کیونکہ وہ گھر سے فرار ہیں اور اُن کا نام نامی ابراہیم بن ادھم ہے۔ مُرید نے جب یہ باتیں سُنیں تو اُس نے لڑکے سے کہا "چلیئے میں ان سے آپ کی ملاقات کروا دوں۔ چنانچہ وہ مُرید، لڑکے اور اُس کی ماں کو آپ کے پاس لے آیا۔ ادھر جب حضرت ابراہیم ادھم نے اپنے سامنے اپنی بیوی اور لختِ جگر کو دیکھا تو وہ بیتابانہ انداز میں ان سے لپٹ گئے اور روتے روتے بیہوش ہوگئے۔ پھر ہوش آنے کے بعد حضرت ابراہیمؒ نے اپنے بیٹے سے دریافت کیا کہ تمہارا دین کیا ہے۔ لڑکے نے جواب دیا کہ میرا دین اسلام ہے اور میں نے قرآن پڑھا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ بعض دوسرے علوم بھی حاصل کر رکھے ہیں۔ اپنے بیٹے کی باتیں سُن کر حضرت ابراہیم ادھم نے فرمایا "الحمدللہ"۔ اس کے بعد جب آپ جانے کے لیے اُٹھے تو بیوی اور بچّے نے اصرار کرکے آپ کو روک لیا جس کے بعد آپ نے فلک کی جانب رُخ کرکے کہا " یا الٰہی اغلنی " یہ سُن کر آپ کا بیٹا زمین پر گر پڑا اور فوراً جان دے دی۔ وہاں پر موجود سارے ارادت مند یہ دیکھ کر سخت حیران و پریشان ہوئے۔ پھر اُن کے دریافت کرنے پر حضرت ابراہیم ادھم نے فرمایا کہ جب میں بچّے سے ہم آغوش ہوا تو وفورِ جذبات اور بدرا عقیدت کے باعث میں بیتاب ہوگیا تھا مگر اسی وقت غیب سے یہ ندا آئی "ابراہیم ہم سے دوستی کا دعویٰ بھی کرتا ہے اور دوسروں کو دوست بھی رکھتا ہے"۔ یہ ندا سُن کر میں نے عرض کیا کہ اے اللہ تُو یا تو میری جان لے لے یا میرے لڑکے کی جان لے لے چنانچہ لڑکے کے حق میں دُعا قبول ہوگئی اور اگر اِس پر کوئی اعتراض کرے تو میرا جواب یہ ہے کہ ایسا واقعہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ سے زیادہ حیرت خیز نہیں ہے کیونکہ انھوں نے بھی تعمیلِ حکم میں اپنے بیٹے کو خدا کی راہ میں قربان کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

حضرت ابراہیم ادھم ہر قسم کے دنیاوی لوب لالچ سے بے نیاز تھے۔ ایک مرتبہ کسی نے نذرانے کے طور پر آپ کو دس ہزار درہم پیش کئے مگر آپ نے یہ کہہ کر اس پیشکش کو ٹھکرا دیا کہ میں فقیروں سے کچھ نہیں لیتا۔ درہم دینے والے نے عرض کیا کہ میں تو بہت امیر ہوں۔ اس پر حضرت ابراہیمؒ نے اُس سے دریافت کیا کہ کیا تجھے مزید دولت کی آرزو نہیں ہے جس پر درہم دینے والے شخص نے اثبات میں سر ہلایا۔ آپ نے اُس شخص سے کہا کہ تُو یہ رقم لے جا کیونکہ تُو فقیروں کا سردار ہے۔

آپ ہمیشہ لوگوں کو رزقِ حلال کمانے کی تلقین کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ نے کسی سے سوال کیا کہ کیا تم جماعتِ اولیاء میں شامل ہونا چاہتے ہو۔ جب اُس شخص نے ہاں میں جواب دیا تو آپ نے فرمایا کہ دنیا و آخرت کی ذرہ برابر پروانہ کرو اور خود کو غیر اللہ سے خالی کرلو اور رزقِ حلال استعمال کیا کرو۔ پھر فرمایا کہ صوم وصلوٰۃ جہاد و حج پر کسی جوانمردی کا مرتبہ اُس وقت تک حاصل نہیں ہوتا جب تک اُسے یہ احساس نہ ہو کہ اُس کا رزق کن ذرائع سے ہے اور اُس کی روزی کا وسیلہ کیا ہے۔ کسی نے آپ کے سامنے ایسے شخص کی تعریف کی جو ہر وقت مجاہدات میں

مصروف رہتا تھا۔ چنانچہ شوقِ ملاقات میں جب آپ اُس عبادت گزار شخص کے ہاں پہنچے تو اُس نے آپ سے تین روز تک اپنے ہاں بطورِ مہمان ٹھہرنے کی درخواست کی اور جب آپ نے تین روز تک مسلسل اُس کے خصائل اور حالات کا جائزہ لیا تو یہ محسوس ہوا کہ اُس عبادت گزار نوجوان کی جتنی تعریف سُنی تھی وہ اس سے کہیں زیادہ بہتر ثابت ہوا اور یہ دیکھ کر آپ نے نادم ہو کر فرمایا کہ ہم تو اس قدر کاہل ہیں اور یہ شب بیداری کرتا ہے لیکن پھر اچانک آپ کے ذہن میں خیال آیا کہیں یہ ابلیس کے فریب میں مبتلا نہ ہو لہٰذا یہ دیکھنا چاہیے کہ یہ نوجوان رزقِ حلال کھاتا ہے یا رزقِ حرام اور جب آپ کو یقین ہو گیا کہ اس کی روزی حلال نہیں ہے تو پھر آپ نے اُسے اپنے ہاں تین روز تک مہمان ٹھہرایا اور اپنے ساتھ بٹھا کر کھانا کھلایا۔ جس کے بعد نوجوان کی پہلی سی حالت باقی نہ رہی اور جب اُس نے حضرت ابراہیم ادھمؒ سے پوچھا کہ آپ نے کیا کر دیا تو آپ نے فرمایا کہ تجھے رزقِ حلال میسّر نہ ہونے کی وجہ سے شیطان اپنا کام دکھا رہا تھا مگر میرے گھر کے حلال رزق نے تیری باطنی حالت کو تبدیل کر کے رکھ دیا ہے اور اب تجھے یقیناً احساس ہو گیا ہو گا کہ تمام عبادات و ریاضت کا انحصار صرف حلال کی روزی میں پنہاں ہوتا ہے۔

ایک مرتبہ حضرت ابراہیم ادھمؒ حجام سے بال کٹوا رہے تھے کہ کسی نے آپ سے گزارش کی کہ حجام کو اُس کے کام کا کچھ نہ کچھ معاوضہ ضرور دیجئے۔ لہٰذا آپ نے بال کٹوانے کے بعد حجام کو ایک تھیلی عنایت کر دی مگر اتفاقاً اُس وقت دروازے پر ایک سوالی آ گیا اور حجام نے فوراً وہ تھیلی اُٹھا کر سائل کو دے دی۔ آپ نے حجام سے کہا کیا تجھے معلوم ہے کہ مَیں نے تجھے جو تھیلی دی ہے وہ سونے کی اشرفیوں سے بھری ہوئی تھی۔ حجام نے انتہائی ادب سے جواب دیا: "سرکار مجھے اس سے آگاہی تھی لیکن مَیں یہ بھی جانتا ہوں کہ انسان دولت سے نہیں بلکہ دل سے غنی ہوتا ہے لیکن مَیں جس کے نام پر دولت لٹاتا ہوں شاید اُس سے آپ نا آشنا ہیں۔" حضرت ابراہیم ادھمؒ کا فرمانا ہے کہ حجام کے یہ الفاظ سُن کر مجھے سخت ندامت ہوئی اور مَیں نے اپنے نفس کی مذمت کرتے ہوئے کہا جیسا تُو نے کیا تھا ویسی تمہیں اس کی سزا بھی ملی۔

آپ میں خدا خوفی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا ہر وقت آخرت کو یاد کر کے آنسو بہاتے رہتے تھے زندگی میں آپ سے انجانے میں بھی جو کوتاہیاں ہوئی تھیں آپ اُس کے لیے بھی اللہ تعالیٰ سے معافی کے خواستگار رہتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ کسی کام سے سفر پر جا رہے تھے کہ راستے میں آپ کو ایک سنتری مل گیا۔ اُس نے جب آپ کا نام دریافت کیا تو آپ نے قبرستان کی طرف اشارہ کیا۔ اس پر سنتری سخت غضبناک ہو کر کہنے لگا کہ تُو مجھ سے مذاق کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی سنتری نے آپ کی گردن میں رسّی ڈال دی اور آپ کو زد و کوب کرتا ہوا آبادی کی جانب لے آیا اور جب بستی کے لوگوں نے سنتری کو لعنت ملامت کرتے ہوئے بتایا کہ یہ حضرت ابراہیم ادھمؒ ہیں تو وہ فوراً آپ کے قدموں میں لوٹ کر معافیاں مانگنے لگا۔ اس پر آپ نے انتہائی مثبت شفقت اور ملائمت سے فرمایا: "اے سنتری مَیں تیرا شکر گزار ہوں کہ تُو نے مجھ پر ظلم کر کے مجھے بہشت کا حقدار بنا دیا ہے۔ اس پر مَیں بھی تیرے حق میں دُعا کرتا ہوں کہ تجھے بھی جنّت میں جگہ ملے۔ اس واقعہ کے چند روز بعد کسی بزرگ نے خواب میں اہلِ بہشت کو دیکھا جن کے دامن موتیوں سے لبریز تھے، جب ان بزرگ نے اُن سے اس بارے میں دریافت کیا تو اُنھوں نے بتایا کہ ایک ناواقف نے حضرت ابراہیم بن ادھم کا سر پھوڑ دیا تھا اور اب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمیں حکم ہوا ہے کہ جب وہ جنّت میں داخل ہوں تو اُن پر موتیوں کی بارش کی جائے۔

حضرت ابراہیم ادھم کئی کئی روز فاقہ مستی میں گزار دیتے، کم کھانا کم سونا اور زیادہ عبادت کرنا آپ کا شعار تھا

روایت ہے کہ ایک مرتبہ جب آپ کو کھانے کے لیے کچھ نہ ملا تو آپ نے شکرانے کی چار سو رکعت ادا کیں اور جب اسی طرح مکمل سات روز گزر گئے اور آپ کی کمزوری و نقاہت میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا تب آپ نے اپنے خدا سے بھوک کا اظہار کیا۔ چنانچہ ایک نیک دل نوجوان آپ کو اپنے گھر لے گیا اور آپ کو پہچاننے کے بعد کہنے لگا کہ میں آپ کا پرانا غلام ہوں اب میری تمام جائیداد کے مالک با اختیار آپ ہیں۔ یہ سن کر حضرت ابراہیمؒ نے فوراً اس غلام کو آزاد کر دیا اور اس کی تمام جائیداد بھی اُس کے سپرد کر دی اور یہ عہد کر لیا کہ آئندہ کبھی کسی سے کچھ طلب نہ کروں گا کیونکہ روٹی کے ایک ٹکڑے کی خواہش پر اُن کی خدمت میں پوری دُنیا پیش کر دی گئی تھی۔

حضرت سہیلؒ فرماتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ آپ کے ہمراہ دورانِ سفر بیمار ہو گیا۔ آپ کے پاس جو کچھ تھا انھوں نے وہ سب میری بیماری پر خرچ کر دیا اور جب سارا مال و اسباب ختم ہو گیا حضرت ابراہیم ادھم نے اپنا خچر فروخت کر کے خرچ کیا۔ میں نے صحت یاب ہونے کے بعد جب آپ سے خچر کی بابت دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا کہ وہ تو میں نے فروخت کر دیا ہے۔ اس پر جب میں نے اُن سے دریافت کیا کہ اب میں سفر کس طرح کروں گا تو انھوں نے فرمایا کہ میرے کندھوں پر، اور آپ یقین کریں حضرت نے مجھے اپنے کندھوں پر سوار کر کے سفر کی تین منازل طے کیں۔ ایک اور روایت کے مطابق جب تنگدستی کے باعث آپ کے پاس کھانے کے لیے کچھ نہ رہا تو آپ مسلسل پندرہ دن تک ریت کھاتے رہے۔ آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ میں نے مکہ معظمہ میں قیام کے دوران کبھی کوئی پھل اس لیے نہیں خریدا کہ وہاں کی ساری زمینیں فوجیوں نے خرید رکھی تھیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں نے بے شمار حج کیے مگر آبِ زم زم کا پانی اس خیال کے تحت نہیں پیا کہ اس پانی کو نکالنے کے لیے حکومت کا ڈول استعمال ہوتا ہے۔

لوگ دُور دُور سے چل کر آپ سے ہدایات لینے آیا کرتے تھے اور آپ اللہ اور اُس کے رسول کے احکامات کی روشنی میں اُن کو نصیحت کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی ارادت مند نے آپ سے درخواست کی کہ کوئی نصیحت کیجیے۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ چھ عادات اپنا لو۔ اوّل یہ کہ جب تم ارتکابِ معصیت کرتے ہو تو خدا کے رزق کو مت استعمال کرو۔ دوم اگر معصیت کا ارادہ ہو تو خدا کی مملکت سے نکل جاؤ۔ سوم ایسی جگہ جا کر گناہ کرو جہاں خدا نہ دیکھ رہا ہو۔ اس پر جب لوگوں نے یہ اعتراض کیا کہ وہ کون سی جگہ ہے جہاں پر خدا نہیں دیکھ سکتا جب کہ وہ اسرار و قلوب تک سے آگاہ ہے تو فرمایا کہ یہ کیا انصاف ہے کہ اُس کا رزق استعمال کرو۔ اسی کے مُلک میں رہو اور اسی کے سامنے گناہ بھی کرو۔ پھر آپ نے چوتھی نصیحت یہ کی کہ فرشتہ اجل سے توبہ کا وقت طلب کرو۔ پنجم منکر نکیر کو قبر میں مت آنے دو اور چھٹی نصیحت آپ نے یہ کی کہ جب جہنم میں جانے کا حکم ملے تو انکار کر دو۔ آپ کی یہ نصیحتیں سُن کر سائل نے عرض کیا کہ یہ تمام چیزیں تو ناممکنات میں سے ہیں۔ کسی انسان کے لیے ان پر کاربند رہنا ممکن نہیں اس پر آپ نے فرمایا کہ اگر یہ تمام چیزیں ناممکنات میں سے ہیں تو پھر گناہ مت کرو۔ روایت ہے کہ یہ سُنتے ہی وہ شخص تمام گناہوں سے تائب ہو کر اسی وقت آپ کے سامنے اس جہانِ فانی سے کوچ کر گیا۔ اسی طرح جب لوگوں نے آپ سے دُعاؤں کی عدم قبولیت کا شکوہ کیا تو حضرت نے اُن سے کہا کہ تم لوگ اللہ کو پہچانتے ہوئے بھی اُس کی اطاعت سے گریزاں ہو اور اس کے قرآن و رسول سے واقف ہونے کے باوجود تم اُس کے احکام پر عمل نہیں کرتے اور اُس کا رزق کھا کر بھی ناشکرے رہتے ہو۔ بہشت میں جانے اور دوزخ سے بچاؤ کے لیے کچھ نہیں کرتے تم لوگ اپنے والدین کو سپرد خاک کرنے کے باوجود بھی عبرت نہیں پکڑتے۔ شیطان کو اپنا دُشمن جاننے کے باوجود اُس کو لعنت ملامت نہیں کرتے بلکہ اُس کو اپنا دوست رکھتے

ہو۔ آپ نے لوگوں سے مزید کہا کہ تم موت پر یقین رکھنے کے باوجود اس سے بے خبر اور لاپروا ہو اور اپنے عیوب سے واقف ہونے کے باوجود دوسروں کی عیب جوئی میں مصروف رہتے ہو۔ لہٰذا اس منافقانہ فضا میں تمہاری دعائیں خدا کے دربار میں بھلا کس طرح شرف قبولیت حاصل کر سکتی ہیں۔ ایک مرتبہ آپ کے ارادت مند نے آپ سے دریافت کیا کہ فاقہ مست انسان کو کیا کرنا چاہیے۔ آپ نے فرمایا کہ اُسے آخری سانس تک صبر و شکر سے کام لینا چاہیے تاکہ قاتل سے خون بہا لیا جا سکے۔

ذکر الٰہی کے موقع پر آپ نڈھال ہو جاتے تھے اور قرآن پاک کی تلاوت کے دوران آپ پر رقت کی کیفیت طاری ہو جایا کرتی تھی۔ ایک مرتبہ کوئی مجذوب قسم کا شخص پراگندی حالت میں آپ کے سامنے آگیا آپ نے اپنے ہاتھوں سے اُس کا مُنہ دھلوا کر فرمایا کہ جو مُنہ ذکرِ الٰہی کا مظہر ہو اس کو پراگندہ نہیں ہونا چاہیے اور جب اس نیم پاگل شخص کو تھوڑا سا ہوش آیا تو لوگوں نے اس کے سامنے پورا واقعہ بیان کر دیا جسے سُن کر اُس نے دل سے توبہ کر لی۔ پھر آپ نے خواب میں دیکھا کہ ایک شخص کہہ رہا ہے کہ تم نے محض خدائے بزرگ و برتر کی خاطر ایک مجذوب کا چہرہ دھلوایا لہٰذا اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ نے تیری روح و قلب کو پاک صاف کر دیا۔ اللہ کی راہ میں تکالیف اور مصیبتیں سہہ کر آپ کو روحانی مسرت ہوتی تھی۔ مکہ میں قیام کے دوران آپ کو دن بھر کی مزدوری کے بعد جو رقم میسر آتی وہ تمام کی تمام آپ اپنے عقیدت مندوں اور مُریدوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔ ایک رات جب آپ کو آنے میں خاصی تاخیر ہوگئی تو اس تصور سے کہ شاید اب آپ نہ آئیں سب مُرید کھانا کھا کر سو گئے۔ آپ نے واپسی پر جب تمام مُریدوں کو محوِ استراحت پایا تو خیال کیا کہ شاید یہ سب بھوکے ہی سو گئے ہیں چنانچہ آپ آگ جلا کر فوراً اُن کے لیے کھانا تیار کرنے لگے۔ حُسنِ اتفاق سے اُس وقت ایک مُرید بیدار ہو گیا اور سوال کیا کہ آپ یہ مصیبت کیوں برداشت کر رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا میں یہ خیال کر رہا تھا کہ شاید آپ لوگ بغیر کھائے پیئے سو گئے ہیں اس لیے میں کھانے کی تیاری میں مصروف تھا۔ آپ کی یہ بات سُن کر اس مُرید کا سر شرم سے جُھک گیا۔ دوسروں کی مصیبتوں اور پریشانیوں کو اپنے سر لے کر آپ کو بہت خوشی ہوتی تھی۔ ہر وقت آپ اس موقع کی تلاش میں رہتے کہ آپ کسی کے دُکھ درد کو اپنا روگ بنا سکیں۔ ایک شخص کئی برس تک آپ کی صحبت میں رہنے کے بعد جب واپس جانے لگا تو اُس نے عرض کیا کہ سرکار اگر آپ نے میرے اندر کچھ خامیاں اور بُرائیاں دیکھی ہوں تو آپ مجھے فوراً تنبیہہ کریں تاکہ میں آئندہ کے لیے اس سے محفوظ رہ سکوں۔ آپ نے فرمایا اے اللہ کے بندے میں نے تمہیں ہمیشہ محبت کی نگاہ سے دیکھا ہے جب کہ عیب اور بُرائیاں صرف دُشمنوں اور مخالفین میں نظر آتی ہیں۔ ایک دن جب کوئی مزدور دن بھر کام کاج تلاش کرنے میں ناکامی کے بعد گھر روانہ ہونے لگا تو اُسے خیال آیا کہ آج میں اپنے گھر والوں کو کیا مُنہ دکھاؤں گا۔ اپنے ننھے منّے معصوم بچّوں کو کھانا کہاں سے لاکر کھلاؤں گا۔ اتفاق سے اسی عالم میں سرِراہ آپ کی ملاقات حضرت ابراہیم بن ادہم سے ہوگئی۔ اور اُس نے عرض کیا کہ مجھے آپ کی حالت پر صرف اس لیے رشک آتا ہے کہ آپ تو آسودہ حال اور مطمئن ہیں جب کہ میں صبح و شام پریشانیوں میں مبتلا رہتا ہوں۔ آپ نے اُس شخص سے فرمایا کہ آج کی عبادات و صدقات میں تیرے نام کرتا ہوں اور تو آج کی پریشانی مجھے دے دے۔ الغرض یہ کہ آپ کا وجود اور ذات مبارک بنی نوع انسان کے لیے باعث راحت تھی شاید یہی وجہ ہے کہ جب آپ نے اس عالم فانی سے کوچ کیا تو نہ صرف آپ کے ارادت مندوں اور مُریدوں بلکہ عام لوگوں کو بھی اس کا بہت زیادہ ملال ہوا آپ پوری دنیا کیلئے امن و آشتی اور صلح جوئی کی علامت تھے۔ بعض روایات کے مطابق آپ کا مزار بغداد میں واقع ہے جبکہ ایک روایت کے مطابق آپ کا مزار حضرت لوطؑ کی قبر کے قریب ہے تاہم حتمی طور پر کسی کے یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔
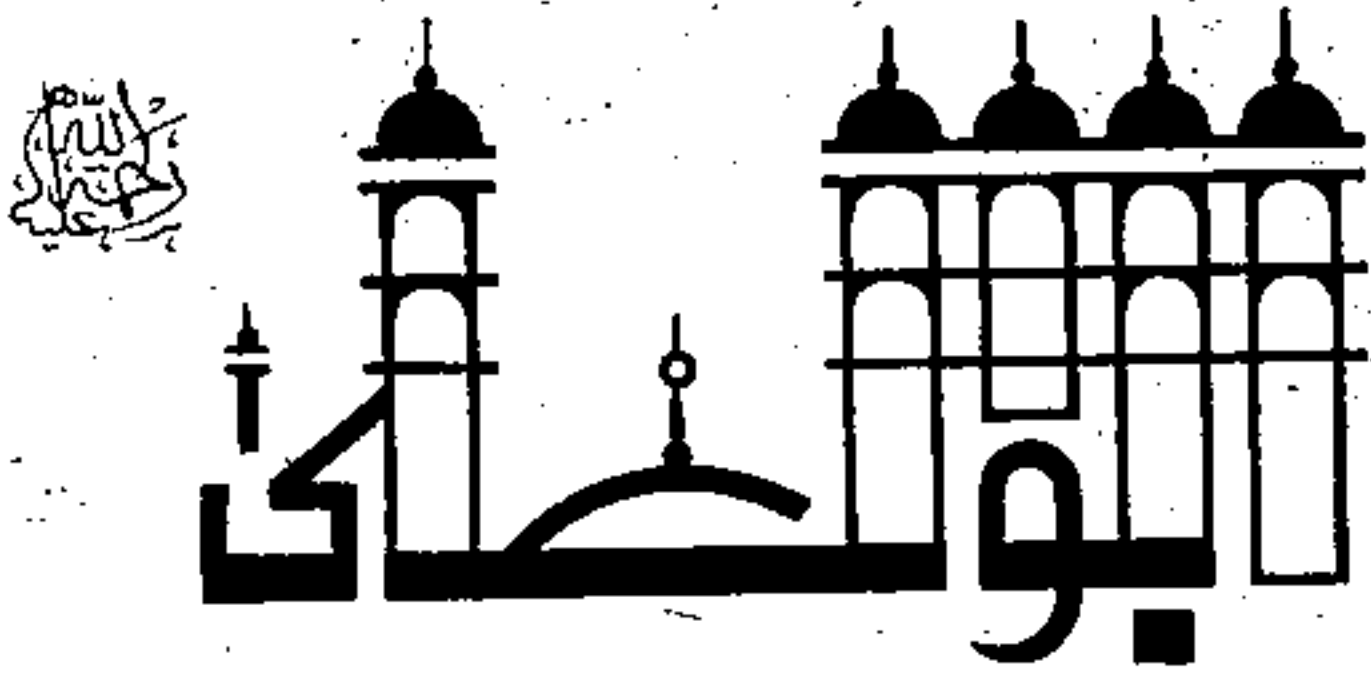
وہ بچہ بے پناہ خصوصیات اور خوبیوں کا مالک تھا اور اُس کے بارے میں وقت کی بڑی بڑی مقتدر ہستیوں اور نجومیوں نے پیش گوئی کی تھی کہ وہ بڑا ہو کر ایک کامل ولی اور صاحبِ کرامت ہوگا۔ ایک بار یہ ہونہار بچّہ جب اپنے نانا خواجہ محمّد فیض کے ہمراہ بنگال کے صوبے دار راجہ مان سنگھ کی خدمت میں حاضر ہُوا تو مان سنگھ نے اس بچّے کو بغور دیکھتے ہُوئے کہا کہ یہ لڑکا ایک دِن بڑی شہرت اور عروج حاصل کرے گا اور ایک زمانہ اس کی تعلیمات اور کرامات سے فیضیاب ہوگا۔ راجہ مان سنگھ نے بچّے کے نانا خواجہ محمّد فیض کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے نواسے کو کسی اونچے منصب پر فائز کروا دیں۔ مگر بچّے کے نانا نے راجہ مان سنگھ کی تجویز کو مسترد کرتے ہُوئے کہا کہ ابھی اُن کا نواسہ بہت چھوٹا ہے ویسے بھی وہ اُس کی ذمّہ داری کسی دوسرے کے سر پہ نہیں ڈالنا چاہتا جب کبھی موقع آیا وہ اپنے نواسے کو اُس کی صلاحیتوں اور اہلیت کے مطابق کسی منصب پر فائز کروا دیں گے۔

اس دوران بدقسمتی سے اس بچّے کے نانا کو راجہ مان سنگھ نے ایک جنگی محاذ پر بھجوا دیا، اگرچہ اُنہوں نے بہت بہادری اور دلیری کا مظاہرہ کیا مگر طاقت ور دُشمن کے سامنے اُن کا کوئی بس نہ چلا اور اس محاذ پر لڑتے ہوئے وہ شہید ہوگئے۔ یوں اُن کا نواسہ تن و تنہا رہ گیا، چنانچہ راجہ مان سنگھ نے خواجہ محمّد فیض کے اس نواسے کو اُس کے نانا کے منصب پر فائز کر دیا۔ یوں یہ نوعمر لڑکا ایک فوجی دستے کا سربراہ مقرر ہوگیا۔ اِس قدر کم عمری میں اتنی بڑی ذمّہ داری پر تعینات اِس لڑکے کو دیکھ کر ہر کوئی حیران رہ گیا۔ وہ اپنے جملہ فرائض اِس خوش اسلوبی سے نباہ رہا تھا کہ ماضی میں اس منصب پر فائز رہنے والے بڑے بڑے تجربہ کار بھی دنگ رہ گئے، لیکن خود یہ نوعمر لڑکا اپنی زندگی کے اِس انداز سے مطمئن نہ تھا۔ دُنیاداری سے وہ بیزار نظر آتا تھا اور اپنا زیادہ تر وقت عبادت اور ریاضت میں گزارتا تھا۔ ایک رات خواب میں اِس لڑکے نے دیکھا کہ تین باریش اور روحانی چہروں والے بزرگ اُس کے سامنے موجود ہیں۔

ایک بزرگ نے اُس سے کہا۔
"برخوردار تو اب کس لیے اُداس اور کھویا کھویا سا رہتا ہے تیرے پاس دُنیا کی ہر شے ہے، اعلیٰ منصب تیرے پاس ہے اور یہ وہ نعمتیں ہیں جن کی ہر انسان تمنا کرتا ہے"۔
لڑکے نے کہا: "اے نیک بزرگ وہ تو سب ٹھیک ہے مگر میرا ان دُنیاوی نعمتوں اور آسائشوں میں دل نہیں لگتا۔ مجھے تو فقیری اور درویشی کی آرزو ہے"۔
لڑکے کی بات سن کر بزرگ کے ہونٹوں پر تبسم پھیل گیا اور وہ لڑکے کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لے کر کہنے لگے۔" برخوردار! خدائے بزرگ و برتر زمین و فلک کا نور ہے۔ وہ بڑا رحیم ہے اس لیے تجھے افسردہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں"۔ اتنا کہنے کے بعد بزرگ نے اُسترا نکالا اور لڑکے کے سر کے بال صاف کر دیئے۔ پھر دوسرا بزرگ آگے بڑھا اُس نے لڑکے کا دُنیاوی لباس اُتار کر اُسے کفن نما لباس پہنا دیا۔ اِسی دوران تیسرے بزرگ نے لڑکے کے سر پہ عمامہ رکھ دیا پھر وہ تینوں بزرگ ایک ساتھ بولے "برخوردار! ہم نے اپنے اپنے حصے کا کام کر دیا ہے اب اگلی ذمہ داری تمہاری ہے کہ تم کیا کرتے ہو ــــ؟
یہ خواب دیکھتے ہی لڑکا نیند سے بیدار ہو گیا۔ اب اُس کی طبیعت میں پہلے کی طرح بے کلی اور بے چینی نہیں تھی ایک عجیب قسم کا قلبی سکون محسوس ہو رہا تھا۔ لڑکے نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ خواب میں جو بشارت ہوئی تھی اُس کے مطابق اُس نے اپنے بال کٹوا دیے۔ دنیاوی لباس اُتار کر خاک نشینوں والا لباس زیبِ تن کیا اور آسائش کی ہر شے کو اپنے سے دُور کر دیا۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے رات والے خواب نے اُس کی زندگی بدل دی ہے اُسے اب دُنیا کی ہر شے کمتر نظر آ رہی تھی۔
شاہانہ جاہ و جلال اور دُنیاوی شان و شوکت کو ٹھکرا کر خاک نشین ہونے کا آرزومند یہ نوجوان اپنے دَور کا عظیم صاحبِ کرامت ولی اللہ ٹھہرا جسے زمانہ آج امیر ابوالعلیٰ قطب دوراں کے نام سے یاد کرتا ہے۔
یہ اُس دَور کی داستان ہے جب برّصغیر میں ہر قسم کے افراد کی آمد آمد تھی۔ تاجروں ہنرمندوں اور صوفیائے کرام کا دَور دورہ تھا۔ جلال الدین اکبر کی حکومت اپنے عروج پر تھی، لیکن ابھی دینِ الٰہی کو فروغ نہیں ملا تھا۔ اِسی زمانے میں ایک بزرگ جن کا نام خواجہ عبدالسلام تھا اپنے بیوی بچوں کے ہمراہ برّصغیر میں آکر آباد ہو گئے۔ اُن کی تعلیمات اور کردار و گفتار سے لوگ اِس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے آپ کو سرآنکھوں پر بٹھایا۔ آپ کی علمیت کی شہرت کے بارے میں جب جلال الدین اکبر نے سُنا تو اس نے اپنے وزیروں سفیروں سے دریافت کیا کہ کیا تم بھی خواجہ عبدالسلام سے آشنا ہو۔ وزیروں نے بھی خواجہ صاحب کی کرامات اور تعلیمات کی تصدیق کر دی۔ بادشاہ نے بڑی تمکنت میں کہا۔ میں نے سُنا ہے کہ وہ یہاں سے کہیں اور جانا چاہتے ہیں اس پہ دربار میں موجود خواجہ صاحب کے ایک ارادت مند نے کہا کہ اگر وہ کہیں جانا بھی چاہیں تو انہیں بھلا کون روک سکتا ہے۔
یہ سُن کر جلال الدین اکبر طیش میں آگیا اور اُس نے کہا "میری مرضی کے بغیر وہ بزرگ کہیں نہیں جا سکتا"۔ درباریوں نے سوچا کہ شاید بادشاہ سلامت خواجہ عبدالسلام سے ناراض ہو گئے ہیں۔ انہوں نے کہا "بادشاہ سلامت کیا خواجہ صاحب کی کوئی بات آپ کو ناگوار گزری ہے"۔
یہ سُن کر جلال الدین اکبر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اُس نے کہا "کہ وہ اپنے دل میں خواجہ صاحب

کے لیے گہری عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اس لیے اُن کی خواہش ہے کہ خواجہ عبدالسلام اُنہی کے مُلک میں مستقل قیام پذیر رہیں"۔ خواجہ صاحب نے بادشاہ کی درخواست قبول کر لی مگر کچھ عرصہ بعد وہ حج بیت اللہ کی سعادت کے لیے روانہ ہو گئے اور وہیں ان کا انتقال ہو گیا۔ پھر اُن کے صاحبزادے امیر ابوالوفا اپنے والد محترم کی جگہ جانشین مقرر ہوئے مگر وہ بھی عالمِ جوانی میں اِس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔ امیر ابوالوفا نے اپنی نیابت کے لیے ایک کمسن بچہ چھوڑا۔ یہ وہی خوش نصیب بچہ تھا جسے اُس کے نانا خواجہ محمد فیض کے انتقال کے بعد نوعمری میں ہی بنگال کے حاکم نے ایک فوجی دستے کا سپہ سالار مقرر کر دیا مگر اب ایک خواب نے اُس کی زندگی بدل کر رکھ دی تھی اور وہ اپنے موجودہ منصب سے فوری طور پر دستبردار ہو کر درویشانہ زندگی بسر کرنا چاہتا تھا۔ اسی کشمکش کی کیفیت میں ابوالعلیٰ راجہ مان سنگھ کے دربار میں جا پہنچے۔ راجہ نے سوچا کہ شاید کچھ مشکل آن پڑی ہے اور فوجی دستے کا یہ نوعمر سپہ سالار کوئی مشورہ لینے آیا ہے مگر جب ابوالعلیٰ نے راجہ مان سنگھ سے یہ کہا کہ وہ اپنے منصب سے سبکدوش ہونے آئے ہیں تو وہ سخت برہم ہوا اور کہنے لگا۔

" صاحبزادے یہ فیصلہ کرنا بادشاہ کا کام ہے کہ آپ موجودہ عہدے کے اہل ہیں یا نہیں، تاہم میں آپ سے بھی کہوں گا کہ اگر آپ کو کوئی اُلجھن پیش آ گئی ہے یا آپ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے تو میں اس کو درگزر کرنے کے لیے تیار ہوں، لیکن آپ کو یہ اختیار نہیں کہ خود اپنی مرضی سے اپنے منصب سے الگ ہو سکیں۔ پھر بھی میں پوچھنا چاہوں گا کہ آخر آپ کی اس ذہنی تبدیلی کا سبب کیا ہے۔ اگر آپ مزید بڑے منصب کے خواہش مند ہیں تو اس کے لیے بھی میں بادشاہ سے بات کر سکتا ہوں، لیکن اگر آپ اپنی ضد پر اڑے رہے تو آپ کو نقصان بھی پہنچ سکتا ہے"۔

راجہ مان سنگھ کی یہ بات سُن کر نوجوان سپہ سالار ابوالعلیٰ کا چہرہ بھی سُرخ ہو گیا اور انہوں نے راجہ سے کہا " صوبے دار صاحب موجودہ منصب پر رہنے کی وجہ سے اب تک مجھے جو نقصان پہنچا ہے۔ میں اس سے زیادہ کا متحمل نہیں ہو سکتا"۔

مان سنگھ نے ابوالعلیٰ سے کہا " میں احتیاطاً آپ کا استعفیٰ رکھ لیتا ہوں، لیکن مجھے یقین ہے کہ ایک روز آپ کو اپنے اس فیصلے پر پچھتانا پڑے گا"۔

بہر کیف ابوالعلیٰ اپنا استعفیٰ پیش کر کے واپس چلے آئے کچھ ہی دِنوں بعد ابوالعلیٰ کو راجہ مان سنگھ نے طلب کیا اور کہا کہ سید صاحب آپکی آزمائش کا وقت آ گیا ہے۔ باغیوں کی فوجیں بینار پور کے میدان میں ڈیرے ڈال رہی ہیں اور مجھے ایک غیبی قوت کی وساطت سے معلوم ہوا ہے کہ اگر اس جنگ کی قیادت آپ نے کی تو یقیناً کامیابی ہماری ہی ہو گی۔ بصورتِ دیگر شکست ہمارا مقدر ہو گی لہٰذا اس جنگی معرکے میں آپ کو شاہی فوج کی قیادت کرنا ہو گی چونکہ صورتِ حال کا تقاضا بھی یہی تھا۔ اس لیے آپ فوری طور پر شاہی فوج کے دستے لے کر بینار پور روانہ ہو گئے جہاں پہلے ہی باغی سپاہی حملہ کے لیے تیار کھڑے تھے اگرچہ باغیوں کے پاس بہت زیادہ عسکری طاقت تھی مگر ابوالعلیٰ نے انتہائی ہوشیاری اور جوانمردی سے باغیوں کی فوج کا مقابلہ کر کے اُنہیں کچل کر رکھ دیا راجہ مان سنگھ کو جب اس فتح کی خبر ملی تو اُسے بے پایاں مسرت ہوئی۔ مقابلے سے واپسی پر راجہ مان سنگھ نے ابوالعلیٰ کو سر آنکھوں پر بٹھایا اور موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اُس نے ایک بار پھر ابوالعلیٰ سے گزارش کی کہ آپ ایسے بہادر جری اور جواں ہمت سپہ سالار کی ہماری فوج میں موجودگی خوش نصیبی کی علامت ہو گی مگر ابوالعلیٰ نے دوبارہ مان سنگھ پر زور دیا کہ حسبِ وعدہ وہ اپنا وعدہ پورا

کریں۔ مان سنگھ نے کہا، "سید صاحب ابھی آپ نوعمر ہیں جبکہ ترکِ دُنیا آخری عمر میں کی جاتی ہے۔" ابوالعلیٰ نے انتہائی تحمل اور بُردباری سے جواب دیا۔

"راجہ صاحب شاید آپ نہیں جانتے کہ جو طاقتیں مجھے دُنیاداری سے بیزار کر رہی ہیں۔ اُن میں یہ قوت بھی ہے کہ وہ آپ کو میرا استعفیٰ قبول کرنے پر بھی مجبور کر دیں گے۔"

یہ بات سُنکر مان سنگھ طیش میں آگیا اُس نے انتہائی تلخی سے کہا: "دیکھیے سید صاحب میں اِن انجانی قوتوں کو بھی دیکھ لوں گا جو اپنے دباؤ سے آپ کا استعفیٰ منظور کروائیں گی، فی الحال آپ اپنے فرائض انجام دیتے رہیں۔

راجہ کی اس بات نے ابوالعلیٰ کو انتہائی افسردہ اور غمگین کر دیا۔ اُس رات خواب میں پہلے تین بزرگوں کے علاوہ ایک اور بزرگ بھی نظر آئے۔ چوتھے بزرگ بہت جاہ وجلال والے اور نورانی صورت کے مالک تھے۔ اس بزرگ نے کہا ابوالعلیٰ تُو نے زندگی کا یہ کیسا انداز اپنا رکھا ہے۔ تمہارے لیے بہتر ہے کہ تم اپنی خاندانی روایات پر چلتے رہو۔ بزرگ کی بات سُن کر ابوالعلیٰ نے آبدیدہ ہو کر کہا: "حضور میں تو کمبل چھوڑنا چاہتا ہوں مگر یہ دُنیاوی کمبل ہی مجھے چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہے۔"

بزرگ نے دلاسہ دیتے ہوئے کہا ابوالعلیٰ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں بروں دان نے تیرا دامن پکڑ رکھا ہے اور ہم اِسی سے تیرا پیچھا چھڑائیں گے۔ خواب دیکھ کر ابوالعلیٰ بیدار ہوئے۔ اب وہ رات والے خواب کو جلد از جلد شرمندہ تعبیر ہوتے دیکھنا چاہتے تھے۔ اسی دوران راجہ مان سنگھ نے اُنہیں طلب کر لیا۔ ابوالعلیٰ جب راجہ کے پاس پہنچے تو وہ بہت افسردہ دکھائی دے رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ابھی اُس کے آنسو چھلک پڑیں گے۔ ابوالعلیٰ نے دریافت کیا کہ آپ نے مجھے اتنی رات گئے کس لیے یاد فرمایا ہے۔

راجہ مان سنگھ نے ابوالعلیٰ کی بات کا جواب دینے کے بجائے اُن سے سوال کیا کہ شہنشاہِ اکبر کے بارے میں آپ کے کیا خیالات ہیں۔ ابوالعلیٰ نے کہا کہ وہ حاکمِ وقت ہیں اور ہم سب اُس کے نمک خوار و وفادار ہیں۔ اس کے ساتھ ہی راجہ مان سنگھ نے ابوالعلیٰ کو یہ خبر سُنائی کہ شہنشاہِ اکبر اس دُنیا سے رُخصت ہو گئے ہیں اور اب اُن کے صاحبزادے نورالدین جہانگیر نے تخت و تاراج سنبھال لیا ہے۔ نئے حکمران نے ہمیں فوری طور پر آگرہ پہنچنے کا حکم صادر کیا ہے کیونکہ وہ اپنے تمام عہدے داروں سے ملاقات کرنا چاہتا ہے اور عین ممکن ہے کہ بعض عہدے داروں کی معطلیاں اور بعض کی نئی تقرریاں عمل میں آئیں۔ یہ اطلاع ابوالعلیٰ کے لیے کسی خوشخبری سے کم نہ تھی انہوں نے سوچا کہ یقیناً اب میری مراد پوری ہو جائے گی۔

جلد ابوالعلیٰ نے بھی تمام تیاریاں مکمل کر لیں اور سفر پر روانہ ہو گئے۔ راستے میں جہاں جہاں بھی اللہ کے نیک بندے ملے ابوالعلیٰ نے اُن سے ملاقات کی۔ جب آپ منیر نامی قصبے میں ٹھہرے تو آپ کو اطلاع ملی کہ یہاں پر مشہور صوفی بزرگ شیخ یحییٰ منیری کی اولاد میں سے کوئی ولی اللہ سکونت پذیر ہیں۔ ابوالعلیٰ ان سے مل کر خوشی سے سرشار ہو گئے اس کے بعد آپ اکبر آباد پہنچ گئے جہاں نورالدین جہانگیر سے آپ کی ملاقات ہوئی وہ آپ سے مل کر بہت خوش ہوا اور ابوالعلیٰ سے دریافت کیا کہ آپ فیض سنگ کے نواسے ہیں؟ ابوالعلیٰ نے اثبات میں جواب دیا۔ جہانگیر نے پھر پوچھا کیا آپ خواجہ عبدالسلام کے پوتے اور ابوالوفا کے صاحبزادے ہیں؟ ابوالعلیٰ نے جب دوبارہ ہاں میں جواب دیا تب جہانگیر نے طنزاً کہا "اس صورت میں تو آپ تارکِ دنیا ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔"

خوشخبری — خوشخبری

چشمۂ فیض کا اجراء

سلطان العارفین حضرت سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلۂ عالیہ سروری قادری سے تعلق رکھنے والے پیر محمد اشرف صاحب سروری قادری نے بیشمار چلّے کاٹنے اور کڑی ریاضت کے بعد اپنے پیرخانے دآستانہ عالیہ سلطان الفقراء حضرت فقیر نور محمد سروری قادریؒ کلاچی ضلع ڈیرہ اسماعیل خان کے روحانی جانشین حضرت فقیر عبدالحمید سروری قادری صاحب مدظلہ کی خصوصی اجازت اور حکم سے عوام کی بے لوث خدمت اور دکھی انسانیت کو سکون بخشنے کی خاطر شیریں جناح کالونی مکان ۱۹۹/ایل نزد گورنمنٹ گرلز پرائمری اسکول کلفٹن حق باہو ہاؤس میں دم تعویذ اور دعا کا مبارک سلسلہ شروع کردیا ہے اللہ کے نام اور کلام میں حیرت انگیز برکت اور شفا موجود ہے اب تک بیشمار لاعلاج مریض اور آسیب زدہ لوگ شفایاب ہوچکے ہیں آپ بھی فیض حاصل کرنے کیلئے رابطہ قائم کریں۔

منجانب خادم الفقراء

برکت علی کلفٹن کراچی • ایم اے شیخ ڈیفنس سوسائٹی • نثار صدیقی کیماڑی کراچی
قاری فیض اللہ۔ ناظم آباد کراچی

(برائے رابطہ پیر صاحب)

پیر محمد اشرف سروری قادری

حق باہو ہاؤس ۱۹۹/ایل شیریں جناح کالونی کراچی

ابوالعلیٰ نے جواب دیا کہ وہ کئی مرتبہ اس دنیاوی منصب سے دستبردار ہونا چاہتے تھے مگر راجہ مان سنگھ نے اُن کا استعفیٰ قبول نہیں کیا جہانگیر نے ابوالعلیٰ سے وعدہ کیا کہ وہ اُن کی درخواست پر غور کریں گے۔ اس کے ساتھ جہانگیر نے ابوالعلیٰ سے یہ بھی کہا کہ میل ملاقات کی غرض سے وہ دربار میں آتے جاتے رہا کریں۔ ایک دن جہانگیر نے ابوالعلیٰ کو ایسی دعوت میں شریک کر لیا جہاں شراب کا دور چل رہا تھا۔ ابوالعلیٰ کو بھی جام پیش کیا گیا۔ انہوں نے اخلاقاً جام لے تو لیا مگر بعد میں اُسے فرش پر انڈیل دیا۔ ساقی اُن کی یہ حرکت دیکھ کر بہت پریشان ہوا۔ اُس کا خیال تھا کہ بادشاہ سلامت تو اب قہر بن کر ابوالعلیٰ پر برسیں گے۔ جہانگیر نے بھی یہ سارا منظر دیکھا۔ پھر اُس نے کچھ سوچ کر ابوالعلیٰ کی طرف دوسرا جام بھی بڑھا دیا۔ انہوں نے جہانگیر کے ہاتھ سے یہ جام بھی لے کر فرش پر انڈیل دیا۔ اب تو بادشاہ آپے سے باہر ہو گیا اور انتہائی قہر آلود نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"ابوالعلیٰ میں اب تک تیری بہت عزت کرتا آرہا تھا۔ مگر تو آداب شاہی سے بالکل بے بہرہ ہے یہ گستاخی کرتے ہوئے تجھے اتنا بھی یاد نہیں رہا کہ غضب سلطانی کے شعلے بڑے بڑوں کو جلا کر خاکستر کر دیتے ہیں۔" اس پر ابوالعلیٰ نے برملا جواب دیا۔ بادشاہ سلامت میں صرف قہر الٰہی سے ڈرتا ہوں غضب سلطانی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

ابوالعلیٰ کوئی جواب دیئے بغیر اپنے گھر لوٹ گئے۔ ادھر جہانگیر کا نشہ کم ہوا تو اس نے انہیں طلب کیا مگر ابوالعلیٰ نے جانے سے انکار کر دیا۔ جہانگیر نے دوبارہ بلوایا اور ساتھ یہ بھی پیغام بھیجا کہ میں نے نشے کی حالت میں سب کچھ کہا تھا۔ آپ اس کو درگزر فرمائیں اور تشریف لے آئیں۔ ابوالعلیٰ نے اس پیغام کے جواب میں بھی کہلا بھیجا کہ دنیا داری کے چکر میں پڑ کر میں بہت ذلیل وخوار ہو چکا ہوں لہٰذا اب میں شاہی نوکری نہیں کر سکتا۔ چنانچہ جہانگیر نے بے بسی کے عالم میں ابوالعلیٰ کا استعفیٰ منظور کر لیا۔

اس کے بعد ابوالعلیٰ نے اپنا تمام مال واسباب اللہ کی راہ میں لٹا دیا اور سارا وقت عبادات وریاضت میں صرف کرنے لگے۔ ایک دن خواب میں کسی بزرگ نے آپ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "اے فرزند ارجمند تمہارا کشود کار خواجہ معین الدین چشتی سے مقدر ہے تم سستی سے کام مت لو اور بغیر کسی تاخیر کے اجمیر شریف روانہ ہو جاؤ اور وہاں اپنے حصے کا کام نمٹاؤ۔" جیسے ہی آپ نیند سے بیدار ہوئے تو درویشی لباس پہن کر دہلی کو روانہ ہو گئے۔ راستے میں آپ نے نظام الدین اولیا اور قطب الدین بختیار کاکی کے مزار کی زیارت کی۔ اس کے بعد اجمیر پہنچ کر بھی حاضری دی۔ ابوالعلیٰ کو اس امر پر خاصی حیرانی ہوئی کہ خواجہ چشتی نے عالم خواب میں اُن سے ملاقات کی۔ پھر ایک روز آپ خواجہ صاحب کے مزار کا طواف کر رہے تھے کہ انہیں قریب ہی سے خواجہ معین الدین چشتی کے وجود مبارک کا احساس ہوا۔ یہ دیکھ کر ابوالعلیٰ دم بخود رہ گئے۔ خواجہ صاحب نے ہاتھ بڑھا کر اُسے کھانے کے لیے کوئی شے پیش کی۔ یہ شے تسبیح کے دانے جیسی اور قدرے سرخ رنگ کی تھی۔ اس کو جیسے ہی ابوالعلیٰ نے اپنے حلق سے نیچے اُتارا تو انھیں اپنی کیفیت میں نمایاں تبدیلی محسوس ہوئی۔ ان کا قلب ایمان کی روشنی سے منور ہو گیا۔ آپ مزید چند روز اجمیر شریف میں قیام کرنا چاہتے تھے مگر خواجہ صاحب کے حکم پر آگرہ چلے گئے۔ ابوالعلیٰ نے عرض کیا۔ حضرت میں تو آپ کی بیعت کے لیے حاضر ہوا تھا مگر آپ مجھے آگرے جانے کا حکم صادر فرما رہے ہیں۔"

خواجہ نے جواب دیا۔ "ابوالعلیٰ تو نے اپنے چچا امیر عبداللہ کو نہ جانے کیوں بھلا رکھا ہے حالانکہ

ت نیک پرور اور عبادت گزار ہیں جا انہی سے بیعت ہو جا اور اُن کی بیٹی سے شادی کر لے۔
آگرے میں آپ کے چچا امیر عبداللہ نے بڑے پُرجوش طریقے سے آپ کا استقبال کرتے ہوئے کہا۔
ابوالعلیٰ میں تیرا ہی انتظار کر رہا تھا" آپ اپنے چچا کے قریب بیٹھ گئے۔ چچا نے بھتیجے کے سر پر شفقت سے
ہاتھ پھیرا اور درد بھرے لہجے میں بولے۔" اگر خواجہ صاحب نے تجھے میرے پاس نہ بھیجا ہوتا تو تو اسی طرح مجھ
سے دُور رہتا، حالانکہ میں ایک عرصہ سے تیری آس لگائے ہوئے تھا" بہرکیف ابوالعلیٰ نے خواجہ معین الدین چشتی
کی ہدایت پر اپنے چچا کے ہاتھ میں بیعت کی اور اُن کی بیٹی سے شادی بھی کر لی۔

شادی کے بعد تو ابوالعلیٰ مکمل طور پر بدل گئے۔ وہ اِس قدر ریاضتیں اور مجاہدے کرنے لگے کہ مکاشفات
ہونے لگے۔ آپ کے ارادت مندوں میں مُلا عمر نامی ایک شخص بھی موجود ہوتے تھے جن پر غیر معمولی طور پر سماع
کا اثر ہوتا تھا۔ وہ سماع سے اِس قدر متاثر ہوتے کہ کئی کئی گھنٹوں تک بیہوشی کے عالم میں رہتے۔
مُلا عمر ایک روز سماع کے دوران اِس قدر زور سے اُچھلے کہ اُن پر غشی کی کیفیت طاری ہو گئی۔ اُنہیں
ہوش میں لانے کی ساری تدابیر ناکام ہو گئیں اور یہ انکشاف کافی دیر بعد ہُوا کہ مُلا عمر غشی کی حالت میں
انتقال کر گئے ہیں۔ یہ اعلان سُن کر محفل میں موجود ہر شخص ہکا بکا رہ گیا۔ آہ و بکا کی آوازیں سن کر ابوالعلیٰ بھی
اپنے حجرے سے نکل آئے۔ جب آپ کو یہ بتایا گیا کہ مُلا عمر سماع کے دوران بیہوشی کے عالم میں انتقال کر
گئے ہیں تو آپ نے مُلا عمر کو چھُو کر کہا "کون کہتا ہے کہ مُلا عمر مر گیا ہے" اس پر حاضرین کی آوازیں اُٹھیں کہ
اب ان میں رکھا ہی کیا ہے۔
یہ سُنتے ہی ابوالعلیٰ نے مُلا عمر کو کندھے سے پکڑ کر ہلایا اور ازراہِ مذاق کہا "ارے بھائی کیوں فریب
کرتا ہے۔ بہت سُستی کر لی تو نے اب اُٹھ جا۔ خوامخواہ لوگوں کو پریشان مت کر" یہ سُنتے ہی مُلا عمر اُٹھا اور
حیرت زدہ نگاہوں سے آس پاس کے لوگوں کو دیکھنے لگا۔ وہاں پر موجود حاضرین نے پوچھا کہ ابھی ابھی
تمہیں کیا ہو گیا تھا۔ مُلا عمر نے جواب دیا "مجھے نیند آ گئی تھی اور میں خواب میں دیکھ رہا تھا کہ میرا وجود بہت
ہلکا پھلکا ہو چکا ہے اور میں اوپر اُٹھتا چلا جا رہا ہوں پھر معلوم نہیں کہ کس نے مجھے واپس کر دیا اور جب میں
ہوش میں آیا تو اپنے آس پاس ہجوم دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا"
ابوالعلیٰ نے فرمایا "مُلا عمر حیرت زدہ کیوں ہوتے ہو، ہوش میں آنے کے بعد نمازِ شکرانہ ادا کرو"
مُلا عمر نے عرض کیا "حضرت میں اس واقعہ کی ساری حقیقت جاننے کا مشتاق ہوں"
ابوالعلیٰ نے جواب دیا "تیری باتوں پر میں نے یقین کر لیا ہے۔ اب اس کو بار بار دہرانے کی ضرورت نہیں
ہے" اس موقع پر کسی اور ارادت مند نے کہا۔ مُلا عمر تیرا وصال تو ہو چکا تھا مگر پیر و مرشد کی دُعا سے تجھے
زندگی مل گئی۔ تم اسے ہی غنیمت سمجھو۔ مُلا عمر جانا تو نہیں چاہتا تھا، لیکن جب سبھی نے مجبور کیا تو وہ چلا گیا
خاصا مضمحل اور پریشان تھا۔ چند دنوں بعد اُس نے سبھی پر بات واضح کر دی کہ وہ واقعی مر چکا تھا،
حضرت شاہ ابوالعلیٰ کی دعاؤں اور مہربانیوں سے دوبارہ اس دنیا میں لوٹ آیا۔ یہی واقعہ جب بہت زیادہ
مشہور ہو گیا تو یوں ابوالعلیٰ کی ولایت لوگوں میں شہرت پا گئی۔
اس واقعہ کے بعد آپ سے بے شمار کرامات رونما ہوئیں۔ ایک روز نمازِ جمعہ کے بعد آپ مسجد میں بیٹھے
ارادت مندوں کو کچھ سمجھا رہے تھے کہ انہیں شور و غل کی آواز سنائی دی۔ ایک مُرید نے آکر بتایا کہ ایک

بدمست ہاتھی ادھر اُدھر بھاگا پھر رہا ہے اندیشہ یہ ہے کہ کہیں وہ مسجد کی جانب نہ آنکلے۔ ابوالعلیٰ فوراً اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور کہا کہ وہ کسی طور بھی ہاتھی کو مسجد کی جانب نہیں آنے دیں گے۔ یہ کہہ کر آپ باہر نکل گئے۔ مریدوں نے کہا۔" حضرت کیا آپ کو اپنی جان عزیز نہیں ہے؟ آپ جانتے ہی ہیں کہ ہاتھی بدمست ہے اگر آپ اُس کے سامنے آگئے تو نہ جانے آپ کا کیا حشر ہو۔"

اِس پر ابوالعلیٰ نے جواب دیا۔" بابا! ابوالعلیٰ اپنی راہ جاتا ہے ہاتھی اپنی راہ جائے۔" ابھی اُن کی بات چیت جاری تھی کہ بدمست ہاتھی اِسی طرف کو نکل آیا۔ جب ہاتھی زیادہ قریب آگیا تو ابوالعلیٰ نے اُسے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔" تو ایسا کیوں کر رہا ہے۔ یاد رکھ ایسا کرنے سے تیرا اپنا ہی نقصان ہوگا۔ ہاتھی بدستور کھڑا آپ کی جانب دیکھتا رہا۔ پھر کئی روز بعد مریدین نے آکر ابوالعلیٰ کو اطلاع دی کہ بدمست ہاتھی خانقاہ کے در پر کھڑا ہے۔ آپ فوراً باہر نکلے اور ہاتھی سے پوچھا کہ تو مخلوقِ خدا کو کیوں خوف زدہ کر رہا ہے۔" ہاتھی ایک بار چنگھاڑ کر دوبارہ خاموش ہو گیا۔ ابوالعلیٰ نے فرمایا۔" مخلوقِ خدا کو تنگ کرنا یا نقصان پہنچانا اچھی بات نہیں ہے۔ تیرے لیے مناسب یہی ہے کہ راج گھاٹ چلا جا اور لوگوں کو پیٹھ پر بٹھا کر انہیں دوسرے کنارے پر پہنچایا کر۔ ہاتھی کچھ دیر تو خاموشی سے کھڑا رہا اس کے بعد راج گھاٹ پر جا کر بڑی مستعدی سے لوگوں کو ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پہنچانے کا کام کرنے لگا۔ یہ ہاتھی بعد میں امیر صاحب کا ہاتھی کے نام سے مشہور ہو گیا۔

حضرت امیر ابوالعلیٰ قطبِ دوراں اُن اولیائے کرام میں سے تھے جنہوں نے اپنی تمام زندگی بنی نوع انسان کی بھلائی کے لیے وقف کر رکھی تھی وہ اپنے مریدوں، ارادت مندوں اور لوگوں کو ہمیشہ امن و آشتی کا درس دیا کرتے تھے۔ اپنے زمانے کے بڑے بڑے حکمران اور ریاستوں کے نواب ملکی امور پر آپ سے مشورے لیا کرتے تھے۔

حضرت امیر ابوالعلیٰ کی تعلیمات و کرامات سے ایک زمانے نے فیض حاصل کیا۔ روایت ہے کہ آخری دِنوں میں اُن کی ایک ٹانگ مفلوج ہو گئی تھی اور چلنے پھرنے سے قاصر تھے، لیکن اس کے باوجود انہوں نے اپنے عقیدت مندوں کو اپنے دُکھ درد کا احساس تک نہیں ہونے دیا۔ اِسی تکلیف کے عالم میں انہوں نے چند فارسی اشعار کہے جن کی تاثیر نے کچھ ایسا کام دکھایا کہ چند ہی دِنوں میں آپ صحت یاب ہو گئے۔

حضرت امیر ابوالعلیٰ قطبِ دوراں ۱۰۶۱ ہجری میں اِس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ آپ کی طرح آپ کے دونوں صاحبزادوں امیر نور العلیٰ اور امیر فیض اللہ بھی اپنے دَور کے عظیم صوفیاء میں ٹھہرے اور انہوں نے بھی اپنے والدِ محترم کی تعلیمات کے مطابق لوگوں کو انسانیت کا درس دیا۔

نصیحت

ایک دفعہ خواجہ حسن بصری کو حضرت عمر بن عبدالعزیز نے لکھا کہ مجھے کوئی نصیحت فرمائیے کہ میں اسے حرزِ جان بنالوں۔ آپ نے جواب میں لکھا کہ اگر تمہارے ساتھ خدا ہے تو پھر کسی سے نہ ڈر اور اگر تیرے ساتھ خدا نہیں ہے تو پھر کسی سے اُمید نہ رکھ اور اس دن کو ہمیشہ یاد رکھ جب موت سر پر کھڑی ہوگی۔

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ

اللہ کا ایک نیک بندہ کشتی پر سوار کہیں جا رہا تھا اس کشتی میں کچھ تاجر اور بیوپاری بھی سوار تھے۔ کرنا خدا کا کیا ہوا کہ اُن میں سے ایک تاجر کا کوئی قیمتی موتی گم ہو گیا۔ ۔۔۔ ام بیوپاریوں نے اللہ کے اس نیک بندے کو پیٹنا شروع کر دیا۔ اُس شخص نے آسمان کی طرف دیکھ ر باآوازِ بلند کہا۔ "اے خدائے بزرگ و برتر تو دِلوں کے بھید جانتا ہے۔ تجھے یہ بھی علم ہے کہ میں نے ۔۔۔ کبھی چوری چکاری نہیں کی مگر آج کچھ لوگ مجھ پر یہ الزام عائد کر رہے ہیں لہٰذا اب تیری ذات مجھے بے گناہ ثابت کر سکتی ہے۔ روایت ہے کہ اِسی دوران سینکڑوں مچھلیاں بیک وقت پانی میں ے نمودار ہوئیں اور ہر مچھلی کے مُنہ میں ایک موتی تھا۔ اس نیک بندے نے ایک مچھلی کے مُنہ میں سے ائی نکالا اور چوری کا الزام لگانے والے بیوپاری کے حوالے کر دیا۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر کشتی میں سوار ام بیوپاری بے حد نادم ہوئے اور وہ تمام کے تمام اس اجنبی بندے سے معافی کے خواستگار ہوئے۔

یہ پُراسرار اور نیک انسان دراصل حضرت ذوالنون مصریؒ تھے جو اپنے دَور کے قطبوں اور ولیوں میں زہوتے تھے۔ آپ انسانیت کی معراج تھے مگر بدقسمتی سے اُس دَور کے اہلِ تصوف اور اہلِ معرفت نے تر کر طور پر یہ تہیہ کر رکھا تھا کہ وہ آپ کی عظمت و بلندی اور پارسائی کو تسلیم نہیں کریں گے۔ اس کی رشاید یہ تھی کہ حضرت ذوالنون نے کبھی بھی اپنی خوبیوں کو اُجاگر کرنے یا اپنی اچھائیوں کا ڈھنڈورا نے کی کوشش نہیں کی تھی۔ یہ عظیم صوفی بزرگ جب تک ۔۔۔ اس دُنیا میں رہے آپ کے اوصاف اور فائیاں زمانے کی نگاہوں سے پنہاں رہیں۔

آپ زندگی بھر ظاہری مال و دولت سے دُور رہے کیونکہ اُن کے خیال میں لوب اور لالچ انسان کو انسانیت ے بہت دُور لے جاتا ہے۔ ایک مرتبہ آپ کی خدمت میں ایک کم عمر لڑکا حاضر ہوا اور اُس نے عرض کی اُسے ورثے میں ایک لاکھ دینار ملے ہیں اور اُس کی یہ خواہش ہے کہ وہ یہ رقم آپ کی نذر کر دے۔

نوجوان کی بات سُن کر حضرت ذوالنون نے فرمایا کہ بن بلوغت تک پہنچنے سے قبل تمہارے لیے یہ رقم خرچ کرنا ناجائز ہے اور جب وہ لڑکا اپنے شباب پر پہنچا تو اُس نے ساری رقم غریبوں اور مسکینوں میں تقسیم کر دی اور خود آپ کے مریدوں کی صف میں آن کھڑا ہوا۔ پھر بھی نوجوان ایک روز آپ کی خدمت میں حاضر ہُوا اور جب اُسے یہ اندازہ ہُوا کہ آپ کو کچھ رقم کی ضرورت ہے تو اُس نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ کاش میرے پاس دولت اور مال وزر ہوتا تو میں اُسے آپ پر قربان کر دیتا۔ حضرت ذوالنون مصریؒ نے آپ کی نیت کو بھانپ کر یقین کر لیا کہ ابھی یہ نوجوان فقر کے مفہوم سے ناآشنا ہے چنانچہ آپ نے اِس سے فرمایا۔ کہ فلاں دوا خانہ سے فلاں دوا لاؤ۔ اُس دوا کو روغن میں ملا کر اُس کی تین گولیاں تیار کرو اور ان گولیوں میں سوئی کا سوراخ کر کے اُسے میرے پاس لے آؤ۔ چنانچہ آپ نے جب ان تین گولیوں پر کچھ پڑھ کر دم کیا تو وہ یاقوت میں تبدیل ہوگئیں۔ پھر آپ نے اُس نوجوان سے کہا کہ کسی جوہری کے پاس جا کر ان گولیوں کی قیمت معلوم کرو۔ سُنار نے اِن گولیوں کی قیمت ایک ہزار دینار لگائی۔ نوجوان نے واپس آکر جب پورا واقعہ آپ کو سنایا تو آپ نے نوجوان کو ہدایت کی کہ اِن گولیوں کو دوبارہ پانی میں گھول دو۔ اور اپنے ذہن میں اچھی طرح یہ بات بٹھا لو کہ فقیروں کو مال وزر کی قطعی آرزو نہیں ہوتی۔ حضرت ذوالنون کی یہ بات سُن کر وہ نوجوان اتنا متاثر ہوا کہ فوراً تارکِ دُنیا ہو گیا۔

آپ اپنے ارادت مندوں سے اکثر فرمایا کرتے تھے کہ صرف وہی ذات پاکیزہ ہے جو عارفین کو دنیاوی مسائل سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ حضرت ذوالنون مصری نے فرمایا کہ میں نے ایک پہاڑ پر بہت سے بیماروں کا اجتماع دیکھا اور جب وجہ دریافت کی تو انہوں نے بتایا کہ یہاں پر ہر عبادت کرنے والا سال میں ایک مرتبہ اپنی عبادت گاہ سے باہر نکل کر بیماروں کو کچھ دم کرتا ہے جس کے بعد سب لوگ صحت یاب ہوجاتے ہیں چنانچہ میں نے بھی کچھ مدت تک ان بزرگ کا انتظار کیا اور جب وہ برآمد ہوئے تو اُن کی آنکھوں کے گرد حلقے گہرے ہوگئے تھے اور وہ بہت نحیف سے دکھائی دیتے تھے۔ پھر آسمان کی جانب نگاہ اُٹھا کر تمام بیماروں پر کچھ دم کیا اور وہ سب صحت یاب ہوگئے اور جب وہ عبادت گاہ میں قدم رکھنے لگے تو میں نے اُن کا ہاتھ پکڑ کر عرض کیا کہ ظاہری امراض والوں کو تو شفا ہو گئی، لیکن میرا باطنی مرض بھی رفع فرما دیجیے۔

میری یہ بات سُن کر ان بزرگ نے فرمایا کہ اے ذوالنون میرا ہاتھ چھوڑ دے کیونکہ اللہ تعالیٰ نگرانی فرما رہے ہیں کہ تو نے اُس کا دستِ کرم چھوڑ کر دوسرے کا ہاتھ تھامنے کی خواہش کی ہے۔ یہ کہہ کر ان بزرگ نے اپنا ہاتھ چھڑایا اور اپنی عبادت گاہ میں داخل ہوگئے۔ تب مجھے احساس ہوا کہ مشکل اور مصیبت میں صرف اُسی ذات باری کی طرف دیکھنا چاہیے۔ جو کل کائنات کا پالنے والا ہے۔

قرآن سنت اور شریعت کے خلاف آپ کوئی بات گوارہ نہیں کرتے تھے شاید یہی سبب تھا کہ اہل معرفت ہمیشہ آپ کو زندیق کہہ کر آپ کی بزرگی اور عظمت سے منکر ہوتے رہتے تھے۔ جس زمانے میں آپ بلند مناصب پر فائز ہوئے تو بعض ناعاقبت اندیشوں نے مراتب کی ناواقفیت کی بنا پر آپ کو زندیق کا خطاب دے دیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ وقت خلیفہ سے آپ کی شکایت بھی کی۔ چنانچہ جس لمحے آپ کو بیڑیاں پہنا کر لیجایا جا رہا تھا تو ایک بوڑھی عورت نے آپ سے کہا " بیٹا خوفزدہ ہرگز نہ ہونا کیونکہ وہ بھی تمہاری طرح اللہ کا بندہ ہے۔" اُسی وقت راستے میں ایک بہشتی نے آپ کو ٹھنڈے پانی سے سیراب کیا اور اس کے صلہ میں جب آپ

نے اپنے ساتھی سے کہا کہ اس کو ایک دینار دے دو تو بہشتی نے عرض کیا کہ قیدیوں سے کچھ لینا بزدلی کی علامت ہے۔ اس کے بعد آپ کو دربارِ خلافت سے چالیس روز کی قید کا حکم سنایا گیا۔ اسی عرصے میں آپ کی بہن روزانہ ایک روٹی آپ کو جیل پہنچاتیں مگر رہائی کے بعد ہر یوم کے حساب سے چالیس روٹیاں آپ کے پاس محفوظ تھیں اور جب آپ کی بہن نے کہا کہ بھیا یہ روٹیاں تو جائز کمائی کی تھیں پھر آپ نے کیوں نہیں کھائیں۔

اس پر حضرت ذوالنون مصری نے فرمایا۔ چونکہ داروغہ جیل بدباطن قسم کا انسان تھا اس لیے جو روٹی اُس کے ہاتھ بھجوائی جاتی تھی مجھے اس سے کراہت محسوس ہوتی تھی۔

اس کے بعد جب آپ جیل سے روانہ ہونے لگے تو آپ گر پڑے اور سر پر شدید ضرب آئی مگر اس کے باوجود خون کی ایک بوند بھی آپ کے لباس پر نہ پڑی حد تو یہ ہے کہ جو خون زمین پر گرا تھا وہ بھی غائب ہو گیا۔ پھر جب آپ کو خلیفہ کے روبرو پیش کیا گیا تو آپ نے اُس کے سوالات کا مُنہ توڑ جواب دے کر دربار میں موجود تمام لوگوں کو حیران کر دیا چنانچہ آپ کی سچائی اور بے باکی سے متاثر ہو کر خلیفہ نے آپ کے دستِ مبارک پر بیعت کر لی اور انتہائی عقیدت اور احترام کے ساتھ آپ کو سفرِ مصر کے لیے رخصت کیا۔

حضرت ذوالنون مصری کی تمام عمر اپنے نفس کے خلاف جنگ کرتے ہوئے گزر گئی۔ آپ کا کہنا تھا کہ نفس سے صُلح کرنے والا شخص خدا کا دوست نہیں ہو سکتا۔ عام انسانوں کی طرح آپ کو بھی لذیذ کھانوں کی خواہش تھی، لیکن کبھی اپنی خواہش پوری نہ کی۔ ایک مرتبہ —— عید کی شب جب میرے نفس نے تقاضا کیا کہ آج تو کوئی لذیذ غذا ضرور ملنی چاہیئے۔ تو فرمایا کہ اگر تُو دو رکعت میں قرآن مکمل کرلے تو میں تیری خواہش پوری کردوں گا۔ نفس نے آپ کی یہ شرط منظور کر لی اور ختم قرآن کے بعد جب آپ لذیذ غذائیں لے کر آئے تو پہلا ہی لقمہ اُٹھا کر ہاتھ کھینچ لیا اور نماز کے لیے کھڑے ہو گئے۔ اور جب لوگوں نے آپ سے اس کی وجہ پوچھی تو فرمایا کہ پہلے ہی لقمے پر نفس نے خوش ہو کر کہا کہ آج دس برس کے بعد تیری خواہش پوری ہو رہی ہے چنانچہ میں نے ہاتھ سے لقمہ چھوڑ کر کہا کہ میں تیری یہ خواہش کبھی پوری نہ ہونے دوں گا، لیکن اسی وقت ایک شخص عمدہ کھانے کی دیگ لے کر حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں بہت مفلس اور بال بچوں والا ہوں مگر آج صبح عید کی وجہ سے میں نے لذیذ کھانا پکوایا اور سو گیا چنانچہ خواب میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ اگر تُو محشر میں مجھ سے ملنے کا آرزومند ہے تو یہ کھانا ذوالنون کو دے آ اور میرا یہ پیغام پہنچا دے کہ وقتی طور پر اپنے نفس سے صُلح کر کے اس کھانے کے دو ایک لقمے چکھ لے۔ حضورؐ کا یہ پیغام سُن کر میں نے دس سال کے دوران پہلی مرتبہ تھوڑا سا اچھا اور لذیذ کھانا چکھ لیا۔

✖

حضرت ذوالنون مصری کے تائب ہونے کا واقعہ بہت مشہور ہے۔ کہتے ہیں کہ کسی شخص نے آپ کو اطلاع پہنچائی کہ کسی مقام پر ایک نوجوان عبادت گزار رہتا ہے اور جب آپ اُس سے شرفِ ملاقات حاصل کرنے کے لیے پہنچے تو دیکھا کہ وہ نوجوان ایک درخت سے اُلٹا لٹکا ہوا ہے اور اپنے نفس سے مسلسل کہہ رہا ہے کہ جب تک تُو عبادت الٰہی میں میری ہمنوائی نہیں کرے گا۔ میں تجھے اذیت دیتا رہوں گا حتیٰ کہ تیری موت واقع ہو جائے۔ سارا منظر دیکھ کر آپ کو اُس نوجوان پر اس قدر ترس آیا کہ آبدیدہ ہو گئے اور جب نوجوان عابد نے پوچھا کہ یہ کون ہے جو ایک بے حیا خطاکار پر ترس کھا کر رو رہا ہے تو یہ سُنتے ہی آپ نے اُس کے سامنے

جا کر سلام کیا۔ تفصیلات جاننے پر نوجوان عبادت گزار نے بتایا چونکہ یہ بدن عبادت الٰہی میں آمادہ نہیں ہے اس لیے مَیں اسے سزا دے رہا ہوں۔ آپ نے نوجوان سے کہا "مجھے تو یہ اندیشہ ہوا کہ شاید تم نے کسی کو قتل کر دیا ہے یا تم سے کوئی اور گناہ عظیم سرزد ہو گیا ہے"۔

اس پر نوجوان نے جواب دیا کہ تمام گناہ مخلوق سے اختلاط کی وجہ سے جنم لیتے ہیں اس لیے مَیں مخلوق سے رسم و راہ کو گناہ عظیم تصور کرتا ہوں۔

آپ نے نوجوان عابد سے فرمایا کہ تم واقعی بہت بڑے زاہد و عابد ہو۔

نوجوان نے جواب دیا۔ کہ اگر تم کسی بڑے زاہد کو دیکھنا چاہتے ہو تو سامنے والے پہاڑ پر جا کر دیکھو چنانچہ جب آپ وہاں پہنچے تو وہاں ایک نوجوان کو دیکھا جس کا ایک پاؤں کٹا ہوا باہر پڑا تھا اور اس کا جسم کیڑوں کی خوراک بن چکا تھا۔ آپ کے دریافت کرنے پر اس ابتر حالت میں پڑے ہوئے نوجوان نے بتایا کہ ایک دن مَیں اسی جگہ عبادت میں مصروف تھا کہ ایک خوبصورت عورت میرے سامنے سے گزری جس کو دیکھ کر مَیں شیطانی خیالات میں مبتلا ہو کر اس کے نزدیک پہنچ گیا۔ عین اسی وقت ندا آئی کہ اے بے غیرت تیس سال خدا کی عبادت و اطاعت میں گزار کر آج شیطان کی عبادت کرنے چلا ہے لہٰذا مَیں نے اسی وقت اپنا پہلا پاؤں کاٹ دیا کیونکہ گناہ کی جانب پہلا قدم اسی نے اٹھایا تھا۔ اب آپ ہی بتائیں کہ مجھ ایسے گناہگار کے پاس آپ کس لیے آئے ہیں اور اگر واقعی آپ کو کسی بڑے زاہد کی جستجو ہے تو اس پہاڑ کی چوٹی پر چلے جائیے، لیکن جب بلندی کی وجہ سے آپ کے لیے وہاں پہنچنا ناممکن ہو گیا تو اس نوجوان نے خود ہی اس بزرگ کا قصہ شروع کر دیا۔ اس نے بتایا کہ پہاڑ کی چوٹی پر جو بزرگ ہیں —— ان سے ایک دن کسی نے کہہ دیا کہ روزی محنت سے حاصل ہوتی ہے۔ پس اسی دن سے انہوں نے یہ عہد کر لیا کہ جس روزی میں مخلوق کا ہاتھ ہوگا وہ مَیں استعمال نہیں کروں گا۔ اور جب بغیر کچھ کھائے پیئے چند روز گزر گئے تو اللہ تعالیٰ نے شہد کی مکھیوں کو حکم صادر فرمایا کہ ان کے گرد جمع ہو کر انہیں شہد مہیا کرتی رہیں چنانچہ ہمیشہ وہ شہد ہی استعمال کرتے ہیں۔ نوجوان کی زبانی بزرگ کے بارے میں یہ داستان سن کر حضرت ذوالنون نے درس عبرت حاصل کیا اور اسی وقت سے عبادت و ریاضت میں مصروف ہو گئے۔ آپ جس وقت پہاڑ سے نیچے اتر رہے تھے تو آپ نے دیکھا ایک اندھا پرندہ درخت سے نیچے آ کر بیٹھ گیا ہے۔ اس وقت آپ کو خیال آیا کہ نجانے اس پرندے کو کہاں سے رزق میسر آتا ہوگا۔ پھر اگلے ہی لمحے آپ نے دیکھا کہ اس پرندے نے اپنی چونچ سے زمین کریدی جس میں سے ایک سونے کی پیالی برآمد ہوئی۔ اس پیالی میں تل بھرے ہوئے تھے اور دوسری چاندی کی پیالی گلاب کے عرق سے لبریز تھی۔ چنانچہ وہ پرندہ تل کھا کر اور گلاب کا عرق پی کر درخت پر جا بیٹھا اور پیالیاں غائب ہو گئیں۔

یہ پُر اثر منظر دیکھ کر حضرت ذوالنون مصری نے بھی توکل پر کمر باندھ لی اور یہ یقین کر لیا کہ متوکل علی اللہ کو کبھی تکلیف نہیں ہوتی۔ اس کے بعد آپ نے جنگل کی راہ لی جہاں آپ کے کچھ پرانے دوست مل گئے اور اتفاق سے وہاں ایک خزانہ برآمد ہو گیا جس میں ایک ایسا تختہ تھا جس پر اللہ تعالیٰ کے اسمائے مبارک کندہ تھے جس وقت اس خزانے کو تقسیم کیا جانے لگا تو آپ نے اپنے لیے صرف لکڑی کا وہ تختہ لے لیا۔ پھر ایک رات آپ نے خواب دیکھا۔ کوئی آپ سے کہہ رہا تھا "اے ذوالنون سب نے دولت کو آپس میں تقسیم کر لیا مگر تو نے ہمارے نام کو پسند کر لیا جس کے عوض ہم نے تیرے اوپر علم و حکمت کے دروازے کھول دیئے۔ اس

اپنے بچاؤ کے لئے مظلوموں کی مدد کیجئے

"آخر تم کیوں اللہ (عزوجل) کی راہ میں ان بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر نہیں لڑتے جو کمزور پاکر دبالئے گئے ہیں اور فریاد کررہے ہیں کہ خدایا ہمیں اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی حامی و مددگار پیدا کردے۔" (القرآن 4 : 75)

روسیوں کے مکمل سقوط کے بعد دو طاقتی نظام اب ایک طاقتی نظام میں سمٹ کر رہ گیا ہے جس کی بناء پر امریکہ اور اس کے مغربی اتحادیوں کے لئے اپنے نام نہاد نیو ورلڈ آرڈر پر عمل کرنے میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اس نئے عالمی نظام کا حقیقی مقصد مسلمانوں کو کچلنا اور انہیں اقتدار میں آنے سے روکنا ہے خواہ یہ مقصد انتخابات کے ذریعہ حاصل کیا جائے یا اس کے لئے استبدادی طاقت استعمال کی جائے اور جہاں جہاں ان کا بس چلتا ہے وہاں وہاں مسلمانوں کو خانہ جنگی کی طرف دھکیل رہے ہیں اور مختلف سازشوں کے ذریعہ ان کو غیر مستحکم کررہے ہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ جب مسلمان اپنے خون میں کمیونسٹ سلطنت کو غرق کررہے تھے اس وقت انہیں ریگن جیسا شخص بھی مجاہد قرار دے رہا تھا لیکن جب مغرب نے محسوس کیا کہ ان کے مقاصد حاصل ہوچکے ہیں تو اب مسلمانوں کو جنگجو، بنیاد پرست اور دہشت گرد کہا جارہا ہے، یہ پروپیگنڈہ عالمی سطح پر مسلمانوں کے قتل عام کے جواز کے طور پر کیا جارہا ہے، جس کا مظاہرہ بوسنیا ہرزگوینا، کشمیر، فلسطین، برما، صومالیہ، وسط ایشیاء، عراق، لبنان، لائبیریا، اریٹیریا اور فلپائن میں بڑی بیدردی سے کیا جارہا ہے۔ اسی طرح افغانیوں کو ان کے جہاد کے ثمرات کو حاصل کرنے اور مستحکم حکومت قائم کرنے سے روکنے کے لئے وہاں بے پناہ سازشیں کی جارہی ہیں تاکہ اس جنگ زدہ ملک میں امن و امان قائم نہ ہوسکے۔

دشمن میوزیکل چیئرز جیسی ایک محتاط حکمت عملی پر عمل کررہا ہے اور ایک کے بعد دوسری مسلم ریاست کو ٹھکانے لگارہا ہے، جبکہ ہماری غفلت کا جو عالم ہے اس سے یہ محسوس ہوتا ہے جیسے ہم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ موت اور تباہی دوسروں کا مقدر ہے اور ہم محفوظ ہیں حالانکہ یہ ایسی ہی تباہی اور موت سے دوچار ہونے سے پہلے ملنے والی مہلت ہے۔

ان حالات میں مسلمانوں پر فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنے باہمی اختلافات کو بُھلا کر ان مظلوم بھائیوں کی مدد کریں جو مدد کے لئے پکار رہے ہیں، ان مسلمانوں کو ایسے قتل عام کا نشانہ بنایا جارہا ہے، جس کی کوئی مثال نہیں ملتی، ان کا جرم صرف یہ ہے کہ ان کے آباؤاجداد نے اسلام قبول کرلیا تھا اور وہ خود کو مسلمان کہلوانے پر اصرار کرتے ہیں۔

قرآن مسلمانوں کو صاف صاف بتاتا ہے کہ : "حق کا انکار کرنے والے ایک دوسرے کے مددگار ہیں۔ اگر تم (مسلمان) بھی ایک دوسرے کے مددگار نہ بنے تو زمین میں فتنہ اور بڑا فساد برپا ہوگا" (القرآن 8 : 73)

اس لئے ہم آپ سے اپیل کرتے ہیں کہ اپنے آپ کو بچانے کے لئے اپنے مظلوم بھائیوں کی مدد کیجئے

مخیر حضرات سے اپیل ہے کہ اپنی امدادی رقوم جمع کروانے کے لئے ہمارے
درج ذیل مراکز سے رجوع کریں

ہیڈ آفس ، پشاور
یو پی او بکس نمبر 914 ، پشاور
فون : 43203 ، 44601
فیکس نمبر : 840371

برانچ آفس ، کراچی
پی او بکس نمبر 12670 کراچی
فون : 4532009

برانچ آفس ، اسلام آباد
پی او بکس نمبر 2497 اسلام آباد
فون : 256926

کے بعد آپ واپس اپنے شہر آ گئے۔

حضرت ذوالنون مصری اکثر اپنے ارادت مندوں کو تلقین فرماتے کہ ہمیشہ اپنے دل میں خوفِ خدا رکھو کیونکہ جن کے دل میں خوفِ خدا نہیں ہوتا وہ گمراہ ہو جاتے ہیں اور درویشی سے ڈرنے والے قہرِ الٰہی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ انسان پر چھ چیزوں کی وجہ سے تباہی آتی ہے اوّل اعمالِ صالحہ سے کوتاہی کرنا۔ دوم ابلیس کا فرمانبردار ہونا۔ سوئم موت کو قریب نہ سمجھنا۔ چہارم رضائے الٰہی کو چھوڑ کر مخلوق کی رضامندی حاصل کرنا۔ پنجم تقاضائے نفس پرستی کو ترک کر دینا اور ششم اکابرین کی غلطی کو سند بنا کر ان کے فضائل پر نظر نہ کرنا۔ آپ نے مزید فرمایا کہ اہلِ تقویٰ کی صحبت سے لطفِ حیات حاصل ہوتا ہے۔

آپ کے ایک عقیدت مند نے جس نے چالیس چلّے کھینچے، چالیس حج کیے اور چالیس برس تک جاگتا رہا۔ عرض یہ کہ اتنی عبادت و ریاضت کے باوجود آج تک اللہ تعالیٰ مجھ سے ہمکلام نہیں ہوا اور نہ کبھی رموزِ خداوندی مجھ پر منکشف ہو سکے، لیکن نعوذ باللہ یہ اللہ تعالیٰ سے شکوہ نہیں بلکہ اپنی بدنصیبی کا اظہار کیا ہے۔
آپ نے اپنے اس ارادت مند سے فرمایا کہ خوب پیٹ بھر کر کھانا کھاؤ اور عشاء کی نماز پڑھے بغیر آرام سے سو جاؤ۔ مُریدنے آپ کے حکم کی تعمیل میں پیٹ بھر کر کھانا تو کھا لیا مگر دل میں نماز کو ترک کرنا گوارا نہ کیا۔ اس لیے نماز پڑھنے کے بعد سو گیا اور خواب میں حضورِ اکرمؐ کی زیارت ہوئی۔
آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے ناامید لوٹنے والا نامراد ہوتا ہے۔ تم یقین کرو کہ اللہ تعالیٰ تیری چالیس سالہ ریاضت کا صلہ ضرور دے گا، لیکن ذوالنون کو ہمارا یہ پیغام پہنچا دینا کہ تمہیں شہر بھر میں اس لیے ذلیل کریں گے کہ تو پھر کبھی ہمارے دوستوں کو فریب میں مبتلا نہ کر سکے۔ اس مُرید نے جب اپنا خواب حضرت ذوالنون مصری کو سنایا تو اُن کی آنکھوں میں مسرت کے آنسو چھلک پڑے، لیکن اگر کوئی معترض یہ کہے کہ کیا کوئی مُرشد کسی کو نماز نہ پڑھنے کا حکم دے سکتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ مُرشد کی حیثیت طبیب کے برابر ہوتی ہے اور کبھی کبھار طبیب کو زہر سے بھی مریض کا علاج کرنا پڑتا ہے اور چونکہ آپ کو بخوبی یہ علم تھا کہ میرے کہنے سے مرید ہرگز نماز ترک نہیں کر سکتا۔ اس لیے آپ نے ایسا حکم دیا اور اس کے علاوہ طریقت کی راہوں میں ایسے احوال بھی آ جاتے ہیں جو بظاہر شریعت کے منافی ہوتے ہیں، لیکن وہ درحقیقت اپنی جگہ بالکل درست ہوتے ہیں۔ جس طرح حضرت خضرؑ ــــ کو لڑکے کے قتل کا حکم دیا گیا، لیکن منشائے خداوندی یہی تھا گویا یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ خلافِ شرع کوئی کام نہ کیا جائے، لیکن راہِ طریقت میں ایسے احوال بھی پیش آتے ہیں جس سے کسی طور بھی انکار ممکن نہیں۔
ایک مرتبہ حضرت ذوالنون مصری نے ایک کمزور بدّو کو کعبہ کا طواف کرتے ہوئے دیکھ کر فرمایا "کیا تو خدا کا محبوب ہے؟" بدو نے اثبات میں جواب دیا۔ آپ نے پھر پوچھا کہ وہ محبوب تجھ سے قریب ہے یا دُور۔ اُس نے جواب دیا کہ بہت قریب ہے۔ حضرت ذوالنون نے پھر پوچھا کہ کیا وہ تجھ سے موافقت کرتا ہے یا ناموافقت۔
اُس نے عرض کیا "موافقت کرتا ہے"۔
یہ سُن کر حضرت مصری نے فرمایا کہ جب تُو خدا کا محبوب بھی ہے اور وہ تیرے قریب و موافق بھی ہے تو پھر تُو اس قدر لاغر و نحیف کیوں ہو۔

اُس نے جواب دیا کہ دُور رہنے والوں کے عذاب کی نسبت سے وہ لوگ زیادہ حیران و سرگرداں رہتے ہیں جنہیں قربِ الٰہی بہت زیادہ نصیب ہوتا ہے۔

اخلاص کے بارے میں حضرت ذوالنون مصری اکثر فرمایا کرتے تھے کہ جب تک صدق صبر کی شمولیت نہ ہو اُس وقت تک اخلاص مکمل نہیں ہوتا اور خود کو ابلیس سے محفوظ رکھنے کا نام بھی اخلاص ہے اور اہلِ اخلاص وہ ہوتے ہیں جو اپنی تعریف سے خوش اور برائی سے ناخوش ہوں اور اپنے اعمالِ صالحہ کو اس طرح فراموش کر دیں کہ روزِ محشر اللہ تعالیٰ سے اس کا معاوضہ بھی طلب نہ کریں لیکن سب سے مشکل کام یہ ہے کہ خلوت میں اخلاص کو قائم رکھا جائے۔

یہ بھی آپ ہی کا ارشاد ہے کہ خدا سے خائف رہنے والے کے دل میں خدا کی محبت اس طرح جگہ بنا لیتی ہے کہ اس کو عقلِ کامل عطا کر دی جاتی ہے اور جو مشکلات پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہتا ہے وہ شدید مشکلات میں گھرتا چلا جاتا ہے اور جو بے سود چیزوں سے حصول کی سعی کرتا ہے وہ اس شے کو کھو دیتا ہے جس سے اس کو فائدہ پہنچنے کا امکان ہوتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اگر تمہیں حق بات پر تھوڑا سا بھی رنج ہوتا ہے تو یہ اس چیز کی علامت ہے کہ تمہارے نزدیک حق کا درجہ بہت کم ہے۔ حضرت مصری نے مزید فرمایا کہ جس کا ظاہر باطن کا آئینہ دار نہ ہو اُس کی صحبت سے کنارہ کشی اختیار کر لینی چاہیئے۔

ایک مرتبہ کسی نے آپ سے عرض کی کہ مجھے کوئی نصیحت فرمائیں تو آپ نے فرمایا کہ اپنے ظاہر کو خلق کے اور باطن کے حوالے کر دو اور خدا سے ایسا تعلق قائم کرو کہ جس کی وجہ سے وہ تمہیں مخلوق سے بے نیاز کر دے اور یقین پر کبھی شک کو ترجیح نہ دو اور جس وقت تک نفس اطاعت پر آمادہ نہ ہو بدستور اس کی مخالفت کرتے رہو اور مصائب میں صبر کرتے ہوئے زندگی کو یادِ الٰہی میں گزار دو۔

ایک روز آپ ایک ایسے شخص کی عیادت کو چلے گئے جس نے خود کو خدا کا دوست مشہور کر رکھا تھا۔ اُس شخص نے آپ کو سامنے پا کر کہا کہ جو کوئی خدا کے عطا کردہ دُکھ درد اور تکلیف میں اذیت کا احساس کرتا ہے وہ کبھی خدائی دوستی کا دعویٰ دار نہیں ہو سکتا۔ اس کے جواب میں حضرت ذوالنون مصری نے فرمایا یہ بالکل غلط ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جو خود کو خدا کا دوست کہتا ہے وہ کسی صورت بھی خدا کا دوست نہیں ہو سکتا۔ حضرت کی یہ بات سن کر اُس شخص نے سچی توبہ کرتے ہوئے کہا کہ آئندہ وہ کبھی بھی خدا سے دوستی کا دعویٰ نہیں کرے گا۔ اپنے ارادت مندوں اور دوست احباب میں سے کسی کے نام تحریر کیا کہ اللہ تعالیٰ ہم دونوں کو نادانی کی چادر سے ڈھانپ کر تمام دنیاوی چیزوں سے اس طرح بے خبر کر دے کہ ہم اس کی رضا کے مطابق کام کریں تاکہ وہ ہم سے خوش رہ سکے۔ حضرت ذوالنون مصری فرماتے ہیں کہ سفر کے دوران میرا ایک برف پوش صحرا سے گزر ہوا تو میں نے دیکھا کہ ایک آتش پرست ہر طرف اناج بکھیرنے میں مصروف ہے۔ آپ کے دریافت کرنے پر اُس آتش پرست نے بتایا کہ ایسی حالت میں پرندوں کو چونکہ کہیں سے دانہ دُنکا میسر نہیں آتا اس لیے میں ثواب کی نیت سے دانہ بکھیر رہا ہوں۔ اس پر میں نے اُسے کہا کہ اللہ کے ہاں غیر کی روزی ناپسندیدہ ہے لیکن اُس نے عرض کیا کہ میرے لیے بس اتنا ہی کافی ہے کہ وہ میری نیت کو دیکھ رہا ہے۔ اس کے بعد میں نے اس آتش پرست کو ایامِ حج کے دوران بڑی دیوانگی کے عالم میں

بیت اللہ کا طواف کرتے دیکھا اور طواف کے بعد اُس نے مجھ سے کہا "آپ نے دیکھا کہ مَیں نے پرندوں کے لیے جو دانہ دُنکا بکھیرا تھا اُس کا پھل مجھے کتنی بہتر شکل میں مِلا ہے"۔

حضرت ذوالنون مصری فرماتے ہیں کہ یہ سُنتے ہی مَیں نے پُرجوش لہجے میں اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ تُو نے چالیس برس تک آگ پوجنے والے کو تو اناج کے چند دانوں کے عوض ارزاں فروشی کرتے ہوئے اتنی بڑی نعمت سے کیوں سرفراز فرمایا۔ اس پر غیب سے آواز آئی کہ ہم اپنی مرضی کے مختار ہیں اور ہمارے معاملات میں کسی کو مداخلت کی اجازت نہیں۔

آپ کے ایک ارادت مند نے آپ سے دریافت فرمایا کہ حضرت جی آپ کے نزدیک لفظ صوفی کی تعریف کیا ہے؟

حضرت ذوالنّون مصری نے فرمایا کہ جو ترکِ دنیا کرکے خدا کو محبوب بنالے اور خدا بھی اس کو اپنا محبوب سمجھے۔ پھر کسی نے کہا کہ مجھ کو خدا کا راستہ دکھا دیجئے۔ آپ نے اُس شخص سے کہا کہ اللہ تعالیٰ تیری رسائی سے بہت دور ہے لیکن اگر کسی کو واقعی قربِ مطلوب ہو تو وہ پہلے ہی قدم پر مل جاتا ہے۔

حضرت ذوالنون مصری نے جب انتقال فرمایا تو ایک روایت کے مطابق اُس وقت آپکی پیشانی پر "ھٰذا حبیب اللہ" لکھا تھا۔ یعنی یہ اللہ کا حبیب ہے۔ جب آپ کو قبرستان لیجایا جا رہا تھا تو اُس وقت کڑی دھوپ تھی اتنے میں کرنا خدا کا کیا ہوا کہ کہیں سے پرندوں کا ایک بہت بڑا غول آیا اور انہوں نے اپنے پروں سے آپ کی میّت پر سایہ کر دیا۔ آپ صحیح معنوں میں زاہد و عارف تھے جو عُمر بھر خدا کی قربت کے لیے سرگرداں رہے۔ اور بالآخر ایک روز بزرگی کی معراج کو پہنچ گئے۔

ایک مرتبہ امیر عمرو بن لیث سخت بیمار ہو گیا۔ تمام حاذق اطبا نے اس کے علاج پر پُورا زور صرف کیا لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا۔

امرا و وزرا نے اس کی روز بروز بگڑتی ہوئی حالت کو دیکھ کر مشورہ کیا اور امیر سے عرض کی کہ دوائیں تو اب کارگر ہوتی نظر نہیں آتیں آپ اجازت دیں تو کسی درویش سے آپ کے لیے دُعا کرائی جائے۔ امیر نے اجازت دے دی۔

اسی زمانے میں حضرت سہل بن تستریؒ کے مستجاب الدعوات ہونے کی شہرت تھی۔ چند سرکردہ امرا آپکی خدمت میں حاضر ہوئے اور منت کر کے امیر عمرو بن لیث کے پاس لے آئے۔ حضرت سہلؒ امیر کے پاس بیٹھ گئے اور فرمایا "دُعا اسی کے حق میں قبول ہوتی ہے جو توبہ کر کے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اس وقت تیرے قید خانے میں بہت سے بیگناہ قیدی ہیں۔ اگر تو چاہتا ہے کہ میری دعا تیرے حق میں قبول ہو تو پہلے انھیں رہا کر اور پھر خلوصِ نیّت سے بارگاہِ الٰہی میں توبہ کر۔" امیر نے اسی وقت تمام قیدیوں کو رہا کرنے کا حکم دیا اور صدقِ دل سے توبہ کی۔ حضرت سہلؒ نے اب دُعا کیلئے ہاتھ اُٹھائے اور کہا: "الٰہی...... جس طرح تُو نے اسے گناہوں کی ذلّت دکھائی اسی طرح اسے اپنی طاقت کی عزت دکھا اور اس کے ظاہر کو صحت و عافیت کا لبادہ پہنا۔ جوں جوں آپ دعا مانگتے جاتے تھے امیر محسوس کرتا تھا کہ بیماری اسکو چھوڑتی جا رہی ہے۔ جوں ہی آپنے دُعا ختم کی امیر بالکل صحت یاب ہو کر بیٹھ گیا۔ اس نے حضرت کے قدموں پر بے شمار زر و جواہر ڈھیر کر دیے لیکن آپنے ان کو ٹھوکر مار کر فرمایا: "مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے۔"

جب آپ اپنے گھر جا رہے تھے تو راستے میں ایک مرید نے عرض کیا کہ اس میں سے آپ تھوڑا سا مال قبول کر لیتے تو قرض ادا ہو جاتا۔ آپنے فرمایا: "اچھا۔ تجھے زر و مال چاہیئے، ذرا سامنے دیکھ۔" اس نے نظر اٹھا کر دیکھا تو سامنے کے میدان میں زر و جواہر کے ڈھیر لگے دکھائی دینے لگے۔ مُرید ششدر رہ گیا۔ آپنے فرمایا "جسے اللہ تعالیٰ نے سب کچھ دے رکھا ہو وہ بھلا مخلوق سے کیوں کوئی چیز لے گا۔" حکایاتِ صوفیہ

سب عورتوں نے اپنی سہیلی سے کہا" محمد بن علی تیرے قابو میں نہیں آئیں گے وہ بڑے مغرور ہیں۔"
مگر اُس عورت نے بھی ہمت نہ ہاری، آج بھی حسب معمول اُس نے جاتے ہوئے محمد بن علی کو پکارا مگر آپ بھی ہمیشہ کی طرح بغیر کوئی جواب دیئے گزر گئے۔ وہ عورت بلا کی حسین تھی اور محمد بن علی پر دل و جان سے فدا ہو چکی تھی۔ اس نے دل میں عہد کر رکھا تھا کہ وہ ایک نہ ایک دن اس برف پوش کو برف زار سے ضرور باہر نکالے گی اور اپنی محبت کے پودے کو ضرور لہلائے گی۔ اُس کو اپنے قیامت خیز حسن پر بڑا ناز تھا اور وہ چاہتی تھی ابن علی صرف ایک مرتبہ اُس کی طرف دیکھ لیں پھر وہ کبھی اُس سے دُور نہ رہیں گے۔ پھر وہ آپ سے تمام بدلے لے گی، ستائے گی، جلائے گی اور اُن کو خوب تنگ کرے گی مگر ہنوز وہ اپنی کوششوں میں ناکام رہی تھی۔ اُس کی سہیلیاں اُس کو طنز کرتیں تھیں کہ تم خوش فہمی میں مبتلا ہو۔ ابن علی ایک ناقابلِ تسخیر قلعہ ہے جس کو سر کرنا تمہارے بس میں نہیں۔ تمہارے مقدر میں اس طرف سے ناکامی ہی ناکامی ہے۔
مگر اُس عورت کو اپنے معصوم حسن پر بڑا ناز تھا۔ وہ کہتی' ابھی میں نے اپنے ترکش کا آخری تیر محفوظ رکھا ہوا ہے۔ جس دن میں نے اُس کو چھوڑا' پھر میرا نشانہ خطا نہیں جائے گا۔ وہ تیر دنیا کا زہریلا اور خطرناک تیر ہوگا۔
اُس کی سہیلیوں نے کہا' ہمیں بھی اُس تیر کے متعلق بتاؤ مگر اُس نے بتلانے سے انکار کر دیا لیکن اتنا ضرور کہا کہ جس دن ابن علی پر اپنا آخری تیر پھینکوں گی تمہیں بھی مطلع کر دوں گی تاکہ تمہارے سارے طنز و تمسخر ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں۔
اُس روز کی ناکامی کے بعد اُس حسین بلا آہو چشم قتالہ نے ابن علی کے معمولات کے متعلق پتہ چلانا شروع کیا۔ آپ کے گھر میں قیام اور گھر سے باہر آپ کی نشست و برخاست اور دیگر معلومات اکٹھی کرنا شروع کیں۔ اس کو اُن معلومات میں ایک کام کی بات ہاتھ آ گئی کہ ابن علی روزانہ ایک ویران باغ میں جاتے ہیں جو کہ ترمذ میں ہے وہاں عموماً دوسرے لوگوں کی بہت کم آمد ہوتی ہے اور اُس باغ میں زیادہ تر ویرانی ہی ویرانی ہوتی ہے۔ ابن علی

اس باغ میں گھنٹوں ٹھہرے رہتے اور غور و فکر میں اپنا وقت بسر کرتے تھے۔
اب وہ عورت اس تاک میں رہتی کہ کس روز اپنی کارروائی شروع کرے۔ ایک روز اس عورت نے خوبصورت لباس زیب تن کیا اور آرائش کی تمام نزاکتیں پوری کرنے کے بعد وہ اپنی حاسد سہیلیوں کے پاس گئی اور کہا۔
"ذرا دیکھو میں کیسی لگ رہی ہوں؟"
سہیلیوں نے کہا۔ "تمہارا حسن اس قدر جاذب نظر ہے کہ مرد تو مرد ہم عورتیں بھی تم پر فدا ہونے کو تیار ہیں۔"
اُن سہیلیوں نے پوچھا "تو آخر اتنی بن سنور کر جا کہاں رہی ہے؟"
"ابن علی کے پاس، اپنا آخری تیر آزمانے۔ جس تیر میں ترغیبات و تحریصات، آنسو اور ناز و نخرے شامل ہوں گے اور میں یہ تیر خلوت کی کمین گاہ میں چھوڑونگی۔ پھر دیکھوں گی میرا محبوب کہاں بچ کر جاتا ہے۔"
دوسری عورتیں آج حیران تھیں۔ انھیں یقین ہو رہا تھا کہ آج یہ باوری چکوری ضرور کامیاب ہوگی۔ آج وہی عورتیں جو طنز و تمسخر کے کنکر اُس پر برساتی تھیں اُس کی کامیابی کے خیال سے غمزدہ ہو رہی تھیں اور دل ہی دل میں اُس کی ناکامی کے لیے دُعائیں مانگ رہی تھیں مگر ظاہری طور پر اُس کے حسن و جمال کی تعریف اور اُس کی کامیابی کے لیے دُعا گو تھیں۔
آج ترمذ کے ویران باغ میں ابن علی سے پہلے ہی وہ سراپا حسن و نزاکت پہنچ چکی تھی۔ باغ میں ماہِ کامل اُتر آیا تھا۔ وہ ایک کونے میں چُھپ کر بیٹھ گئی۔ اتنے میں ابن علی بھی حسبِ معمول باغ میں آئے اور ایک سرو کے درخت کے نیچے بیٹھ کر عبادت و ریاضت میں مشغول ہو گئے۔ اُن کے دل میں اسرار و معارف کے خزانے جمع ہو رہے تھے۔ آپ نے سرو کے درخت کا انتخاب اپنی جائے غور و فکر کے لیے اس لیے کیا ہوا تھا کیونکہ اُس کے اردگرد جھاڑیوں کے کنج ہی کنج تھے اور آپ وہاں بیٹھ کر بالکل چھپ جاتے تھے۔ اوّل تو باغ میں کوئی آتا ہی نہیں تھا اور اگر آتا تو اُن جھاڑیوں میں سے کم از کم آپ کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اُس عورت نے ابن علی کو جھاڑیوں کے اندر بیٹھے دیکھا تو وہ اور زیادہ خوش ہوئی اور اُس نے دل میں سوچا اس سے بہتر اور کوئی موقع نہیں ہوگا۔ آج میں اپنے تیروں کی بوچھاڑ ابن علی پر کر سکتی ہوں اور وہ اپنا حسین حملہ کرنے کے لیے اُٹھی۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتی چلی گئی اور جب ابن علی کے بالکل قریب پہنچی تو اُس نے اپنے دل کو غم زدہ کیا، چہرے کو غمناک کیا اور سسکیوں کے ساتھ رونا شروع کر دیا۔ سسکیوں کی آواز سُن کر ابن علی نے اپنے اردگرد دیکھنا شروع کر دیا۔ جب آپ نے اُس کی طرف دیکھا تو وہ روتی ہوئی آپ کے پاس پہنچ گئی اور کہنے لگی "اے نوجوان میں مظلوم ہجور صورت ہوں تم خدا را میری مدد کرو" آپ نے عورت کو غور سے دیکھا تو اُس کے حسن میں کھو کر رہ گئے۔ اس کا حسن ہوشربا اور آرائش و زیبائش غارت گر تھی۔ اُس عورت نے ابن علی کو بے خود دیکھا تو اور بھی اُن کے قریب ہوگئی۔ اور بولی "نوجوان مجھے بچالے۔"
ابن علی پیچھے ہٹ گئے اور اُس سے پوچھا "اے عورت اپنے حواس ٹھکانے پر لے آ اور مجھے بتا تمہیں کیا پریشانی ہے؟"
اُس نے کہا "میں خوف زدہ ہوں آپ مجھے اپنے قریب بٹھالیں میرا ڈر اُترے گا تب میں آپ کو کچھ بتا سکوں گی۔"
ابن علی نے کہا۔ "میری موجودگی میں تمہارا کوئی کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ تم کھل کر اپنی تکلیف مجھے بتاؤ۔"
وہ عورت روتی ہوئی بولی: میرا شوہر آج سے تین برس پہلے ایک عورت کے ساتھ اصفہان چلا گیا اور مجھے

یہاں پر تنہا چھوڑ گیا۔ آج مجھے کسی شخص نے خبر دی کہ تمہارا شوہر اس باغ میں آئے گا لہٰذا تو اُس کی خاطر بن سنور کر اس باغ میں آجا۔ مَیں جب باغ میں آئی تو وہ شخص میری آبرو پر ہاتھ ڈالنے لگا۔ مگر تمہیں دیکھ کر وہ بھاگ گیا اور اب مَیں تمہارے پاس آگئی ہوں۔"

ابن علی نے اُس کو مطعون کرتے ہوئے کہا "بے وقوف عورت تُو اس طرح غیر آدمی کے ساتھ کیوں چل کر اس باغ میں آئی۔"

اُس عورت نے کہا "ابن علی! جس عورت نے خاوند کی جدائی میں ایک مدت گزاری ہو اور اس دوران کسی دوسرے مرد کی شکل بھی نہ دیکھی ہو اُس کی حالت کا کیا تم اندازہ لگا سکتے ہو۔ اس پریشانی اور اضطراری حالت میں تو حرام چیز بھی حلال ہوتی ہے۔"

آپ نے اُس کو سمجھایا "بے وقوفی کی باتیں مت کرو اور اللہ سے توبہ کرو۔" وہ عورت پھر زار و قطار رونے لگی۔ آپ نے اُس سے کہا "بتاؤ مَیں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟"

"اس نے جواب دیا "تم وعدہ کرو کہ میری مدد ضرور کرو گے پھر مَیں بتاؤں گی۔"

ابن علی نے کہا "وعدہ تو نہیں کرتا لیکن اگر میرے بس میں ہوا تو مزید تمہاری مدد کروں گا۔"

اس عورت نے کہا "مَیں تمہارے عشق میں مبتلا ہوں مگر تمہاری بے توجہی اور لاپرواہی نے مجھے تمہارا دیوانہ کر دیا ہے۔ اس لیے مَیں نے یہ سارا بہروپ اختیار کیا۔ تُو اب بھی میرا ہو جائے تو میرے لیے اس سے بڑی کوئی خوشی کی بات نہیں۔"

آپ نے اُس عورت سے کہا "تو تم نے اتنی سی بات کے لیے اتنی لمبی کہانی بنائی۔ تم نے پہلے مجھے بتایا ہوتا تو میں اس بارے میں کچھ سوچتا۔"

اس پر عورت بولی "تو اب کیا ہو گیا ہے اب سوچ لو۔" اس کے ساتھ ہی عورت نے مزید آپ کے قریب ہونا چاہا مگر آپ نے اس سے دُور ہو کر بھاگنا شروع کر دیا اور بمشکل تمام اپنے گھر پہنچ کر اپنی والدہ کو سارا قصہ سنایا۔ انھوں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ محمد بن علی کو اللہ نے بُرائی سے بچا لیا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد خضر علیہ السلام آپ کو مبارک باد دینے آئے اور کہا "محمد بن علی مبارک ہو آج تم زلیخا سے بچ کر آگئے ہو۔"

✖

شیخ محمدؒ بن علی ترمذ کے رہنے والے تھے اوائل عمری میں آپ نے اپنے دو تین دوستوں کے ساتھ علم کے حصول کے لیے بغداد جانے کا ارادہ کیا۔ دوستوں نے اصرار کیا اگر بغداد جانے کی بجائے ترمذ میں ہی رہ کر تعلیم حاصل کر لی جائے تو کیا حرج ہے مگر محمدؒ بن علی کا خیال تھا کہ بغداد میں بہت سی یگانۂ روزگار ہستیاں موجود ہیں، مگر آپ کے دوست صعوبتِ راہ اور دیگر مسائل کی وجہ سے سفر اختیار کرنے کے خلاف تھے۔ لیکن جب آپ نے اُن کو استدلال سے سمجھایا تو وہ تینوں نہ صرف سفرِ علم کے لیے تیار ہو گئے بلکہ انھوں نے عہد کیا کہ خواہ ہماری جانیں چلی جائیں ہم علم حاصل کیے بغیر واپس گھر نہ لوٹیں گے۔ مگر جب اپنی والدہ سے اجازت لینے کا وقت آیا تو محمدؒ بن علی پریشانی میں مبتلا ہو گئے کیونکہ اُن کی والدہ کی عمر پینسٹھ سال کے قریب تھی اور حصولِ علم کے لیے کم و بیش دس سال کا عرصہ درکار تھا۔ والدہ نے اُن کو روک دیا اور یوں اُنکو والدہ کی بات ماننا پڑی اور انھوں نے سفر کرنے سے اجتناب کیا مگر آپ کے دوسرے دو دوست جو کہ سفر کے لیے کمربستہ تھے وہ بغداد جانا چاہتے تھے۔ آپ نے انھیں اپنی مجبوری بتائی اور انھیں کہا کہ وہ سفر پر جائیں اور علم حاصل کر کے

لوٹیں مگر میں یہاں ترمذ میں ہی رہوں گا۔ آپ کے دوستوں نے آپ پر بہت دباؤ ڈالا مگر آپ نے حکم مادر کی خلاف ورزی کرنا بالکل مناسب نہ سمجھا لیکن آپ کی طبیعت ہر وقت آزردہ رہتی تھی۔ رہ رہ کر آپ کو خیال آتا کہ چند سالوں کے بعد میرے یہ دونوں دوست تعلیم یافتہ ہو کر آئیں گے اور میں اُن کے سامنے جاہل ٹھہروں گا۔ اپنی آزردگی کو کم کرنے کے لیے آپ اپنا زیادہ تر وقت قبرستان میں گزارا کرتے تھے اور جب طبیعت میں ٹھہراؤ پیدا ہوتا تو آپ گھر آجاتے۔ آپ کو ہر وقت دنیا اور اُس کے مسائل، ہیچ نظر آتے تھے۔ ایک دن حسبِ معمول جب آپ قبرستان میں تشریف لے گئے تو ایک پُرانی قبر کے سرہانے آپ نے ایک بزرگ کو فاتحہ پڑھتے ہوئے دیکھا۔ آپ نے بھی اس بزرگ کی تقلید میں اپنے دونوں ہاتھ فاتحہ کے لیے اُٹھا دئیے آپ آنکھیں بند کر کے پہلے سورۃ فاتحہ پھر سورۃ اخلاص بڑے خشوع وخضوع سے پڑھتے گئے اور اردگرد سے بیگانہ ہو گئے۔ پھر جب آپ نے آنکھیں وا کیں تو وہ بزرگ جو آپ سے پہلے کھڑے تھے وہ جا چکے تھے۔ مگر جب آپ پیچھے مُڑے تو وہ بزرگ آپ کے پیچھے کھڑے تھے۔ اُن سے نظریں چار کر کے محمد بن علی کو ایک کرنٹ سا لگا۔ آپ نے اس بزرگ سے پوچھا "حضرت کیا آپ مجھ سے واقف ہیں؟"

انھوں نے جواب دیا "خوب اچھی طرح۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ یہاں قبرستان میں کیوں آتے ہیں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ اپنے دونوں دوستوں کے ساتھ بغداد نہ جانے کی وجہ سے بڑے آزردہ خاطر ہیں اور اسی پریشانی میں یہاں قبرستان میں آکر اپنا وقت گزارتے ہیں۔ اور یہ بھی مجھے معلوم ہے کہ یہ سب کچھ تو نے اپنی والدہ کے بڑھاپے کے خیال سے کیا۔"

اب ابن علی کی حیرت بڑھی تو اُس اجنبی بزرگ نے کہا "ابن علی! مجھے بتاؤ میں تمہاری کیا مدد کروں؟"

آپ نے جواب دیا "مجھے خود معلوم نہیں کہ آپ میری کیا مدد کریں گے۔"

وہ ہنس کر بولے "بھائی ذرا یہ بھی تو بتاؤ کہ میں تمہاری کیا مدد کروں۔ میں زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا ہوں کہ تمہارے جو دوست بغداد میں علم سیکھنے گئے ہیں یہاں پر ہی تمہیں سکھا دوں گا۔ میں تمہارے پاس از خود نہیں آیا بلکہ میں بھیجا گیا ہوں۔ کیونکہ تم نے اپنی ماں کے خیال سے علم ملتوی کیا ہے۔ اب اللہ تعالیٰ نے یہ فرض میرے سپرد کیا کہ میں تمہاری تمام تعلیم و تربیت مکمل کروں جس کی غرض سے تو بغداد جانے کا تمنائی تھا"

ابن علی نے اُس بزرگ سے پوچھا "آپ کا مبلغ علم کیا ہے؟"

انھوں نے جواب دیا "میرا مبلغ علم اتنا زیادہ ہے کہ بغداد اور دوسرے شہروں کے تمام علماء بھی اپنا علم اکٹھا کر لیں پھر بھی میرے علم سے کم بنتا ہے۔"

ابن علی کافی دیر سوچ بچار میں مشغول رہے پھر کچھ دیر کے بعد بولے "اے بزرگ! میں نے اک عمر یہاں بسر کی ہے مگر آپ تو ترمذ میں کہیں نظر نہیں آئے، تو اب آپ کہاں سے تشریف لے آئے۔"

اُس بزرگ نے جواب دیا "اے نوجوان! بے کار بحث مت کر اور کل سے قبرستان میں آکر مجھ سے تعلیم حاصل کر۔ اور یہ وعدہ کر جب تو تعلیم حاصل کر لے گا تو مغرور نہیں ہو گا بلکہ عجز و انکسار سے رہے گا۔ میں تمہیں طب بھی پڑھاؤں گا جس سے تم لوگوں کی بہتر طور پر خدمت کر سکو گے۔"

دوسرے دن سے پڑھائی شروع ہوئی، ابن علی تجسس کے عالم میں گھر آگئے پھر کافی دیر کے بعد کتابیں بغل میں تھامے قبرستان میں آگئے۔ ابن علی نے وہاں پر موجود کتابیں دیکھیں تو ان کی عقل دنگ رہ گئی۔ ہر موضوع مثلاً تصوف، حکمت اور طب پر کتابیں موجود تھیں اور چند ہی روز میں بڑے میاں نے ان کو تمام کتابیں حفظ

کرا دیں۔ اور اب ابن علی کا معمول بن گیا کہ وہ ایک درخت کے نیچے بیٹھ جاتے اور یوں درس و تدریس شروع ہو جاتا۔ ادھر ابن علی کی والدہ کو تشویش ہوئی کہ میرا بیٹا ہر روز کہاں جاتا ہے۔ بڑے میاں کے حکم کے مطابق اس علم کے بارے میں تاوقتیکہ مکمل تفاصیل بتانا منع تھا مگر ابن علی نے والدہ کو اتنا بتا دیا کہ ایک بزرگ مجھے بلا معاوضہ تعلیم سے سرفراز فرما رہے ہیں۔ والدہ نے اُس اَن دیکھے بزرگ محسن کو دُعائیں دیں اور کچھ عرصہ میں ہی آپ تصوّف، حکمت اور طب میں یکتا ہو گئے۔ اب آپ پر علم اور جوانی دونوں اپنا اپنا رنگ لے کر آئے آپ اس قدر خوبصورت تھے کہ علاقے بھر کی دوشیزائیں آپ کو دیکھ کر اپنی پوکڑیاں بھول جاتی تھیں۔ مگر آپ نے ہمیشہ شرم و حیا اور سنجیدگی کو برقرار رکھا۔ بڑے میاں آپ کے اوصاف کے بڑے معترف تھے۔ یوں آپ کی تعلیم مکمل ہوئی تو ایک روز آپ کو آپ کے اُستادِ مہربان نے بتایا کہ مَیں حضرت خضرؑ ہوں مجھے اللہ تعالیٰ نے اولیائے کرام کی تعلیم کے لیے ہی مامور کیا ہوا ہے۔ یہ کہہ کر آپ چلے گئے۔

✖

محمدؒ بن علی نے اسی وقت سجدۂ شکر ادا کیا کہ مولا تو نے مجھ پر کس قدر کرم کیا اور میری تعلیم پر ایک جیّد ہستی کو مامور کیا۔ یوں آپ کو معلوم ہوا کہ والدہ کی خدمت میں کس قدر برکت ہوتی ہے اور اس بات کا کتنا انعام ہے۔ اگر انھوں نے ماں کی خدمت اور دل جوئی کی خاطر اپنے علم کے سفر کو ملتوی کیا تو اللہ نے علم کے خزانے ان کے گھر میں خود بخود بھیج دیئے اور جو علم آپ کے دوست بغداد میں حاصل کرنے گئے تھے اُس علم سے کہیں بہتر اور اعلیٰ علم آپ کو ترمذ میں ہی عطا کر دیا اور عظمت کے اس مقام تک پہنچا دیا کہ حضرت خضر علیہ السلام نے ان سے وعدہ کیا کہ تعلیم کی تکمیل کے بعد بھی وہ ہفتہ میں ایک مرتبہ اُن سے ضرور ملنے آیا کریں گے۔ اس طرح رفتہ رفتہ یہ بات منظرِ عام پر آنے لگی کہ محمدؒ بن علی کے گھر حضرت خضرؑ آتے ہیں اور آپ کے ساتھ علمی مباحثے کرتے ہیں۔ اس بات کی خبر صوفیٔ وقت ابوبکر وراق کو بھی ہو گئی۔ وہ ایک روز آپ کے پاس آئے اور آپ سے باتوں باتوں میں دریافت کیا کہ کیا یہ سچ ہے کہ آپ کے پاس حضرت خضرؑ اکثر تشریف لاتے ہیں۔ آپ نے جواب دیا "بے شک وہ میرے پاس ہی آتے ہیں اور مَیں نے علم بھی انہی سے سیکھا ہے۔"

ابوبکر وراق نے آپ سے درخواست کی" پھر آپ میری بھی ملاقات اُن سے کروا دیں۔"

آپ نے جواب دیا "حضرت میرے پاس ہفتہ میں ایک بار تشریف لاتے ہیں۔ اب کی بار آئے تو مَیں اُن سے پوچھ لوں گا اور اگر انھوں نے پسند کیا تو آپ کی ملاقات اُن سے ضرور کرا دوں گا۔"

اب جب معمول کے مطابق اگلے ہفتے حضرت خضرؑ تشریف لائے تو ابن علی نے ابوبکر وراق کے متعلق بات چیت کی اور ملاقات کی اجازت مانگی۔

حضرت خضرؑ نے جواب دیا" اے ابن علی جس باغ میں آپ کو اُس خوبصورت بلانے اپنے دامن میں جکڑنا چاہا تھا۔ اس جمعہ کو اُسی باغ میں ابوبکر وراق کو لے آئیے مَیں اُن سے ملاقات کر لوں گا۔"

آپ نے ابوبکر وراق کو مطلع کر دیا۔ یوں جمعہ کی شب کو دونوں اُس باغ میں پہنچ گئے۔ وہاں انھوں نے دیکھا ایک تخت بچھا ہوا ہے۔ اس کے اردگرد ایک سحر خیز روشنی ہے اور اُس تخت پر ایک بزرگ بیٹھے ہیں۔ ابن علی اور ابوبکر وراق کو دیکھ کر وہ تخت سے نیچے اُترے اور پھر اُن دونوں کو بھی اپنے تخت کے اوپر ہی بٹھا لیا۔ ابھی دونوں حضرات تخت پر بیٹھے تھے کہ وہاں مزید چالیس بزرگ آ گئے۔ پھر ابن علی اور ابوبکر وراق کے لیے کھانا لایا گیا۔ اس قدر لذیذ کھانا انھوں نے پہلے کبھی نہیں کھایا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد ابن علی اور حضرت خضرؑ

آپس میں گفتگو کرنے لگ گئے۔ گفتگو اس قدر علم سے لبریز تھی کہ ابوبکر وراق جیسے عالم کو اُن کی گفتگو کا ایک لفظ تک سمجھ نہ آیا۔ پھر کافی دیر وہاں رہنے کے بعد دونوں نے حضرت خضرؑ سے اجازت چاہی اور واپس آگئے۔ اب ابوبکر وراق کو محمد بن علی کے مرتبہ اور مقام کا اندازہ ہوگیا اور آپ کے علم سے وہ اس قدر متاثر ہوگئے کہ انھوں نے مستقلاً آپ کی صحبت اختیار کر لی۔ اسی دوران ابن علی کی والدہ وفات پاگئیں اس کے بعد آپ خلوت نشیں ہوگئے اور اپنا زیادہ تر وقت یادِ الٰہی اور تصنیف و تالیف میں صرف کرنے لگے۔

آپ حج کے لیے تشریف لے گئے تو کعبہ کے طواف کے دوران آپ کی گریہ زاری سے عجیب کیفیت ہوگئی، اور روضۂ رسولؐ پر تو آپ پر شدید رقت طاری ہوگئی۔ آپ کا دل وہاں سے واپس لوٹنے کو نہیں چاہ رہا تھا مگر واپس آنا بھی ضروری تھا۔ جب واپس لوٹے تو آپ نے دیکھا کہ آپ کی کٹیا میں ایک کتیا نے بچے دے رکھے ہیں۔ آپ اس خیال سے کٹیا کے باہر کھڑے رہے کہ شاید کتیا خود بخود چلی جائے کیونکہ اُس کو دھتکارنا آپ نے مناسب نہ سمجھا مگر کتیا نے پوری رات کٹیا نہ چھوڑی۔ آپ نے بھی اُسے باہر نکالنے کی کوشش نہ کی اور اس انتظار میں پوری رات کٹیا کے باہر کھڑے رہے۔

✽

آپ کے دونوں دوست بغداد سے عالم بن کر واپس آگئے۔ انھیں اپنی علمیت کی رفعت پر ناز تھا اور وہ سوچ رہے تھے کہ اب ابن علی اُن کے سامنے شرمندہ رہیں گے لیکن جب ترمذ والوں نے آپ کے علم کے متعلق انھیں بتایا کہ اُن کے علم کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا تو وہ بڑے حیران ہوئے اور ابن علی کے پاس پہنچے اور اُن کو اس سے بہتر پایا جتنا کہ آپ نے اُن کے متعلق سُنا تھا۔ کیونکہ اُن دونوں کا علم منطقی اور معقولی تھا۔ اور ابن علی منطقی اور معقولی علم کے ساتھ ساتھ باطنی علم سے بھی بہرہ ور ہو چکے تھے۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر اُن دونوں دوستوں کے دل میں آپ کے لیے حسد پیدا ہوگیا لیکن وہ آپ کو تکلیف نہ پہنچا سکے مگر انھوں نے ابن علی کے خلاف پراپیگنڈہ کرنا شروع کر دیا کہ ابنِ علی کو کوئی علم نہیں آتا۔ عالم تو وہ ہوتا ہے جو علم کے حصول کے لیے دَر دَر پھرے، گھر بیٹھ کر علم کہاں حاصل ہوتا ہے۔ آپ کو اپنے دوستوں کے ارادوں کے بارے میں اطلاع ملتی رہتی تھیں مگر آپ انھیں بالکل زیرِ خاطر نہ لاتے تھے۔ آخر ایک روز دونوں شرمندہ ہوکر آپ کے پاس آئے اور عرض کی، "ہم نے آپ کے خلاف بہت باتیں کہیں، حسد اور کینہ پروری کا مظاہرہ کیا، آپ کا دل دُکھایا۔ آپ ہمیں معاف کر دیجیے۔"

آپ نے جواباً کہا، "تم نے دنیاوی علم سیکھا اُس کے زہر نے تمھیں ایسا کرنے پر مجبور کیا۔ حالانکہ کسی میں کوئی خوبی پاکر اس پر رشک کرنا چاہیے اور خدا سے ویسی عنایات کے لیے دعا مانگنی چاہیے۔" آپ کی باتیں سُن کر آپ کے حاسد دوست بڑے شرمندہ ہوئے اور آپ کے قدموں میں گر کر معافیاں مانگنے لگے۔ آپ نے ان دونوں کو معاف کر دیا۔

ایک مرتبہ ابن علی سخت بیمار ہوگئے۔ آپ کی بیماری کی نوعیت اور شدت اس قسم کی تھی کہ اس نے آپ کو آپ کے ورد و وظائف اور معاملات سے بھی غافل کر دیا۔ آپ بڑے ہی پریشان ہوئے۔ اکثر ایسے عالم میں سوچا کرتے تھے کہ کاش میں بیمار نہ ہوتا تو میرے وظائف کا حرج نہ ہوتا۔ آپ ابھی یہ سوچ رہے تھے کہ آپ کے کانوں میں سیٹیاں سی بجنے لگیں۔ ان سیٹیوں کی آواز میں آپ سے کہا گیا "اے ابن علی تو کتنا نادان انسان ہے جو اللہ کی مصلحت پر اعتراض کر رہا ہے تو نہیں جانتا کہ تیرا کام سہو ہے اور خدا کا کام راستی ہے

ہے۔ آپ نے جب یہ آوازیں سُنی تو سخت نادم ہوئے اور اُسی وقت توبہ و استغفار کرنے لگے۔ اللہ نے آپ کو شفایابی عطا فرمائی اور آپ کی عبادت اور ریاضت میں بہت اضافہ کردیا۔ آپ نے عبادت کے علاوہ طبّ کا کام بھی شروع کردیا۔ صبح سے شام تک لوگ آپ کے مطب میں آتے اور صباتِ نو کی نوید اور صحت و تندرستی کے تریاق حاصل کرتے۔ انہی مریضوں میں چالیس سال پہلے کی آپ کی عاشق زار عورت بھی ایک مرتبہ آگئی۔ آپ نے اُس کو قطعاً نہ پہچانا مگر وہ آپ کو پہچان گئی۔ آپ نے اُسے ساٹھ سال کی عمر میں بھی اُسی ہذیانی کیفیت میں دیکھا جس میں وہ چالیس سال پہلے مبتلا تھی۔ وہ ایک رٹ لگائے جا رہی تھی۔ اس دن کاش میری مُراد برآ جاتی تو آج میری تشنہ روح جو بے قرار ہے وہ چین حاصل کرلیتی۔ آپ نے اُسے دوا بھی دی اور اُس کیلئے دُعا بھی کی۔ کیونکہ اس عورت کا ذہنی توازن بالکل دُرست نہ تھا۔ وہ عورت تو چلی گئی لیکن آپ کو انتہائی پریشانی میں مُبتلا کر گئی۔ آپ بے اختیار سوچنے لگے کہ مَیں نے اُس روز موقع کا فائدہ کیوں نہ اُٹھایا۔ اُس سوچ سے آپ لمحہ بہ لمحہ شدید پریشان ہوتے گئے اور آپ کئی روز تک ذہنی طور پر بحال نہ ہوسکے پھر ایک روز آپ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں اپنی زیارت سے مستفیض فرمایا اور سمجھایا۔ "اے ابن علی تمہاری خجالت اور پشیمانی ہمیں بڑی پسند آئی ہے اس لیے اپنی اُداسی اور ملولیت چھوڑو۔" اُس کے بعد ابن علی سکون پذیر ہوئے۔

آپ نے اسی دوران شادی بھی کی۔ اللہ نے آپ کو ایک بیٹا بھی دیا جس کا نام عبداللہ تھا۔ اُس کی وجہ سے آپ کی کنیت ابو عبداللہ ہوئی۔ آپ اپنی بیوی کے سامنے بھی انتہائی ضبط احتیاط کا مظاہرہ کیا کرتے تھے اور اُس کے سامنے ناک بھی صاف نہیں کرتے۔ آپ میں نفس کُشی کا جذبہ کُوٹ کُوٹ کر بھرا ہو

علاماتِ مہدیؑ احادیث کی روشنی میں

1. اُن کا اسمِ گرامی محمّد اور اُن کے والدِ محترم کا نامِ نامی عبداللہ ہوگا۔
2. خاندانِ نبوّت کے چشم و چراغ ہوں گے یعنی حضرت فاطمہ زہراؓ کی اولاد میں سے ہوں گے۔
3. عرب کے حکمران ہوں گے۔
4. ان کا ظہور مدینہ منورہ میں ہوگا اور وہاں سے مکّہ معظمہ آئیں گے۔
5. مسجد الحرام میں حجرِ اسود اور مقامِ ابراہیم کے درمیان اُن کے ہاتھ پر بیعت خلافت کی جائے گی۔
6. ساری دُنیا کو عدل و انصاف سے معمور کردیں گے۔
7. سات سال تک مسندآرائے خلافت رہیں گے۔
8. ان کے عہدِ مبارک میں اسلام کا بول بالا ہوگا اور سطوتِ اسلام منتہائے عروج کو پہنچ جائے گی۔
9. غنی ہوں گے اور مال و زر بغیر گنتی کے تقسیم کریں گے۔
10. ان کے آخری ایام میں مال و زر کی اتنی فراوانی ہوگی کہ کوئی شخص زکوٰۃ کا قبول کرنے والا نہ ہوگا۔
11. شہر قسطنطنیہ جو نصاریٰ کے قبضے میں چلا گیا ہوگا۔ ان سے واپس لیں گے۔
12. یورپ کی مسیحی طاقتوں کے خلاف ان کی بہت سی لڑائیاں ہوں گی جن میں وہ مظفر و منصور رہیں گے۔
13. حضرت مسیح ابنِ مریمؑ ان کے زمانے میں نازل ہوں گے اور دجّال ان کے ہاتھوں مارا جائے گا۔

تھا اور اپنے آپ کو اذیت پہنچا کر بہت خوش ہوتے تھے اور کہتے اے نفس میں نے تمہیں حتی الامکان قابو میں کر لیا۔

ایک مرتبہ آپ اپنے کچھ تحریر کردہ اوراق ضائع کرنے والے تھے کہ اُوپر سے ابوبکر وراق آ گئے۔ آپ نے وہ صفحات اُن کو دے کر کہا" ابوبکر ان صفحات کو ضائع کر دو۔" ابوبکر نے ضائع کرنے سے پہلے اُن صفحات کو دیکھا اور ان کا مطالعہ کیا تو چند ہی صفحات پڑھ کر انھیں یوں محسوس ہوا جیسے علم کا بے بہا سرمایا انھیں مل گیا ہے۔ جب ابن علی نے ابوبکر سے اُن صفحات کی بابت پوچھا تو انھوں نے بات بنا دی" میں نے اُن اوراق کو دریا میں پھینک دیا ہے۔"
اس پر ابن علی مسکرائے اور فرمایا" اچھا تو تمہارا گھر دریا ہے۔"
یہ سُن کر ابوبکر شرمندگی سے مسکرائے اور آپ کے کشف پر حیران ہو گئے اور عرض کی" حضرت! میں نے ان کاغذات میں معرفت کے خزانے دیکھے۔ اس لیے اُن کو اپنے پاس رکھ لیا۔"
ابن علی نے حکم دیا" تم اسی وقت اُن کاغذات کو دریا بُرد کر دو۔" چنانچہ ابوبکر نے حکم کی تعمیل کی لیکن قابلِ ذکر بات یہ ہوئی کہ جس وقت انھوں نے کاغذات دریا میں پھینکے غیبی طور پر دریا کی سطح پر ایک صندوق نمودار ہوا اور تمام کاغذات از خود اُس کے اندر چلے گئے۔ ابوبکر صورتِ حال دیکھ کر بہت حیران ہوئے اور سارا قصہ آ کر ابن علی کو سنایا۔
آپ نے فرمایا" جاؤ اندر میرے حُجرے سے وہی صندوق اُٹھا لاؤ۔"
جب ابوبکر اندر گئے تو دیکھا کہ وہی صندوق حُجرے کے اندر پڑا ہے اور کاغذات بھی اُس کے اندر محفوظ پڑے ہیں۔ آپ نے ابن علی سے کہا" حضرت! یہ اسرار و رموز دیکھ کر میں پاگل ہو جاؤں گا مجھے ان کی وضاحت فرمائیں۔"
آپ نے فرمایا" ابوبکر! میں ان کاغذات کو استاد حضرت خضرؑ کو پیش کرنا چاہتا تھا مگر اُن کا میری طرف آنا نہیں ہو رہا تھا۔ چنانچہ میں نے وہ کاغذات سُپردِ دریا کر دیئے اور حضرت خضر علیہ السلام نے وہ تمام تحریریں پڑھ کر مجھے لوٹا دی ہیں اور مجھے حکم دیا ہے کہ ان تحریروں کو لوگوں کے حوالے کر دو یہ بڑی کارآمد ہیں مخلوقِ خدا ان سے بے حد فائدہ اُٹھا سکتی ہے۔" یہ کہہ کر محمد بن علی نے وہ تمام تحریریں ابوبکر وراق کے حوالے کر دیں اور انھوں نے اُن تحریروں کو کتابوں کی شکل دے کر مخلوقِ خدا کے لیے وقف کر دیا۔ جس سے ہر طبقے کے پیاسے نے اپنی اپنی بساط کے مطابق فائدہ اُٹھایا۔
آپ کی تاریخ وفات کے بارے میں کوئی مستند حوالہ موجود نہیں ہے کیونکہ آپ اپنی آخری عمر میں بالکل رُوپوش ہو گئے تھے۔ آپ کی حکمت کی وجہ سے آپ کے عقیدت مندوں کا ایک فرقہ حکیمتہ کے نام سے مشہور ہوا۔ جس نے آپ کو حکیم الاولیاء کا لقب دیا تھا۔ آپ نے زمانے بھر کا طب سے جسمانی علاج کیا اور روحانیت سے روحانی علاج کیا۔ آپ نے ہمیشہ عجز و انکسار کی زندگی گزاری۔

شیخ نور ایک صاحبِ کرامات اور صاحبِ حال بزرگ تھے پنڈوہ شہر میں عموماً قیام فرماتے تھے لوگ دُور دُور سے اُن سے فیض حاصل کرنے آیا کرتے تھے۔ اُن کے معتقدین مریدان ارادت مندوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ زندگی کے تمام شعبۂ حیات سے تعلق رکھنے والے افراد اُن کے در پر حاضری دینے آیا کرتے تھے۔ انہی مریدوں میں ایک تاجر بھی تھا جو خوشبویات اور معری وغیرہ کی تجارت کرتا تھا۔ کاروبار کے سلسلے میں وہ عموماً ایران، ترکی، ہندوستان، چین اور سمرقند وغیرہ جایا کرتا تھا۔ یہ تاجر جب بھی شیخ نور کی قدم بوسی کے لیے حاضر ہوتا تو وہ اُس سے اُس کے کاروبار کے متعلق دریافت کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ جب یہ تاجر شیخ نور کی خدمت میں حاضر ہوا تو انھوں نے اُس سے دریافت کیا "کیا دہلی جانا ہوا تھا؟" تاجر نے جب اثبات میں سر ہلایا تو شیخ نور نے دریافت کیا کہ وہاں تیری کن بزرگانِ دین سے ملاقات ہوئی ہے۔ تاجر نے کہا۔

"حضرت! دہلی میں قیام کے دوران مجھے جہانیاں جہاں گشت، قطب الدین منور، حسام الدین ملتانی اور فخرالدین زرادی سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ ان ہی نیک بندوں کی زیارت سے مجھے روحانی سکون میسر آیا ہے۔" تاجر کی بات شیخ نور نے سنی اَن سنی کر دی اور پھر ایک اور بزرگ کا نام لے کر کہا۔ "کیا تو ان سے بھی ملا تھا؟ وہ بھی ایک عظیم صاحبِ کرامت بزرگ ہیں۔"

تاجر نے کہا "حضرت یہ میری بدنصیبی ہے کہ میں اُن بزرگ کی قدم بوسی کے لیے جا نہ سکا" اس پر شیخ نور نے تاجر سے کہا۔

"اگر وہ آئندہ دہلی جائے تو اُن بزرگ سے ضرور ملے۔"

چنانچہ یہ تاجر جب اگلی مرتبہ دہلی گیا تو شیخ نور کے بتائے ہوئے بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اُن کو نذرانہ پیش کرنے کے لیے معری اور مشک کی خاصی مقدار بھی اپنے ساتھ لے گیا جب وہ یہ ساری چیزیں

لے کر اُن بزرگ کے پاس ایک مسجد میں پہنچا تو اُن بزرگ کے مریدوں نے تاجر کو دیکھ کر انتہائی حیرت کا اظہار کیا۔ تاجر نے اُن مریدوں سے کہا کہ وہ اُن کے مُرشد صاحب سے ملنے کا متمنی ہے۔ جب تاجر کو بزرگ کے سامنے پیش کیا گیا تو اُنہوں نے دریافت فرمایا کہ وہ کس سے ملنے آیا ہے۔ تاجر نے اُن کا نام لیتے ہوئے کہا کہ وہ اُنہی سے ملنے حاضر ہوا ہے کیونکہ اُن کی شہرت ایک زمانے میں پھیلی ہوئی ہے۔

اِن بزرگ نے مسکراتے ہوئے کہا "بھئی مَیں ہوں تو وہی جس سے تم ملنے آئے ہو مگر مجھ میں ایسی کوئی خوبی نہیں جیسا کہ تم نے سن رکھا ہے۔ ویسے یہ تو بتاؤ تم اپنے ساتھ تیس سیر مصری اور مُشک نافہ کس لیے لے کر آئے ہو؟" ان بزرگ کی زبانی مصری کا صحیح وزن سنکر وہ تاجر اُسی وقت اُن کے قدموں میں لوٹ گیا اور انتہائی عقیدت مندی سے بولا۔

حضرت آپ کو مَیں نے ویسا ہی پایا جیسا کہ میرے پیرو مُرشد شیخ نور نے فرمایا تھا۔ چنانچہ اس کے بعد وہ تاجر باقاعدگی سے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ کی برکات سے فیض یاب ہونے لگا۔

یہ عظیم صاحب کرامت بزرگ شیخ احمد کھتو تھے جنہوں نے زمانے کی سختیوں اور مشکلات کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتے ہوئے خلق خدا کو صراطِ مستقیم پر چلنے کی تلقین فرمائی۔

آپ کی تعلیم و تربیت کا واقعہ بھی بڑا عجیب وغریب ہے۔ آپ ۷۳۷ھ میں اس دُنیا میں تشریف لائے تاہم یہ ساری کہانی بڑی متاثر کُن ہے۔ روایت ہے کچھ بچے بابے دہلی شہر کے ایک محلّے میں کھیل کُود میں مصروف تھے۔ اتنے میں زبردست آندھی اور طوفان آگیا۔ تمام ننھے منے بچے اس طوفان کی زد میں آکر اُسی وقت ہلاک ہوگئے۔ کئی مکان زمین بوس ہوگئے۔ درخت جڑوں سے اُکھڑ گئے۔ اچھی خاصی تباہی مچی مگر ایک بچہ اس طوفان میں اُڑتا ہوا تھوڑی دُور روئی کے ایک ڈھیر پر جا گرا اور اس کے بعد بیہوش ہوگیا مگر جب وہ دوبارہ ہوش میں آیا تو اس کے گرد بہت سے لوگ جمع تھے۔ ایک بزرگ نے پوچھا۔

"بیٹا پہلے تم یہ بتاؤ کہ کہاں سے آئے ہو؟"

اس پر لڑکا معصومیت سے کہنے لگا "بابا جی! میرا نام احمد ہے۔ مَیں دہلی میں رہتا ہوں۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہاں زبردست طوفان آیا تھا جس نے مجھے یہاں تک پہنچا دیا ہے۔ اگر آپ مجھے واپس میرے گھر پہنچا دیں تو آپکی مہربانی ہوگی۔"

اب تو احمد نامی بچے سے سوال کرنے والے بزرگ بہت حیران ہوئے اور کہنے لگے "برخوردار! دہلی تو یہاں سے کئی میل دُور ہے جہاں پر طوفان نے قیامت خیز تباہی مچا دی ہے۔ وہاں تو کچھ بھی باقی نہیں بلکہ اب تو یہ بھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ تمہارا خاندان زندہ سلامت بھی بچا ہے یا نہیں۔" یہ سُنکر احمد اس خیال سے بلک بلک کر رونے لگا کہ اب وہ کہاں جائے گا۔

احمد کو روتا دیکھ کر وہ بزرگ بھی آب دیدہ ہوگئے۔ انہوں نے بچے سے کہا کہ اُسے فکر مند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں وہ اُسے اپنا بیٹا بنا کر رکھیں گے۔ احمد نے کہا کہ وہ دہلی جا کر اپنے گھر کی خبر لینا چاہتا ہے بہرکیف اس بُوڑھے شخص نے دوبارہ احمد کے سر پر دست شفقت رکھا اور اُسے اپنے ساتھ گھر لے آئے کیونکہ وہ خود بھی بے اولاد تھا۔ اس لیے مذکورہ لاوارث بچے کی صورت میں اُنہیں بیٹا مل گیا تھا۔ وہ شخص جب گھر آیا اور اُس نے بیوی کو ساری داستان سنائی تو وہ بھی بہت زیادہ خوش ہوئی وہ دونوں میاں بیوی بڑی شفقت سے احمد کی پرورش کرنے لگے مگر اس خاندان کے دوسرے بچے احمد سے دُور دُور رہتے اور اُسے حقیر

کر نفرت کا اظہار کرتے۔

گھر کی یہ نفرت انگیز فضا دیکھ کر احمد کا دِل اُچاٹ ہو گیا۔ اُنہوں نے بڑے میاں سے کہا "باواجان آپ نے ہم پر بہت احسان کیا ہے۔ مجھے آپ نے بزرگوں کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔ اس مہربانی کے لیے مَیں ہمیشہ آپ کا احسان مند رہوں گا مگر یہاں کے حالات مجھے مجبور کر رہے ہیں کہ اب مَیں اس گھر کو چھوڑ دوں بڑے میاں نے احمد کو بہت روکنے کی کوشش کی مگر اس نے تہیہ کر لیا کہ ایک نہ ایک روز وہ یہ گھر چھوڑ جائے گا۔

لہٰذا اپنے منصوبے کے مطابق ایک رات احمد نے اپنے محسن کا گھر چھوڑ کر دہلی کا قصد کیا مگر جب اُنہیں دہلی پہنچ کر اپنے اہلِ خانہ کا کوئی نشان نہ ملا تو اُنہوں نے پیٹ پالنے کی خاطر محنت مزدوری شروع کر دی۔ یوں ہی کر یہ کر یہ گھومتے احمد ایک روز ایک قصبے میں پہنچے جو کھتو کے نام سے مشہور تھا۔ اس جگہ اُن کا جی اس قدر لگا کہ یہیں کے ہو کر رہ گئے۔

ایک روز اسی قصبے میں احمد کی نظر ایک بزرگ پر پڑی جو اپنے مریدوں کے ہمراہ کہیں چلے جا رہے تھے مگر احمد کو دیکھ کر وہ بزرگ رُک کر اُنہیں گھورنے لگے یوں لگتا تھا جیسے وہ اُن کو پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں۔ لگتا تھا کہ احمد بھی اِن بزرگ سے بہت متاثر نظر آ رہے تھے۔

بزرگ اپنے ایک مرید سے کہنے لگے "یہاں پر خیمے لگا دو ہم اس جگہ قیام کریں گے" پھر دوسرے مرید سے کہنے لگے کہ اس لڑکے کو ہمارے پاس لاؤ۔

جیسے ہی بزرگ نے حکم فرمایا خیمے نصب ہونا شروع ہو گئے۔ دوسرے مرید نے احمد کے پاس جا کر کہا کہ اُن کے مرشد نے اُنہیں یاد فرمایا ہے۔

اب تو احمد بہت حیرت زدہ ہوئے اُنہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ بزرگ انہیں یاد فرما سکتے ہیں۔ احمد فوراً اُن بزرگ کے پاس چلے گئے۔ بزرگ نے خوش دلی سے احمد کا خیر مقدم کیا اور کہا "برخوردار کیا ارادے ہیں"

احمد کو یوں محسوس ہُوا کہ جیسے پہلے ہی اِن بزرگ سے اُن کی شناسائی ہے۔

پھر بزرگ خود ہی کہنے لگے برخوردار مَیں تم سے اچھی طرح آگاہ ہوں اور بیتابی سے تمہارا منتظر تھا۔

کچھ دیر تک وہ احمد سے باتیں کرتے رہے اور پھر اپنے مریدوں سے کہا کہ وہ احمد کو کسی ایک خیمے میں ٹھہرا دیں کیونکہ اب اُنہیں ہمارے ساتھ ہی رہنا ہو گا۔

کچھ دیر بعد احمد نے ایک مُرید سے پُوچھا کہ ان بزرگ کا نام کیا ہے احمد کو بتایا گیا کہ ان بزرگ کا نام اسحاق مغربی ہے اور اُن کے فیض سے ایک زمانہ فیضیاب ہو رہا ہے۔

"مگر مجھ سے یہ کیا چاہتے ہیں" احمد نے دریافت کیا۔

"معلوم نہیں مگر آثار بتا رہے ہیں کہ اُن کو آپ میں کوئی خاص بات نظر آئی ہے"

چند دِن اسی گو مگو کی حالت میں گزر گئے۔ ایک دن بابا اسحاق مغربی نے اُنہیں اپنے پاس بلوایا اور کہنے لگے "احمد تو اَن پڑھ ہے۔ اگر مَیں تجھے خلافت عطا کرنا چاہوں تو تمہیں صحیح مسرت نہیں ہو گی۔ اس لیے مَیں چاہتا ہوں کہ تو پہلے علم حاصل کر لے"

احمد کہنے لگے: "اے پیرومرشد میں تو آپ کے حکم کا غلام ہوں۔ آپ جیسا کہیں گے میں ویسا ہی کروں گا۔"
چنانچہ شیخ احمد نے بابا اسحاق کی ہدایت کے مطابق دہلی جا کر تعلیم حاصل کرنا شروع کر دی اور مسجد خان جہاں میں عبادت و ریاضت میں مصروف ہو گئے۔ یہاں آپ دن بھر روزے سے رہتے۔
اب تو شیخ احمد کی دنیا ہی بدل گئی کچھ ہی عرصہ بعد بابا اسحاق نے انہیں خلافت عطا فرمائی اور انہیں اس بات کی اجازت فرمائی کہ وہ جیسے چاہیں اپنے طور پر زندگی گزار سکتے ہیں۔
لہٰذا انہوں نے سب سے پہلے حج کا قصد کیا۔ حج کے بعد مدینہ منورہ میں روضۂ رسول پر حاضری دی، جہاں رو رو کر آپ کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔
بعض کتابوں میں آیا ہے کہ مدینہ منورہ کی زیارت کے دوران جس وقت آپ روضۂ رسول سے کچھ دور کھڑے سلام عرض کر رہے تھے تو مزار سے چند گز کے فاصلے پر روضۂ مبارک کا خادم ہاتھوں میں سیاہ دستانے پہنے کھڑا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک دستار تھی۔ چند لمحے وہ شیخ احمد کو انتہائی توجہ سے دیکھتا رہا اور پھر آپ کی طرف دستار بڑھاتے ہوئے بولا۔
"یہ دستار اپنے سر پر باندھ لو۔"
"میں یہ کیسے پہن سکتا ہوں کیونکہ میرے پیرومرشد بابا اسحاق تو مغربی ٹوپی پہنا کرتے تھے۔" شیخ احمد نے جواب دیا۔
اس پر روضۂ مبارک کے خادم نے جواب دیا: "بابا! آپ کو یہ دستار کالی کملی والے کی طرف سے عطا ہوئی ہے اور حکم ہوا ہے کہ آپ اسے اپنے سر پر باندھ لیں اور تبلیغ اسلام کا نیک کام شروع کر دیں۔"
یہ سنکر آپ دیوانگی اور عقیدت کے جذبے سے سرشار آگے بڑھے دستار مبارک کو بوسہ دیا اور جیسے ہی اسے سر پر رکھا تو انہیں یوں محسوس ہوا جیسے دنیا بھر کے علم کے خزانے ان کے دماغ میں سما گئے ہوں
آپ اللہ کے انتہائی برگزیدہ اور صاحب کرامت بزرگ تھے۔ ایک مرتبہ عصر کی نماز پڑھنے سے پہلے وضو کرنے کی غرض سے جب آپ سمندر کے کنارے پہنچے تو آپ کا پاؤں پھسل گیا اور آپ سمندر میں گر گئے آپ کے مریدوں اور معتقدین نے پریشانی کے عالم میں رونا دھونا شروع کر دیا۔ شیخ احمد نے بھی اپنے بچاؤ کے لیے ہاتھ مارنا شروع کر دیئے۔ ابھی آپ زیادہ دور نہیں گئے تھے کہ آپ کو اپنے پاؤں تلے ایک بڑا پتھر محسوس ہوا۔ شیخ احمد فوراً اس پر بیٹھ گئے حالانکہ اس وقت سمندر کا پانی آپ کی کمر تک پہنچ چکا تھا۔ آپ نے فوراً یا حفیظ یا حافظ کا ورد شروع کر دیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ایک جہاز کے کپتان نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے آپ کو پانی سے نکال لیا۔
کپتان نے پوچھا: "اے حضرت آپ کس شے پر بیٹھے تھے۔"
"ایک پتھر پر۔" آپ نے فرمایا۔
اب تو کپتان بہت حیران ہوا۔ کیونکہ سمندر میں اتنے بڑے پتھر کا وجود ہونا یقیناً ایک معجزہ تھا۔
شیخ احمد کھٹو ایک بے خوف ہستی کے مالک تھے۔ بادشاہوں اور رئیس و امرا کے سامنے بھی آپ حق بات کہنے سے دریغ نہیں کرتے تھے خواہ اس کے لیے انہیں کتنی ہی کڑی مصیبت کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑے۔
ایک مرتبہ سلطان فیروز شاہ تغلق کسی خاص مقصد کے تحت آپ کی طرف جا رہا تھا۔ راستے میں دونوں جانب لوگ جوق در جوق کھڑے ان کا استقبال کر رہے تھے۔ جو سلطان کے منکر تھے وہ بھی اس ڈر سے کہ کہیں

سُلطان ناراض نہ ہو جائے استقبال کے لیے تیار کھڑے تھے۔

اُدھر شیخ احمد کو جب اُن کے مریدوں نے بتایا کہ سلطان اُن سے ملنے آرہا ہے تو وہ بدستور اپنے حُجرے میں بیٹھے رہے۔ ایک مرید نے کہا پیرومُرشد کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ آپ بھی رسماً سُلطان کے استقبال کے لیے تشریف لے جائیں۔

"میں باہر جا کر سُلطان کا استقبال نہیں کروں گا، لیکن اگر وہ خود حجرے میں آئے گا تو میں اُس کا استقبال کروں گا۔"

آپ کی یہ بات سُن کر تمام مُرید خاموش ہو گئے۔

پھر جب سُلطان نے آپ کے حجرے کے باہر کھڑے ہو کر باریابی کی اجازت چاہی تو آپ نے خود آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور سُلطان کو اندر آنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

آپ نے سُلطان سے فرمایا: "بندہ جانتا ہے کہ آپ بادشاہوں کی مصروفیات بہت زیادہ ہوتی ہیں، لیکن اس کے باوجود اگر آپ میرے حجرے تک آئے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ سُلطان کو اپنی کوئی غرض یہاں تک لے آئی ہے۔"

پھر آپ نے خود ہی فرمایا: "کہیں سُلطان ہم آپ کے کس کام آسکتے ہیں؟"

سلطان تغلق کہنے لگا: "اے بزرگوار کیا آپ نے امیر تیمور کا نام سُنا ہے۔"

شیخ احمد نے فرمایا: "کیا وہی تیمور جو تاتاری ہے اور جس کی تلوار نے بے گناہ لوگوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ دیا تھا۔"

"جی پیرومرشد وہی تیمور" سُلطان نے جواب دیا۔

"تو اب اُس کو کیا مسئلہ درپیش ہے۔" آپ نے دریافت فرمایا۔

"اُس نے تو کچھ نہیں کہا حضرت! لیکن اِس قسم کی خبریں سُننے میں آئی ہیں کہ وہ بہت جلد ہندوستان میں وارد ہونے والا ہے" سُلطان تغلق عاجزی سے بولا۔

شیخ احمد نے فرمایا: "اگر کسی کی قضا آنے والی ہوتی ہے تو وہ آکر ہی رہتی ہے۔ قدرت کے کاموں کو ہم ٹالنے والے کون ہوتے ہیں۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہُوا کہ تیمور یہاں ضرور آئے گا" سُلطان نے مایوس کُن لہجے میں کہا۔

"ہاں وہ ضرور آئے گا" آپ نے فرمایا: "البتہ آپ کہیں اور جانا چاہیں تو جا سکتے ہیں۔"

اب تو سُلطان تغلق بہت پریشان ہوا اور کہنے لگا پیرومُرشد اگر امیر تیمور اس علاقے میں آیا تو بہت تباہی اور بربادی ہوگی۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ آپ میرے ساتھ جونپور چلیں۔

مگر آپ نے انکار کر دیا اور کہا کہ تیمور سے میرا کیا تنازعہ، جب میرا اُس سے کوئی جھگڑا ہی نہیں تو پھر مجھے اُس سے کیا خطرہ ہو سکتا ہے۔

چنانچہ سُلطان تغلق انتہائی مایوسی کے عالم میں اکیلا ہی جونپور چلا گیا جبکہ شیخ احمد دہلی میں ہی سکونت پذیر رہے۔

سُلطان تغلق کے دہلی سے چلے جانے کے پندرہ بیس روز بعد امیر تیمور اپنے لشکر کے ساتھ دہلی میں وارد ہُوا اور اُس کی فوج نے قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا۔ عوام النّاس نے اپنے بچاؤ کے لیے آس پاس کے

احمد کہنے لگے۔" اے پیرومرشد میں تو آپ کے حکم کا غلام ہوں۔ آپ جیسا کہیں گے میں ویسا ہی کروں گا۔"
چنانچہ شیخ احمد نے بابا اسحاق کی ہدایت کے مطابق دہلی جا کر تعلیم حاصل کرنا شروع کر دی اور مسجد خان
جہاں میں عبادت و ریاضت میں مصروف ہو گئے۔ یہاں آپ دن بھر روزے سے رہتے۔
اب تو شیخ احمد کی دُنیا ہی بدل گئی کچھ ہی عرصہ بعد بابا اسحاق نے انہیں خلافت عطا فرمائی اور انہیں اس
بات کی اجازت فرمائی کہ وہ جیسے چاہیں اپنے طور پر زندگی گزار سکتے ہیں۔
لہٰذا انہوں نے سب سے پہلے حج کا قصد کیا حج کے بعد مدینہ منورہ میں روضۂ رسول پر حاضری دی،
جہاں رو رو کر آپ کی آنکھیں سُرخ ہو گئیں۔
بعض کتابوں میں آیا ہے کہ مدینہ منورہ کی زیارت کے دوران جس وقت آپ روضۂ رسول سے کچھ دُور
کھڑے سلام عرض کر رہے تھے تو مزار سے چند گز کے فاصلے پر روضۂ مبارک کا خادم ہاتھوں میں سیاہ دستانے
پہنے کھڑا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک دستار تھی۔ چند لمحے وہ شیخ احمد کو انتہائی توجہ سے دیکھتا رہا اور پھر
آپ کی طرف دستار بڑھاتے ہوئے بولا۔
" یہ دستار اپنے سر پر باندھ لو۔"
" میں یہ کیسے پہن سکتا ہوں کیونکہ میرے پیرومرشد بابا اسحاق تو مغربی ٹوپی پہنا کرتے تھے۔" شیخ احمد
نے جواب دیا۔
اس پر روضۂ مبارک کے خادم نے جواب دیا۔" بابا! آپ کو یہ دستار کالی کملی والے کی طرف سے عطا
ہوئی ہے اور حکم ہوا ہے کہ آپ اسے اپنے سر پر باندھ لیں اور تبلیغ اسلام کا نیک کام شروع کر دیں۔"
یہ سُن کر آپ دیوانگی اور عقیدت کے جذبے سے سرشار آگے بڑھے دستار مبارک کو بوسہ دیا اور جیسے
ہی اُسے سر پر رکھا تو اُنہیں یوں محسوس ہوا جیسے دُنیا بھر کے علم کے خزانے اُن کے دماغ میں سما گئے ہوں
آپ اللہ کے انتہائی برگزیدہ اور صاحب کرامت بزرگ تھے۔ ایک مرتبہ عصر کی نماز پڑھنے سے پہلے
وضو کرنے کی غرض سے جب آپ سمندر کے کنارے پہنچے تو آپ کا پاؤں پھسل گیا اور آپ سمندر میں گر گئے
آپ کے مُریدوں اور معتقدین نے پریشانی کے عالم میں رونا دھونا شروع کر دیا۔ شیخ احمد نے بھی اپنے
بچاؤ کے لیے ہاتھ مارنا شروع کر دیئے۔ ابھی آپ زیادہ دُور نہیں گئے تھے کہ آپ کو اپنے پاؤں تلے
ایک بڑا پتھر محسوس ہوا۔ شیخ احمد فوراً اس پر بیٹھ گئے حالانکہ اُس وقت سمندر کا پانی آپ کی کمر تک
پہنچ چکا تھا۔ آپ نے فوراً یا حفیظ یا حافظ کا ورد شروع کر دیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ایک جہاز کے کپتان
نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے آپ کو پانی سے نکال لیا۔
کپتان نے پوچھا۔" اے حضرت آپ کس سے پر بیٹھے تھے۔"
" ایک پتھر پر۔" آپ نے فرمایا۔
اب تو کپتان بہت حیران ہوا۔ کیونکہ سمندر میں اتنے بڑے پتھر کا وجود ہونا یقیناً ایک معجزہ تھا۔
شیخ احمد کھتو ایک بے خوف ہستی کے مالک تھے۔ بادشاہوں اور رئیس و امراء کے سامنے بھی آپ
بات کہنے سے دریغ نہیں کرتے تھے خواہ اس کے لیے انہیں کتنی ہی کڑی مصیبت کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑے
ایک مرتبہ سلطان فیروز شاہ تغلق کسی خاص مقصد کے تحت آپ کی طرف جا رہا تھا۔ راستے میں دونوں
جانب لوگ جوق در جوق کھڑے اُن کا استقبال کر رہے تھے۔ جو سلطان کے کمشکر تھے وہ بھی اس ڈر سے کہ کہیں

سلطان ناراض نہ ہو جائے استقبال کے لیے تیار کھڑے تھے۔
اُدھر شیخ احمد کو جب اُن کے مریدوں نے بتایا کہ سلطان اُن سے ملنے آرہا ہے تو وہ بدستور اپنے حجرے میں بیٹھے رہے۔ ایک مرید نے کہا پیر و مرشد کیا یہ مناسب نہ ہو گا کہ آپ بھی رسماً سلطان کے استقبال کے لیے تشریف لے جائیں۔
"میں باہر جا کر سلطان کا استقبال نہیں کروں گا، لیکن اگر وہ خود حجرے میں آئے گا تو میں اُس کا استقبال کروں گا۔"
آپ کی یہ بات سن کر تمام مُرید خاموش ہو گئے۔
پھر جب سلطان نے آپ کے حجرے کے باہر کھڑے ہو کر باریابی کی اجازت چاہی تو آپ نے خود آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور سلطان کو اندر آنے کی اجازت مراحمت فرمائی۔
آپ نے سلطان سے فرمایا: "بندہ جانتا ہے کہ آپ بادشاہوں کی مصروفیات بہت زیادہ ہوتی ہیں، لیکن اس کے باوجود اگر آپ میرے حجرے تک آئے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ سلطان کو اپنی کوئی غرض یہاں تک لے آئی ہے۔"
پھر آپ نے خود ہی فرمایا: "کہیں سلطان ہم آپ کے کس کام آسکتے ہیں؟"
سلطان تغلق کہنے لگا: "اے بزرگوار کیا آپ نے امیر تیمور کا نام سُنا ہے۔"
شیخ احمد نے فرمایا: "کیا وہی تیمور جو تاتاری ہے اور جس کی تلوار نے بے گناہ لوگوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ دیا تھا۔"
"جی پیر و مرشد وہی تیمور۔" سلطان نے جواب دیا۔
"تو اب اُس کو کیا مسئلہ درپیش ہے۔" آپ نے دریافت فرمایا۔
"اُس نے تو کچھ نہیں کہا حضرت! لیکن اس قسم کی خبریں سُننے میں آئی ہیں کہ وہ بہت جلد ہندوستان میں وارد ہونے والا ہے۔" سلطان تغلق عاجزی سے بولا۔
شیخ احمد نے فرمایا: "اگر کسی کی قضا آنے والی ہوتی ہے تو وہ آکر ہی رہتی ہے۔ قدرت کے کاموں کو ہم ٹالنے والے کون ہوتے ہیں۔"
"تو اس کا مطلب یہ ہُوا کہ تیمور یہاں ضرور آئے گا۔" سلطان نے مایوس کُن لہجے میں کہا۔
"ہاں وہ ضرور آئے گا۔" آپ نے فرمایا: "البتہ آپ کہیں اور جانا چاہیں تو جا سکتے ہیں۔"
اب تو سلطان تغلق بہت پریشان ہوا اور کہنے لگا پیر و مرشد اگر امیر تیمور اس علاقے میں آیا تو بہت تباہی اور بربادی ہو گی۔ کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ آپ میرے ساتھ جونپور چلیں۔
مگر آپ نے انکار کر دیا اور کہا کہ تیمور سے میرا کیا تنازعہ، جب میرا اُس سے کوئی جھگڑا ہی نہیں تو پھر مجھے اُس سے کیا خطرہ ہو سکتا ہے۔
چنانچہ سلطان تغلق انتہائی مایوسی کے عالم میں اکیلا ہی جونپور چلا گیا جبکہ شیخ احمد دہلی میں ہی سکونت پذیر رہے۔
سلطان تغلق کے دہلی سے چلے جانے کے پندرہ بیس روز بعد امیر تیمور اپنے لشکر کے ساتھ دہلی میں وارد ہُوا اور اُس کی فوج نے قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا۔ عوام الناس نے اپنے بچاؤ کے لیے آس پاس کے

علاقوں میں پناہ لینا شروع کر دی مگر شیخ احمد نے اپنی مسجد سے باہر قدم بھی نہ رکھا۔
تھوڑی ہی دیر بعد تیمور کی فوج مسجد میں بھی داخل ہو گئی اور اُس نے شیخ احمد کو گرفتار کر لیا۔ اس موقع پر آپ کے چالیس مریدوں کو بھی گرفتار کر کے اُن سب کو ایک جیل میں بند کر دیا تھا۔
اب تو بعض مُریدوں نے مایوسی اور بے بسی کے عالم میں باقاعدہ اشک شوئی شروع کر دی۔ آپ بہت برہم ہُوئے اور اُن سے کہا کیا تم رحمتِ الٰہی سے مایوس ہو گئے ہو جو اس طرح رو پیٹ رہے ہو۔
اس پر مریدوں نے کہا "اے پیرو مُرشد ہم تو یہ سوچ کر آہ و زاری کر رہے ہیں کہ ہمارا حشر کیا ہو گا"
حضرت شیخ نے اپنے مُریدوں کو دلاسہ دے کر کہا "گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں انشاءاللہ قدرت ہم پر مہربان ہو گی"۔
اس دوران امیر تیمور نے دہلی کے مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کی۔ اولیائے کرام کے مزاروں پر حاضری دی اس کے بعد وہ متھرا کی تسخیر کے بارے میں سوچنے لگا۔
ایک روز امیر تیمور سو رہا تھا کہ خواب میں اُسے ایک بزرگ کی زیارت ہُوئی۔
بزرگ نے امیر تیمور سے کہا "کیا تو یہ چاہتا ہے کہ تجھ پر کوئی غالب آ جائے"
"میں ایسا ہرگز نہیں چاہتا" تیمور نے جواباً کہا۔
پھر بزرگ نے تیمور سے کہا کہ جس طرح تو امیر اور فاتح ہے اسی طرح دہلی میں یہی مقام شیخ احمد کو حاصل ہے مگر تُو نے اُن کو اُن کے مریدوں سمیت پابندِ سلاسل کر رکھا ہے، لیکن اگر شیخ احمد نے جلال میں آ کر تمہیں کوئی بددعا دی تو تُو تباہ و برباد ہو جائے گا"
بزرگ کی بات سُن کر تیمور پر کپکپی سی طاری ہو گئی۔ اُس نے بزرگ سے کہا "اے بزرگوار میں نے تو شیخ احمد یا اُن کے مُریدوں کو جیل میں ڈالنے کا حُکم نہیں دیا"
"یہ تُو نے نہیں بلکہ تیرے سپاہیوں نے کیا ہے" اتنا کہہ کر بزرگ غائب ہو گئے اور تیمور کی آنکھ کھل گئی
امیر تیمور نے فوراً اپنے آدمیوں کو حُکم دیا کہ قید خانے کے نگران کو پیش کیا جائے۔ جب وہ آیا تو امیر تیمور نے اُس سے شیخ احمد اور ان کے مُریدوں کی گرفتاری کے بارے میں دریافت کیا۔
نگرانِ جیل نے کہا "سرکار یقیناً وہ گرفتار ہیں۔
امیر تیمور نے حُکم دیا کہ اسی وقت شیخ احمد اور اُن کے مُریدوں کو پیش کیا جائے۔
کچھ ہی دیر بعد شیخ احمد اور اُن کے مُریدوں کو امیر تیمور کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ امیر تیمور نے کھڑے ہو کر حضرت اور اُن کے مُریدوں سے معافی طلب کی۔ اس پر شیخ احمد نے فرمایا۔
"اے امیر تیمور! ایک عادل اور انصاف پسند حکمران دہلی پر حکومت کرتا تھا مگر تُو نے اپنی وحشت و بربریت سے عوام کو خوف زدہ کر کے دہلی پر قبضہ جما لیا ہے۔ میں اب بھی کہتا ہوں کہ تو یہاں سے واپس لوٹ جا۔ کیونکہ اللہ ایسی ناانصافی اور ظلم کو پسند نہیں فرماتا۔
تیمور نے شیخ احمد کو جواب دیا کہ وہ خدا کی رضا سے دہلی میں وارد ہُوا ہے اور اب خدا کی مرضی اور رضا سے ہی واپس جائے گا۔
امیر تیمور کی اس بات پر آپ نے فرمایا "خداوند قدوس کبھی بھی یہ نہیں چاہتا ہو گا کہ ایک عادل نیک پرہیزگار بادشاہ کو سزا ملے بلکہ خدا کی منشا تو یہ تھی کہ تجھ کو ایک عذاب کی شکل میں یہاں کے گناہگار بندوں

نازل کرے۔ چونکہ اب مشیت ایزدی پوری ہو چکی ہے اس لیے تجھے واپس لوٹ جانا چاہیئے تاکہ یہاں پر دوبارہ ایک عدل پسند بادشاہ کی حکومت قائم ہو سکے"۔

تیمور نے نہ صرف جلد ہی واپس لوٹ جانے کی حامی بھر لی بلکہ شیخ احمد اور اُن کے مریدوں کو بھی عزت و احترام سے واپس مسجد میں بھجوا دیا۔ پھر وہ کچھ عرصہ تک دہلی میں رہنے کے بعد اپنی فوج کے ساتھ واپس لوٹ گیا۔

ادھر سلطان فیروز شاہ تغلق کو جب یہ خبر پہنچی تو وہ واپس دہلی لوٹ آیا اور اُسے جب یہ علم ہوا کہ حضرت شیخ احمد کی نصیحت اور ہدایت کے تحت امیر تیمور دہلی سے گیا ہے تو اُس کی خوشی کی انتہا نہ رہی اور اُس نے حضرت شیخ احمد کی خدمت میں حاضر ہو کر عقیدت کے ساتھ عرض کی "اے پیر و مرشد یہ سب آپ کی برکت کی وجہ سے ہوا ہے۔ اگر اُس وقت آپ میری درخواست پر میرے ساتھ جونپور چلے جاتے تو شاید امیر تیمور یہاں سے کبھی نہ جاتا۔

آپ نے مسکراتے ہوئے فرمایا "سلطان اگر تو ہر وقت اللہ کو یاد رکھے گا تو کبھی مشکل میں گرفتار نہیں ہو گا۔ اب تو یہاں خدا اور اُس کے رسولؐ کی ہدایات کے مطابق حکومت کر"۔

حضرت شیخ احمد سفر پر رہنے کو بھی نیک فال تصور کرتے تھے۔ اُن کا فرمانا تھا کہ اس طرح انسان کو کائنات کے رنگ دیکھنے اور قدرت کے نظاروں کو دیکھنے کا موقع ملتا ہے جو ایک طرح سے عبادت کے برابر ہے۔

آپ ایک مرتبہ سیاحت کے شوق میں سفر کرتے کرتے سمرقند پہنچ گئے جہاں رات کو آپ نے مسجد میں

قیام فرمایا۔ مسجد کے ایک حصے میں ایک درس گاہ بھی قائم تھی جہاں اساتذۂ کرام صبح سویرے لڑکوں کو علم کی روشنی سے منور کرتے تھے۔

حضرت بھی اُس درسگاہ میں تشریف لے گئے اور وہاں جب ایک طالب علم کو غلط اعراب کے ساتھ پڑھتے دیکھا تو فوراً ٹوک دیا۔ یہ دیکھ کر لڑکے کے اُستاد کے ہوش جاتے رہے۔ اُس نے آپ کے قریب آکر پوچھا "اے بزرگوار آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں"

"میں دہلی سے آیا ہوں"۔ آپ نے جواب دیا۔

"کیا ایسا ممکن نہ ہوگا کہ آپ ہمارے ساتھ ہی قیام فرمائیں"۔ استاد نے اپنی خواہش کا بے چینی سے اظہار کیا۔

شیخ صاحب نے اُس سے پوچھا کہ آپ ایسا کیوں چاہتے ہیں۔

اُستاد کہنے لگا "حضرت آپ کی علمیت ہم پر واضح ہو چکی ہے۔ آپ نے شاگردوں کو جس طرح بڑھایا ہے اُس سے آپ کا عالم فاضل ہونا ثابت ہو چکا ہے اور مجھے یقین ہو چکا ہے کہ آپ سے بہتر کوئی اُستاد ہو ہی نہیں سکتا"۔

جب شیخ صاحب مدرسے میں موجود تھے تو اُن کے تن پر پھٹا پرانا اور بوسیدہ لباس تھا۔ مدرسے کے اُستاد نے دریافت کیا کہ اُنھوں نے یہ معمولی پوشاک کس لیے پہن رکھی ہے"۔

جواب میں شیخ احمد نے فرمایا۔ "اے خدا کے بندے اگر علم اور عقل و شعور کی طرح میری پوشاک بھی اچھی ہوتی تو اس صورت میں میرا نفس چغلی شرارت اور دیگر بُرے کاموں کی طرف مائل ہو جاتا، لیکن اگر انسان کی پوشاک فقیرانہ ہو تو وہ انسان کو غرور اور تکبر سے بچائے رکھتی ہے۔

چونکہ حضرت شیخ احمد کی عمر مبارک کا زیادہ حصہ اجمیر کے شہر کھتو میں ہی بسر ہوا۔ اور وہیں سے آپ کو بلند مقام و مرتبہ حاصل ہوا۔ اس لیے آپ "شیخ احمد کھتو" کے نام سے ہی مشہور ہوئے۔

کئی دوسرے اولیاء کی طرح آپ نے بھی بہت لمبی عمر پائی۔ آپ کی تاریخ وفات کے بارے میں کوئی حتمی بات نہیں کہی جا سکتی۔ تاہم بعض حوالوں میں آپ کی تاریخ وفات ۸۴۹ ہجری اور بعض کتابوں میں ۸۴۸ ہجری درج ہے۔

حضرت شیخ احمد کھتو کے لیے اُن کے عقیدت مندوں نے ایک عالی شان مقبرہ تعمیر کروایا جہاں آپ ابدی نیند سو رہے ہیں۔

امام شافعیؒ کی والدہ کو ایک مرتبہ ایک مرد اور ایک عورت کے ساتھ گواہی دینے کے لیے عدالت میں جانا پڑا۔ قاضی نے دونوں عورتوں کا بیان الگ الگ لینا چاہا مگر امام شافعیؒ کی والدہ نے الگ بیان دینے سے انکار کر دیا اور کہا "قرآن نے دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر اس لیے قرار دی ہے کہ اگر ایک عورت صورتِ واقعہ کو بھول جائے تو دوسری اس کو یاد دلا دے۔ قاضی نے اپنی غلطی تسلیم کر لی۔

ایک شخص بازار میں کھڑا ہو کر کہہ رہا تھا "لوگو! مَیں نے بہت زیادہ جرائم کیے ہیں، میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا ہے لہٰذا اسی وقت مجھے حاکمِ وقت کے پاس لے چلو تاکہ وہ مجھ پر شرعی حدود نافذ کر کے مجھے قرار واقعی سزا دے"۔ پہلے تو لوگ بہت حیران ہوئے کہ یہ کیسا شخص ہے جو جان بُوجھ کر قانون کی گرفت میں جانا چاہتا ہے مگر جب اُس شخص نے بہت زیادہ اصرار کیا تو لوگوں نے اُسے لے جا کر حاکمِ وقت کی خدمت میں پیش کر دیا مگر حاکمِ وقت نے اللہ کے اس بندے کو باعزّت طور پر واپس گھر بھجوا دیا۔

گھر واپس پہنچ کر جب دروازے پر ہی اس شخص نے انتہائی بے قراری کے عالم میں اپنی بیوی کو آواز دی تو بیوی نے تصوّر کیا کہ شاید اُس کے شوہر کسی جسمانی مصیبت یا ذہنی اُلجھن میں مبتلا ہیں۔

بیوی نے دروازہ کھولتے ہی کہا "خدا خیر کرے کیا آپ زخمی ہو گئے ہیں تو جواب میں اس شخص نے کہا ہاں نیک بخت مَیں قلبی طور پر سخت زخمی ہوں مگر حاکمِ وقت نے میرے زخموں پر مرہم رکھنے سے انکار کر دیا ہے"۔

پھر تھوڑی دیر بعد دوبارہ کہنے لگا: "بیگم مَیں حج پر جانا چاہتا ہوں اگر تم چاہو تو مَیں تمہیں طلاق دے سکتا ہوں کیوں کہ اس کٹھن راستے میں میرے ساتھ تمہیں بھی اذیتیں برداشت کرنا پڑیں گی"۔

"تو کیا ہوا" بیوی بولی "مَیں خادمہ بن کر آپ کے ساتھ رہوں گی کیونکہ میرے لیے آپ کی فرقت اور جدائی ناقابلِ برداشت ہے"۔ چنانچہ اس نیک بندے نے اپنی بیوی کو بھی شریکِ سفر کر لیا اور اللہ تعالیٰ نے اُس کے سفر کی تمام دُشواریاں اور صعوبتیں آسان فرما دیں اور پھر مکّہ معظمہ پہنچ کر اس شخص نے خانہ کعبہ کی مجاوری اختیار کر لی۔

یہ پُر تاثیر واقعہ اہلِ تقویٰ اور اہلِ حال بزرگ اور راہِ طریقت کے ہادی حضرت فضیل بن عیاض کی زندگی کا ہے جو ولایت و ہدایت کے مہرِ منور اور اپنے وقت کے کامل ولی اللہ تھے۔ جنہیں اُن کے معتقدین آج

بھی صادق و مقتدا تصور کرتے ہیں۔
کہتے ہیں کہ ہارون الرشید نے ایک رات فضل برمکی کو حکم دیا کہ مجھے کسی درویش قلندر سے ملوا دو۔ چنانچہ وہ آپ کو حضرت سفیان کی خدمت میں لے گیا اور دروازے پر دستک دینے کے بعد جب حضرت سفیان نے دریافت فرمایا کہ کون ہے تو فضل برمکی نے جواب دیا کہ امیرالمومنین ہارون الرشید تشریف لائے ہیں۔
حضرت سفیان نے فرمایا "کاش مجھے پہلے علم ہوتا تو میں خود خلیفہ کے استقبال کے لیے حاضر ہوتا۔ یہ بات سُن کر ہارون الرشید نے فضل برمکی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔
"میں جس قسم کے درویش کا کھوج لگانے نکلا تھا ان میں ویسے اوصاف اور خوبیاں موجود نہیں ہیں تم مجھے یہاں کیوں لے کر آئے ہو؟"
فضل برمکی انتہائی عاجزی سے عرض گزار ہوا "حضور آپ جس قسم کے بزرگ کی تلاش و جستجو میں ہیں وہ اوصاف صرف فضیل بن عیاض میں ہیں۔" اتنا کہنے کے بعد فضل برمکی ہارون الرشید کو فضیل بن عیاض کے ہاں لے گیا۔
جب آپ لوگ حضرت فضیل بن عیاض کے ہاں آئے تو اس وقت وہ قرآن پاک کی تلاوت فرما رہے تھے جس کا ترجمہ یہ تھا۔
یعنی کیا لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے بُرے کام کیے۔ ہم ان کو نیک کام کرنے والوں کے برابر کر دیں گے جیسے ہی ہارون الرشید نے یہ الفاظ سُنے تو وہ خود سے بولے "اس سے بڑی نصیحت اور کیا ہو سکتی ہے"
پھر جب خلیفہ نے دروازے پر دستک دی تو فضیل اندر سے بولے "کون ہے دروازے پر؟"
فضل برمکی نے باہر سے کہا کہ امیرالمومنین تشریف لائے ہیں۔ آپ نے اندر سے ہی فرمایا کہ خلیفہ کا میرے دروازے پر کیا کام اور میرا ان سے کیا علاقہ؟ برائے کرم آپ میری عبادت و ریاضت میں مخل نہ ہوں اور واپس تشریف لے جائیں۔
فضل برمکی نے باہر سے کہا "جناب والا! امیر وقت کی اطاعت کرنا آپ کا فرض ہے۔"
آپ نے اندر سے فرمایا "مجھے اذیّت میں مبتلا مت کرو۔"
اس پر فضل برمکی نے باہر کھڑے کھڑے باآوازِ بلند کہا۔ "حضرت! اگر آپ اندر آنے کی اجازت نہیں دیں گے تو ہم لوگ زبردستی اندر آ جائیں گے۔"
فضیل بن عیاض نے اندر سے مختصراً جواب دیا "بلا اجازت اندر داخل ہونے میں تم مختار ہو مگر میری مرضی اس میں شامل نہیں ہو گی۔"
چنانچہ جب ہارون الرشید اور فضل برمکی دونوں اندر داخل ہوئے تو آپ نے شمع بجھا دی تاکہ آپ کو ہارون دکھائی نہ دے سکیں۔ حسنِ اتفاق دیکھیے کہ اس تاریکی میں ہارون کا ہاتھ آپ کے دستِ مبارک پر پڑ گیا تو آپ نے فرمایا۔
"کتنا نرم ہاتھ ہے کاش یہ دوزخ کی آگ سے محفوظ رہ سکے۔" اتنا فرمانے کے بعد آپ دوبارہ نماز میں مشغول ہو گئے۔ جیسے ہی آپ نے نماز مکمل کی تو ہارون الرشید نے دوبارہ عرض کیا کہ حضرت کچھ ارشاد فرمائیے ہم تو بڑی اُمیدیں لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں۔
اس پر آپ نے فرمایا "ہارون الرشید میری بات غور سے سُنو۔ تمہارے والد حضور اکرمؐ کے چچا تھے اور

جب انھوں نے حضورؐ سے استدعا کی کہ مجھے کسی مُلک کا حکمران بنا دیجیے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا کہ مَیں تمہیں تمہارے نفس کا حکمران بناتا ہوں کیونکہ دنیاوی حکومت تو روزِ محشر میں قیامت کے برابر ہو گی۔"

آپ کی یہ بات سُن کر ہارون الرشید غور و فکر میں ڈوبتے چلے گئے پھر قدرے توقف کے بعد بولے۔ "حضرت مزید کچھ ارشاد فرمائیں۔"

حضرت فضیل بن عیاض نے فرمایا کہ جب عمر بن عبدالعزیز کو سلطنت حاصل ہوئی تھی تو انھوں نے باشعور لوگوں کو اکٹھے کر کے فرمایا تھا' لوگو! میرے اُوپر ایک بھاری بوجھ لاد دیا گیا ہے جس سے نجات کا کوئی راستہ نہیں۔ ان لوگوں میں سے ایک نے مشورہ دیا تھا کہ آپ ہر ضعیف العُمر مومن کو اپنے باپ کے برابر درجہ دیں، ہر جوان کو اپنا بھائی اور بیٹا تصوّر کریں۔ اسی طرح ہر عورت کو ماں بہن اور بیٹی کے برابر سمجھیں اور رشتوں کے مطابق ان سے حُسنِ سلوک کریں۔

ہارون الرشید نے پھر گزارش کی کہ حضرت مزید کچھ ارشاد فرمائیں۔ آپ نے فرمایا" پوری ملتِ اسلامیہ کے افراد کو اپنی اولاد کے برابر سمجھو۔ بزرگوں پر مہربانی اور چھوٹوں سے بھائیوں کی طرح پیش آؤ۔" پھر فرمانے لگے۔" ہارون الرشید مجھے ڈر ہے کہ کہیں تمہاری حسین و جمیل صورت جہنم کی آگ کا ایندھن نہ بن جائے کیونکہ روزِ محشر بہت سی حسین صورتوں کو جہنم کی آگ جلا کر بھسم کر ڈالے گی۔ بہت سے رئیس، امراء قیدی بن کر رہ جائیں گے اس لیے تم کو محشر میں جواب دہی کے لیے ہمیشہ سے تیار رہنا چاہیے کیوں وہاں بطور مسلمان تم سے باز پُرس ہو گی۔ پس اگر تمہاری حکومت میں ایک غریب انسان بھی بھوکا پیاسا سو گیا تو حشر کے روز وہ تمہارا گریبان پکڑے گا۔"

کہتے ہیں کہ فضیل بن عیاض کی یہ باتیں سُن کر ہارون الرشید پر غشی کی کیفیت طاری ہو گئی۔ خوفِ خدا سے اُن کا رواں رواں کانپ اُٹھا۔ حتیٰ کہ ہارون الرشید کے ساتھ آئے ہوئے فضل برمکی کو یہ کہنا پڑا کہ حضرت بس کیجیے آپ کی باتوں نے تو ہارون الرشید کو نیم مُردہ ہی کر ڈالا ہے۔

تھوڑی دیر تک یہی کیفیت طاری رہی۔ ہارون الرشید ذرا سنبھلے تو انھوں نے پھر یہ دریافت فرمایا کہ آپ کسی کے مقروض تو نہیں ہیں۔

اس سوال کے جواب میں آپ نے فرمایا" مَیں اللہ کا قرض دار ہوں اور اس کی ادائیگی صرف اطاعت ہی سے ممکن ہو سکتی ہے لیکن یہ میرے بس میں نہیں ہے کیونکہ روزِ محشر میرے پاس کسی سوال کا جواب نہ ہو گا۔"

اس پر ہارون الرشید نے کہا" حضرت! میرا مقصد دنیاوی قرض سے تھا۔"

اس پر آپ نے فرمایا" خدائے بزرگ و برتر کی عطا کردہ نعمتیں ہی اس قدر زیادہ ہیں کہ مجھے کسی سے قرض لینے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔" اس کے باوجود ہارون الرشید نے حضرت فضیل بن عیاض کو ایک ہزار دینار کی تھیلی پیش کرتے ہوئے کہا کہ یہ رقم مجھے اپنی والدہ سے ورثے میں ملی اس لیے یہ قطعی طور پر حلال ہے۔

یہ سُن کر آپ انتہائی غضبناک ہوئے اور فرمانے لگے کہ صد حیف میری تمام نصیحتیں ضائع ہو کر رہ گئیں، کیونکہ میری ان تمام باتوں کا تم نے ذرا برابر اثر قبول نہیں کیا۔ کتنی عجیب بات ہے کہ مَیں تو تمہیں نیکی کی راہ پر چلنے کیلئے دعوتِ عمل دے رہا ہوں مگر تم بدستور مجھے ہلاکت میں جھونک دینا چاہتے ہو، کیونکہ جس مال کو ضرورت مندوں میں تقسیم کیا جانا چاہیے اُسے تم غیر ضرورت مند لوگوں میں تقسیم کرنے کے خواہش مند ہو۔

حضرت فضیل بن عیاض کی یہ ایمان افروز گفتگو سُن کر ہارون الرشید جب وہاں سے رُخصت ہوئے تو انھیں بے اختیار یہ کہنا پڑا کہ واقعی یہ صاحبِ کمال بزرگوں میں سے ہیں۔ اس کے بعد آپ سے زندگی میں کبھی ایسی کوتاہی سرزد نہ ہوئی جس کی تلقین حضرت فضیل نے انھیں فرمائی تھی۔

حضرت امام حنبل سے روایت ہے کہ مَیں نے خود اپنے کانوں سے آپ کو یہ کہتے ہوئے سُنا ہے کہ دنیا کی طلب کرنے والا ہمیشہ ذلیل و رسوا ہوتا ہے اور جب مَیں نے اپنے لیے کچھ نصیحت کرنے کے متعلق عرض کیا تو فرمانے لگے کہ مخدوم بننے کے بجائے ہمیشہ خادم بننے کی کوشش کرو کیونکہ خادم بننا ہی وجہ سعادت ہے۔ ایک مرتبہ بشر حافی نے آپ سے دریافت فرمایا کہ وہ کون شخص ہے جو زہد و رضا میں افضل و بالا ہے آپ نے فرمایا کہ رضا کو اس لیے فضیلت حاصل ہے کہ جو راضی برضا رہتا ہے وہ اپنی بساط اور حقیقت سے زیادہ طلب نہیں کرتا۔

آپ خوفِ الٰہی سے اکثر کانپ جایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی حافظِ قرآن نے آپ کے سامنے انتہائی خوش الحانی سے تلاوت کی۔ آپ نے اُسے ہدایت کی کہ میرے بچّے کے قریب جاکر تلاوت کرو مگر سورہ القارعہ ہرگز مت پڑھنا کیونکہ خشیتِ الٰہی کی وجہ سے وہ ذکرِ قیامت سننے کی استطاعت نہیں رکھتا مگر قاری نے اس کی پروا نہ کرتے ہوئے آپ کے بیٹے کے سامنے جاکر جب اسی آیت کی تلاوت کی تو وہ ایک چیخ مار کر اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے۔

خدائے بزرگ و برتر کی ذات کے سوا آپ کو دنیا میں اور کسی سے محبّت نہ تھی۔ آپ کسی دوسرے کو خدا کی محبّت کا شریک نہیں بنانا چاہتے تھے۔ مثلاً ایک روز پدرانہ جذبے سے مغلوب ہو کر اپنے لختِ جگر کو گود میں اُٹھا کر پیار کرنا شروع کر دیا۔ بچّے نے معصومیت سے سوال کیا۔

"بابا جان کیا آپ نے مجھے اللہ تعالیٰ سے بھی زیادہ محبوب رکھتے ہیں۔"

"یقیناً ایسا ہی ہے۔" آپ نے جواب دیا۔

"مگر ابّا جان آپ تو اللہ تعالیٰ کو بھی اپنا محبوب اور پیارا سمجھتے ہیں پھر بھلا ایک دل میں دو چیزوں کی محبوبیّت کیسے جمع ہو سکتی ہے۔"

بچّے کی یہ بات سنتے ہی آپ نے اُسے اپنی گود سے اُتار دیا اور اُسی وقت یادِ الٰہی میں مصروف ہو گئے۔ ایک مرتبہ آپ نے حضرت عبداللہ کو سامنے آتا ہوا دیکھ کر فرمایا کہ جس سمت سے آئے ہو اُدھر ہی واپس لوٹ جاؤ بصورتِ دیگر مجھے یہاں سے جانا ہو گا۔

حضرت عبداللہ بہت حیران ہوئے اور کہنے لگے عیاض مَیں آپ کا مطلب نہیں سمجھا آخر آپ بغیر کسی وجہ کے مجھے واپس کیوں بھیجنا چاہتے ہیں۔

حضرت فضیل نے کہا "مَیں جانتا ہوں کہ تم میرے پاس بیٹھ کر محض گپ شپ لگانے آئے ہو جب کہ مَیں اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ یادِ الٰہی میں گزار دینا چاہتا ہوں۔"

اسی طرح جب ایک اور شخص نے آپ کی صحبت میں بیٹھ کر محض آپ کی شیریں بیانی سے محظوظ ہونا چاہا تو آپ نے قسم کھا کر فرمایا کہ یہ بات میرے لیے بہت ہی وحشت انگیز ہے کیونکہ تمہاری آمد کا مقصد صرف اس قدر ہے کہ ہم دونوں جھوٹ اور فریب میں مبتلا رہیں لہٰذا بہتر ہے کہ تم فوراً یہاں سے چلتے بنو کیونکہ مَیں اپنے اور خدا کے درمیان کسی تیسرے کو ایک لمحے کے لیے حائل ہوتے نہیں دیکھنا چاہتا

آپ کے نزدیک خلوت نشینی سے مراد یہ تھی کہ جس میں کسی دوسرے کی صورت نظر آئے کیونکہ بقول ان کے بندگی ایسی ہی خلوت نشینی کا نام ہے۔ آپ اکثر کہا کرتے تھے کہ میں ایسے شخص کا بہت احسان مند ہوں جو نہ تو مجھے سلام کرے اور نہ ہی میری مزاج پرسی کے لیے آئے کیونکہ لوگوں کے میل ملاپ کی وجہ سے انسان نیکی سے بہت دور چلا جاتا ہے۔

صراطِ مستقیم پر چلنے سے پہلے جس دور میں قزاقی آپ کا پیشہ تھا۔ اس دوران بھی فضیل بن عیاض نے اپنی عبادت و ریاضت میں کبھی کوئی خلل نہیں آنے دیا تھا۔ اولیائے کرام کی تاریخ میں آپ کی شخصیت اس اعتبار سے منفرد ہے کہ آپ برائی سے نیکی کی طرف مائل ہوئے تھے مگر اس برائی کے دوران بھی کئی نیکو کاروں سے اچھے تھے۔

روایت ہے کہ ایک مرتبہ کوئی مالدار قافلہ سفر کو روانہ ہوا۔ قافلے میں شامل ایک شخص کے پاس بہت زیادہ دولت اور ہیرے جواہرات تھے چنانچہ اس نے لٹیروں کے خوف اور ڈر سے یہ سوچ کر کہ اگر رقم بچ جائے تو اچھا ہے اس رقم کو صحرا میں کسی جگہ دفن کرنے کا فیصلہ کیا۔ ابھی وہ شخص اپنی دولت دبانے کے لیے جگہ ہی تلاش کر رہا تھا کہ اچانک وہ اپنے قریب ہی ایک بزرگ (حضرت فضیل بن عیاض) کو مصلے بچھا کر تسبیح پڑھتے دیکھ کر قدرے مطمئن ہو گیا۔ اس نے اپنی رقم ان بزرگ کے پاس بطورِ امانت رکھ دی اور خود جب وہ دوبارہ قافلے میں پہنچا تو پورا قافلہ لٹیروں کی نذر ہو چکا تھا۔

چنانچہ وہ امیر شخص جب ان بزرگ سے اپنی امانت واپس لینے کے لیے پہنچا تو وہاں ایک عجیب غریب منظر دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس نے دیکھا کہ وہ بزرگ تمام لٹیروں کے درمیان بیٹھے مالِ غنیمت آپس میں تقسیم کر رہے ہیں۔

اب تو وہ امیر بہت سٹپٹایا اس نے دل میں سوچا میں کتنا احمق ہوں کہ اپنی دولت اس شخص کے پاس امانت رکھوا دی جو خود لٹیروں کا سردار ہے۔ مگر حضرت فضیل نے اسے اپنے قریب بلوا کر پوچھا کہ یہاں کیوں آئے ہو؟

اس نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا "اپنی رقم کی واپسی کے لیے حاضر ہوا تھا"

حضرت فضیل نے کہا کہ جس جگہ رکھ کر گئے تھے وہیں سے اٹھا لو۔ جب وہ شخص اپنی رقم واپس لے کر چلا گیا تو آپ کے ساتھیوں نے آپ سے پوچھا کہ یہ رقم باہمی تقسیم کرنے کے بجائے آپ نے واپس کیوں لوٹا دی۔

حضرت فضیل نے فرمایا "ساتھیو! اس نے مجھ پر اعتماد کیا تھا اور میں اس کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچا سکتا تھا۔ اس واقعہ کو ابھی چند روز ہی گزرے تھے کہ آپ کے ساتھی لٹیروں نے ایک دوسرے قافلے کو لوٹ لیا جس میں بہت مال و متاع ہاتھ آیا۔ اہلِ قافلہ میں سے کسی نے لٹیروں سے دریافت کیا کہ کیا تمہارا کوئی سرغنہ ہے۔

لٹیروں نے جواب دیا "ہمارا سردار تو یقیناً ہے لیکن اس وقت وہ دریا کے کنارے عبادت و ریاضت میں مصروف ہے۔ اس شخص نے کہا "یہ وقت تو کسی نماز کا نہیں ہے۔" راہزنوں نے کہا کہ وہ نوافل پڑھ رہا ہے۔ اس شخص نے پھر سوال کیا کہ جب تم لوگ کھانا کھاتے ہو تو کیا وہ تمہارے ساتھ مل کر کھانا کھاتا ہے؟ لٹیروں نے جواب دیا کہ ہمارا سردار دن میں روزہ رکھتا ہے۔ اس شخص نے پھر کہا کہ یہ تو رمضان کا

نہیں ہے۔

ڈاکوؤں نے کہا کہ وہ نفلی روزے رکھتا ہے۔ ڈاکوؤں کی زبانی اُن کے سردار کے بارے میں اس قسم کی باتیں سُن کر قافلے کا شخص بہت حیران ہوا اور وہ حضرت فضیل کے پاس جا کر عرض کرنے لگا کہ صوم و صلوٰۃ کے ساتھ رہزنی کا کیا تعلق ہے۔ آپ نے اُس شخص سے دریافت کیا" کیا تُو نے قرآن مجید پڑھا ہے۔ اُس شخص نے جب اثبات میں جواب دیا تو حضرت فضیل نے قرآن کی ایک آیت تلاوت فرمائی جس کا ترجمہ تھا۔

" یعنی دوسروں نے اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہوئے عملِ صالح کو اس کے ساتھ غلط ملط ملا دیا ہے۔"

آپ کی زبانی قرآنی آیات سُن کر وہ شخص محوِ حیرت رہ گیا۔

حضرت فضیل بن عیاض کے راہ راست پر آنے اور حق گوئی کو اختیار کرنے کا واقعہ بھی بڑا عجیب و غریب ہے۔ جس نے آپ کی پُوری زندگی کو بدل کر رکھ دیا۔ روایت ہے کہ ایک مرتبہ جنگل میں رات کے وقت کسی قافلے نے آکر پڑاؤ ڈالا۔ اس قافلے میں ایک شخص تلاوت کر رہا تھا جس کا ترجمہ تھا۔

" کیا ایمان والوں کے لیے وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے قلوب اللہ کے ذکر سے خوف زدہ ہو جائیں۔"

اس آیتِ قرآنی کا حضرت فضیل بن عیاض پر اس قدر اثر ہوا کہ جیسے کسی نے آپ کے دل میں کوئی نشتر اتار دیا ہو اور آپ نے انتہائی رقت آمیز لہجے میں خود سے کہا۔ فضیل آخر تم یہ غارت گری اور لوٹ مار کب تک جاری رکھو گے۔ اب وہ لمحہ آگیا ہے کہ تُو اللہ کے بتائے ہوئے سیدھے راستے پر چل پڑے۔"

کہتے ہیں کہ اس کے بعد آپ زار و قطار رونے لگے اور پوری یکسوئی کے ساتھ عبادت و ریاضت میں مصروف ہو گئے اور ایک ایسے ریگستان میں جا پہنچے جہاں ایک قافلہ پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ جب آپ پڑاؤ کے قریب پہنچے تو آپ کے کانوں میں قافلے میں شامل ایک شخص کی آواز پڑی وہ کہہ رہا تھا۔

" اس راستے میں فضیل ڈاکے ڈالتا ہے اس لیے ہمیں اب راستہ تبدیل کر دینا چاہیے۔"

فضیل بن عیاض یہ سنتے ہی اُس شخص کے سامنے چلے گئے اور فرمایا" لوگو! اب آپ بے فکر ہو جائیں کیونکہ مَیں نے راہزنی سے پکّی توبہ کر لی ہے۔ پھر آپ اُن تمام لوگوں سے معافی کے خواستگار ہوئے جو آپ کے ہاتھوں لُٹ چکے تھے۔ تمام لوگوں نے تو آپ کو معاف کر دیا مگر ایک یہودی نے آپ کو معافی دینے سے انکار کر دیا اور یہ شرط پیش کی کہ اگر تم سامنے والی پہاڑی کو یہاں سے ہٹا دو تو مَیں تمہیں معاف کر دونگا۔ یہودی کی شرط کو قبول کرتے ہوئے حضرت فضیل بن عیاض نے وہاں سے مٹی ہٹانا شروع کر دی حُسنِ اتفاق سے اُسی وقت ایسی تیز آندھی چلی کہ دیکھتے ہی دیکھتے پوری پہاڑی صفحہ ہستی سے غائب ہو گئی۔ چنانچہ یہ دیکھتے ہوئے یہودی نے آپ کو سچے دِل سے معاف کر دیا۔

یہودی نے عرض کیا کہ مَیں نے یہ تہیہ کر رکھا تھا کہ جب تک تم میرا لُوٹا ہوا مال واپس نہیں لوٹاؤ گے مَیں تمہیں معاف نہیں کروں گا۔ لہٰذا اس وقت میرے تکیہ کے نیچے اشرفیوں کی ایک تھیلی رکھی ہوئی ہے وہ آپ اُٹھا کر مجھے دے دیں تاکہ میری قسم کا کفارہ ہو جائے۔

چنانچہ آپ نے یہودی کے تکیے سے تھیلی اُٹھا کر اُس کے ہاتھ میں تھما دی۔ اس کے بعد یہودی نے مزید ایک شرط پیش کی۔ اُس نے کہا۔

" پہلے مجھے مسلمان کرو پھر مَیں تمہیں معاف کرونگا۔"

آپ نے کلمہ پڑھا کر یہودی کو مسلمان کر لیا۔

یہودی نے اسلام لانے کے بعد فضیل بن عیاض سے کہا "میرے مسلمان ہونے کی ایک وجہ یہ ہے کہ میں نے ایک مرتبہ تورات میں پڑھا تھا کہ اگر سچے دِل سے تائب ہونے والا خاک کو بھی چھو لے تو وہ کندن بن جاتی ہے لیکن مجھے اس بات کا یقین نہیں تھا اور آج جب کہ میری ہتھیلی میں مٹی بھری ہوئی تھی جب آپ نے اُس ہتھیلی کو اُٹھا کر میرے ہاتھ میں تھمایا تو وہ سونا بن گئی۔ اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ واقعی دینِ اسلام ایک سچا مذہب ہے۔ یہ کہہ کر وہ یہودی زار و قطار رونے لگا اور اُس نے خدا اور اُس کے رسول سے لو لگا لی۔ یوں فضیل بن عیاض نے سیدھے راستے پر آتے ہی سب سے پہلے ایک یہودی کو مسلمان کر کے اپنے ولی اللہ ہونے کا ثبوت فراہم کر دیا۔

آپ کے اقوال اور ارشادات سے راہِ حق سے بھٹکے ہوئے بے شمار بندگانِ خدا نے رہنمائی حاصل کی۔ دُنیا کی چیزوں سے پیار کرنے والوں کو آپ اپنے قریب بھی نہ پھٹکنے دیتے تھے۔

ایک مرتبہ آپ نے فرمایا "اگر دُنیا کی ہر لذّت اور آسائش میرے لیے جائز قرار دے دی جاتی تو بھی مَیں دُنیا سے اتنا ہی دُور اور بدظن رہتا اور اپنے آپ کی مذمت کرتا جتنا کہ لوگ حرام اور مُردہ شے کھا کر نادم ہوتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بُرائیوں کے مجموعے کو دُنیا کا نام دے دیا ہے اور دُنیا سے بری الذمہ ہونا اتنا ہی مُشکل ہے جتنا کہ اس دُنیا میں آنا آسان ہے۔

کسی ارادت مند نے آپ سے سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ کی محبت معراجِ کمال تک کس طرح پہنچتی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ جب انسان کے لیے دین اور دُنیا دونوں برابر ہو جائیں۔ ایک اور شخص نے آپ سے سوال کیا کہ اگر کوئی فرد اس خوف سے لبیک نہ کہتا ہو کہ جواب میں انکار ہو جائے گا تو اُس کے بارے میں آپ کیا رائے ہے؟ حضرت فضیل بن عیاض نے فرمایا کہ اس سے زیادہ بُلند المرتبت کوئی نہیں۔ پھر آپ نے فرمایا کہ عقل دین کی بُنیاد ہے جب کہ عقل کی بُنیاد علم اور علم کی بُنیاد صبر ہے۔

آپ نے ایک ایسے شخص سے جو آپ کی تعلیمات سے بہرہ ور ہونے آیا تھا۔ فرمایا کہ تین چیزوں کا حصول ناممکن ہے اس لیے کبھی بھی ان کی جستجو نہ کرو۔ اوّل ایسا عالم جو مکمل طور پر اپنے علم پر عمل پیرا ہو دوم ایسا عامل جس میں اخلاص بھی ہو اور سوم وہ بھائی جو ہر قسم کے عیوب سے پاک ہو کیونکہ جو فرد بھائی کا ظاہری دوست اور باطنی دُشمن ہو اس پر سدا خدا کی لعنت رہتی ہے اور اس کی سماعت و بصارت سلب کر لیے جانے کا خدشہ رہتا ہے۔

آپ ہمہ وقت اللہ تعالیٰ کا وِرد جاری رکھتے تھے اور عالمِ نزاع میں بھی آپ کی زبانِ مبارک پر اللہ تعالیٰ ہی کا نام تھا۔ حضرت فضیل بن عیاض کی تمام زندگی نیکی کی راہ سے بھٹکے ہوئے لوگوں کے لیے مشعلِ راہ ہے۔

حکمِ الٰہی

ایک شخص چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا جب کوتوال اس کو زدو کوب کرنے لگا تو اُس نے کوتوال سے مخاطب ہو کر کہا "اے سردار میں نے جو کچھ کیا وہ حکمِ الٰہی تھا۔" کوتوال نے کہا "جو کچھ میں تیرے ساتھ کرنا چاہتا ہوں وہ بھی حکمِ الٰہی ہے۔ اگر کوئی شخص کسی دُکان سے مولی چُرا لے تو تیرے کہنے کے مطابق اُس نے خدا کے حکم سے چُرائی اور جب اس کو ڈنڈے رسید کیے جائیں تو یہ بھی خدا کا حکم ہوگا۔

کہتے ہیں کہ ایک انگریز پادری کسی بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اُن کی خدمت میں بطورِ تحفہ ایک دُوربین پیش کی۔ بزرگ نے انگریز سے دریافت کیا کہ کیا چیز لائے ہو؟ انگریز نے کہا کہ اسے دُوربین کہتے ہیں جس میں دُور کی چیزیں نزدیک تر دکھائی دیتی ہیں۔

اللہ کے اس نیک اور صاحبِ کرامت بزرگ نے انگریز پادری کا بغور جائزہ لیا اور پھر فرمانے لگے۔ "دیکھو! سامنے والی پہاڑی کے پیچھے مجھے کچھ نظر آ رہا ہے کیا تمہیں بھی کچھ دکھائی دے رہا ہے؟"

انگریز پادری نے نفی میں جواب دیا۔

یہ سُن کر ان بزرگ کے ہونٹوں پر تبسم پھیل گیا اور فرمانے لگے "اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک ایسی نظر عطا فرمائی ہے کہ پہاڑی کے پیچھے کی ہر شے میں دیکھ سکتا ہوں۔"

پھر بزرگ نے پادری سے کہا "مجھے پہاڑی کے پیچھے ایک گائے اور اس کا بچھڑا فلاں رنگ میں نظر آ رہا ہے۔" اس کے ساتھ ہی بزرگ نے اپنے انگوٹھے اور شہادت کی اُنگلی سے ایک گول سا دائرہ بنایا اور پادری کو اس دائرے میں دیکھنے کے لیے کہا۔ پادری کی اُس وقت حیرت کی انتہا نہ رہی کہ جب اُسے دائرے میں گائے اور اُس کا بچھڑا دکھائی دیئے۔ یہ سارا منظر دیکھ کر انگریز پادری وطیرۂ حیرت میں ڈوب گیا اور بالآخر اپنا سا مُنہ لے کر واپس چلا گیا۔

یہ عظیم صاحبِ کرامت ہستی حضرت سیّد امیر علی المعروف حضرت جی صاحب کوٹھ شریف کی تھی۔ جن کی علمی، روحانی اور اخلاقی روشنی کی ضیاپاشیوں سے ایک زمانہ فیض یاب ہوا۔

سلطان اولیاء قطبِ دوراں حضرت سیّد امیر صاحب بن محمد سعید ۱۲۱۰ھ کو بمقام کوٹھ شریف آرائے عالم امکان ہوئے۔ افغانی معاشرے میں مروّجہ طریقِ تعلیم کے مطابق پہلے آپ نے قرآنِ کریم مکمل کیا بعد میں ۲۸ سال کی عمر میں علمِ فقہ کے علاوہ علومِ قواعدِ عربیہ، علومِ بلاغتہ اور علومِ عقول وغیرہ سے فیض یاب ہوئے

پھر آپ نے حضرت فضل حق صاحب نقش بندی پشاوری کے حلقہ ارادت میں علوم سلوک باطن میں کمال پیدا کیا۔ اس کے ساتھ ہی کچھ عرصہ بعد حضرت سید امیرؒ نے مولانا یار محمدؐ اخونزادہ کابلی سے بیعت کی اور اُن کی خصوصی توجہ سے تھوڑے ہی عرصہ میں مقاماتِ سلوک طے کر کے مسندِ خلافت سنبھالی۔

حضرت جی تحصیل کے زمانے میں ہی اخلاق اور سلوک کی کتابیں مثلاً عین العلم پڑھا کرتے تھے آپ اخلاقِ عظیمہ، خصائل کریمہ اور لباس زہد و تقوی سے سرفراز ہوئے۔

یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ خداوند قدوس جب اپنے کسی نیک بندے کو اپنے فضل و احسان سے ولایت کی خلعتِ فاخرہ اور کرامت کے رُتبہ عالیہ پر مشرف اور سرفراز فرماتا ہے تو اُس کی شان اور تعظیم و تکریم کی خاطر اُسے بعض خصائل اور کرامات سے نواز کر دوسرے لوگوں سے ممتاز اور افضل بنا دیتا ہے حضرت جی ایسی ہی کامل ہستیوں میں سے ایک تھے جن کی تعلیمات کی بدولت لوگ دین کی طرف راغب ہوئے اور عبادت و ریاضت کو اپنا شعار بنا لیا۔

حضرت جی کے والد محمدؐ سعید اور چچا محمدؐ قابل دونوں بھائی سلسلہ عالیہ قادریہ اور نقشبندیہ میں حضرت شیخ المشائخ جناب فضل احمد معصوم مجددی نقشبندی المعروف "حضرت جی صاحب پشاوری" کے خلیفہ تھے۔ حضرت سید امیر نے سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ میں دو بزرگوں سے بیعت کی اور خلعت و خلافت حاصل کی۔

حضرت سید امیر المعروف حضرت جی صاحب کوٹھہ شریف اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے التجا درخواست تمنا نہیں کرتے تھے۔ جب وہ اللہ تعالیٰ کی توجہ میں کمی محسوس کرتے تو اُن پر حالتِ قبض طاری ہو جاتی مگر جب اللہ کے لطف و جمال کا مشاہدہ کرتے تو عالمِ بسط سے ہمکنار ہو جاتے۔ یہ حالت ظہر اور شام کی نماز کے بعد غائب ہو جاتی۔ اُن کی اس کیفیت میں یہاں تک شدت آجاتی کہ مفروضہ نماز کے اوقات کی اطلاع دینے کے لیے ایک آدمی مقرر ہوتا تاکہ وقت داخل ہونے یا دیگر ضروری امورات کی اطلاع کے لیے حضرت صاحب کو مطلع کرے کیونکہ استغراق کی زیادتی کی وجہ سے یہ خوف ہوتا تھا کہ نماز کے اوقات یا دیگر ضروری امورات فوت نہ ہو جائیں اور کبھی کبھی جب استغراق کی حالت طویل ہو جاتی کوئی بھی یہ خیال نہ کرتا کہ اِس حالت سے ان کی واپسی ممکن ہو گی۔

استغراق کی کیفیت میں کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا کہ بعض موذی جانوروں اور زہریلے کیڑے مکوڑوں کی موجودگی کے باوجود حضرت جی کے بدن مبارک میں کسی قسم کی جنبش نہ ہوتی۔ ہرچند کہ یہ موذی کیڑے مکوڑے اُن کے جسم کو کاٹتے بھی تھے مگر چونکہ اُن کو کمالِ استغراق حاصل ہوتا تھا اس لیے اُن کے کاٹنے کا اثر اُن کی حرکت وغیرہ سے ظاہر نہ ہوتا تھا۔

حضرت جی ایک صاحب کرامات بزرگ تھے اُن کی کرامات نے ایک عالم کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ ہزارہ کی مشہور خود مختار ریاست تنول کے نواب فرید خان نمازِ جمعہ پڑھنے اکثر کوٹھہ گاؤں آتے تھے۔ ایک دن انگریزوں کا قاصد ضروری پیغام لے کر آیا۔ قاصد کو بتایا گیا کہ نواب صاحب نمازِ جمعہ پڑھنے کوٹھہ گئے ہیں، یہ سُن کر قاصد بھی کوٹھہ چلا گیا اور وہاں حضرت جی صاحب کی مسجد میں نواب صاحب کو پیغام کے ضروری کاغذات دیئے۔

نواب صاحب نے پیغام پڑھنے کے بعد اس کا جواب لکھ دیا اور پھر مُہر لگانے کے لیے اپنی قمیص کی جیب میں ہاتھ ڈالا مگر جیب میں مُہر نہ تھی۔ نواب صاحب پریشان ہوئے کہ اب کیا کیا جائے۔

اسی دوران حضرت سید امیر، نواب صاحب کی پریشانی بھانپ گئے اور اُن سے پوچھا کہ کیوں حیران و پریشان ہو؟ نواب صاحب نے تمام حالات بتا دیئے جسے سُن کر حضرت جی نے وہیں بیٹھے بیٹھے اپنا ہاتھ لمبا کیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد اپنا ہاتھ واپس لے آئے اور نواب صاحب کے ہاتھ میں مہر اور کچھ معمولی گیلی ریت تھما دی پھر اس کے ساتھ ہی فرمایا۔

"اب میری اور آپ کی مُریدی صرف مُہر تک محدود رہی۔" نواب صاحب فرماتے ہیں کہ جب حضرت جی صاحب نے اپنا ہاتھ سیدھا کر کے لمبا کیا تو اس وقت میرے کانوں میں دریائے سندھ کی موجوں کی آواز آ رہی تھی۔

حضرت جی کو مُرشدی کا رُتبہ اور مقام وراثت میں ملا تھا۔ جس وقت آپ ذکر کرنے والوں کے ساتھ ذکر میں مصروف ہو جاتے تو اِن کو ایسی لذّت اور محبّت حاصل ہوتی کہ نہ تو انھیں کسی دنیاوی لذّت کی پروا رہتی اور نہ ہی آخرت کی راحتوں اور نعمتوں کی آرزو ہوتی۔

جب حضرت جی کی زبان مبارک پر خدا کا ذکر ہوتا تو سامعین و حاضرین کے دلوں میں لطف و سوز اور لذّت و اثر پیدا ہو جاتا تھا۔ عبادت کے دوران آپ تمام دنیاوی لذّتوں اور نفسانی خواہشات سے کنارہ کش ہو کر توجہ الی اللہ میں مستغرق ہو جاتے تھے شاید اسی وجہ سے بسا اوقات اُن کی دُعا اتنی دراز ہو جایا کرتی تھی کہ ساتھ والوں کو ساتھ دینے کی طاقت باقی نہ رہتی تھی مگر آپ کے دل اور دیگر اعضاء میں ایک ایسی شورش اور ہیجان بپا ہوتا تھا جسے احاطۂ قلم میں نہیں لایا جا سکتا۔

ایک روز آپ کا ایک عقیدت مند حضرت جی کی قدم بوسی کے لیے کوٹھ شریف جا رہا تھا کہ اچانک راستے میں اُسے جَو کا ایک سبز خوشہ پڑا ہوا ملا۔ مُرید نے یہ خوشہ اُٹھا لیا اور ہاتھ سے مَل کر اُس کے دانے مُنہ میں ڈال لیے۔ اس کے بعد یہ مُرید حضرت جی صاحب کی قدم بوسی اور ملاقات سے مشرف ہوا مگر دوسرے روز ظہر کی نماز کے وقت جب حضرت صاحب مسجد مبارک کے ایک کمرے میں دیگر مُریدوں سے ملاقات فرما رہے تھے۔ تو اُس وقت مذکورہ مُرید بھی وہاں پر موجود تھا جس نے راستے سے جَو کا خوشہ اُٹھا کر کھا لیا تھا۔

حضرت صاحب نے تمام مُریدوں کو توجہ عنایت فرمانے کے بعد مذکورہ مُرید سے کہا کہ وہ تخلیہ میں اُس کے ساتھ چند باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ دوسرے حاضرین کمرے سے باہر آ گئے۔

پھر حضرت صاحب نے اس مُرید سے فرمایا "تمہارے باطن میں حرام کا اثر نظر آتا ہے مگر وہ سبز رنگ کا ہے۔" چونکہ مُرید کے ذہن سے جَو کے خوشے کا خیال نکل چکا تھا اس لیے اُس نے حضرت صاحب سے عرض کیا کہ اُسے کچھ علم نہیں کہ ایسا کیونکر ہوا مگر کافی سوچ بچار کے بعد جب مُرید کو خوشہ کھانے والی بات یاد آئی تو اُس نے حضرت جی سے سارا ماجرہ کہہ سُنایا۔

حضرت صاحب نے فرمایا کہ وہی جَو کا خوشہ رزقِ حرام کا باعث بنا ہے۔ مُرید یہ سُن کر بہت نادم ہوا اور آئندہ کے لیے وہ مالک کی اجازت کے بغیر کسی کی شے کو چھُونے سے بھی گریزاں رہا۔

حضرت سید امیر کی زندگی کا مشن ہی یہ تھا کہ حق کو بُلند کیا جائے اور باطل کو نیچا دکھایا جائے۔ آپ کہا کرتے تھے کہ اللہ کے دُشمنوں سے اس حد تک دُشمنی کرنی چاہیئے کہ وہ زیر ہو جائیں اور اللہ کے دوستوں کے ساتھ اس حد تک دوستی کی جائے کہ وہ سربلند ہو کر ترقی کے اُونچے مقامات تک پہنچ جائیں۔

حضرت سید امیر نے ایک مرتبہ فرمایا کہ انسان جو کچھ کہتا ہے اللہ تعالیٰ اُسے سُن لیتا ہے اس لیے زبان سے کوئی بے ہودہ اور ناگفتنی کی بات نہیں کرنی چاہیے، اسی طرح خداوند کی نازل کردہ کتاب اور کلامِ الٰہی کے علاوہ کوئی

دوسرا کلام نہیں سُننا چاہئے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے صرف اچھی چیزیں سُننے کے لیے ہی انسان کو قوّتِ سماعت عطا فرمائی ہے۔

ایک مرتبہ کوئی اہلِ خیر اور نیک سیرت آدمی حضرت جی کی مسجد میں اُن کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اُس کے ساتھ ایک دوسرا آدمی بھی تھا جو کہ اس شخص کے تابع تھا۔ وہ شخص جب ملاقات سے فارغ ہو گیا تو مسجد کے ایک کونے میں بیٹھ کر کام کاج میں مصروف ہو گیا۔ وہ ایک خوش نویس تھا اور کتابت اُس کا پیشہ تھا۔

اس شخص کے بارے میں معلوم یہ ہوا کہ وہ گوجرانوالہ کے موضع قلعہ میاں سنگھ کا رہنے والا ہے اور وہ اپنے چند علمی سوالات کا جواب حاصل کرنے کے لیے کئی مرتبہ سوات کے اخوند صاحب کے پاس گیا تھا مگر جب کوشش کے باوجود اس کی مشکلات کا حل اور مشکل مقامات کی گرہ کشائی نہ ہوئی تو وہ اس مقصد کے لیے حضرت سیّد امیر سے مُلاقات کے لیے آگیا۔

بعد میں معلوم ہوا کہ وہ شخص ایک عالم اور دانا ہے معاملہ فہمی اور فراست میں یکتا ہے اور ہر علم و فن پر کافی دسترس رکھتا ہے مگر حضرت سیّد امیر نے اُس پر کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی اور اُس شخص نے بھی کوئی خاص بات حضرت جی کے گوش گزار نہیں کی تھی۔

مگر ایک بات ضرور تھی کہ وہ شخص کبھی کبھی حضرت سیّد امیر کی مبارک مجلس میں آکر استماع کرتا اور کچھ سن کر دوبارہ اپنے مخصوص گوشے میں جا کر کتابت کرنے میں مشغول ہو جاتا۔

ایک روز حضرت سیّد امیر نے دُعا کرنے کے لیے جیسے ہی ہاتھ اُٹھائے تو اُن پر ایسی کیفیت طاری ہو گئی کہ وہ دُعا کو لمبی کرتے چلے گئے اور جب دُعا سے فارغ ہوئے تو اپنے ایک مُرید سے فرمانے لگے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے عظیم الشان فضل سے مجھے اس شخص کی بیماری کے بارے میں مطلع فرمایا ہے جو کئی دنوں سے مسجد میں ٹھہرا ہوا ہے اور جو کتابت کرتا ہے۔

مُرید نے پوچھا حضرت! اس کی بیماری کیا ہے تو آپ نے فرمایا۔

"کچھ عرصہ کے لیے اس شخص کو کسی بدعتی کے ساتھ رہنا پڑا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اُس نے کسی فاسق کی مدح کی ہے۔ اب اس کا علاج یہ ہے کہ وہ کسی صالح اور اہلِ سُنّت کی صحبت میں رہے اور کسی نیک آدمی کی مدح کرے۔"

مُرید نے یہ سُننے کے بعد حضرت سیّد امیر سے عرض کی کہ حضرت! اگر اجازت ہو تو مَیں مسجد میں مقیم اس خوشنویس کو آپ کی ہدایت کے بارے میں آگاہ کر دوں۔

حضرت سیّد امیر نے مُرید سے فرمایا" تمہارے کہنے سے اس کے دل میں وسوسہ اور شک پیدا ہو گا۔ اس لیے تم فی الحال اسے کچھ نہ کہو۔ اُسے وقتِ مقررہ پر مطلع کر دیا جائے گا۔

چنانچہ چند دن مزید گزر جانے کے بعد حضرت سیّد امیر نے مسجد میں مقیم اُس خوشنویس کو اپنے پاس بلوایا اور اُس سے فرمانے لگے۔" اے اللہ کے بندے! قدرت نے مجھے تمہاری بیماری اور اُس کے علاج کے بارے میں آگاہی فرمائی ہے اگر تمہاری اجازت ہو تو بیان کروں۔"

وہ شخص فوراً بولا" حضرت جی یہ تو میری انتہائی خوش نصیبی ہو گی۔ یہی تو میرے دِل کی مُراد ہے کہ آپ میری رہنمائی فرمائیں۔" چنانچہ سیّد امیر نے تمام ماجرا اُس خوشنویس سے کہہ سنایا جس پر وہ بے اختیار پُکار اُٹھا۔

"یا حضرت" آمنا و صدقنا" یعنی جو کچھ آپ نے فرمایا ہے وہ بالکل سچ ہے۔ جب مَیں طالبِ علم تھا تو ایک

لذت اور خوشبو ۔ دونوں کا مستقل ساتھ
SMC
فلیورنگ ایسنس
کھانوں اور مشروبات میں
خوشبو کا اعلیٰ ترین معیار
مشرق کا انداز ہو یا مغرب کا، نمکین کھانے ہوں یا میٹھے، انواع واقسام کے فرحت بخش
مشروبات ہوں یا خوش ذائقہ کنفکشنری ۔ لذت اور خوشبو دونوں کا مستقل ساتھ ہے۔
SMC فلیورنگ ایسنس، آپکے کھانوں، مشروبات اور کنفکشنری کے لئے اعلیٰ
ترین معیاری خوشبو فراہم کرکے انکی لذت میں بیش بہا اضافہ کرتے ہیں۔
انتخاب کیجئے:
کیوڑہ ۔ بریانی ۔ ونیلا ۔ صندل ۔ خس ۔ گلاب
رس بھری ۔ کیلا ۔ آم ۔ بادام ۔ سنگترہ
لیموں ۔ انناس
ORANGE
فلیورنگ ایسنس ۔ کھانوں میں خوشبو کا اعلیٰ معیار
بنانیوالے: اسٹینڈرڈ مینوفیکچرنگ کمپنی (پرائیویٹ) لمیٹڈ
۲ ۔ دیال سنگھ مینشن شاہراہ قائداعظم ۔ لاہور
SMC
Repcom
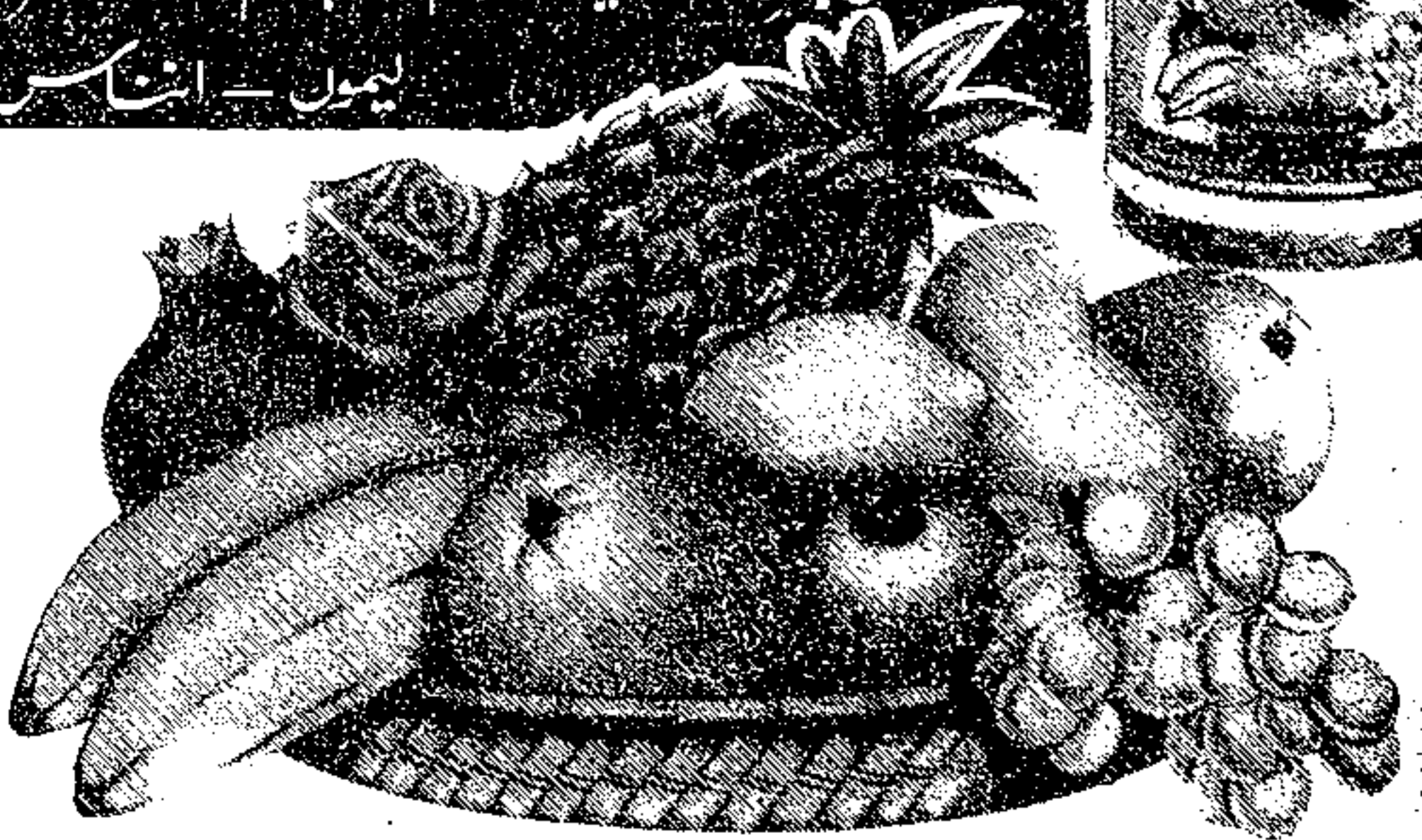
اُستاد مُلّا حاجی سے شرح پڑھا کرتا تھا مگر وہ رافضی تھا۔ میں ایک سال تک اُس کے پاس مقیم رہا۔ پھر دوسری بات یہ ہے کہ لاہور میں ایک حکیم آیا تھا جو انگریز کا نوکر تھا اور میں نے اُس کی مدح کی تھی۔ لہٰذا آپ کو قدرت نے میرے حالات کے بارے میں بالکل صحیح آگاہی فرمائی ہے۔ آپ واقعی ایک پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔"

یہ کہتے ہوئے اُس خوشنویس نے حضرت جی کے ہاتھ بیعت کر لی اور آپ ہی کی مدح سرائی کرنے لگا۔

حضرت سیّد امیر نے اسلام کی سربلندی کے لیے اپنی زندگی میں کئی مواقعوں پر انگریزوں اور ہندوؤں کے خلاف عملی جنگ میں حصہ لیا مثلاً وادیٔ پشاور میں مجاہدین کی لڑائیوں میں اٹک کے قلعہ پر مشہور تاریخی شب خوں کے واقعہ میں حضرت جی کے کئی مُریدوں اور چاہنے والوں کو بڑے بڑے کڑاہوں میں تیل گرم کر کے ڈالا گیا تھا۔

اسی طرح حضرت سیّد امیر المعروف حضرت جی صاحب کوٹھے کے مجاہدانہ کارناموں کا دوسرا دَور وہ ہے جب امیر دوست محمد خان والیٔ کابل نے سکھوں کے خلاف جنگیں لڑیں اور جن میں آخرکار ۱۸۳۷ء میں جمرود اور بنگال کے مقام پر سکھوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اس لڑائی میں حضرت سیّد امیر اپنے مُریدوں کے ہمراہ یوسف زئی کے فوجی لشکر میں شامل تھے اور انہی کی برکت سے مسلمانوں کو کامیابی حاصل ہوئی۔

سکھوں کے آخری حکمران سردار گلاب سنگھ کے عہد میں ۱۲۶۵ھ بمطابق ۱۸۴۹ء میں میجر جارج لارنس نے پشاور پر قبضہ کر لیا۔ اس دوران میجر نے حضرت جی سے بھی ملاقات کی۔ اُس کو یہ خوش فہمی تھی کہ جس طرح اور لوگوں کو لالچ یا دباؤ سے اُس نے قابو میں کیا ہے اسی طرح وہ حضرت جی کو بھی اپنی ہمنوائی پر آمادہ کرے گا مگر جلد ہی میجر لارنس کے ذہن میں یہ بات آگئی کہ اس مردِ مجاہد کو رام کرنا ناممکنات میں سے ہے۔

انہی دنوں اتفاق سے وہ خط انگریزوں کے ہاتھ لگ گیا جو انھوں نے کابل کے شاہ شجاع کو لکھا تھا جس میں انھیں یہ مشورہ دیا گیا تھا کہ وہ انگریزوں کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیں جہاں لوگ پہلے ہی انگریزی کی بیخ کنی کرنے کے لیے کیل کانٹے سے لیس کھڑے تھے۔

اب انگریزوں نے کسی نہ کسی بہانے سے حضرت جی صاحب کو پابندِ سلاسل کرنے کا مکارانہ منصوبہ بنایا اور اس سلسلے میں جب انھیں کوئی معقول جواز نہ ملا تو انھوں نے حضرت سیّد امیر کے خلاف ۱۸۵۲ء کے بعد وہابیت کے الزام میں مہم شروع کر دی جب کہ اس دوران حضرت جی صاحب کوٹھے سے ہجرت کر کے مہابن کے راستے ہوتے ہوئے بونیر میں باجکٹہ کے مقام پر قیام پذیر ہوئے۔ بونیر چملہ اوازئی اور گدون میں حضرت سیّد امیر کا بہت زیادہ روحانی اثر تھا۔

آخرکار انگریزوں کو جب حضرت سیّد امیر کی روحانی طاقت اور اثر و رسوخ سے زیادہ خطرہ لاحق ہوا تو انھوں نے ۱۲۷۷ھ کو بروز سوموار ۲۴ شوال کو حضرت جی صاحب کو گرفتار کر کے فوجی چھاؤنی میں پابندِ سلاسل کر دیا۔ مگر حضرت جی صاحب کی گرفتاری کے خلاف اُن کے مُریدوں، ارادت مندوں کے علاوہ لوگوں کا ایک مُنہ زور طوفان اُمڈ آیا۔ آپ کے ہزاروں جانثاروں نے انگریزوں کے خلاف عملی اقدام کا فیصلہ کر لیا اور آخرکار انگریز کو حضرت جی صاحب کے جانثاروں کے احتجاج کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پڑے اور سنگین صورتحال کے پیشِ نظر انگریزوں نے ۲۹ محرم الحرام ۱۲۷۸ھ کو حضرت سیّد امیر کو رہا کر دیا۔

حضرت سیّد امیر کی طرح اُن کی آل اولاد نے بھی مسلمانوں کے لیے عظیم تر مذہبی دینی اور درسی خدمات انجام دیں۔ اس وقت صوبہ سرحد میں اسلامیہ کالج کے نام سے علم و عرفان کی جو عظیم درسگاہ موجود ہے اُس کا سنگِ

حضرت سید امیر کے نواسے نواب صاحبزادہ عبدالقیوم نے ہی رکھا تھا۔ انھوں نے اسلامیہ کالج کے
بانی کی حیثیت سے اِس ادارے کے قیام اور اس کی ترقی کے لیے جو خدمات انجام دیں وہ ناقابلِ فراموش ہیں۔
نواب صاحبزادہ عبدالقیوم جب اس دنیا میں تشریف لائے تو آپ کے نانا حضرت سید امیر نے انھیں دیکھتے ہی
پیش گوئی کر دی تھی کہ انشاء اللہ اس بچے کا اقبال بہت بلند ہوگا۔
کہتے ہیں کہ حضرت جی صاحب کی بینائی آخری عمر میں بہت کم ہو چکی تھی۔ ایک مرتبہ آپ گاؤں سے باہر
ریف لے جا رہے تھے کہ راستے میں کھیلتے ہوئے بچوں میں سے آپ کا گزر ہوا ——— ایک مرید
تین چار سال کے ایک بچے کو ہاتھ سے پکڑ کر حضرت صاحب سے کہا کہ یہ بچہ آپ کا نواسہ ہے۔ اسی
ران مرید نے اپنی قمیص کے دامن سے اس بچے کی ناک صاف کی۔ حضرت جی صاحب کی نظرِ کرم اس پر پڑی
فرمانے لگے۔ "مجھے اس بچے کے ناک صاف کرنے سے نوابی کی بو آتی ہے اور کرنا خدا کا کیا ہوا کہ یہی بچہ آگے
کر نواب عبدالقیوم کہلایا۔
حضرت سید امیر کی تعلیمات اور اُن کے علوم و فکر کی بلندی اُن کے افکار اور نظریات سے نمایاں تھی۔ آپ
علم و فضل کے چرچے گاؤں گاؤں قریہ قریہ تھے۔
راوی بیان کرتا ہے "ایک مرتبہ میں نے حضرت جی صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر گزارش کی کہ حضور
اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک جگہ فرمایا ہے "یعنی سب سے پہلے میرا نور پیدا کیا گیا" جب کہ دوسری جگہ آپ
تے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے عقل کی تخلیق فرمائی" اسی طرح ایک اور حدیث میں ہے" اَوَّلُ مَا
قَ اللّٰہُ الْقَلَمَ "یعنی سب سے پہلے اللہ نے قلم کو خلعت وجود سے سرفراز کیا ہے۔"
راوی نے کہا "میں نے حضرت جی صاحب سے درخواست کی کہ میں ان احادیث میں تطابق چاہتا ہوں۔"
چنانچہ میرے اس سوال کے جواب میں حضرت سید امیرؒ نے ارشاد فرمایا کہ تینوں احادیث میں نور، عقل اور قلم
ہے اور اس سے مراد محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارک ہے اور نور، عقل و قلم کا اُس ذات
ارک پر تعبیر حالات و صفات کی وجہ سے ہے کیونکہ نور کا اطلاق تو آپؐ کی ذات مبارک پر اس لیے ہے
نور سے اشیا کا ظہور ہوتا ہے۔ پوشیدہ چیزیں اور چھپی اشیا اُس سے ظاہر و عیاں ہو جاتی ہیں اور حضور اکرمؐ
ذاتِ مبارک ایسی ہی ہے اسی طرح عقل کا اطلاق اُن کی ذات والا صفات پر اس وجہ سے ہے کہ عقل سے
اد صاحبِ عقل ہے کیونکہ عقل ایک صفت ہے اور صفت موصوف کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتی۔
پھر حضرت جی نے فرمایا کہ قلم کا اطلاق رسولِ اکرمؐ پر اس لیے کیا گیا ہے کہ قلم سے لکھائی کی جاتی ہے اور
ن سے حروف کی صورتیں اور نقوش حاصل ہوتے ہیں اور حضورؐ کی ذاتِ مبارک بھی اس قبیل سے ہے کیونکہ
ن کے ذریعے موجودات اور مخلوقات کی صورت بنائی گئی پس وہ حقیقت میں حضور اکرمؐ کی ذاتِ مبارک ہے۔
راوی کہتا ہے کہ حضرت جی صاحب نے ان تینوں احادیث کی تشریح اور تفصیل جس خوبی سے فرمائی اُس نے
رے ذہن کو علم و عرفان کے بیش بہا خزانے عطا کر دیئے۔

حضرت سید امیر نے ہمیشہ صبر کا راستہ اختیار کیا اور اپنے معاملات کو خدا کے سپرد کر دیا وہ اپنے تابعین کو
صبر و تحمل کا حکم دیتے تھے۔ آپ ہمیشہ اپنے ارادت مندوں اور خلقِ خدا کو سچ بولنے کی تلقین فرماتے۔ اُن کا کلام
حق اور باطل کے درمیان ایک فصل ہے۔ وہ اپنے کلام کو خدا کے پاک نام سے شروع کرتے اور اُسی کے نام پر
ختم کرتے تھے۔

حضرت سید امیر کا آخرت پر بہت پختہ یقین تھا۔ وہ عموماً لحد میں رکھے ہوئے مردہ کی طرح قبلہ رو لیٹتے حتیٰ کہ اپنا دایاں ہاتھ اپنے سر مبارک کے نیچے باوضو ہو کر رکھتے تھے۔ حضرت جی صاحب نے پاؤں کو کبھی دراز نہیں فرمایا۔ اگر کبھی آپ پر نیند کا زیادہ غلبہ ہوتا تو کبھی نیند کے لیے دراز نہ ہوتے تھے۔

ایک مرتبہ کسی مُرید نے آپ سے دریافت کیا "حضرت انسان کا بدترین دُشمن کون ہے؟" آپ نے فرمایا نفس انسان کا بدترین دُشمن ہے اور جہاں تک ہو سکے اس کو دبا کر رکھو۔

حضرت سید امیر نے ۱۲۹۴ ذی الحجہ کو اس دارِ فانی سے اُس عالمِ جاودانی کی طرف رحلت فرمائی۔ آپ کے وصال پر آپ کے مُریدوں عقیدت مندوں جن میں عورتیں مرد اور بچے بھی شامل تھے۔ زار و قطار رونا شروع کر آپ کا وصال شمالی مکان کے اُسی کمرے میں ہوا تھا جو اُن کی عبادت گاہ بھی تھا۔

حضرت سید امیر کی وفات کے وقت اُن کے بہت سے مُرید اور دوسرے لوگ اُن کے گرد بیٹھے تلاوت قرآن اور بعض کلمہ طیبہ کے ذکر میں مشغول تھے۔ جب دن ہوا تو لوگوں نے اشراق کی نماز ادا کی اور حضرت صاحب کی میّت کو کمرہ سے نکال کر شائقین کے دیدار کی خاطر صحن میں رکھ دیا۔ اُن کا چہرہ مبارک عام دید کے لیے کھلا چھوڑ دیا گیا۔

جب آپ آخری سفر پر جا رہے تھے تو راستے میں مکانوں کی چھتوں کے اُوپر اور دیواروں پر پردہ دار عو بھی آپ کا آخری دیدار کرنے والوں میں شامل تھیں۔ حضرت سید امیر کے مزار کی جگہ کے بارے میں آپ صاحبزادے محمد اسرائیل اور گاؤں کے لوگوں کے درمیان اختلاف واقع ہوا۔ گاؤں کے لوگ کہتے تھے کہ حضر صاحب کی قبر مبارک اسی ٹیلہ کے اُوپر بنائی جائے جو اس شہر کے شمال میں واقع ہے اور جس کو بُرج کہتے اور جہاں پر حضرت صاحب کے ایک بیٹے سید عبدالوہاب کا بھی مزار ہے جب کہ محمد اسرائیل صاحب کہتا تھا کہ حضرت صاحب کو اِسی حُجرۂ مبارک میں جو کہ زندگی میں اُن کی عبادت گاہ تھی وہیں پر سپردِ خاک کیا جائے تاکہ لوگ ہر نماز کے بعد دُعا کیا کریں۔

حضرت سید امیر ایک مرتبہ خود بھی فرما چکے تھے کہ ٹیلہ کی چوٹی اچھی اور مبارک جگہ ہے۔ چنانچہ اِسی بنا پر آ کو مسجد کے ساتھ والی جگہ میں دفنانے پر اتفاق رائے ہوا اور آپ کے حجرہ کے سامنے ہی آپ کی قبر مبار تیار کی گئی جہاں سے آج بھی ہزاروں عقیدت مند فیوض و برکات کی جھولیاں بھر بھر کے جاتے ہیں۔

حضرت داؤد طائی کے پاس ایک لونڈی تھی۔ جو آپ کی خدمت کیا کرتی تھی۔ ایک دن اس نے حضرت سے عرض کی کہ اگر آپ اجازت دیں تو آج تھوڑا سا گوشت پکا لوں۔ آپ نے فرمایا "ہاں پکا لے"۔ اُس نے خوب سنوار کر گوشت پکایا۔ جب اُس نے گوشت آپ کے سامنے رکھا تو آپ نے پوچھا "یتیموں کا کیا حال ہے؟" لونڈی نے کہا "بے چارے پہلے کی طرح خستہ حال ہیں"۔ چنانچہ آپ نے لونڈی کو ہدایت کی کہ وہ یہ گوشت یتیموں کو کھلا آئے کیونکہ یتیموں کا کھایا ہوا عرش پر پہنچے گا اور میرا کھایا ہوا خاک میں مل جائے گا۔

یہ داستان بنی سعد قبیلے کے ایک عظیم فرزند کی ہے جو صاحب جمال بھی تھا اور صاحب کمال بھی جس نے عشق حقیقی کی خاطر خاردار راہوں پر چلنا اپنا مقصدِ حیات بنا لیا تھا۔ جنہوں نے دنیاوی خواہشات اور آرزوؤں سے مُنہ موڑ کر فقر اور درویشی کی راہ اختیار کر لی تھی۔ یہ مردِ جلیل عالم فاضل اور روحانی پیشوا ہونے کے ساتھ ساتھ شاعرانہ ذوق بھی رکھتے تھے۔ انھوں نے ایک ولی ہونے کے باوجود دوسرے اولیائے کرام کی تفسیر اور شرح کو لکھنا اپنے لیے باعث سعادت سمجھا اور بالآخر اپنے ان نیک اعمال سے ایک روز اپنی منزلِ مقصود کو پا لیا۔

جب عرب کی معاشی، معاشرتی اور تمدنی زندگی میں اُتار چڑھاؤ آیا تو آپ کا خاندان فکرِ معاش کی تلاش میں مصر چلا گیا۔ اِسی خاندان میں ایک عالم فاضل شخص بھی تھا جس کے علوم دینی نے ہر طرف دُھوم مچا دی۔ حتیٰ کہ مصر کے بڑے بڑے عالم فاضل بھی اُس سے مشورے لینے کے لیے حاضر ہوا کرتے تھے۔ اِسی عالم فاضل کے ہاں ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام عمر رکھا گیا۔ جس کی عادات و خصائل بچپن ہی میں درویشانہ تھے۔ وہ بہت کم دودھ پیتا تھا۔ اور بہت کم سوتا تھا۔ اُس نے عام بچوں کی طرح دودھ کے لیے کبھی چیخ و پکار نہیں کی تھی۔ اسی دوران والدین پر انکشاف ہوا کہ یہ بچہ اکثر روزے سے رہتا ہے۔ اسی بات پر اُسے سارے گاؤں میں شہرت حاصل ہو گئی۔

شاید اسی لیے والدین نے بھی اپنے بیٹے کی تربیت پر خصوصی توجہ مرکوز کی۔ چونکہ والد کا نام فارض تھا اس لیے بچے کو ابن الفارض کے نام سے مخاطب کیا جانے لگا۔

ابن الفارض کے بارے میں بہت سے درویشوں اور نجومیوں نے بھی پیشن گوئی کر دی تھی کہ یہ بچہ بڑا ہو کر روحانی اور دینی علوم میں بڑا نام کمائے گا اور اس کے آثار بہت جلد نمایاں ہونا شروع ہو گئے تھے۔ آپ جب شعور کو پہنچے تو وہ درویشوں اور قلندروں کی مجالس میں جا کر بیٹھتے،

ان کی باتیں سنتے اور حافظے میں محفوظ کر لیتے۔ ان باتوں پر خود بھی غور کرتے اور خود ہی کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کرتے۔
ماں کا انتقال ہو گیا اور یہ اپنے والد کے ساتھ تنہا رہ گئے۔ باپ کو ان سے بڑی محبت تھی۔ یہ باپ کو چھوڑ کے بزرگوں کی صحبت میں جاتے تو فارض کو بڑی کوفت ہوتی اور وہ پریشانی میں ادھر ادھر چکر لگانے لگتے۔ جب بیٹا آجاتا تو پوچھتے "عمر! تم کہاں چلے گئے تھے، میں تو پریشان ہو گیا تھا۔"

عمر جواب دیتے "باواجان! یہاں بغداد سے ایک بزرگ آئے ہوئے ہیں، میں اُن کے پاس چلا گیا تھا۔"

فارض نے انھیں سمجھانا چاہا "بیٹے عمر! میں یہ کبھی بھی نہیں کہوں گا کہ تم بزرگوں سے نہ ملو، مگر میں یہ بھی نہیں چاہوں گا کہ تم بزرگوں کے پاس روز جاؤ اور بیٹے! تم یہ بھی یاد رکھا کرو کہ اب میں اکیلا رہ گیا ہوں اور مجھے تمھاری ضرورت رہتی ہے۔"

آپ نے جواب دیا "محترم پدر بزرگوار! میں بزرگوں کے پاس خود نہیں جاتا بلکہ مجھے بلایا جاتا ہے۔ مجھے آواز دی جاتی ہے، اور میں کھنچا چلا جاتا ہوں۔ آپ اگر مجھ کو گھر میں روکنا چاہتے ہیں تو روک دیا کریں، آپ کو بھی کسی اتنی ہی طاقتور کشش سے کام لینا پڑے گا جتنی کشش سے مجھے بزرگ اپنے پاس بلا لیا کرتے ہیں اور میں بے اختیار کھنچا چلا جاتا ہوں۔"

والد نے مایوسی سے کہا "بیٹے، میں وہ کشش کہاں سے لاؤں گا۔"

عمر نے جواب دیا "باواجان! آپ یقین کریں میں بے بس ہو جاتا ہوں۔ مجھے معلوم نہیں کیا ہو جاتا ہے۔"

باپ نے اپنے دل کی بات کی "بیٹے عمر! تو جس خاندان سے تعلق رکھتا ہے وہ عرب کا ایک معزز خاندان ہے۔ اس خاندان کا علم و فضل مشہور رہے۔ میں نے تجھ سے بڑی اُمیدیں وابستہ کر رکھی ہیں، میں چاہتا ہوں تو بھی مصر کے نامی گرامی علما کی صفوں میں اپنی جگہ بنائے مگر جب یہ محسوس کرتا ہوں کہ تو دنیا کے لائق ہی نہیں تو مایوس ہو جاتا ہوں اور دل کی عجیب سی حالت ہونے لگتی ہے۔"

عمر نے باپ کی باتیں بڑی توجہ سے سنیں اور کچھ سوچ کر جواب دیا "باواجان! آپ خواہش کی بات کرتے ہیں، خواہشیں کس کی پوری ہوئی ہیں جو آپ کی پوری ہوں گی۔ میری کچھ خواہش ہے اور آپ کی کچھ، بات کس طرح بنے گی؟ آپ نے تو دنیا کو بہت قریب سے اور ایک عرصے سے مسلسل دیکھا ہے، آپ کو دنیا نے کیا دیا؟ اور اگر میں کوشش کر کے علما کی صف میں بیٹھ بھی گیا تو وہاں سے مجھے ملے گا کیا؟ شاید، ندامتیں اور پشیمانیاں۔ اس کے سوا دنیا کے پاس ہے ہی کیا جو یہ کسی کو دے گی۔ میں دنیا سے یہ چیزیں نہیں لینا چاہتا۔ دنیا میرا پیچھا کرے گی اور میں اس سے بھاگتا رہوں گا۔ دنیا میری جھولی میں ندامتیں اور پشیمانیاں ڈالنے کی کوشش کرے گی اور میں یہ چیزیں دنیا کی جھولی میں ڈال دوں گا۔"

باپ نے بیٹے کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور کہا "میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ میں تیرے معاملات اور معمولات میں دخل نہیں دوں گا۔ میں شرمندہ ہوں کہ میں نے تجھ سے کس قسم کی باتیں شروع کر دیں۔ میرا کیا ہے، میں اپنی زندگی گزار چکا، اب تجھ کو اپنی زندگی گزارنا ہے جس طرح مناسب سمجھو گزارو، میں خاموش رہوں گا۔"

بیٹے نے باپ کو نظر بھر کے دیکھا اور آہستہ سے کہا "آپ نے یہ جو کچھ کہا، کیا آپ اس پر ہمیشہ قائم رہیں گے؟"

باپ نے جواب دیا "کیوں نہیں، کیا تجھ کو شبہ ہے؟"

عمر نے کہا "مجھے شبہ نہیں ہے، آپ نے جو کچھ کہا ہے شاید آپ نے اس کے مفہوم کی وسعتوں پر غور نہیں کیا؟"

باپ نے جواب دیا "بیٹے! میں نے جو کچھ کہا ہے اس کے معانی اور مطالب کے پھیلاؤ پر غور کر کے کہا ہے۔ تو یقین کر، اور اللہ نے چاہا تو اس کا تجربہ بھی تجھے ہو جائے گا۔"

عمر نے عرض کیا "تب پھر آپ سے میں ایک درخواست کروں گا، حالانکہ آپ نے مجھے جو اجازت دی ہے اس میں درخواست کی نہیں مطلع کرنے کی ضرورت تھی مگر میں اس کے باوجود آپ سے درخواست کروں گا۔"

باپ نے کہا "اس لمبی تمہید کی کوئی ضرورت ہی نہیں۔ تجھ کو جو کچھ کہنا ہے کہہ ڈال۔"

عمر نے کہا "باواجان! میں نے جو راہ اختیار کی ہے اس میں سیر و سیاحت کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ میں اپنے سفر کا آغاز سیر و سیاحت سے کرنا چاہتا ہوں۔"

باپ کے دل پر چوٹ سی لگی۔ وہ خاموش ہو گئے اور کچھ دیر بعد آہستہ سے پوچھا "تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ اب تو مجھ سے بچھڑ جائے گا۔"

عمر نے جواب دیا "جی ہاں باواجان۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ مجھے بے حد چاہتے ہیں، آپ مجھ سے بڑی محبت کرتے

ہیں مگر میں جس راستے پر چل پڑا ہوں اُس میں یہ ناگزیر ہے۔ اس لیے میں نے اپنی سیر و سیاحت میں ذرا سی لچک بھی رکھی ہے، اس لچک سے آپ کو زیادہ پریشانی نہیں اُٹھانا پڑے گی۔"

باپ نے تر آنکھوں سے بیٹے کی طرف دیکھا، پوچھا "یعنی، وہ کس طرح؟"

عمر نے جواب دیا "میں سیر و سیاحت کے لیے آس پاس چلا جایا کروں گا۔ صبح جاؤں گا اور رات کو واپس آجایا کروں گا۔ اس طرح آپ مجھے روزانہ ہی دیکھ لیا کریں گے اور آپ کو زیادہ پریشانی نہیں ہوگی۔"

باپ نے عمر دہ آواز میں کہا: "وہ تو ٹھیک ہے، لیکن پھر بھی یہ تشویش رہے گی کہ تو معلوم نہیں کہاں چلا گیا اور کس حد تک خیریت سے ہے، جب تک تو واپس نہیں آئے گا میں مستقلاً اذیت میں رہا کروں گا۔"

باپ کی بات بھی درُست تھی یہ اُن کا اندیشہ، اُن کا خدشہ بے جا نہیں تھا، باپ نے عمر کو لاجواب کر دیا تھا، ذرا سوچ بچار کے بعد جواب دیا "باواجان! جب میں رات کو واپس آجایا کروں گا تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ میں کہیں دور نہیں جاتا اور جب دور نہیں جاؤں گا تو خطرہ بھی کم ہی رہے گا اور خطرے کی کمی کا احساس آپ کو زیادہ پریشان نہیں کرے گا۔"

باپ نے کہا "بیٹے عمر! بات صرف اتنی سی ہے کہ تو بیٹا ہے اور میں باپ ہوں، باپ کے احساسات کا تو اندازہ نہیں کر سکتا۔ بہرحال میری طرف سے تجھ کو اجازت ہے لیکن حسب وعدہ ہر روز رات کو تیری واپسی ضروری اور لازمی ہوگی۔"

عمر نے اُٹھ کے باپ کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور شکریہ ادا کرتے ہوئے عرض کیا "باواجان! میری دعا ہے کہ اللہ آپ جیسا باپ ہر کسی کو عطا فرمائے۔ آج میں بے حد خوش ہوں۔ آپ نے میری مشکل آسان کر دی ورنہ میں کہیں کا نہ رہتا۔"

عمر نے دوسرے دن علی الصباح جنگل کا رخ کیا۔ یہ جنگل ذرا فاصلے پر تھا اور یہاں سے جو قافلے گزر کے شہر میں داخل ہوتے تھے وہ اس جنگل کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے تھے۔ قافلے والوں کا تجربہ تھا کہ جنگل نہ صرف یہ کہ لٹیروں کی پناہ گاہ تھا بلکہ اس کے جنوبی حصے میں درندے بھی رہتے تھے اور کبھی کبھار ان درندوں نے مسافروں پر حملہ بھی کیا تھا۔ عمر نے اپنے لیے اسی جنگل کو پسند کیا تھا۔ انھوں نے اپنے لیے جنگل کے اس حصے کو پسند کیا تھا جو قافلوں کی رہ گزر میں نہیں تھا۔ یہاں گھنے درختوں پر پرندوں کی چہکار اور پروں کی پھڑپھڑاہٹ نے عمر کو بہت متاثر کیا۔ یہ ان آوازوں میں کھو گئے۔ سبزے کی خاص مہک اور پتوں کی ......سرسراہٹ نے عمر کو بہت مسرور کیا۔ وہ یہ بھی بھول گئے کہ یہاں درندے بھی ہوتے ہیں۔ انھوں نے ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر آنکھیں بند کر لیں اور اللہ سے لو لگا کر باتیں شروع کر دیں: "اے اللہ العالمین! میں تیرا عاجز و کمزور بندہ ہوں اور تیرے لیے گھر سے نکل کر یہاں تک آچکا ہوں، مجھے نہیں معلوم کہ اب کیا ہوگا؟ لیکن میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ تو طالبانِ حق کو مایوس نہیں کرتا۔ میں تیری تلاش میں نکلا ہوں اس لیے مجھے یقین ہے کہ تو مجھ کو مایوس نہیں کرے گا!"

یہ دیر تک یوں ہی گڑگڑاتے رہے اور اس میں اتنے منہمک اور مستغرق ہوئے کہ اپنے آس پاس کا ہوش ہی نہ رہا۔

شام کو جب اندھیرا ہونے لگا تو تاریکی کے احساس نے انھیں جنگل سے باہر نکلنے پر مجبور کر دیا۔ راستہ لمبا تھا اور یہ تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے گھر کی طرف جا رہے تھے۔ راستے میں جو بھی شناسا ملا انھیں مخاطب کیا مگر یہ تو اس کو دیکھ ہی سکے اور نہ اُس کی آواز سن سکے۔ وہ انھیں سنکی سمجھ کر مسکرا دیے۔

گھر پہنچتے پہنچتے رات ہو گئی۔ انھوں نے جیسے ہی دروازے پر ہاتھ رکھ کے اس کو دبایا وہ کھل گیا، دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔ یہ جیسے ہی اندر داخل ہوئے دیکھا اندر چراغ کی مدھم روشنی میں فارمز ان کا انتظار کر رہے ہیں۔ بیٹے پر جیسے ہی نظر پڑی، بولے "تو آگیا۔ میں دیر سے تیرا انتظار کر رہا ہوں۔"

عمر نے جواب دیا: "باواجان! سچ بتائیں کہ میں اپنے وعدے کے مطابق آگیا یا نہیں؟"

باپ نے سوگوار لہجے میں کہا "بیٹے عمر! تجھ کو میری اذیتوں کا علم نہیں ورنہ ایسی بات نہ کرتا!"

عمر نے جواب دیا: "باواجان! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، اگر مجھے آپ کی اذیتوں کا اندازہ نہ ہوتا تو میں یہاں یعنی گھر واپس نہ آتا!"

باپ نے بیٹے کو کھانا کھلایا اور پوچھا: "آج تو کہاں چلا گیا تھا؟"

عمر نے اُس جنگل کا ذکر کیا۔

فارمز خوف سے اُچھل پڑے۔ پھر سوال کیا "تو اُس جنگل کی بات کر رہا ہے نا جدھر سے قافلے بہت کم گزرتے ہیں؟"

عمر نے جواب دیا: "گھر میں کیا کروں؟ آپ ہی بتائیں میں کیا کروں؟ یہاں سے قریب تو بس وہی جنگل ہے۔"

باپ پر سناٹا سا طاری ہوگیا۔ وہ کچھ دیر تو جیسے اپنے ہوش و حواس ہی میں نہیں رہے۔ آخر سرد آہ بھر کے بولے: "اس جنگل میں وقت گزار کے واپس آجانا کمال کی بات ہے۔ وہاں سے کوئی تن تنہا آدمی واپس بھی آسکتا ہے، میں تو سوچ بھی نہیں سکتا۔"

اب فارض کو اپنے بیٹے کی عظمت اور بزرگی کا کچھ کچھ یقین ہو چلا تھا۔

عمر نے رات کا کچھ حصہ سکون سے گزارا اور پھر جنگل کی طرف روانہ ہو گئے۔ فارض اپنے بستر پر سوئے ہوئے تھے۔ فجر کی اذان سے ذرا پہلے بیدار ہوئے تو بیٹے کا خیال آیا۔ سوچا نماز کے لیے جگا دیا جائے مگر پھر یہ سوچ کر خاموش رہے کہ سو رہا ہے تو سونے ہی دیا جائے۔ فجر کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد وہ تلاوت کلام پاک میں مشغول ہو گئے۔ تلاوت سے فارغ ہونے کے بعد جب وہ اُٹھے تو دن کی روشنی نے ہر چیز کو صاف اور واضح کر دیا تھا۔ آپ نے اس روشنی میں عمر کے بستر کا جائزہ لیا تو وہ خالی نظر آیا۔ دل دھک سے رہ گیا۔ بستر کے قریب گئے، اُسے غور سے دیکھا تو بستر کی سلوٹوں سے اندازہ ہوا کہ اس پر سونے والے نے شاید ایک ہی کروٹ میں پوری رات گزار دی تھی۔ اس پر بیٹھ کر ٹٹول کر دیکھا، وہ بالکل سرد ہو رہا تھا، جس کا یہ مطلب تھا کہ اس پر سونے والا کب کا اُٹھ چکا تھا۔

دوسری طرف عمر نے پھر اسی جنگل کا رُخ کیا تھا۔ چلتے چلتے انھیں طویل فاصلے کا اس وقت احساس ہوا جب دن کی روشنی نے راستے کی ہر شے کو واضح کر دیا تھا۔ وہ جنگل میں داخل ہو گئے۔ یہاں بالکل سناٹا نہیں تھا۔ پرندوں کے شور نے پورے جنگل کا سکون برباد کر دیا تھا۔ گاہ بگاہ اس شور میں کسی درندے کی گھن گرج بھی شامل ہو جاتی اور ان کے بڑھتے ہوئے قدم رکنے لگتے لیکن اس دوران کوئی ان کے کانوں میں کہتا: "اے عمر! تو بھی اسی اللہ کا بندہ ہے جس نے درندوں کو پیدا کیا، پھر یہ خوف کیوں اور کس سے؟ تو اپنے خدا کو اس کا جواب کیا دے گا؟"

اِس آواز نے درندوں کا خوف بھی دل سے نکال دیا۔ عمر نے وہیں دوسرا ٹھکانا بھی پیدا کر لیا اور اللہ کی یاد میں محو ہو گئے۔ اس محویت میں جب ذرا ہوش آتا تو وہ اپنے دل کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتے۔ وہ یہ جاننے کی کوشش کرتے کہ دل میں کوئی تبدیلی آئی۔ دل میں جذب و کیف کیوں نہیں پیدا ہوا؟

اس عمل میں مہینے گزار دیے لیکن دل میں ایسی کوئی کیفیت نہیں پیدا ہوئی جس سے وہ کسی خوش فہمی میں مبتلا ہوتے۔ باپ کا وہی عالم تھا۔ وہ فجر کی نماز کے لیے اٹھتے تو وہ اس سے پہلے ہی جا چکے ہوتے، رات کو واپس آتے تو باپ چراغ کی روشنی میں بیٹے کی شکل دیکھ کر خوش ہو لیتے اور اس دیدار ہی کو غنیمت سمجھتے۔

ایک رات جب وہ گھر واپس آئے تو باپ نے اُن کو ملول اور افسردہ محسوس کیا۔ پوچھا: "بیٹے عمر! کیا بات ہے؟ تو چپ چپ کیوں ہے آخر؟"

عمر نے جواب دیا: "کچھ نہیں، کوئی خاص بات نہیں۔"

باپ نے اصرار کیا: "خاص بات کیوں نہیں؟ کوئی بات ہے ضرور۔ اس کو مجھ سے کیوں چھپا رہا ہے؟"

عمر نے کوئی جواب نہ دیا۔

باپ کی نظریں اپنے بیٹے کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ بیٹا اپنے باپ کے بے پایاں تجسس سے لاعلم تھا۔

کچھ دیر بعد باپ نے پھر وہی سوال کیا: "عمر! کیا بات ہے؟ تو جواب کیوں نہیں دیتا؟"

عمر نے ایک بار پھر ٹالنے کی کوشش کی: "کس سوال کا جواب؟"

باپ نے کہا: "میں تجھ کو مسلسل افسردہ اور ملول دیکھ رہا ہوں۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ ایسا کیوں ہے؟"

عمر نے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہا، صاف صاف بتا دیا: "ابا جان! آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ میں کتنے عرصے سے سیر و سیاحت میں مشغول ہوں؟"

باپ نے جواب دیا: "شاید سال ہونے کو آیا، پھر؟"

عمر نے کہا: "ابھی تک میں اس سوز اس کیفیت سے محروم ہوں جس کی تمنا میں آرزو دے کر سیر و سیاحت کو نکلا تھا۔ بتائیے میں کیا کروں؟"

باپ نے جواب دیا: "بیٹے عمر! تو کیسی نادانی کی باتیں کر رہا ہے؟ جس سوز اور کیفیت کی تو بات کر رہا ہے، وہ سال بھر

ریاضت سے کہاں ملتی ہے۔ اس کی طلب میں تو اللہ کے بندے اپنی زندگیاں گزار دیتے ہیں۔ تو اپنی کوشش جاری رکھ اور
نتائج کو اللہ پر چھوڑ دے۔ اللہ کسی کی محنت کو رائیگاں نہیں جانے دیتا۔ ویسے میں ایک بات تو اس وقت بھی کہہ سکتا ہوں۔"
عمر نے دریافت کیا "کون سی بات؟"
باپ نے جواب دیا "یہ بات کہ اللہ تجھ سے راضی ہے، خوش ہے اور تو جو کچھ کر رہا ہے، وہ بے کار نہیں جا رہا۔"
عمر پر کپکپی طاری ہو گئی، پوچھا "اتنی بڑی بات آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں؟"
باپ نے جواب دیا "اس طرح کہ اللہ اگر تجھ سے راضی نہ ہوتا تو آج تو زندہ نہ ہوتا، کسی درندے کا لقمۂ تر بن چکا ہوتا۔"
عمر نے اپنی کوششوں کے اس پہلو پر تو غور ہی نہیں کیا تھا۔
والد صاحب رُک رُک کر کہہ رہے تھے "اس جنگل سے کبھی کبھار تنہا گزرنے والا بھی زندہ نہیں بچا اور تو وہاں ہر روز ہی
آتا جاتا رہتا ہے یہ کرامت ہے ایک قسم کی یا اس سے زیادہ میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"
فارح کی بات میں وزن تھا، سچائی تھی، گہرائی ہی گہرائی تھی۔ عمر کو جھرجھری سی آ گئی، ایک نشہ سا ان کے وجود میں گردش
کرنے لگا۔ آہستہ سے اپنے باپ سے کہا "آپ نے بجا فرمایا پدرِ بزرگوار۔ میں نے اس طرح تو کبھی سوچا بھی نہ تھا۔"
اب عمر نے اپنے منصوبے میں ذرا سی تبدیلی کر دی۔ ان کے والد ان کی رات گئے آمد کے عادی ہو چکے تھے اس لیے انھوں نے
اپنے معمولات میں فرق پیدا کر دیا اور دو دو تین تین دن تک غائب رہنا شروع کر دیا۔ اب وہ اس جنگل سے بھی دور نکل جاتے تھے۔ ان
کے والد کو اس عمل سے کچھ عرصہ بڑی اذیت رہی۔ جب عمر کئی دن بعد اپنے گھر میں داخل ہوتے تو اپنے باپ کو بہت پریشان دیکھتے۔
اسی طرح کئی دن بعد جب وہ اپنے گھر میں رات گئے داخل ہوئے تو دیکھا کہ ان کے والد دروازے کے پاس بیٹھے سو رہے ہیں اور
چراغ ان کے بائیں طرف طاق میں روشن ہے۔ شاید وہ کئی دن سے سو نہیں سکے تھے اور اس وقت وہ نیند کے ہاتھوں بے بس
اور مغلوب ہو چکے تھے۔ انھوں نے دروازے کو کھلا رکھا تھا تاکہ عمر جب واپس آئیں تو انھیں اندر آنے میں زحمت نہ
اٹھانا پڑے۔

عمر نے اندر داخل ہوتے ہی اپنے باپ کو آواز دی "بابا جان میں آ گیا۔"
باپ نے آنکھیں کھول دیں "بیٹے عمر! کیا تو آ گیا؟ کیا سچ مچ، واقعی!"
عمر نے اپنے باپ کے دونوں ہاتھ پکڑ کے آنکھوں سے لگا لیے اور انھیں بوسہ دیا "آپ دیکھیں تو سہی۔"
باپ نے انھیں کھانا دیا۔ وہ بہت بھوکے تھے۔ عمر کھانا کھاتے رہے اور فارح دیکھتے رہے، آخر میں فارح نے کہا "میرا خیال ہے آج کل تو
کچھ زیادہ ہی پریشان ہے؟"
عمر نے جواب دیا "جب کوئی کسی کی تلاش میں نکلتا ہے تو پریشانی تو ہوتی ہی ہے۔"
باپ نے انھیں آنے والے خطرے سے آگاہ کیا "بیٹے! اب میں خود کو چراغِ سحری محسوس کر رہا ہوں، زندگی کا چراغ
تیز ہواؤں کی زد میں ہے اس لیے تو میرے پاس ہی رہ۔"
عمر نے باپ کی بات مان لی اور واقعی کچھ دنوں بعد ہی یہ چراغ گُل ہو گیا۔ عمر کو بڑا دکھ ہوا لیکن رونے کو وہ مشیتِ ایزدی
کی خلاف ورزی سمجھتے تھے اس لیے خاموش رہے اور اس صدمے کو بخیر و خوبی جھیل گئے۔
اب وہ بالکل آزاد تھے۔ انھوں نے خود کو سلوک و طریقت کی طرف متوجہ کر دیا اور جب کچھ عرصہ گزار کے بھی اُن پر کوئی
چیز منکشف نہیں ہوئی تو اُن پر لمحۂ فکریہ کی ابتدا ہو گئی۔ وہ سوچتے کہ "آخر ایسا کیوں ہے؟ ان کی محنت رائیگاں کیوں جا رہی ہے ان
کی کوششیں بے اثر کیوں ہیں؟ آخر انتہائی سوچ بچار کے بعد انھوں نے فیصلہ کیا کہ کسی مدرسے میں داخل ہو جانا چاہیے۔ اس فیصلے
کے ساتھ ہی انھوں نے شہر کے ایک مدرسے کا رُخ کیا۔ مدرسے کے دروازے پر انھوں نے ایک ریڑھی پر سبزیاں رکھی دیکھیں۔
ریڑھی تو موجود تھی لیکن سبزی والا کہیں نظر نہیں آتا تھا۔ پھر اچانک اُن کی نظر ایک بوڑھے پر پڑی جو مدرسے کے باہر وضو کر رہا تھا۔
آپ نے اندازہ لگایا کہ ہو نہ ہو یہی سبزی فروش ہے۔ آپ اُس کے پیچھے کھڑے ہو گئے اور وضو کے اختتام کا انتظار کرنے لگے لیکن
اس دوران وضو کی ترتیب اور تقدیم و تاخیر پر غور کیا تو اس میں بڑی بے ترتیبی اور غیر شرعی انداز دیکھا۔ مسح پہلے، کلّیاں بعد میں،
پاؤں دھو لیے اور پھر منہ دھونا شروع کر دیا۔ ان بڑے میاں سے ذرا دور مدرسے کے اساتذہ وضو کر رہے تھے۔ انھوں نے سوچا،
کیسا شخص ہے کہ اساتذہ کے قریب اور اُن کے سامنے غلط سلط وضو کر رہا ہے اور کوئی اسے ٹوکتا تک نہیں۔

عمر ابھی یہ سوچ ہی رہے تھے کہ اُس سبزی فروش نے اُن کی طرف دیکھا اور کہا "اے عمر! تم یہاں مصر میں اپنا وقت کیوں ضائع کر رہے ہو۔ یہاں تم پر کشود کار نہیں ہوگا۔ تم مکہ اور سرزمینِ حجاز کیوں نہیں جاتے۔ فتح کا وقت قریب ہے۔ وہاں جاؤ کامیاب ہو جاؤ گے۔"

آپ کو اُس بوڑھے سبزی فروش کے صاحب کشف و باطن ہونے کا شبہ نہیں رہا یقین ہو گیا کہ یہ شخص پہنچا ہوا ہے اور وضع میں شرعی ہے تو بھی کا مقصد غالباً اخفائے حال تھا۔ عمر اُن کے سامنے بیٹھ گئے اور عرض کیا "سیدی! میں نے آپ کے بارے میں جو کچھ سوچا اُس پر شرمندہ ہوں۔ آپ نے جو کچھ فرمایا، درست لیکن کہاں میں اور کہاں مکہ معظمہ۔ یہ حج کا زمانہ بھی نہیں کہ میں کسی قافلے میں شامل ہو کر سرزمین حجاز میں داخل ہو جاؤں۔ اس کے علاوہ میں تنہا ہوں اور میرے پاس سفر خرچ بھی نہیں۔"

بوڑھے سبزی فروش نے کہا "اچھا نماز پڑھ، پھر تو مکہ بھی پہنچ جائے گا۔"

انھوں نے نماز ادا کی اور اُنھی بڑے میاں کا ساتھ اختیار کیا۔

عشاء کی نماز کے بعد انھوں نے سو جانے کی ہدایت کی۔ عمر نے دریافت کیا "اتنی جلدی؟"

بڑے میاں نے جواب دیا "ہاں، اتنی جلدی۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اُس پر عمل کر۔"

عمر آنکھیں بند کر کے لیٹ گئے۔ بڑے میاں کہنے لگے "تو مدرسے آیا تھا۔ یہاں سے تجھ کو کیا ملتا؟"

عمر نے پوچھا "آپ کی ریڑھی کہاں ہے، سبزی والی؟"

بڑے میاں نے جواب دیا "یہیں مدرسے میں ایک طرف کھڑی کر دیتا ہوں، صبح پھر نکل جاؤں گا۔"

عمر سونے کی کوشش کرتے رہے یہاں تک کہ اُن کی آنکھ لگ گئی۔ خوابیدگی میں انھوں نے محسوس کیا کہ بڑے میاں ان سے کہہ رہے ہیں: "عمر! سامنے دیکھ، وہ رہا مکہ معظمہ۔ اب تجھے فکر مند نہیں ہونا چاہیے۔"

یہ اُٹھ کر بیٹھ گئے اور ان کی حیرت کی انتہا نہیں رہی، جب انھوں نے مکے کو واقعی اپنے سامنے پایا۔

انھوں نے اپنے آس پاس بڑے میاں کو تلاش کیا، اُن کا کہیں پتا نہ تھا۔ یہ اُٹھے اور مکے کی گلیوں میں گھومنے پھرنے لگے۔

اب انھوں نے اپنے اندر تبدیلیاں محسوس کیں۔ مشکلیں آسان ہونے لگیں اور دل میں کشودگی پیدا ہو گئی۔

یہاں بھی انھیں جنگل کی فکر ہوئی اور اِدھر اُدھر گھوم پھر کے سیاحت کا مشغلہ اختیار کیا۔ یہ چلتے چلتے ایک ایسے جنگل میں داخل ہو گئے جہاں درندے رہتے تھے۔ قریب کی آبادی والوں نے جب انھیں تنہا جنگل کی طرف جاتے دیکھا تو متنبہ کیا "اے نوجوان! کہاں اس جنگل میں مت جانا، یہاں ایک آدم خور شیر رہتا ہے۔"

انھوں نے جواب دیا "بھائیو! میں اُسی کے بھروسے پر جنگل جا رہا ہوں جس نے شیر کو بھی پیدا کیا ہے، اگر درندہ مجھ سے شکم سیر ہونا چاہے گا تو مجھے بڑی خوشی ہوگی اور میں مطمئن رہوں گا کہ میں نے کسی کی بھوک مٹا دی۔"

لوگوں نے انھیں خبطی، جنونی اور پاگل سمجھ کر خاموشی اختیار کر لی۔ آپ جنگل میں داخل ہو گئے۔ یہاں بہت سکون تھا۔ یہ آنکھیں بند کر کے اللہ کو یاد کرنے لگے۔

رات جنگل میں گزاری اور فجر سے پہلے یہ سوچنے لگے کہ اب میں مکہ معظمہ کس طرح پہنچوں، انھیں فجر کی نماز حرم شریف ہی میں ادا کرنا تھی۔ یہ جنگل سے نکلے اور ایک راہ گیر سے پوچھا "بھائی! میں حرم شریف میں فجر کی نماز ادا کرنا چاہتا ہوں۔ بتایئے میں کدھر سے جاؤں کہ جلد از جلد حرم شریف تک پہنچ جاؤں۔"

راہ گیر نے اوپر سے نیچے تک انھیں حیرت سے دیکھ کر پوچھا "بھائی! تم اپنے حواسوں میں تو ہو؟"

انھوں نے جواب دیا "میں اپنے ہوش و حواس میں ہی ہوں کیا میں تمھیں دیوانہ لگ رہا ہوں؟"

راہ گیر نے کہا "بیشک تم دیوانے ہو۔ حرم شریف یہاں سے دس بارہ روز کی مسافت پر ہے اور تم وہاں فجر کی نماز پڑھنے کا خواب دیکھ رہے ہو۔ کیا یہ پاگل پن نہیں ہے؟"

انھیں بڑی حیرت ہوئی اور پہلی بار یہ بات اُن کے علم میں آئی کہ وہ حرم شریف سے بہت دور ہو گئے ہیں۔ یہ راستے کے کنارے بیٹھ کر رونے لگے۔ انھیں حرم شریف سے دوری نے بہت آزردہ کر دیا تھا۔

پھر دیر بعد انھیں اپنے پاس کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ آنکھیں کھولیں اور اُس طرف دیکھا تو کچھ عجیب سی حالت ہو گئی۔

خطرناک شیر اُن کے پاس کھڑا تھا۔ انھوں نے لمحہ بھر کے لیے سوچا کہ اگر شیر بھوکا ہے تو انھیں خوش ہونا چاہیے کہ وہ اللہ کی مخلوق کے کام آنے والے ہیں۔

شیر اُن کے سامنے بیٹھ گیا اور مبہم سے اشارے کرنے لگا۔ انھوں نے پوچھا: "کیا بات ہے؟"

شیر نے گردن ہلا ہلا کے اشارے کیے۔ وہ اپنی پیٹھ پر بیٹھ جانے کے اشارے کر رہا تھا۔ آپ اللہ کا نام لے کر اُس کی پُشت پر سوار ہو گئے۔ شیر اُسی وقت انھیں لے کر ایک طرف دوڑنے لگا۔ انھوں نے شیر کے بال پکڑ لیے۔ جھٹکوں کی وجہ سے اُن کی آنکھیں بند ہونے لگیں، کچھ دیر بعد شیر رُک گیا اور یہ دیکھ کر آپ حیرت زدہ رہ گئے کہ وہ حرم شریف کے سامنے پہنچ چکا تھا۔ آپ کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ ایسا لگا جیسے وہ خواب دیکھ رہے ہوں۔

انھوں نے حرم شریف میں نمازِ فجر ادا کی اور باہر نکل کر سوچنے لگے کہ اب اُن کا اُس جنگل تک پہنچنا بہت مشکل ہے، شیر چلا گیا ہو گا لیکن انھوں نے دیکھا، شیر کتے کی طرح دُم ہلاتا اُن کی طرف آ رہا ہے۔ وہ پھر اونٹ کی طرح بیٹھ گیا اور یہ اُس پر سوار ہو گئے۔ وہ انھیں لے کر جنگل کی طرف روانہ ہو گیا۔ ان پر نیم خوابیدگی کی کیفیت طاری ہو گئی اور جب ہوشیار ہوئے تو خود کو جنگل کے سامنے دیکھا، شیر انھیں چھوڑ کر چلا گیا۔ آبادی والوں نے یہ منظر دیکھا تو سہم گئے اور ان کے پاس جانے میں دقت محسوس کرنے لگے۔

ایک نے پوچھا: "حضرت! آپ کون ہیں؟ آدمی یا جن؟"

آپ نے جواب دیا: "میں آدمی ہوں، بالکل تمھاری طرح۔"

اُس شخص نے کہا: "اگر آپ آدمی ہیں تو عجیب و غریب آدمی ہیں۔ ویسے ہم نے کسی آدمی کو شیر کی سواری کرتے نہیں دیکھا۔"

آپ نے جواب دیا: "تم نے تو بہت کچھ نہیں دیکھا۔ جب کسی انسان کے ساتھ خدا کا فضل و کرم ہوتا ہے تو بڑی نادر چیزیں دیکھنے میں آجاتی ہیں۔"

اس واقعے کے بعد شیر آپ کے پاس پالتو کتے کی طرح رہنے لگا۔ وہ ہر روز اسی طرح آپ کو حرم شریف تک لے جاتا اور واپس لاتا۔ چہ میگوئیاں بڑھنے لگیں۔ آپ لوگوں میں شیر سوار کہے جانے لگے۔ آپ نے اسی حال میں کئی سال گزار دیے۔

ایک دن آپ حرم شریف سے واپس آ کے جیسے ہی جنگل میں داخل ہوئے ایک طرف سے آواز آئی: "عمر! میرے پاس آؤ۔ میں تمھارا انتظار کر رہا ہوں۔"

انھوں نے اِدھر اُدھر دیکھا، کوئی نظر نہ آیا۔ آخر اس آواز کو اپنا واہمہ سمجھ کے نظر انداز کر دیا۔

اچانک پھر وہی آواز سنائی دی: "عمر! کیا تم نے میری آواز نہیں سُنی؟ میرے پاس پہنچو، میں جاں بلب ہوں اور تمھارا انتظار کر رہا ہوں۔"

اب آپ نے اس آواز کو پہچان لیا تھا، یہ اُسی بوڑھے سبزی فروش کی آواز تھی جسے وہ مصر میں چھوڑ آئے تھے اور جس کے طفیل آپ حرم شریف تک پہنچے تھے۔

انھوں نے پوچھا: "آپ کہاں سے بول رہے ہیں، آپ تو دکھائی بھی نہیں دے رہے، پھر میں آپ کے پاس کس طرح پہنچوں؟"

ان سوالوں کے جواب کے لیے وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ انھیں فوراً ہی جواب مل گیا: "صاحبزادے! یہ اِدھر اُدھر کیا دیکھ رہے ہو تم۔ اس وقت میں مکّہ یا سرزمین حجاز میں نہیں، قاہرہ میں ہوں۔ تمھیں قاہرہ آنا ہو گا۔"

آپ جنگل سے نکل کر عام شاہراہ پر آ گئے۔ دیکھا، یہاں شیر اُن کا انتظار کر رہا ہے۔

آپ نے اُس کی پُشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا: "تو نے میرا بڑا ساتھ دیا۔ میں تیرا کس زبان سے شکریہ ادا کروں۔"

شیر اونٹ کی طرح بیٹھ گیا اور اپنی پشت پر بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔
آپ نے کہا۔" لیکن اس وقت مجھے مصر قاہرہ کا سفر درپیش ہے تو مجھے کس طرح وہاں پہنچائے گا؟"
شیر اپنی جگہ بیٹھا رہا اور دُم ہلاتا رہا۔ اُس کی یہی خواہش تھی کہ عمر اس کی پشت پر بیٹھ جائیں۔
دوسری طرف سے ایک بار پھر سبزی فروش بڑے میاں کی آواز سنائی دی۔" کیا کرتے ہو، جلدی کرو۔ یہ میرا آخری وقت ہے اور میں تمھارا انتظار کر رہا ہوں۔ اس وقت تمھیں جو سواری بھی ملے آجاؤ، دیر نہ کرو۔"
آپ حسب معمول شیر کی پشت پر سوار ہو گئے اور شیر اسی طرح بھاگ کھڑا ہوا۔ آپ پر غنودگی طاری ہو گئی اور جب ہوش میں آئے تو دیکھا قاہرہ میں اسی سبزی فروش بوڑھے کے سامنے پہنچ چکے ہیں، وہاں لوگوں نے آپ کو شیر پر سوار آتے دیکھا تو خوف سے اِدھر اُدھر بھاگ گئے۔
آپ نے بڑے میاں کو سلام کیا اور پوچھا۔" اب آپ کا کیا حال ہے؟"
بڑے میاں نے جواب دیا۔" حال کیا پوچھتے ہو، اچھا نہیں ہے۔ میں تمھارا انتظار کر رہا تھا تم میرے پاس ہی رہو۔"
آپ نے شیر کی طرف دیکھا اور بڑے میاں سے پوچھا۔" اس کا کیا کروں؟ اس نے میرا بہت ساتھ دیا ہے۔"
بڑے میاں نے شیر سے کہا۔" اب تو یہاں کیا کر رہا ہے؟ جا آرام کر۔ جب ضرورت ہو گی تجھ کو بُلا لیا جائے گا۔"
شیر نے تشکر آمیز انداز میں دیکھا اور ایک طرف روانہ ہو گیا۔
اُس کے جانے کے بعد بڑے میاں نے کہا۔" اب تم آرام کرو۔ میں تمھارے لیے پریشان تھا۔"
عمر بڑے میاں کے پاس ٹھہر گئے۔ دوسرے دن انھیں قاہرہ کے بازار بھیج دیا گیا اور کہا۔" جاؤ، آج گھوم پھر لو، پھر اس کا وقت نہیں ملے گا۔"
یہ قاہرہ کے ایک بازار سے گزر کے بزرگانِ دین کے مزاروں پر چلے گئے۔ وہاں سے جب واپس ہوئے تو بازار میں ایک شخص کو اِدھر اُدھر بھاگتے دیکھا۔ لڑکے، نوجوان اور بعض بوڑھے اُس کو ستا رہے تھے۔ اُس کا مذاق اُڑا رہے تھے۔ کسی نے آواز بلند کر کہا۔" اس کو پتھر مارو، پاگل ہے۔"
لڑکوں نے اُس پر پتھر برسائے تو عمر نے انھیں روکنے کی کوشش کی۔" یہ کیا کرتے ہو، اس غریب کو کیوں ستا رہے ہو؟"
ایک نوجوان نے آپ کو غور سے دیکھا اور اپنے ساتھیوں سے کہا۔" مجھے تو یہ بھی پاگل ہی لگتا ہے۔"
آپ نے دیکھا لڑکے اور دوسرے نوجوان ان کی طرف دوڑ پڑے۔ آپ نے غصے میں کہا۔" واللہ میں پاگل نہیں ہوں، اگر تم نے میرے ساتھ کوئی ناشائستہ حرکت کی تو پچھتاؤ گے۔"
اُس نوجوان نے کہا۔" تب پھر تم اپنا راستہ لو، اور اس دیوانے سے دُور رہو۔"
آپ نے اس مخبوط [illegible] شخص کو دیکھا وہ برہنہ پا تھا اور اس کے چہرے کا بہت بُرا حال تھا، لوگوں نے مُکے اور جھانپڑ مار مار کے اُس کا مُنہ سُجا دیا تھا۔ ایک نوجوان نے اس مخبوط الحواس شخص سے پوچھا۔" روٹی کھاؤ گے؟"
اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دوسرے نے کہا۔" پوچھتے کیا ہو، مجھے تو پاگل۔۔۔ یہ پاگل بہت بھوکا نظر آتا ہے، اس کو پیٹ بھر کے کھلاؤ۔ اس سے کچھ پوچھو نہیں۔"
ایک شخص نے آگے بڑھ کے اُس کے گال پر تھپڑ رسید کر دیا اور پوچھا۔" کہو کچھ مزہ آیا؟"
دوسرے نے پشت پر مُکا مارا اور ہنستے ہوئے پوچھا۔" کہو اس میں زیادہ مزہ ہے یا تھپڑ میں؟"
ایک عمر رسیدہ شخص نے اس مخبوط الحواس سے پوچھا۔" آخر تم بھاگ کیوں نہیں جاتے؟"
آپ نے ایک بار پھر لڑکوں اور نوجوانوں کو سمجھانے کی کوشش کی۔" لوگو! خدا کے لیے باز آجاؤ، اس کی بددعا سے ڈرو۔"
ایک لڑکا قہقہہ مار کے ہنس دیا۔" یہ ہمیں بددعا دے گا! واللہ تمھارا بھی جواب نہیں۔ تم بھی بددعا دے کر دیکھ لو۔ ویسے اگر دعاؤں سے لوگ مرنے لگتے تو آج دنیا کا ایک انسان بھی زندہ نہ ہوتا۔"
آپ نے مخبوط الحواس آدمی سے کہا۔" تو ہی یہاں سے چلا جا۔"
اُس دیوانے نے آپ کی طرف دیکھا اور کہا۔" تو کیوں پریشان ہے۔ میں تو اپنے رب کا قانع بندہ ہوں۔"
آپ کو یکایک خیال آیا کہ سبزی فروش بڑے میاں کا حال ٹھیک نہیں ہے اس لیے بازار میں اس طرح وقت گنوانا درست

ہیں۔ انھوں نے مخبوط الحواس شخص سے کہا "بھائی تو جان اور تیرے یہ فرزانے جانیں ہمیں تو چلا۔"
مخبوط الحواس نے جواب دیا "اچھا تو چل۔ میں بھی تیرے پاس پہنچنے والا ہوں، تجھ سے ضرور ملوں گا۔"
آپ اُس کو اُس کے حال پر چھوڑ کر بڑے میاں کے پاس پہنچے۔ اس وقت اُن کی حالت بہت خراب ہو رہی تھی۔ آپ نے بڑے میاں سے پوچھا "اب آپ کا کیا حال ہے؟ خیریت تو ہے؟"
بڑے میاں نے جواب دیا "یوں تو خیریت سے ہوں لیکن وہ لمحہ زیادہ دُور نہیں جب میں آزاد ہو جاؤں گا۔"
اس کے بعد انھوں نے ایک چھوٹے سے صندوقچے سے چند دینار نکالے اور ان کے حوالے کرتے ہوئے کہا "عمر! ان دیناروں کو میری تجہیز و تکفین اور تدفین پر خرچ کرنا اور خیال کرنا جو لوگ میری میت اٹھائیں گے، ایک ایک دینار کے وہ بھی حصے دار ہوں گے۔"
عمر نے محسوس کیا کہ بڑے میاں کی زبان لڑکھڑا رہی ہے پھر اُٹھ کے پیشانی جو ٹٹولی تو وہ پسینے سے تر ہو رہی تھی۔ پوچھا "اب آپ کا کیا حال ہے؟"
بڑے میاں نے جواب دیا "اُس کا حال کیا پوچھتے ہو، جو ایک پُل پر کھڑا ہو، جس کے ایک طرف زندگی ہو اور دوسری طرف موت۔ میرے پاؤں لڑکھڑا رہے ہیں اور میں کسی بھی لمحے ملک عدم کی راہ لوں گا۔"
عمر نے دیکھا کہ جملہ جیسے ہی پورا ہوا، اُن کی گردن ایک طرف کو ڈھلک گئی۔
آپ پریشان ہو گئے اور خود سے کہنے لگے "یہ تو بڑی مشکل ہو گئی۔ مجھے کچھ پتا نہیں کہ انھیں کہاں دفن کیا جائے گا۔"
اچانک بڑے میاں میں حرکت ہوئی۔ انھوں نے کہا "ابھی میں زندہ ہوں، جب میں مر جاؤں تو تم میری میت فراقہ نامی مقام پر لے جانا۔ وہاں دائیں طرف کے ایک گوشے میں میرا تابوت رکھ کے انتظار کرنا کہ وہاں کون آتا ہے اور اللہ تعالیٰ کیا کرتا ہے۔"
بڑے میاں کا انتقال ہو گیا۔ آپ نے ان کی تجہیز و تکفین کی اور میت کو فراقہ کی تجویز کردہ جگہ پہنچا دیا۔ اب آپ اُس شخص کا انتظار کر رہے تھے جسے اس وقت نمودار ہو کر اپنا کام انجام دینا تھا۔ اچانک آپ کی نظر ایک ایسے شخص پر پڑی جو ایک ٹیلے سے ہرن کی طرح دوڑتا چلا آ رہا تھا، وہ کچھ دوڑ کر دونوں پاؤں اٹھا لیتا اور زمین سے چند ہاتھ اوپر پرواز کرنے لگتا۔ جب یہ شخص قریب آیا تو آپ نے اُس کو پہچان لیا۔ یہ وہی شخص تھا، جس کا بازاروں میں مذاق اُڑتا تھا اور لوگ پتھروں اور طمانچوں سے اس کی خاطر مدارات کرتے تھے۔
اُس نے آپ سے کہا "اے عمر! آگے بڑھو تاکہ نماز جنازہ پڑھ لی جائے۔"
آپ نے نماز جنازہ کی امامت کی جو لوگ موجود تھے وہ آپ کے پیچھے کھڑے ہو گئے۔ نماز جنازہ کے دوران دو طرح آپ نے بھی یہ محسوس کیا کہ پیچھے سفید اور سبز پرندوں کا ہجوم ہے۔
آپ نے نماز ختم کی اور میت کی طرف دیکھا تو وہ غائب ہو چکی تھی اور وہاں ایک قبر موجود تھی۔ تازہ نئی ... ربانی چھڑکاؤ بھی کیا گیا تھا۔
بازاری مسخرا اُس وقت بھی موجود تھا۔ آپ نے اُسے سوالیہ نظروں سے دیکھا، وہ آپ کی حیرت کا سبب جا ... کہنے لگا۔ "اے عمر! تم حیران و پریشان کیوں ہو؟"
آپ نے فرمایا "تو تو یہ سوال مجھ سے اس طرح کر رہا ہے گویا میری حیرت کی وجہ سے تو واقف ہی نہیں۔"
اُس شخص نے جواب دیا "آپ کی حیرت اور بے قراری نے مجھے کچھ بتانے پر مجبور ... دیا ہے سنیے، میں بتاتا ہوں۔ اے عمر! تم نہیں جانتے کہ شہیدوں کی روحیں سبز پرندوں کے پوٹوں میں رہتی ہیں اور وہ جہاں ... چاہتے ہیں چلے جاتے ہیں، یہ ان شہیدوں کا ذکر ہے جو تلوار کے زخم سے حیات جاوداں حاصل کر لیتے ہیں لیکن وہ لوگ جو شہید محبت ہیں ان کی جگہ ... پرندوں کے جوف ہیں اور یہ بزرگ شہیدان محبت میں سے ایک تھے۔"
آپ نے پوچھا "اور تم کون ہو؟ یہ تو بتایا ہی نہیں۔"
اُس نے جواب دیا "میں بھی اُنھی میں سے ایک ہوں، لیکن مجھ سے ایک ایسا گناہ سرزد ہو گیا جس کی میں سزا بھگت رہا، جماعت سے نکال دیا گیا اور میری جماعت کے لوگ مجھے پتھر، تھپیڑ اور مکے مارتے رہتے ہیں۔"
وہ شخص باتیں کرتے کرتے کہیں غائب ہو گیا۔ آپ نے گھر کا رخ کیا۔ اُس دن آپ پر یہ حقیقت واضح ہوئی کہ آپ شاعری بھی سیکھ

ہیں۔ آپ نے فیصلہ کیا کہ صوفیائے کرام نے سیر و سلوک کے بارے میں جو کچھ بیان کیا ہے اور علوم دینیہ اور معارفِ فقہ اپنے اپنے مذاق کے مطابق بنائے گئے ہیں، انھیں نظم کر دیا جائے چنانچہ آپ نے یہ کام شروع کر دیا اور سات سو پچاس اشعار کا ایک قصیدہ تیار کر دیا۔ یہ قصیدہ تائیہ کے نام سے مشہور ہوا۔ اس قصیدے کی تعریف اس طرح کی گئی۔

"اس کا ایک ایک لفظ لطف و انبساط کا منبع ہے، اس کے معانی میں حسن روشنی کی طرح موجود ہے۔ یہ ایک سمندر ہے۔ اس کا جھاگ عنبر ہے۔ یہ ایک بادل ہے اور اس کی بارش جواہر ہیں۔"

جب آپ کا قصیدہ مکمل ہو گیا تو ایک روز آپ نے خواب میں دیکھا کہ رسول اللہ آپ کے پاس تشریف فرما ہیں اور پوچھ رہے ہیں: "اے عمر! تم نے اپنے قصیدے کو کس نام سے موسوم کیا؟"

انھوں نے جواب دیا: "یا رسول اللہ! میں نے اس کا نام لوائح الجنان رکھا ہے۔"

آپ نے فرمایا: "نہیں، یہ نام مناسب نہیں، تم اس کا نام 'نظم السلوک' رکھو۔"

آپ کی کیا مجال تھی جو یہ نام نہ رکھتے، چنانچہ قصیدۂ تائیہ کا نام نظم السلوک رکھ دیا گیا۔

شیخ صدرالدین قونوی نے نظم السلوک کو اتنا پسند کیا کہ انھیں زبانی یاد ہو گئی۔ آپ جب مجلس کا آغاز کرتے تو 'نظم السلوک' کے چند شعر سنا دیتے، اس طرح جب مجلس ختم ہوتی تو پھر چند اشعار نظم السلوک کے سنا دیتے۔ اس طرح آپ کی شہرت میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ شیخ صدرالدین قونوی اپنے مریدوں کو تلقین فرمایا کرتے تھے کہ ان اشعار کو زبانی یاد کر لو۔"

ایک دوسرے صوفی شیخ شمس الدین نے بات چیت کے دوران کسی کو بتایا: "شیخ سعید فرغانی نے پوری زندگی اس قصیدے کی شرح اور تعلیق نگاری میں گزار دی۔"

ایک بار آپ نے کسی سے کوئی ایسی ویسی بات کہہ دی۔ لوگوں نے آپ سے مواخذہ کیا اور گستاخی پر اتر آئے۔ آپ نے ان سے کہا: "یہ کیوں؟ کیا بات ہے؟ تم مواخذہ کیوں کرتے ہو؟"

اس وقت آپ کی آنکھوں میں بڑا جلال تھا۔ لوگوں نے محسوس کیا کہ ان کی طاقت سلب کر لی گئی ہے اور وہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکتے۔

آپ نے ان سب سے کہا: "یہ گستاخی کیوں؟ تم نے ایسا کیا کیوں؟"

ان کی حالت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ اسی وقت ایک شخص آیا اور ان سب کو رکتے کی حالت میں دیکھ کر آپ سے پوچھا: "یہ کیا ہے؟"

آپ نے جواب دیا: "انھی سے پوچھ لو، میں کیا بتاؤں۔"

اس شخص نے ان سب سے پوچھا: "تم سب کو یہ کیا ہو گیا کہ بولتے ہی نہیں؟"

ان لوگوں نے کوئی جواب نہ دیا۔

[illegible] نے ان کے شانے ہلائے اور کہا: "تم لوگ بولتے کیوں نہیں؟"

[illegible] طرف سے پھر کوئی جواب نہ ملا۔ آخر آپ سے پوچھا: "حضرت! کیا بات ہے، یہ جواب کیوں نہیں دیتے؟"

آپ نے فرمایا: "یہ لوگ میری باتوں پر توجہ دیے بغیر مواخذہ کرنے لگے۔ میں نے ان کی طاقت سلب کر لی۔"

اس شخص نے آپ کی خوشامد کی: "حضرت! یہ تو مر جائیں گے۔"

آپ نے جواب دیا: "پھر میں [illegible] کروں، ان سے کہو توبہ کریں۔"

اس شخص نے کہا: "یہ توبہ کس طرح [illegible]یں گے، ان کی تو طاقت ہی سلب کی جا چکی ہے۔"

آپ [illegible] کیا کوئی، جس کو دیکھا نہیں جا سکتا تھا، شیخ حریری کا ایک شعر پڑھ رہا ہے۔

"ایسا کون ہے جس نے کبھی برائی نہ کی ہو، اور دنیا میں ایسا کون ہے، جس کے پاس نیکیاں ہی نیکیاں ہوں۔"

آپ پر حالت نے غلبہ کیا اور ان سب کی سلب ہوئی طاقت بحال کر دی گئی۔

اسی عالم میں ان کے کانوں میں کسی کا یہ شعر گونجنے لگا:

"صرف محمد مصطفیٰ ایسے ہادی ہیں کہ ان کے پاس نیکیاں ہی نیکیاں تھیں۔ آپ کے پاس جبرائیل امین آیا کرتے

شیخ برہان الدین ابراہیم جعبر نامی جگہ کی سیاحت کے دوران رقت میں مبتلا ہو گئے۔ اس حال میں اُن کے پاس سے ایک شخص گزرا، وہ یہ شعر پڑھ رہا تھا: "تم جب تک مجھ میں فنا نہیں ہو جاؤ گے، میں تمھیں عاشق نہیں سمجھوں گا اور جب تک میری صورت تم میں جلوہ گر نہ ہوگی فنا نہ ہوگی۔"

اس شعر نے اُن کی حالت ہی غیر کر دی۔ یہ شعر پڑھنے والے کے پیچھے دوڑے اور اُس کو پکڑ لیا، پوچھا: "یہ کس کا شعر ہے؟"

اُس نے جواب دیا: "ابن الفارض کا۔"

صوفی نے پوچھا: "ابن الفارض کون؟"

اُس نے جواب دیا: "عمر بن فارض۔"

صوفی برہان الدین نے پوچھا: "ابن الفارض آج کل ہیں کہاں؟"

جواب دیا گیا: "غالباً مکہ معظمہ میں یا قاہرہ میں بھی ہو سکتے ہیں۔"

صوفی برہان الدین نے کہا: "میں اُن سے ملنا چاہتا ہوں، کہاں ملیں گے؟"

جواب دیا گیا: "سرزمین حجاز یا قاہرہ میں تلاش کرو۔"

اُس شخص نے آپ کی تلاش شروع کر دی اور تلاش کرتا مکہ معظمہ پہنچا۔ وہاں کسی نے بتایا کہ ابن الفارض یہاں تھے تو ضرور، مگر چلے گئے اور غالباً مصر میں ملیں گے۔

کسی نے شیخ برہان الدین سے پوچھا: "آپ اُن سے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟"

انھوں نے جواب دیا: "مجھے حکم دیا گیا ہے کہ ابن الفارض کے پاس پہنچوں، ان کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔"

اُن سے پوچھا گیا: "لیکن آپ انھیں جس طرح تلاش کر رہے ہیں کیا یہ انداز غیر معمولی نہیں ہے؟ اور یہ تلاش کا غیر معمولی انداز ہے تو کیوں؟"

شیخ برہان الدین نے جواب دیا: "بھائی بات یہ ہے کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ ابن الفارض کا یہ آخری وقت ہے، اُن کے پاس جاؤ، ان سے ملو اور اگر وہ وفات پا جائیں تو اُن کی نماز جنازہ پڑھاؤ۔"

انھیں جواب دیا گیا: "تب پھر آپ مصر تشریف لے جائیں۔ وہ وہیں ملیں گے۔"

شیخ برہان الدین مصر روانہ ہو گئے اور کچھ عرصے بعد تلاش کرتے ہوئے ابن الفارض کی خدمت میں پہنچ گئے۔ انھوں نے دیکھا وہاں بہت سے لوگ موجود ہیں۔ شیخ برہان الدین نے ایک شخص سے پوچھا: "کیا عمر بن فارض یہاں موجود ہیں؟"

اُس شخص نے اُن کا ہاتھ پکڑا اور ابن الفارض کے بستر کے قریب لے گیا۔ بولا: "یہ رہے ابن الفارض۔" اور ابن الفارض سے کہا: "حضرت یہ ہیں شیخ برہان الدین ابراہیم۔ ان کا پورا نام تو یہی ہے لیکن لوگ انھیں صرف ابراہیم کہتے ہیں۔"

شیخ برہان الدین نے اس شخص سے متحیر ہو کر سوال کیا: "لیکن جناب، میں کیا ہوں، کون ہوں؟ یہ آپ کب سے اور کہاں سے جانتے ہیں؟"

اُن بزرگ نے جواب دیا: "ولی، ولی کو خوب پہچانتا ہے۔"

شیخ برہان الدین نے شیخ عمر بن الفارض کو سلام کیا، شیخ ابن الفارض نے جواب دیا: "ابراہیم! وعلیکم السلام۔ تم خوب آئے، مجھے تمھارا انتظار تھا۔"

شیخ برہان الدین کھڑے ہوئے تھے۔ آپ نے کہا: "تم کھڑے کیوں ہو؟ بیٹھ جاؤ۔ میں تم کو بشارت دیتا ہوں کہ تم اولیاء اللہ میں سے ہو۔"

شیخ برہان الدین نے عرض کیا: "یا سیدی! آپ نے جو کچھ فرمایا میں اس پر شبہ بھی نہیں کر سکتا لیکن میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ نے اتنی بڑی بات کس طرح کہہ دی؟"

آپ نے جواب دیا: "ابراہیم! میں نے علالت سے پہلے اللہ سے دُعا کی تھی کہ جب میں بیمار پڑوں اور میرا آخری وقت آ جائے تو اُس وقت اے میرے اللہ، میرے پاس اولیاء اللہ کو بھیج دینا۔ میری وہ دُعا قبول ہوئی۔ اس وقت یہاں موجود لوگوں میں تم بھی شامل ہو، اس لیے تم بھی ولی ٹھہرے۔"

ابن الفارض نے آنکھیں بند کر لیں اور کچھ دیر بعد اسی عالم میں فرمایا: "اے میرے اللہ! یہ کیا ہے، یہ کون سی جگہ ہے؟"

" آخر معاملہ کیا ہے پیرومرشد۔" شیخ برہان الدین نے دریافت کیا۔ بات یہ ہے کہ کچھ ہی لمحے پہلے میری آنکھوں نے جنّت کی جھلک دیکھی ہے اور اس موقع پر مَیں نے دو اشعار بھی پڑھے ہیں۔ کیا آپ مجھے اُن کا مفہوم بتائیں گے۔ شیخ برہان الدین نے پوچھا۔ اس پر آپ نے جواب دیا۔ ے سُن جو کچھ تُو نے ابھی ابھی مجھے دکھایا ہے اگر یہی میری منزل ہے تو افسوس کہ اس کی آس اور آرزو میں مَیں نے اپنی پُوری زندگی برباد کر دی کیوں کہ مَیں نے تو اس دنیا میں جو کچھ بھی کیا تھا وہ سب تیری رضا اور طلب کے لیے کیا تھا۔ میری روح تو اس جنّت کے بغیر ہی شاداں رہ سکتی تھی، جب کہ وہ خواب جسے دیکھنے کا مَیں متمنی تھا وہ تو ابھی تک پورا نہیں ہوا۔

اشعار کا مفہوم سُن کر شیخ صاحب نے عرض کیا حضرت! اب تو آپ کو خوش ہونا چاہیے کہ آپ کو اس قدر عالی مرتبہ عطا ہوا۔ کیا یہ کم ہے کہ دُنیا میں ہی آپ کو بہشت کی بشارت دے دی گئی ہے۔

ابن الفارض چند لمحے خاموش رہے اور پھر دھیرے دھیرے کہنے لگے۔ شیخ برہان الدین کیا تم جانتے ہو کہ رابعہ بصری ایک عورت تھیں اور انھوں نے ایک بار فرمایا تھا کہ اے خداوند قدوس مجھے تیری عزّت کی قسم مَیں محض اس لیے تیری عبادت نہیں کرتی کہ دوزخ کی آگ سے خوف زدہ ہوں یا مجھے بہشت کی تمنّا ہے بلکہ اے باری تعالیٰ مَیں تو ہر کام تیری خوشنودی اور رضا کے لیے کرتی ہوں۔"

اتنا کہنے کے بعد ابن الفارض خاموش ہو گئے اور پھر فرمانے لگے۔" شیخ برہان الدین اب تم جا سکتے ہو۔ البتہ جب مَیں اپنی جان جانِ آفرین کے سپرد کروں تو تم ہی میری نمازِ جنازہ پڑھانا میری قبر پر تین روز تک موجود رہنا اور اس کے بعد اپنے وطن واپس لوٹ جانا۔"

شیخ برہان الدین اس کے باوجود وہاں پر کھڑے رہے مگر ابن الفارض نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور دیر تک دھیرے دھیرے کچھ کہتے رہے۔ پھر اچانک انھیں ایک بازگشت سُنائی دی، کوئی کہہ رہا تھا اے عمر بولو تمہاری کیا منشا ہے؟

مَیں تو سدا سے ہی آپ کی زیارت کا طلبگار ہوں اور اپنی اس تمنّا کی حسرت میں کئی بار اشکبار بھی ہو چکا ہوں۔ اتنا کہنے کے بعد ابن الفارض کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی، جس کے ساتھ آپ نے اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔

شیخ برہان الدین نے آپ کی وصیّت کے مطابق نہ صرف آپ کی تجہیز و تکفین میں حصّہ لیا بلکہ نمازِ جنازہ بھی پڑھائی۔ بے شمار ارادت مندوں مریدوں اور عام لوگوں نے آپ کو آپ کی آخری آرامگاہ تک پہنچایا۔ آپ کا وصال ۶۳۲ ہجری کو ہوا۔

ابن الفارض نے تمام زندگی جنّت اور دوزخ سے بے نیاز ہو کر عشقِ الٰہی کو اپنا مشن بنایا اور باالآخر اللہ تعالیٰ نے اُن کی عبادتوں اور ریاضتوں کو شرفِ قبولیت بخشا۔

ڈاکوؤں کا قافلہ آبادی سے دُور مراکش کے ویران علاقے سے گزر رہا تھا۔ چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کبھی کبھار اُونٹوں کے گلے کی گھنٹیاں بجتیں تو اُن کی آواز سارے سناٹے پر محیط ہو جاتی۔ قافلے کے سردار نے اس بے آب گیاہ وادی میں ایک نوجوان کو تن تنہا سوتے ہوئے دیکھا تو قافلے کو رُکنے کا حکم دیا۔ یہ نوجوان صحت مند اور قوی جسم کا مالک تھا۔ سردار نے اس نوجوان کو نیند سے بیدار کیا اور یہاں ویرانے میں اس طرح رہنے کا مقصد پوچھا مگر نوجوان خاموش رہا۔ سردار نے اپنا وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا اور حکم دیا "اے نوجوان تُو جو کوئی بھی ہے ہمارے قافلے میں شامل ہو جا اور ہمارے ساتھ چل" لیکن اس نوجوان نے اُن کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ سردار نے قافلے کے مضبوط نوجوانوں کو حکم دیا کہ اس نوجوان کو زنجیر میں جکڑ کر اُونٹوں پر لاد دیا جائے اور اگلی منزل پر جب پڑاؤ ڈالا جائے تو اس نوجوان کو میرے سامنے پیش کیا جائے وہاں جا کر ہی اس سے باز پرس ہوگی۔ سردار کے حکم کی تعمیل کی گئی اور نوجوان کو اُونٹ پر لاد لیا گیا پھر اگلی منزل پر پہنچ کر نوجوان کو سردار کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ سردار نے پہلے تو اس نوجوان کو رات کی تاریکی میں دیکھا تھا مگر اب جب دن کے اُجالے میں دیکھا تو اس کو عجیب حیرت ہوئی۔ اُس نے ایک نامعلوم خوف کے پیش نظر حکم دیا کہ قافلے میں شامل آدمیوں کی گنتی کی جائے۔ سب لوگ حیران تھے کہ سردار کو کیا ہو گیا ہے۔ قافلے کی گنتی کا اس نوجوان کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ بہر حال حکم حاکم مرگ مفاجات کے مصداق سارے قافلے کی گنتی کر کے سردار کو بتایا گیا کہ اس وقت قافلے میں ایک سو ایک افراد شامل ہیں۔ یہ سُن کر سردار کی حالت اور بھی غیر ہو گئی۔ اُس پر لرزہ طاری ہو گیا۔ لوگوں نے سردار کو بڑی کشمکش میں مبتلا پایا۔ اس سے پہلے اُس کی حالت کبھی ایسی نہ ہوئی تھی۔ جب سردار سے دریافت کیا گیا کہ اس کیفیت کی کیا وجہ ہے تو اس نے بتایا کہ بہت مدت پہلے میں ایک دفعہ ڈاکہ ڈال کر آرہا تھا کہ راستے میں مجھے ایک کامل بزرگ ملے۔ انہوں نے مجھے کہا "تم میری ایک بات مان لو میں تمہیں تمہاری فلاح

اور بھلائی کی ضمانت دیتا ہوں۔" میں نے اُس مردِ کامل سے کہا کہ میں آپ کی ہر بات مان لوں گا لیکن اگر آپکی بات میرے پیشہ کے متعلق ہوئی تو میں آپ کی بات ماننے سے انکار کردوں گا۔" اُن بزرگ نے کہا" میں راہزنی اور ڈاکوں سے نہیں روکوں گا مگر اتنا کہوں گا کہ غریبوں پر رحم کرو اور اُن کی دعائیں لو اور اس میں تمہاری بھلائی کا راز پنہاں ہے اور تم پر کوئی آفت یا آنچ نہ آئے گی تاوقتیکہ ایک ایسا دن آئے گا جب تمہارے قافلے میں ایک سو ایک افراد ہوں گے تو سو کے اوپر جو ایک آدمی ہوگا اس کے بعد اُسی آدمی کے ہاتھ میں تمہاری باقی زندگی کی باگ ڈور ہوگی۔ اگر تم اس کی صحبت سے فائدہ اُٹھاؤ گے تب تمہیں ہمیشہ کامرانیاں نصیب ہوں گی اور اگر اُس کو تنگ کرو گے تو تمہاری بربادی شروع ہوجائے گی۔

سردار نے مزید اپنے ساتھیوں کو بتایا" میں اس دن کے بعد اپنے قافلے کے تمام افراد کی گنتی کرواتا رہتا تھا مگر آج تک کبھی لوگوں کی گنتی ایک سو ایک نہیں ہوئی۔ اور آج جب ایک سو ایک ہوگئی ہے اور سو سے اوپر جو ایک شخص ہے وہ شکل صورت سے کوئی کامل آدمی ہی معلوم ہوتا ہے۔ اب اس بزرگ کے مطابق اسی کے ہاتھ میں میری آیندہ زندگی کے فیصلے ہیں۔ اُس کو ہم نے بلاشبہ اذیت پہنچائی ہے اور اب اُس کو چھوڑ دینا ہی دانشمندی ہے۔ کیونکہ ایک خطرہ یہ بھی لاحق ہے اگر اُس کو چھوڑ دیا گیا تو یہ ہمارے ٹھکانے سے آگاہ ہوگیا ہے اور ممکن ہے کہ یہ بادشاہ مراکش کو جاکر ہمارا پتہ ٹھکانہ بتادے اور ہم برباد ہوجائیں۔" یہ کہانی سُناکر ڈاکوؤں کے سردار غنیم نے اپنے زیرک اور عقل مند ساتھیوں سلیم اور اسواد سے مشورہ کیا کہ اب اس شخص کا کیا کیا جائے۔ اس کے ساتھیوں نے کہا" ہم اس شخص کو علیحدگی میں لے جاکر اس کے آیندہ پروگرام معلوم کرتے ہیں پھر کوئی فیصلہ کریں گے۔"

چنانچہ پروگرام کے مطابق اس نوجوان کو علیحدہ لے جاکر اس سے پوچھا گیا کہ تم کہاں جانا چاہتے ہو اور آیندہ تمہارا کیا پروگرام ہے۔ اس نوجوان نے کہا" میرا آیندہ پروگرام تو خدا جانتا ہے لیکن جانا میں وہیں چاہتا ہوں جہاں سے تم لوگوں نے مجھے اٹھایا تھا۔ اُس کے بعد میں بادشاہِ وقت کو جاکر تم لوگوں کی سرگرمیوں اور ٹھکانے سے باخبر کروں گا تاکہ حکومت تم لوگوں کو سزا دے سکے۔ یہ باتیں سردار کو بتائی گئیں تو وہ سخت پریشان ہوا اور غصے میں آکر اس نے حکم دیا اس نوجوان کو تاحکمِ ثانی غار کے اندر بند رکھا جائے۔ البتہ اُسے کھانا وغیرہ باقاعدگی سے فراہم کیا جائے تاکہ اس کو ہماری طرف سے زیادہ تکلیف نہ پہنچے۔

سردار کے حکم کے مطابق نوجوان کو زنداں میں ڈال دیا گیا اور وہیں پر اس کو کھانا پیش کیا گیا۔ لیکن نوجوان نے کھانا کھانے سے انکار کردیا اور کہا کہ" یہ کھانا حلال نہیں، لُوٹ مار کا مال میں استعمال نہیں کرسکتا۔" یہ کہہ کر انہوں نے کھانا واپس بھجوا دیا اور اپنے دل میں عہد کیا کہ جب تک حلال کا کھانا نہیں ملے گا بھوکا ہی رہوں گا خواہ اس سلسلہ میں میری جان بھی چلی جائے۔ سردار نے یہ بات سُنی تو اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا" دوستو اگر یہ نوجوان قید کے اندر رہ کر کھانا نہیں کھائے گا تو یہ بات ہمارے لیے اور زیادہ بہتر ہے کیونکہ بھوک کی شدت سے یہ زیادہ دن نہ جی سکے گا اور یوں یہ دیوار ہمارے راستے سے خود بخود ہٹ جائے گی لیکن سردار کی خام سوچوں سے آگے ایک بڑا سردار بھی جو دونوں جہانوں کا رب ہے، جو اپنے ہر بندے کا پالن ہار ہے اس نے کھنڈر میں اس نوجوان کے پاس ایک بزرگ نورانی رُو کو بھیجا جس نے اس نوجوان کو دودھ ملا شہد پینے کو دیا جس سے اس کے جسم کے اندر ایک تازگی پیدا ہوئی اور وہ اسم اعظم بھی اس نوجوان کو سکھاتے جن کی مدد سے اس نوجوان میں یہ صلاحیت پیدا ہوسکتی تھی کہ ان دو اسمائے اعظم جن میں ایک کو وہ جس وقت بھی پڑھے گا تو وہ عام لوگوں کی نظروں سے غائب ہوجائے اور جہاں جانا چاہے گا چلا جائے گا اور دُوسرے کی مدد سے جہاں سے چاہے گا واپس آجائے

یہ ساری باتیں نوجوان کو سکھانے کے بعد اس بزرگ نے نوجوان کو یہ بتایا کہ میرا نام خواجہ خضر علیہ السلام ہے اور خدا نے میری ڈیوٹی اپنے نیک بندوں کی تربیت و آگہی پر لگائی ہوئی ہے اور یہ مذکورہ اسم اعظم جب تک تمہارے تصرف میں رہیں گے تمہارے اوپر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ یہ کہہ کر وہ بزرگ چلے گئے۔

دوسری طرف ڈاکوؤں کے سردار کا خیال تھا کہ نوجوان کھائے پیئے بغیر کس طرح زندہ رہ سکتا ہے مگر نوجوان کے لیے غائب سے آنے والے رزق سے وہ بے خبر تھا۔ کافی دنوں کے بعد سردار نے جب نوجوان کو تر و تازہ دیکھا تو اُس کو بڑی حیرت ہوئی کہ بھوکا پیاسا رہ کر بھی اس نوجوان کی تر و تازگی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ لہذا اس نے سوچا اس طرح تو اُس سے چھٹکارا حاصل کرنا ممکن نہیں اس لیے اُس کو تلوار سے موت کے گھاٹ اُتار دیا جائے۔ صرف اسی طریقے سے اس نوجوان سے گلو خلاصی ہو سکتی ہے۔ اب نوجوان کو قید سے باہر لایا گیا اور کہا گیا کہ تم موت کے لیے تیار ہو جاؤ۔ تلواریں میان سے باہر نکل آئیں مگر آن کی آن لوگوں کے ہاتھوں سے تلواریں بھی غائب اور نوجوان بھی غائب۔ یہ کیفیت دیکھ کر سردار گھبرایا کہ یہ نوجوان تلواروں سمیت کہاں غائب ہو گیا۔ سردار کے ساتھیوں نے کہا "سردار! یہ تو بہت اچھا ہوا کہ وہ نوجوان خود بخود غائب ہو گیا ورنہ خواہ مخواہ اس کا خون ہماری گردن پر پڑتا" ابھی یہ بات ہو رہی تھی کہ وہ نوجوان بھی واپس آ گیا اور تلواریں بھی واپس آ گئیں۔ اب سردار کافی متاثر ہو چکا تھا۔ اس نے نوجوان سے عرض کی "تم کون ہو اور ہمیں بتاؤ تم ہمارے بارے میں کیا کرنا چاہتے ہو"۔ اس نوجوان نے سردار سے کہا" دیکھو میں یا تو حکومتِ مراکش کے پاس جاؤں گا تاکہ تم لوگوں کو پکڑوا کر قرار واقعی سزا دلوا سکوں۔ یا پھر تم لوگ کسی ایسے علاقے میں چلے جاؤ جہاں جا کر تم یہ ڈاکہ زنی چھوڑ کر نیک بندے بن جاؤ۔ ڈاکوؤں کے سردار اور اس کے ساتھیوں نے فلاح اسی میں جانی کہ کسی دوسرے علاقے میں جا کر دھندا کیا جائے کیونکہ اگر بادشاہ نے پکڑ لیا تو سخت سزائیں ملنے کا اندیشہ تھا۔

چنانچہ اس نوجوان نے ڈاکوؤں کے سردار سے کہا "تم لوگ اپنا ضرورت کا اسباب لے لو اور یہاں میدان میں آ کر آنکھیں بند کر کے کھڑے ہو جاؤ اور اس وقت تک آنکھیں بند کیے رکھو جب تک میں نہ کھولنے کے لیے کہوں۔ ڈاکوؤں نے آپ کی بات پر عمل کیا اور جب نوجوان کے حکم کے مطابق سب نے آنکھیں کھولیں تو اپنے آپ کو بغداد شہر میں پایا اور پھر نوجوان نے اُن سے کہا کہ اب تم یہاں عزت دارانہ زندگی بسر کرو اور آئندہ ڈاکہ نہ ڈالنا پھر دیکھو گے کہ تم لوگوں کو کس قدر عزت والی زندگی نصیب ہوتی ہے۔ یہ کہہ کر وہ نوجوان اچانک غائب ہو گیا اور اسی جگہ پہنچ گیا جہاں سے ڈاکوؤں نے اس کو اُٹھایا تھا۔ ڈاکوؤں کے سردار کا نام غنیم تھا اور وہ اپنے دونوں ساتھیوں سلیم اور اسواد کے ہمراہ بغداد میں آباد ہو گیا۔ ان لوگوں کے پاس دولت اس قدر تھی کہ وہ ساری عمر بھی بیٹھ کر کھاتے تب بھی نہ ختم ہوتی۔ اس لیے انہوں نے اس بزرگِ کامل جو ابھی نوجوان تھا کے ساتھ کیا ہوا وعدہ ایفا کرنے کا پکا عہد کر لیا اور بغداد میں نہایت شریفانہ زندگی بسر کرنے لگے۔

⁂

یہ نوجوان جس نے ڈاکوؤں کی زندگی کی کایا پلٹی اور جس کو حضرت خضرؑ جیسی شخصیت کی رہنمائی حاصل ہوئی اس کا نام نامی سعید بن سلامؒ تھا۔ آپ مراکش کے علوم و معارف کے مرکز، خوبصورت شہر الاصنام کے مدرسہ الفرقان کے فارغ التحصیل تھے۔ علامہ عبداللہ عامریؒ جیسے قابل استاد کی اتالیقی میں آپ نے اپنی علمی منازل طے کی تھیں۔ آپ کے متعلق آپ کے اُستاد علامہ عامری بہت کچھ جانتے تھے کہ آپ روحانیت میں کون کون سے مدارج طے کر چکے ہیں۔ جس روز الاصنام میں سالانہ جلسہ تقسیم اسناد ہو رہا تھا وہاں پر لوگوں کا اس قدر ہجوم تھا کہ تل رکھنے کی جگہ نہ تھی۔ جب سعید بن سلام کو سند حاصل کرنے کے لیے پکارا گیا تو جونہی آپ اپنی نشست سے اُٹھے لوگوں نے دیکھا کہ تمام اہلِ جلسہ پر

نکہت و انوار کی بارش ہونے لگی ہے اور ایک مسحور کن خوشبو نے تمام لوگوں کی حسِ شامہ کو معطر کر دیا ہے۔ اس وقت اگرچہ شام کا وقت تھا مگر یوں معلوم ہوتا تھا کہ دوپہر کی طرح چاروں طرف سورج کی روشنی پھیلی ہوئی ہے۔ سعید بن سلام کے اسرار کا راز افشا ہوتا دیکھ کر اُن کے استادِ گرامی علامہ عامری نے نعرہ صلوٰۃ لگایا اور درود پاک کی صدا سے فضا گونج اٹھی اور اِس رحمت آگیں فضا میں سعید بن سلام نے سند وصول کرنے کے لیے ابھی ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ ایک نادیدہ ہاتھ نے سند اٹھا کر سعید بن سلام کے ہاتھ پہ رکھ دی۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر اہلِ مجلس نے ایک مرتبہ کیف و مستی میں صلوٰۃ و سلام کے نعرے بلند کرنے شروع کر دیئے۔ علامہ عامری نے سعید بن سلام کی پیشانی کو بوسہ دیا اور فرمایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ سے تمہیں سند عطا کر کے تمہارے علم کی توثیق کر دی ہے۔ اس کے بعد تمام ہجوم کی یہ خواہش تھی کہ وہ کسی طرح سعید بن سلام کے ہاتھوں کو بوسہ دیں مگر اذانِ مغرب نے اظہارِ عقیدت کا رُخ مسجد کی طرف پھیر دیا۔ بعد از نماز مغرب ہجوم پھر سعید بن سلام کی طرف راغب ہوا تو علامہ عامریؒ نے دیگر شاگردوں کے حلقے میں آپ کو مسجد سے مدرسے کی طرف بھیج دیا اور یوں آپ کو لوگوں کے ہجوم سے چھٹکارا ملا۔ عشا کی نماز کے بعد علامہ عامریؒ مدرسے میں تشریف لائے تو اپنے ہونہار شاگرد سے کہا "دیکھو سعید بن سلام تم نے علوم ظاہری کی تو تکمیل کر لی ہے اور علوم باطنی کی طرف بھی کوئی توجہ دو۔" سعید بن سلام نے کچھ پوچھنا چاہا تو استاد کے اس جواب نے ان کو خاموش کر دیا کہ ریاضتِ نفس، مجاہدات اور عبادت پر کمر باندھ لو منزل خود چل کر تمہارے پاس آجائے گی روحانیت کے مبادیات سے تم پہلے ہی آگاہ ہو۔ جب ان اصولوں کی پابندی کرو گے تو ان شاء اللہ تمہیں ہمیشہ کامیابی نصیب رہے گی۔

اپنے استاد کا حکم سُن کر سعید بن سلام نے باطنی علم کی طرف توجہ دینے کے متعلق سوچنا شروع کر دیا۔ اسی وقت علامہ عامریؒ کی آواز دوبارہ گونجی کہ سعید باطنی علوم یہاں رہ کر نہیں حاصل ہوں گے بلکہ ویرانوں میں جا کر خدا کی قدرت پر غور کرو۔ خدا تمہاری راہیں از خود متعین کر دے گا اور یہاں رہ کر تو لوگوں کی عقیدت و احترام تمہیں ہلاک کر دے گی۔

استاد کا حکم سُن کر سعید بن سلام نے اسی وقت سفر کی تیاری شروع کر دی۔ ضروری سامان باندھ کر اسی رات کو کسی ویرانے میں نکل جانے کا ارادہ کر لیا۔ جب ضروری سامان لے لیا تو استاد کو ملنے کے لیے آئے۔ استادِ محترم نے سامان دیکھ کر کہا "سعید! یہ کیا؟ تم خُدا کے بھروسے پر اُسی کے پاس جانے والی راہ پر گامزن ہونے لگے ہو تو پھر اس سامان کی کیا ضرورت تم صرف تین کپڑوں میں یہاں سے نکلو اور دیکھو کہ کائنات کا پالنے والا کیا عجائب دکھاتا ہے۔" یہ سُن کر سعید بن سلام نے سامان وہیں رکھا اپنے استادِ محترم کو آخری سلام کیا اور مدرسے کی عمارت سے باہر نکل آئے ابھی وہ سوچ رہے تھے کہ کس سمت کو سفر شروع کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ذہن میں قرآن مجید کی ایک آیت ڈال دی جس کا مطلب تھا "جس طرف بھی رُخ کرو اللہ اُسی طرف ہے۔" اس آیت کریمہ کی روشنی میں آپ نے ایک بے نام منزل کی طرف سفر کا آغاز کر دیا۔ رات بھر آپ نے سفر کیا۔ فجر کی نماز تک آپ ایک نخلستان میں پہنچ چکے تھے۔ آپ نے وہاں پر ہی نماز ادا کی جس سے آپ کو قلبی سکون ملا اور رات بھر کی مسافت کی تھکاوٹ بھی دُور ہو گئی۔ پھر آپ آگے چل پڑے۔ دن بھر سفر کرتے رہے۔ بھوک اور پیاس نے آپ کا بُرا حال کر دیا۔ آپ اس قدر تھک گئے تھے کہ اس سے آگے ایک قدم بھی چلنا مشکل ہو گیا تھا۔ چنانچہ ایک ویرانے میں پہنچ کر آپ نے آرام کرنے کا ارادہ کیا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں ڈاکوؤں کے قافلے سے آپ کی مڈبھیڑ ہوتی تھی اور یہاں سے ہی آپ کو ولایت کی منازل کا راہبر و راہ نما ملا اور یہاں ہی آپ پر روحانیت کے اسرار و رموز کے دَر وا ہوتے۔
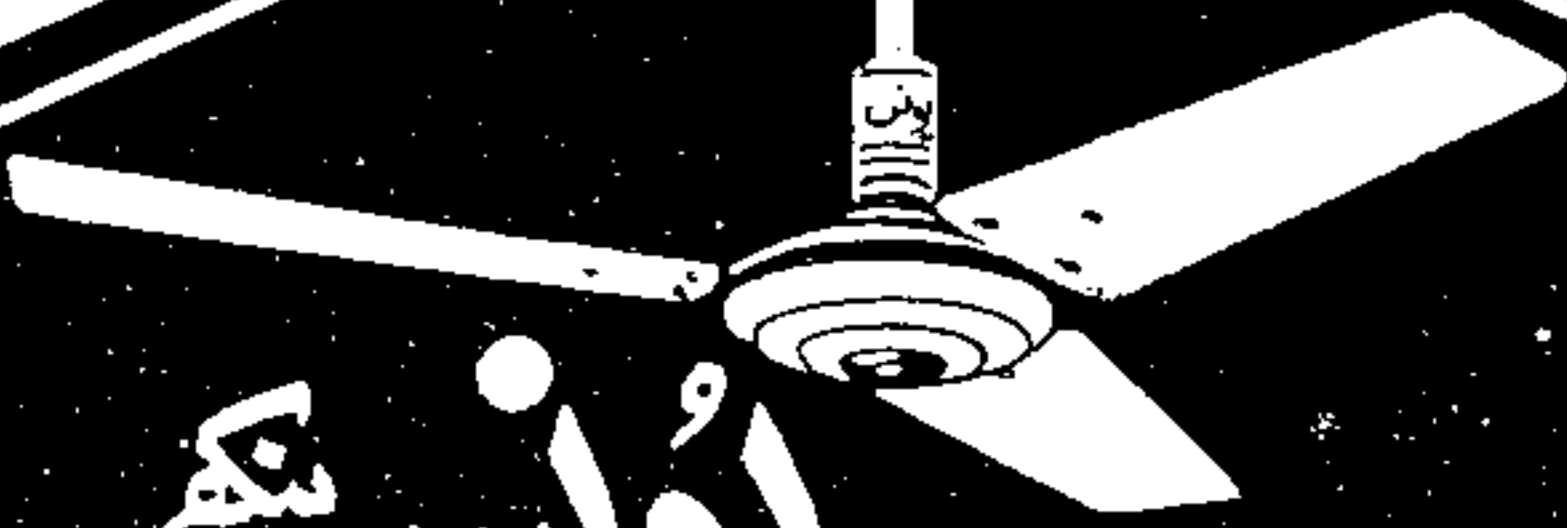
Yunas FANS
یونس
آپ کا پہلا انتخاب
یونس پنکھے
پائیداری اور کارکردگی میں بے مثال مکمل گارنٹی شدہ۔ بے آواز اور خوشنما
ہمارے مقرر کردہ ڈیلر سے رجوع کریں
اور ہمارا ٹریڈ مارک ۵۹۹۲۹ چیک کریں
یونس میٹل ورکس (پرائیویٹ) لمیٹڈ
یونس کالونی۔ جی ٹی روڈ گجرات فون ۴۶۴۳-۳۸۲۳
ٹیلکس نمبر 4590 YUNAS PK
گرام: "یونس فینز"
یونس پنکھے
سالہا سال سے پسندیدہ
تربیت یافتہ تیکنیکی ماہرین کی
شب و روز محنت کا نتیجہ
tascom
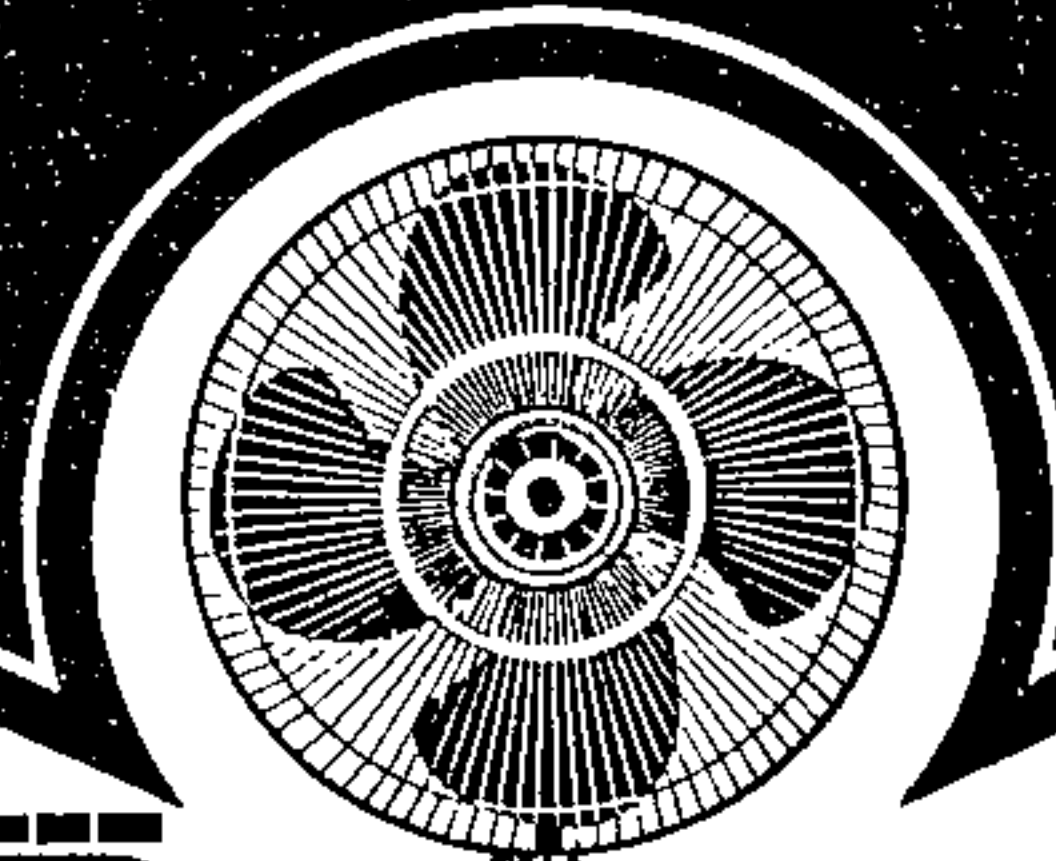
جیسا کہ پیچھے بیان کیا گیا ہے۔ آپ کو ڈاکوؤں نے زبردستی اپنے ساتھ لے جا کر قید کر دیا اور پھر اسی قید میں حضرت خضر علیہ السلام نے آپ کو اسم اعظم سکھا کر آپ کی تربیت کی اور انہی اسمائے اعظم کے ساتھ آپ نے ڈاکوؤں کی زندگیاں بدل دی تھیں اور خود پھر اسی ویرانے میں جہاں آپ نے آرام فرمایا تھا واپس آ کر عبادت و ریاضت میں مشغول ہو گئے۔ آپ کو حضرت خضر علیہ السلام کی تعلیمات نے صاحب کرامت کر دیا تھا مگر آپ تو طالب مولا تھے۔ لہٰذا ان کرامات پر آپ نے اکتفا نہ کیا اور ذکر الٰہی میں انہماک کے ساتھ مصروف رہے۔ یوں رفتہ رفتہ آپ کی نظروں سے تمام حجابات تمام ہو گئے۔ تب آپ کو معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ لاتعداد صفات کا مالک ہے۔ اور ہر صفت بندے اور خدا کے درمیان ایک حجاب ہے۔ غرضیکہ آپ روحانیت میں اس قدر یکتا ہو گئے کہ ایک رات عبادت میں مشغولی کے دوران آپ پر تجلی حق کا نزول ہوا۔ اور آپ پر ایسا عالم تحیّر طاری ہو گیا کہ چار سال تک آپ کا شعور اپنے تشخص کو فراموش کیے رہا اور جب آپ جذب و شکر کی حالت سے واپس لوٹے تو آپ کو اپنی شناخت کرنے میں بھی تکلیف ہوتی۔ اب آپ کا دل ہر وقت اس بات کے لیے بے چین رہتا کہ کسی طرح وہ جذب و شکر والی کیفیت دوبارہ حاصل ہو۔ وہ کیفیت جاودانی آپ کے لیے ناقابل فراموش تھا۔ جمال حق کی طلب نے آپ کو بے قرار کر دیا تھا۔ حتیٰ کہ آپ ایک ایسے مقام پر پہنچ گئے کہ ایک روز شدید گرمی میں آپ کو انگور کھانے کی خواہش ہوئی۔ آپ نے نفس کشی کے لیے منہ کے اندر چند کنکریاں اٹھا کر رکھ دیں اور خدا نے ان کنکریوں کو انگوروں میں تبدیل کر دیا۔ آپ کو خیال ہوا کہ انگوروں کو فوراً پھینک دیں لیکن کفران نعمت کے ڈر سے آپ نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔

❖

حمزہ ایدمبر میں ہاتھی دانت کے بہت بڑے تاجر تھے۔ انہوں نے تین شادیاں کر رکھی تھیں۔ پہلی بیوی سے ایک بیٹا حسن تھا جبکہ دوسری بیوی بے اولاد تھی اور تیسری سے صرف دو لڑکیاں تھیں۔ حمزہ اہل ثروت ہونے کے ساتھ دیندار بھی تھے۔ انہوں نے اپنی تینوں بیویوں کو علیحدہ علیحدہ مکان بنوا کر دیے ہوتے تھے۔ اور اس کے علاوہ دین کی تبلیغ بھی وہ بڑے ذوق و شوق کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ اسی مقصد کے لیے انہوں نے ایدمبر میں ایک عالی شان مسجد بھی تعمیر کروائی تھی۔ آپ کی تبلیغ سے ایدمبر اور اس کے ارد گرد کے کئی قبائل اسلام قبول کر چکے تھے۔ علاوہ ازیں آپ نے ایک دینی مدرسہ بھی قائم کروا رکھا تھا۔ نومسلموں کو حمزہ نے اپنے کاروبار میں بھی شریک کار بنایا۔ اس طرح غریب نومسلموں کی مالی حالت بھی کافی بہتر ہو گئی اور اس طرح انہوں نے سنت عثمانی کی تقلید کی۔

حمزہ کی دین پروری سے ایدمبر کے غیر مسلم امراء اُس کے مخالف ہو گئے جب روپے پیسے اور طاقت کے بل سے حمزہ زیر نہ ہو سکے تو اس علاقے کے ایک رئیس کنوٹا نے حمزہ کو کئی طریقوں سے مالی نقصان پہنچایا۔ اُن کے بچوں کو ہلاک کرنے کی کوشش کی مگر اسلام کی خدمت کے جذبے سے سرشار حمزہ دن بدن ترقی کرتے جا رہے تھے۔ اب کنوٹا سخت چراغ پا ہو چکا تھا چنانچہ اس نے اپنے علاقے کے ایک جادوگر کٹیار کی خدمت میں حاضر ہو کر حمزہ کو جادو کے ذریعے ختم کرانے کی درخواست کی۔ لیکن کٹیار اپنے کئی ساحرانہ حملوں کے باوجود حمزہ کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکا۔ اب کٹیار نے اپنے استاد زامبے جو کہ نائجر کے شہر زندر میں رہتا تھا کو لکھا کہ وہ آ کر حمزہ کو ٹھکانے لگائے۔

زامبے بڑا زبردست قسم کا جادوگر تھا وہ سال میں چھ ماہ غار کے اندر بند رہ کر اپنے عمل کرتا۔ تین ماہ جنگلوں میں بسر کر کے اپنے جاپ کرتا اور دو مہینے دیوی اور دیوتاؤں کے استھانوں پر گزارتا۔ وہ ایک مہینہ لوگوں کو اپنا دیدار کرواتا اور اُن کے مسائل سنتا تھا۔ جب زامبے کو کٹیار کی ناکامی کا پتہ چلا تو وہ ہوا میں اُڑتا ہوا ایدمبر پہنچا۔ پہلے تو اس نے کٹیار کی خوب خبر لی اور اس کو مار مار کر ادھ مُوا کر دیا اور کہا کہ تمہیں اتنے عمل سکھا کر میں نے بے وقوفی ہی کی جو تم ایک

معمولی سے انسان کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ اب میرے ساتھ چلو اور دیکھو کہ کس طرح میں حمزہ کی زندگی اجیرن کرتا ہوں۔ کٹیا اور وہ اڑتے ہوتے حمزہ کے گھر پہنچے۔ حمزہ اس وقت باغیچے میں اپنی بیوی کے ہمراہ بیٹھے تھے۔ زرامبے نے ہاتھ کا اشارہ کیا اور حمزہ کی کھال اُن کے جسم سے اُتر کر زرامبے کے ہاتھ میں آگئی۔ زرامبے کھال لے کر کنوٹا کے پاس پہنچا اور اُسے بتایا کہ اب نہ تو کسی علاج یا جادو سے حمزہ کی کھال اس کے جسم پر چڑھ سکے گی نہ دوبارہ اُگ سکے گی اور اس کا بدبودار جسم اس کو سب کی نظروں میں حقیر کر دے گا اور اس کا جسم چیونٹیاں اور کیڑے کھائیں گے۔ یہ کہہ کر زرامبے کھال لے کر چلا گیا اور کنوٹا بہت خوش ہوا کہ اس نے اسلام کے ایک نام لیوا کو نیچا دکھایا۔ اس کے بعد حمزہ اپنے کمرے میں بند تھے اور ہر وقت اپنے گناہوں کی معافی خُدا سے مانگتے تھے جس کی وجہ سے وہ اس عذاب میں پھنس چکے تھے۔ حج کا زمانہ آیا تو انہوں نے اپنے بیٹے حسن کو کہا کہ تم حج کو روانہ ہو جاؤ اور وہاں غلافِ کعبہ پکڑ کر میرے خُدا سے دُعا مانگو تاکہ خُدا میری معاف فرما دے اور مجھے اس تعفن زدہ بیماری سے نجات مِل جائے۔

اِدھر حسن حج کے لیے روانہ ہوتے تو دوسری طرف سے سعید بن سلام بھی حج ادا کرنے کے لیے مکّہ معظمہ پہنچے۔ دونوں نے اپنا اپنا حج ادا کیا۔ حسن خانہ کعبہ کا غلاف پکڑ کر رو رو کر دُعا مانگ رہا تھا اور عرض کر رہا تھا "اے بارِ الٰہی میرے والد کے گناہ معاف کر دے اور اُس کو اس بیماری سے نجات دے جس سے وہ دوچار ہے"۔ سعید بن سلام نے حسن کی گریہ زاری اور دُعا سُنی تو اس سے پوچھا "تمہیں کیا مسئلہ درپیش ہے مجھے بتاؤ شاید میں تمہاری کوئی مدد کر سکوں"۔ حسن نے بے کم و کاست اپنے والد کی بیماری کا قصّہ سُنا دیا۔ آپ نے حسن کو تسلی دی اور کہا "دیکھو میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ میں تمہارے والد کا علاج کر کے اس کو اس سحر کاری سے نجات دلاؤں گا اور خُدا کے فضل سے تمہارے والد اچھے ہو جائیں گے۔ حسن نے سعید بن سلام کا شکریہ ادا کیا۔ پھر دونوں نے سفر کا آغاز کیا۔ پہلے مدینہ منورہ پہنچ کر انہوں نے حضورؐ کے روضۂ المطہر پر درود و سلام پڑھا، دُعا مانگی اور آگے روانہ ہوتے۔ حسن کے پاس جو اونٹنی تھی وہ بہت خوبصورت اور صبا رفتار تھی۔ دونوں مسافر اونٹنی پر آرام سے سفر کرتے ہوتے جا رہے تھے کہ راستے میں ایک اور سوار جو سانڈنی پر سوار تھا وہ بھی آپ لوگوں کے ساتھ مل گیا۔ سانڈنی کو اس سوار نے ذرا تیز بھگایا تو وہ اونٹنی سے آگے نکل گئی۔ حسن نے بھی اپنی اونٹنی کو تیز بھگانے کے لیے اس کو ایک دو ڈنڈے رسید کیے۔ یہ دیکھ کر سعید بن سلام ناراض ہوتے اور فرمایا "دیکھو حسن! اگر تمہیں اونٹنی کو تیز ہی چلانا ہے تو اس پر آرام سے ہاتھ پھیرو اس طرح مت مارو۔ انشاء اللہ اونٹنی کی رفتار تمہارے حسبِ منشا ہو جائے گی"۔ اس کے بعد حسن نے اونٹنی پر سعید بن سلام کے حکم کے مطابق صرف ہاتھ پھیرا اور اونٹنی میں اتنی تیز رفتاری پیدا ہو گئی کہ وہ سانڈنی سے کئی گنا زیادہ آگے چلی گئی۔ اونٹنی کو آگے جاتا دیکھ کر سانڈنی کے مالک نے اونٹنی کے مالک حسن کو آواز دے کر روکا اور کہا "یہ اونٹنی میرے ہاتھ فروخت کر دو"۔ حسن نے جواب دیا "یہ اونٹنی میں ہرگز فروخت نہیں کروں گا"۔ اسی بات پر دونوں کے درمیان تلخ کلامی ہوتی اور پھر نوبت لڑائی تک جا پہنچی۔ جب دونوں اشخاص تلواریں نکال کر لڑنے لگے تو سعید بن سلام نے اسمِ اعظم کے ذریعہ نہ صرف اونٹنی، سانڈنی اور تلواروں کو غائب کر دیا بلکہ خود بھی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ اِدھر دشتِ تنہائی میں حسن اور سانڈنی کا مالک یہ صورتِ حال دیکھ کر گھبرا گئے اور رونے لگے۔ دونوں نے جھگڑے سے توبہ کی اور اللہ سے معافی مانگی۔ عین اسی وقت سعید بن سلام دونوں تلواروں سانڈنی اور اونٹنی سمیت دوبارہ سامنے آگئے۔ اب حسن نے سعید بن سلام سے معافی مانگی اور آپ کی خواہش پر نہ صرف اونٹنی، سانڈنی کے مالک کو دے دی بلکہ اونٹنی پر جو سامان بھی تھا وہ بھی اس کو دے دیا۔ اس کے بعد سعید بن سلام نے حسن سے کہا "اب تم آنکھیں بند کر لو اور جب تک میں نہ کہوں آنکھیں نہیں کھولنی"۔ حسن نے آپ کے ارشاد کی تعمیل کی اور آنکھیں آپ کے کہنے تک نہ کھولیں۔ جب حسن کو آنکھیں کھولنے کا حکم دیا گیا تو حسن کی حیرانگی کی انتہا نہ رہی کہ حسن آپ کے ہمراہ

ایدمیر میں اپنے گھر کے آگے کھڑا تھا۔

جب حسن اپنے گھر گیا تو اس کی والدہ حیران ہوتی اور کہنے لگی حسن تم اتنی جلدی کس طرح مکہ سے واپس آ گئے۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے تم حج ادا کیے بغیر واپس آ گئے۔ مگر جب حسن نے تمام قصہ سنایا اور سعید بن سلام کی آمد سے اپنی والدہ کو باخبر کیا تو وہ مطمئن ہو گئیں۔

سعید بن سلام کو حسن نے اپنے گھر میں ایک کشادہ کمرے میں رہنے کو جگہ دی۔ وہ کمرہ حمزہ کے کمرہ کے ساتھ ملحق تھا۔ اس طرح سعید بن سلام نے حمزہ کی بیماری بھی ملاحظہ کی۔ حسن نے جب بتایا کہ میرے والد کے پاس سے تو بڑی سخت قسم کی بُو آتی ہے تو آپ نے فرمایا "حسن اب جا کر دیکھو تمہارے والد کے پاس سے بُو کی بجائے خوشبو آتے گی"۔ چنانچہ حسن جب اپنے والد حمزہ کے کمرے میں گیا تو اس کی حیرانی کی انتہا نہ رہی کہ اس کے والد کے پاس سے بُو کی بجائے خوشبو آ رہی تھی۔

اب سعید بن سلام نے حسن سے کہا "میں آج سے اپنے کمرے میں بند ہونے لگا ہوں اور جب تک تمہارے والد صحت یاب نہیں ہوں گے میں کمرے سے باہر نہ نکلوں گا اور تم رگ بھی میرے کمرے کے پاس اس وقت تک نہ آنا"۔ حسن نے آپ سے وعدہ کیا "جس طرح آپ فرماتیں گے اسی طرح ہو گا"۔

آپ نے کمرہ بند کر کے بارگاہِ ایزدی میں سجدہ ریز ہو کر دُعا مانگی۔ "اے خُداوند تعالیٰ تُو نے مجھے جتنا علم دیا ہے مجھے تو اسی پر عبور حاصل ہے اور صاحبِ علم و حکمت تو تیری ذات ہے۔ تُو میری راہنمائی فرما تاکہ میں زامیے جادوگر سے حمزہ کو نجات دلا سکوں"۔ آپ کی دُعا اللہ نے قبول فرمائی اور زامیے جادوگر کا قلع قمع کرنے کا سارا پروگرام اللہ نے آپ کو القا کر دیا اور پھر خُدا نے آپ کو غیبی مدد کے ساتھ لمحہ بھر میں تاتجر پہنچایا اور وہاں سے زندر بھیجا۔ زامیے اُن دنوں غار میں بند تھا۔ اس کو اس کے علم کے ذریعے آپ کی آمد کا پتہ چل گیا اس لیے اس نے غار کے آگے ایک ایسی چٹان رکھ دی جو نہ ٹوٹ سکتی نہ ہل سکتی اور دیکھنے والے کو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے غار کے اندر کوئی انسان موجود نہیں ہو سکتا۔ آپ نے خُدا کا نام لے کر چٹان کو غار کے مُنہ سے ہٹ جانے کو کہا تو چٹان وہاں سے از خود ہٹ گئی۔ چٹان کے ہٹنے سے زامیے نے ایک دہکتی ہوئی آگ غار کے اندر سے آپ کی طرف پھینکی مگر آپ نے کلام الٰہی سے آگ کو ٹھنڈا کر دیا۔ یہ دیکھ کر زامیے غار سے اُڑ کر کسی دوسری سمت چلا گیا۔ آپ نے جب اس کا پیچھا کیا تو اس نے اپنے عمل سے ایسا اندھیرا پھیلا دیا کہ آپ کو کچھ نظر نہ آیا۔ مگر آپ نے کلام الٰہی اور خُدا کی مدد سے زامیے کی تمام تدبیروں کو خاک میں ملا دیا اور آخر کار زامیے کو آپ کے آگے جھکنا پڑا۔ آپ زامیے کو قابو کر کے اس کے ٹھکانے پر لے گئے اور حکم دیا کہ "فوراً حمزہ کی کھال واپس اس کے جسم کے ساتھ لگانے کے لیے میرے ساتھ ایدمیر چلو۔ زامیے نے آپ کے حکم کی تعمیل کی اور کھال جس صندوق میں اُس نے بند کی ہوئی تھی ساتھ لے کر وہ سعید بن سلام کے ساتھ ایدمیر حسن کے گھر اُن کے کمرے میں پہنچا۔ آپ نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا اور حسن کو بلایا اور کہا یہ زامیے جادوگر ہیں۔ انہوں نے تمہارے والد کو اس اذیت میں مبتلا کیا تھا اب یہی اُن کی کھال اُن کے جسم پر لگائیں گے۔ پھر زامیے وہ صندوق لے کر حمزہ کے کمرے میں گیا اور اس نے کھال کو حمزہ کے جسم کے ساتھ لگایا اور اوپر چادر ڈال دی۔ اس کے بعد اُس نے کوئی عمل کیا اور کھال خود بخود حمزہ کے جسم کے ساتھ لگ گئی۔ اب حمزہ ہوش میں آ گئے۔ سعید بن سلام نے حمزہ کو دودھ اور شہد دینے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ دودھ اور شہد پینے سے ان کے جسم میں تازگی آ گئی۔

زامیے سعید بن سلام کی بزرگی سے اس قدر قائل ہوا کہ اس نے فوراً کلمہ طیبہ پڑھا اور جادوگری سے ہمیشہ کیلئے توبہ کر لی۔ اللہ نے اس کا باطن جگمگا دیا۔ حمزہ نے بھی سعید بن سلام کی دست بوسی کی اور شکریہ ادا کیا کہ ان کو آپ کی وجہ سے اتنی

ے نجات ملی۔ زامبے کا اسلامی نام سعید بن سلام نے عبدالرحمٰن رکھا اور اس کو حکم دیا کہ تم اب کنوٹا اور کٹیار سے مل کر
و اسلام کی دعوت دو۔ زامبے جب کنوٹا کے گھر کی طرف روانہ ہوا تو راستے میں اس کو ایک خطرناک سیاہ ناگ کا
منا کرنا پڑا مگر وہ فوراً پہچان گیا کہ یہ میرا استاد مزاجی ہے جس نے مجھے جادوگری اور سحر کاری سکھائی تھی آج یہ
ے تائب ہونے پر سخت ناراض ہے اور ایک ناگ کی شکل میں آ کر مجھ پر حملہ آور ہونا چاہتا ہے۔ زامبے
سانپ کو مخاطب ہو کر کہا "دیکھو میں تمہیں پہچان چکا ہوں۔ لہٰذا ڈرامہ بازی مت کرو۔" یہ سُن کر سانپ انسانی شکل
گیا اور کہنے لگا زامبے تو میرا شاگرد ہے لیکن آج تو اس قدر گستاخ نظر آ رہا ہے نہ تو نے مجھے جھک کر سلام کیا
ہی میرا احترام کیا۔" اس پر زامبے نے کہا "تم جس کالے علم کی وجہ سے میرے استاد تھے اس سے میں نے رشتہ
لیا تو پھر استاد اور شاگردی کا کیا قصہ۔ اب میں نے اسلام قبول کر لیا ہے لہٰذا تمہارے میرے راستے جُدا جُدا ہیں
ن کر زامبے کے استاد مزاجی نے ایسا منتر پڑھا کہ زامبے نہ صرف اسلام کی ساری باتیں بھول گیا بلکہ اس کی مکمل یادداشت
باقی رہی۔ حتیٰ کہ وہ اپنا نام تک بھول گیا اور عجیب سی کیفیت میں تھا کہ کیا کرے کیا نہ کرے۔

ادھر حسن کے گھر سعید بن سلام زامبے کا انتظار کر رہے تھے لیکن جب مغرب کی نماز تک وہ واپس نہ آیا تو حضرت
ن اور اس کے والد حمزہ کو بتا کر زامبے کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ تھوڑی سی مسافت کے بعد ہی اُن کو
مبے مل گیا۔ آپ نے اس کو بلایا لیکن وہ تو آپ کو پہچان بھی نہ سکا۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے کیونکہ تمام قصے سے باخبر
دیا تھا اس لیے آپ نے اس پر قرآنی آیات دم کر کے سحر ختم کیا اور وہ آپ کے قدموں میں گر گیا اور پھر اس کو لے کر
اس کے استاد مزاجی کی شیطانیت ختم کرنے گئے۔ زامبے کا استاد مزاجی اس وقت کنوٹا کے گھر قیام پذیر تھا۔
ر بھی اس وقت وہاں پر موجود تھا۔ آپ نے زامبے کو کنوٹا کے گھر بھیجا وہاں پر مزاجی نے سب کو زامبے کے متعلق
ہ بتا دیا ہوا تھا کہ میں نے اس کو کالے علم سے بے علم کر دیا ہے چنانچہ اب وہ بیکار ہو چکا ہے۔ مگر زامبے
پنے سامنے پا کر مزاجی کے علاوہ کنوٹا اور کٹیار بھی حیران رہ گئے۔ زامبے نے مزاجی کو کہا "استاد اب تمہارے
ے علم بھی بیکار ہو گئے اب تمہاری سزا کا وقت آ گیا ہے۔ یہ بات سُن کر مزاجی نے ایک اُلٹی دیوار زامبے
ہ آگے کھڑی کر دی لیکن زامبے نے دیوار پھلانگ کر کے مزاجی پر جُوتے برسانے شروع کر دیئے۔ جُوں جُوں جُوتے
نز میں مزاجی کے سر پر لگتی تھیں تُوں تُوں اس کے اندر سے کالے علم کا خاتمہ ہوتا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ مار کھا کھا کر مزاجی
ہوش ہو گیا اور کنوٹا اور کٹیار نے مزاجی کو قہر مذلت میں دیکھا تو انہوں نے زامبے کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔ زامبے
اُن کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ اُن دونوں نے مزاجی کا انجام دیکھ لیا تھا اس لیے وہ سخت خوفزدہ ہو گئے
تب انہوں نے بلا چُوں چراں اسلام قبول کرنے کی حامی بھر لی۔ اسی دوران مزاجی بھی ہوش میں آ گیا۔ اس نے بھی
مبے کے قدموں میں گر کر معافی مانگی اور درخواست کی "زامبے مجھے بھی اُس شخص کے پاس لے جا جس نے تمہیں اسلام
دولت سے روشناس کرایا ہے۔" چنانچہ زامبے جس کا اب نام عبدالرحمٰن تھا وہ کٹیار، کنوٹا اور مزاجی کو لے کر حسن بن
زہ کے مکان پر لے آیا۔

حمزہ کو دیکھ کر کنوٹا بڑا شرمندہ تھا۔ اس کو اپنی زیادتیاں یاد تھیں لیکن اب نفرتوں کے الاؤ سرد ہو چکے تھے۔
قصر کا منظر دیدنی اور شنیدنی تھا۔ سب نے ایک دُوسرے کو معاف کر دیا۔ مزاجی، کنوٹا اور کٹیار نے پاک صاف
ر سعید بن سلام کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا اور پھر اسلام کے دیگر ارکان و قوائد سیکھے اور یوں کفر و شرک کا ایک
ع اسلام کی روشنی سے ضیا بار اور منور ہو گیا۔

ادھر بغداد میں سعید بن سلام کے تینوں پیروکار غنیم، سلیم اور اسود اسلام کی تبلیغ میں مشغول تھے۔ انہوں نے اپنی دولت اور اسلام دوستی سے بڑی شہرت پائی۔ انہوں نے مسجدیں اور مدرسے تعمیر کروائے۔ مسلمانوں کے اندر مساوات کی نادر مثال قائم کی۔ غنیم کی دین پروری نے اس کو اور اس کے ساتھیوں کو بہت بلند درجات عطا کیے۔ اُن تینوں کی شادیاں بغداد میں ہی ہوئیں۔ سعید بن سلام اپنی روحانی طاقت سے پرواز کر کے بغداد پہنچے اور وہاں جاکر آپ نے جب اپنے پیروکاروں اور عقیدت مندوں کو اتنے بلند درجات پر فائز دیکھا تو آپ خدا کی بارگاہ میں سجدۂ شکر بجالاتے۔ غنیم اور اس کے ساتھی آپ کو مل کر بہت خوش ہوتے۔ انہوں نے آپ کو اپنے پاس ٹھہرنے پر اصرار کیا مگر آپ نے رُکنے سے اعتراض کیا۔ اور واپس ایدمیرا آگئے۔

اب ایدمیر اسلام کا گڑھ بن چکا تھا۔ حمزہ اور حسن اسلام کے داعی اور علمبردار تھے۔ ایدمیر کی پوری آبادی مسلمان ہو چکی تھی اور وہ سب سعید بن سلام کی اقتدا میں نمازیں عطا کیا کرتے تھے۔ ایدمیر کے ارد گرد کا علاقہ کنوٹا اور کٹیار کے ذریعہ حلقہ بگوش اسلام ہو گیا تھا۔ یوں کنوٹا اور کٹیار کے گھروں میں ہر وقت اسلام کی تبلیغ کا پرچار ہوتا۔ جہاں کے ڈیرے تھے وہاں اب اسلام کا بول بالا تھا۔

سعید بن سلام کو بغداد میں غنیم کے آباد کردہ مسجد و مدرسہ بہت پسند تھے اس لیے آپ نے ایدمیر میں اسی قسم کے مدرسوں کی آباد کاری کا کام شروع کر دیا۔ آپ نے ایدمیر کے لوگوں کو بتایا کہ "میرے دوست غنیم نے دارالسلام کے نام سے ایک بستی بھی آباد کی ہے جس میں اسلام صحیح خطوط پر نافذ ہے۔ کیا تم بھی ایدمیر کو اُسی قسم کی بستی بنانے کے لیے تیار ہو۔ سب لوگ یک زبان ہو کر بولے کہ ہمیں آپ کی سب تجاویز منظور ہیں۔" اس کے بعد آپ نے حسن حمزہ کو نومسلموں کی علوم ظاہری و باطنی تربیت پر مامور کیا۔ مسلمان لڑکیوں اور عورتوں کے بارے وہ لباس کا انتظام نراجی، کنوٹا اور کٹیار کی تعلیم و تربیت سعید بن سلام نے خود کی۔ آپ کی تربیت سے اُن کا جہل ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا وہ خود سراپا ہدایت بن گئے۔ سعید بن سلام اور اُن کے ساتھیوں کی کوشش سے ایدمیر کی بستی اور ارد گرد کا علاقہ ایک اسلامی ریاست بن گیا۔ اب یہ صورت دیکھ کر ارد گرد کی غیر مسلم بستیاں مسلمانوں کو آزار پہنچانے کی سکیمیں بنانے لگیں۔ سعید بن سلام نے ایک وفد ساتسلیٹ کے مطلق العنان حبشی حاکم مالبہ کے پاس بھیجا مگر اُس نے اسلام قبول کرنے کی بجائے ایدمیر والوں سے جنگ کرنے کا فیصلہ کیا۔ مالبہ کی شہ پر ایدمیر کے ارد گرد کے غیر مسلم لوگ بھی مسلمانوں کے خلاف محاذ جنگ بنانے لگے۔ سعید بن سلام چاہتے تو وہ اپنی روحانی قوتوں سے غیر مسلم بستیوں کے مکینوں اور مالبہ کو زیر کر سکتے مگر آپ اپنے پیروکاروں کی جہاد کی تربیت بھی کرنا چاہتے تھے چنانچہ آپ نے ایدمیر کی لڑاکی غیر مسلم بستیوں کا مقابلہ کے لیے کنوٹا اور کٹیار وغیرہ کی سرکردگی میں فوجیں بھیجیں لیکن اُن علاقوں کے سردار جنگ سے پہلے ہی تائب ہو گئے اور مالبہ کے پہنچنے سے پہلے ہی کافی تعداد غیر مسلموں کی مسلمان ہو چکی تھی۔ آپ نے مالبہ کا اور اس کی فوج کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور اُسے شکست فاش دی اور مالبہ آپ کے ہاتھوں ہی فی النار ہو آ۔ مالبہ کے مرنے کی دیر تھی کہ اس کی ساری فوج نے آپ کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور بعد میں سب لوگ مسلمان ہو گئے اور اب ایدمیر کی طرف کوئی میلی نگاہ سے دیکھنے والا نہ تھا۔ آپ کے عقیدت مند ایک سیلاب کی مانند تھے وہ جس طرف اُٹھتے ایک سیلاب سا اُمڈ آتا تھا۔

چاروں طرف سے امن و سکون ہو گیا تھا اور اسلام کی اشاعت پُرامن طریقے سے ہونے لگی تو آپ نے حکم دیا "دیکھو مسلمانوں کی وحدت قائم رکھنے کے لیے ایک امیر کا ہونا بہت ضروری ہے۔ میں تمہارے سا

سحر و افطار کا اہتمام رُوح افزا کے بغیر نا تمام
سحر کے وقت رُوح افزا کا استعمال آپ کو
سارے دن کے لیے توانائی فراہم کرتا ہے
تاکہ آپ تشنگی اور تکان کے بغیر عبادات اور
روزمرّہ کاروبارِ زندگی پوری مستعدی سے
انجام دے سکیں۔
افطار کے وقت رُوح افزا جسم و جاں کو
فرحت و تازگی پہنچاتا ہے اور آپ کو
تازہ دم کر دیتا ہے۔
رمضان المبارک میں روزمرّہ کے
استعمال اور مہمانوں کی تواضع کے لیے
اپنی ضرورت کے مطابق آج ہی
رُوح افزا خرید لیجیے۔
SHARBAT
ROOH AFZA
REGD.
راحتِ جاں رُوح افزا مشروبِ مشرق
ہمدرد
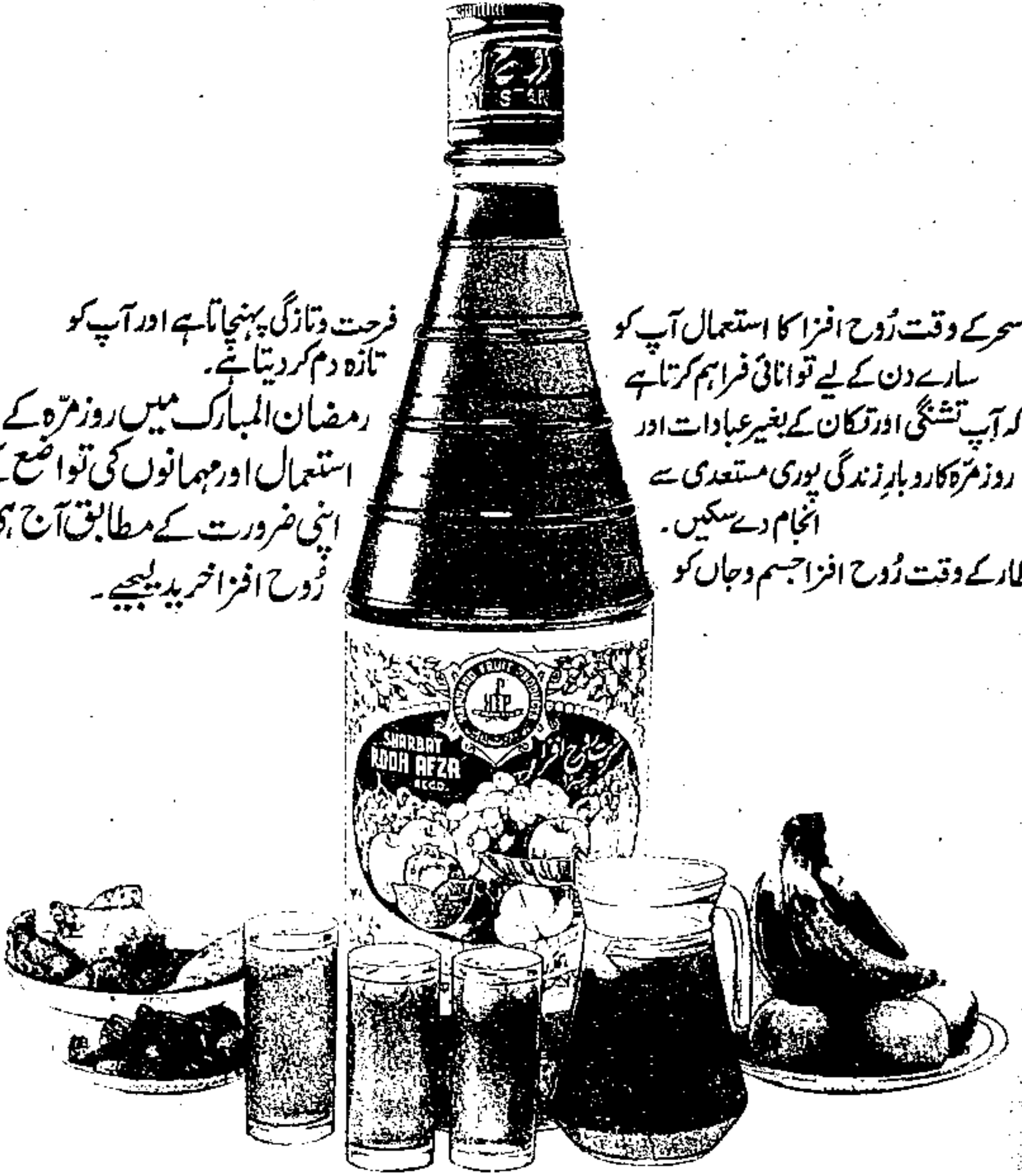
چند لوگوں کے نام پیش کرتا ہوں اس لیے تم اُن میں سے ایک کو اپنا امیر منتخب کر لو۔ سب لوگوں کی خواہش تھی
آپ سے بہتر اور کون ہمارا امیر ہو سکتا ہے مگر آپ نے فرمایا "نہیں تمہیں میرے علاوہ کوئی دُوسرا امیر منتخب
کرنا پڑے گا۔ اس پر لوگوں نے آپ سے درخواست کی کہ فیصلہ آپ ہی کریں گے کہ کون سا ہمارا امیر ہو گا؟ لوگوں
اس درخواست پر آپ نے حسن کو ایدمیر میں مسلمانوں کا امیر منتخب کیا۔ سب لوگوں نے آپ کے انتخاب کے ساتھ اتفاق
کیا اور سب نے حسن کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اس کے بعد آپ نے ایک مجلس شوریٰ تشکیل دی۔ ان تمام کاموں سے
فارغ ہو کر سعید بن سلام نے مسلمانوں کو باجماعت حج کروایا اور حج کے بعد آپ نے اپنے ساتھیوں کو مکہ سے
ایدمیر رخصت کیا اور خود ہمیشہ کے لیے حرم پاک کی خدمت کا کام سنبھال لیا۔ وہ دن کو حرم پاک کی خدمت کرتے
اور رات کو ریاضت میں مشغول ہو جاتے تھے۔ اس عرق ریز عبادت و ریاضت نے آپ کو بہت زیادہ نحیف کر
اور ایک روز خدا تعالیٰ نے آپ کی زندگی بھر کی ریاضت و عبادت کا صلہ دینے کے لیے ———
سعید بن سلام سے پوچھا "بتا میرے بندے تو کیا چاہتا ہے۔" عرض کی بارِ الٰہی میں اب زیادہ دیر دُور نہیں
رہ سکتا مجھے اپنے پاس بُلا لے۔ اللہ نے آپ کی درخواست قبول کر کے آپ کو ہمیشہ کے لیے اپنے پاس بُلا
اور ساری زندگی عبادت و ریاضت میں غرق رہنے والا ولی، عالمِ اسلام کی سربلندی کا غازی اور مسلمانوں
تاجدار سرمدی ملاقات کے لیے خُدا کے پاس چلا گیا۔

✠

مراکش کے قیام کے دوران ایک روز آپ نے خواب دیکھا کہ علامہ عامری پر وقتِ نزع ہے اور وہ
سے ملاقات کے متمنی ہیں۔ آپ بیدار ہونے کے فوراً بعد اُن کی خدمت میں حاضر ہوتے اور دیکھا کہ
عامری سخت علیل ہیں۔ آپ نے اُن کی صحت یابی کی دُعا کی تو وہ ناراض ہوتے اور کہا "سعید ہم نے تمہیں
سے ملا دیا ہے اور جب ہماری ملنے کی باری آتی ہے تو تم دُعا کے ذریعے ہمیں دیدارِ خداوندی سے محروم
کرنا چاہتے ہو۔" اس کے بعد علامہ عامری خُدا کو پیارے ہو گئے۔ مگر انہوں نے ریاضت کا جو پودا سعید
کی شکل میں کاشت کیا اس کی آبیاری وہ اپنی زندگی میں ہی کر گئے پھر دُنیا نے دیکھا کہ اس کاشت کردہ
درخت کی روحانی چھاؤں میں ایک عالم نے پناہ لی اور اُس درخت نے ہر ایک کو سرمدی سکون و کیف
ڈاکوؤں نے اپنا پیشہ چھوڑ کر راہِ ہدایت اختیار کی۔ مشرکوں، کافروں اور خُدا کے باغیوں نے طاغوتی
چھوڑ کر حق کی راہ اپنائی۔ اور حق تعالیٰ نے ان لوگوں کو سعید بن سلام کے ذریعے اسلام کی دولت سے بہرہ
جن کے دل کفر و ظلمت سے سیاہ ہو چکے تھے۔ آپ نے بڑے بڑے جادوگروں، سرکشوں کو زیر کیا۔ جنگ
اور یہ باتیں ثابت کر دکھائیں کہ خُدا کے دین کی نگہداشت کرنے والوں کی خُدا نہ صرف نگہداشت کرتا
کو بلند درجات بھی عطا کرتا ہے اور یہی وہ درجات ہوتے ہیں جن کا مطالعہ ہم سعید بن سلام
کے مندرجات پڑھ کر کر سکتے ہیں۔ خُدا ہمیں بھی ان عنایات سے نوازے جن سے سعید بن سلام
نوازا تھا۔ (آمین)

ایک مجذوب نے کسی مکان کے دروازے پر دستک دی۔ اندر سے نوکر برآمد ہوا اور اُس نے مجذوب سے اُس کی آمد کا مقصد پوچھا۔ مجذوب نے کہا کہ وہ پیاسا ہے اور پانی پینا [چ]اہتا ہے۔ نوکر بولا "تم ٹھہرو میں ابھی پانی لا دیتا ہوں" مگر مجذوب بضد ہوا کہ وہ اس گھر کی مالکن کے سوا [ک]سی کے ہاتھ سے پانی نہیں پیئے گا۔

ابھی دونوں کی تکرار ہو رہی تھی کہ مکان کی مالکہ دروازے پر آگئی اور اُس نے کہا "ٹھیک ہے میں خود [ا]س درویش کو پانی پلاتی ہوں"۔ چنانچہ جب اُس نیک عورت نے مجذوب کو پانی پلایا تو وہ بولا۔

"اے نیک خاتون تو نے مجھے پانی پلا کر میرا کلیجہ ٹھنڈا کیا ہے۔ میں خدا سے دُعا کروں گا کہ وہ تیرے [د]ل کو بھی راحت اور سکون پہنچائے۔ انشاءاللہ کچھ عرصہ بعد تیرے ہاں ایک ایسا بچہ ہوگا جسے دُنیا ایک پیر، [و]لی، درویش اور قلندر کے نام سے یاد کرے گی۔

چنانچہ ایسا ہی ہُوا۔ تھوڑے ہی دِنوں بعد اس خاتون نے ایک چاند سے چہرے والے پھول سے بچے [کو] جنم دیا۔ بچے کے باپ کا نام موید بن ابی تھا جس کے تعلقات وقتِ حاکم کے ساتھ بہت قریبی اور خاصے [خو]شگوار تھے۔ سُلطان نے جب سُنا کہ موید بن ابی کے ہاں بیٹا تولد ہُوا ہے تو وہ مبارکباد دینے کی غرض [س]ے اُن کے گھر آیا۔

سُلطان نے موید بن ابی کے اس نومولود بیٹے کو جب گود میں لے کر پیار کرنا چاہا تو اُس نے دوسری [طر]ف مُنہ پھیر لیا۔ سُلطان جیسے ہی بچے کو پیار کرنے کی غرض سے ہاتھ لگاتا تو وہ زور شور سے رونے [لگ]تا۔ اب تو بچے کے والد کو سُلطان کے سامنے بہت شرمندگی ہوئی۔ اُس نے کہا "اے سُلطان معلوم نہیں بچہ آپ سے دُور کیوں رہنا چاہتا ہے۔

سُلطان کے ساتھ اس کی بیوی بھی تھی۔ اُس نے شوہر سے کہا کہ ممکن ہے پہلی مرتبہ بچہ یوں ہی چلا رہا ہو

آپ دوسری مرتبہ اُس کو گود لینے کی کوشش کریں۔ سُلطان نے جب دوسری مرتبہ بچّے کو چھیڑنا چاہا تو اُس نے پھر پہلے والی حرکت کی اور مزاحمت شروع کر دی۔

اب تو بچّے کے ماں باپ کو بھی خاصی شرمندگی ہوئی مگر اس میں اُن کا بھی کوئی قصور نہ تھا۔ سُلطان بھی عقلمند تھا اُس نے بھی زیادہ محسوس نہ کیا اور اپنی بیوی کے ساتھ واپس لوٹ گیا۔ اِدھر بچّے کی ماں کو وہ درویش یاد آیا جس نے ایک مرتبہ اُس کے ہاتھ سے پانی پیا تھا اور اُس کو بشارت دی تھی کہ بہت جلد اُس کے ہاں ایک ایسا بچّہ جنم لے گا جو اپنے دَور کا ولی اللہ قرار پائے گا۔ سچ مچ یہ بچّہ پیدائشی ولی تھا جس نے شیر خواری میں بھی یہ گوارہ نہ کیا تھا کہ ملک کا سُلطان اور حاکم اُس کو ہاتھ لگائے یا اُسے اپنی گود میں لے۔

پھر ایک عرصہ بعد واقعی پانی پینے والے اُس درویش کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی اور اس بچّے نے آخر کار شیخ مجدالدین بغدادی کے نام سے بے پایاں شہرت پائی۔ وہ نہ صرف ایک صاحب کرامت ولی کے طور پر جانا گیا بلکہ حکیم حاذق بھی ٹھہرا اور بے شمار مریضوں نے حکمت کے اس چشمے سے شفا پائی۔

آپ کے والد محترم موید بن ابی الفتح ایک روز اپنے بیٹے مجدالدین کو سلطان خوارزم کے دربار میں لے گئے۔ اُس وقت مجدالدین کی عمر بمشکل چھ سات برس تھی۔ خوارزم شاہ نے جب ننھے مجدؔ کو پیار سے اپنے پاس بُلانا چاہا تو اُس نے انکار کر دیا۔ یوں موید بن ابی الفتح کو اپنے بیٹے کی وجہ سے سُلطان کے سامنے دوسری مرتبہ شرمندگی ہوئی۔

انہوں نے گھر آکر بیٹے سے پوچھا کہ آخر وہ سُلطان کے قریب جانے سے کیوں انکاری ہے۔ مجدالدین نے انتہائی سادگی سے جواب دیا "بابا جب بھی میں سلطان کی طرف دیکھتا ہوں تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے اُس کے ماتھے پر کوئی کالا ناگ بیٹھا ہوا ور وہ میری جانب یوں دیکھتا ہے کہ جیسے ابھی مجھے ڈس لے گا۔"

چونکہ آپ کے والد موید بن ابی الفتح کا خاندانی پیشہ حکمت تھا۔ اِس لیے اُنہوں نے بیٹے کو بھی طبابت کی تربیت دینا چاہی مگر مجدالدین نے انکار کر دیا اور کہا۔ "بابا میں جسمانی بیماریوں کا نہیں بلکہ روحانی بیماریوں کا معالج بننا چاہتا ہوں۔"

پھر ننھے مجدالدین نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ دُنیا میں روحانی بیماریوں نے لوگوں کو خدا اور اُس کے رسولؐ سے دُور کر رکھا ہے اس لیے وہ علم روحانی پر عبور حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ماں باپ نے بیٹے کو کافی قائل کرنے کی کوشش کی مگر بیٹا اس بات پر مُصر رہا کہ ہر شخص کو اپنے اعمال کا بوجھ اُٹھانا چاہیئے تو پھر میں کیوں نہ بچپن ہی سے اس بوجھ کو اُٹھانے کی تیاری میں لگ جاؤں۔ مجدالدین نے اپنے والد کو واضح طور پر کہہ دیا کہ اُس دُنیا میں اُن کا جی نہیں لگتا۔

چونکہ مجدالدین اُن کا لاڈلا اور اکلوتا بیٹا تھا اس لیے وہ اُس کی ضد ماننے پر مجبور ہو گئے، لیکن اب سوال یہ تھا کہ بیٹے کی اچھی اور مناسب تربیت کے لیے اُسے کس معلّم کے سپرد کیا جائے۔

آخر کافی سوچ بچار کے بعد مجدالدین کو اُس دَور کے مردِ حق اور صوفی بزرگ نجم الدین کبریٰ کے پاس بھجوانے کا فیصلہ کیا گیا۔ اب تو مجدالدین بھی بہت خوش ہوئے اور والدین سے کہنے لگے کہ میں خود بھی نجم الدین کبریٰ کے پاس جا کر تعلیم حاصل کرنا چاہتا تھا۔

مگر جب یہ لوگ نجم الدین کبریٰ کے پاس پہنچے اور انہوں نے اُن کے سامنے اپنی غرض وغایت بیان کی

تو وہ سوچ میں پڑ گئے اور موید بن ابی الفتح سے کہنے لگے کہ آپ کا بیٹا مجدالدین ان کٹھن پُر خار اور سنگلاخ راستوں پر کبھی نہیں چل سکے گا۔

اس پر مجدالدین کی والدہ نے کہا "اے بزرگوار یہ ہمارا اکلوتا لختِ جگر ہے ہم نے بڑے ناز و نعم سے اس کی پرورش کی ہے ہم اس کا دل توڑنا نہیں چاہتے بلکہ ہم خود بچے کی خواہش پر اُسے آپ کے پاس لے کر آئے ہیں کیونکہ روحانیت کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے اسی نے آپ کا نام تجویز کیا تھا۔

نجم الدین کبریٰ نے جب مجدالدین سے پوچھا کہ کیا وہ ان کانٹوں پر چل سکے گا تو اُس نے کہا کہ وہ اس مقصد کے لیے کسی بھی آگ میں سے گزر سکتا ہے اور اب تو اُس نے یہیں جینے اور یہیں مرنے کا تہیہ کر لیا ہے۔

اس پر نجم الدین کبریٰ نے بچے کے ماں باپ سے کہا کہ اب آپ کے بیٹے کا آپ سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ اس لیے آپ اب جا سکتے ہیں چونکہ عزیز بیٹے کی خوشی پوری ہو چکی تھی اس لیے اُس کے والدین اپنی اُداسی اور غم کو چھپا کر واپس لوٹ گئے۔

نجم الدین کبریٰ نے مجدالدین سے کہا کہ آج سے تم نمازیوں کے لیے پانی بھر کر لایا کرو گے جس سے وہ وضو کیا کریں گے۔ مجدالدین نے خوشی خوشی اس حکم کی تعمیل کا وعدہ کر لیا۔ اِدھر جب نمازیوں نے ننھے بچے کو اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے پانی کے بھاری ڈول اُٹھاتے دیکھا تو اُنہیں اس پر بہت رحم آیا۔ آخر ان میں سے ایک نمازی مجدالدین کی والدہ کے پاس جا پہنچا اور اُسے بتایا کہ اس کے بیٹے سے کس قدر مشکل کام لیا جا رہا ہے۔

ماں آخر ماں ہوتی ہے وہ تڑپ کر رہ گئی مگر اُس نے نمازی سے کہا "بھائی میں تو خود اپنی مرضی سے بیٹے کو نجم الدین کے ہاں چھوڑ کر آئی ہوں اب میں کس زبان سے اُن سے شکوہ کروں"۔

نمازی تو اتنا کہہ کر چلتا بنا مگر مجدالدین کی والدہ کو ایک عجیب اذیت میں مبتلا کر گیا۔ اب اُنہیں کسی پل چین نہیں آ رہا تھا اور جب دِل کو کسی طور بھی قرار نہ آیا تو وہ بیٹے کی حالت کا جائزہ لینے پہنچ گئیں۔

نمازِ عصر کا وقت ہو رہا تھا۔ آپ کی والدہ نے دیکھا کہ اُن کا بیٹا مجدالدین نمازیوں کے لیے پانی بھرنے میں مصروف ہے۔ اُس وقت تو وہ خاموشی سے سب کچھ دیکھتی رہیں مگر جب تمام لوگ نماز پڑھ چکے تو وہ نجم الدین کبریٰ کے پاس گئیں اور بولیں۔

"حضرت یہ ٹھیک ہے کہ میں اپنے بیٹے کو اپنی مرضی سے یہاں چھوڑ کر گئی تھی مگر جو کام مجدالدین سے لیا جا رہا ہے میرے خیال میں وہ اُس کی ہمت اور استعداد سے باہر ہے۔ میں صرف یہ گزارش کرنے آئی ہوں کہ اُس کے لیے کوئی اور کام تجویز کر دیا جائے۔

نجم الدین کبریٰ نے کہا۔ خاتون آپ تو خود بھی طبیبہ ہے اور آپ کا تعلق سلطان خوارزم کے دربار سے ہے آپ مجھے یہ بتائیں کہ اگر آپ کے پاس تپ محرقہ کا کوئی مریض لایا جائے اور آپ سے کہا جائے کہ خاتون اُس مریض کو ایک غلام مہیا کر دیں کیونکہ اس مریض کا یہی علاج ہے تو اُس صورت میں آپ کیا کریں گی۔

"حضرت میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی" مجدالدین کی والدہ بولیں "آخر تپِ محرقہ سے غلام کا کیا تعلق ہے۔"

یہی تو مَیں آپ کو سمجھانا چاہتا ہوں کہ آپ کا بچّہ جس مرض میں مبتلا ہے اُسی کا علاج مَیں کر رہا ہوں۔ مانا کہ آپ طبیبہ ہیں حکمت جانتی ہیں، لیکن میرے ہاں آپ کی طبابت کمال نہیں دِکھا سکتی۔ نجم الدین نے تفصیل سے آپ کی والدہ کا جواب دے دیا اور وہ لاجواب ہو کر واپس چلی گئیں۔

چونکہ ایک درویش نے آپکی پیدائش سے پہلے ہی آپکی والدہ کو یہ خوشخبری دے دی تھی کہ اُن کے ہاں ایک ولی اللہ پیدا ہوگا اس لیے مجدّ الدین میں بزرگی اور درویشی کے آثار دکھائی دینے لگے حتیٰ کہ تھوڑے ہی عرصہ میں آپ نے وعظ بھی شروع کر دیا۔

اگرچہ خواتین بھی آپ کا وعظ سُننے آیا کرتی تھیں مگر شاہی خواتین پر پابندی عائد تھی۔ مجدّ الدین اپنے سحر انگیز وعظ کے باعث دُور دُور تک بہت مقبول ہو چکے تھے۔ سلطان خوارزم شاہ کی والدہ نے جب یہ شہرہ سُنا تو انہوں نے ایسی عورتوں سے جو آپ کا وعظ سُن چکی تھیں دریافت کیا کہ مجدّ الدین کس قسم کا وعظ فرماتے ہیں۔ خواتین نے جب اُن کے اندازِ خطابت کی بے پناہ تعریف کی تو اُن کے دِل میں بھی وعظ سُننے کا اشتیاق پیدا ہُوا۔

مگر خواتین نے اُن سے کہا کہ شاہی خواتین پر تو مجدّ الدین کا وعظ سننے پر پابندی عائد ہو چکی ہے۔ آپ یہ وعظ کیسے سُن سکتی ہیں۔

میرے لیے ایسی کوئی پابندی نہیں کیونکہ مَیں سلطان کی ماں ہوں۔ مجھے اُس کی پابندی کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔

چنانچہ سلطان خوارزم کی والدہ جب مجدّ الدین بغدادی کا وعظ سُننے کے لیے گئیں۔ مجدّ الدین نے جب سلطان کی والدہ کو اپنے سامنے پایا تو وہ خوش ہونے کے ساتھ پریشان بھی ہو گئے اور اُن سے کہا "مادرِ محترم! سلطان کو یہ پسند نہیں ہے کہ آپ میرا وعظ سُننے آئیں پھر آپ کیونکر تشریف لے آئی ہیں"

سلطان کی والدہ اس قدر خوبصورت تھیں کہ اس سے پہلے اتنا دلکش چہرہ مجدّ الدین نے ___ کبھی نہیں دیکھا تھا وہ اس بڑھاپے میں بھی کمال کی حسین دکھائی دے رہی تھیں۔

"آپ کیا سوچ رہے ہیں"۔ سلطان کی والدہ نے مجدّ الدین سے پوچھا۔

"مَیں یہی سوچ رہا ہوں مادرِ محترم! کہ آپ کو یہاں نہیں آنا چاہیئے تھا"۔ مجدّ الدین نے کہا۔

"یہ میرا مسئلہ ہے"۔ سلطان کی والدہ بولیں بہرکیف آج مَیں تمہارے وعظ کی محفل میں ضرور شرکت کروں گی۔ چنانچہ سلطان کی والدہ روزانہ مجدّ الدین کی محفل میں شریک ہوتی رہیں اور اُن کے دلکش اندازِ خطابت سے اس قدر متاثر ہوئیں کہ وعظ سنے بغیر اُنہیں چین ہی نہ آتا تھا۔

اُدھر کسی طرح یہ بات سلطان خوارزم شاہ کے کان تک بھی پڑ گئی۔ کہتے ہیں کہ ایک روز وہ بہت زیادہ مخمور سے شغل کرتا ہُوا رات کے وقت کہیں جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ اُس کے دو مصاحبین بھی تھے۔ سلطان نے اُن سے کہا کہ مجھ ایسا شریف النفس حکمران ملنا بہت زیادہ مُشکل ہے۔ کسی دوسرے حکمران میں مجھ ایسی شرافت اور نیکی نہیں ہو سکتی۔ اس پر ایک صاحب نے کہا۔

"عالیجاہ آپ واقعی اپنے خاندان کے واحد فرد ہیں جن کے بارے میں اس قسم کی گواہی دی جاسکتی ہے"۔ مصاحب کا یہ فقرہ سُن کر سلطان سیخ پا ہو گیا اور انتہائی غصّے کے عالم میں بولا "کیا تمہارا دماغ ٹھکانے ہے؟ یہ کیا بکواس کر رہے ہو؟

اسی موقع پر دوسرے مصاحب نے بھی جلتی پر تیل ڈال دیا اور پھر کہا "حضور والا یہ زیادہ بہتر ہوگا کہ آپ والدہ محترمہ سے جا کر مل لیں پھر شاید آپ کسی نتیجہ پر پہنچ سکیں۔"

سلطان خوارزم شاہ نے اُس وقت تو اپنے آپ کو قابو میں رکھا مگر گھر پہنچ کر فوراً والدہ سے ملاقات کی اور کہنے لگا "مادرِ محترم آجکل آپ کے ساتھ کچھ باتیں منسوب کی جا رہی ہیں۔ کیا یہ درست ہے۔ میں نے سُنا ہے کہ آپ شیخ مجدّالدین کا وعظ سُننے جاتی ہیں۔"

ماں نے انتہائی تحمل سے سلطان کی باتیں سُنیں اور پھر قدرے توقف کے بعد بولی۔

"کیا کسی کا وعظ سُننا بُرائی ہے؟ بیٹا شاید تجھے علم نہیں کہ تیرے بعض مصاجین اور درباری بھی شیخ مجدّالدین کا وعظ سُننے کے لیے جاتے ہیں۔"

"مگر میں نے اپنے خاندان کی عورتوں پر پابندی عائد کر رکھی ہے کہ وہ شیخ مجدّالدین کا وعظ سُننے ہرگز نہیں جائیں گی۔" سُلطان سخت لہجے میں بولا۔

"تم دوسری عورتوں پر پابندی لگا سکتے ہو مگر میں تمہارے کسی حکم کی پابند نہیں۔" سلطان کی والدہ یہ کہتی ہوئیں اپنے کمرے میں تشریف لے گئیں۔

مادرِ محترم سے ملاقات کے فوراً بعد اپنے درباریوں کو واضح طور پر حکم دے دیا کہ اگر کسی نے خاتون کو گھر سے باہر نکلنے دیا تو اُس کا سر قلم کر دیا جائے گا۔

اس وجہ سے خوارزم شاہ کی والدہ بھی کچھ ماہ تک گھر سے باہر نہ نکل سکیں مگر جب ایک مرتبہ سلطان کسی کام سے بخارا سے باہر گیا ہوا تھا تو اُن کی والدہ دوبارہ شیخ مجدّالدین بغدادی کا وعظ سُننے چلی گئیں۔ جیسے ہی وعظ ختم ہُوا تو مجدّالدین نے ایک بار پھر سلطان کی والدہ سے گزارش کی کہ وہ اُن کا وعظ سُننے نہ آیا کریں۔"

"تو پھر مجھے کیا کرنا چاہیئے۔" سلطان کی والدہ نے پوچھا۔

آپ کو فی الحال سلطان کو ایک بیٹا نہیں بلکہ حاکمِ وقت سمجھ کر اُس کے حکم کی پابندی کرنی چاہیئے۔

سلطان خوارزم کی والدہ کو شیخ مجدّالدین کی بات سنکر انتہائی قلق ہُوا وہ جب واپس محل میں پہنچیں اُس وقت سلطان واپس آچکا تھا اور [illegible] نے والدہ کو محل میں موجود نہ پا کر ایک طوفان اُٹھا لیا۔ کئی درباریوں کی فوری گرفتاری کا حکم دے دیا گیا۔ اس غصّے کے عالم میں بھی سُلطان شراب کے جام چڑھاتا رہا اور بار بار اپنے مصاحبوں سے پوچھتا رہا کہ آخر شیخ مجدّالدین میں ایسی کیا بات ہے کہ میری ماں وہاں ہر حال میں جانا چاہتی ہے۔

اس موقع پر ایک چغل خور نے کہا "سرکار اگر آپ ناراض نہ ہوں تو میں آپ کو اس کا جواب دے سکتا ہوں۔"

"فوراً بتاؤ۔" سلطان اُس چغل خور کی جانب متوجہ ہُوا۔

چغل خور نے انتہائی دروغ گوئی اور غلط بیانی سے کام لیتے ہُوئے کہا "سرکار آپ خود ہی بتائیے بھلا ایک بیوی کو اُس کے شوہر کے پاس جانے سے کیسے روکا جا سکتا ہے۔"

یہ سن کر سُلطان خوارزم شاہ کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اُس نے چغل خور کے مُنہ پر تھپڑ رسید کرتے ہُوئے کہا "کیا بکتے ہو؟"

چغل خور نے ہمت کرتے ہوئے کہا "میں بالکل درست کہہ رہا ہوں عالی جاہ ۔ آپ کی والدہ محترمہ نے شیخ مجدالدین سے نکاح کر لیا ہے اور اب وہ دونوں میاں بیوی بن چکے ہیں۔"

اس سے پیشتر کہ سلطان کسی ردِ عمل کا اظہار کرتا چغل خور نے مزید مکاری سے کہا "سرکار اگر اس میں ذرہ برابر بھی جھوٹ ہو تو بے شک آپ میرا سر قلم کر دیں۔"

اب تو سلطان کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا ۔ یہ انکشاف اُس پر ایک بجلی بن کر گرا ۔ پھر اچانک اس نے تالی بجا کر جلادوں کو بلوایا اور انہیں حکم دیا کہ فوری طور پر جاؤ اور شیخ مجدالدین کو گھسیٹتے ہوئے دریا تک لے جاؤ ۔ اور اُسے گہرے پانی میں ہمیشہ کے لیے غرق کر دو۔"

حکمِ حاکم اور مرگِ مفاجات کے مصداق جلادوں نے فوراً سلطان کے حکم کی تعمیل کی اور شیخ مجدالدین کو رسیوں سے جکڑ کر پانی میں ڈبو دیا۔

اِدھر جب شیخ صاحب کے مریدوں اور جانثاروں نے یہ منظر دیکھا تو ہر طرف کہرام مچ گیا ۔ کچھ لوگ بھاگتے بھاگتے شیخ صاحب کے مرشد بابا نجم الدین کے پاس پہنچے اور انہیں سارا ماجرا کہہ سنایا ۔ بابا نجم الدین نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور مراقبے کی حالت میں شیخ مجدالدین کے غرق ہونے کا منظر دیکھا اور زیرِ لب اِنّا لِلّٰہ واِنّا الیہِ راجعون پڑھتے ہوئے غصے کی حالت میں فرمایا۔

"اے ظالم خوارزم شاہ یہ تو نے کیا غضب ڈھایا تو نے میرے فرزندِ ارجمند کو مار ڈالا۔" کافی دیر آپ اسی سجدے میں پڑے رہے اور پھر لوگوں سے مخاطب ہوئے۔ "لوگو! میں نے مجدالدین کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ سے درخواست کی تھی کہ سلطان سے مجدالدین کا خون بہا ادا کرا دے ۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمیں آگاہ کیا گیا ہے کہ مجدالدین کے خون بہا کے طور پر سلطان سے اُس کی حکومت اور تخت و تاج لے لیا گیا ہے۔

دوسری جانب جب سلطان تک آپ کے جذبات پہنچے تو وہ اپنے آپ کو ملامت کرنے لگا کہ میں نے کیا کر دیا ۔ اُس نے ایک طشت سونے سے بھرا اور پیدل چلتا ہوا بابا نجم الدین کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگا۔

"اعلیٰ حضرت! میں اپنے کیے پر سخت نادم ہوں ۔ میرے اختیار میں یہ تو نہیں کہ میں آپ کے فرزند کو زندہ کر سکوں مگر خون بہا کے طور پر سونے کا یہ طشت حاضر ہے ۔ ساتھ تلوار بھی پیش کرتا ہوں اگر آپ مناسب فرمائیں تو قصاص کے طور پر میرا سر بھی قلم کر سکتے ہیں۔"

بابا نجم الدین نے کہا "سلطان! میرے فرزندِ ارجمند کا خون بہا سونے کا یہ تھال نہیں ہو سکتا بلکہ اس کا خون بہا تیرا ملک تیرا سر اور بہت سے لوگوں کا قتلِ عام ہے۔" نجم الدین کے کلمات سُن کر سلطان خوارزم شاہ کا رواں رواں کانپ اُٹھا ۔ وہ ندامت اور شرمندگی کا احساس لیے فوراً اپنے محل پہنچا اور شاہی خادموں کو حکم دیا کہ فوراً دریا سے شیخ مجدالدین کی لاش نکالی جائے اور اُسے اُس کی بیوہ کے سپرد کر دیا جائے۔ چنانچہ سلطان کے حکم پر ایسا ہی کیا گیا۔

بابا نجم الدین نے مراقبے میں شیخ مجدالدین کے خون بہا کے لیے خدا سے درخواست کی تھی اُس کا نتیجہ اس صورت میں نکلا کہ چنگیز خان قہرِ الٰہی بن کر بخارا میں داخل ہوا ۔ اُس نے ہر شے تباہ کر دی ۔ خوارزم شاہ جو یہ دیکھ کر بخارا فرار ہو گیا تھا ۔ چنگیز خان نے وہاں تک اُس کا پیچھا کیا اور اُسے انتہائی بے دردی

کے عالم میں قتل کر دیا۔ یوں اللہ کے ایک نیک بزرگ اور ولی کی جان لینے کے جرم میں وقت کے ایک جابر اور سفاک حاکم کو انتہائی عبرت ناک انجام تک پہنچنا پڑا۔

شیخ مجدالدین بغدادی نے تصوف اور معرفت میں وہ بلند مقام بہت کم عرصے میں حاصل کر لیا، جس کے لیے صدیوں کی ریاضتیں عبادتیں اور مجاہدے درکار ہوتے ہیں۔ جب آپ تعلیم و تربیت کی غرض سے نجم الدین کے ہاں مقیم تھے اُس وقت وہاں پر سماع کی محافل بھی منعقد ہوا کرتی تھیں جس میں خصوصی شخصیات شرکت فرماتیں۔

ایک سیاہ فام درویش بھی یہاں پر موجود ہوتا تھا جو کہ بابا نجم الدین کا مُرید تھا۔ مضبوط جسم کا مالک یہ حبشی درویش اپنا زیادہ تر وقت تخلیے میں گزارتا تھا چونکہ بابا نجم الدین اس حبشی مُرید کو بہت عزیز رکھتے تھے اس لیے دوسرے مُرید اور ارادت مند اُس کی بہت زیادہ عزت کرتے تھے۔ اس سیاہ فام حبشی کو کو سماع کی محافل سے کوئی خاصی دلچسپی نہ تھی جس وقت محفل سماع بپا ہوتی تو اُس دوران بھی وہ اپنے حجرے سے باہر قدم نہ رکھتا۔

حسبِ معمول ایک روز محفلِ سماع اپنے عروج پر تھی اور حبشی مُرید بھی عادت کے مطابق اپنے حجرے میں بیٹھا مصروفِ عبادت تھا۔ مجدالدین بھی سماع کی محفل میں شریک تھے کہ خلافِ توقع حبشی درویش وہاں آگیا۔ اُس کی حرکات و سکنات سے یہ تاثر ملتا تھا کہ اُس پر وجد کی کیفیت طاری ہے۔ کچھ دیر تک تو وہ بیٹھا سر دُھنتا رہا اور پھر چیتے کی مانند ایک جست لگا کر مجدالدین کے کندھے پر سوار ہو گیا۔ دوسری جانب مجدالدین جو کہ نرم و نازک جسم کے مالک تھے وہ بھی وجد کی حالت میں تھے مگر حبشی درویش کی اس حرکت سے اُن کے وجد کی کیفیت میں کوئی فرق نہ آیا۔

تھوڑی دیر بعد جب سماع کی محفل ختم ہوئی تو سیاہ فام درویش مدہوشی کے عالم میں وہیں فرش پر لیٹ گیا۔ قریب ہی دوسرے لوگ بیٹھے یہ سارا منظر دیکھ رہے تھے۔

انہوں نے کہا "مجدالدین ہم تو آپ کو بہت نحیف اور کمزور سمجھتے تھے مگر آپ نے ایک بھاری بھر کم حبشی کا بوجھ برداشت کر کے ہم سب کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ہے۔ مجدالدین نے لوگوں کو جواب دیا "بھائیو میں تو خود وجد کی کیفیت میں بیٹھا تھا مجھے تو احساس ہی نہیں ہوا کہ وہ حبشی درویش میرے اوپر آ کر گرا اور اس کا کس قدر بوجھ تھا بلکہ سماع کے دوران میں مضطرب و متحرک چلتا پھرتا بھی رہا۔" یہ سُن کر وہاں پر موجود تمام لوگ بہت حیران ہوئے کیونکہ انہوں نے خود اپنی آنکھوں سے کافی دیر تک اُس بھاری بھر کم حبشی درویش کو مجدالدین کے کندھے پر پڑے دیکھا تھا۔

مجدالدین نے اپنے پیر و مرشد بابا نجم الدین کی خاص اجازت اور مشورے سے نیشاپور کے ایک معزز گھرانے میں شادی کی مگر شادی کے بعد بھی آپ زیادہ تر وقت اپنے پیر و مرشد بابا نجم الدین کے آستانے پر گزارتے۔ دُنیا داری سے آپ کو بہت کم لگاؤ تھا۔

آپ سے ایک دلچسپ واقعہ یوں منسوب ہے کہ کسی نے آپ سے پوچھا "حضرت آپ کا کیا حال

اور کیا آپ نے سُکر پر غلبہ پالیا ہے۔"
آپ نے جواب میں فرمایا "سُکر نے میرے بطن کی آنکھیں کھول دی ہیں۔ ہم کبھی بط کا انڈا تھے جو ایک دریا کے کنارے پڑا تھا۔ پھر ہمارے پیر و مرشد نجم الدین نے اسے دیکھا اور ہمیں اپنی تربیت کے پروں میں چھپا لیا چنانچہ اس طرح ہم انڈے سے باہر آ گئے۔ انڈے سے باہر آنے کے بعد ہم بط کے بچے کی مانند ہی دریا کے اندر اُتر گئے مگر ہمارے پیر و مرشد کنارے پر ہی کھڑے رہے۔
چند لمحوں بعد جب آپ کی یہ کیفیت ختم ہوئی تو ایک مُرید نے آ کر آپ کو اطلاع دی کہ بابا نجم الدین آپ کو یاد فرماتے ہیں۔
"کیا انہوں نے اسی وقت ہمیں یاد فرمایا ہے۔" مجدّ الدین نے دریافت کیا۔
جی ہاں مجھے حکم ہوا ہے کہ آپ کو ساتھ لے کر ہی جاؤں۔
یہ بھلا کیسے ہو سکتا تھا کہ پیر و مرشد یاد فرماتے اور مجدّ الدین سے ذرا برابر بھی تاخیر ہوتی۔ سو وہ اُسی وقت بابا نجم الدین کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ نجم الدین اُس وقت انتہائی غصے اور جلال کے عالم میں تھے انہوں نے اس کیفیت میں نجم الدین کو پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔
"کیا آپ نے مجھے یاد فرمایا ہے بابا" مجدّ الدین نے انتہائی عاجزی سے دریافت کیا۔
"ہاں" نجم الدین نے غصے کی حالت میں جواب دیا۔ اور پھر پوچھنے لگے "مجدّ الدین تو بط اور انڈے کی کیا کہاوتیں بیان کر رہا تھا۔ تُو نے یہ کس خیال کے تحت کہہ دیا کہ میں نے تجھے بط کے انڈے کی مانند اپنے پروں کے نیچے لے لیا اور تُو انڈے سے پیدا ہو کر دریا میں اُتر گیا۔
پیر و مرشد کی بات سُن کر مجدّ الدین بہت زیادہ سہم گئے اور ڈرتے ڈرتے بولے "اعلیٰ حضرت مجھے معاف کر دیجئے کیونکہ میں نے سب کچھ سُکر کی حالت میں کہہ دیا تھا۔"
اِس پر نجم الدین بولے "میں تجھے معاف کر بھی دوں تو اِس سے کیا فرق پڑے گا۔ کیونکہ تُو نے جو کچھ کہہ دیا ہے اُسے بھلا کون جھٹلا سکتا ہے۔" پھر وہ مزید کہنے لگے "مجدّ الدین تُو نے جو کچھ کہا ہے وہ تیرا مقدر ہے اور تجھے دریا میں موت آئے گی۔"
اور پھر دیکھنے والوں نے بعد میں دیکھ ہی لیا کہ پیر و مرشد کی بات کس قدر درست ثابت ہوئی اور سلطان خوارزم شاہ کے ظلم اور بے عقلی کی وجہ سے اُس کے حکم پر مجدّ الدین کو دریا میں ڈبو دیا گیا اور اسی حالت میں وہ جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ خوارزم شاہ کو اس گستاخی کی کتنی بڑی سزا ملی مگر مجدّ الدین کے مرشد محترم کا کہا ہوا حرف بہ حرف درست ثابت ہوا اِس سے یہ اندازہ لگانا بھی مشکل نہیں رہتا کہ جس بزرگ کے پیر و مرشد اتنے صاحبِ کرامت اور صاحبِ کمال تھے خود اُن کا مرتبہ کس قدر بلند ہو گا۔
آپ حسن و جمال کے پیکر تھے سلطانوں اور حکمرانوں کو ہمیشہ آپ نے اپنا حریف جانا۔ بلاشبہ مجدّ الدین بغدادی تصوّف کی تاریخ کا ایک ایسا دلچسپ اور حیرت انگیز کردار تھے جنہیں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

حکومت برطانیہ نے جب پنجاب کا الحاق کیا تو چنیوٹ شہر بھی انگریزوں کے تسلط میں آگیا۔ اس علاقے میں ہملٹن کا تقرر پہلے ڈپٹی کمشنر کے طور پر کیا گیا۔ چنیوٹ کے بااثر اور متمول خاندانوں نے ماسوائے سادات گیلانی خاندان کے انگریزوں کا تسلط قبول کر لیا۔ اس عہد میں چنیوٹ میں حضرت نور احمد نقشبندیؒ جیسی جریدہ عصر اور یگانہ روزگار ہستی کا بھی قیام تھا۔ آپ انگریزوں کے سخت خلاف تھے۔ آپ کی نفرت فرنگی قوم کے لیے اس قدر تھی کہ آپ کا کوئی مرید انگریزی حکومت کا ملازم نہ تھا۔ اور آپ سے محبت کرنے والوں کے لیے یہ شرط تھی کہ انگریزی حکومت کی ملازمت ترک کرنی ہو گی۔ یہی وجہ تھی کہ آپ کے مریدین اور متعلقین بھی یاد الٰہی اور علمی و روحانی مصروفیات کے علاوہ جہاد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ آپ کے خدام نے ایڈورڈز کی فوجوں کے سامنے سینہ سپر ہو کر دین اسلام کو سربلند کیا تھا۔

آپ کی حق گوئی، بیباکی کا یہ عالم تھا کہ کسی کے منصب کی کچھ پرواہ نہ کرتے تھے۔ آپ نے قید و بند اور دار و رسن کی صعوبتیں برداشت کیں لیکن باطل کے سامنے سرنگوں نہیں ہوتے۔ ایک مرتبہ خلیفہ سعید الدین جو انگریزی حکومت میں محکمہ تعلیم کے سرکردہ آفیسر تھے۔ جب اُن کا تقرر چنیوٹ میں ہوا تو انہوں نے شاہی مسجد میں نماز جمعہ پڑھانے کا سلسلہ شروع کیا۔ مگر حضرت نور احمد صاحب نے ان کو کہا "واعظ کو پہلے اپنے اخلاق کی اصلاح کرنی چاہیے۔ آپ انگریز کے غلام ہیں۔ اس لیے آپ اسلام کے دشمنوں کے ساتھی ہیں۔ اس لحاظ سے آپ کا رزق حلال نہیں ہے اور کسی واعظ کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ خود اخلاقی لحاظ سے پست ہو اور دوسروں کو نصیحت کرے۔" خلیفہ سعید الدین کو آپ کی باتیں بڑی ناگوار گزریں۔ انہوں نے آپ کے خلاف حکومت کو لکھا کہ "آپ انگریز سرکار کے خلاف لوگوں کو اکساتے ہیں اور جہاد پر آمادہ کرتے ہیں۔"

آپ کے خلاف ڈپٹی کمشنر جھنگ نے گرفتاری کے احکام صادر کیے اور چنیوٹ کے تحصیلدار کو اس کام پر مامور کیا گیا۔ گرفتاری کے وقت آپ کو متعدد بار ہتھکڑی لگانے کی کوشش کی گئی مگر ہر مرتبہ ہتھکڑی خود بخود کھل جاتی۔

آخر کار آپ کو بغیر ہتھ کڑی کے جھنگ عدالت میں پیش کیا گیا۔ آپ کے مریدین کو خطرہ لاحق تھا کہ آپ کی تلخ گوئی کی بدولت انگریز حکام پہلے ہی مسلمانوں سے بلکہ آپ جیسے بزرگانِ دین سے متنفر ہیں اور کہیں آپ کو کوئی سزا ایسی نہ ملے جس سے اُن کے دل مجروح ہوں۔ لہٰذا سب مریدوں نے عرض کی "حضرت! یہ وقت اظہارِ حق کا نہیں ہے انگریز تو مسلمان علماء کو سولی پر چڑھانے کے بہانے چاہتا ہے۔ آپ براہِ کرم عدالت کے سامنے خاموش ہی رہیں تو بہتر ہے۔"
آپ نے مریدوں کو کہا "مردانِ حق آگاہ کسی میدان سے نہیں ڈرتے۔ اپنے موقف اور حق بات پر ڈٹ جانا عین عبادت ہے۔ موت سے ڈر کر کسی کی غلامی قبول کر لینا کہاں کی دانشمندی ہے۔"
چنانچہ آپ کو جب عدالت میں پیش کیا گیا تو ڈپٹی کمشنر نے مقدمہ کی کارروائی اگلے روز پر ملتوی کر دی اور آپ کو حوالات میں بند کر دینے کا حکم دیا۔ آپ نے پوری رات حوالات کے اندر یادِ الٰہی میں بسر کی۔ کیف و سرور میں اس قدر مگن ہوتے کہ پوری رات گزرنے کا آپ کو پتہ بھی نہ چلا۔ ادھر ڈپٹی کمشنر کو اچانک دردِ قولنج شروع ہوا۔ ہر چند معالجین کی سعی بلیغ کرنے کے باوجود درد میں کمی کی بجائے اضافہ ہی ہوتا گیا۔ آخر ایک مسلمان ملازم نے ڈپٹی کمشنر کی توجہ آپ کی طرف مبذول کرائی اور آپ سے دم کروانے کا مشورہ دیا۔ آپ کو فوراً حوالات سے بلایا گیا۔ آپ نے جواباً کہلا بھیجا کہ ڈپٹی کمشنر کو از خود میرے پاس حوالات میں آنا چاہیے۔ ناچار ڈپٹی کمشنر کو چارپائی پر ڈال کر حوالات لایا گیا۔ آپ نے اپنا عصا ڈپٹی کمشنر کے پیٹ پر رکھا اور خدا کی شان کہ درد فوراً رخصت ہوا۔ آپ کی اس کرامت نے ڈپٹی کمشنر کو آپ کے موافق کر دیا اور اس نے آپ کو نہایت احترام کے ساتھ رخصت کرنے کے احکام جاری کر دیئے۔

❖

یہ ذکر تھا ایک سچے، کھرے اور مخلص انسان کا جو اپنی ذات کے اندر ایک دانش کدہ تھا۔ جو نسلیں سنوارتا رہا، گنہگاروں کو نیک بناتا رہا اور سرِ راہ کھڑے ہو کر صدا لگاتا کہ ہے کوئی پیاسا جسے چشمہ آبِ حیات کا راستہ دکھاؤں، ہے کوئی پارکھ جسے کیمیاگری سکھاؤں، ہے کوئی طالبِ روحانیت جسے بہرہ ور کروں۔ اس متاثر کرنے والی شخصیت کو دنیا حضرت قبلہ فقیر نور احمد نقشبندی کے نام سے جانتی اور مانتی ہے۔
حضرت فقیر نور احمد صاحب گجرات کے علاقہ موسیٰ چوہیاں میں تقریباً ۱۲۲۰ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد مولانا گل احمد صاحب اپنے علاقے اور وقت کے مشہور متقی اور پرہیزگار بزرگ تھے۔ آپ کے اسلاف میاں جان محمد، میاں اللہ داد اور میاں محمد حسینؒ بھی اہلِ روحانیت گزرے ہیں۔ آپ کا تعلق مارتھ قوم سے تھا۔ کا پورا خاندان ہی زہد و ورع میں ایک مقام رکھتا تھا۔ فقیر نور احمد بچپن سے ہی نہایت لائق اور ذکی تھے۔ آپ کی ذہانت کا یہ عالم تھا کہ انتہائی کم عمری میں قرآن مجید حفظ کر لیا۔ ابتدائی تعلیم آپ نے اپنے والد ماجد سے ہی حاصل کی۔ فقہ، حدیث، تفسیر اور دیگر علوم دینیہ آپ نے مولانا غلام محی الدین بگویؒ صاحب سے حاصل کی۔ آپ کو علوم و بہرہ ور کرنے میں آپ کے دادا مولانا فضل الدینؒ کا بھی حصہ ہے۔ اس کے بعد آپ نے تزکیہ نفس اور روحانیت میں اعلیٰ مقام حاصل کرنے کے لیے اولیائے کاملین اور صوفیا ۔۔۔۔ واصلین کی تلاش شروع کی۔ آپ اس راہ میں مشائخ عظام اور اولیائے کرام کی زیارت و صحبت سے شرف یاب ہوتے۔ اور اسی روحانیت تلاشی اور جہاں گردی میں ہی آپ کی ملاقات قیوم زمان، عمدہ اولیا، زبدۃ الاصفیا سیدنا امام علی شاہ صاحبؒ سے بمقام ذکر حضرت المعروف مکان شریف (انڈیا) میں ہوئی۔ آپ نے حضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت ہونے کی گزارش کی جس کو قبول کر چنانچہ بیعت و خلافت حاصل کر کے آپ تین برس تک حضرت کی خدمت میں حاضر رہے۔ اور روحانیت میں انجامِ کمال

کتے۔ آپ کو اپنے شیخ سے والہانہ محبت تھی۔ جب بھی اُن کا ذکر ہوتا تو آپ آنکھیں بند کر کے یوں جذب اور شیفتگی سے باتیں کرتے کہ جیسے مسافت سمٹ گئی ہو اور حضرت اپنے شیخ کے حلقۂ ارادت منداں جا پہنچے ہوں۔ تین سال کی قربت کے بعد جدائی بڑی تکلیف دہ تھی مگر آپ مُرشد کے حکم سے سرتابی بھی نہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ اجازت نامہ کے بعد وہاں سے رخصت ہوتے۔

تعلیم و تربیت حاصل کرنے کے بعد حضرت نور احمد صاحبؒ نے اپنے آبائی پیشہ کھیتی باڑی کو ہی اپنایا اور کاشت کاری کے ساتھ مُردہ دلوں کی روحانیت کے ساتھ آبیاری بھی کرتے رہے۔ آپ کو اپنے مرشد کے ساتھ جو والہانہ محبت و عقیدت تھی اس کا اظہار آپ نے کئی قصائد و رسائل کی شکل میں فرمایا۔ آپ کے مرشدِ عالی نے بھی اپنے ایک مکتوب میں آپ کے متعلق فرمایا ہے کہ جس طرح نور احمدؒ نے مجھ سے فیض حاصل کیا ہے ایسا روزمانہ میں کہیں کہیں ہی ہوتا ہے۔

آپ کے مریدوں میں ایک عفیفہ خاتون "بہشتاں" نامی تھیں وہ بیوہ تھیں۔ اس کو اپنے بھائیوں سے بہت بد اُمیدی اور بھائیوں نے اس کو گھر سے نکال دیا اور دربدر کر دیا۔ وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتی اور اپنی داستان۔ آپ نے اس کو بیٹھنے کا حکم دیا اور خادم کو فرمایا "میرے حجرے میں فلاں جگہ ایک ڈبہ پڑا ہے اس کو اُٹھا لاؤ" خادم نے حکم کی تعمیل کی اور وہ ڈبہ اٹھا لایا۔ آپ نے ڈبہ کھولا تو اس کے اندر ایک بہت بڑا بچھو بیٹھا تھا۔ ڈبہ کھولتے ہی وہ حرکت میں آگیا۔ آپ بچھو کی طرف اشارہ کر کے بہشتاں سے مخاطب ہوتے اور فرمایا "دیکھو بہشتاں! اس بچھو کو کوئی چھ ماہ قبل کسی دوائی کی تیاری کی غرض سے اس ڈبے میں بند کیا گیا تھا۔ مگر یہ بغیر خوراک کے اتنا عرصہ زندہ رہا ہے۔ اللہ کو اسے زندہ رکھنا مقصود تھا۔ لہٰذا یہ اس قید میں بھی زندہ رہا اور اگر خدا کو تمہاری بھلائی مقصود ہے تو وہ ہو کر رہے گی تمہارے بھائی اس میں رکاوٹ نہیں ڈال سکتے۔ اللہ تعالیٰ حقیقی رزاق ہے اور اس کے دیتے ہوتے رزق کے سامنے دنیاوی رزق کی کوئی وقعت نہیں۔" آپ کی حکیمانہ بات وہ نیک سیرت خاتون سمجھ گئی اور اطمینانِ قلبی کے ساتھ واپس چلی گئی۔

حضرت نور احمد صاحب اپنے دور کے نابغہ عصر بزرگ تھے۔ آپ کے زمانہ میں جو مشائخ عظام گزرے تاریخ کے اوراق اُن کے سنہری اسمائے گرامی سے آج بھی تاباں اور روشن ہیں۔ خواجہ شمس الدین سیالویؒ، خواجہ خان عالمؒ، مولانا غلام رسول قلعیؒ، مولانا عبید اللہ ملتانی اور خواجہ غلام نبی للّٰہیؒ جیسی جریدہ عصر ہستیاں کاروانِ روحانیت میں آپ کے ہمراہ و ہمرکاب تھیں۔

آپ جمعہ کے روز اپنے عقیدت مندوں کو ایک بصیرت افروز درس دیا کرتے تھے۔ اور مریدین کو عام اجازت تھی اس لیے وہ بھی اپنے دل میں پوشیدہ سوال کرتے تھے اور آپ اُن کو آسان پیرائے اور عام فہم کے انداز میں جواب دے کر اُن کی تالیفِ قلبی کا سامان پیدا کرتے تھے۔ آپ کی روح پرور محافل اور تربیت کا ہی اثر تھا کہ آپ کی قربت میں داخل ہوتے ہی غیر مسلم بھی فوراً مسلمان ہو جایا کرتے تھے۔
ایک مرتبہ ایک بہت بڑے حکمران اپنے چند حواریوں کے ساتھ آپ کے گھر آتے اور آپ سے ملنے کی خواہش

کی۔ آپ کے مرید خاص مرزا نظام الدین گھر سے باہر تشریف لاتے اور آنے والوں کو بتلایا "حضرت اس وقت تلاوت قرآن مجید میں مشغول ہیں اور ابھی کافی دیر کے بعد وہ اپنے حجرے سے باہر آئیں گے۔ تب تک آپ لوگ بیٹھیں اور ان کا انتظار کریں۔" آنے والے لوگوں کو اپنے شاہی کروفر پر بڑا ناز تھا۔ انہوں نے مرزا نظام الدین سے کہا ہم بہت جلدی میں ہیں اور فی الفور ملنا چاہتے ہیں۔" موصوف نظام الدین دوبارہ اندر گئے اور حضرت نور احمد صاحب کو حقیقت بتائی۔ حضرت نے جب آنے والوں کا تحکمانہ انداز تخاطب سنا تو فوراً فرمایا "جاؤ اور اُن سے کہہ دو میں اس وقت دونوں جہانوں کے مالک خالق کائنات کا کلام پڑھنے میں مصروف ہوں اور خدا کی درگاہ میں بیٹھ کر میں کسی دُنیاوی حکمران کی پروا نہیں کرتا۔ انتظار کر سکتے ہو تو کرو ورنہ چلے جاؤ۔"

مرزا نظام الدین نے ساری بات آنے والے حکمران اور اُن کے ساتھیوں کو بتائی۔ حاکم یہ سُن کر خوش ہوا کہ میں صرف یہی دیکھنے آیا تھا کہ حضرت نور احمدؒ کو ولایت و روحانیت میں کس قدر دسترس حاصل ہے اور اب میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے اور کانوں سے سُن لیا ہے کہ اہل اللہ واقعی غیر اللہ سے نہ ڈرتے اور نہ ہی پرواہ کرتے ہیں اور درحقیقت اللہ والوں کی پہچان بھی یہی ہے۔

❖

توکل و قناعت اولیائے کرام کا خاصہ ہوتا ہے۔ حضرت نور احمد صاحب کو خُدا پر کامل یقین تھا اس لیے آپ ہمیشہ اُس کی رضا پر شاکر و صابر رہتے تھے۔ آپ کے پاس ہر وقت ارادت مندوں اور درویشوں کا مجمع لگا رہتا تھا۔ اور اُن کے کھانے پینے کے تمام انتظام آپ کے آستانے پر ہی کیے جاتے تھے۔ اس سلسلہ میں بھی خدا کی امداد ہی ممد و معاون ہوتی۔ آپ کے مریدین میں بڑے امراء اور روساء شامل تھے مگر آپ کسی کا نذرانہ قبول نہ فرماتے تھے سوائے مالِ حلال بصورت جنس اپنے لنگر کے لیے وصول فرما لیا کرتے تھے اور اس میں بھی اس قدر مال وصول کرتے جو صبح سے لے کر شام تک صرف ہو جاتا تھا۔ آپ کے آستانے پر کوئی بھی آتا تو آپ اس کو بغیر کھاتے پیتے واپس نہ جانے دیتے۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے جہاں دیگر بے شمار اوصاف عطا فرماتے تھے وہاں پر توکل بھی آپ کا ایک عالی شان وصف تھا۔ آپ نے اپنے اہل خانہ اور اولاد کو بھی توکل پر یقین رکھنے کی تلقین کی۔ آپ کا ارشاد تھا کہ "خدا خود میر سامان است ارباب توکل اللہ" یہ بات بالکل درست ہے کہ خدا پر جن لوگوں کا یقین کامل ہوتا ہے خدا ان کو کبھی بے یار و مددگار نہیں چھوڑتا اور قرآن پاک میں بھی خُدا تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں کو اسی بات کا درس دیا ہے کہ خُدا پر بھروسہ کرنے والوں کے لیے خُدا خود کافی ہے۔ اور یہی آپ کے متوکل ہونے کی بنیاد تھی۔ بعض اوقات لنگر میں اسباب طعام ختم ہو جاتا تو خدام پریشان ہو جاتے لیکن آپ انہیں خاموش رہنے کی تلقین فرماتے اور کہتے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں دیکھ رہا ہے اُسے ہماری ضرورتوں کا ہم سے زیادہ احساس ہے اس لیے اس سے ہمیں بدگمان نہیں ہونا چاہیے۔

آپ کے گھر میں ایک گائے تھی جس کا دُودھ اور لسی آپ کے گھر والوں کے استعمال میں آتا تھا۔ ایک مرتبہ چند عورتیں آپ کی اہلیہ محترمہ کے پاس آئی ہوئی تھیں۔ اِدھر اُدھر کی باتوں میں گائے کا ذکر نکل آیا تو آپ کی زوجہ عفیفہ کے مُنہ سے یہ نکل گیا کہ جب سے یہ گائے ہمیں ملی ہے ہمارے گھر میں دُودھ لسی عام ہے اور ہمارے گھر میں بھی زندگی کے نشان نظر آنے لگ گئے ہیں اور اسی طرح کی باتیں اس قسم کی کر دیں جن سے اس بات کا گمان ہوتا تھا گویا زندہ رہنے کا انحصار گائے کی موجودگی پر ہے۔ حضرت قبلہ نور احمدؒ صاحب کو جب اپنی بیوی کی اس بات کا علم ہوا تو آپ نے فوراً گائے کھول کر اللہ کی راہ میں تصدق فرما دی۔ گھر والوں اور مریدوں کے استفسار پر آپ نے فرمایا "میری بیوی کو زندہ رہنے کے لیے گائے کی ضرورت تھی۔ میں نے گائے خیرات کر دی ہے اور اب یہ دیکھنا ہے کہ وہ ربّ العالمین جو تمام جہانوں کا پالن ہار ہے

ہمیں بغیر گاسے کے زندہ رکھتا ہے یا نہیں۔ اس پر آپ نے اپنے مرشدِ عالم سیدنا امام علیؒ کی کتاب "مراۃ المحققین" میں اُن کا تحریر کردہ ارشاد بیان فرمایا" فقیر کو خود بھی متوکل ہونا چاہیے اور اُس کا فرض ہے کہ وہ اپنے اہل و عیال کو بھی متوکل بنائے۔

حضرت نور احمدؒ صاحب نے اپنی تصانیف میں کئی چھوٹے چھوٹے رسائل بھی لکھے ہیں۔ جن میں پنج گنج، فقہ صوفیہ، مسافر نامہ، عبرت نامہ، مثنوی راز و نیاز، نافہ مشک، رسالہ نقشبندان، فقر نامہ، سی حرفی، خطبہ جمعہ شریف آپ کی مشہور و معروف تالیفات ہیں۔ آپ نے اس کے علاوہ فارسی دیوان بھی مرتب کیا ہے۔

ایک مثنوی میں عشقِ حقیقی تفسیر آپ نے یوں بیان کی۔

ترجمہ مثنوی:۔

عشق کے مرض والے کے لیے شفا کہاں اور بیماری والے کے لیے دوا کیسی

نہ مطلوب کے سوا اس کا کوئی معالج ہے اور نہ ہی محبوب کے سوا کوئی اس کا دوست ہے

ان اشعار میں آپ نے ان عاشقوں کا ذکر کیا جو محبت الٰہی میں غرق رہتے تھے اور خدا کے قرب کے لیے اپنا رہن سہن، بود و باش تیاگ دیا کرتے تھے۔ اور ہر وہ کام کرتے جس کے ذریعہ وہ اللہ کی رضا حاصل کرسکیں۔ اور رنج و الم کو خُدا کی طرف سے تحفہ سمجھا کرتے تھے۔ اور جب اُن پر کوئی تکلیف نہیں نازل ہوتی تھی تو اُن کے دل میں یہ خدشہ پیدا ہو جاتا تھا کہ شاید خُدا اُن سے ناراض ہو گیا ہے جو اُن پر تکلیف کا نزول ختم ہو گیا ہے اور پھر وہ خُدا کے حضور گڑگڑا کر اس کو راضی کرتے تھے اور تکالیف پر خُدا کے حضور سجدۂ شکر بجا لایا کرتے تھے۔ ایسے لوگ آج کل ناپید و نایاب ہیں جو زہد و رکوع و تقویٰ میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ حضرت نور احمدؒ صاحب انہی صحاب کی ہوبہو ——— تصویر و تفسیر ہیں۔

جھنگ کی تاریخ میں آپ کی ذات گرامی کو ایک نمایاں حیثیت حاصل ہے اور یہ دھرتی آپ کی ذات پر فخر کرتی ہے۔ اہلِ جھنگ آج بھی آپ کے روحانی اور دینی احسانات مانتے ہیں۔ آپ نے اسلام کے احیاء اور تحفظ کے لیے بڑی قربانیاں دیں اور حکومتِ وقت سے بڑی سے بڑی ٹکر لی۔ اس ضمن میں آپ کو کئی مرتبہ علاقہ بدر بھی کیا گیا اور دیگر سخت سزائیں بھی سنائی گئیں لیکن آپ کے پائے ثبات میں کبھی لغزش نہیں آئی۔ آپ حق گوئی و بیباکی سے اپنے موقف پر ڈٹے رہے اور علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں اللہ کے حقیقی شیر ثابت ہوتے حق کو روباہی نہیں آتی۔

آپ اور آپ کے خاندان نے قید و بند کی شدید سزائیں برداشت کیں۔ جنگ آزادی میں آپ کا اور آپ کے ساتھیوں کا کردار ناقابل فراموش ہے۔ انگریزوں اور اُن کے کاسہ لیسوں نے اپنی قدرت کے مطابق آپ پر ظلم ڈھانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ دنیاوی جاہ و حشم کے لیے مسلمانوں نے آپ کے خلاف بڑے بڑے اقدام کیے اور اپنے فرنگی آقا کو خوش کر کے سیم و زر اور دُنیاوی نعمتوں سے اپنے آپ کو مالا مال کر لیا۔ لیکن اس مجاہد حریت نے اپنا سر ہمیشہ اپنے مالک حقیقی کے سامنے ہی خم کیے رکھا۔

آپ کے کارنامے جھنگ گزٹ میں واضح طور پر تحریر ہیں کہ جہادِ آزادی کے موقع پر آپ ایڈورڈز کی افواج کے سامنے کس انداز سے سینہ سپر ہوتے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو کس طرح کامیابیاں عطا فرمائیں۔

اولیائے کرام کے متعلق ارشادِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ یہ وہ گروہ ہے کہ جن کے پاس اگر کوئی بدبخت اور شقی آکر بیٹھے تو وہ بھی بدبخت اور شقی نہیں رہتا بلکہ لمحہ بھر کی ہمنشینی کی برکت سے سعید اور نیک بخت بن جاتا ہے۔

فقیر نور احمدؒ صاحب اپنے ارادت مندوں کو دینی، مُلکی اور سیاسی مسائل پر ایسی پُرلطف، جامع اور دلنشیں گفتگو فرمایا کرتے تھے کہ آپ کی گفتگو گھنٹوں سُن کر بھی طبیعت تشنہ کی تشنہ رہتی تھی۔ آپ اوّل درجے کے مہمان نواز، مشفق تھے۔ آپ کی صحبت میں بیٹھنے سے رُوح بالیدہ ہو جایا کرتی تھی۔ آپ کی زبان کے اندر ایسی تاثیر تھی کہ ایک مسئلہ یا بات اگر آپ بار بار بھی بیان فرماتے تو معلوم یوں ہوتا جیسے پہلی مرتبہ ارشاد فرما رہے ہیں۔
عام طور پر روحانیت اور ولایت انسان کی طبیعت میں سنجیدگی پیدا کر دیتی ہے مگر آپ کے فضائل و کمالات اور جملہ علمی مشاغل کے باوجود طبیعت کے اندر خوش مزاجی رچی بسی ہوتی تھی۔ یہ آپ کی اعلیٰ شان ہی تھی کہ میاں شیر محمد شرقپوری ایسی یگانۂ روزگار ہستی اپنے مریدوں کو حکم دیا کرتی تھی کہ فقیر نور احمدؒ صاحب کے مزار پر حاضری لازمی دیا کرو۔ کیونکہ اُن جیسے بزرگوں کے پاس جا کر روحانیت میں ترقی حاصل ہو سکتی ہے۔

آپ اپنے اصولوں کے سخت پابند تھے۔ آپ نے اپنے مریدوں پر واضح کر رکھا تھا۔ جو شخص فرنگی سرکار کا ملازم ہو گا وہ میرا مرید نہیں ہو سکتا۔ اس سلسلہ میں چنیوٹ کا ایک تحصیلدار مرزا مراد علی ملتانی آپ کا دل کی گہرائیوں سے معتقد تھا اور آپ کی توجہات باطنہ کا اتنا قائل تھا کہ اُس نے آپ کی شان میں بے شمار قصائد بھی کہے اور آپ کی بیعت کرنے کی کئی مرتبہ کوشش بھی کی مگر آپ نے انگریزی حکومت کا ملازم ہونے کی بدولت مرید کرنے سے انکار کر دیا۔ آپ روحانیت کے اسرار و رموز سمجھاتے وقت ایسا انداز اپناتے تھے کہ مُنکر سے مُنکر انسان کا دل بھی آپ کے ارشادات کو دل سے تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ آپ کی گفتگو نکھری ہوتی اور بڑی لطیف ہوتی تھی۔ آپ کو بھاری بھرکم بات کو ہلکے پھلکے انداز میں بیان کرنے میں قدرت حاصل تھی۔

حضرت رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے آپ کے عشق و محبّت کا عجیب ہی عالم تھا۔ آپ کی پوری زندگی سرکارِ دوعالمؐ کی اطاعت و اتباع کا عملی پیکر تھی۔ آپ نے اہل سنت عقائدِ حقّہ کے سلسلے میں تقریر و تحریر سے دین کی ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں۔ بعض اوقات سرورِ کائنات رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں اس قدر سرشار ہو جاتے تھے کہ بے اختیار اشعار جن میں حضورؐ کی تعریف ہوتی آپ کی زبان مبارک پر آجایا کرتے تھے۔ ایک نعت جس کے چند اشعار حسب ذیل ہیں آپ کی عقیدتِ رسُولؐ اور عشق نبیؐ کی عملی مثال ہے:

بشر ہیں کیا گو کہ ظاہر شمار — ولیکن دیا ان کو سب اختیار
بشر جو کہیں ہیں وہ قائل بشر — حقیقت کی ان کو نہیں کچھ خبر
وہابی خرابی یہ کیا جانے طور — رہِ عقل دیگر ہے راہِ عشق اور

آپ کو دیکھ کر اس بات کا شدت سے احساس ہوتا ہے کہ اگر آپ ایسی برگزیدہ ہستیاں نہ ہوتیں تو انسان کی شرف سے دُنیا کا اعتبار ہی اُٹھ چکا ہوتا۔ آپ رسُولِ خدا کے سچے خادم اور دینِ الٰہی کے صادق پیروکار تھے۔

فقیر نور احمدؒ صاحب کی خدمت میں آپ کے ایک مرید نے عرض کی "حضرت! میری والدہ نماز نہیں پڑھتیں" آپ نے اس کی والدہ کو طلب کر کے فرمایا "دیکھو بی بی! نماز مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے اور تم کو خدا کا حکم سُنا کر تلقین کرتا ہوں کہ تم نہ صرف نماز پڑھا کرو بلکہ تہجد بھی پڑھا کرو۔" اس عورت پر آپ کی گفتگو کا اثر ہوا کہ اس کی تہجد نماز بھی کبھی قضا نہیں ہوئی۔

آپ کی کرامات میں یہ قابلِ ذکر کرامت ہے کہ آپ کے مریدین میں سے کسی کی بھی نمازِ تہجد قضا نہیں ہوتی تھی۔ آپ تہجد نہ پڑھنے والے سے بات تک نہ کرتے تھے اور بے نمازی کے ہاتھ کی پکی ہوئی روٹی بھی نہیں کھاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے مریدوں، عقیدت مندوں اور ارادت مندوں میں بے شمار صاحبِ ارشاد بزرگ ہوتے ہیں۔ آپ کی توجہ سے ہزاروں لوگ سعادتِ ابدی اور فیضِ سرمدی سے مستفید و مستفیض ہوتے تھے۔ آپ کے مرید اور خلفاء بھی تربیت روحانی میں یدطولیٰ رکھتے تھے۔

آپ کے خلفاء میں قابلِ ذکر نام حاجی محمد الدین صاحب کا ہے وہ آپ کی پیروی صدقِ دل سے کرتے تھے اور نہایت حلیم الطبع، بے نفس شخص تھے۔ ان سے بھی بے شمار کرامات ظاہر ہوئیں۔ اور ان کا انتقال حج سے واپس آتے ہوئے ہوا۔ حاجی محمد الدین صاحب کو جناب فقیر نور احمد صاحب کی دامادی کا بھی شرف حاصل تھا۔ اور حضرت نے اپنے وصال سے قبل اپنی دستار مبارک آپ کے سر پر رکھی اور فرمایا "آج سے تو میرا روحانی جانشین ہے۔ اور پھر آپ کے حکم سے حاجی صاحب نے جمعہ کی نماز پڑھائی اور آپ کی اقتداء میں حضرت فقیر نور احمد صاحب نے نماز پڑھی۔ اس بات میں بھی حضرت فقیر صاحبؒ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ جانشینی کی پیروی کی۔

حضرت فقیر نور احمد صاحب کے متعلق حکیم احمد علی خان رقمطراز ہیں کہ آپ کی خدمت میں ایک آنکھوں کا مریض آیا اس کے مرض کو اس وقت کے معالجوں اور طبیبوں نے لاعلاج قرار دے دیا تھا اور خود حکیم صاحب کہتے ہیں کہ میں نے خود بھی مریض کو دیکھا مرض واقعی لاعلاج تھا۔ مگر آپ نے اپنا لعابِ دہن اُس کی آنکھوں میں ڈالا اور تین روز کے اندر اس کی بینائی مکمل طور پر بحال ہوگئی۔

ایک دفعہ آپ کہیں جا رہے تھے کہ ایک فاحشہ عورت آپ کے پیچھے لگ گئی۔ آپ نے کئی حیلوں سے اُس سے خلاصی کرانی چاہی مگر وہ تو آپ کی دیوانی ہو کر رہ گئی۔ آخر کار آپ نے اس کو ایک دن حکم دیا کہ "ہمارے گھر جاؤ اور ایک کتاب کا ذکر کیا کہ وہ لے آؤ۔" وہ عورت فوراً آپ کے گھر گئی اور دروازے پر دستک دی مگر آپ کی اہلیہ محترمہ نے دروازہ نہ کھولا۔ اس نے متعدد آوازیں دیں مگر اس کو مطلق کامیابی نہ ہوئی آخر وہ تنگ آ کر واپس آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور سارا واقعہ سنایا۔ آپ نے اُس کو فرمایا "فاحشہ عورتوں سے عورتیں بھی پردہ کرتی ہیں اور تو نے خوب جان لیا کہ ہم نے تمہیں کس کتاب کے متعلق اشارہ دے کر گھر بھیجا تھا۔"

اس فاحشہ عورت کو آپ کا یہ سمجھانے کا انداز بہت پسند آیا۔ اس نے نہ صرف آپ کا پیچھا چھوڑ دیا بلکہ وہ بے راہ روی سے تائب ہو کر سچی مسلمان خاتون بن گئی اور اس کے شب و روز یادِ الٰہی میں گزرنے لگے۔ یہ مومن کی شان ہے کیونکہ اللہ کا ولی پارس کی مانند ہوتا ہے جس کے ساتھ لوہا بھی ٹکرا جاتے تو سونا بن جاتا ہے۔

حضرت فقیر نور احمد صاحب نے چنیوٹ کے قاضی خاندان کے متعلق ایک پیش گوئی لکھ کر دی تھی جو آج اس خاندان کے بزرگوں کے پاس ہے اور ڈیڑھ سو سال گزر جانے کے باوجود اب بھی لفظ بلفظ پوری ہو رہی ہے۔ قاضی خاندان کو آپ کی مریدی کا شرف حاصل تھا۔ ایک مرتبہ قاضی نور احمد گھوڑے پر سوار ہو کر کہیں جانے والا تھا۔ آپ نے اس کو پیغام بھیجا کہ آج مت جاؤ اور گھر پر ہی رہو۔ قاضی نور احمد نے آپ کے حکم کی تعمیل کی۔ کچھ ہی دیر کے بعد اس کی طبیعت سخت ناساز ہو گئی۔ وہ روزے سے تھا چنانچہ اس نے آدمی بھیج کر آپ کی خدمت میں عرض کی "میری طبیعت خراب ہو رہی ہے اور میرا روزہ بھی ہے اب میرے لیے کیا حکم ہے۔"

آپ نے جواباً فرمایا۔ حکم کیا ہوگا تمہارا روزہ آج یہاں نہیں بلکہ آگے چل کر افطار ہوگا" اور کچھ ہی دیر کے بعد موصوف نور احمد قاضی کا انتقال ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ جب بھی اپنے کسی ولی اور مقرب بندے کے منہ سے کوئی بات نکلواتا ہے تو اس میں اس کی اپنی رضا اور منشا شامل ہوتی ہے۔

ایک مرتبہ آپ کے ایک خاص مرید میاں دلاور خان ہرلؒ جو مڑھ بلوچاں کے رہنے والے تھے، آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ مجلس میں کافی وقت گزارنے کے بعد انہوں نے واپسی کی اجازت چاہی تو آپ نے اُن کو مخاطب کر کے فرمایا "دیکھو دلاور خان تمہارے راستے میں جنگل پڑتا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ تم راستہ کھو جاؤ اس لیے ہوشیار ہو کر سفر کرنا۔ دلاور خان نے آپ کے ارشاد کی تعمیل کی اور سفر کا آغاز کیا اور باوجود کوشش کے وہ راستہ بھول گئے اور سخت پریشانی کے عالم میں انہوں نے ایک مسجد میں جا کر نوافل ادا کرنے شروع کیے انہوں نے ابھی سلام پھیرا ہی تھا کہ انہیں فقیر نور احمدؒ صاحب کی آواز سنائی دی کہ دلاور خان راستہ دائیں ہاتھ ہے۔ چنانچہ دلاور خان نے آپ کی بتائی ہوئی سمت کی طرف راستہ اختیار کیا اور اپنی منزل پر پہنچ گئے۔ دلاور خان ہرلؒ خود بھی بڑے صاحب طریقت بزرگ ہوتے ہیں۔ ان کے مزار پر آج بھی لوگ حاضر ہو کر ہر مرض شفایابی کی دعا کرتے ہیں اور خدا سے شفا حاصل کرتے ہیں۔

آپ کے مریدین دیگر قابل ذکر شخصیات سلطان الواعظین، مولانا محمد ظہور احمدؒ صاحب، سید امیر شاہ صاحب شیخ اسمٰعیل بخاریؒ، میاں فیض بخش چشتیؒ، میاں تاجہؒ اور میاں فتح محمد لسریکہ ہیں۔

فقیر نور احمد صاحب نے ۱۵ شعبان المعظم ۱۲۹۹ھ جو کہ آپ کا یوم وصال ہے، سے چند روز قبل اپنے مریدوں کو پیغام بھیجا کہ ہم ایک دُور دراز سفر پر روانہ ہونے والے ہیں۔ لہٰذا جمعہ کو سب لوگ مسجد میں آکر دیدار کر لیں۔ چنانچہ ارشاد کے مطابق جمعہ کے روز ۱۵ شعبان المعظم ۱۲۹۹ھ کو جب سب لوگ حاضر ہوتے تو انہوں نے دیکھا حضرت وصال فرما چکے تھے۔ ہزاروں سوگواروں اور اشکباروں کی موجودگی میں اس رہنمائے آزادی کامل اور مرد حق کو سپردِ خاک کیا گیا۔ آپ کا عرس مبارک شعبان کی ۱۵ تاریخ کو بڑے تزک و احتشام کے ساتھ منعقد ہوتا ہے۔ زائرین ارادت مند جوق در جوق حاضری دے کر اپنی جھولیاں انوار و رحمت سے بھرتے ہیں۔ آستانہ عالیہ کی جملہ خدمات فقیر صفدر حسین حامد سرانجام دیتے ہیں۔

خواجہ حسن بصریؒ کو ایک دفعہ کسی نے اطلاع پہنچائی کہ فلاں آدمی نے آپ کی غیبت کی ہے۔ آپ نے کھجوروں کا ایک طبق اس کے پاس بطور ہدیہ بھیجا اور ساتھ ہی پیغام دیا کہ مجھ کو یہ اطلاع پہنچی ہے کہ آپ نے اپنی نیکیاں میرے نامۂ اعمال میں منتقل کر دی ہیں۔ اس احسان کا بدلہ دینے کی مجھ میں استطاعت نہیں ہے۔ اس لیے صرف یہ کھجوریں نذر کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

حضرت معروف کرخیؒ

طریقت و حقیقت کے ایک مقتدر پیشوا کہیں جا رہے تھے کہ راستے میں انہوں نے لوگوں کا ایک گروہ دیکھا جو رقص و سرود اور مے نوشی میں مصروف تھا۔ ان بزرگ کے ہمراہ چلنے والے ارادت مندوں نے جب آپ سے اس بھٹکے ہوئے گروہ کے حق میں بددعا کرنے کی درخواست کی تو انہوں نے فرمایا "اے اللہ جس طرح آج تُو نے ان کو بہتر عیش دے رکھا ہے آئندہ اس سے بھی بہتر عیش ان کو عطا کرنا رہ۔

ابھی ان بزرگ نے اپنی دُعا مکمل بھی نہ کی تھی کہ وہ گروہ شراب و رباب پھینک کر آپ کے سامنے آیا اور بیعت حاصل کر کے افعالِ قبیحہ سے تائب ہو گیا۔ اس کے بعد ان بزرگ نے اپنے ارادت مندوں سے فرمایا "یہ بات یاد رکھو کہ جو شیرینی سے مر سکتا ہے اس کو زہر دینے سے کیا حاصل؟

اللہ کی یہ نیک اور برگزیدہ ہستی جس کا اُوپر ذکر کیا گیا ہے حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ تھے جنہوں نے اپنی تمام زندگی اللہ اور اس کے رسُول کے عشق میں گزار دی۔ آپ کا تعلق نصرانی خاندان سے تھا۔ روایت ہے کہ جب آپ کو مکتب میں داخل کیا گیا تو معلم نے یہ درس دینا چاہا کہ ثالث ثلاثہ یعنی خدا تین ہیں۔ آپ نے کہا کہ ھُوَ اللہُ اَحَدٌ یعنی اللہ ایک ہے۔ اس معلم نے آپ کی بے تحاشا پٹائی کی اور معروف کرخی کو قائل کرنے کی کوشش کی کہ اللہ ایک نہیں بلکہ تین ہیں مگر حضرت معروف کرخی بھی اپنے نظریئے پر قائم رہے اور جب انہوں نے دیکھا کہ معلم اپنی بات منوانے پر تلا ہوا ہے تو وہ مکتب سے فرار ہو کر حضرت علی بن موسیٰ رضا کی خدمت میں حاضر ہو کر مشرف بہ اسلام ہوتے اور انہی سے بیعت کی۔

معروف کرخی جب گھر سے فرار ہوتے تو اُن کے نصرانی والدین کو بہت دُکھ ہوا اور وہ حسرت سے سوچنے لگے کہ کاش ان کا بیٹا ان کے پاس ہی رہتا چاہے وہ کوئی بھی مذہب اختیار کر لیتا انہیں قبول تھا مگر معروف کرخی کے دل میں اسلام کی شمع جل رہی تھی وہ اس کی ضیا سے پُورے معاشرے کو روشن کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ دینِ اسلام کو اپنانے اور اپنے پیر و مُرشد علی بن موسیٰ رضا سے بیعت کرنے کے بعد جب وہ گھر پہنچے تو انہوں نے اپنے غیر مسلم والدین کو بھی اسلام کی طرف راغب کر لیا اور وہ بیٹے کے کہنے پر مسلمان ہو گئے۔ معروف کرخی واپس آنے کے بعد بہت عرصہ تک حضرت داؤد طائی کی خدمت میں رہ کر

فیوض باطنی سے سیراب ہوتے رہے۔

آپ ایک مرتبہ انتہائی رغبت اور شوق سے جب کوئی شے تناول فرما رہے تھے تو لوگوں نے پوچھا کہ ایسی کیا شے ہے جو آپ اس قدر مسرت سے کھا رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا "میری خوشی کی وجہ یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کا مہمان ہوں اور وہ جو کچھ مجھ عطا کرتا ہے صبر و شکر سے کھا لیتا ہوں۔"

حضرت معروف کرخی اکثر اپنے نفس سے فرمایا کرتے تھے کہ مجھ کو چھوڑ دے تاکہ تجھے بھی چھٹکارا مل جائے۔ آپ کا نظریہ یہ تھا کہ خدا پر توکل کرنے والا مخلوق کے ضرر سے محفوظ رہتا ہے۔

ایک مرتبہ کسی نے آپ سے دعا کرنے کی درخواست کی تو آپ نے فرمایا "بارگاہ خداوندی میں پہنچ جاؤ وہاں میری دعا کی حاجت نہیں رہے گی۔ جب اس شخص نے کہا کہ حضرت مجھے تو بارگاہ خداوندی کا علم نہیں ہے لہٰذا اگر آپ مجھے وہیں بھیجنا چاہتے ہیں تو پھر مجھے اس کا پتہ اور مقام بھی بتا دیجئے۔" آپ نے جواب دیا "بارگاہ خداوندی وہیں ہے جہاں تمہارا وجود باقی نہ رہے۔"

آپ کی بات سن کر اس شخص نے گوشہ نشینی اختیار کر لی اور یاد الٰہی میں مصروف ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنے کرم سے سعادت کی دولت سے مالا مال کر دیا۔

حضرت معروف کرخی اپنی ہر غرض اور ضرورت کے لیے ہمیشہ اپنے خدا کی طرف ہی دیکھتے۔ کسی انسان کے سامنے کبھی بھی اپنی غرض و غایت پیش نہ کی۔ ایک مرتبہ جب کسی تونگر نے آپ کو کچھ رقم پیش کرنا چاہی تو آپ نے اسے منع کرتے ہوئے فرمایا کہ میں اس ڈر سے نہیں لیتا کہ تیری موت کے بعد مجھے اللہ تعالیٰ سے یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ زمین کا رزق مر گیا ہے لہٰذا اب تو میری ضروریات کی تکمیل فرما۔

حضرت موسیٰ بن طوسی سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ میں نے ایک نشان دیکھ کر پوچھا کہ کل تک تو آپ کے جسم پر یہ نشان نہیں تھا پھر آج کیسے ہو گیا۔ آپ نے فرمایا کہ رات کو حالت نماز میں مجھے مکہ معظمہ پہنچنے کا تصور آ گیا اور وہاں پہنچ کر طواف کعبہ کے بعد جب چاہ زم زم پر پہنچا تو میرا پاؤں پھسل گیا اور یہ اسی کا نشان ہے۔

یتیموں اور بے آسرا بچوں کو دیکھ کر اکثر آپ کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلتے جہاں کہیں بھی حضرت معروف کرخی کو کوئی مسکین اور بے سہارا بچہ نظر آتا فوراً اس کی دلجوئی کرتے اور حسب توفیق اس کی مدد بھی فرماتے۔ حضرت سری سقطی سے روایت ہے کہ عید کے روز جب میں نے آپ کو کھجوریں چنتے دیکھ کر وجہ پوچھی تو فرمایا کہ یہ سامنے والا یتیم بچہ اس لیے اداس ہے کہ تمام بچے نئے لباس میں ملبوس ہیں اور میرے پاس کپڑے تک نہیں۔ لہٰذا اس لیے میں کھجوریں چن کر فروخت کرنا چاہتا ہوں تاکہ اس کے لیے کپڑے فراہم کر سکوں۔

حضرت سری سقطی بیان فرماتے ہیں "میں نے معروف کرخی سے عرض کیا کہ یہ کام تو میں بھی کر سکتا ہوں آپ کیوں زحمت فرماتے ہیں۔ چنانچہ میں بچے کو ہمراہ لے آیا اور اس کو نیا لباس پہنا دیا۔ یتیم بچے کی خدمت کے صلے میں جو نور مجھ کو عطا کیا گیا اس سے میری حالت بدل گئی۔

حضرت معروف کرخی فرمایا کرتے تھے کہ اللہ کی عبادت کرنے کے لیے انسان کو کسی قسم کی آسائش کا سہارا نہیں لینا چاہیے نرم جگہ پر عبادت کرنے کے بجائے سخت جگہ پر نماز ادا کرنا بہتر ہے۔ خود فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ جب میں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھانا چاہے تو سردی کی وجہ سے میں نے اپنا ایک ہاتھ بغل میں دبا لیا اور اسی رات غیب کی طرف سے مجھے ندا آئی "اے کرخی تجھے اس ہاتھ کا رتبہ عطا کر دیا گیا جو تو نے دعا کے لیے دراز کیا تھا اور اگر دوسرا ہاتھ بھی اٹھا لیتا تو ہم اس کا اجر بھی عطا کر دیتے۔" آپ فرماتے ہیں کہ اس دن کے بعد میں نے موسم سرما میں دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے کا معمول بنا لیا

جاپان کا بنا ہوا ایلفی
ہر چیز کو سیکنڈوں میں جوڑتا ہے
ایلفی کے استعمالات بے شمار ہیں
زیورات ، ریڈیو ، ٹیلی ویژن ، ریفریجریٹر ، کھلونے ، کرکٹ کا سامان ، فٹبال ، گلدان ، عام گھریلو اشیاء ، نائلون کے موزے ، کاروں ، اسکوٹروں ، سائیکلوں کے ٹائر ، ٹاپ ، ڈیش بورڈ ، ونیائل ٹرم ، تھرماس ، چشمے کے فریم ، قلم ، پرس ، سوٹ کیس ، بریف کیس ، جوتے ، بیلٹ ، سینڈل ، مچھلی پکڑنے کی ڈوری ، ہینگر ، کیمرہ وغیرہ وغیرہ کو بآسانی جوڑا جا سکتا ہے۔
ہر جگہ آسانی سے دستیاب
ELFY
ELFY
ایلفی کے جوڑ ہزاروں پونڈ سے زائد قوت برداشت کر لیتے ہیں
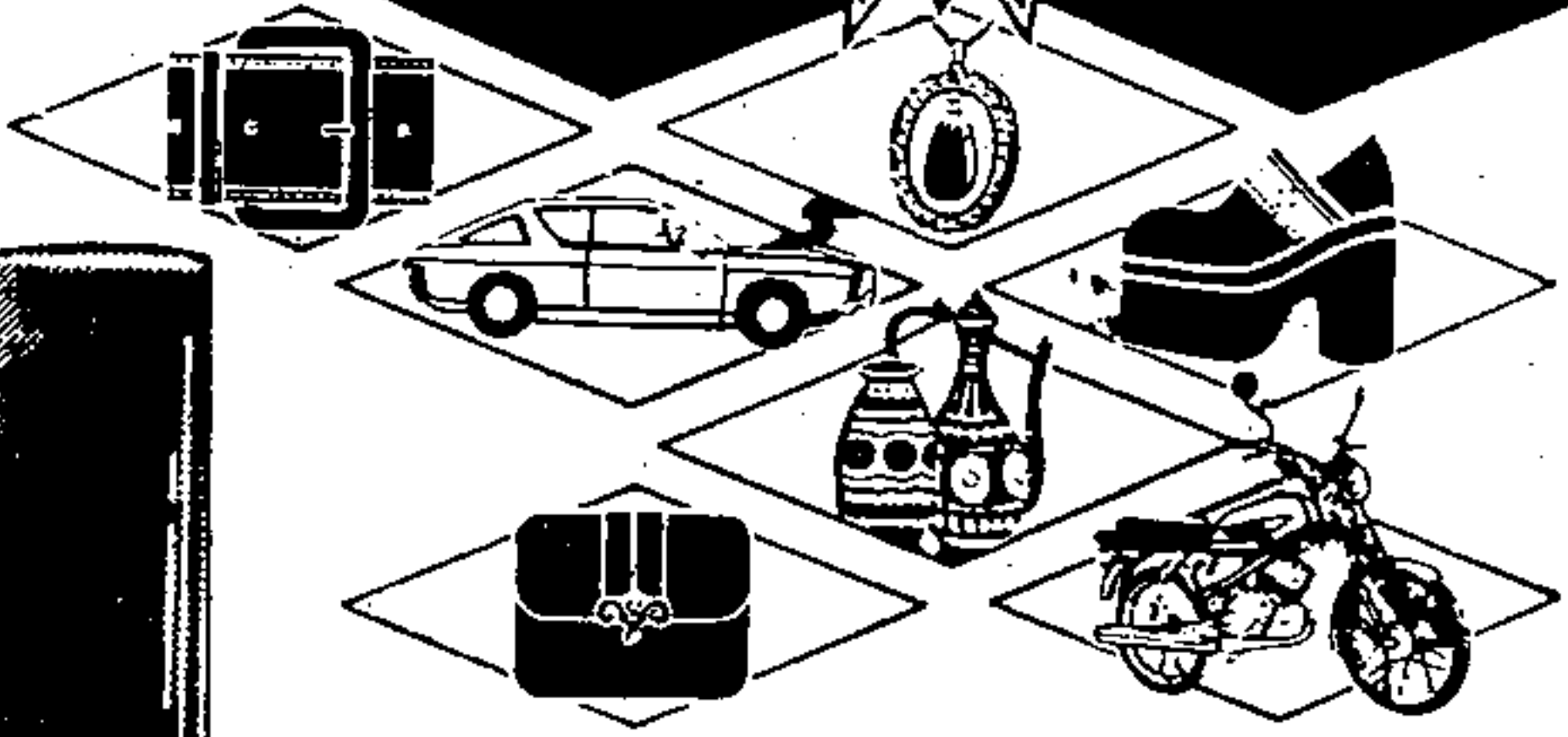
فرمایا کہ ایک رات مجھ پر ایسی غنودگی طاری ہوئی کہ میرے وظائف کا وقت ختم ہونے لگا اور خواب میں دیکھا کہ ایک حُور مجھ سے کہہ رہی ہے "مکمل پانچ سو سال سے مجھے تمہارے لیے ہی بنایا سنوارا جا رہا ہے مگر تم خوابِ غفلت میں پڑے ہوئے ہو۔" آپ فرماتے ہیں کہ اس آواز کے ساتھ ہی میں نے بیدار ہو کر اپنا وظیفہ مکمل کیا۔ پھر فرمایا کہ ایک مرتبہ میں نے خواب میں ایک ایسی حُور کا نظارہ کیا جس کی پیشانی روشن اور منوّر تھی۔ جب میں نے اس سے دریافت کیا کہ یہ نور و روشنی کیسی ہے تو اس نے جواب دیا کہ ایک رات جب تم خوفِ الٰہی میں گریہ زاری کر رہے تھے تو تمہارے اشکوں کو میرے چہرے پر بطور اُبٹن مل دیا گیا تھا۔ بس اسی دن سے یہ نور و روشنی میری پیشانی پر نمودار ہو گئی۔

آپ کے ماموں شہر کے کوتوال تھے۔ انہوں نے ایک مرتبہ دیکھا کہ آپ جنگل میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ قریب ہی ایک کتا بھی بیٹھا ہے۔ آپ ایک لقمہ خود کھاتے ہیں اور دُوسرا کتے کو کھلا دیتے ہیں۔ یہ کیفیت دیکھ کر ماموں نے کہا "کیا تم کو حیا نہیں آتی کہ کتے کو کھانا کھلا رہے ہو۔" آپ نے جواب دیا کہ حیا کی وجہ سے ہی تو میں اس کو کھلا رہا ہوں۔ یہ کہہ کر جب آپ نے آسمان کی طرف دیکھا تو ایک پرندہ اپنی آنکھ اور چہرے کو پروں سے ڈھانپے ہوئے آپ کے دستِ مبارک پر آ بیٹھا۔ اس پر آپ نے اپنے ماموں سے فرمایا کہ خدا اسے حیا کرنے والی ہر شے حیا کرتی ہے۔

ایک مرتبہ آپ کے ہاں کوئی شخص بطور مہمان آ کر ٹھہرا۔ چونکہ اس شہر میں وہ پہلی مرتبہ آیا تھا اس لیے اُسے قبلہ کا صحیح رُخ معلوم نہ تھا جس کی وجہ سے اُس نے غلط سمت کی جانب مُنہ کر کے نماز ادا کر لی مگر نماز کے بعد جب اُسے صحیح سمت معلوم ہوئی تو اُس نے آپ سے عرض کیا کہ جب میں نے نیت باندھی تھی تو اس وقت آپ نے آگاہ کیوں نہیں کیا۔ اس کے جواب میں حضرت معروف کرخی نے فرمایا کہ فقرا کو دوسروں کے امور میں اس وقت مداخلت کی حاجت محسوس ہوتی ہے جب انہیں اپنے امور سے مہلت مل جاتی ہے۔

آپ فرمایا کرتے تھے کہ نفس کی اتباع خدا کی گرفت ہے اور جو خُدا کو یاد کرتا ہے وہ اس کا محبوب ہے۔ یہ تو بات واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کو اپنا محبوب بنا لے اس پر خیر کے دروازے کھول کر شر کے دروازے بند کر دیتے جاتے ہیں۔ گمراہی کے بارے میں آپ اپنے مریدوں سے فرمایا کرتے تھے کہ لغو باتیں بھی گمراہی کی دلیل ہوتی ہیں اور غافل نہ ہونا حقیقتِ وفا کی نشانی ہے۔ ایک اور موقع پر حضرت معروف کرخی نے فرمایا کہ اعمالِ صالحہ کے بغیر جنّت کی طلب اور اتباعِ سنّت کے بغیر شفاعت کی امید اور نافرمانی کے بعد رحمت کی تمنا حماقت ہے۔ تصوف کے بارے میں آپ کا نظریہ یہ تھا کہ دینی مسائل بیان کرنا اور مخلوق سے اُمید وابستہ نہ کرنے کا نام ہی تصوف ہے لہٰذا انسان کو چاہیے کہ وہ مخلوق سے اُس توڑ کر اپنے اللہ سے طلب کی خواہش کرے۔ شر کو آپ سخت بُرا گردانتے تھے۔ آپ اپنے ارادت مندوں کو اکثر یہی تلقین فرمایا کرتے تھے کہ شر کو نظرانداز کر کے کسی کی بُرائی یا بھلائی نہ کرو۔

روایت ہے کہ ایک مرتبہ آپ بازار سے گزر رہے تھے تو انہیں ایک بہشتی دکھائی دیا جو کہہ رہا تھا "اے اللہ جو میرا پانی لے اس کی مغفرت فرما دے۔ چنانچہ نفلی روزے کے باوجود آپ نے پانی پی لیا اور جب لوگوں نے کہا کہ آپ کا تو روزہ تھا۔ آپ نے ان لوگوں کو جواب میں فرمایا کہ میں نے بہشتی کی دُعا پر پانی پی لیا۔ اس واقعہ کے بعد جب آپ کا انتقال ہو گیا تو آپ کسی شخص کو خواب میں نظر آئے۔ اس شخص نے جب آپ سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیسا سلوک کیا تو آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بہشتی کی دُعا سے میری مغفرت فرما دی ہے۔

اولیائے کرام میں حضرت معروف کرخی کا مقام بہت بلند ہے۔ آپ کے ارادت مند اور مریدین آپ کے انتقال کے بعد کئی دن تک افسردہ رہے۔ حتیٰ کہ کھانے تک کو ہاتھ نہ لگایا۔ آپ کی تعلیمات بھٹکے ہوئے انسانوں کے لیے آج بھی مشعلِ راہ ہیں۔ آپ کے مزار سے عقیدت مند مرادوں کی جھولیاں بھر بھر کے لے جاتے ہیں۔

حضرت سری سقطیؒ کی گردن کاٹنے کے لیے جلاد نے تین مرتبہ تلوار بلند کی مگر ہر مرتبہ کوئی غیبی قوت جلاد کے ہاتھوں کی طاقت مفلوج کر دیتی۔ کوتوالِ شہر جلاد پر برس رہا تھا کہ تم تلوار کیوں نہیں چلاتے۔

جلاد نے ڈرتے ڈرتے عرض کی۔ "جناب! میں اس شخص پر تلوار نہیں چلا سکتا کیوں کہ میں جب بھی تلوار اٹھاتا ہوں میرے سامنے ایک نورانی شکل والے بزرگ آجاتے ہیں، جو مجھے اس شخص کی گردن مارنے سے روکتے ہیں، اس لیے میں اس شخص کی گردن نہیں کاٹ سکتا آپ کسی اور جلاد کو بلائیں۔"

کوتوال شہر بڑا حیران ہوا اور جلاد کے برابر آکھڑا ہوا اور کہنے لگا "اب چلاؤ تلوار میں دیکھتا ہوں کہ وہ کون بزرگ ہے جس کی شکل دیکھ کر تمہاری قوت بازو سلب ہو جاتی ہے۔"

ایک مرتبہ پھر جلاد نے تلوار چلائی تو اس کا ہاتھ حسب سابق مفلوج ہو گیا۔ اب کوتوالِ شہر نے بھی دیکھا کہ ایک بڑے ہی جلیل القدر بزرگ ماتھے پر تیوریاں چڑھائے کھڑے ہیں اور انگلی کے اشارے سے حضرت سری سقطیؒ کی گردن زنی کرنے سے منع فرما رہے ہیں۔ کوتوال شہر پر ہیبت سی طاری ہو گئی۔ وہاں پر قاضی وقت بھی تشریف فرما تھے۔ انھوں نے جب ساری صورتحال کا جائزہ لیا تو کوتوال شہر سے پوچھا۔

"تم اس شخص کو کیوں قتل کروانا چاہتے ہو؟"

کوتوال نے قاضی کو بتایا "یہ شخص قاتل ہے اس کے خلاف گواہ اور ثبوت موجود ہیں اور انہی گواہوں اور شواہد کی روشنی میں اس کے قتل کا فیصلہ کیا گیا ہے۔" قاضی نے حضرت سری سقطیؒ کے قتل کا فیصلہ موقوف کر دیا اور حکم دیا کہ ملزم اور گواہوں کو میری عدالت میں پیش کیا جائے۔ میں سارے بیانات اور شہادتیں خود سنوں گا اور پھر فیصلہ کروں گا۔

اگلے روز عدالت میں حضرت سری سقطیؒ اور گواہ پیش ہوئے۔ قاضی نے پہلے جناب سری سقطیؒ سے پوچھا

"آپ پر جو الزامات لگائے گئے ہیں آپ ان کے متعلق اپنی صفائی پیش کریں۔"
حضرت سری سقطیؒ نے عرض کی" میں بالکل بے گناہ ہوں۔ ایک رات میں اپنے مریدوں کے حلقے میں بیٹھا ہوا تھا کہ حضرت فتح موصلیؒ کا ذکر چل نکلا۔ میرے مریدوں کا خیال تھا کہ موصوف پر ہر وقت جذب و سکر طاری رہتا ہے۔ اُن کو اپنی خبر تک نہیں ہے اور جس کو اپنی خبر نہ ہو وہ زمانے کی کیا خبر رکھ سکتا ہے۔ لہٰذا ایسے بے خبرے کو بزرگ نہیں سمجھا جا سکتا۔ میں اپنے مریدوں کو سمجھا رہا تھا کہ حضرت فتح موصلیؒ ایسے درویش ہیں جن کی ذات میں صحو و سکر کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ وہ جذب و سکر کے باوجود صحو و سلوک میں رہتے ہیں اور انھیں ہر چیز کا فکر و خیال رہتا ہے۔ میرے مریدوں میں ایک مرید اس بات پر بضد تھا کہ حضرت فتح موصلیؒ بزرگ و درویش نہیں بلکہ دماغی طور پر مختل اور دیوانے ہیں۔ میں نے اپنے اُس مرید کو کہا کہ تم ابھی میرے ساتھ چل کر آزما لو کہ موصوف بزرگ تمہارے خیال کے مطابق ہیں یا میرے خیال کے مطابق۔ میرے مرید نے رات کا وقت ہونے کی وجہ سے حضرت فتح موصلیؒ کے پاس جانے سے اعتراض کیا کیونکہ رات کو گشتی پولیس کسی بھی شبے میں پکڑ سکتی تھی مگر میں نے اپنے مرید کو اسی وقت حضرت فتح موصلیؒ کی خدمت میں لے جانے کا فیصلہ کیا۔ ہم دونوں ابھی زیادہ فاصلہ طے نہ کر پائے تھے کہ گشتی پولیس ہمیں دوسری سمت سے آتی ہوئی دکھائی دی۔ میرا مرید تو پولیس کے خوف سے بھاگ گیا جب کہ میں وہیں کھڑا رہا۔

پولیس والوں نے مجھ سے پوچھا" تم کون ہو اور اس وقت بازاروں میں کیوں پھر رہے ہو؟"
میں نے انھیں جواب دیا" میں وقت کا مشہور صوفی سری سقطیؒ ہوں اور حضرت فتح موصلیؒ کی ملاقات کو جا رہا ہوں۔" مگر پولیس والوں نے میری ایک نہ سُنی اور مجھے چور کہنا شروع کر دیا۔ میں نے انھیں بہت سمجھایا مگر بے سود۔ انھوں نے مجھے گرفتار کر کے حوالات میں بند کر دیا اور اگلے روز دو جھوٹے گواہ بُلا کر مجھ پر چور اور قاتل کا الزام لگوا کر گواہی ثابت کر دی اور مجھے سزائے موت دیئے جانے کے احکام جاری کر دیئے گئے لیکن جب جلاد تلوار چلانے لگا تو اُس سے تلوار نہ چلائی گئی کیونکہ جب بھی جلاد تلوار چلانے لگتا حضرت فتح موصلیؒ اُس کو تلوار چلانے میں مزاحم ہو جاتے۔ جس مجمع میں مجھ پر تلوار آزمائی ہو رہی تھی وہاں میرا وہ مرید بھی کھڑا تھا جو حضرت فتح موصلیؒ کی کرامات کا منکر تھا۔ اُس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ حضرت فتح موصلیؒ اپنے پرستاروں اور عقیدت مندوں کی طرف سے ہر وقت آگاہ رہتے ہیں اور یوں اتنی دُور سے آ کر مجھے تلوار کی کاٹ سے بچانے کے لیے آنا ان کی کرامت میں شامل تھا لہٰذا میں جس مقصد کے لیے اپنے مرید کو حضرت فتح موصلیؒ کے پاس لے جانا چاہتا تھا وہ یہاں پر ہی پورا ہو گیا۔"

یہ بیان سننے کے بعد قاضی صاحب نے دونوں گواہوں سے پوچھا" تم بتاؤ تم اس شخص کو کیسے قاتل و سارق ثابت کرتے ہو؟"

دونوں نے دست بستہ قاضی صاحب سے عرض کی" جناب! ہم بے قصور ہیں ہم نے پولیس کی ایماء و خوشنودی کے لیے حضرت سری سقطیؒ کے خلاف جھوٹی گواہی دی ہے۔"
قاضی صاحب نے پولیس کے اہلکاروں اور کوتوال شہر کو معطل کر دیا اور اُن دونوں جھوٹے گواہوں کو زنداں میں بھیج دیا اور حضرت سری سقطیؒ کو باعزت بری کر دیا۔
سری سقطیؒ کے مرید نے ان سے معافی مانگی اور عرض کی" حضرت! میں نے آپ کے ساتھ زیادتی کی اور نافرمانی کا مرتکب ہوا۔ آپ مجھے معاف فرما دیں۔"

حضرت نے جواب دیا" تم نے میرے ساتھ کون سا ظلم کیا ہے جو میں تمہیں معافی دیتا پھروں تم نے جس بات سے انکار کیا تھا اللہ نے تمہیں جیتے جاگتے اُس حقیقت کو تمہارے سامنے ثابت کر دیا کہ حضرت فتح موصلیؒ صرف سکر و جذب میں ہی نہیں رہتے بلکہ صحو و سلوک میں بھی ہوتے ہیں۔ یوں اتنی دُور سے مجھے قتل ہونے سے بچانے کے لیے آنا اُن کا صحو و سلوک میں ہونا ثابت ہو گیا ہے۔ اس طرح یہ بھی ثابت ہو گیا کہ حضرت موصوف اپنے عزیزوں، دوستوں اور اپنے آشناؤں سے کبھی غافل نہیں رہتے تھے۔ جب بھی اُن کے دوستوں، عزیزوں پر کوئی کٹھن وقت پڑا وہ امداد بن کر سامنے آئے۔"

مُرید بھی اپنے مُرشد کی بات اور خیال پر متفق ہو گیا اور حضرت فتح موصلیؒ کی بزرگی کا قائل ہو گیا۔

بُری ہونے کے بعد حضرت سری سقطیؒ اپنے مُرید کو لے کر حضرت فتح موصلیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت موصلیؒ اُس وقت شدید سُکر و جذب کی کیفیت میں تھے۔ کافی دیر کے بعد انھوں نے حضرت سقطیؒ سے پوچھا "آپ کون ہیں اور کس لیے آئے ہیں؟"

آپ نے عرض کی حضرت میں وقت کا صوفی سری سقطیؒ ہوں، کمال ہے آپ نے مجھے پہچانا نہیں اور ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ مجھے جلّاد کی تلوار سے رہا کروا کر لائے ہیں۔"

حضرت موصلیؒ مسکرائے اور فرمایا" بھائی میں تمہیں کس طرح تلوار سے آزاد کروا سکتا تھا کیونکہ میں تو اپنے حجرے سے باہر نکلا ہی نہیں، پھر تمہاری مدد میں نے کیونکر کی۔"

حضرت سقطیؒ اپنی بات پر ڈٹے رہے جب کہ حضرت موصلیؒ بار بار یہ کہتے رہے کہ وہ میں نہ تھا البتہ اتنا ضرور ہے کہ اُس کی شکل میرے ساتھ ملتی ہو گی۔

مگر سری سقطیؒ اپنی بات پر اڑے رہے اور عرض کی۔" حضرت آپ پر جذب و سُکر اور صحو و سلوک کی کیفیت طاری رہتی ہے۔ اس وقت آپ پر جذب و سُکر طاری ہے جب کہ مقتل میں آپ پر صحو و سلوک کی کیفیت تھی۔"

حضرت فتح موصلیؒ نے جب یہ بات سُنی تو مسکرا دیے۔ حضرت سری سقطیؒ کا مُرید حضرت موصلیؒ کی بزرگی فہم و ادراک اور ولایت میں بلند مقام کا تہِ دل سے قائل ہو گیا اور حضرت سری سقطیؒ کا یہی مقصود و مطلوب تھا۔

حضرت فتح موصلیؒ کی تاریخ ولادت اور دیگر حالاتِ زندگی کے متعلق اگرچہ صحیح معلومات فراہم نہیں کی گئیں تاہم اس قدر معلوم کیا گیا ہے کہ آپ تیسری صدی ہجری میں بغداد کے شہر میں پیدا ہوئے اور یہیں پلے بڑھے۔ بغداد اس زمانے میں علم و تصوّف کا گہوارہ تھا۔ حضرت سری سقطیؒ نہ صرف آپ کے ہم عصر تھے بلکہ انھیں آپ کے ساتھ بہت زیادہ عقیدت تھی۔

حضرت فتح موصلیؒ کا ٹھکانہ بغداد کے محلہ کرخ کے ایک شکستہ کھنڈر میں تھا اور اُس کھنڈر میں آپ کا قیام ایسی جگہ پر تھا جہاں سارا دن دھوپ رہتی تھی اور اُس بے سائبان جگہ کو آپ اپنی خانقاہ و حجرہ کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ آپ نے نوجوانی کے زمانے سے ہی دنیا ترک کر کے خدا سے لو لگا لی تھی۔ حالانکہ جس زمانے میں آپ کی زندگی گزری اُس وقت بغداد عروج پر تھا۔ ہر انسان اپنے حال میں مست عہدے و مناصب کے لیے ایک دوسرے کے ذرکی ناصیہ فرسائی کر رہا تھا۔ ترغیب و تحریص کی کارفرمائیوں اور رزلت کی فراوانی نے پورے حاضر پر ایک نشہ سا طاری کر رکھا تھا اور حضرت فتح موصلیؒ کا یہ حال تھا کہ آپ دنیاوی محبّت سے بے نیاز ہر وقت یادِ الٰہی میں مگن رہتے تھے۔ بغداد میں ہر طرف نفسِ امارہ کی حکومت تھی جب کہ اللہ والوں نے نفسِ امارہ پر
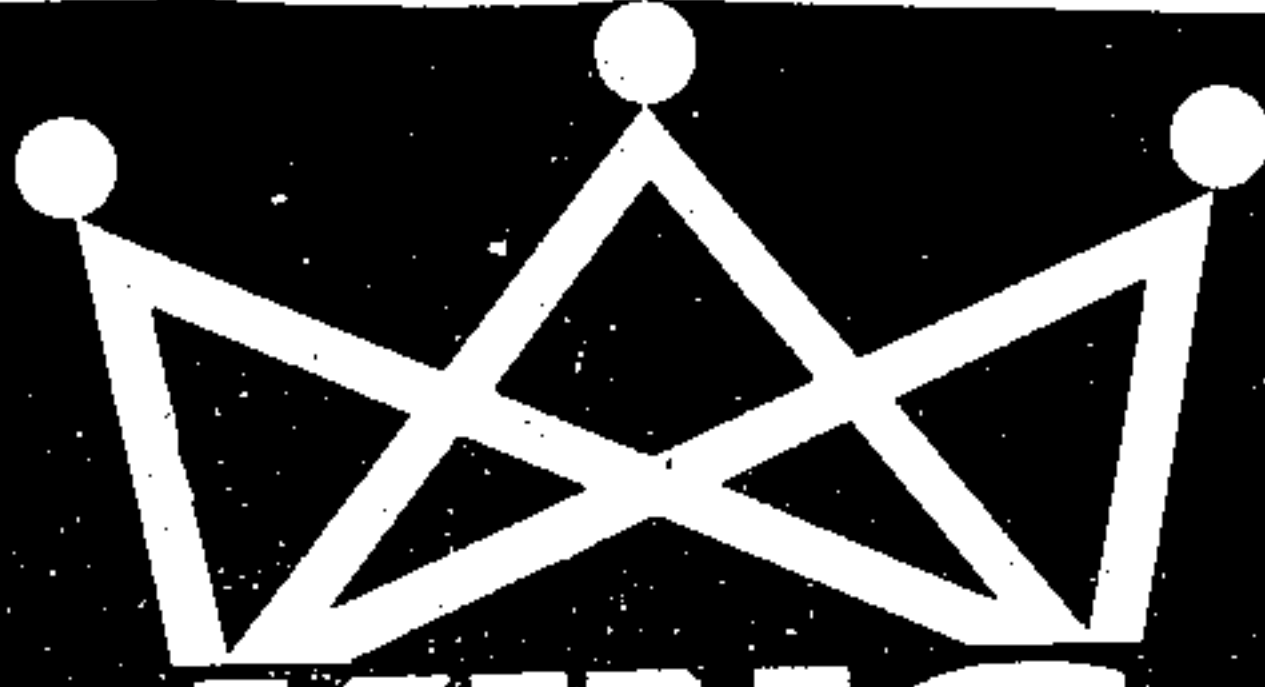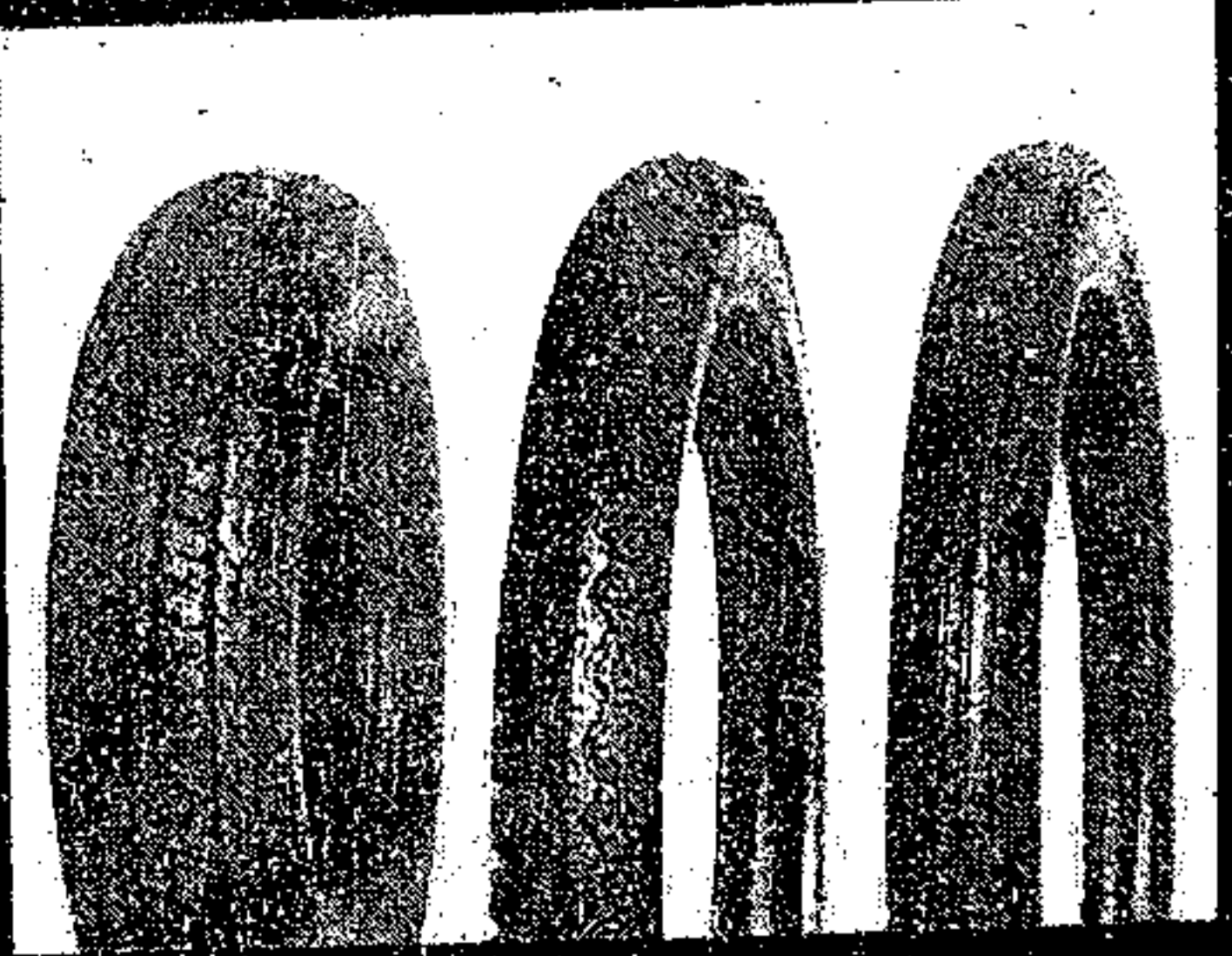
اپنی حکومت قائم کر رکھی تھی اور لوگوں کو بھی نفس امارہ پر حکومت کرنے کا درس دیتے تھے۔ آپ کی زندگی اور عبادت پر آپ کے ہم عصر بزرگ رشک کیا کرتے تھے۔ حضرت سری سقطیؒ اپنی عقیدت کی بنا پر اکثر حضرت فتح موصلیؒ کی خدمت میں حاضر رہا کرتے تھے۔ مگر دونوں میں باتیں کم ہوتی تھیں محض ایک دوسرے کی قربت میں بیٹھے یادِ الٰہی میں مگن رہا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ ایک شخص نے آپ سے صدق کا مطلب پوچھا۔ آپ نے فرمایا: "صدق ایسا مفہوم ہے کہ اس پر اگر میں بولنا شروع کروں تو کئی دن اور کئی راتوں میں بھی اس کا تفصیلی ذکر بیان نہ کر سکوں گا۔"

اس شخص نے عرض کی: "حضرت! پھر میں اس کے بارے میں کیسے جان سکوں گا۔"

آپ اُسے اپنی خانقاہ کے نزدیک ایک لوہار کی بھٹی پر لے گئے۔ لوہار نے بھٹی میں لوہا ڈال رکھا تھا اور لوہار کا شاگرد دھونکنی چلا رہا تھا۔ جب لوہا گرم ہو کر لال ہو گیا تو لوہار نے سنّی کے ساتھ لوہا پکڑا اور اس کو کوٹنا شروع کیا جب لوہے کی رنگت پھر بدل گئی تو لوہار نے دوبارہ لوہا آگ میں ڈال دیا۔

حضرت نے اُس سائل سے فرمایا: "تم نے یہ سُرخ لوہا دیکھا ہے۔"

اُس نے عرض کی: "حضرت دیکھا تو ہے۔"

آپ نے فرمایا: "تو کیا تم بغیر سنّی کے اُسے ہاتھ میں پکڑ سکتے ہو۔"

اُس نے کہا: "حضرت! بالکل نہیں میں تو کیا اسے تو کوئی شخص بھی نہیں پکڑ سکتا۔"

آپ نے بھٹی میں سے لال لال گرم لوہا نکالا اور اپنی انگلیوں کے ساتھ اٹھا لیا اور اُسے ہاتھ میں پکڑے ہوئے فرمایا: "اس طرح گرم لوہے کو پکڑ لینا صدق ہے کیونکہ صدق کی طاقت سے صدیق کی انگلیوں اور ہاتھ میں گرم لوہا، برف ہو جائے گا۔"

وہ شخص حیرت زدہ رہ گیا اور لوہار اور اس کا شاگرد بے ہوش ہوتے ہوتے رہ گئے۔ جب آپ بھٹی سے جانے لگے تو لوہار نے آپ کی خدمت میں عرض کی "حضرت! میں تو اب یہ سارا کام وام چھوڑ کر آپ کی خدمت میں رہوں گا۔"

آپ نے اُسے منع فرمایا: "اس کی کوئی ضرورت نہیں، خدا نے تمہیں جس کام پر لگایا وہ ہی مناسب ہے اپنے کام کو صدق و یقین سے انجام دیتا رہے گا تو ایک دن ایسا آ جائے گا جب تم سے کرامتیں رونما ہونے لگیں گی۔"

لوہار کا شاگرد بھی از خود رفتہ ہو چکا تھا، اُس نے آپ کے پیچھے دوڑنا شروع کر دیا۔ آپ نے اُس سے کہا: "تم اپنے استاد کے ساتھ رہو۔"

مگر وہ تو رونا شروع ہو گیا "حضرت میں تو آپ کے ساتھ ہی رہوں گا۔" جب لوہار نے اپنے شاگرد کو پکڑ کر اپنے پاس بٹھانا چاہا تو اُس نے اپنے اُستاد کو اٹھا کر پرے پھینک دیا۔ حضرت فتح موصلیؒ نے اس سے یہ کہا۔

"اس پر صدق و یقین کا اس قدر نشہ چڑھ گیا ہے کہ اس کو بیک وقت دس آدمی بھی قابو نہیں کر سکتے۔" کے بعد آپ نے لوہار کے شاگرد کو سمجھایا کہ تم فی الحال اپنے استاد کے ساتھ کام کرو اور جب تمہیں کام سے مل جائے تو میرے پاس آ جایا کرو۔ روحانیت کے اسباق حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ دنیا کے کام بھی اُس نے آپ کی بات مان لی اور اپنے استاد کے ساتھ کام میں مشغول ہو گیا۔ جو شخص صدق کا مفہوم کا متمنی تھا وہ بڑا ہی متاثر ہوا اور عرض کرنے لگا۔

" حضرت! جس انداز سے صدق کا مفہوم اور مضمون آپ نے بیان کیا اُسے دُنیا کا کوئی شخص بیان نہیں کر سکتا۔ اس طرح کا عملی مظاہرہ اہلِ اللہ ہی کر سکتے ہیں۔"

ایک شخص کے دل میں حضرت فتح موصلیؒ کے متعلق بہت بُغض تھا وہ اکثر آپ کے خلاف پراپیگنڈہ کرتا کہ آپ نے لوگوں کو اُلّو بنایا ہوا ہے اور درپردہ وہ لوگوں سے دولت سمیٹتے ہیں۔ اُس شخص کو کئی حضرات نے سمجھایا کہ حضرت موصلیؒ کے خلاف اپنی مخالفت ترک کردو، وہ واقعی اللہ کے ولی ہیں اور اُن کو تو دنیا داری سے سخت نفرت ہے بلکہ وہ تو ہر وقت جذب وسُکر میں محو رہتے ہیں۔ ان باتوں کو سُن کر وہ بُغضی شخص یہ مسئلہ اُٹھاتا کہ اگر وہ حضرت ہر وقت عبادتِ الٰہی میں مصروف ومشغول رہتے ہیں تو وہ روزمرّہ زندگی کی ضروریات کس طرح پوری کرتے ہیں۔ اس کے متعلق بھی اُس کو بتایا گیا کہ حضرت فتح موصلیؒ دن کے کچھ اوقات میں کھجوریں فروخت کرتے ہیں اور یوں انھوں نے اپنی ناگزیر ضرورت کا ذریعہ آمدن بنا رکھا ہے۔ مگر یہ باتیں بھی اُس مُنکر انسان کو مطمئن نہ کرتیں۔ اُس کے دل میں تو ایسا بُغض، کینہ اور نفرت پیدا ہو چکے تھے کہ اس کا ہر وقت یہی جی چاہتا کہ کسی طرح کوئی ایسی بات پیدا ہو۔ کوئی ایسا نقطہ ملے جس کو بُنیاد بنا کر حضرت موصلیؒ کو بدنام کروں اور اُن کی سیرت ونیک نامی داغدار ہو جائے۔

انہی مذموم ارادوں میں غرق ایک دن بازار میں اُس شخص نے حضرت فتح موصلیؒ کو دیکھا کہ انھوں نے اپنی تمام کھجوریں فروخت کر کے آمدشدہ رقم جیب میں ڈالی اور ایک نان بائی کی دُکان پر گئے وہاں سے روٹیاں خریدیں پھر ایک کبابچی کی دُکان سے کباب خریدے، کچھ مٹھائی خریدی اور ایک برتن میں تھوڑا سا فالودہ لیا اور یہ ساری چیزیں لے کر چل پڑے۔ اُس مخالف ومُنکر انسان نے یہ سارا منظر دیکھا تو اُس کی آنکھوں میں حسد اور نفرت کے شعلے جل اُٹھے۔ اُس نے دل میں سوچا۔ آج اس گندم نما جو فروش انسان کو جی بھر کر بدنام کروں گا کہ بظاہر یہ شخص درویش بنا پھرتا ہے مگر اُس کی خوراک کس قدر امیرانہ ہے اور اُس کے متعلق لوگوں کے دلوں میں جو عزت واحترام ہے وہ آج ختم ہو جائے۔ یہ باتیں سوچتا ہوا وہ حضرت فتح موصلیؒ کے پیچھے پیچھے چلتا گیا۔ آپ شہر سے باہر نکلتے گئے اور آہستہ آہستہ آبادی سے دور نکل آگے وہ شخص بھی اپنا منہ سر کپڑے سے چھپائے آپ کے پیچھے چلتا گیا۔ اب جوں جوں ویرانہ اور غیر آباد علاقہ شروع ہوتا جاتا وہ بھی حیران ہوتا جاتا کہ آخر یہ فتح موصلیؒ کس بات کے انتظار میں ہیں، یہ کھانا کیوں نہیں کھاتے۔

چلتے چلتے وہ ایک بڑے سے جنگل میں پہنچے۔ یہاں اُس شخص نے سوچا اب تو جنگل آ گیا ہے۔ اب فتح موصلیؒ یہاں چھُپ کر یہ لوازمات نکالیں گے۔ مگر اُس کا یہ خیال بھی خام ثابت ہوا۔ اتنا بڑا جنگل بھی چل کے انھوں نے عبور کیا۔ وہ شخص بھی آپ کے پیچھے چلتا گیا۔ جب جنگل سے نکل کر کافی آگے پہنچے تو آپ ایک آبادی میں پہنچے اور وہاں پر ایک مسجد میں داخل ہو گئے۔ وہ شخص بھی آپ کے پیچھے پیچھے مسجد کے اندر پہنچا۔ مسجد کے اندر ایک مریض پڑا تھا جس کو بیماری نے اتنا لاغر کر دیا تھا کہ وہ اُٹھ کر بیٹھ بھی نہیں سکتا تھا۔ آپ نے اُن کو کھانا کھلایا اُس کی خدمت کی۔ اُس مُنکر وحاسد انسان نے جب یہ منظر دیکھا تو اُس کو بڑی مایوسی ہوئی اور وہ اپنے آپ کو کوسنے لگا کہ خواہ مخواہ میں نے اپنا وقت ضائع کیا اور بھوکا پیاسا بھٹکتا رہا ہوں۔ یہ سوچ کر وہ شخص اس آبادی میں روٹی کی تلاش میں نکلا تاکہ اپنی بھوک مٹا سکے۔ جب کھانا کھا کر واپس آیا اور مسجد میں داخل ہوا تو وہاں فتح موصلیؒ غائب تھے اور وہ مریض اکیلا لیٹا ہوا تھا۔ اُس نے مریض سے پوچھا: " وہ جو آپ کو یہیں کھانا کھلا رہا تھا وہ کہاں گیا ہے۔"

اُس مریض نے جواب دیا۔" وہ تو وقت کے قطب حضرت فتح موصلیؒ ہیں وہ ہفتہ میں ایک مرتبہ بغداد سے یہاں آتے ہیں اور میری تیمار داری اور طعام کا انتظام کر جاتے ہیں۔ اُن کو اللہ نے اس کام پر مامور کیا ہے، کیونکہ میں جب بیمار ہوا تو میرے گھر والوں نے مجھے گھر سے نکال دیا۔ تب سے حضرت فتح موصلیؒ باقاعدگی سے ہفتہ بہفتہ آتے ہیں اور میری تمام ضروریات پُوری کر جاتے ہیں۔"

اب اُس منکر شخص کو خیال ہوا کہ میں تو بغداد سے شاید کہیں دُور پہنچ گیا ہوں اُس نے یہ سوچ کر مریض سے سوال کیا۔" بغداد یہاں سے کتنی دُور ہے؟"

اُس نے جواب دیا۔" کوئی چالیس فرسنخ (ایک سو پچاس میل)"

یہ سُن کر اُس حاسد انسان کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ اُس نے سوچا شاید مریض جھوٹ بول رہا ہے اس بات کی تصدیق کے لیے اُس نے آبادی والوں سے بغداد کے فاصلے کا پُوچھا تو وہاں سے بھی یہی جواب ملا کہ بغداد یہاں سے ایک سو پچاس میل ہے۔ اب تو وہ شخص سخت پریشان ہوا اور اپنے آپ کو ملامت کرنے لگا کہ حضرت فتح موصلیؒ کا پیچھا کیوں کیا تھا۔ اسی پریشانی میں مسجد میں داخل ہوا اور مریض سے حضرت کے بارے میں پوچھنے لگا۔

اُس مریض نے بڑی دُرشتی سے جواب دیا۔" میاں! تمہیں ایک مرتبہ بتایا تو ہے کہ وہ ایک ہفتہ سے پہلے نہیں آئیں گے ایک ہفتہ انتظار کرو۔" یہ کہہ کر مریض نے اُس سے دریافت کیا" مگر تم یہاں آ گئے کیسے؟" اس پر اُس شخص نے اپنی تمام کینہ پروری یہاں بیان کر دی اور پورا ایک ہفتہ حضرت فتح موصلیؒ کا انتظار کرتا رہا۔ ایک ہفتہ کے بعد حضرت وہاں اشیائے خورد و نوش کے ساتھ پہنچے تو مریض کے ہمراہ ایک شخص کو دیکھا تو دریافت کیا کہ یہ کون ہے؟

مریض نے جواب دیا۔" میں تو اس کو نہیں جانتا یہ گزشتہ ہفتے آپ کے پیچھے چلتا ہوا یہاں پہنچا تھا۔"

یہ سُن کر حضرت نے اُس شخص سے پوچھا" تم یہاں کیسے پہنچے ہو؟"

اُس نے تمام قصہ سنا کر عرض کی۔" حضرت! میں اپنی غلطی اور حماقت پر شرمسار ہوں۔" اُس شخص نے عرض کی۔" آپ بجا فرماتے ہیں میں اس کا بھی اعتراف کرتا ہوں۔"

اس کے بعد حضرت فتح موصلیؒ نے اُس شخص سے پوچھا" اب تم کیا چاہتے ہو؟"

عرض کی۔" حضرت! میں بغداد واپس جانا چاہتا ہوں۔"

آپ نے فرمایا" ابھی جب میں واپس جاؤں گا تو تم میرے پیچھے پیچھے خاموش چلتے رہنا۔"

اُس نے عرض کی۔" بہت بہتر جناب۔"

حضرت فتح موصلیؒ نے اس مریض کو کھانا کھلایا اور اس کی دیگر ضروریات پُوری کر کے اُس کی مکمل مدد سرانجام دینے کے بعد جب رخصت ہونے لگے تو آپ نے اُس شخص کو حکم دیا کہ تم میرے پیچھے پیچھے چلتے رہو۔ شخص نادم اور شرمسار سا آپ کے پیچھے چلتا ہوا بغداد پہنچ گیا۔ یہاں پہنچ کر حضرت فتح موصلیؒ نے اُس سے کہا۔" بغداد میں تم کون سی جگہ پر رہتے ہو؟"

اُس نے کہا۔" میں سناروں کی بستی سے ملحقہ محلے میں رہتا ہوں۔"

حضرت نے اشارہ کر کے اُسے اُس کے محلے میں پہنچا دیا۔ یہ روحانی کرامات اُس شخص نے دیکھیں تو نہ صرف حضرت فتح موصلیؒ کی ذات کا معترف ہو گیا بلکہ اُس کو خود بھی روحانیت و ولایت کا شوق پیدا

اس نے حضرت فتح موصلیؒ سے معافی مانگی۔ اپنی غلطیوں کا اعتراف کیا اور آئندہ محتاط رہنے کا وعدہ کیا۔
اگلے روز وہ شخص آپ کی خدمت میں دوبارہ حاضر ہوا اور عرض کی "حضرت میں نے ایک طویل عرصہ آپ کی مخالفت میں گزارا ہے۔ اور شدید غلط عزائم رکھ کر بھی مجھے ہمیشہ ناکامی اور ذلت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اب جب میں نے آپ کے مقام اور مرتبہ کو پہچان لیا ہے تو اب میرا دل چاہتا ہے کہ میں ہر وقت آپ کی خدمت میں رہوں۔ اسی وجہ سے میں نے اپنا تمام کاروبار چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ آپ مجھے اجازت دیں تاکہ میں اپنا تمام وقت آپ کی خدمت میں گزارا کروں۔"
آپ نے اس شخص کو کاروبار ترک کرنے سے منع کیا کہ تمہاری دولت اور کاروبار سے بہت سے لوگوں کی روزیاں وابستہ ہیں۔ تم کاروبار میں مصروف رہنے کے ساتھ ساتھ عبادت و ریاضت بھی کرو۔ ہمارے پاس بھی کسی کسی دن آجایا کرو اور باقی غرباء اور مساکین کی دل کھول کر امداد کیا کرو۔ ان شاء اللہ تمہارے گزشتہ گناہ اللہ معاف کردے گا اور تمہاری آئندہ راہیں اپنے نور سے منور کردے گا۔ کچھ عرصہ کے بعد اس شخص نے آپ کے فرمودات پر عمل کرکے ولایت میں ایک بلند مقام حاصل کر لیا۔
ایک مرتبہ حضرت فتح موصلیؒ نے اپنے مریدوں سے فرمایا "کیا تم میں سے کوئی یہ چاہتا ہے کہ میں اسے ایک کم سن کامل ولی کی زیارت کراؤں جو انتہائی کم عمری میں عرفان و معرفت کی تمام منازل طے کر چکا ہے؟"
سب مریدوں نے خواہش اشتیاق ظاہر کیا کہ ہم سب اس روحانیت وولایت کے مسند نشین کی زیارت کرنا چاہتے ہیں۔ آپ اپنے تمام ارادت مندوں کو لے کر چل پڑے۔ ایک جنگل کے قریب پہنچے تو سب نے دیکھا ایک بالکل کم عمر لڑکا کچھ پڑھتا ہوا ایک طرف کو جا رہا تھا۔ اس کی چال میں وقار، چہرے پر تمکنت اور ظاہری ہیئت میں ایک عزم تھا۔
حضرت فتح موصلیؒ نے اس کم سن ولی کو روکا اور پوچھا "تم کہاں جا رہے ہو؟"
اس نے جواب دیا "میں حج بیت اللہ کے لیے جا رہا ہوں۔"
آپ نے فرمایا "اس وقت تم کس چیز کا ورد کر رہے ہو؟"
اس نے جواب دیا "میں اس وقت قرآن مجید پڑھ رہا ہوں۔"
پھر آپ نے اس سے کہا "تم نے ابھی زندگی کے تکالیف و رنج کا مزہ نہیں چکھا۔"
اس نے جواب دیا "میں نے اپنے سامنے اپنے بھائی بہنوں کو موت کا شکار ہوتے دیکھا اس سے بڑے کیا غم ہو سکتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ لڑکا پھر تلاوت کلام پاک میں مشغول ہو گیا۔
حضرت موصلیؒ اس سے بار بار سوال و جواب صرف اس لیے کر رہے تھے کہ وہ اپنے مریدوں کو بتانا چاہتے تھے کہ وہ لڑکا معرفت اور ولایت میں کتنے بلند درجات حاصل کر چکا ہے۔ آپ نے چند اور سوال اس کم سن ولی سے کیے۔ "تمہاری رفتار کس قدر سست ہے تم آخر کب اپنی منزل پر پہنچو گے؟ تمہارے پاس نہ سواری ہے نہ ہی توشہ۔"
اس لڑکے نے جواب دیا "اے بزرگ محترم! مجھے خدا پر کامل یقین ہے اور میں خلوص دل اور یقین کامل سے سفر کر رہا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ میں اپنی منزل تک ضرور پہنچوں گا۔ رہی بات سواری اور توشے کی آپ ذرا یہ بتائیں کہ اگر آپ کسی کے گھر مہمان بن کر جائیں گے تو کیا اپنا کھانا ساتھ لے جائیں گے؟"
حضرت موصلیؒ نے جواب دیا "ہرگز نہیں یہ تو میزبان کی توہین ہے کہ اپنی روٹی ساتھ لے کر جایا جائے۔"

لڑکا بولا،" تو میں بھی خدا کے ہاں مہمان جا رہا ہوں اور میرا کھانا دانہ اسی کے ذمہ ہے اور اگر میں اپنا کھانا وغیرہ ساتھ لے جاؤں تو کیا یہ خدا کی توہین نہ ہوگی۔ پھر مجھے اللہ پر اتنا یقین ہے کہ میرا ہر قدم ایک یقین اور استقامت کے ساتھ اُٹھ رہا ہے۔"

حضرت فتح موصلیؒ نے اپنے مُریدوں سے پوچھا کہ تم لوگوں نے اس ننھے سے ولی کی باتیں سُنی ہیں سب لوگ بولے ہم تو اس بچّے کی باتیں سُن کر حیرت زدہ رہ گئے ہیں کہ اس قدر کامل شخص ہم نے پہلے نہیں دیکھا۔ اُسی سال حضرت فتح موصلیؒ بھی بیت اللہ کے حج کو پہنچے وہاں ان کی ملاقات اسی کم سن ولی سے ہوئی وہ آپ کو دیکھ کر مسکرایا اور بولا،" دیکھیں میرے یقین اور صدقِ دلی نے مجھے کعبہ تک پہنچا دیا، اور اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنی نعمتوں سے نوازا ہے۔

ایک شخص حضرت سری سقطیؒ کے پاس آیا اور بولا،" یہ فتح موصلیؒ جو ہیں یہ کوئی مجنوں اور مجنوط الحواس شخص معلوم ہوتے ہیں۔"

حضرت سری سقطیؒ نے اس شخص کو جواب دیا،" جس شخص نے دنیا چھوڑ دی اور اس پر دنیا کی ترغیب و تحریم بے اثر رہی اس لیے تم اُس کو پاگل کہتے ہو۔ حالانکہ پاگل وہ لوگ ہیں جو دنیا کی چمک میں کھو کر سب دنیا ہو گئے ہیں۔"

اس شخص نے پھر کہا،" مگر فتح موصلیؒ کو تو اپنا ہوش نہیں ہے۔ اس بے ہوشی کو بزرگی تو نہیں کہا جا سکتا۔"

حضرت سری سقطیؒ نے فرمایا،" تم لوگ ہوش و حواس کسے کہتے ہیں؟ جو لوگ دنیا ہی کے ہو کر رہ گئے ہیں وہ اپنے ہوش و حواس میں کب ہیں جب کہ فتح موصلیؒ نے دنیا کو بھلا کر آخرت کو محبوب رکھا ہوا ہے کیونکہ زندگی عارضی ہے اور آخرت دائمی ہے۔"

یہ باتیں سُن کر اُس شخص کو حضرت فتح موصلیؒ سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہوا اور وہ آپ کی خانقاہ واقع موصل کی طرف چل پڑا۔ جب وہ آپ کی خانقاہ میں پہنچا اور آپ کو کڑکتی دُھوپ میں بیٹھے ہوئے پایا۔ مگر خانقاہ کے اندر جانے سے پہلے دروازے پر ہی رُک گیا۔ آپ کو دُور سے دیکھ کر ہی آپ کی بزرگی کا رُعب اُس کے دل پر طاری ہو گیا۔ آپ کو کشف کے ذریعے اُس شخص کی آمد کی خبر ہو گئی۔ آپ نے اپنے خادم سے کہا" جاؤ ہمارے دروازے پر ایک شخص کھڑا ہے اُس کو اندر لاؤ۔ اس شخص کو سر برہنہ خانقاہ کے اندر لائے تو وہ شخص حضرت فتح موصلیؒ کے قدموں میں گر گیا اور اپنی ساری خطاؤں پر معذرت کی۔ آپ نے اُس کو معاف کر دیا اور اپنے حلقۂ ارادت میں شامل کر لیا۔

ایک روز آپ اپنے درود وظائف ختم کر کے مسجد سے نکل رہے تھے کہ ایک نوجوان آپ کے پاس آیا اور بولا،" میں بہت دُور سے آیا ہوں مجھے اللہ نے حکم دیا تھا کہ آپ کی زیارت کروں۔"

آپ نے فرمایا،" آپ میرے مہمان ہیں۔ مجھے بتائیں میں آپ کی کیا خدمت کروں۔"

اس نوجوان نے عرض کی،" مجھے کسی ظاہری خدمت کی ضرورت نہیں میں نے بازار سے روٹی اور کباب لے لیے ہیں۔ رہائش کا میرا انتظام شہر سے باہر ایک سرائے میں ہے۔ مگر میں جو خدمت آپ کے سپرد کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ میرا وقت قریب آ چکا ہے اور کل دوپہر تک مجھے خدا کی طرف

جائے گا۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ جب میں وفات پا جاؤں تو آپ میری تجہیز و تکفین اپنے ہاتھوں سے کریں۔"

آپ نے ایسا کرنے کا وعدہ کر لیا۔ اگلے روز آپ دریائے دجلہ کے کنارے واقع سرائے میں پہنچے تو آپ نے دیکھا کہ وہاں لوگوں کا مجمع لگا ہوا ہے۔ آپ نے لوگوں سے پوچھا "کیا بات ہے یہاں لوگ کیوں اکٹھے ہوئے ہیں؟"

لوگوں نے بتایا کہ ایک پردیسی یہاں سرائے میں ٹھہرا ہوا تھا انتقال کر گیا ہے۔"

آپ نے ہجوم سے پوچھا "یہ کون تھا؟"

لوگوں نے کہا "وہ جب سے یہاں تھا بالکل الگ تھلگ رہتا تھا اور کسی سے کوئی بات نہیں کرتا تھا اس لیے اس کے متعلق ہم لوگ کچھ نہیں جانتے۔"

حضرت فتح موصلیؒ نے فرمایا "اُس کے متعلق میں جانتا ہوں یہ ایک عارف باللہ تھا۔ اُس کی تجہیز و تکفین کا حکم ہے۔ اس کے بعد آپ نے اپنے ہاتھوں سے اُس شخص کو غسل دیا اور اُسے دفن کیا۔ اُسی رات خواب میں اُس نوجوان نے آپ سے ملاقات کی اور بتایا کہ آپ نے مجھ پر جو احسان کیا ہے میں اُس کا شکر گزار ہوں اور اس کے بدلہ میں آپ کو اس طرح دوں گا کہ جب مجھے قربِ خداوندی حاصل ہو گیا تو میں آپ کو بھی فراہم کر دوں گا۔"

جب آپ کی آنکھ کھلی تو آپ عجیب سا اطمینان و سکون محسوس کر رہے تھے۔ آپ اس نوجوان کی وفات کے بعد زیادہ دیر زندہ نہ رہے اور طویل عمر پانے کے بعد وصال فرمایا۔ آپ کی تاریخ وفات کے بارے میں بھی مورخ خاموش ہیں۔ آپ عمر بھر اولیاؤں اور ابدالوں سے فیضیاب ہوئے اور ہمیشہ خدا کے طالب رہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو نہایت بلند مقام عطا فرمایا۔ آپ کا مزار شہرِ بغداد میں مرجعِ خاص و عام ہے۔

طاقت کی برتری

قوت اور امانت دونوں کسی ایک آدمی میں جمع ہوں، ایسے لوگ آج تک بہت کم ہیں۔ پس امام کسی اقلیم کے لیے والی اور حاکم مقرر کرنا چاہتا ہو اور دو آدمی ملتے ہیں جن میں ایک امانت دار ہے اور دوسرا طاقت ور ہے تو امام کا فرض ہے کہ وہ اسے مقدم رکھے جو اس اقلیم اور ولایت کے لیے زیادہ مفید اور زیادہ سے زیادہ نفع پہنچانے والا ہو۔ چنانچہ امارتِ حرب اور جہاد کے لیے ایسا آدمی مقرر کرے جو قوی، دلیر اور شجاع اور بہادر ہو اگرچہ وہ فاجر ہی کیوں نہ ہو اور ضعیف و عاجز کے مقابلے میں اسی کو ترجیح دے۔ خواہ وہ امین ہو۔ امام احمد حنبل سے کسی نے پوچھا دو آدمی ہیں اور وہ دونوں ہی حرب و جہاد کے امیر و سردار ہیں مگر ان میں سے ایک فاجر مگر قوی ہے دوسرا صالح اور نیک ہے مگر ضعیف و کمزور ہے تو دونوں میں سے کس کے ساتھ رہ کر جہاد کرنا چاہئے؟ آپ نے فرمایا "فاجر قوی کی قوت مسلمانوں کے لیے ہے اور اس کا فجور اس کی جان کے لیے ہے اور صالح اور نیک اگر ضعیف و کمزور ہے تو اس کی صلاح اور نیکی اس کی جان کے لیے ہے اور اس کا ضعف مسلمانوں کا ضعف کا موجب ہے تو جہاد قوی فاجر کے ساتھ رہ کر کرنا چاہئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "اللہ تعالیٰ فاجر آدمی سے بھی اس دین کی مدد کرا دیتا ہے۔" ہاں جب امیر و سالار کے منصب کے لیے قوی القلب شجاع اور دلیر میسر نہ آسکے اور اس جگہ کو پُر کرنے کے لیے کوئی موزوں آدمی نہ مل سکے تو اس وقت اصلح فی الدین مقرر کرنا چاہئے۔ (سیاستِ شرعیہ از امام ابنِ تیمیہ)

احمد شاہ درانی

کے دربار میں موکل خان نامی ایک پرہیزگار شخص اعلیٰ عہدے پر تعینات تھا۔ دین اسلام اور مذہب سے انھیں خصوصی لگاؤ تھا۔ نوکری تو بادشاہ کے دربار میں کرتے تھے مگر دل ہر وقت اللہ تعالیٰ کی یاد میں کھویا رہتا تھا۔ موکل خان کو جب موقع ملتا وہ روحانی علوم کی تعلیم کے لیے بڑے بڑے صوفیا اور اہل علم کی صحبت میں جا بیٹھتے۔ انہی دنوں ایک صاحب حال بزرگ گلزار محمّد خان کے علوم و فیوض کا بڑا شہرہ تھا۔ ان کی کرامات کا چرچا دُور دُور تک پھیل چکا تھا۔ چونکہ موکل خان پہلے ہی کسی برگزیدہ ہستی کی صحبت کے لیے بے چین رہتے تھے چنانچہ وہ دل میں یہ حسرت لیے گلزار محمّد خان کی خدمت میں حاضر ہوگئے اور ان سے کہا کہ وہ انھیں اپنا مرید بنا لیں۔

آپ نے فرمایا "موکل خان تُو تو دُنیا داری کا دامن تھامے ہوئے ہے جب کہ تصوف کی راہیں تو بہت کٹھن ہیں اس کے لیے تو انسان کو اپنا تن من دھن سب کچھ قربان کرنا پڑتا ہے۔"

موکل خان نے کہا "حضرت میں درویشی کی راہ اختیار کرنے کے لیے ہر قسم کا دُکھ قبول کرنے کو تیار ہوں بس آپ مجھ پر نظرِ عنایت فرما دیں۔"

گلزار محمّد خان نے کافی دیر خاموش رہنے کے بعد فرمایا "موکل خان میں تمہیں اس شرط پر مرید بناؤں گا کہ تمہیں مجھ سے بہت دُور جانا پڑے گا کیوں کہ جہاں پر میں مقیم ہوں یہاں تمہاری کوئی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اس مقصد کے لیے تمہیں ہندوستان جانا پڑے گا۔"

موکل خان نے بلا تامل مرشد کے حکم کی تعمیل کرنے کا وعدہ کر لیا اور آپ کی قدم بوسی کے لیے جھک گئے۔ چنانچہ اس کے بعد باقاعدہ ایک رسم ہوئی جس میں مریدوں میں مٹھائی تقسیم کی گئی اس موقع پر آپ نے گلزار محمّد خان نے اس بات پر موکل خان کی بے حد تعریف کی کہ انھوں نے احمد شاہ درانی کے دربار میں بڑے عہدے کو ٹھکرا کر گدائی کو بخوشی قبول کر لیا۔

اس موقع پر موکل خان نے ڈرتے ڈرتے اپنے مُرشد سے سوال کیا کہ حضرت آخر اس بات میں کونسی مصلحت ہے کہ آپ مجھے اپنے قدموں میں رکھنے کے بجائے ہندوستان ـــــ بھجوانا چاہتے ہیں۔

اس پر درویش گلزار محمد نے کافی دیر سوچنے کے بعد فرمایا "موکل خان مَیں آنے والے وقت پر نگاہ رکھتا ہوں۔ شاید تمھیں یہ معلوم نہیں کہ جب تُو ہندوستان چلا جائے گا تو وہاں تمہاری کسی آئندہ نسل میں سے ایک ایسا بیٹا پیدا ہوگا جو تیرے خاندان کے نام کو ہمیشہ کے لیے روشن کر دے گا۔" موکل خان نے جب اپنے مُرشد کی بات سُنی تو وہ خوشی سے نہال ہو گئے۔ انھوں نے فوری طور پر شاہی ملازمت کو خیرباد کیا اور اُسی وقت اپنے مُرشد کی ہدایت پر ہندوستان کے سفر پر روانہ ہو گئے۔

جب موکل خان سفر پر جانے لگے تو آپ کے مُرشد نے کہا کہ مَیں اپنے دو خلیفوں حاجی مڈ اور شیر خاں غازی کو تمہارے ساتھ روانہ کر رہا ہوں تاکہ وہ راستے میں تمہاری تعلیم و تربیت کے فرائض انجام دے سکیں۔ چنانچہ موکل خان سفر پر روانہ ہو گئے اور آخر کار ضلع ہوشیار پور میں ایک ایسی جگہ پر ڈیرے لگا لیے۔ جو کہ خیلیوں کی ملکیت تھی۔

درویش گلزار محمّد خاں نے موکل خاں کے بارے میں جو یہ پیشن گوئی کی تھی کہ اُن کی آئندہ نسلوں میں کوئی ولی اللہ پیدا ہوگا رفتہ رفتہ اُس کے پورا ہونے کا وقت قریب آنے لگا۔ کچھ ہی عرصہ بعد موکل خان کا انتقال ہو گیا اور اُن کی جگہ حمریز خان کو اپنا گدی نشین مقرر کر دیا پھر کچھ عرصہ بعد اُن کا بھی وصال ہو گیا اور اُن کی جگہ ان کے بیٹے شیر محمّد خان نے اپنے کنبے کی کفالت کا ذمّہ اپنے سر لے لیا۔ شیر محمّد خان جب تیس بتیس برس کی عمر کو پہنچے تو ۱۲۰۴ھ میں انھیں اللہ تعالیٰ نے ایک فرزند عطا فرمایا جو کہ خوبصورتی کی ایک منفرد اور انوکھی مثال تھی۔ ماں باپ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ بس یہی جی چاہتا تھا کہ وہ ہر وقت بچّے کو دیکھتے ہی رہیں۔ باپ کو بچّے کے نام کی فکر تھی۔ آخر ایک نام القا ہو گیا اور نومولود کا نام دیدار بخش رکھ دیا گیا۔ پہلی بار نام رکھنے میں خاندانی روایت کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ اصل نام سے پہلے ہر نام کے ساتھ خان ضرور لگتا تھا لیکن اب خان کی جگہ بخش نے لے لی تھی۔

دیدار بخش دل کا سرور اور آنکھوں کا تارا بنا ہوا تھا کہ پانی کی طرح بہتے ہوئے پُرسکون تالاب میں قدرت نے ایک پتھر مارا اور شیر محمّد خان رحلت فرما گئے۔ اس وقت دیدار بخش کی عمر صرف ڈھائی سال تھی۔ بیوی کو اپنے شوہر کی موت کا بڑا غم تھا۔ ابھی لوگ ان کی تجہیز و تکفین سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ معلوم ہوا ننھے دیدار بخش بعارضہ چیچک بستر مرگ پر پڑے ہیں۔ عیادت کرنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ علاج معالجہ بھی ہوتا رہا لیکن ہر وہ شخص جو دیدار کی حالت قریب سے دیکھ چکا تھا ناامیدی ہی ظاہر کرتا تھا۔ آخر کار یہ ننھا پودا دیکھتے ہی دیکھتے مرجھا گیا اور دیدار بخش کا انتقال ہو گیا۔ گھر میں ایک کہرام سا برپا ہو گیا۔ لوگوں نے دیدار بخش کو چھپانے کی کوشش کی مگر یہ راز راز نہ رہا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ اگر دیدار بخش کی ماں نے اپنے لاڈلے کی لاش دیکھ لی تو یہ صدمہ ان کے لیے ناقابلِ برداشت ہو جائے گا اور بہت ممکن ہے کہ ماں پر بھی دل کا دورہ پڑ جائے اور وہ چل بسیں۔ دیدار بخش کی لاش ان سے چھپا دی گئی۔ ماں اپنے بیٹے کی لاش دیکھنے کے لیے اتنی بے چین تھی کہ ایک ایک کی خوشامد کرتی پھرتی تھی "خدارا آخری بار اس کا دیدار تو کرا دو ورنہ یہ حسرت زندگی بھر کے لیے رہ جائے گی۔"

غم گساروں نے کہا "بی بی! جو ہونا تھا ہو چکا۔ مشیت ایزدی میں کس کو دخل ہے، صبر کرو کیونکہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔"

عزیز رشتہ دار بچّے کی تجہیز و تکفین میں مصروف تھے۔ ماں نے کہا: "مَیں یہ چاہتی ہوں کہ تدفین سے پہلے میرے بچّے کی شکل دکھا دی جائے۔"

لوگوں نے آپس میں مشورہ کیا اور بالاتفاق یہ طے پا گیا کہ بچّے کی شکل ضرور دکھا دینی چاہیے۔ کفن میں لپٹا ہوا بچّہ ماں کے سامنے رکھ دیا گیا۔ ماں نے حاضرین سے درخواست کی کہ کچھ دیر کے لیے سب باہر چلے جائیں تاکہ وہ اپنے بچّے کو جی بھر کر آزادی سے دیکھ سکیں۔ لوگ باہر چلے گئے۔ ماں نے اُٹھ کر پہلے تو دروازے کو اندر سے بند کر لیا اس کے بعد بچّے کو گود میں لے کر دوسرے دروازے سے نکل گئی اور مسیحا دم درویش نادر علی شاہ کے پاس چلی گئی۔

یہ بزرگ اپنے غیر معمولی تصرفات اور کرامات میں غیر معمولی شہرہ رکھتے تھے۔ اس وقت شاہ صاحب آنکھیں بند کیے مراقبے میں بیٹھے تھے۔ انہماک اور خود فراموشی کا یہ عالم کہ کون آیا اور کون گیا خبر ہی نہ ہوتی تھی۔ ماں نے کفن اتار کر برہنہ بچّہ نادر علی شاہ کے زانو پر رکھ دیا اور سامنے سے ہٹ گئیں۔ شاہ کے خادم نے انھیں اس حرکت سے منع کرنا چاہا لیکن اس خیال سے چُپ رہا کہ اس کے بولنے سے شاہ صاحب کے مراقبے میں فتور پیدا ہو جائے گا۔ لیکن وہ جیسے ہی وہاں سے ہٹیں خادم نے ان کا راستہ روک لیا۔ پوچھا: "بی بی! یہ کسے شاہ صاحب کے زانو پر رکھ آئیں؟"

انھوں نے جواب دیا: "مَیں شیر محمّد خان کی بیوہ اور اس بچّے کی ماں ہوں۔ شوہر کے بعد بیٹا بھی چھین لیا گیا۔ اب مَیں اپنے دیدار بخش کو شاہ صاحب کے حوالے کیے جا رہی ہوں۔ وہ اس کا جو چاہیں کریں۔ دفن کرا دیں، کہیں پر پھنکوا دیں، اپنے پاس رکھیں، جو جی چاہیں کریں مَیں کچھ نہیں جانتی۔"

خادم نے کہا: "بی بی! یہ آپ نے کیا غضب کر دیا کہ مردہ بچّے کو شاہ صاحب کے زانو پر رکھ آئیں؟"

اتنے میں شاہ صاحب نے خادم کو آواز دی۔ خادم نے خاتون سے کہا: "بی بی! ابھی جانا مت، مَیں ذرا شاہ صاحب کی بات سُن لوں کیا فرماتے ہیں؟"

خادم شاہ صاحب کے پاس پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ ابھی تک آنکھیں بند کیے ہوئے تھے۔ خادم نے پوچھا: "جی شاہ صاحب فرمایئے میں حاضر ہوں۔"

شاہ صاحب نے پوچھا: "یہ میرے زانو پر گیلی گیلی کیا چیز رکھی ہے؟"

خادم نے ڈرتے ڈرتے سب کچھ بتا دیا۔

آپ نے لاپروائی سے کہا: "اچھا تو یہ بات ہے۔ مرحوم بچّہ دیدار بخش ہے نا؟ یہ اس کو کیا ہو گیا؟"

خادم نے جواب دیا: "شاہ صاحب! مَیں نے عرض جو کیا کہ شیر محمّد کی بیوہ کا یہ اکلوتا بیٹا تھا جو چیچک میں رخصت ہو گیا۔"

شاہ صاحب نے فرمایا: "اچھا تو یہ بات ہے۔ مگر دیدار بخش تو ایک بزرگ ہستی کا باپ ہے۔ یہ مر کیسے گیا؟" پھر خود ہی فرمایا: "یہ مرا نہیں ہے سکتہ ہو گیا ہو گا۔ اگر یہ مر گیا تو مشیّتِ ایزدی کس طرح پوری ہو گی؟" سوال کیا: "دیکھ، یہاں آس پاس کوئی گڑھا ہے جس میں پانی بھی ہو؟"

خادم نے جواب دیا: "جی شاہ صاحب! چھوٹا سا گڑھا ہے تو سہی۔ اس میں کچھ پانی بھی بھرا ہوا ہے۔"

شاہ صاحب نے حکم دیا: "تو پھر ایسا کر کہ دیدار بخش کو پانی میں ڈال دو اور اس سے کہہ دو کہ اس سے کام نہیں چلے گا۔ بہت زیادہ سو لیے۔ اب جاگ بھی جاؤ۔"

خادم نے بچّے کو اُٹھا کر پانی میں ڈال دیا اور خاموشی سے پاس کھڑے ہو کر اس کا مشاہدہ کرنے لگا۔
دوسری طرف شاہ صاحب سجدے میں گر گئے اور رو رو کر فرمایا: "میرے مولا! میں نے لوحِ محفوظ میں دیدار بخش کو زندہ اور صاحبِ اولاد دیکھا ہے پھر یہ سب میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ دیدار بخش تو ایک عظیم شخص کا باپ ہے۔ اگر یہ دم سادھے قبر میں اُتر گیا تو پھر وہ عظیم اور بزرگ شخص کس طرح آئے گا!"
شاہ صاحب گڑگڑا رہے تھے اور خادم دیدار بخش کا معائنہ کر رہا تھا۔ اس نے اچانک محسوس کیا کہ دیدار بخش کا ایک انگوٹھا حرکت میں ہے پھر پورے ہاتھ کو حرکت ہوئی اس کے بعد دونوں پاؤں سکیڑ لیے اور آخر میں آنکھیں کھول کر ادھر اُدھر دیکھنا شروع کر دیا۔
خادم نے دیدار بخش کو گود میں لے لیا اور شاہ صاحب کے زانو پر بٹھا دیا۔ شاہ صاحب مسکرائے لیکن ان کی آنکھیں پُرنم تھیں۔ پوچھا: "اس کی ماں کہاں ہے؟"
خادم نے جواب دیا: "باہر موجود ہے۔"
شاہ صاحب نے فرمایا: "اس کو بلاؤ۔"
خادم دیدار بخش کی ماں کو بُلا لایا۔ انھوں نے اپنے زندہ بیٹے کو شاہ صاحب کے زانو پر بیٹھے پایا تو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ پوچھا: "کیا یہ دیدار بخش ہے، میرا بیٹا، میرا لاڈلا۔"
شاہ صاحب نے فرمایا: "بی بی! زیادہ باتیں نہ کر اور اس کو اپنے گھر لے جا۔"
ماں نے جواب دیا: "شاہ صاحب! اب یہ آپ کا بھی بیٹا ہے۔ اس کو آپ اپنے پاس ہی رکھ لیجیے۔ میں اپنے گھر لے جا کر کیا کروں گی؟"
شاہ صاحب نے سکوت اختیار فرمایا۔ اس کے بعد کہا: "اچھا اگر یہ بات ہے تو مجھ کو یہ بات بھی منظور ہے۔ میں ہی اس کی پرورش کر لوں گا۔"
جہاں خیلیوں میں جب نادر علی شاہ کی اس کرامت کا چرچا ہوا تو ہر کوئی ان کی زیارت کو پہنچنے لگا۔ شاہ صاحب دیدار بخش کی پرورش خود ہی کرنے لگے۔

❖

دیدار بخش کی پرورش اور تعلیم و تربیت نادر علی شاہ فرمانے لگے۔ یہاں تک کہ جب یہ چوبیس سال کے ہو گئے تو شاہ صاحب سے خرقۂ خلافت اور دستارِ فضیلت سے سرفراز فرمائے گئے۔ نادر علی شاہ ایک سو پچیس سال کی عمر میں وصال فرما گئے۔ دیدار بخش غمگین اور دل برداشتہ کشمیر چلے گئے اور وہیں ملازمت کر لی۔ تینتیس سال کی عمر میں ان کی ملاقات ایک مجذوب سے ہو گئی۔ ان مجذوب کا نام احمد شاہ تھا۔ دیدار بخش کو جب بھی چھٹی ملتی مجذوب احمد شاہ کی خدمت میں چلے جاتے۔
ایک دن احمد شاہ نے آنکھیں کھول کر دیدار بخش کی طرف دیکھا اور خوش ہو کر فرمایا: "دیدار بخش! کیا تُو نے شادی کر لی؟"
دیدار بخش نے جواب دیا: "ابھی تو شادی نہیں کی میں نے۔"
احمد شاہ نے فرمایا: "پھر اپنے وطن واپس جا اور شادی کر لے، کیونکہ جس قطب کو آنا ہے وہ ضرور آئے گا اور اس کے لیے شادی بہت ہی ضروری ہے۔"
دیدار بخش نے جواب دیا: "حضرت! شادی کرنے کو جی نہیں چاہتا کیونکہ جو وقت خدا کی یاد میں بسر ہو جائے

بہت غنیمت ہے۔ شادی کے بعد انسان بیوی بچوں میں پھنس کر خدا کی یاد سے غافل ہو جاتا ہے۔"
احمد شاہ نے اصرار کیا: کچھ بھی سہی شادی تجھ کو کرنا ہی پڑے گی۔"
دیدار بخش مجبور ہو گئے اور کشمیر کے راجا سے رخصت لے کر وطن روانہ ہو گئے۔ دوران سفر دینا نگر نامی گاؤں میں ان کی ملاقات ایک اور درویش سے ہوئی۔ انھوں نے دیدار بخش کو دیکھتے ہی فرمایا: "کیا تو شادی کرنے جا رہا ہے؟"
دیدار بخش نے جواب دیا" ارادہ تو یہی ہے لیکن پتہ نہیں شادی ہوگی بھی یا نہیں اور پھر یہ کہ مجھ سے شادی کون کرے گی؟"
درویش نے کہا" میاں جو تم نہیں جانتے میں جانتا ہوں۔ ضلع ہوشیار پور جا رہے ہو نا؟"
دیدار بخش نے جواب دیا" ہاں! وہیں جا رہا ہوں۔"
درویش نے انھیں سمجھایا" ہوشیار پور کے موضع میانی سے پرے جلال خان نامی ایک بستی ہے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں تمہاری شادی ہو گی۔ تیری بیوی کا نام زہرہ خاتون ہوگا۔ اس کے بطن سے وہ ولی پیدا ہوگا جس کی کئی درویش بشارتیں دے چکے ہیں۔"
دیدار بخش سیدھے بستی جلال خان پہنچ گئے۔ اس بستی میں وہ لوگ آباد تھے جن کی رشتہ داریاں جہاں خیلاں والوں سے چلی آ رہی تھیں۔ یہاں پر دیدار بخش کی بڑی آؤ بھگت ہوئی اور انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ گامن خان نامی ایک معزز شخص نے دیدار بخش کی بڑی خاطر مدارت کی اور خود ہی اپنی بیٹی زہرہ خاتون کا رشتہ پیش کیا دیدار بخش سناٹے میں رہ گئے۔ انھوں نے گامن خان سے کہا" جناب! مجھے آپ سے اتفاق ہے اور میں آپ کی فرزندی میں آنے کو تیار ہوں لیکن یہ تمام باتیں بڑوں کی طرف سے طے پائیں گی۔ میں اپنے خاندان میں واپس جا رہا ہوں، وہ لوگ رشتہ مانگنے آئیں گے۔"
گامن خاں کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا، راضی ہو گئے۔
دیدار بخش جہاں خیلاں واپس آ گئے اور اپنے بزرگوں کو رشتہ مانگنے کی غرض سے بستی جلال خان بھیج دیا۔ رشتہ منظور ہوا اور شادی کے دن مقرر ہو گئے۔ آخر دیدار بخش جہاں خیلاں والوں کے ساتھ موعودہ اور مقررہ تاریخ پر بستی جلال خان پہنچ گئے۔ یہ بستی جہاں خیلاں سے تیس میل کے فاصلے پر آباد تھی۔ شادی بخیر و خوبی انجام پا گئی۔
انہی خاتون سے بروز دوشنبہ ۱۷ شوال ۱۲۳۷ھ (۱۸۲۲ء) ایک بچہ پیدا ہوا۔ اس بچے کا نام قادر بخش رکھا گیا۔ دیدار بخش اس بچے میں وہ ساری باتیں محسوس کر رہے تھے جو انھیں مختلف درویشوں کی پیش گوئیوں سے معلوم ہوتی رہی تھیں۔
قادر بخش پانچ سال کے ہوئے تو انھیں قرآن پاک کی تعلیم دی جانے لگی۔ دیدار بخش اپنی ملازمت پر واپس کشمیر چلے گئے لیکن جانے سے پہلے اپنی بیوی کو بطور خاص نصیحت کی کہ ان کی عدم موجودگی میں بھی قادر بخش کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی جائے۔ قادر بخش نے دو سال کی مدت میں قرآن پاک کو ختم کیا۔ اب یہ سات سال کے تھے۔ دیدار بخش نے کشمیر سے آ کر بیٹے کی کامیابی پر بے پناہ خوشی کا اظہار کیا۔ انھیں اپنے بیٹے میں وہ تمام آثار نظر آ رہے تھے، جن کا ایک عرصے سے تذکرہ ہوتا آ رہا تھا۔ انھوں نے کشمیر واپس جانے سے پہلے اپنے سات سالہ بیٹے سے کہا: "بیٹے قادر بخش! میں اپنی ملازمت پر واپس کشمیر جا رہا ہوں۔ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں، دوبارہ ملاقات ہو یا نہ ہو۔ بہر حال میں تم سے یہی کہوں گا کہ اپنی تعلیم پر خاص توجہ دینا اور میری روح کو شرمندہ نہ ہونے دینا۔"

دیدار بخش واپس کشمیر گئے اور کچھ دنوں بعد ہی ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کی تدفین بھی کشمیر ہی میں ہوئی اور وہاں یہ پنجابی پیر کے نام سے مشہور ہوئے۔ قادر بخش پر اپنے باپ کی وفات کا بڑا اثر ہوا مگر تعلیم کی حصول یابی میں کسی کوتاہی سے کام نہیں لیا۔ بارہ سال کی عمر میں وہ اُردو فارسی اور دینی تعلیم میں خاص ملکہ حاصل کر چکے تھے۔ پھر وہ کھیتی باڑی میں مصروف ہو گئے۔

جب چودہ سال کے ہوئے تو معلوم نہیں کس بات پر ان کا دل اپنے آبائی گاؤں سے اکتا گیا اور وہ جہاں خیلاں کی سکونت ترک کر کے تن تنہا لدھیانہ میں جا بسے اور انگریز فوج میں ملازم ہو گئے۔ انہی دنوں انگریزوں اور افغانوں میں جنگ چھڑ گئی اور انگریزوں نے کابل پر چڑھائی کر دی۔ قادر بخش کو بھی کابل جانا پڑا۔ انگریز فوجیں واپس ہوئیں لیکن قادر بخش انگریزوں کی ملازمت چھوڑ کر کابل ہی میں رہ گئے۔ یہ پانچ سال تک کابل ہی میں رہے۔ ان کا دل دنیا سے اُکتا چکا تھا۔ یہ اکثر روتے رہتے۔ ان کا دل بے حد گداز تھا۔ ان دنوں کابل میں قادری سلسلے کے شاہ عنایت اللہ کا..... بڑا شہرہ تھا یہ ان کے پاس پہنچے اور ان کی مُریدی اختیار کر لی۔ شاہ عنایت اللہ نے انھیں اپنا خلیفہ بنا کر رخصت کر دیا۔ یہ پشاور کی راہ سے واپس آئے اور کچھ عرصہ لاہور میں قیام کیا۔ لاہور سنگھڑ شریف پہنچے اور اپنے عہد کے یگانہ روزگار صوفی شاہ سلیمان تونسوی کی خدمت میں حاضری دی۔ یہ سلسلہ چشتیہ کے بزرگ تھے۔ قادر بخش ان کی نسبت اور خلافت لے کر کشمیر چلے گئے۔ باپ کے مزار پر حاضری دی۔ فاتحہ پڑھی اور گڑگڑا کر عرض کیا: "باوا جان! آپ اس وقت ہم میں موجود نہیں ہیں ورنہ آپ خود ملاحظہ فرماتے کہ میں نے آپ کو شرمندہ نہیں ہونے دیا۔"

یہاں سے فارغ ہوئے تو سیّد احمد نامی درویش کی خدمت میں حاضری دی۔ یہ سہروردیہ سلسلے کے بزرگ تھے۔ قادر بخش نے ان سے بھی خلافت حاصل کر لی۔ یہاں سے جالندھر پہنچے۔ ان دنوں جالندھر اور اس کے آس پاس دُور دُور تک حاجی محمود کا بڑا چرچا تھا۔ قادر بخش بھی ان سے ملنے کے لیے بہت بے چین تھے۔ انھوں نے اپنے ایک دوست محمد بخش سے پوچھا: "بھائی میرے! کسی ایسے شخص کا نام بتا جس کی مُریدی پر میں فخر محسوس کر سکوں۔"

محمد بخش نے جواب دیا: "بھائی قادر بخش! یہاں تو حاجی محمود ہی ایک ایسے بزرگ ہیں جو خدا کا نام لینا سکھا دیتے ہیں۔ اگر چاہو تو ان سے ملاقات کر لو۔"

قادر بخش نے کہا: "تب تو پھر تُو مجھ کو ان کے پاس لے چل۔ میں ان سے ملنے کے لیے بہت بے چین ہوں۔"

محمد بخش انھیں ساتھ لے کر حاجی محمود کی خدمت میں پہنچ گیا۔ قادر بخش کی حاجی محمود پر جیسے ہی نظر پڑی ان کے دل کی دنیا زیروزبر ہو کر رہ گئی۔ دل بھر آیا اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

کچھ دیر بعد حاجی محمود نے مراقبے سے اپنا سر اُٹھایا اور پوچھا: "یہ تُو کیوں رو رہا ہے؟ تجھے یہ ہو کیا گیا ہے؟"

قادر بخش نے روتے ہوئے کہا: "حضرت! میں نے یہاں آتے ہی اپنے آپ میں زبردست تبدیلیاں رونما ہوتے محسوس کر لی ہیں۔ میں آپ کی صحبت میں رہنا اور کچھ وقت دینا چاہتا ہوں لیکن صورت حال یہ ہے کہ میں ملازم ہوں اور ملازم ہونے کی وجہ سے آپ کی خدمت میں حاضری دینا مشکل ہے۔ مگر اب جب کہ میں آ گیا ہوں تو خالی ہاتھ واپس نہیں جاؤں گا۔"

حاجی محمود نے جواب دیا: "بچّے تُو گھبراتا کیوں ہے، تیرا ہر کام ہو جائے گا کوئی کام رُکے گا نہیں۔ اِدھر تُو نیت کو سے گا دوسری طرف تیرے کام بنیں گے۔"

قادر بخش نے عرض کیا۔ "حضرت تسلیوں سے کام نہیں چلے گا۔ میں تو آپ سے کچھ لے کر رہوں گا۔"
حاجی محمود نے فرمایا۔ "اچھا پہلے اللہ کا نام تو سیکھ لے۔ اس کے بعد دیکھا جائے گا۔"
قادر بخش حاجی محمود کی خدمت میں رہنے لگا۔ یہاں پیرو مُرشد نے اپنے ارادت مند کی تربیت شروع کر دی اور کچھ ہی دنوں میں وہ اثر ظاہر ہوا کہ خود حاجی محمود کو بڑی حیرت ہوئی۔ انھوں نے قادر بخش سے کہا۔ "میں سمجھتا ہوں، تجھ کو اپنے پیرو مُرشد مولوی محمد شریف کے پاس لے چلوں۔"
قادر بخش نے جواب دیا۔ "حضرت! میں آپ کا بندۂ بے دام ہوں۔ جہاں فرمائیں گے آپ کے ساتھ جاؤں گا۔"
حاجی محمود، قادر بخش کو اپنے پیرو مُرشد کے پاس لے گئے اور استدعا کی۔ "کہ قادر بخش کو اپنا مُرید فرمالیں۔"
مولوی محمد شریف نے قادر بخش کو بڑی توجہ کی نظر سے دیکھا۔ "لیکن حاجی محمود! میں تو اس میں کچھ اور ہی دیکھ رہا ہوں۔"
حاجی نے دوبارہ درخواست کی۔ "حضرت! میری استدعا ہے کہ قادر بخش کو آپ مُرید کرلیں۔"
مولوی صاحب نے فرمایا۔ "لیکن اس میں تو پہلے ہی سے بزرگی کے آثار پائے جاتے ہیں۔ اس لیے اس کو میں کیا مُرید کروں، یہ تو تیرا پہلے ہی مُرید ہو چکا ہے۔"
حاجی محمود نے لجاجت سے کہا۔ "حضرت! آپ کی موجودگی میں میں بھلا....."
مولوی صاحب نے سختی سے حکم دیا۔ "بھلا ولا کچھ نہیں تو مُرید کر، میرے سامنے مُرید کر۔ میں اسی میں خوش ہوں۔"
حاجی محمود نے اپنے پیرو مُرشد کے حکم پر قادر بخش کو مُرید کر لیا۔
اب مُرید نے اپنے پیرو مُرشد کی چوکھٹ کو مستقلاً پکڑ لیا۔ دنیا داری سب چھوٹ گئی۔ حاجی محمود نے پوچھا "کیا تو اپنے کام پر واپس نہیں جائے گا؟"
قادر بخش نے جواب دیا۔ "اب میں اس در کو چھوڑ کر کہیں بھی نہیں جاؤں گا۔"
حاجی صاحب نے پوچھا۔ "میں نے سُنا ہے تو بین بہت اچھی بجاتا ہے۔ کیا یہ دُرست ہے؟"
قادر بخش نے جواب دیا۔ "کبھی بین بجایا کرتا تھا پیرو مُرشد لیکن اب آپ کی صحبت اور تربیت کے طفیل ایک اور ہی بین بجانے لگا ہوں۔"
"حاجی صاحب نے اصرار کیا۔" "ذرا مجھ کو تو سُنا بین۔"
مُرید نے جواب دیا۔ "حضرت مجھ کو شرمندہ نہ کیجیے۔"
حاجی صاحب نے مزید اصرار نہیں کیا۔ فرمایا "اچھا تیری مرضی۔"
اب قادر بخش کا یہ حال ہو چکا تھا کہ کسی وقت بھی اپنے پیرو مُرشد سے جُدا ہونے کو تیار نہ ہوتے۔ ان کی ماں ابھی حیات تھیں اور بیٹے کا بڑی بے چینی سے انتظار کیا کرتیں۔ کچھ دنوں تک تو بیٹے کی غیر حاضری کا کوئی خاص سبب معلوم نہ ہو سکا لیکن جب تجسّس بڑھا تو یہ بات بھی ان کے علم میں آگئی کہ بیٹے نے حاجی محمود کے ہاتھ پر بیعت کر کے درویشی اختیار کر لی ہے۔ یہ دل ہی دل میں مشتعل اور آگ بگولا حاجی محمود کی خدمت کیا پہنچ گئیں۔ اپنے بیٹے کو حاجی محمود کی خدمت میں مؤدبانہ بیٹھا دیکھکر وہ گرم ہو گئیں۔ بیٹے سے پوچھا۔ "بیٹے! قادر بخش تو نے کیا حال بنایا ہے؟"
قادر بخش نے پوچھا۔ "ماں! کیا میرا حال بُرا نظر آرہا ہے آپ کو؟"

ماں نے کہا: "یہ میرا مطلب نہیں ہے بیٹے. میں تو یہ پوچھ رہی ہوں کہ تُو نے درویشی کیوں اختیار کرلی؟ اس میں کیا راز ہے؟"

قادر بخش نے جواب دیا: "ماں! یہ دُنیا مسافر خانہ ہے پھر میں اس سے دل لگا کر کیا کروں گا؟"

ماں نے بیٹے سے کہا: "لیکن بیٹے میرے تو بڑے ارمان ہیں. وہ کس طرح پُورے ہوں گے؟"

قادر بخش نے جواب دیا: "ماں! دُنیا کے جال میں مت پھنسیئے. جو اس جال میں پھنسا. اس کا بُرا حال کر دیتی ہے دنیا. فکر وہاں کی کیجئے گا جہاں مستقل رہنا ہے."

ماں بیٹے کی باتوں سے زچ ہو کر حاجی محمود کی خدمت میں پہنچ گئیں. اور کہا "بھائی صاحب! یہ آپ نے کیا کر دیا ہے؟"

حاجی محمود نے پُوچھا "میں نے کیا کر دیا؟"

ماں نے جواب دیا: "آپ نے میرے بیٹے کو درویش بنا لیا' آخر کیوں؟"

حاجی صاحب نے فرمایا "تیرے بیٹے کو میں نے درویش نہیں بنایا. اس کو تو اللہ نے پہلے ہی درویش بنا رکھا تھا. میں نے تو بس ذراسی جلا دے دی ہے اس کی درویشی میں."

ماں کو رونا آگیا. بولیں "لیکن میں اب کیا کروں؟"

حاجی صاحب نے جواب دیا بیٹے کی اختیار کردہ راہ پر تُو بھی چل پڑ. بس اسی میں نجات ہے."

ماں پر مایوسی کا اتنا غلبہ تھا کہ اس کے زیرِ اثر بولیں: "میں آپ کی مُریدی کا حلقہ اپنے گلے میں ڈالنا چاہتی ہوں."

حاجی محمود نے اپنا ہاتھ ان کی طرف بڑھا دیا اور قادر بخش کی ماں بھی حاجی صاحب کے مُریدوں میں داخل ہوگئی. قادر بخش کو جب یہ خبر ملی تو وہ دیوانہ وار ماں کی خدمت میں پہنچا اور انھیں سینے سے لگا کر رونا شروع کر دیا. قادر بخش کی گریہ نے ماں کو بھی متاثر کیا اور وہ بھی رونے لگیں.

ایک دن حاجی محمود نے قادر بخش کو طلب کیا اور انھیں حکم دیا کہ "اب کہیں ملازمت کر لو."

قادر بخش نے جواب دیا: "حضرت! اگر میں ملازمت کروں گا تو اس سے میری عبادت و ریاضت میں فرق آجائے گا."

حاجی صاحب نے سختی سے فرمایا: "یہ میری ہی نہیں تیری ماں کی بھی خواہش ہے."

قادر بخش نے عاجزی سے کہا: "آپ لوگ مجھے دنیاداری میں پھنسانا چاہتے ہیں."

حاجی صاحب نے نرمی سے سمجھایا: "قادر بخش! میں تجھ کو ایک ایسی ملازمت میں دیکھنا چاہتا ہوں. جہاں لوگوں کی خدمت کا موقع ملے گا اور اگر تُو اس جگہ اپنے زہد اور تقوٰے پر قائم رہا تو تیرے درجات بلند ہوں گے اور وہاں کا تیرا ہر نیک عمل ثواب اور بزرگی میں اضافے کا سبب بنے گا."

قادر بخش نے پوچھا "ایسی کون سی ملازمت ہے پیرومرشد؟"

حاجی صاحب نے جواب دیا "پولیس کی ملازمت. پولیس کی ملازمت تیرے لیے آزمائش ثابت ہوگی. اگر تُو نے اس ملازمت میں خود کو سنبھالے رکھا تو تجھے وہ مقام حاصل ہو جائے گا کہ دوسرے ایک عمر کی ریاضتِ شاقہ کے بعد بھی وہ مقام حاصل نہیں کر سکتے."

مُرشد کا حکم اور ماں کی خواہش' قادر بخش مجبور ہو گئے. انھوں نے محکمۂ پولیس میں ملازمت کرلی اور لاہور نامی

ایک قصبے میں تعینات ہوگئے۔ ان کی عادات اور اطوار پولیس والوں سے مختلف تھیں، محکمہ کے لوگ ان کی ایمانداری خدا ترسی اور خدمت خلق سے تنگ آگئے۔ قادر بخش ہمیشہ مجرموں اور بے گناہوں سے ایک جیسا سلوک نہیں کرتے تھے۔ جب تک کسی کا جرم ثابت نہیں ہو جاتا اس کے خلاف کوئی ضابطے کی کارروائی نہ کی جاتی۔ کسی بے گناہ کو ستایا نہ جاتا۔ رشوت نام کی کسی چیز کا آپ کو گویا علم ہی نہ تھا اور زندگی بڑی عسرت میں بسر ہو رہی تھی۔

انگریز ان کی دیانت داری اور ایمانداری سے اتنے خوش ہوئے کہ وہ ڈپٹی انسپکٹر بنا دیئے گئے اور کچھ عرصہ بعد انسپکٹر بن گئے۔

راتوں کو تہجد گزاری اور شب بیداری کا سلسلہ جاری تھا۔ ان کے روحانی تصرفات نے ارادت مندوں کو ان کے ارد گرد جمع کرنا شروع کر دیا تھا۔ محکمہ پولیس کے لوگوں کو بھی آپ کے مقام کا کسی حد تک اندازہ ہو گیا تھا۔ ایک رات تقریباً ایک بجے انھوں نے اپنے مرید امیر خان کو آواز دی، پوچھا "امیر خان کیا سو گئے؟"

امیر خان فوراً ہی ان کی خدمت میں پہنچ گئے۔ بولے۔ "جی میں بیدار ہوں، کوئی حکم؟"

آپ نے فرمایا: "سلیمان خان جمعدار کو بلاؤ۔ ابھی ابھی میرے حلقے سلیم پور میں ایک قتل ہو گیا ہے۔"

امیر خان نے پوچھا: "حضرت! کیا کوئی بلانے آیا ہے؟"

آپ نے جواب دیا: "ایسی کوئی بات نہیں، ابھی ابھی میں مراقبے میں تھا کہ میں نے دیکھا کہ لیسین اور اکرم اپنے چچا کے بیٹے قربان علی کو قتل کر رہے ہیں۔ ان دونوں نے مقتول کو دریا کے کنارے ایک جھاڑی میں ڈال دیا اور اپنے گھر جا کر سو گئے۔"

امیر خان نے سلیمان خان کو بلا دیا۔ آپ نے سلیمان خان کو ہدایت کی: "سلیمان خان! تم چند سپاہیوں کو لے کر دریا کے کنارے اس جھاڑی کے پاس پہنچ جاؤ جو شیشم کے ایک پیڑ تلے ہے۔ اس جھاڑی میں قربان علی کی لاش پڑی ہے اس کو اپنے قبضے میں کرو اور پھر مقتول کے چچا زاد بھائی اکرم اور لیسین کے پاس جاؤ اور انھیں گرفتار کر کے میرے پاس لے آؤ۔"

سلیمان خان کو حکم ماننے میں تامل ہوا۔ پوچھا: "حضرت! کیا کسی نے پرچہ درج کرایا تھا اس قتل میں؟"

آپ نے جواب دیا: "اس کو کوئی ضرورت نہیں میں جو کہہ رہا ہوں پرچہ بعد میں چاک کر دیا جائے گا۔"

سلیمان خان اپنے ساتھ چند سپاہیوں کو لے کر مذکورہ جھاڑی میں پہنچا تو وہاں قربان علی کی لاش مل گئی۔ ان سب کو بڑی حیرت ہوئی مگر ابھی قاتلوں کی گرفتاری باقی تھی۔ سلیمان مقتول کے چچا زاد بھائی اکرم اور لیسین کے پاس پہنچا اور دونوں کو گرفتار کر کے قادر بخش کے پاس لے آیا۔ اس عجیب و غریب واقعہ نے ہر کسی کو ششدر اور حیرت زدہ کر دیا۔ انھوں نے قاتلوں سے پوچھا۔ "مقتول نے تم دونوں کا کیا بگاڑا تھا۔ اس کو کیوں قتل کیا گیا؟"

اکرم نے جواب دیا۔ "میں نے اس کو قتل نہیں کیا۔ مجھ پر جھوٹا الزام لگایا ہے۔"

لیسین نے کہا: "میں بھی اپنی برأت کا اعلان کرتا ہوں۔ میں تو مقتول کا چچا زاد بھائی ہوں پھر میں اس کو کیسے قتل کر سکتا تھا؟"

آپ نے دونوں سے کہا: "دیکھو جھوٹ بولنے سے کچھ حاصل نہیں، تم دونوں مقتول کی زمین ہتھیانا چاہتے تھے۔ اس لیے اس کو قتل کر دیا اور اب زیادہ لطف کی بات یہ ہے کہ تم دونوں اپنے اپنے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف قتل کے منصوبے بنا رہے ہو۔"

اکرم کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا، گھبرا کر بولا: "نہیں حضرت ایسی کوئی بات نہیں، میں نے تو ایسا کبھی سوچا

بھی نہیں۔"
یسین نے اکرم کو جھڑک دیا: "تُو غلط کہہ رہا ہے تُو نے ایسا ضرور سوچا ہو گا لیکن وہ تو خیریت یہ گزری کہ خواجہ قادر بخش انسپکٹر نے اس کا انکشاف کر دیا۔"
اکرم نے کہا: "اب زبان نہ کھلواؤ۔ قربان علی کے قتل کا منصوبہ بھی تم ہی نے بنایا تھا۔ مجھ کو تو اس میں مجبوراً شریک ہونا پڑا ہے اور اب میں شرمندہ ہو رہا ہوں۔"
یسین نے زیادہ گرمی دکھائی۔ غصّے میں بولا: "اب زیادہ معصوم بننے کی کوشش نہ کرو۔ قربان علی کی پشت سے اس کی گدی پر گنڈاسے کا بھرپور ہاتھ کس نے رسید کیا تھا؟"
اکرم نے اشتعال میں بکنا شروع کر دیا: "بیشک میں نے گنڈاسے سے اس کی گدّی پر حملہ کیا تھا لیکن میرا وار اوچھا پڑا تھا۔ قربان علی کا پیٹ تو تم نے چاک کیا تھا۔"
خواجہ قادر کا مُرید امیر خان اور پولیس کے سلیمان خان اور سپاہی حیرت زدہ تھے کہ دونوں کتنی آسانی سے اقبالِ جرم کر رہے ہیں۔ ان کے یقین میں زیادہ مضبوطی آگئی کہ خواجہ قادر صاحب کمال روحانی شخص ہیں۔"
دونوں قاتلوں پر مقدمہ چلا اور انھیں موت کی سزا سنا دی گئی لیکن محکمہ پولیس کا ایک ایک فرد خواجہ قادر کا قائل ہو چکا تھا۔
محکمے میں ایسے بھی لوگ تھے جو ان روحانی تصرفات کے قائل نہیں تھے، وہ آپس میں باتیں کرتے تو خواجہ قادر کا مذاق اُڑاتے اور کہتے: "جناب! انسپکٹر صاحب کو اس قتل کے بارے میں کسی نے سب کچھ ضرور بتا دیا ہو گا۔ ورنہ انھیں اتنی بہت ساری باتیں کشف سے نہیں معلوم ہو سکتیں۔"
کوئی دوسرا کہتا: "ہاں کسی نہ کسی نے مخبری ضرور کی ہو گی۔"
اس واقعے کو گزرے ایک سال کا عرصہ بھی نہ ہوا تھا کہ ایک رات وہ مراقبے سے نکل کر باہر آگئے اور سلیمان خان کو حکم دیا: "گھوڑا تیار کرو میرے لیے بھی اور اپنے لیے بھی۔"
سلیمان خان نے پوچھا: "حضرت جی! جانا کہاں ہے؟"
آپ نے جواب دیا: "ساہوکار اللہ دتہ کے گھر۔"
سلیمان نے ڈرتے ڈرتے پوچھا: "کیا آج ساہوکار کو بھی کسی نے قتل کر دیا ہے؟"
آپ نے جواب دیا: "نہیں، بلکہ ساہوکار کے گھر چوری ہو گئی ہے۔ بہت بڑی چوری ہوئی ہے اور میں نے چوروں کو پہچان لیا ہے۔"
سلیمان خان نے کہا: "اگر ایسی کوئی بات ہے تو وہاں آپ کیوں جائیں۔ ہمیں حکم دیجیے! چوروں کے نام اور پتے بتا دیجیے ہم ساہوکار سے چوری کی تصدیق کر کے چوروں کو پکڑ لائیں گے۔"
آپ نے فرمایا: "اچھا چلو! یوں ہی سہی۔ ذرا جمعدار غلام محمّد کو بھی بلوا لو کیوں کہ وہ ساہوکار سے بھی واقف ہے اور چوروں کو بھی پہچانتا ہے۔"
سلیمان نے اسی وقت غلام محمّد جمعدار کو بلوا لیا۔ آپ نے غلام محمّد کو حکم دیا: "غلام محمّد! تو سلیمان خان اور چند سپاہیوں کو ساتھ لے کر ساہوکار اللہ دتّہ کے گھر چلا جا اور اس سے پوچھ کہ تیرا کیا کیا سامان چوری ہوا ہے۔ سامان کی فہرست تیار کر کے سکندر، رحمت اور نتھا کے گھروں پر چلا جا یہ تینوں راج ہیں، مکان بناتے ہیں۔ یہی تینوں چور ہیں۔ سکندر کے گھر سے باہر بھوسے کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ تینوں نے چوری کا مال اسی بھوسے کے انبار میں چھپایا ہے وہاں

سے سامان برآمد کرکے ساہوکار کی فہرست سے ملالو اور تینوں چوروں کو پکڑ کر میرے پاس لے آؤ۔"
سلیمان خان اور غلام محمد جو کچھ سُن رہے تھے، اس پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا لیکن ان کے کمالات اور تصرفات ثابت ہو چکے تھے۔ اس لیے مجبوراً ساہوکار اللہ دتہ کے گھر پہنچ گئے۔ ساہوکار نے پولیس کو اپنے دَر پر دیکھ کر حیرت سے پوچھا: "تمہیں میرے پاس کس نے بھیجا ہے؟"
غلام محمد نے جواب دیا: "انسپکٹر خواجہ قادر بخش نے۔"
ساہوکار نے پوچھا: "مگر کس لیے؟"
غلام محمد نے ہچکچاتے ہوئے کہا: "وہ فرماتے تھے کہ انھوں نے مراقبے میں دیکھا ہے کہ تمہارے گھر میں چوری ہو گئی ہے، بہت بڑی چوری۔"
ساہوکار رونے لگا: "مگر اس چوری کی خبر انھیں کس نے دی؟ میں تو برباد ہو گیا، تباہ ہو گیا، لٹ گیا، میں تو کہیں کا بھی نہیں رہ گیا۔"
غلام محمد نے کہا: "تم اپنے مسروقہ مال کی ایک فہرست تیار کرا دو، چور ابھی پکڑے جائیں گے اور تمہارا سامان بھی برآمد ہو جائے گا۔"
ساہوکار نے مسروقہ مال کی فہرست تیار کر دی۔ اس کے بعد غلام محمد اور سلیمان خان سپاہیوں کے ساتھ در[illegible] پور نامی بستی میں گئے۔ کیوں کہ سکندر، رحمت اور نتھارا ج اس بستی میں رہتے تھے۔ تینوں اپنے اپنے گھروں [illegible] سونے کی کوشش کر رہے تھے۔ انھوں نے اپنے اپنے دروازوں پر پولیس دیکھی تو پریشان بھی ہوئے اور خوف زدہ بھی۔ یہ بات اُن کی سمجھ میں نہیں آئی کہ ان کی مخبری کس نے کر دی۔ غلام محمد اور سلیمان خان نے ان تینوں کو گرفتار کر لیا اور سکندر کے دروازے پر بھوسے کے انبار میں سے چوری کا مال برآمد کر لیا۔ چوروں کو سامان سمیت انسپکٹر خواجہ قادر بخش کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔ یہ لوگ صبح تک حوالات میں رہے۔
صبح کو ساہوکار اللہ دتہ کو بھی بلوا لیا گیا۔ تینوں چور آپس میں شک و شبہہ کر رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ انھی میں سے کسی نے مخبری کر کے پکڑا دیا ہے۔ تینوں آپس میں جھگڑنے لگے اور ایک دوسرے پر الزام دینے لگے۔
غلام محمد نے ان تینوں سے کہا: "ارے احمقو! تم آپس میں بلاوجہ جھگڑ رہے ہو۔ جب تک ہمارے درمیان انسپکٹر خواجہ قادر بخش موجود ہیں ہمیں کسی کی مخبری کی ضرورت نہیں۔"
چور ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے۔ جمعدار پولیس نے کہا: "ایک دوسرے کی شکل کیا دیکھتے ہو، تم لوگ ایسے ہو کہ اپنے علاقے کے باکمال روحانی شخص کو نہیں جانتے۔"
اتنے میں ان کے درمیان خواجہ قادر بخش بھی پہنچ گئے۔ ساہوکار انھیں دیکھتے ہی ادب سے کھڑا ہو گیا۔ آپ نے چوروں سے پوچھا: "تم چوریاں کیوں کرتے ہو؟"
ایک نے جواب دیا: "حضرت عادت سی پڑ گئی ہے۔"
آپ نے فرمایا: "یہ عادت چھوڑ دو، کیوں کہ اس عادت سے دین اور دنیا دونوں برباد ہو رہے ہیں۔"
دوسرے نے جواب دیا: "کوشش تو بہت کی مگر کامیابی نہیں ہوتی۔"
آپ نے تیسرے سے پوچھا: "اور تم کیا کہتے ہو؟"
اس نے جواب دیا: "اب ان دونوں کے بعد میں کیا کہوں؟ اپنا بھی وہی حال ہے۔"

آپ نے فرمایا: "دیکھو میں اس وقت یہاں کا انسپکٹر پولیس ہی نہیں مصلح بھی ہوں۔ میں چاہتا ہوں تم لوگ سُدھر
کیوں کہ جس طرح میں اپنے محکمہ کے افسران کے روبرو جواب دہ ہوں۔ اسی طرح دوسری دنیا میں اپنے ربّ کے
نے جواب دہ ہوں۔ اگر میں تم لوگوں کی اصلاح میں کامیاب ہوگیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں دین اور دنیا
سرخروئی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا ہوں۔

آپ کی تقریر کا تینوں پر بڑا اثر ہوا، ایک نے کہا: "اس چوری کے مقدمے میں ہمیں سزا تو ہو ہی جائے گی
سزا کاٹ لینے دیجئے، اس کے بعد ہم اپنی اصلاح کی کوشش کریں گے۔"

آپ نے فرمایا: "اگر تم تینوں اس وقت توبہ کرلو تو میں اس مقدمے کو آگے نہیں جانے دوں گا۔ یہیں رفع
کر دوں گا۔"

ایک چور نے ساہوکار کی طرف دیکھا: "آپ اگر معاف بھی کر دیں گے تو یہ ساہوکار ہمیں معاف کیوں کرنے لگا۔"
آپ نے جواب دیا: "میں اس سے بھی معافی دلوا دوں گا۔"

تینوں چوروں کے چہروں پر بشاشت دوڑ گئی۔ تقریبًا ایک ساتھ جواب دیا۔ اگر ایسا ہوگیا تو ہم بھی وعدہ
ہیں کہ چوری سے توبہ کرلیں گے۔"

آپ نے ساہوکار سے پوچھا: "بول! تو کیا کہتا ہے؟"

ساہوکار نے جواب دیا: "حضرت میں کیا کہوں گا۔ میں تو آپ کی منشا اور حکم کا تابع ہوں جو فرمائیں گے اس
ل کروں گا۔ میرا سارا سامان تو مل ہی چکا ہے اس کے سوا مجھے کچھ بھی نہیں چاہیے۔"

آپ نے ان تینوں کو رہا کر دیا۔ فرمایا: "اب تم جا سکتے ہو مگر یاد رکھو۔ تم نے مجھ سے جو وعدہ کیا ہے اس
طرف ہرگز نہ ہونا۔"

سپاہیوں نے آپ کے حکم پر انھیں رہا کر دیا۔ ساہوکار نے اپنا سامان سمیٹا اور اپنے گھر کی راہ لی۔ تینوں
ہیں بیٹھے رہے۔ اپنی جگہ سے ہلے بھی نہیں۔

آپ نے ان سے کہا: "اب تم یہاں کیوں بیٹھے ہو۔ جاؤ اپنے اپنے گھر جاؤ اور اپنے وعدے پر عمل کرنے کی
شش کرو۔"

ایک نے عرض کیا: "حضرت! ہم تینوں نے ابھی ابھی یہاں یہ مشورہ کیا ہے کہ آپ کے حکم پر عمل کس طرح کیا
۔ آخر یہی طے پایا کہ اس در کو چھوڑ کر کہیں اور جانا فضول ہے۔ اب آپ ہمیں اپنا بنا لیجئے تاکہ ہماری آخرت
ر جائے۔"

آپ نے فرمایا: "جیسی تمہاری مرضی۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

چنانچہ تینوں چور توبہ کرکے آپ ہی کے پاس رہ گئے اور انھوں نے اتنی عبادت و ریاضت کی کہ بعد میں
شمار بھی اہلِ اللہ میں ہونے لگا۔

آپ تھانہ راہوں کے باہر کھڑے تھے کہ ایک طرف سے شور و غل بلند ہوا۔ سامنے سے ایک گھوڑا سرپٹ
چلا آرہا تھا اور لوگ چیخ چیخ کر راہ گیروں کو خبردار کر رہے تھے کہ ہوشیار خبردار گھوڑا سرکش ہے لوگوں کو
کر رہا ہے۔"

آپ گھوڑے کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ اپنی انگشت شہادت اس کی طرف اٹھا کر فرمانے لگے، "گھوڑے یہ

کیسی سرکشی ہے کہ بے گناہوں کو زخمی کر رہا ہے۔ بہت بھاگ دوڑ کر لی۔ اب رُک جا اور آرام کر، ذرا سستا لے۔"
گھوڑا آپ کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ لوگوں کا چاروں طرف ہجوم لگ گیا اور اس حیران کن منظر کو دیکھنے لگے۔
آپ گھوڑے کی پشت پر ہاتھ پھیر رہے تھے اور گھوڑا نہایت فرماں برداری سے اپنی دُم کو بار بار ہلا رہا تھا۔ آپ
نے مزید فرمایا: "میری بات سمجھ لی؟ اب تو سرکشی نہیں کرے گا، کبھی بھی نہیں۔"
اور اس کے بعد واقعی کسی نے بھی اس گھوڑے کو سرکشی اختیار کرتے نہیں دیکھا۔
ایک مولوی پیر محمد چوبیس میل دُور سے مدرسے میں بچوں کو پڑھانے آیا کرتے تھے۔ صبح فجر کے بعد وہ اپنے
گھر سے چل دیتے تھے اور شام کو مغرب کے وقت اپنے گھر پہنچ جایا کرتے تھے۔ سواری کے لیے ان کے پاس
ایک تیز رفتار گھوڑی تھی۔
ایک دن دوپہر کو اپنے گھر جو جانے لگے تو آپ نے فرمایا: "پیر محمد! ذرا ہوشیاری سے سفر کیا کر، سنا ہے
راہ میں درندے گھومتے دیکھے گئے ہیں۔"
پیر محمد نے جواب دیا: "آج تک تو کوئی درندہ دیکھنے میں آیا نہیں۔"
آپ نے فرمایا: "ٹھیک ہے، پھر بھی ذرا ہوشیاری سے سفر کیا کر، احتیاط بڑی اچھی چیز ہے۔"
پیر محمد نے جواب دیا: "آپ فرماتے ہیں تو میں ضرور احتیاط کروں گا۔"
اس دن پیر محمد نے نہایت احتیاط اور ہوشیاری سے سفر کیا۔ وہ اپنی گھوڑی کو بھگا رہے تھے اور اپنے گرد و
پیش بھی دیکھتے جاتے تھے۔ راستے میں ایک ندی پڑتی تھی، مولوی پیر محمد جب اس ندی کے قریب پہنچے تو انھوں
نے ایک چیتے کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ مولوی پیر محمد چیتے کو دیکھتے ہی بدحواس ہو گئے۔ گھبراہٹ کا یہ عالم تھا
کہ سمجھ میں ہی کچھ نہ آتا تھا کہ گھوڑی کو بھگا کر کس طرف لے جائیں۔ آخر بے اختیار ان کے مُنہ سے نکلا: "خواجہ قادر
پیر و مُرشد! جب اتنی خبر دی تھی کہ راہ میں کوئی درندہ مل سکتا ہے اب جب کہ وہ مل ہی چکا ہے، اس سے
حفاظت بھی فرمائیے۔"
چیتا جست لگانے کی فکر میں تھا۔ مولوی پیر محمد نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں اور کلمہ پڑھنے لگے۔ ا
انھوں نے اپنے پیر و مُرشد کی آواز سُنی: "پیر محمد اپنی گھوڑی بھگا لے جا۔ میں نے چیتے کو پکڑ لیا ہے۔"
مولوی پیر محمد نے آنکھیں کھول دیں۔ دیکھا کہ خواجہ قادر بخش نے چیتے کو پکڑ رکھا ہے۔ اس کے دونوں کان
ہاتھوں میں ہیں اور وہ بار بار یہی کہہ رہے ہیں: "پیر محمد! دیر نہ کریں میں نے اس کو پکڑ لیا ہے۔" تو فوراً ہی چلا دو
پیر محمد نے گھوڑی کو بے اختیار بھگایا اور آناً فاناً اس خطرے کی جگہ سے نکل گئے۔
دوسرے دن جب وہ صبح مدرسے میں پہنچے تو خواجہ قادر بخش کی خدمت میں بھی حاضری دی اور ان کا
ادا کرتے ہوئے کہا: "حضرت! اگر آپ نے مدد نہ کی ہوتی تو کل میں چیتے کے پیٹ میں پہنچ چکا ہوتا۔"
آپ نے پوچھا: "میں نے تیری کیا مدد کی تھی؟ جس کا تو شکریہ ادا کر رہا ہے۔"
پیر محمد نے پورا واقعہ دوہرایا۔ آپ نے فرمایا: "تجھ کو دھوکا ہوا ہوگا۔ میں نے چیتے کے کان نہیں پکڑے
پیر محمد نے عرض کیا: "پیر و مُرشد! اگر وہ فریبِ نظر یا دھوکا تھا تو پھر میں جو کچھ بھی دیکھتا ہوں اسے
فریبِ نظر اور دھوکا ہے۔"
آپ نے جواب دیا: "ایسا ممکن تو ہے کیونکہ اللہ نے اپنے نیک بندوں کو درندوں پر بھی فائق اور
ہے، یہ بھی ان برگزیدہ انسانوں کے تابع ہوتے ہیں۔"

مولوی پیر محمد نے آپ کے ہاتھوں کو فرطِ مسرت سے بوسہ دیا اور کہا "حضرت! اس انکسار کو میں کیا کہوں آپ ... کچھ ہونے کے باوجود اپنی ذات اور صفات کی نفی کر دیتے ہیں۔"

آپ نے خاموشی اختیار کر لی اور نظریں جھکا لیں۔

ان کے ایک مرید الٰہی بخش جو محکمہ میں ملازم بھی تھا نے ایک دن کسی معاملے میں دس روپے رشوت میں لیے، روپے جیب میں ڈالے ہی تھے کہ الٰہی بخش کے گال پر ایک تھپیڑ لگا اور کانوں میں آواز گونجنے لگی "ارے ...! رشوت لیتا ہے، ذلیل کتے۔ اس لیے اس محکمہ میں ملازمت کی تھی؟"

الٰہی بخش نے اِدھر اُدھر دیکھا مگر کوئی نظر نہ آیا۔ خوف زدہ ہو کر روپے واپس کر دیے اور شرمندہ ہو کر ایک ...نے میں جا بیٹھا۔

کام سے فراغت پانے کے بعد خواجہ قادر بخش کی خدمت میں پہنچے۔ سلام کیا اور مصافحہ کے لیے دونوں ہاتھ بڑھا... لیکن آپ نے منہ پھیر لیا۔ الٰہی بخش قدموں میں گر کر رونے لگے۔ عرض کیا "پیر و مرشد! بس ایک بار معاف کر دیجیے ...ہ ایسی غلطی نہیں ہوگی۔"

آپ نے فرمایا "تو نے بیعت ہوتے وقت اللہ اور مجھ سے یہ وعدہ کیا تھا کہ نواہی شریعہ سے مجتنب اور محترز ...ی کا لیکن افسوس کہ تو نے اس وعدے کا پاس نہیں کیا۔"

الٰہی بخش نے جواب دیا "پیر و مرشد! میں نے جو گناہ کیا تھا، اس کی سزا بھی مل گئی۔ میں نے وہ روپے اسی ... واپس کر دیئے۔ اب خدا کے لیے مجھ کو معاف فرما دیجئے۔"

آپ نے فرمایا "خدا نے مجھے خبر دی، میں نے تمہیں روک دیا۔"

الٰہی بخش نے شرمندگی سے دوبارہ بیعت کی اور وعدہ کیا کہ اب آئندہ ایسی حرکت سرزد نہیں ہوگی۔ آپ نے ...ے حق میں دعا کی کہ خدا تجھے بیعت پر رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔

آپ نے محکمہ پولیس میں ملازمت کے دوران لوگوں کی بڑی خدمت کی اور گمراہ راہ لوگوں کی اصلاح فرماتے ... آپ اس بھٹی میں کندن ہو چکے تھے۔ آخر ایک دن آپ کے پیر و مرشد حاجی محمود نے انھیں بلایا اور ... حکم دیا کہ "قادر بخش! اب ملازمت چھوڑ دے۔"

آپ نے پوچھا "کیا فوراً ہی، اسی وقت؟"

حاجی صاحب نے جواب دیا "ہاں فوراً ہی، اسی وقت۔"

آپ نے اسی وقت استعفیٰ دے دیا اور پیر و مرشد کے حکم پر اپنے آبائی وطن جہاں خیل چلے گئے۔ آپ ...رت ہر طرف پھیل چکی تھی اور دور دور سے لوگ شرفِ ملاقات اور شوقِ بیعت کی خاطر آپ سے ملتے اور ...یں کے ہو رہتے۔ لوگوں کی مشکلوں اور الجھنوں کا علاج بھی بتا دیتے تھے۔ یہاں بھی غرض مندوں اور حاجت ...وں کی بھیڑ لگی رہتی۔

❋

...پ کے ارادت مندوں اور مریدوں کا جو وسیع حلقہ تھا اُن میں محمد بخش نام کا ایک مرید ایسا تھا جسے ...دوسروں کے مقابلے میں بہت زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ ایک روز جب محمد بخش گہری نیند سو رہے تھے تو ... کسی نے بہت زیادہ پانی ڈال دیا۔ بیوی سے دریافت کیا تو اُس نے جواب دیا کہ گھر کے تمام دروازوں ...سے کنڈی لگی ہوئی ہے پھر یہ کون ہو سکتا ہے کہ جس نے یہ شرارت کی۔

محمد بخش نے بیوی کو یہ بھی بتایا کہ جب اُن پر پانی گرا تھا تو ساتھ ہی کسی کے ہنسنے کی آواز بھی آئی تھی۔ پھر محمد بخش نے بیوی سے پوچھا کہیں یہ تمہاری شرارت تو نہیں تھی۔
بیوی حیرت زدہ کہنے لگی "سرتاج اگر میں نے ایسا کیا تھا تو پھر وہ پانی والا برتن کہاں گیا۔ میں تو یہاں سے باہر بھی نہیں گئی۔"
بہرطور اس واقعہ کے کافی روز بعد ایک رات جب دونوں میاں بیوی کی اچانک آنکھ کھلی تو انھوں نے خود کو گھر کی چار دیواری کے بجائے دریائے بیاس کے کنارے پڑے ہوئے پایا۔ اور قریب ہی کسی شخص کے فلک شگاف قہقہے بھی سُنائی دے رہے تھے۔
باقی کی تمام رات میاں بیوی نے خوف کے عالم میں گزار دی اور اگلی صبح پہلا کام انھوں نے یہ کیا کہ مرشد کی خدمت میں حاضر ہو کر تمام واقعہ من وعن سنا دیا۔ آپ دونوں میاں بیوی کی بات سن کر مراقبے میں چلے گئے اور قرآن پاک کی ایک آیت تلاوت کرنے لگے۔ پھر انھوں نے اپنے انگوٹھے پر کچھ پڑھ کر دم کیا اور اُسے زمین پر رکھ کر پوری قوت سے دبایا جس کے ساتھ ہی کسی کے چیخنے کی آواز سُنائی دینے لگی "حضرت میری خطا بخش دیں میں آگ میں جلنے لگا ہوں۔ مجھے چھوڑ دیں۔" آپ نے اُس سے پوچھا "کون ہے تو جو ان میاں بیوی کو ستاتا ہے۔" اس کے جواب میں ایک شخص سامنے آن کھڑا ہوا اور کہنے لگا "مجھے شاہ زماں کہتے ہیں میں ایک جن ہوں۔"
آپ نے دریافت فرمایا کہ تو میرے اس نیک مُرید کو کس لیے تنگ کر رہا ہے۔
جن نے جواب دیا کہ مجھے یہ اچھا لگتا ہے اس لیے اس کے ساتھ شغل وغیرہ کرنے آجاتا ہوں۔ تاہم اب آپ کے بارے میں معلوم ہو گیا ہے میں کبھی ایسا کام نہیں کروں گا۔
کہتے ہیں کہ یہ جن اُسی رات دوبارہ انسانی شکل میں محمد بخش کے پاس آیا اور اُس سے کہنے لگا کہ میں نے آج تک تمہارے مُرشد سے عظیم انسان نہیں دیکھا۔ اتنا کہہ کر وہ جن وہاں سے چلا گیا لیکن چند روز بعد بیوی بچوں سمیت آپ کے مُریدوں کی صف میں شامل ہو گیا۔
آپ کی شہادت کا واقعہ بھی عجیب وغریب ہے ۱۲۷۲ ہجری شعبان کے مہینے میں ایک روز عشاء کی نماز کے بعد جب آپ اپنے حجرے میں بیٹھے عبادت میں مصروف تھے تو زور کی بجلی چمکنے لگی۔ آپ کے ایک مرید نے آکر بتایا کہ اُس نے حجرے کے باہر آسمانی بجلی کی روشنی میں نورانی صورت رکھنے والے کچھ آدم زاد دیکھے ہیں۔ آپ کی ہدایت پر جب مُرید نے باہر جاکر اُن آدم زادوں سے پوچھا کہ وہ کس مقصد کیلئے یہاں آئے ہیں تو انھوں نے کوئی جواب نہ دیا مگر اگلے ہی لمحے حجرے کی چھت نیچے آگری جس کی وجہ سے حضرت قادر بخش اپنی والدہ سمیت شہید ہو گئے۔ آپ کا مزار ہوشیار پور میں ہے۔ آپ کے مُرید اور عقیدت مند آپ کو شمس العرفان کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

فقہ کے پانچ دبستان فکر کون نہیں جانتا۔ بعض اوقات استاد شاگرد ایک دوسرے سے اختلاف کرتے نظر آتے ہیں۔ امام اعظم نے امام جعفر صادق سے استفادہ کیا۔ امام شافعیؒ امام مالکؒ کے شاگرد ہیں۔ امام احمد بن حنبلؒ امام شافعیؒ کے حلقہ تلمذ میں رہے مگر یہ سارے الگ الگ فقہی مکتب فکر کے بانی ہیں اور اُمت پر ان سب کا احترام واجب ہے۔

اللہ کے نیک بندوں اور بزرگانِ دین میں ایک عظیم ہستی اس زمانے میں ایسی بھی گزری ہے جس کے فیوض و برکات سے آج بھی ایک زمانہ بہرہ ور ہو رہا ہے اور خلق خدا انھیں حضرت ابو محمد رویم
نام سے یاد کرتی ہے۔ اگرچہ اُن کے نظریات افکار اور تجربات سے تو لوگوں کو اختلاف ہو سکتا ہے لیکن ان
ت کی روشنی میں جو چونکا دینے والے نتائج سامنے آئے اُس سے ہر نکتہ چیں نے بھی اختلاف کرنا گناہ تصوّر
اگرچہ ایک زمانے میں جنید بغدادیؒ نے آپ کے افکار سے کسی حد تک اختلاف کیا لیکن آپ کی بزرگی
معتی اور کمالات و کرامات کے وہ بھی معترف تھے۔ غالباً یہ اُس دَور کے بغداد کا ذکر ہے جب اس شہر
صاحبِ حال اور صاحبِ کمال لوگوں کی کمی نہ تھی۔ شاید یہ ان ہی عظیم لوگوں کا کمال تھا کہ اُن کی صحبت اور
ت کے لیے خلق خدا اُن کی طرف کھنچی چلی آتی تھی۔ اس زمانے میں ہر قسم کے علوم کو بغداد ایسے تاریخی اسلامی
میں بڑا فروغ مل رہا تھا اور اہلِ کمال کو ان کی اہلیت کے مطابق نوازا جا رہا تھا لیکن دوسری جانب ایک
ے کے خلاف سازشوں کا بازار گرم تھا۔ معاشرہ مسابقت کا بن چکا تھا اور یہاں کے لوگ ایک دوسرے
بقت لے جانے کی تگ و دو میں مشغول تھے۔ یہاں ایسے لوگ بھی موجود تھے جو سچے اور کھرے تھے۔ انھیں
ں کا بڑا قلق تھا کہ ہر طرف جاہ طلبی کا بازار لگا ہوا ہے وہ اس بازار سے خود کو الگ تھلگ رکھنا چاہتے
۔ یہ وہ لوگ تھے جنھیں دنیا سے آخرت عزیز تھی۔ انھیں عرفِ عام میں صوفی کہا جاتا تھا۔ یہ صوفی بغدادی
ار سے الگ تھلگ اپنی دنیا میں مست و سرشار رہتے تھے۔ انھوں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا وہ جس زمانے میں
رہے ہیں بہت دین دار اور آلودہ حرص و طمع ہے۔ اس لیے بہتری اسی میں ہے کہ انسان اس سے دُور
محفوظ رہے۔ صوفیوں نے اپنی خانقاہیں اور حجرے آباد کیے درباروں سے دُوری اختیار کی اور اپنے دین اور
لن کے ارتقا میں مشغول ہو گئے۔
حکمرانوں سے دوری اختیار کی۔ یہ لوگ تزکیۂ نفس اور مجاہدے میں غیر معمولی محنت سے کام لیتے۔ ابو محمد رویمؒ

بھی اس دور اور اسی گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ کہنے کو تو مشہورِ زمانہ صوفی جنید بغدادیؒ کے ہم عصر اور مُرید تھے اور خود کو جنید بغدادی کے شاگرد کہتے تھے لیکن بات یہ نہیں تھی۔ کیونکہ دوسرے صوفی اور عالم انھیں شیخ جنید بغدادیؒ سے بڑا فاضل قرار دیتے تھے۔ چنانچہ شیخ الاسلام ابو اسماعیل عبداللہ بن محمد انصاری نے اپنی کتاب میں ابو محمد رویمؒ کے بارے میں لکھا ہے:۔

جنید بغدادیؒ کو ان سے یہ اختلاف تھا کہ رویم نے قاضی کا منصب قبول کر لیا تھا۔ اور منصف بن گئے تھے۔ قاضی بن جانے کے بعد انھیں وہی ٹھاٹ باٹ بھی اختیار کیا۔ جنیدؒ کو ان باتوں سے چڑ تھی۔ بغداد میں جنید بغدادیؒ کے زیرِ اثر حضرات بھی رویمؒ کے قاضی بن جانے سے خوش نہیں تھے لیکن جنیدؒ انھیں منع فرماتے تھے کہ رویمؒ کے بارے میں ایسی ویسی سوچ نہ رکھنا ورنہ خسارے میں رہو گے۔

شیخ رویمؒ خود کو حضرت جنید بغدادیؒ قدس سرہ کا شاگرد کہتے تھے اور اُن کے اصحاب اور رفقا میں سے تھے لیکن میں رویمؒ کو شیخ جنیدؒ سے افضل سمجھتا ہوں بلکہ شیخ رویمؒ کا ایک بال سو جنید سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں۔

اسی طرح شیخ ابو عبداللہ خفیف نے آپ کے بارے میں فرمایا:

مَیں نے کسی شخص کو بھی توحید کی گفتگو میں شیخ رویمؒ سے بڑھ کر یا اُن کی طرح کا نہیں پایا۔ شیخ بغداد میں پیدا ہوئے اور بغداد ہی میں اپنی زندگی گزار دی اور وہیں کے قبرستان میں مستقل قیام کیا۔

یہیں علوم ظاہری اور باطنی حاصل کیے اور رُشد و ہدایت کا دربار لگایا۔ جو بھی بڑا آدمی بغداد آتا آپ سے ملتا اور آپ کے حجرے میں حاضری کو اپنی خوش قسمتی سمجھتا۔

آپ شیخ جنید بغدادیؒ کے پاس خود بھی جاتے اور شیخ جنید خود بھی حاضری دیا کرتے تھے۔ آپ ہمیشہ اُس چیز سے پرہیز کرتے جس کی نفس خواہش کرتا تھا۔ اچھے کھانوں سے پرہیز، ٹھنڈے پانی سے پرہیز اور اچھے لباس سے گریز۔ لیکن جب انھیں باطنی طور پر خبردار کیا گیا کہ بلاوجہ کا جبر اپنی ذات پر طاری نہ کریں تو آپ میں تبدیلی آگئی، معاملاتِ زندگی میں اعتدال کی راہ اختیار کی۔ آپ کے پاس جو لوگ حاضریاں دیا کرتے تھے وہ اپنے عہد کے آفتاب و ماہتاب تھے۔ لیکن عام تاثر یہ تھا کہ آپ کے پاس جو بھی آتا آپ کا بندہ بے دام بن کر واپس جاتا تھا۔

آپ سے ایک صوفی نے دریافت کیا۔ حضرت! اس وادیٔ تصوّف میں گھومتے پھرتے عمر گزر گئی لیکن اب بھی بُرا ہے۔ اگر کوئی ہم سے پُوچھے کہ تصوّف کیا ہے تو ہمارے پاس اس کا کوئی شافی و کافی جواب نہیں ہے۔ آپ ہی اس کی وضاحت فرما دیں تو ہمارے علم میں اضافہ ہو جائے گا، اور ہم آپ کے شکر گزار ہوں گے۔

آپ نے توقف فرمایا اور کچھ سلوک کے بعد جواب دیا۔ سُن! صوفی وہ ہے جو نہ تو خود کسی چیز کا مالک ہو اور نہ اس کا کوئی مالک ہو۔ اور تصوف یہ ہے کہ دو چیزوں میں زیادتی (افراط) کا پہلو ترک کر دیا جائے۔

ایک دن ایک ظاہر بیں اور مادہ پرست حضرت رویم سے ملا اور گستاخانہ لہجے میں پوچھا۔ "رویمؒ آپ صوفی ہیں؟"

آپ نے جواب دیا: "مَیں اتنا بڑا دعویٰ کس طرح کر سکتا ہوں۔ مَیں اللہ کا حقیر ترین بندہ ہوں۔"

اس شخص نے کہا: "آپ خود کو حقیر ترین نہ کہیں۔ آپ تو ہمارے معاشرہ کے معزز ترین فرد ہیں، آپ کا لباس، آپ کی نشست و برخاست کا شاہانہ انداز، آپ کا گاؤ تکیہ، آپ کی ہر چیز شاندار ہے پھر آپ یہ بات کیوں کہتے ہیں۔

آپ نے فرمایا۔ "اے شخص! مَیں جس ماحول میں رہتا ہوں وہاں صوفی سے زیادہ قاضی بن کر رہنا پڑتا ہے ورنہ
اجی چاہتا ہے کہ مَیں اپنا پائتابہ سَر سے باندھ لوں اور اسی حلیے میں بازار جاؤں۔ ادنیٰ سے ادنیٰ لباس پہن
تا ہوں لیکن مَیں نے کہہ جو دیا قاضی ہوں اور میرا قاضی ہونا بہتوں کے کام آتا ہے۔ مَیں انھیں صحیح انصاف دیتا
ں۔ مَیں مخلوق کی خدمت کرتا ہوں پھر تجھ کو اس پر اعتراض کیوں؟"
معترض خاموش ہوگیا۔

چند دنوں کے بعد اُس شخص کو کسی جھوٹے الزام میں قید کر دیا گیا۔ اس کے خلاف جو مقدمہ قائم کیا گیا تھا
فرضی تھا اور لوگ اس کو سزا دلوانے میں بڑی دلچسپی لے رہے تھے۔

آپ نے اُسے اپنے رُوبرو دیکھا تو بڑی حیرت ہوئی۔ اس سے پوچھا "تجھ پر جو الزام لگایا گیا ہے کیا وہ
ست ہے۔"

اُس نے جواب دیا۔ "وہ بالکل غلط ہے سرتاپا جھوٹ ہے۔"
لیکن جن لوگوں نے الزام لگایا تھا، وہ بضد تھے کہ یہ خطاکار ہے۔
رویمؒ نے غصے کے عالم میں اُن لوگوں کی طرف دیکھا اور پُوچھا "کیا تم اس کو گنہگار کر لوگے۔"
انھوں نے جواب دیا "کیوں نہیں۔"

آپ نے انھیں دھمکی دی۔ "اگر تم ثابت نہ کر سکے تو مَیں تم پر جرم اتہام میں مقدمہ چلاؤں گا اور سزا دونگا۔"
یہ لوگ ڈر گئے اور مقدمہ کی پیروی میں کمزوری دکھائی۔ آخر میں ان لوگوں نے اعتراف کر لیا کہ انھوں
جھوٹا مقدمہ تیار کیا تھا۔ اور آپ سے معافی مانگی۔

آپ نے فرمایا "مَیں تمہیں کس طرح معاف کر سکتا ہوں۔ تم اس شخص کے مجرم ہو۔ یہ چاہے تو معاف کر
اور نہ معاف کرنا چاہے تو سزا بھی دلوا سکتا ہے اور مَیں اس کی بات مانوں گا۔"
وہ شخص رونے لگا۔ بولا "مجھے جتنا ذلیل ہونا تھا ہو چکا۔ اور ایسا کیوں ہوا مَیں جانتا ہوں۔ اس لیے مَیں ان
کو معاف کر دینا چاہتا ہوں۔"

آپ نے فرمایا "یہ بہتر ہے کیونکہ تُو چاہے تو بدلہ لے لے لیکن تیری عظمت اور بڑائی اسی میں ہے تو انھیں
ف کر دے۔" چنانچہ اس شخص نے انھیں معاف کر دیا۔

آپ اُسے اپنے ساتھ لے گئے اور فرمایا "اے شخص! تُو نے دیکھ لیا۔ یاد رکھ جو شخص صوفیوں میں اُٹھے بیٹھے
ن امور میں جن کی یہ تحقیق کر چکے ہوں، اُن کی مخالفت کرے تو اللہ اُسکے دل سے ایمان کا نور نکال لیتا ہے۔
وہ شخص بے حد شرمندہ تھا۔ آپ نے فرمایا "اے عزیز! تجھ کو مومنوں کی عبث باتوں میں دل چسپی نہیں ہونی
ہے۔ تُو نہیں جانتا کہ اس میں صوفیوں کو اپنی روح خرچ کرنا پڑتی ہے۔"
س شخص نے توبہ کرتے ہوئے کہا "حضرت جو ہونا تھا ہو چکا مَیں اپنی جگہ بے حد شرمندہ ہوں (اس کے بعد
آپ ہی کی صحبت میں اپنا بیشتر وقت گزارنے لگا۔

انہی دنوں شیخ ابوعمرو زجاج ایک صوفی بغداد آئے اور شیخ جنیدؒ بغدادی کے پاس قیام کیا۔ ابوعمرو زجاج
و تھا کہ وہ ابو محمد رویمؒ سے ملاقات کریں لیکن وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ رویمؒ سے جنید بغدادیؒ کی اجازت
بغیر ملاقات کریں۔ انہوں نے خاصا وقت جنیدؒ کے پاس گزار دیا لیکن اجازت نہیں حاصل کر سکے۔
دنوں بعد ابوعمرو زجاج کو صاف محسوس ہونے لگا کہ جنیدؒ خود بھی ایسی صورت پیدا کر دیتے ہیں کہ ابوعمرو

اس سلسلے میں کوئی بات نہ کرسکیں۔ جنیدؒ ایسا کیوں چاہتے ہیں اسے کچھ پتا نہ تھا۔
ایک دن دوپہر کے کھانے کے بعد جنیدؒ نے قیلولے کا ارادہ کیا۔ اس وقت وہاں اور کوئی نہ تھا۔ شیخ
زجاج نے آگے بڑھ کے اپنی زبان کھولی اور کہا "بابا جنید! مَیں آپ سے اجازت چاہتا ہوں۔"
جنیدؒ نے بات ٹال دی اور کہا۔"مَیں جانتا ہوں۔ کچھ دن صبر کرو، پھر اس موضوع پر بھی بات ہوجائے گی۔"
زجاج اس وقت تو چُپ ہوگئے لیکن دوسرے ہی دن پھر وہی سوال کر دیا۔ بولے"حضرت مَیں آپ سے
جس قسم کی بات کرنا چاہتا ہوں کیا آپ جانتے ہیں۔"
جنیدؒ نے جواب دیا،" تُو نے کل یا پرسوں بھی اسی موضوع پر بات کرنا چاہی تھی لیکن نہیں کرسکا تھا۔ میرے
پاس پھر وہی جواب ہے کہ فی الحال صبر کرو اور پریشانی میں مبتلا نہ ہو اور نہ ہمیں پریشان کر۔
زجاج پھر خاموش ہوگئے لیکن چند گھنٹوں کے اندر زجاج نے عرض کیا"حضرت مَیں حیران ہوں آپ مجھے
پُوری بات کیوں نہیں کرنے دیتے۔"
جنیدؒ نے پوچھا،" سبحان اللہ۔ مَیں نے تم کو یا کسی اور کو کہیں آنے جانے سے کب روکا ہے؟"
زجاج نے عرض کیا،" حضرت! مَیں ابو محمد رویمؒ سے ملنا چاہتا ہوں لیکن صرف اس خیال سے نہیں جاتا کہ
آپ کہیں میری اس حرکت سے ناراض نہ ہو جائیں۔ کیوں کہ یہاں کے لوگوں نے مجھے بتایا ہے کہ آپ نے ابو
محمد رویمؒ سے ملاقات کو پسند نہیں کیا۔"
جنیدؒ نے پوچھا،" مَیں کیا پسند نہیں کرتا۔
زجاج نے جواب دیا کہ کوئی ابو محمد رویمؒ سے ملاقات کرے اور بالخصوص وہ لوگ جو آپ کے پاس آتے
جاتے ہیں۔"
جنیدؒ نے سکوت اختیار کیا کوئی جواب نہیں دیا۔
زجاج چند دنوں کے لیے خاموش ہوگئے۔
انھوں نے کئی بار اجازت لینے کے لیے زبان کھولی مگر چُپ ہو ہو گئے۔ اس کا واحد سبب یہ تھا کہ
وہ جانتے تھے کہ اجازت پھر بھی نہیں ملے گی۔
ایک دن زجاج بازار سے گزر رہے تھے کہ ایک صوفی سے ملاقات ہوگئی۔ اُس نے ان سے پوچھا ابو
کیا ابو محمد رویمؒ سے ملاقات کرلی۔"
زجاج نے جواب دیا،" نہیں ابھی تک مَیں وہاں نہیں جاسکا۔"
صوفی نے کہا،" آپ کو اُن سے ضرور ملنا چاہیے کیونکہ رویمؒ جیسی نادر روزگار ہستی مشکل ہی سے کہیں
زجاج کے تجسس میں اضافہ ہوگیا اور آن کی آن میں یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ رویمؒ سے ملاقات ضرور کریں گے
اور اس سلسلے میں جنیدؒ سے اجازت بھی نہیں لیں گے۔
صوفی نے پوچھا،" کیا سوچنے لگے زجاج؟"
انھوں نے جواب دیا،" مَیں سوچ رہا تھا کہ مَیں وہاں کس طرح جاؤں! میرا قیام جنیدؒ کے پاس
شاید جنیدؒ کو یہ بات پسند نہیں کہ ان کی صحبت میں اُٹھنے بیٹھنے والا کوئی شخص رویم سے ملاقات کرے۔"
صوفی نے ہنستے ہوئے کہا،" تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ آپ رویمؒ سے ملاقات نہیں کرسکیں گے۔"
زجاج نے جواب دیا،" نہیں۔ اس سلسلے میں مَیں جنیدؒ بغدادی کو کچھ بتائے بغیر ہی رویمؒ کے پاس

گا۔ بعد میں انھیں معلوم بھی ہو گیا تو پروا نہیں۔"

صوفی نے کہا۔" حضرت۔ سوچ لیں آپ، بعد میں کوئی مصیبت نہ کھڑی ہو جائے۔"

زجاج نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اسی وقت رویمؒ کے پاس جائیں گے۔

چنانچہ وہ بازار ہی سے رویمؒ کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس وقت رویم کے دربار میں باہر سے آئے ہوئے کئی صوفی بھی موجود تھے۔ زجاج اس مجلس میں ایک طرف بیٹھ گئے اور آپ کی باتیں سننے لگے۔

اس وقت آپ مجلس میں سوال و جواب میں مشغول تھے۔ لوگ کھڑے ہو کر آپ سے سوال کر رہے تھے اور آپ انھیں جواب دے رہے تھے۔

ایک شخص نے کھڑے ہو کر عرض کیا۔" حضرت۔ اگر میں چاہوں تو سوالات کی بوچھاڑ کر سکتا ہوں لیکن اس وقت میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ آپ کچھ تھکے تھکے سے دکھائی دے رہے ہیں۔ کیا میں آپ سے پوچھ سکتا ہوں کہ ایسا کیوں ہے؟ آپ کا مزاج کیسا ہے؟"

ابو محمد رویمؒ نے جواب دیا اور فی الفور جواب دیا۔" اس شخص کا حال یا مزاج کیا پوچھتے ہو جس کا دین اس کی خواہش ہو، جس کی ہمت اس کی دنیا ہو۔

ایسا شخص نہ تو نیک بخت متقی ہو سکتا ہے اور نہ عارف اور پاکیزہ خو۔"

زجاج کو اس آواز میں سحر جیسا اثر محسوس ہو رہا تھا۔

رویمؒ نے حاضرین سے مخاطب ہو کر بولنا شروع کر دیا۔

آپ نے فرمایا۔" میں تو شروع سے کہہ رہا ہوں کہ معرفت ہی اصل شے ہے۔ جیسا کہ قرآن میں ہے۔ ہم نے جن و انسان پیدا کیے ہیں عبادت کے لیے۔" آپ نے سکوت اختیار کی۔ اس روز آپ کی نظر زجاج پر پڑ گئی، آپ انھیں دیکھ کر مسکرائے اور اپنی بات جاری رکھی۔ کہنے لگے" انسانوں میں وہ لوگ بھی ہیں جن کو اللہ کی حضوری حاصل ہو جاتی ہے۔ ان کی تین قسمیں ہوتی ہیں۔ ان میں اوّل وہ ہیں جن کو شاید وحید کہا جاتا ہے اور یہی وہ لوگ ہیں جن پر ہیبت طاری رہتی ہے۔ دوم وہ ہیں جنھیں شاید وعدد کہا جاتا ہے اور یہ وہ ہیں جو ہمیشہ عالم غیوبت میں رہتے ہیں۔"

کسی نے بے چینی سے دریافت کیا" تیسرے کون ہیں؟"

آپ نے فرمایا۔" تیسرے وہ ہیں جو شاید حق کہلاتے ہیں اور یہی ہیں جو ہر وقت مسرور اور مگن رہتے ہیں۔"

اس کے بعد زجاج کو مخاطب کیا" اے ابو عمرو! یہاں کیا لینے آئے ہو؟"

ابو عمرو نے جواب دیا۔ حضرت، میں آپ سے ملنے آیا ہوں۔"

آپ نے فرمایا۔" کیا اجازت لے لی تھی؟"

ابو عمرو کو شرمندگی ہو رہی تھی۔ جواب دیا۔ جس طرح میزبان کے لیے کچھ شرائط مقرر ہیں اسی طرح مہمان پر کچھ ذمے داریاں اور فرائض واجب ہیں اور بحیثیت انسان وہ ان کی بجا آوری اور تعمیل کا پابند ہے۔

آپ نے فرمایا۔" میں نے یہ کب کہا کہ تم اس کی پابندی نہ کرو لیکن میں تو یہ چاہتا ہوں کہ ایک درویش دوسرے درویش کو تیسرے درویش کی ملاقات سے باز کیوں رکھنا چاہتا ہے۔"

زجاج نے جواب دیا۔" حضرت! اس کا میں کیا جواب دوں گا۔ جنید بغدادیؒ ہی اس کا جواب دے سکتے ہیں۔"

آپ نے فرمایا۔" ہاں، وہی میرے اس سوال کا جواب دیں گے، وہی اس کی وضاحت میں کچھ فرمائیں گے۔ میں

اُن سے اس کا جواب مانگوں گا۔ کچھ دیر بعد مجلس برخاست ہو گئی اور آپ زجاج کو اپنے حجرے میں لے گئے۔
فرمایا "تم تو کافی دنوں سے اس شہر میں رہ رہے ہو۔"
زجاج نے جواب دیا "بیشک، آپ کا ارشاد بجا ہے، مگر اس کے آگے اس موضوع پر کوئی بات نہ کیجیے گا کیونکہ مجھے اس سے شرمندگی ہوگی۔"
رویمؒ نے ان کی بات مان لی اور دوسری باتیں کرنے لگے۔ آپ نے فرمایا "اے زجاج! اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں قول اور فعل بڑی نعمت ہیں، جس کو یہ دونوں نعمتیں مل جائیں وہ بڑے خوش قسمت ہوتے ہیں۔ یہ داخلِ سعادت ہیں۔ اگر انسان سے قول کو سلب کر لیا جائے اور فعل کو باقی رکھا جائے تو یہ انسان کے حق میں نعمت ہوگی لیکن اگر معاملہ برعکس ہو یعنی فعل کو سلب کر لیا جائے اور قول کو بحال رکھا جائے تو یہ انسان کے حق میں بڑی مصیبت ہوگی۔"
زجاج نے پوچھا "اور اگر قول اور فعل دونوں کو سلب کر لیا جائے؟"
آپ نے فرمایا "اگر بدقسمتی سے ایسا ہو جائے تو سمجھ لو اس انسان کے لیے یہی ہلاکت ہے۔"
زجاج کو آپ کی گفتگو میں بڑا مزہ آ رہا تھا۔ کہا "حضرت کچھ اور ارشاد فرمائیں۔"
رویمؒ نے فرمایا "زجاج! آج میں تمہیں نہایت اہم باتیں بتانا چاہتا ہوں۔ قیامت کے دن سب انسانوں کو پلِ صراط سے گزارا جائے گا تو وہاں دوسروں کی نسبت صوفیوں کو بڑی مشکل پیش آئے گی۔"
زجاج نے عرض کیا "لیکن حضرت! عام انسانوں کی نسبت صوفی تو زیادہ دیندار اور اللہ کا تابع ہوتا ہے پھر اس کو کیوں مشکل آئے گی؟"
رویمؒ نے جواب دیا "دوسری جماعتوں کے لوگوں سے ظاہری شریعت کے مطابق باز پُرس ہوگی اور صوفیا سے باطن کے مطابق باز پُرس ہوگی۔"
زجاج نے کہا "حضرت! میں ایک مسافر ہوں آپ مجھے سفر کے آداب بتائیں۔"
آپ نے جواب دیا "آدابِ سفر کی بنیادی چیز یہ ہے کہ کسی قسم کا خطرہ مسافر کے لیے سدِ راہ نہ ہو اس کو آرام کی غرض سے کہیں قیام بھی نہیں کرنا چاہیے۔ یاد رکھو جس جگہ بھی طلب نے آرام کیا بس وہی اس کی منزل ٹھہری۔"
زجاج نے پھر سوال کیا "آپ کے نزدیک تصوّف کی بُنیاد کیا ہے؟"
آپ نے جواب دیا "تصوّف کی اساس یہ ہے کہ فقراء سے تعلق رکھے۔ عاجزی سے ثابت قدم رہے اور بخشش و عطا پر معترض نہ ہو اور اعمالِ صالحہ پر ثابت قدم رہے اس کا نام تصوّف ہے۔"
زجاج نے عرض کیا "اور توحید کیا ہے؟"
آپ نے فرمایا "خدا کی محبت میں عنایت کا نام توحید ہے۔" اس کے بعد آپ نے فرمایا "برادرِ عزیز! اللہ عارف ایسا آئینہ ہوتا ہے جس میں ہر لحظہ تجلیات کا انعکاس ہوتا رہتا ہے۔" پھر فرمایا "زجاج! یاد رکھو قربِ خداوندی جس شے کا نام ہے اگر اس کو معلوم کرنا چاہو تو یہ دیکھو کہ دل میں خدا کے سوا بھی کچھ ہے یا نہیں اگر جب یہ محسوس کرو کہ خدا کے سوا ہر شے سے نفرت محسوس ہو رہی ہے تو سمجھ لو کہ تمہیں قرب حاصل ہو گیا۔"
زجاج کے دل و دماغ میں آپ کی باتیں براہِ راست اثر کر رہی تھیں۔ رویمؒ نے ان سے پوچھا "جب جلیہ کو تمہارے یہاں آنے پر اعتراض تھا تو تم یہاں کیوں آئے۔"

زجاج نے جواب دیا۔ "حضرت! مَیں جھوٹ بولنے سے رہا۔ ایمانداری کی بات یہ ہے کہ جب مَیں بغداد آیا تو مَیں نے یہ سوچا کہ واپسی پر لوگ مجھ سے پوچھیں گے کہ زجاج تم بغداد گئے، اتنے عرصے قیام بھی کیا، مشہور زمانہ صوفیوں سے بھی ملے یہ بتاؤ کہ پیر و مُرشد رویمؒ سے بھی ملاقات ہوئی یا نہیں۔ وہ لوگ آپ کی بابت سوال کریں گے تو مَیں انھیں کیا جواب دوں گا۔"

رویمؒ نے کہا۔ "تم چاہو تو کچھ دیر قیام کرو۔"

زجاج تو پہلے ہی یہ چاہتے تھے فوراً رُک گئے۔ رویمؒ انھیں چھوڑ کر اندر چلے گئے اور کچھ دیر بعد زجاج کو بھی اندر بُلوا لیا۔ یہاں جو منظر دیکھنے میں آیا وہ پہلے سے بالکل مختلف تھا۔ یہاں پر رویمؒ گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بڑی شان سے بیٹھے تھے۔ رویمؒ نے زجاج کو دیکھتے ہی کہا۔ "اے ابوعمرو! مَیں نے سوچا میری جلوت تو تم نے دیکھ لی، اب میری خلوت بھی دیکھ لو۔"

اتنے میں اندر سے ایک چھوٹی سی لڑکی آپ کے پاس آئی۔ آپ نے اسے اپنے پاس بٹھا لیا اور اس سے علم توحید پر باتیں کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد آپ نے زجاج سے کہا "اے ابوعمرو! تمہارے شیخ (جنیدؒ) کہتے ہیں کہ مَیں نے کیسی روش اختیار کرلی ہے اور مَیں نے یہ شغل کیوں نہیں ترک کیا۔ یہی وجہ ہے کہ مَیں ان کے پاس حاضری بھی نہیں دیتا۔ اب تم ہی بتاؤ میرے پاس اتنا وقت کہاں۔ یہ بچے میرے پاس آتے ہیں اور مجھ سے سوالات کرتے ہیں۔ مَیں انھیں جوابات دیتا ہوں اور کوشش کرتا ہوں کہ انھیں زیادہ سے زیادہ باخبر کر دیا جائے۔ مَیں ان بچوں کو علم توحید کا درس دیتا ہوں اور مَیں اپنے اس شغل کو ضروری اور واقعی سمجھتا ہوں۔"

زجاج نے آپ کی بات سے کامل اتفاق کیا۔

یہاں سے مل کر جب آپ شیخ جنیدؒ کے پاس پہنچے تو وہاں کسی نے اُن کے پہنچنے سے پہلے ہی یہ بتا دیا تھا کہ اس وقت زجاج، رویمؒ کے پاس تشریف فرما ہیں۔

شیخ جنیدؒ نے زجاج کو اپنے رُوبرو کھڑے دیکھا تو مسکراتے ہوئے کہا "آثار بتا رہے ہیں کہ شیخ رویمؒ سے تمہاری ملاقات ہو گئی ہے۔"

زجاج نے جی کڑا کر کے جواب دیا۔ "مَیں اُن سے مل کر آ رہا ہوں۔"

"تو انھیں کیسا پایا؟" جنیدؒ نے پُوچھا۔

انھوں نے جواب دیا۔ "رویمؒ تو بڑے بُلند پایہ بزرگ ہیں۔ اُن کی باتوں نے جی خوش کر دیا۔"

جنید بغدادیؒ نے فرمایا۔ "الحمد للہ تم نے مجھے خوش کر دیا۔ مَیں دل ہی دل میں خوفزدہ تھا کہ اگر رویمؒ سے مل کر اور انھیں اس حال میں دیکھ کر کہ وہ گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے لوگوں سے مخاطب ہیں اور اگر تم ان کے ظواہر پر اُن کی شخصیت کو جانچنے لگے تو اس کا آخر کیا نتیجہ نکلے گا۔ تم ان کی شخصیت سے بے نیاز اور منحرف ہو جاؤ گے۔ بس اسی خوف سے مَیں تمہیں وہاں نہیں جانے دینا چاہتا تھا۔"

زجاج نے عرض کیا۔ "آپ نے میرے بارے میں یہ کیا سوچ لیا تھا۔"

جنیدؒ نے جواب دیا۔ "مَیں نے جو کچھ سوچا تھا عین بشریت کے مطابق تھا اور اگر اس طرح سوچ لیتے تو اپنے ذخیرہ اعمال کو برباد کر لیتے۔ الحمد للہ، کہ تم نے انھیں خوب دیکھا وہ واقعی بزرگ ہیں۔"

❖

ایک روز آپ نے اپنے ارادت مندوں اور مُریدوں کو اکٹھا کر کے کہا "لوگو! تم مجھ سے کیا پُوچھنا چاہتے ہو

پوچھو۔ میں تمہارے ہر سوال کا جواب دوں گا۔"
مجلس میں ہر شخص سرتاپا اشتیاق بنا ہوا تھا کسی نے پوچھا۔ "ابھی حال ہی میں آپ نے ایک شخص سے یہ فرمایا تھا کہ اس میں صوفیوں کو اپنی روح خرچ کرنا پڑتی ہے۔ براہ کرم اس کے معنی و مطالب سے آگاہ فرمائیں۔"
آپ نے فرمایا۔ "اے شخص! روح کا خرچ کرنا یہ نہیں ہے کہ جہاد میں تجھ کو قتل کر دیا جائے بلکہ جان دینا یہ ہے کہ اپنی جان کے لیے اللہ سے جھگڑا نہ کرے۔ اپنی جان، اپنے جسم اور اپنے دل کو اسی کام میں لگا دے اس کو کہتے ہیں فداکاری اور اس کے بعد بھی یہی سمجھے کہ اللہ کا حق اُس پر باقی ہے۔"
ایک اور شخص نے پوچھا۔ آپ اُنس کے بارے میں کیا فرماتے ہیں؟
آپ نے جواب دیا۔ میں اس کا جواب پہلے بھی دے چکا ہوں۔ اُنس یہ ہے کہ بندہ غیر اللہ سے وحشت کرے یہاں تک کہ اُسے اپنے نفس سے بھی وحشت ہو۔"
کسی نے پوچھا۔ محبت کی حقیقت کے بارے میں کچھ ارشاد فرمائیں۔"
آپ نے فرمایا۔ "اپنی تمام حالتوں میں راضی بہ رضائے الٰہی ہونا۔" اس کے بعد آپ نے اپنا ایک شعر پڑھا جس کا مفہوم کچھ یوں تھا۔
" اگر موت کا حکم دیا جائے تو وہ مجھے دل و جان سے منظور ہے اور میں اس موت کو خوش آمدید اور مرحبا کہتے ہوئے قبول کر لوں۔"
آپ سے ایک اور سوال کیا گیا۔ " اور رضا کیا ہے؟"
آپ نے جواب دیا۔ "مصیبت اور ابتلا سے لذت حاصل کرنا۔"
پھر پوچھا گیا۔ "یقین کیا ہے؟"
فوراً جواب دیا۔ "مشاہدے کا دوسرا نام یقین ہے۔"
آپ نے فرمایا۔ "لوگو! قول اور فعل کے بارے میں میں پہلے بھی کچھ کہہ چکا ہوں۔ آج میں اس کو دوبارہ کہہ رہا ہوں تاکہ یہ نکتہ اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے اور تم مصیبتوں سے محفوظ رہو۔"
حاضرین دم بخود آپ کی باتیں سُن رہے تھے۔ آپ نے فرمایا۔ "لوگو! جب اللہ تم کو قول اور فعل سے نوازے اور پھر وہ تجھ سے قول کو لے لے اور فعل سے نوازے تو کچھ پرواہ نہ کرنا کیوں کہ یہ ایک نعمت ہے اور اور تجھ سے فعل لے لیا جائے اور قول کو تجھ پر چھوڑ دیا جائے تو اپنے اس حال پر تجھے رونا چاہیے کیونکہ یہ ایک مصیبت ہے اور اگر تم سے قول اور فعل دونوں لے لیے جائیں تو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ تم پر عذابِ الٰہی کا نزول شروع ہو چکا ہے۔"
آپ سے پوچھا گیا۔ "فقر کی عزت کے بارے میں آپ کیا کہیں گے یعنی اُسے کس بات سے عزت حاصل ہے۔"
آپ نے جواب دیا۔ "فقر کا فقر ہی اس کی عزت اور اُس کا ستر ہے اور فقر ہی اس کی غیرت ہے۔ جس نے اس کو کھول دیا اور زمانے کو اس کی جھلک دکھا دی، وہ فقر نہیں رہا اس کو فقر میں کبھی بھی عزت نہیں حاصل ہو سکتی۔"
آپ کی زبان کی تاثیر کا یہ حال تھا کہ لوگوں کے دلوں میں گدازیت نے اپنا گھر بنا لیا تھا۔ اور ان کے دل درد و غم سے لبریز ہو چکے تھے کسی نے آپ سے سوال کر دیا جو تصوف سے بہت مختلف تھا۔ آپ سے پوچھا گیا

"کیا کوئی ایسا بھی کام ہے جو دانش مندی کے معیار پر پورا اُترے اور اس کو صوفیا میں خاص مقام حاصل رہے۔"
آپ نے جواب دیا "کیوں نہیں۔ دانش مندی کے اُصول و حکمت سے یہ بات طے شدہ ہے کہ اگر وہ احکام میں اپنے بھائیوں پر کشادگی کرے مگر اپنے نفس پر تنگی کرے کیونکہ دوسروں پر فراخی کرنا علم کی پیروی ہے اور اپنے نفس پر تنگی کرنا پرہیز گاری۔ اس نکتے کو ہمیشہ یاد رکھنا۔"

آپ کے جوابات سن کر حاضرین پر وجد کی سی کیفیت طاری ہو چکی تھی۔ آپ سے پوچھا گیا۔ صوفیاء مخلوق سے دور کیوں رہتے ہیں۔ جس کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ صوفی کا مخلوق سے کنارہ کش ہونا ہی افضل ہے۔ اسی میں نجات اور اسی میں بڑائی ہے۔ مزید فرمایا۔ میں فقر کی بابت پہلے ہی بہت کچھ کہہ چکا ہوں۔ اب مزید یہ کہوں گا۔ فقر اس کو کہتے ہیں کہ انسان نفس کی ہمیشہ مخالفت کرتا رہے۔ رموزِ خداوندی کو کبھی بھی آشکار نہ ہونے دے۔

آپ نے مزید فرمایا۔ "لوگو! تم مجھ سے سوال کرتے ہو اور میں اُن کے جواب دے دیتا ہوں۔ لیکن بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ میرے دل پر وارد ہوئی اور میں ان کو تم لوگوں تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ اس لیے تم مجھ کو اجازت دو کہ میں سوال جواب کے بغیر ہی تم تک پہنچا دوں۔"
لوگ کہنے لگے حضرت ہمیں بھلا اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ ہم تو آپ کی تعلیمات اور روحانی علوم کے قائل ہو چکے ہیں۔

پھر آپ فرمانے لگے۔ لوگو! ہم اولیاء کے نزدیک ترکِ شکایت کا نام صبر ہے اور تواضع یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے انسان خود کو ذلیل سمجھے۔ ہم صوفیوں میں ترکِ دنیا زہد کو کہتے ہیں اور خائف اس کو کہتے ہیں جو اللہ کے سوا کسی سے بھی نہ ڈرتا ہو۔ جو شخص احکامِ الٰہی کا استقبال خندہ پیشانی سے کرتا ہے ہم اس کے اس فعل کو راضی برضائے الٰہی قرار دیتے ہیں۔

روایت ہے کہ اپنے وقت کے ایک عظیم ولی اللہ جنہیں لوگ صوفی عبداللہ کے نام سے جانتے ہیں وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور نیاز مندی کے بعد جب رخصت ہونے لگے تو آپ سے کوئی نصیحت کرنے کی درخواست کی۔ آپ نے قدرے توقف کے بعد کہا میری پہلی اور آخری نصیحت یہی ہے کہ ہمیشہ راہِ خدا میں جان دینے کے لیے تیار رہو اور اگر ایسا نہ کر پاؤ تو پھر درویشی کی راہ پر چلنے کا ارادہ ترک کر دو۔
شیخ ابو محمد رویم کی درویشی قلندری اپنی مثال آپ تھی۔ کئی کئی روز تک آپ بھوکے پیاسے عبادت و ریاضت میں گزار دیتے تھے۔ گوشہ نشینی کا یہ عالم تھا کہ ہفتوں گزر جاتے مگر اپنے حجرے سے باہر نہ نکلتے تھے۔
اللہ تعالیٰ نے آپ کو بڑے اونچے مقامات اور حفظِ مراتب سے سرفراز فرمایا تھا۔ لوگ دور دور سے آ کر آپ سے اپنے روحانی قلبی اور ذہنی مسائل کے حل میں آپ سے رہنمائی حاصل کرنے آیا کرتے تھے۔
اللہ تعالیٰ کے یہ عظیم صوفی بزرگ ۳۰۳ ہجری میں اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔ بغداد کے شونیزیہ قبرستان میں آپ کا مزارِ مبارک ہے۔ جہاں آج بھی آپ کے ارادت مند اور مرید جوق در جوق حاضری دینے آتے ہیں۔

حضرت شیخ علی فارمدی کا قول ہے کہ روزِ محشر جب اللہ تعالےٰ۔ مجھ سے یہ سوال کریگا کہ اے بندے تُو نے اس دُنیا میں کونسا نیک کام کیا ہے تو میں یہی جواب دوں گا کہ باری تعالیٰ میں نے تیری دُنیا میں شیخ ابوعلی دقاق سے عشق کرنے کے سوا اور کوئی کام نہیں کیا اور عمر بھر اُن ہی کی عقیدت مندی میں رہا ہوں۔

حضرت شیخ علی فارمدی اس اعتبار سے واقعی اپنے عشق پر فخر کر سکتے تھے کہ انہوں نے ایک ایسی عظیم ہستی کو اپنا محبوب بنایا تھا جو طریقت و حقیقت میں ممتاز، عشقِ الٰہی میں یکتائے روزگار اور تفسیر و حدیث پر کامل عبور رکھتی تھی۔ شیخ ابوعلی دقاق ایک ایسے ولی اللہ تھے جن سے بے شمار بزرگانِ دین اور علمائے کرام نے باطنی فیوض حاصل کیے۔ آپ کے اندازِ خطابت میں اس قدر سوز و گداز ہوا کرتا تھا کہ لوگوں نے آپ کو نوحہ گر قوم کا خطاب دے رکھا

آپ کی زندگی کا زیادہ تر دور "مرو" میں گزرا۔ اسی دور کے ایک بزرگ بیان فرماتے ہیں کہ میں نے ایک مر مرو میں شیطان کو افسردہ حال اور سر پہ خاک ڈالتے ہوئے دیکھ کر پوچھا کہ تُو نے اپنی یہ کیا حالت زار بنا رکھی ہے وہ ہے جس نے تمہیں اس قدر ذلت، کرب اور مصیبت میں مبتلا کر رکھا ہے۔ شیطان نے جواب دیا۔ میں اللہ تعالیٰ جس خلعت کے لیے سات لاکھ سال سے طالب رہا وہ خلعت اللہ تعالیٰ نے ایک آٹا فروش کو پہنا دی ہے۔ شیطان کا اشارہ حضرت شیخ ابوعلی دقاق کی جانب تھا جن کے عشقِ الٰہی کے جذبے پر اُن کے ہم عصر بھی رشک کیا کرتے تھے

حضرت شیخ ابوعلی دقاق نے طویل عرصہ تک مرو میں مقیم رہ کر وعظ گوئی کو اپنائے رکھا اور لوگوں کو نیکی کی ہدایت کر رہے جس کے بعد آپ بعض دُور دراز کے شہروں میں جاکر بھٹکے ہوتے لوگوں کو صراطِ مستقیم پر چلنے کی ہدایت کرتے ر

آپ فرماتے ہیں کہ میں نے دورانِ سفر ایک ویران مسجد دیکھی جہاں پہ ایک بوڑھا شخص عبادتِ الٰہی میں مصروف اُس کے چہرے پر عجیب قسم کی بیقراری تھی اور عبادت کے دوران زار و قطار رو بھی رہا تھا۔ زیادہ حیرت و استعجاب کی یہ تھی کہ اُس کی آنکھوں سے اشکوں کی بجائے خون رواں تھا۔ وہ صحیح معنوں میں خون کے آنسو رو رہا تھا جس سے مسجد فرش بھی خون آلود ہو چکا تھا۔ یہ دیکھ کر مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ میں نے اس کے قریب پہنچ کر اُسے ایسا کرنے سے منع

جس پر وہ شخص بچوں کی طرح بلکتے ہوئے بولا۔

"اے اجنبی! تمہیں کیسے بتاؤں کہ میں کس طرح ایک مدت سے دیدِ الٰہی کی خواہش دل میں لیے بیٹھا ہوں اور اس کی یاد میں روتے روتے میری ساری جسمانی قوت بھی ختم ہو چکی ہے۔"

حضرت شیخ ابوعلی دقاق فرماتے ہیں کہ مسجد میں بیٹھے ہوئے اس شخص نے اپنی داستان سنانے کے بعد ایک واقعہ بیان کیا کہ کسی شخص نے اپنے غلام سے ناراض ہو کر اُسے ہمیشہ کے لیے اپنے گھر سے نکال دیا۔ لیکن بعد میں لوگوں کی سفارش پر اس نے اس غلام کا قصور معاف کر دیا اور اُسے واپس اپنے ہاں آنے کی اجازت دے دی لیکن اس کے باوجود وہ غلام ہر وقت آہ و بکا کرتا رہتا تھا۔ اس پر لوگوں نے غلام سے کہا کہ بھائی اب تو تیرے آقا نے تیرا قصور بھی معاف کر دیا ہے تو پھر یہ رونے دھونے کا کیا سبب ہے مگر غلام نے لوگوں کے اس سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔ چنانچہ غلام کے آقا نے کہا کہ اب اس کو میری رضا کی خواہش ہے کیونکہ یہ اچھی طرح سمجھ چکا ہے کہ میرے بغیر اس کے لیے کوئی چارہ کار نہیں ہے۔

ایک دکاندار کا یہ معمول تھا کہ جب وہ آپ کی خانقاہ میں آتا تھا تو اپنے ساتھ کھانے پینے کی کچھ اشیاء بھی لے آتا تھا۔ وہ اکثر فقرا کے ہمراہ کھانے میں شریک بھی ہوا کرتا تھا۔ اس طرح وہ کئی سال تک اپنے پاس سے فقرا کی خدمت کرتا رہا۔ اس کے متعلق ایک مرتبہ شیخ ابوعلی دقاق نے فرمایا کہ یہ شخص صاحبِ باطن ہے۔ اسی رات آپ نے دیکھا کہ ایک شاندار محل کی چھت پر بہت سے بزرگانِ دین کا اجتماع ہو رہا ہے لیکن آپ بے حد کوشش کے باوجود اوپر نہیں پہنچ پا رہے۔ اسی دوران وہ دکاندار آکر کہنے لگا کہ یہ وہ راہیں ہیں جن پر چلتے ہوئے شیر عموماً لومڑیوں سے بھی پیچھے رہ جاتے ہیں۔ پھر اس شخص نے آپ کو اوپر پہنچا دیا۔ اس خواب کے اگلے روز جب شیخ ابوعلی دقاق منبر پر تشریف فرما تھے تو حسبِ معمول وہی دکاندار حاضر ہوا۔ آپ نے اُسے دور سے دیکھ کر لوگوں سے فرمایا کہ اس کو راستہ دے دو کیونکہ اگر یہ کل ہماری اعانت نہ کرتا تو ہم شکستہ پائی کا شکار ہو جاتے۔ یہ سن کر اس شخص نے دست بستہ عرض کی کہ حضرت میں تو ہر شب وہیں ہوتا ہوں لیکن آج تک کسی سے اس کا تذکرہ نہیں کیا مگر آپ نے ایک ہی شب میں مجھے لوگوں کے سامنے ذلیل و رسوا کر کے رکھ دیا۔

ایک مرتبہ کسی شخص نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں طویل سفر کی صعوبتیں جھیلنے کے بعد آپ کی خدمت میں ملاقات کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ آپ نے اُسے فرمایا کہ تمہاری یہ مسافت قطعی طور پر معتبر نہیں ہے کیونکہ انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے نفس سے صرف ایک قدم جدا ہو جائے تاکہ تمام مقاصد پایۂ تکمیل تک پہنچ جائیں۔

حضرت شیخ ابوعلی دقاق نے کبھی اپنے ذاتی مفاد کی خاطر لوگوں کی رنجش اور مخالفت مول نہیں لی تھی۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ ذاتی دشمنی اپنی خودی کا دعویٰ کرنے کے مترادف ہوتی ہے جس کے معنی ایک اعتبار سے یہ بھی ہوتے کہ تم نہ تو خود کو ہیچ تصور کرتے ہو اور نہ تم خود کو دوسروں کی ملکیت تصور کرتے ہو لیکن پھر ایسی صورت میں تمہیں یہ ثابت کرنا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ تمہارا مالک نہیں ہے تو پھر تمہارا مالک کون ہے۔ آپ نے ایک اور موقع پر فرمایا کہ جو شخص محبوب کے مکان کا جاروب کش نہ بن سکے اس کا شمار عاشقوں میں نہیں ہو سکتا۔ اور جو شخص خدا کے سوا کسی اور سے اُنس رکھتا ہے وہ خدا کے اُنس کو ضائع کر دینے والا ہے۔ یہ حقیقت جان لو کہ ذکرِ الٰہی کو چھوڑ کر کسی اور کا ذکر کرنا لغو اور بے بنیاد ہے۔

فقیری، درویشی اور قلندری آپ کی زندگی کا خاصا تھی۔ آپ کئی کئی روز تک گوشۂ تنہائی میں پڑے بغیر کھائے پیتے عبادتِ الٰہی میں مصروف رہتے تھے۔ آپ خود فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میری آنکھ میں ایسا شدید درد اٹھا کہ میں اس کی شدت سے مضطرب اور بے چین ہو گیا اور اسی حالتِ اضطراب میں مجھے نیند آگئی اور خواب میں مجھے کسی نے کہا کہ کیا اللہ اپنے بندوں کے لیے کافی نہیں ہے۔ پھر جب میری آنکھ کھلی تو سارا درد ختم ہو چکا تھا۔ اس کے بعد میری آنکھ میں کبھی کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس قسم کی عنایات اور نوازشات صرف اپنے نیک بندوں پر ہی کرتا ہے۔
شیخ ابوعلی دقاق کی اپنی تمام عمر عشق حقیقی میں گزر گئی۔ آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ استاد اور مرشد کے وسیلے کے بغیر کوئی شخص خدا تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا اور جو شخص ابتدا میں استاد و مرشد کی اتباع نہیں کرتا وہ جب تک کسی کامل استاد و مرشد کو اپنا رہنما نہیں بنا لیتا اس وقت تک وہ طریقت سے محروم رہتا ہے۔ ایک مرتبہ آپ نے اپنے ایک مرید سے فرمایا کہ بارگاہ کے دروازے تک تو خدمت و بزرگی ہے لیکن بارگاہ میں داخلے کے بعد ایک رعب طاری ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد مقام قرب میں افسردگی رہتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ریاضت و مجاہدات سے اولیائے کرام کے حالات سکون و راحت میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

آپ فرماتے ہیں کہ ایک روز کسی درویش نے میری خانقاہ میں حاضر ہو کر استدعا کی کہ خانقاہ کا ایک گوشہ میرے لیے بھی خالی کر دیں تاکہ میں اس میں اپنی جان دے دوں۔ چنانچہ میں نے اس کے لیے ایک جگہ متعین کر دی اور اس نے وہاں پہنچ کر اللہ اللہ کا ورد شروع کر دیا۔ میں یہ سب کچھ چھپ چھپ کر دیکھتا رہا لیکن اس نے نہ جانے مجھے کن آنکھوں سے دیکھ لیا کہ کہنے لگا "اے ابوعلی مجھے پریشان مت کرو۔ چنانچہ میں یہ سن کر وہاں سے واپس آ گیا اور وہ درویش کچھ دیر تک ورد الٰہی کرتا ہوا فوت ہو گیا۔

اس کے بعد جب میں ایک شخص کو اس کی تجہیز و تکفین کا سامان لینے کے لیے بھجوا کر مکان کے اندر داخل ہوا تو وہ مردہ درویش وہاں سے غائب تھا۔ اس واقعہ سے میں حیرت زدہ رہ گیا اور اللہ تعالیٰ سے عرض کی کہ اے خدا تو بزرگ و برتر ہے تو نے میری ملاقات ایک ایسے اجنبی سے کرائی جو مرنے کے بعد غائب ہو گیا آخر اس میں تیرا کیا راز اور کیا مصلحت تھی۔ اس پر غیب سے آواز آئی کہ جو ملک الموت کو تلاش کرنے پر نہ مل سکا تو آخر اس کی جستجو کیوں کرنا چاہتا ہے اور جو ملائکہ اور حوروں کو نہ مل سکا تجھے اس کی تلاش کیوں ہے۔ میں نے عرض کی "اے اللہ آخر وہ ہے کس جگہ پر۔" غیب سے ندا آئی فی مقعد صدق عند ملیک مقتدر (یعنی وہ مجلس صدق میں مقتدر بادشاہ کے پاس ہے۔

شیخ ابوعلی دقاق میں عاجزی اور انکساری کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ شب و روز عبادت میں مصروف رہنے کے باوجود بھی وہ خود کو گنہگار اور خطاکار تصور کرتے تھے۔ حالت غلبہ میں آپ اپنی مناجات کچھ اس طرح سے شروع کیا کرتے تھے۔

"اے اللہ! مجھے چیونٹی کی طرح عاجز تصور کر اور خشک گھاس کی پتی کی مانند سمجھ کر اپنے کرم سے میری مغفرت فرما دے مجھ کو دنیا کے سامنے رسوائی سے بچانا کیونکہ میں نے منبر پر بیٹھ کر بہت لاف زنی کی ہے اور اگر تجھے رسوا کرنا ہی منظور ہے پھر مجھ کو صوفیا کے لباس میں جہنم میں رکھنا تاکہ میں ہمیشہ تیرے فراق کے غم میں گھلتا رہوں۔ اے اللہ میں نے اپنے گناہوں سے اپنے اعمال نامہ کو سیاہ کر لیا ہے اور اپنے سیاہ بالوں کو سفیدی میں تبدیل کر لیا ہے لہٰذا ہماری سیاہی پر نظر نہ ڈالنا بلکہ اس سفید کیے بالوں کی لاج رکھ لینا۔ اے اللہ تجھ سے واقفیت رکھنے والا کبھی تیرے سے طلب نہیں رکھتا۔ خواہ اس کو یہ علم ہو جاتے کہ وہ تجھے کبھی نہیں پا سکے گا۔ اے اللہ تو اگر اپنے کرم سے جنت بھی عطا فرما دے تب بھی میرے قلب سے یہ داغ مٹے گا کیونکہ میں نے تیری بندگی میں بہت کوتاہیاں کی ہیں۔

ایک روز آپ منبر پر تشریف فرما تھے اور انسانی کوتاہیوں پر تقریر فرما رہے تھے۔ آپ کا کہنا تھا کہ انسان ظلم کرنے جہالت میں مبتلا رہنے والا اور خود بینی و حسد کرنے والا ہوتا ہے اور یہ تمام صفات معیوب ہیں۔ اس لیے ان سے احتراز لازم ہے۔ اس محفل میں ایک درویش نے جب آپ کی زبانی انسانی برائی کے بارے میں سنا تو وہ اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے اور ابوعلی دقاق سے کہنے لگے "اگرچہ انسان برائیوں کا مجموعہ ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کو محل دوستی بھی تو قرار دیا ہے اور یہ

بہتر صفت ہے۔"

درویش کی بات سن کر آپ نے فرمایا کہ واقعی تو صحیح کہتا ہے اور تیرا قول اس آیت قرآنی کے مطابق ہے کہ اللہ ان کو ادب سکھلاتا ہے جو اللہ تعالیٰ کو محبوب سمجھتے ہیں۔

ایک وقت ایسا بھی آیا کہ جب آپ کے پاس پہننے کے لیے کوئی لباس نہ تھا۔ روایت ہے کہ آپ برہنگی کی حالت میں حضرت اللہ کی خانقاہ پر تشریف لے گئے۔ وہاں ایک شخص نے آپ کو پہچان لیا اور آپ کی بہت زیادہ عزت و تکریم کی۔ اسی دوران ان پر موجود دوسرے لوگوں نے بھی آپ کو پہچان لیا۔ اور وہ سب پروانوں کی طرح آپ کے گرد جمع ہو گئے پھر انہوں نے اصرار کہ حضرت آپ یہاں پر کچھ درس دیں مگر جب آپ نے انکار کر دیا تو لوگوں نے آپ سے وعظ کی فرمائش کر دی۔ آپ نے وعظ سے بھی انکار کی کوشش کی مگر جب لوگوں کا اصرار زیادہ بڑھا تو شیخ ابوعلی دقاق منبر پر تشریف لے گئے۔ پہلے انہوں نے دائیں طرف اشارہ کر کے اللہ اکبر اور پھر بائیں جانب اشارہ کر کے واللہ خیر والبقی فرمایا۔ اس کے بعد قبلہ رو ہو کر ــــــ اللہ اکبر فرمایا۔ اس وقت لوگوں پر بے خودی اور مستی کا ایسا عالم طاری ہوا کہ مجلس میں ہر سمت شور و غوغا بلند ہوا اور شدت سے حاضرین بے ہوش ہو گئے۔ آپ اسی کیفیت میں منبر سے اتر کر نامعلوم منزل کی طرف چل دیئے۔ پھر جب لوگوں کی حالت درست ہوئی تو وہ آپ کو تلاش کرنے لگے مگر اس وقت آپ مرو پہنچ چکے تھے۔ حالانکہ چند لمحے پہلے آپ مجلس میں موجود تھے مگر اب یہاں سے سینکڑوں میل دور تشریف فرما تھے۔

✻

ایک درویش نے بیان کیا کہ میں ایک مرتبہ شیخ ابوعلی دقاق کی خدمت میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ آپ طبری دستار باندھے تشریف فرما ہیں اور وہ دستار مجھے بہت خوبصورت معلوم ہوئی تو میں نے ان سے پوچھا کہ توکل کس کو کہتے ہیں۔ شیخ ابوعلی دقاق نے فرمایا کہ مردوں کی دستار کی خواہش کو اپنے قلب سے نکال دینے کا نام توکل ہے۔ یہ فرما کر انہوں نے اپنی دستار اتار کر مجھے مرحمت فرما دی۔

ایک دن آپ دیدہ زیب لباس میں ملبوس تھے تو شیخ ابوالحسن نوری کہنہ و بوسیدہ پوستین پہنے ہوئے آپ کے سامنے آئے۔ آپ نے مسکرا کر سوال کیا کہ اے ابوالحسن تم نے یہ پوستین کس قیمت میں خریدی ہے۔ انہوں نے ایک ضرب لگا کر کہا کہ میں نے پوری دنیا کے معاوضے میں اس کو خریدا ہے اور مجھے یہ اس قدر عزیز ہے کہ اگر اس کے بدلے میں پوری جنتیں بھی عطا کر دی جائیں اس صورت میں بھی میں یہ پوستین ہی پہنوں گا۔ ابوالحسن نوری کا یہ جواب سن کر شیخ ابوعلی دقاق نے روتے ہوئے کہا کہ آج سے میں کسی درویش کا تمسخر نہیں اڑاؤں گا۔

شیخ ابوعلی دقاق فرمایا کرتے تھے کہ ہمیشہ بدی کے اثرات سے انسان کو محفوظ رہنا چاہیے کیونکہ برائی کا اثر انسان پر دیر تک حاوی رہتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ایک مرتبہ میں راستہ بھول جانے کی وجہ سے مسلسل پندرہ یوم تک جنگلوں میں بھٹکتا پھرا جس کے بعد مجھے راستہ مل گیا اور ایک فوجی نے مجھے ایسا شربت پلایا کہ جس کی ظلمت و تاریکی کا اثر آج تک مجھے اپنے قلب میں محسوس ہوتا ہے حالانکہ اس واقعہ کو تیس سال بیت چکے ہیں۔

کسی شخص نے آپ کو مرو میں مدعو کیا۔ آپ جا رہے تھے کہ راستے میں ایک بڑھیا سے ملاقات ہو گئی جو کہہ رہی تھی "اے اللہ تو نے مجھے کثیر الاولاد ہونے کے باوجود فقر و فاقہ میں مبتلا کر دیا ہے آخر اس میں تیری کیا مصلحت ہے۔ شیخ ابوعلی دقاق اس وقت تو خاموش رہے اور وہاں سے چل دیئے مگر جب مرو میں اپنے میزبان کے ہاں پہنچے تو اُسے فرمایا کہ ایک طباق میں بہت سا کھانا بھر کر لے آؤ۔ یہ سن کر وہ شخص بہت خوش ہوا۔ اس نے خیال کیا کہ شاید آپ گھر پر جا کر کھانا چاہتے ہیں کیونکہ آپ کے پاس گھر بار نام کی کوئی شے نہیں تھی۔ چنانچہ جب وہ میزبان طباق بھر کر لے آیا تو آپ اس کو سر پر رکھ کر اس بڑھیا

کی طرف چل پڑے جو آنی بار انہیں راستے میں ملی تھی۔ وہاں پہنچ کر آپ نے اپنے حصے کا سارا کھانا اس بڑھیا کو پیش کر دیا۔ اس قسم کی عاجزی انکساری اور دریادلی اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو ہی عطا کرتا ہے جس سے عام طور پر دوسرے لوگ محروم رہتے ہیں۔

ایک روز وعظ کے دوران آپ نے فرمایا کہ اگر روزِ محشر اللہ تعالیٰ نے مجھے دوزخ میں بھجوایا تو کفار مجھے اپنے مصاحبین میں دیکھ کر بہت مسرور ہوں گے اور میرا مذاق اڑائیں گے۔ وہ مجھ سے پوچھیں گے کہ آج ہمارے اور تمہارے درمیان کیا فرق ہے؟ میں انہیں جواب دوں گا کہ جواں مردوں کو فردوس وجہنم کی کوئی پروا نہیں ہوتی لیکن اللہ کا یہی طریقہ ہے۔

فَلَمَّا اَضَاءَ الصُّبحُ فَرَّقَ بَیْنَنَا وَاَیُّ نَعِیْمٍ لَا یُکَدِّرُہٗ الدَّھْرُ

یعنی پھر جب صبح ہوئی تو اس کی روشنی نے ہمارے اندر جدائی کر دی اور کون سی نعمت ہے جس کو زمانہ نے مکدر نہیں کیا۔

حضرت مصنف کا قول ہے کہ اس کے بعد آپ کا یہ فرمانا تعجب خیز ہے کہ اگر میرے پاس علم آجاتا کہ روزِ محشر کوئی قدم میرے قدم کے علاوہ ہوگا تو ہر وہ عمل جو میں نے کیا ہے روگرداں ہو جاتا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ جملہ آپ نے محویت وعبوریت کے عالم میں فرمایا ہو۔

ایک مرتبہ کسی نے خانقاہ میں آکر آپ سے سوال کیا کہ اگر کسی شخص کے قلب میں تصورِ گناہ پیدا ہو گیا تو کیا اس سے جسمانی پاکیزگی ختم ہو جاتی ہے۔ یہ سن کر آپ نے مریدین سے روتے ہوئے فرمایا کہ اس کو جواب دو چنانچہ حضرت زین الاسلام کہتے ہیں کہ میں نے یہ جواب دینا چاہا کہ تصورِ گناہ ظاہری پاکی کے لیے مضر رساں نہیں ہوتا۔ البتہ باطنی پاکیزگی ختم ہو جاتی ہے۔ مگر مرشد کے ادب اور احترام کے پیشِ نظر میں جواب دیے بغیر ہی خاموش ہو گیا۔

زندگی کے آخری ایام میں آپ کی یہ کیفیت ہو گئی تھی کہ شام کے وقت اپنے بالاخانے پر جو آپ کے مزار کے نزدیک اس وقت بیت المفتوح کے نام سے مشہور ہے آفتاب کی جانب منہ پھیر کر فرمایا کرتے تھے کہ اے مملکتوں میں گردش کرنے والے آج تیری کیا حالت ہوتی جا رہی ہے اور ملک الموت کے گرد تو نے کس طرح گردش کی اور یہ بتا دے کیا تو نے کسی مجھ جیسا شیدائی اور اشتیاقِ دید رکھنے والا بھی دیکھا ہے۔ غرض کہ آپ غروبِ آفتاب کے وقت تک اسی قسم کی باتیں کرتے رہتے تھے۔ آخری دور میں آپ کا کلام اس قدر ذومعنی اور دقیق ہونے لگا تھا کہ لوگ اس کا مفہوم سمجھنے سے قاصر رہتے تھے۔ اس کے باعث آپ کی مجلس میں آخری دنوں میں شرکت کرنے والوں کی تعداد چودہ پندرہ افراد سے زیادہ نہ ہوتی تھی۔

حضرت انصاری کا قول ہے کہ جب آپ کا کلام بہت گہرا اور بلند ہو گیا تھا تو آپ کی محفل مخلوق سے خالی نظر آنے لگی تھی۔

روایت ہے کہ حضرت شیخ ابوالقاسم قشیری نے آپ کے انتقال کے بعد آپ کو خواب میں دیکھ کر پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا ہے۔ آپ نے جواب دیا کہ میرے تمام گناہ معاف کر کے اللہ تعالیٰ نے میری مغفرت فرما دی لیکن مجھ سے ایک گناہ ایسا سرزد ہوا تھا کہ اس کا اقرار کرتے ہوئے مجھے خاصی ندامت محسوس ہوئی جس کی وجہ سے میں پسینہ میں شرابور ہو گیا اور چہرے پر زردی پھیل گئی۔ میرا وہ گناہ یہ تھا کہ میں نے اپنی نوعمری میں ایک لڑکے کو غلط نگاہ سے دیکھا تھا۔

اسی طرح ایک اور بزرگ نے آپ کو خواب میں بے قراری کی حالت میں روتے ہوئے دیکھا تو ان سے پوچھا کہ کیا آپ دوبارہ اس دنیا میں آنا چاہتے ہیں تو آپ نے ہاں میں جواب دیا لیکن ساتھ یہ بھی فرمایا کہ میں اپنی بھلائی کے لیے دنیا میں آنا نہیں چاہتا بلکہ مخلوق کو اللہ کی جانب راغب کرنے کے لیے واپسی چاہتا ہوں اور ان کو یہاں کے حالات سے آگاہ کرنے کی خواہش ہے۔ پھر کسی بزرگ نے خواب میں سوال کیا کہ وہاں آپ کا کیا حال ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اوّل تو اللہ تعالیٰ نے میرے تمام اچھے برے اعمال کا محاسبہ کیا۔ اس کے بعد سارے گناہ معاف کر کے مجھے مغفرت میں بٹھا دیا۔

شیخ ابوعلی دقاق اکثر اپنے مریدوں اور ارادت مندوں سے فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص بنیا و بقال بننا چاہتا ہے اس کے
ے تو بہت سے برتنوں کی ضرورت ہوتی ہے لیکن جو اس کو پسند نہیں کرتا اس کے لیے ایک کوزا اور چند برتن کافی ہیں یعنی
علم کو مراتب و نمود کے لیے حاصل کیا جائے تو زیادہ علم حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ اور اگر معقول علم کا مقصد صرف
آخرت کا مہیا کرنا ہو تو پھر عبودیت کی شرائط سے ہی واقف ہونا اور اپنے قلیل علم پر عمل کرنا ہی مقصود اصل ہے۔
آپ کے نزدیک انسان کو دوزخ سے زیادہ دُنیا میں اذیت اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ آپ فرمایا کرتے
کہ میری آج کی مصیبت کل کی دوزخ کی مصیبت سے زیادہ ہے کیونکہ قیامت میں تو صرف اہل جہنم ہی کا ثواب فوت
گا لیکن میرا آج کا نقد وقت مشاہدہ الٰہی میں فوت ہو رہا ہے اس لیے میری مصیبت اہل جہنم کی مصیبت سے زیادہ
ے۔ ایک اور موقع پر آپ نے فرمایا کہ حرام چیزوں کو چھوڑ دینے والا دوزخ سے نجات پائے گا اور مشتبہ اشیا سے احتراز
نے والا جنت میں داخل ہو گا۔
حضرت شیخ ابوعلی دقاق ایک درویشانہ اور قلندر مزاج رکھنے والے صوفی بزرگ تھے جنہوں نے اپنے خدا سے دلوا نہ
شق کیا اور تصوف کی منزل کو پا لیا۔

انیسویں صدی کا وسطی دور برصغیر کے مسلمانوں کے لیے انتہائی ابتلا اور آزمائش کا دور تھا۔ سامراجی اقتدار کی توسیع پسندی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ مغربی اور مشرقی تہذیب کی آویزش اور مذہبی و نظریاتی اختلاف نے پورے ہند میں ایک بحران کی کیفیت پیدا کر رکھی تھی۔ سکھ نے لوٹ مار کا بازار گرم کر رکھا تھا اور مسلمانوں پر ان کا ظلم و ستم روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد مسلمان ہی انگریزوں کے زیرِ عتاب تھے اور پوری قوم پر ایک یاس و قنوط کی کیفیت تھی۔ ان حالات میں ایک طرف اربابِ قلم علی گڑھ تحریک کے زیرِ اثر اپنی پُرجوش تحریروں سے قوم کی اور نظریات کی رہنمائی کر رہے تھے تو دوسری طرف صوفیائے کرام کا عظیم الشان گروہ خواجہ سلیمان تونسوی کی قیادت میں احیائے قلب کے لیے کوشاں تھا۔ تاریخ کے اس نازک دور میں دین کے مقاصدِ عظیم کی نگہداشت اور احیائے قلب کا کارنامہ جس جوش و خروش سے خواجہ تونسوی کے خلیفہ اعظم خواجہ شمس الدین سیالوی نے انجام دیا اس کو بھلایا نہیں جا سکتا۔

خواجہ صاحب کے آبا و اجداد پشتہا پشت سے دنیاوی وجاہت اور علم دونوں میں بڑے ممتاز تھے۔ حضرت کے جدِ اعلیٰ حضرت شیر کرم علی سلسلہ قادریہ کے ایک شہبازِ لامکانی حضرت موسیٰ پاک شہید ملتانی کے خلیفہ تھے۔ آپ نے پشاور میں ایک فاضلِ روزگار سے علم کی تکمیل کی۔ وہاں سے اپنے مرشد کی معیت میں حج بیت اللہ شریف کی سعادت سے بہرور ہوئے۔ پھر محبوبِ خدا سرکارِ دو عالم کے آستانہ پر حاضری دی۔ بارہ سال تک نعمت حضوری سے لطف اندوز ہوتے رہے پھر بارگاہِ نبوی سے بغداد جانے کا حکم ملا۔ کچھ عرصہ حضرت سیدنا غوث الاعظم محبوبِ سبحانی رحمۃ اللہ علیہ کے در کرم پر محوِ ریاضت رہے۔ حضرت غوث پاک نے عالمِ خواب میں آپ کا ہاتھ حضرت موسیٰ پاک شہید کے ہاتھ میں دے دیا۔ وہاں سے ملتان پہنچے۔ مرشد کامل بڑی شدت سے آپ کے منتظر تھے۔ فوراً سینہ سے لگایا۔ شرفِ بیعت بخشا اور خرقۂ خلافت سے

فرمایا بعرصہ تک مجاہدہ و ریاضت میں مشغول رہے اس وقت آپ کی عمر مبارک نوّے سال تھی۔ پیر کامل نے وطن واپس جانے اور شادی کرنے کا حکم دیا۔ ایک عظیم المرتبت فرزند کی بشارت دی۔ آپ اپنے آبائی وطن قصبہ دھول پہنچے مگر وہاں اب آپ کو کوئی پہچاننے والا موجود نہ تھا۔ تمام عزیز و اقارب اس دُنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ نئی نسل کو آپ کے متعلق خبر تک نہ تھی۔ چنانچہ وہاں سے رُخصت ہو کر ایک جنگل میں قیام فرمایا اور وہاں سیال نامی ایک بستی آباد کی۔ جس کے مقدر میں اس علاقہ کی تاریخ کو نیا عنوان بخشا جانا تھا۔

چنانچہ اسی فرخندۂ روزگار کی نسل پاک سے ۱۲۱۴ھ کو سیال شریف (ضلع سرگودھا) میں معرفت کے تاجدار خواجہ شمس الدین تولد ہوئے۔ حضرت کے والد بزرگوار کا اسم گرامی میاں محمد یار ابن میاں محمد شریف ابن میاں برخوردار بن میاں تاج محمود بن میاں شیر کرم علی علیہم الرحمۃ و الغفران ہے۔ حضرت خواجہ صاحب کا سلسلہ نسب پچاس واسطوں سے حضرت عباس علمدار شہید کربلا سے جا ملتا ہے۔

آپ کی والدہ ماجدہ کا اسم گرامی حضرت جنت بی بی تھا۔ آپ لوہلہ گاؤں کی رہنے والی تھیں جو سیال شریف سے ایک میل کے فاصلہ پر ہے۔ آپ قرآن پاک کی حافظہ تھیں۔ عبادت و ریاضت میں شب و روز مصروف رہتیں۔ آپ نے ایک درس قرآن جاری کر رکھا تھا جس میں بچیاں قرآن کریم یاد کرتی تھیں آپ خود تدریس کے فرائض سرانجام دیا کرتیں۔ آج بھی موضع لوہلہ میں عورتیں بکثرت حافظ قرآن ہیں۔ یہ آپ ہی کا فیضان ہے کہ جب اس نور ولایت کی امانت آپ کے بطن مبارک میں منتقل ہوئی تو ذکر و عبادت کے معمولات میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ شب و روز بکثرت درود شریف زبان پر جاری تھا۔ سونے سے پہلے ہر شب اکتالیس بار سورۃ یٰسین تلاوت فرماتیں۔ تین ہمشیرگان کے بعد حضرت میاں محمد یار کے ہاں وہ آفتاب ولایت طلوع ہوا جس نے ان گنت سیاہ بختوں کو بلند اقبال کیا۔ بے شمار غافلوں کو ذکر الٰہی کی لذت سے بہرہ ور کیا۔ جس کی توجہ سے ہزاروں سالکانِ راہ محبت کو وصل تک رسائی نصیب ہوئی۔

آپ کے چچا حضرت میاں احمد یار صاحب کی شادی لالی قوم کی ایک خاتون سے ہوئی تھی۔ ان محترمہ کے والد روشن ضمیر درویش تھے۔ ان کا اسم گرامی میاں نور نبی تھا۔ ایک دفعہ وہ اپنی بچی سے ملنے کے لیے سیال شریف آئے۔ اس وقت حضرت کم سن تھے مگر آنگن میں گھٹنوں کے بل چل رہے تھے۔ آپ کی جبین سعادت پر جونہی نگاہ پڑی از راہ ادب کھڑے ہو گئے۔ کسی نے پوچھا اس چھوٹے بچے (خواجہ شمس الدین) کے سامنے ایسی تعظیم بجالانے کا کیا مطلب؟ اس درویش نے جواب دیا۔

"تم اس بچے کی شان کو نہیں پہچانتے۔ اس کی پیشانی پر اسم اعظم لکھا ہے۔ جب یہ اپنے مرتبۂ کمال پر فائز ہو گا تو اپنے روحانی فیوض و کمال سے ایک عالم کو سیراب کر دے گا اور اس کے دروازے پر بڑے بڑے باکمال اہل بصیرت دست بستہ کھڑا ہونا باعث سعادت سمجھیں گے"۔ پھر میاں نور نبی صاحب نے اپنی بیٹی کو کہا کہ میں نے دعا مانگی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں بچی عطا فرمائے۔ تم اپنی بچی کا رشتہ اس کو دینا تاکہ قیامت کے روز میں بھی اس مردِ کامل کے رشتہ داروں میں اٹھایا جاؤں۔

❋

خواجہ صاحب کو عام بچوں کی طرح کھیل کود سے کوئی شغف نہ تھا۔ اُن کے والد نے قرآن مجید ختم کر لیا۔ بعد ازاں وہ اپنے ماموں میاں احمد الدین کے ساتھ میکی ڈھوک (پنڈی گھیپ) تشریف لے گئے جہاں چند ماہ

میں انہوں نے نام حق اور کریما وغیرہ۔ کتابیں پڑھلیں ۔ پھر وہ مکھڈ چلے گئے۔ لیکن طالب علمی کے زمانہ میں بھی جس صاحب کمال نے آپ کو دیکھا حیرت زدہ ہو کر رہ گیا۔ کبھی کبھی آپ مکھڈ سے اپنے والدین کی ملاقات کے لیے تشریف لایا کرتے تو دین پور کے قصبہ سے گزر ہوتا۔ وہاں ایک باکمال بزرگ میاں محمد اکرم صاحب رہا کرتے تھے جب وہ اس نوجوان کو دیکھتے تو تعظیم کے لیے کھڑے ہو جاتے اور رخصت کے لیے کافی دور تک دین پور سے باہر آتے۔

آپ کے ایک خادم نے سوال کیا کہ آپ اس نوجوان کی شاید اس لیے تکریم کرتے ہیں کہ وہ میاں شیر کرم علی صاحب کی اولاد میں سے ہے۔

میاں اکرم صاحب نے فرمایا کہ تم سلطان ولایت کے اس گوہر تاباں کی قدر نہیں جانتے۔ ایک دن آئے گا جب یہ نوجوان اقلیم فقر کا فرمانروا ہوگا اور اس کی عظمت کا ڈنکا چار دانگ عالم میں بجے گا۔ بڑے بڑے باکمال لوگ یہاں حاضر ہو کر اپنی منزل مراد کو پائیں گے۔ میاں کرم علی صاحب جیسے بزرگ اور میرے ایسے لقمہ خوار ہزاروں اس کے آستان پر دربان ہوں گے۔

مکھڈ میں مولانا محمد علی کے علم و فضل کا بڑا شہرہ تھا۔ خواجہ صاحب تیرہ برس تک ان کی خدمت میں رہ کر تحصیل علم ــــ کرتے رہے اور اپنے علمی ذوق و شوق کے باعث امتیازی حیثیت اختیار کر گئے۔ مولوی صاحب کو بھی ان کی ذہانت اور علمی انہماک نے بڑا متاثر کیا اور وہ خواجہ صاحب پر خصوصی توجہ دینے لگے۔ کھانے کے وقت دسترخوان پر اپنے ساتھ کھانا کھلاتے اور علمی مسائل پر گفتگو کرتے۔ ان علمی صحبتوں سے خواجہ صاحب کی دبی ہوئی صلاحیتیں بیدار ہو گئیں اور مزید علم حاصل کرنے کا شوق تیز تر ہو گیا۔ اتفاق سے انہی دنوں خواجہ صاحب کو کابل جانے کا موقع مل گیا۔ وہ اس طرح کہ محمد امین نامی ایک تاجر نے جو بسلسلہ تجارت افغانستان جانے والے تھے مولوی صاحب سے درخواست کی کہ وہ حصول برکت کے لیے خواجہ شمس الدین کو ان کے ساتھ بھیج دیں۔

مولوی صاحب نے خواجہ صاحب سے مشورہ کیا اور ان کی رضامندی کے بعد انہیں میاں محمد امین کے ساتھ افغانستان روانہ کر دیا۔ یہاں محمد امین کو کافی عرصہ رکنا پڑا۔ خواجہ صاحب نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور کابل کے معروف و متبحر عالم دین حافظ دراز صاحب سے ہدایہ شریف پڑھی اور حدیث شریف کی سند بھی حاصل کی۔ کابل سے تحصیل علم کے بعد خواجہ صاحب مکھڈ واپس آئے تو یہاں مولوی علی محمد صاحب کی کیفیت بھی بدل چکی تھی اور وہ کسی مرشد کامل کے متلاشی تھے۔ وہ دن رات روتے اور دعائیں کرتے کہ کوئی رہبر راہ حقیقت مل جائے جو قلب کی تسکین کا سامان کر سکے۔ ادھر شاگرد ارجمند کا بھی یہی حال تھا۔ علوم ظاہر تو حاصل کر چکے تھے اب باطنی تعلیم و تربیت کا شوق موجزن تھا۔

جب مولانا مکھڈی مرشد کی تلاش کے لیے روانہ ہوئے تو خواجہ شمس الدین کو بھی ساتھ لے لیا۔ اس وقت خواجہ صاحب کی عمر اٹھارہ برس تھی۔ انہی دنوں کسی اہل دل سے انہوں نے حضرت خواجہ شاہ محمد سلیمان تونسوی رحمۃ اللہ علیہ کی تعریف سنی۔ زیارت کا شوق بڑھا تو یہ استاد و شاگرد دونوں حضرت خواجہ صاحب تونسوی کی زیارت کے لیے تونسہ شریف روانہ ہو گئے۔

ہمارے گرامی قدر عالم دین جناب پیر کرم شاہ نے خواجہ شاہ محمد سلیمان تونسوی سے ان کی بیعت کا حال بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔

.... دونوں قبلہ عالمیان شہنشاہ اقلیم ولایت حضرت شاہ محمد سلیمان رحمۃ اللہ علیہ کے درِ اقدس پہنچے۔
"حضور نے پوچھا۔" کہاں سے آئے ہو؟" عرض کی مکھڈ سے۔ مزید استفسار فرمایا۔ "مولوی صاحب بخیریت
تھے؟" عرض کی کہ وہ خاکسار مَیں ہی ہوں۔ حضور نے اُٹھ کر گلے سے لگا لیا اور بڑی عزت و تکریم کی رہائش
کے لیے اُنہیں ایک الگ حجرہ مرحمت فرمایا۔

مولانا تو اپنی اقامت گاہ پر فروکش ہو گئے۔ لیکن شمس معرفت (حضرت خواجہ شمس الدین سیالوی) حضرت
پیر پٹھان کو دیکھتے ہی ہزار جان اور ہزار دل سے فریفتہ ہو گئے اتنا یارائے صبر بھی نہ رہا کہ اپنے استادِ محترم
کا انتظار کریں۔ موقع ملتے ہی بارگاہِ ناز میں حاضر ہوئے اور بیعت کے لیے گزارش کی۔ مرشد کامل نے از راہِ عنایت
و بندہ نوازی شرفِ بیعت سے سرفراز فرمایا اور نمازِ مغرب کے بعد نفل اوابین اور حفظ الایمان اور سبحانک کے
بعد دس دس مرتبہ درود پاک پڑھنے کا حکم دیا اور فرمایا سردست تمہارے لیے اتنا وظیفہ کافی ہے جب تحصیل علم
سے فراغت پا کر آؤ گے۔ اس وقت مزید کرم فرمایا جائے گا۔ اس سعادتِ ازلی سے بہرہ ور ہو کر اپنے استادِ
محترم کے پاس حاضر ہوئے اور آرام فرمایا۔

مولانا نے چند روز توقف کے بعد بیعت کے لیے عرض کی۔ حضور نے فرمایا "آپ بہر وجہ افضل و اکمل ہیں
آپ کا علم و فضل مشہور عالم ہے۔ آپ کو اس فقیر سے بیعت کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

حضرت مولانا نے بصد ادب و نیاز عرض کی کہ قبلہ! مَیں نے علم اس لیے تو نہیں پڑھا کہ یہ محرومی کا باعث ہو
ورمَیں اس نعمتِ سرمدی سے بے بہرہ رہوں! مَیں نے علم ہدایت پذیری کے لیے پڑھا ہے۔ اس لیے حضور اس
اکسار پر نظر کرم فرمائیں اور مجھے اپنی غلامی کی عزت سے محروم نہ رکھیں۔ علم و فضل کے باوجود مولانا کی اس نیازمندی
دحضور نے بہت پسند فرمایا اور کچھ پڑھنے کی تلقین فرمائی۔ ان وظائف کے پڑھنے سے مولانا کے دل کی پہلی
مغائی جاتی رہی۔ ذوق و شوق کی جو چنگاری سُلگ رہی تھی وہ پھر سرد پڑ گئی۔ آپ اس صورتحال سے بڑے
زردہ ہوئے اور اپنی کیفیت عرض کی۔

حضرت پیر پٹھان نے فرمایا کہ "ایک لدے تے بیا آوے" یعنی ایک رخصت ہو تو دوسرا آئے۔ آپ کے پہلے
اردات رخصت ہوں گے۔ تب نئی کیفیات کا ورود ہو گا۔ چنانچہ کچھ عرصہ بعد مولانا کے دل میں درد و سوز اور ذوق
شوق کی وہ کیفیت پیدا ہو گئی جس کا بیان زبانِ قلم سے ممکن نہیں۔

مولانا نے چھ ماہ تک شہباز لامکانی کے آستانہ عالیہ پر قیام کیا۔ نعمتِ دیدار، توجہ باطنی اور کرمہائے بے پایاں
سے محظوظ ہوتے رہے۔ چھ ماہ بعد حضور نے آپ کو طلب فرمایا۔ بیعت بھی کیا اور نعمتِ باطنی سے بھی مالا مال کر کے
نر خلافت بھی مرحمت فرمایا اور واپس مکھڈ جانے کی اجازت دی۔" (ضیائے حرم مارچ ۱۹۷۲ء)

مولوی محمد علی کی اولاد نہ تھی۔ اب مکھڈ واپس آئے تو اپنا تمام اثاثہ خواجہ صاحب کے حوالے کر دیا اور مدرسہ کا
نظام والنصرام بھی انہی کے سپرد کر دیا۔

ادھر سیال شریف میں خواجہ صاحب کے والدین ایک عرصہ سے اُن کے فراق میں تڑپ رہے تھے۔ اُن کی
تمنا تھی کہ وہ جلد اپنے بیٹے کی شادی کی مسرتیں دیکھیں۔ جب خواجہ صاحب شادی کی ذمہ داریاں قبول کرنے
کو آمادہ نہ ہوئے تو ان کے والد ماجد نے حضرت خواجہ صاحب تونسوی کو عریضہ لکھا اور امداد کی درخواست کی۔
تونسوی نے مولوی صاحب کو لکھا:

"مولویا! تُو نے اس فقیر کو کیوں اسیر کر رکھا ہے، اس کو فوراً باپ کے پاس بھیج دے۔" اور ساتھ ہی خواجہ

صاحب کو ہدایت فرمائی کہ وہ فوراً سیال شریف چلے جائیں اور والدین کے حسب منشا نکاح سے فراغت حاصل کریں۔
مرشدِ کامل کا حکم ملتے ہی خواجہ صاحب سیال شریف کے لیے روانہ ہو گئے جہاں پہنچتے ہی انہوں نے چچا میاں
احمد یار کی دختر کے ساتھ ان کا نکاح کر دیا۔ اس وقت خواجہ صاحب کی عمر ۲۴ سال تھی۔

نکاح کے بعد خواجہ صاحب نے سیال شریف میں مستقل قیام کا ارادہ فرمایا اور وہیں درس و تدریس اور عبادت و
ریاضت میں مشغول ہو گئے۔ اس کے علاوہ سال میں کئی مرتبہ پاپیادہ منزل جاناں کی زیارت کے لیے آتے اور کم سے
کم چالیس روز قیام فرماتے۔ جب بتقاضائے عمر ظاہری قوت کمزور ہوئی تو بامر مجبوری سوار ہو کر تونسہ شریف حاضر ہوتے
اپنے مرشد کو خدمت اور غلامی کو سرچشمہ سعادات و برکات یقین کرتے۔ چودہ مرتبہ حضرت پیر پٹھان کی معیت
میں تونسہ مقدسہ سے مہار سدا بہار کا سفر کیا اس شان سے کہ حضور ایک تیز رفتار گھوڑی پر سوار ہوئے یہ پیکر صدق و وفا
اپنے مرشد کا قرآن کریم مع رحل اور دیگر وظائف سر پہ رکھے۔ پانی کا بھرا ہوا کوزہ دائیں ہاتھ میں حضور کا عصا اور
مصلی بغل میں لیے بادۂ محبت سے سرشار ہو کر حضرت کی گھوڑی کے آگے آگے دوڑتے۔ لوگ اس حسین و رعنا نوجوان کے
جسم نازک اور اس پر یہ مشقت۔ جفاکشی، پھر شوق و مستی کا عالم اور ہمت کی بلندی کا مشاہدہ کر کے دنگ رہ جاتے دیکھنے
والا ایک نظر سے پہچان جاتا کہ یہ کس منزل کا مسافر ہے اور اس کی ۔۔۔ آنکھیں کس کے دردِ محبت کی غمازی کرتی ہیں
تونسہ شریف سے مہار شریف ایک سو کوس یعنی ایک سو پچاس میل کی مسافت ہے اس زمانہ میں تقریباً سارا علاقہ
جنگل بیابان یا چٹیل ریگستان تھا۔ پانی نایاب۔ آبادیاں خال خال۔ سڑکیں اور شاہراہیں مفقود۔ ایک دفعہ حضرت پیر
پٹھان قدس سرہٗ دیارِ محبوب کی طرف روانہ ہوئے۔ گرمی کا موسم تھا۔ نوجوان سیال بڑے ذوق و شوق سے وجد کناں
اپنے مرشد کی گھوڑی کے آگے دوڑتے جا رہے تھے۔ آپ برہنہ پا تھے۔ ریشم سے نرم و نازک پاؤں کے تلوں میں
کانٹے چبھتے۔ آبلے بنتے رہے اور دھوپ قیامت ڈھا رہی تھی۔ زمین تپ رہی تھی۔ اس کے باوجود اس بلند اقبال
اور اولوالعزم نوجوان کے ذوق و شوق میں ذرا فرق نہیں آ رہا تھا۔ اچانک مرشد کامل نے آپ کو اس حالت میں
دیکھا تو کھڑا ہونے کا حکم دیا۔ اپنی پاپوش مبارک اتار کر آپ کو دی کہ اسے پہن لو تا کہ گرم ریت راہ میں بکھرے
ہوئے کانٹے اور سنگریزے نہ چبھیں۔ آپ نے اس تحفہ کو بصد شکریہ قبول کیا اور چوم لیا۔ لیکن پاؤں میں پہننے
کی بجائے اپنے سر کا تاج بنا لیا۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد پھر حضرت پیر پٹھان نے آپ کو حسب سابق ننگے
پاؤں دیکھا اور پوچھا جوتے کہاں ہیں۔ جو ان کا صحیح مقام تھا۔ میں نے انہیں وہاں سجا لیا ہے۔ حضرت اس جذبہ
نیاز مندی پر از حد مسرور ہوئے۔ اپنی گھوڑی سے نیچے اترے اور اپنے جواں بخت مرید کو اپنے سینے سے لگا
لیا۔ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ اسرار معارف کے خزینے بخش دیے۔

حضرت پیر سیال فرمایا کرتے کہ میں نے اپنے مرشد کی خدمت میں چودہ سال کا طویل عرصہ اس انتظار میں گزارا کہ
کوئی رحمت کی گھڑی آئے اور لطف خسروانہ ابر کرم بن کر برسے۔ اتنے عرصہ میں مجھے دو بار یہ خصوصی تحفے نصیب
ہوئے اس وقت آپ ایک اسی واقعہ کا ذکر کرتے ہیں اور دوسرا زیارت خضر کا واقعہ جس کا بیان آ رہا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ جب تک اپنے مرشد کے ساتھ اتنی والہانہ عقیدت نہ ہو۔ افادہ اور استفادہ کا دروازہ نہیں
کھلتا۔ طالب کو گوہر مقصود ہاتھ نہیں آتا۔ اپنے شیخ سے کامل درجہ کی محبت نے باطن کو تو ہم رنگ کر ہی دیا تھا
ظاہری شکل و صورت میں بھی ایسی مماثلت پیدا ہو گئی تھی کہ حضرت کو دیکھنے والا یہ سمجھتا تھا کہ اسے حضرت خواجہ شاہ محمد
سلیمان تونسوی کی زیارت کی ہے۔ آپ اپنی زندگی کے آخری حصہ میں جب تونسہ شریف حاضر ہوئے تو آستانہ عالیہ
کے تالاب پر تشریف فرما تھے۔ جس نے دیکھا یہی سمجھا کہ خود حضرت پیر پٹھان تشریف فرما ہیں۔ کسی خادم نے دو

ضرت خواجہ کریم تونسوی کی خدمت میں گزارش کی کہ قبلہ! میں اپنی آنکھوں سے حضرت پیر پٹھان کو تالاب پر بیٹھے دیکھ کر آیا ہوں۔ حضرت خواجہ کریم نے سن کر فرمایا۔ پتہ چلتا ہے کہ مولوی صاحب سیالاں والے آ گئے ہیں۔ ایک دفعہ حضرت پیر پٹھان کے پوتے حضرت خواجہ خیر محمد صاحب سیال شریف تشریف لائے اور حضرت باوجود ضعف پیری اور نقاہت کے اپنے شیخ کے پوتے کی خدمت میں دن میں کئی بار حاضر ہوتے اور کافی دیر زانو شکستہ دست بستہ بیٹھے رہتے۔ اس اثنا میں حضرت صاحبزادہ صاحب آپ کے چہرہ انور کو بڑے غور سے دیکھتے رہتے۔ ایک دن صاحبزادہ صاحب نے ارشاد فرمایا کہ جب سے ہمارے جدّ امجد خواجہ محمد سلیمان صاحب کا انتقال ہوا ہے تب سے حضرت خواجہ سیالوی کی زیارت سے ہمارے دل کو اطمینان نصیب ہوتا ہے کیونکہ ہمارے جدّ امجد اور خواجہ سیالوی کی صورت اور سیرت میں ایک بال کا فرق نہیں۔

بعض حضار مجلس نے یہ کلمات طیبات اعلیٰ حضرت سیالوی کی خدمت میں حضرت کہے لیکن حضرت نے ازراہِ کسر نفسی فرمایا مورچہ (چیونٹی) کو سلیمان کے ساتھ کیا نسبت ہے۔

خاک درِ لطفِ سلیمان پہ یہ پیشانی ہے
چشم اس مور کی بر لطف سلیمانی ہے

میاں حفیظ ماہی صاحب ساکن سور کی شریف، حضرت مولانا سلطان محمود صاحب ساکن ناڑہ، دونوں حضرت پیر پٹھان کے جانثار مرید تھے۔ حضرت پیر پٹھان کے انتقال کے بعد ان کی دنیا تاریک ہو گئی۔ نہ رات کو آرام، نہ دن کو قرار۔ ہجرِ محبوب میں ہر وقت رویا کرتے۔ ایک رات حضرت پیر پٹھان نے میاں حفیظ ماہی صاحب کو خواب میں ارشاد فرمایا کہ تم روتے کیوں ہو۔ میں تو اب تمہارے نزدیک سیالاں میں رہتا ہوں۔ آپ بیدار ہوئے۔ اسی وقت بستر باندھا سر پر رکھا اور سیال شریف کی طرف چل پڑے۔ راستہ ہی میں اپنے پیر بھائی مولانا سلطان محمود صاحب کے پاس سے گزرے دیکھا وہ بھی بستر باندھے بیٹھے ہیں اور آمادہ سفر ہیں آپ نے پوچھا حضرت کہاں کی تیاری ہے۔ فرمایا رات کو میرا دل از حد سوگوار تھا۔

روتے روتے آنکھ لگ گئی۔ حضرت پیر پٹھان نے شرفِ زیارت بخشا اور فرمایا مولوی صاحب آپ اتنا کیوں روتے ہیں۔ میں تو اب تمہارے بالکل قریب سیالاں میں آ گیا ہوں۔ بعینہٖ یہی خواب حفیظ ماہی صاحب دیکھ کر روانہ ہوئے تھے۔ انھوں نے بتایا۔ بخدا مجھے بھی آج رات یہی حکم ملا ہے۔ چنانچہ دونوں حضرت پیر سیال کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ کے روئے تاباں کی زیارت سے ان کے غمزدہ دلوں کو قرار آ گیا اور پھر ساری عمر حضرت پیر سیال کی محبت کا دم بھرتے رہے۔ حضرت نے ان کو خلافت عطا فرمائی۔

جب حضرت پیر سیال کی عمر مبارک چھتیس برس ہو گئی اور زہد و ریاضت سے سینہ گنجینہ نور بن گیا تو شاہ شاہان خواجہ محمد سلیمان قدس سرہٗ نے خرقہ خلافت ارزانی فرمایا اور ساتھ ہی ہدایت کی کہ میں تجھے گم کردہ راہوں کو راہ ہدایت پر لانے کے لیے آوارگانِ دشت محبت کو منزلِ محبوب تک پہنچانے کے لیے بیعت اور خلافت کی اجازت دیتا ہوں۔ آپ نے بصد نیاز عرض کی کہ مخدوما میں اس بارِ گراں کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ مجھے اس سے معذور سمجھا جائے۔ حضرت نے فرمایا کہ "تو کہاں ہے جب تو میں ہو گیا تو پھر تو کہاں رہا۔ تیرے ہر کام کا میں ذمہ دار ہوں۔ اپنے آپ سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے تجھے اس کا مجاز کرتا ہوں۔ چنانچہ ظاہری و باطنی انعامات سے سرفراز فرما کر گھر رخصت کیا اور روانگی کے وقت سخت تاکید کی کہ جس فیض کا تمہیں امین اور جس خزینہ سعادت کا تجھے قاسم مقرر کیا گیا ہے اس سے کوئی محروم واپس نہ جائے۔ جو بیعت کا خواہش مند ہو کر آئے اس کی دستگیری ضرور کی جائے۔

جب دوبارہ اپنے مُرشد کی خدمت میں حاضر ہوئے تو دریافت فرمایا کہ کیا کسی کو بیعت کیا ہے۔ عرض کی صرف میرے والدین نے میری بیعت کی ہے اس کے علاوہ اور کوئی بیعت نہیں ہوا۔ حضرت پیر پٹھان نے جلال میں آکر فرمایا کہ میں نے تو تجھے شاہباز بنایا ہے۔ سارا عالم تیرا صید زبوں ہے۔ اپنی ہمت خداداد کو مخلوق خدا کی رشد و ہدایت میں صرف کر۔ ایک دفعہ حضرت پیر پٹھان تشریف فرما تھے۔ مشتاقان دید کا ہجوم تھا۔ اس اثناء میں ایک نورانی پیکر بزرگ حاضر ہوئے اور کچھ دیر محو گفتگو ہو کر رخصت ہو گئے۔ جب وہ تھوڑا سا دُور گئے تو حضرت نے حاضرین مجلس کو کہا کہ جس شخص کے دل میں خضر کی زیارت کا شوق ہو۔ وہ جائے اور زیارت کرے یہی خضر تھے جو یہاں سے ابھی اُٹھ کر گئے ہیں۔ لوگ دیوانہ وار خضر کی زیارت کرنے کے لیے دوڑ پڑے لیکن حضرت پیر سیال وہیں بیٹھے رہے حضور نے فرمایا۔ مولوی صاحب کیا تمہیں خضر کی زیارت کرنے کا اشتیاق نہیں۔ عرض کی میں تو اس کی زیارت کروں گا جس کی زیارت کے لیے خضر آتا ہے۔ حضرت پیر پٹھان حضور کی اس سعادت مندی اور خلوص پر بڑے خوش ہوئے اور دُعا فرمائی" اللہ سائیں میرے سیال نوں رنگ لائیں" اے اللہ تعالیٰ میرے اس مرید با صفا کو ابدی عزت و سعادت سے سرفراز فرما۔ اس دُعا کا یہ اثر ہوا کہ شرق و غرب سے لوگ کسب فیض کے لیے پروانہ وار سیال شریف آنے لگے۔ آپ کو اپنے شیخ کا اتنا احترام ملحوظ تھا کہ تونسہ شریف کی حدود میں قضاء حاجت نہیں اور تین میل دور تشریف لے جاتے

ایک دفعہ آپ سیال شریف سے تونسۂ مقدسہ زیارت شیخ کے لیے جا رہے تھے۔ راستہ میں ایک جنگل سے گزر ہوا وہاں ایک نورانی شکل بزرگ سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے فرمایا کہ درود اکبریت احمد پڑھا کرو۔ آپ نے جواب دیا کہ میرے لیے میرے پیر کا فرمان کافی ہے۔ تونسہ شریف حاضر ہوئے تو مرشد کریم نے فرمایا کہ راستہ میں تمہیں ایک آدمی ملا تھا اس نے جو وظیفہ بتایا ہے۔ وہ پڑھا کرو وہ حضرت پیران پیر دستگیر حضرت غوث الاعظم تھے۔ یہ درود پاک (کبریت احمد) اس سے پہلے طریقۂ چشتیہ کے ادوار میں شامل نہ تھا حضرت پیر سیال کے ذریعہ یہ نعمت عظمیٰ چشتیہ سلسلہ کو نصیب ہوئی۔

اعلیٰ حضرت سیالوی پھر اس کی تلاوت پر مداومت فرمایا کرتے آں والا مرتبت نے معہودہ طریقہ کے مطابق اس کی زکوٰۃ بھی دی اس کے اختتام پر بارگاہِ رسالت سے آپ پر خصوصی کرم ہوا۔

میری خصوصی درخواست پر شیخ الاسلام حضرت خواجہ محمد قمر الدین سجادہ نشین سیال شریف نے یہ واقعہ اپنی زبان مبارک سے یوں بیان کیا۔

مجھے مولانا محمد امین صاحب ٹکوچی نے بتایا کہ حضرت مولانا معظم الدین صاحب مولوی کبریت احمد کی زکوٰۃ کے ایام میں خدمت عالی میں حاضر رہا کرتے اور ہر طرح کی خدمات بجالاتے۔ انہوں نے اپنا چشم دید واقعہ یوں بیان کیا کہ اعلیٰ حضرت نے سیال شریف سے باہر مغرب کی طرف ایک جگہ کو کبریت احمد شریف کی زکوٰۃ کے لیے منتخب فرمایا۔ میری ڈیوٹی یہ تھی کہ میں کسی کو اس خلوت میں مخل نہ ہونے دوں۔ چنانچہ جس روز زکوٰۃ کا اختتام تھا چاشت کا وقت تھا آپ تلاوت میں مصروف تھے۔ میں کافی پیچھے ہٹ کر بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک ایک اندھیرا سا ہوا جیسے صبح صادق کا وقت ہو اسی اثنا میں چند گھڑ سوار آسمان کی طرف سے اُترے۔ حضرت نے آگے بڑھ کر ایک شاہسوار کی قدم بوسی کی یہ حضور نور مجسم سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ستودہ صفات تھی۔ حضور کے دست مبارک میں ایک دستار تھی جو آپ کے سر پر باندھی گئی۔ اس عزت سے مشرف کرنے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ میں نے حاضر خدمت ہو کر اس عزت افزائی پر مبارک باد عرض کی۔ اعلیٰ حضرت نے دریافت

فرمایا کہ آپ نے بھی زیارت کی ہے۔ میں نے عرض کیا آپ کے صدقے مجھے بھی یہ عزت نصیب ہوئی ہے۔ حضرت نے مجھے تاکید کی کہ میں اس واقعہ کا کسی کے سامنے ذکر نہ کروں۔

جب تک حضرت پیر سیال اس جہانِ فانی میں جلوہ افروز رہے مرید صادق نے اس راز کو افشا نہیں کیا لیکن آنجناب کے وصال کے بعد آپ نے مناسب نہ سمجھا کہ اپنے مرشد کے اس کمال کو مخفی دیکھیں اس لیے آپ نے اصحاب سے اس کا تذکرہ فرمایا۔

حضرت کا اندازِ تبلیغ و ارشاد بالکل نرالا تھا۔ اسوۂ نبوت کا کامل نمونہ مناظرہ مجادلہ بحث و تکرار کا تو وہاں گزر ہی نہ تھا جو بات فرماتے محبت و پیار کے رنگ سے رنگی ہوتی اور بڑے سے بڑا جھگڑالو مدمقابل بھی خلوص کی تاب سے از خود رفتہ ہو کر سرِ نیاز قدموں میں رکھ دیتا۔ بڑے بڑے علماء و فضلا مناظرہ کرنے کے لیے حاضر ہوئے اور ناوکِ نگاہ کی تاب نہ لا کر ہمیشہ کے لیے غلام بے دام بن کر رہ گئے۔ بے شمار ایمان افروز واقعات سے ایک روح پرور باتیں آپ بھی سن لیں۔ تحصیل خوشاب میں آنگہ ایک مشہور قصبہ ہے۔ قاضی سلطان محمود صاحب کا زمانہ تھا آپ کے علم و فضل کی شہرت دور دراز علاقوں میں پہنچ چکی تھی۔ آپ کے متبحرِ علمی کے باعث علماء عصر آپ کو استادِ کل کہا کرتے ان کے فضل و کمال کی بلندی کا اندازہ لگانے کے لیے صرف یہ کہہ دینا ہی کافی ہے کہ حضرت قبلہ پیر مہر علی شاہ صاحب آپ کے شاگرد تھے۔ حضرت کئی سال تک آنگہ میں قیام پذیر رہے اور آپ کے چشمۂ علوم و معارف سے سیراب ہوتے رہے۔

قاضی صاحب مذکور کو پتہ چلا کہ ان ہی کے ضلع شاہ پور میں سیال کے مقام پر ایک فقیر ظاہر ہوا ہے جو سماع سنتا ہے اور لوگ جوق در جوق اس کے مرید بنتے جا رہے ہیں۔ قاضی صاحب کی تحقیق کے مطابق سماع شریعت میں ناجائز تھا۔ ان کی ایمانی غیرت یہ گوارہ نہ کر سکی کہ ان کے علاقہ میں خلافِ شریعت فعل کو اتنا فروغ نصیب ہو۔ چنانچہ ایک گدھے پر اپنی کتابوں کے انبار لادے اور مناظرہ کرنے کے ارادے سے سیال شریف روانہ ہوئے وہاں اپنے معتقدین اور ساز و سامان کے ساتھ ایسے وقت پہنچے جب حضرت شمس العارفین اپنی مجلس آراستہ کیے ہوئے معرفت کے موتی لٹا رہے تھے قاضی صاحب نے آؤ دیکھا نہ تاؤ آدابِ مجلس کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے کہنے لگے کہ میں نے سنا ہے کہ آپ شریعت کی خلاف ورزی کرتے ہیں اور ایسے کام کرتے ہیں جو شرعاً ممنوع ہیں۔ حضرت نے قاضی صاحب کی آواز سن کر بڑے تحمل سے فرمایا۔ قاضی صاحب میری گردن بلکہ میری سات پشتوں کی گردنیں شریعت کے سامنے جھکی ہوئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ مجھے خلافِ شریعت کام کرنے سے بچائے یہ جواب سننے کے بعد قاضی صاحب تھوڑی دیر خاموش بیٹھے رہے۔ پھر وضو کرنے کے لیے مشرقی کنواں پر تشریف لے گئے۔ ان کے چلے جانے کے بعد حضرت نے قوالوں کو اشارہ کیا تو انہوں نے پنجابی کے بولوں سے محفل سماع کا آغاز کیا۔

جھنگ کنوں دل تنگ ہیوسے پیچھاں ہزار سے ریاں داماں
میرے ماہی دیاں مٹھیاں باتاں جیوں کھنڈ شکر نباتاں

قاضی صاحب سماع کی آواز سن کر غصے سے دوڑتے ہوئے آئے۔ بار بار کہہ رہے تھے۔ پھر بھی آپ باز نہ آئے۔

جب قاضی صاحب قریب پہنچے تو حضرت نے ایک بار نگاہ بھر کر دیکھا ان پر وجد کی کیفیت طاری ہوگئی غش کھا کر گرے اور ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگے اور قوال برابر ان بولوں کو دہرا دہرا کر قاضی صاحب

کی آتش شوق کو بھڑکا رہے تھے۔ قاضی صاحب بہت بڑی دستار باندھا کرتے تھے جو ان کے علم و فضل کی گواہی دیتی تھی۔ اس مستی و شوق میں اپنی دستار سر سے اُتاری اور قوالوں کو جا کر نذر کر دی۔ اس محفل پر کیف و مستی کا جو رنگ چڑھا ہو گا اس کی ماہیت کیونکر بیان کی جا سکتی ہے۔ قوال اس بول کا تکرار کرتے تو آپ تڑپتے اور یہ نعرہ لگاتے۔

حق او یار و حق ! حق او یار و حق

حضرت ثانی غریب نواز اس محفل پاک میں حاضر تھے جب قاضی صاحب نے اپنی دستار قوالوں کو نذر کی تو آپ چپکے سے اُٹھ کر گھر تشریف لے گئے۔ گھر میں سونے چاندی کے جتنے زیورات تھے سب اُٹھا کر لائے اور قوالوں کو پیش کر کے ان کے عوض قاضی صاحب کی دستار ان سے لے لی اور فرمایا یہ عالم کی دستار ہے اور اسی کے سر پر زیب دیتی ہے۔ پھر قاضی صاحب کے سر پر وہ دستار باندھ دی۔ اعلیٰ حضرت غریب نواز اپنے فرزند دلبند کی اس اداشناسی پر بڑے مسرور ہوئے اور آپ کو دعاؤں سے نوازا۔

مردانِ خدا مناظرہ کے اکھاڑوں کو یوں اپنی چشم کرم سے عشق و محبت کے خیاباں میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ اس قسم کے واقعات شاذ و نادر ہی نہیں بلکہ ہر روز کا معمول تھا۔ خدنگ ناز کی زد میں جو آیا جانے نہیں پایا۔

❋

اولیا اللہ سراپا مظہر نورِ ذات حق ہوتے ہیں۔ ان کا وجود مسحور سراپا کرامت ہوتا ہے مگر اظہار کرامت کو پسند نہیں فرماتے۔ اسی طرح اگر کسی درویش سے کرامت کا ظہور ہوتا تو خواجہ صاحب سخت سرزنش فرماتے۔ اس ضمن میں سید عباس علی شاہ کا واقعہ بڑا بصیرت افروز ہے۔ حضرت خواجہ غلام فخر الدین سیالوی مدظلہٗ کی روایت سے ہدیہ ناظرین ہے۔

آپ نے فرمایا کہ میں ایک مرتبہ لاہور گیا۔ مجھے کسی نے بتایا کہ بلال گنج میں ایک درویش حافظ شفیق احمد قادری رہتے ہیں۔ ان کی زیارت کرنا چاہیئے۔ چنانچہ اس ساتھی کو لے کر میں حافظ صاحب کے مکان پر گیا دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازہ کھلا۔ ایک درویش نے بڑے تپاک سے ہمیں خوش آمدید کہا اور پہلے سے ایک آراستہ مسند پر مجھے بٹھایا۔ یہی حافظ شفیق احمد قادری تھے۔ انہوں نے کہا کہ میرے مرشد نے بتایا کہ آج تیرے پاس مہمان آنے والا ہے۔ میں صبح سے آپ کے لیے چشم براہ ہوں اور یہ مسند میں نے اسی ہدایت کے مطابق بچھا رکھی ہے۔ ابتدائی رسمی گفتگو کے بعد انہوں نے اپنا قصہ بیان کیا۔ بتایا کہ میں موسیٰ زئی شریف میں بیعت ہوا میرے مرشد کا انتقال ہو گیا۔ میں ایک مراقبہ میں سرگرداں تھا وہ حل نہیں ہو رہا تھا۔ دن بدن میری پریشانی میں اضافہ ہونے لگا۔ میں روزانہ حضرت داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ کے آستانہ عالیہ پر حاضری دیا کرتا۔ کافی عرصہ کے بعد مجھے حضرت داتا صاحب نے خواب میں فرمایا کہ جموں میں سید عباس علی شاہ کے پاس جاؤ وہ تمہاری مشکل حل کرے گا۔ میں گوہر مراد کی تلاش میں جموں پہنچا۔ تلاش بسیار کے میں نے سید عباس علی شاہ کو پا لیا۔ لیکن ان کی ہیئت کذائی دیکھ کر مجھے مایوسی ہوئی۔ میں نے سوچا کہ جس کے لیل و نہار ایک برہمن کی نوکری میں گزرتے ہیں۔ وہ میری مشکل کیا حل کرے گا۔ چنانچہ اظہار کیے بغیر میں واپس آ گیا۔ ایک بار پھر داتا صاحب نے خواب میں شرف دیدار بخشا اور میرا ہاتھ پکڑ کر اسی جموں والے درویش کے ہاتھ میں دیا اور ان کے پاس جانے کی تاکید فرمائی۔ میں پھر جموں پہنچا جب گاڑی پلیٹ فارم پر رکی تو میں دیکھتا ہوں

وہی درویش پلیٹ فارم پر ٹہل رہا ہے۔ مجھے دیکھا اور جلدی سے آکر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مجذوبانہ انداز میں کہا کہ اب داتا صاحب نے بھی لوگوں کی چغلی کھانی شروع کر دی ہے۔ وہ مجھے اپنے ساتھ ــــ اس برہمن کے مکان پر لے گئے جس کی گائیں چرایا کرتے تھے۔ کافی دن انہوں نے مجھے اپنے پاس رکھا۔ پھر ایک روز مجھے اپنے ساتھ جنگل میں لے گئے اور خلوت میں ایسی توجہ فرمائی کہ میرا عقدہ حل ہو گیا۔ چشم زدن میں وہ مرحلہ طے ہو گیا۔ جس میں مَیں عرصہ سے سرگرداں تھا۔ اس کے بعد انہوں نے مجھے اپنے بارے میں بتایا کہ مَیں سیّد ہوں اور پنڈی گھیپ کے ایک نواحی گاؤں کا رہنے والا ہوں۔ حضرت خواجہ شمس العارفین کا مرید ہوں۔ آپ کی خدمت میں ہی رہا کرتا تھا مجھ سے کرامات کا بکثرت ظہور ہونے لگا تو حضرت نے بطورِ سزا ئیس سال کے لیے مجھے یہاں گائیں چرانے بھیج دیا۔ اب میری سزا ختم ہونے والی ہے مَیں عنقریب گھر چلا جاؤں گا۔ تم فلاں ماہ کی فلاں تاریخ میرے گھر میں آنا۔ جب تم وہاں پہنچو گے تو مسجد میں چند آدمی قل کے لیے بیٹھے ہوں گے۔ وہ تمہیں بتائیں گے کہ ایک شاہ صاحب جن کا نام عباس علی شاہ تھا ساری عمر باہر رہے چند روز ہوئے واپس آئے وہ انتقال کر گئے ہیں۔ آج تیسرا دن ہے شاہ صاحب نے مجھے کچھ روپے دیے اور وہاں جا کر کھانا پکا کر میری فاتحہ پڑھ کر تقسیم کر دینا۔

مَیں واپس آ گیا جب وہ مقررہ تاریخ آئی تو وصیت کے مطابق مَیں ان کے گاؤں پہنچا جس طرح انہوں نے بتایا تھا لوگ مسجد میں جمع تھے میرے دریافت کرنے پر انہوں نے بعینہٖ وہی بات بتائی جو شاہ صاحب نے بتائی تھی۔ مَیں نے ایصالِ ثواب کے لیے کھانا پکایا اور تقسیم کیا۔ ان کی قبر پر حاضری دی، سلام عرض کیا اور واپس چلا آیا۔

اعلیٰ حضرت کی کرامات جو سورج کی کرنوں کی طرح از خود صادر ہوا کرتی تھیں بے حد و بے حساب تھیں ان کے احاطہ کے لیے تو دفاتر بھی ناکافی ہیں۔ یہاں صرف دو واقعات عرض کرتا ہوں۔ جن میں اپنے مریدین کی جان و مال کی حفاظت کے لیے آپ کے روحانی تصرفات کی ایک جھلک نظر آتی ہے یہ واقعات اتنے سچے اور متقی لوگوں سے مروی ہیں جن کے بارے میں غلط بیانی اور مبالغہ آرائی کا گمان تک بھی نہیں کیا جا سکتا۔

پہلے واقعہ کے راوی حضرت مولانا معظم الدین صاحب مرولوی قدس سرہٗ ہیں۔ جن کو بارگاہِ عالی میں طویل حاضری کا امتیازی شرف حاصل ہے۔ یہاں یہ واقعہ حضرت شیخ الاسلام سجادہ نشین سیال شریف کی زبان مبارک سے سن کر لکھ رہا ہوں۔ حضرت نے فرمایا کہ ایک روز اعلیٰ حضرت سیالوی قدس سرہٗ ظہر کی نماز کے لیے وضو فرما رہے تھے اور خادم نیاز وضو کرا رہا تھا۔ اچانک حضرت نے ان کے ہاتھ سے کوزہ جھپٹ کر کسی غیر مرئی چیز پر دے مارا۔ خادم پریشان ہو گیا کہ مجھ سے کون سی غلطی سرزد ہو گئی ہے۔ چنانچہ وہ افسردہ خاطر ہو کر مولانا مرولوی کی خدمت میں حاضر ہوا جو قریب ہی ایک حجرہ میں مقیم تھے اور یہ ماجرا بیان کیا۔ مولانا نے اسے تسلی دی کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ فقیر کا کوئی مقام حکمت کے بغیر نہیں ہوا کرتا تم اس کوزہ کی ٹھیکریاں سنبھال کر رکھ لو۔ واپس آیا تو ٹھیکریاں بھی موجود نہ تھیں۔ صرف چند ٹکڑے پڑے ہوئے تھے جو اس نے سنبھال کر رکھ لیے۔ چند ماہ بعد ایک بخارا کے علاقہ کا آدمی وہاں پہنچا جو فارسی زبان بولتا تھا۔ جب سیال شریف پہنچا اور حضور کی زیارت کی تو زور سے کہنے لگا "ہمیں بود ہمیں بود" یعنی یہی وہ شخص ہے۔ یہی وہ شخص ہے۔ ہم نے اس سے ماجرا پوچھا تو اس نے بتایا کہ مَیں بارگاہِ الٰہی میں دعا مانگا کرتا تھا کہ الٰہ العالمین مجھے غوثِ زمان کی زیارت کی سعادت نصیب فرما۔ مجھے حضرت کی زیارت کرائی گئی اور سیالاں کا نام بھی بتایا گیا۔ مَیں اپنے علاقہ سے ہندوستان کی طرف روانہ ہوا۔

راستہ میں ایک جنگل سے گزر رہا تھا کہ ایک شیر گرجتا ہُوا مجھ پر حملہ آور ہوا۔ مَیں نے پکارا! اے سیالاں کے غوث میری مدد کر" کیا دیکھتا ہوں کہ شیر کے ماتھے پر آکر ایک کوزہ لگا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ مَیں نے اس کوزے کی ٹھیکریاں اپنے پاس حفاظت سے رکھ لیں جب پشاور سے آگے آیا تو سیالاں کے بارے میں دریافت کیا کسی نے مجھے سیالکوٹ کا پتہ دیا۔ مَیں وہاں پہنچا آپ کی گلی گلی کوچے کوچے تلاش کی، لیکن کامیابی نہ ہوئی وہاں سے مجھے کسی نے جھنگ سیال کا پتہ دیا وہاں پہنچا۔ لیکن جس کی تلاش تھی وہ نہ ملا مَیں حیران و پریشان تھا کہ اس شہر کا سراغ کیسے لگا۔ کسی نے مجھے ساہیوال جانے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ اس طرح میں پوچھتا پوچھتا سیال حاضر ہُوا۔ جب اس نے وہ ٹھیکریاں پیش کیں اور ہم نے اُن کو جوڑا تو وہ ہو بہو حضرت کا کوزہ تھا۔ صرف چند جگہ سے کچھ ٹھیکریاں غائب تھیں۔ ہمارے پاس جو تھیں وہ ہم نے وہاں جوڑیں اور کوزہ مکمل بن گیا۔ یہ واقعہ حضرت کی ظاہری زندگی کا ہے۔ دوسرا واقعہ اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز ہے۔

ضلع مظفر گڑھ کے ایک "گاؤں کھیرے" میں ایک سادات کا خاندان ہے۔ اس کے ایک بزرگ حضرت سید اللہ بخش شاہ صاحب بڑے عالم و فاضل تھے اور اعلیٰ حضرت سیالوی کے نیازمند تھے۔ حضرت بھی ان پر خصوصی توجہ و کرم فرمایا کرتے تھے۔ حضرت کے وصال کے بعد سیال شریف میں ان کی حاضری پہلے کم ہُوئی بعد ازاں آمد و رفت کا سلسلہ بالکل منقطع ہو گیا۔ حضرت قبلہ ثانی صاحب کے عہد میں یہ اطلاعیں آنے لگیں کہ شاہ صاحب نے اپنے گاؤں میں الگ کعبہ بنا لیا ہے۔ اسی کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں اور اسی کے گرد طواف کرتے ہیں۔ حضرت ثانی صاحب سُنتے تو بصد افسوس فرماتے بیچارے شاہ کو کوئی مغالطہ لگ گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس پر رحم فرمائے ان کی یہی حالت رہی۔ حتیٰ کہ حضرت ثانی صاحب نے رحلت فرمائی اور حضرت خواجہ ضیاء الحق والدین سند آرائے سیال شریف ہُوئے۔

ایک دفعہ حضرت ثانی صاحب کے عُرس مبارک پر یہ عمل برپا ہوا کہ کعبہ بنانے والے شاہ صاحب آئے ہیں۔ ہم (حضرت صاحبزادہ عبداللہ صاحب) بھی ان کے دیکھنے کے لیے گئے اور ان سے اس واقعہ کے بارے میں استفسار کیا۔ انھوں نے پہلے تو اظہار خیال سے معذرت چاہی لیکن پھر ہمارے شدید اصرار پر یوں گویا ہوئے۔

میرے حضرت کے وصال کے بعد کچھ عرصہ تو مَیں ان وظائف و اوراد کو پابندی سے ادا کرتا رہا جو میرے شیخ نے مجھے بتائے تھے۔ پھر مجھے غیب سے آوازیں آنے لگیں کہ اے اللہ بخش تو میرا محبوب ہے مَیں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ تو خود کعبہ بنا اور سنت خلیلی کو زندہ کر۔ مَیں حیران تھا کہ مجھ سے پہلے بھی کئی اولیاء کرام کو خلعت محبوبیت عطا ہوئی لیکن کسی نے نیا کعبہ نہیں بنایا میں یہ جسارت کیسے کر سکتا ہوں۔ ایک سال تو مَیں اپنے موقف پر ڈٹا رہا لیکن اس کے بعد غضب ناک لہجہ میں دھمکیاں ملنے لگیں جن کی مَیں تاب نہ لا سکا۔ اس طرح میں ایک کوٹھا بنا کر اس کے گرد طواف کرنے لگ گیا۔

کچھ مُدت گزری تو غیبی آوازوں کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوا مجھے کہا جاتا کہ سنت خلیلی تو تم نے ادا کر دی اب سُنت اسمٰعیلی ادا کرو اور ذبیح اللہ کے مقام پر فائز ہو جاؤ۔ مَیں نے سوچا کہ یہ تو خودکشی ہے جو حرام ہے مَیں اس کا ارتکاب ہرگز نہیں کروں گا۔ کافی عرصہ مَیں اپنی ضد پر اڑا رہا لیکن پھر تو جھڑکیوں اور سرزنشوں کا سلسلہ شروع ہو گیا کہ تو کیسا محبوب ہے کہ اپنے مالک حقیقی کے حکم پر جان بھی نہیں دے سکتا۔ تجھ سے وہ ہندو زن بہتر ہے جو اپنے خاوند کی ارتھی پر بیٹھ کر خاکستر ہو جاتی ہے۔ اگر تو ہمارے حکم کی تعمیل نہیں کرے گا تو گویا تو ہمیشہ کے لیے زندہ رہے گا روز حشر کیا منہ لے کر ہمارے روبرو حاضر ہو گا۔ اُلٹے روز کی ان جھڑکیوں نے مجھے بے بس کر دیا اور

ں اپنا گلہ کاٹنے پر آمادہ ہو گیا۔ ایک روز تیز اُسترا لے کر اپنی گردن پر چلا دیا۔ فوراً میرے شیخ حضرت خواجہ
س العارفین بجسم ظاہر تشریف لے آئے، میرے ہاتھ سے استرا چھین کر دُور پھینک دیا۔ فرمایا۔ خبردار اے اللہ بخش
رحمانی آواز نہیں شیطانی ہے۔ پھر آپ آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔
یوں میں اپنے مُرشدِ کامل کی دستگیری سے دوزخ کا ایندھن بننے سے بچ گیا۔ شاہ صاحب نے گردن پر
ترے کا وہ زخم بھی دکھایا جو ابھی پوری طرح مندمل نہیں ہوا تھا وہ اڑھائی انچ کے برابر تھا۔
بے شک عارف رومی نے سچ کہا ہے۔

دست پیر از غائباں کوتاہ نیست

حضور سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کی یہ حدیث طیبہ اس کی تصدیق کے لیے کافی ہے۔
لایزال العبد یتقرب الی بالنوافل ..... حتی اکون سمعہ الذی یسمع بہ وبصرہ الذی یبصر بہا۔
ایک روز حضور پیر سیال، سیال شریف میں تشریف فرما تھے، ہزاروں لوگ جمع تھے، صبح کا وقت تھا حضور
نے حجرہ میں اپنے اوراد اور وظائف پڑھ رہے تھے اور قوال الگ ایک جگہ درد و سوز سے محبت بھرے اشعار سنا
لوگوں کے ایمان کو تازہ کر رہے تھے۔ قوالوں کی آواز جب حضور نے سُنی تو دل میں ان کے سننے کا شوق پیدا
۔ وظائف سے فراغت پا کر حضور حجرہ سے نکل کر مجلس سماع میں تشریف لے آئے۔ قوال حضرت کے عظمت و
ل کے باعث خاموش ہو گئے، حضور نے فرمایا۔

چوں دور خسرو آمد مے در سبو نماند

حضور کے ایک خادم مولانا حفیظ ماہی صاحب نے جب یہ سُنا تو عرض کی کہ عالیجاہ! ابھی حکم کی تعمیل کی جائے
چنانچہ قوالوں نے اپنے درد بھرے انداز سے یہ غزل پڑھنی شروع کی۔

شراب عشق کاندر جام کردند
نصیب عاشق بدنام کردند
ثنائے زلف رخسار تو اے ماہ
ملائک ورد صبح و شام کردند

قوال یہ غزل گا رہے تھے اور حضور انور پر وجد و کیف کی ایک عجیب کیفیت طاری تھی۔ ضبط اور وقار
پہاڑ جو بڑے سے بڑے واردات کو برداشت کرنے کی ہمت رکھتا تھا۔ اس نے اپنے دلی جذبات کو
ظاہر ہونے کی اجازت نہ دی تھی۔ آج فرطِ ذوق و شوق سے بے تاب ہو گیا۔ حضور کی چشم پُرنم سے ایک رنگین
ٹپکا اور دایاں زانو اُٹھا اور دوسرے کو دبا لیا۔ اس وقت ساری فضا میں کیف و مستی کا ایک عجیب سماں
ہر شخص گریہ کناں تھا اور محبوب حسینی کی محبت میں مرغ بسمل کی طرح تڑپ رہا تھا۔ بڑے بڑے خواص اپنے
و ہوش سے محروم ہو چکے تھے۔ معلوم نہیں اس محفل میں محبت و عشق کی دولت اس فیاضی سے تقسیم ہوئی کہ ہر
ن اپنے دامن مراد کو محبتِ خداوندی اور عشق رسالت پناہی سے مالا مال پا رہا تھا۔
اعلیٰ حضرت نہ فقط کشور فقر و درویشی کے تاجدار ہی نہ تھے بلکہ ظاہری علوم و فنون میں آپ کا درجہ بہت بلند
قرآن کریم کی آیات طیبات کی تفسیر، نبی رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی احادیثِ مبارکہ کی تشریح اور اکابر
ربانیین کے اقوال کی توضیح جب آپ اپنی زبانِ فیض ترجمان سے کرتے تو بڑے بڑے علماء دنگ رہ جاتے۔
ی مولانا روم کی شرحیں بڑے بڑے علماء نے لکھی ہیں لیکن حضرت کا انداز سب سے نرالا اور سب سے منفرد تھا۔

حدیث و فقار کے بڑے بڑے علمار آپ کے سامنے ادب و احترام سے سر جھکائے بیٹھتے تھے۔ حضرت سید پیر مہر علی شاہ صاحب آپ کے چشمہ و فقر و درویشی سے بھی سیراب ہوئے اور اس کے ساتھ ساتھ آپ کے دستر خوان علم و فضل سے بھی بہرہ ور ہوئے۔ جب ہم انھیں بارگاہِ شمس الدین میں دیکھتے ہیں تو وہ بھی حضرت کے علم و فضل کے سامنے دم بخود نظر آتے ہیں اور اپنے بے نظیر علمی کارناموں کو محض اپنے پیر و مرشد کا فیض اور روحانی تصرف سمجھتے ہیں، نہ صرف یہ بلکہ بار بار اس کا برملا اعتراف بھی کرتے ہیں۔

خواجہ شمس الدین نے جن طالبانِ حق کو واصل بحق کر کے خلافت بخشی ان کی تعداد بہت زیادہ ہے، ان میں سے مشہور خلفا کے اسمار گرامی یہ ہیں۔ سید غلام حیدر علی شاہ جلالپوری، پیر سید مہر علی شاہ گولڑوی، مولوی فضل الدین چاچڑوی، مولوی معظم الدین مرولوی، مولوی عبدالعزیز بگوی، مولوی غلام قادر بھیروی، پیر امیر علی بھیروی، سید نور دین بخاری گجراتی، مولانا غلام محمد، سید سکندر شاہ پشاوری، سید حیات شاہ۔

آپ نے چھتیس سال کی عمر میں (۱۲۵۰ھ) اپنے شیخ طریقت سے خلافت پائی اور نصف صدی تک رشد و ہدایت کے چشمے جاری کیے۔ اپنے روحانی تصرفات اور باطنی توجہات سے بندگانِ خدا کا ٹوٹا ہوا تعلق اپنے رب سے جوڑتے رہے۔ سینکڑوں کی تعداد میں آپ کے باکمال خلفار ملک کے طول و عرض میں پھیلا دیے جو دعوت حق میں مشغول ہو گئے۔ آپ کے خلفار نے اپنے اپنے مقام پر خانقاہیں قائم کیں۔

آپ کے خصوصی مریدین میں سے سیالکوٹ کے سائیں عبدالغنی بھی بہت مشہور ہوئے۔ لاتعداد غیر مسلم آپ کے سحر کن خطاب سے متاثر ہو کر مشرف بہ اسلام ہوئے۔ جس وقت انگریز حکومت نے پانچ شہروں میں آپ کو خطاب کرنے سے روکا اور زبان بندی کر دی تو آپ نے ہاتھوں میں ایک اکتارا لے لیا۔ جب اس کو بجاتے تو ذکر اللہ کی ایسی آواز نکلتی کہ جس غیر مسلم کے کان میں پڑتی مسلمان ہو جاتا۔ اس طرح زبان بندی سے تبلیغ کا سلسلہ بند ہونے کی بجائے اور تیز ہو گیا۔ انگریز حکمران کو پھر شکایات موصول ہوئیں تو بالآخر انگریز کمشنر نے مجبور ہو کر آپ سے ملنے کی درخواست کی جو قبول ہوئی۔ جب سائیں صاحب سے ملنے پہنچا تو آپ نے حکم دیا جوتے اتار کر مسجد میں آؤ۔ قریب آیا تو انگریز مہمان کو فرمایا گھر جاؤ تمہاری بیوی تو مسلمان ہو چکی ہے اس کو بھی ساتھ لاؤ۔ کمشنر صاحب اُلٹے پاؤں گھر آئے معلوم ہوا اس کی بیوی واقعی اسلام قبول کر چکی ہے۔ اس کو ساتھ چلنے کو کہا۔ دونوں آپکی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے توجہ فرمائی انگریز مہمان کو بھی مسلمان کیا۔ ان واقعات سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ خواجہ شمس الدین سیالوی نے جو ٹیم تیار کی۔ انھوں نے برصغیر پاک و ہند میں کیسی کیسی خدمات انجام دیں۔ بتایا جاتا ہے کہ سائیں عبدالغنی صاحب عمر کے آخر حصہ میں زیادہ وقت حالتِ جذب و استغراق میں رہتے اور اسی حالت میں وصال کیا۔ آپ کے بعد آپ کے بیٹے خواجہ حفیظ اللہ، حفیظ اللہ قادری و چشتی جو سلطان جی کے نام سے مشہور ہوئے۔ آپ نے بڑیلہ شریف (گجرات) میں نور و ہدایت کے ایسے چشمے جاری کئے کہ ایک زمانہ دنگ رہ گیا۔

جب ۱۳۰۰ھ کا آغاز ہوا، محرم الحرام کی پندرہ تاریخ تھی۔ اعلیٰ حضرت نے اپنے ولی عہد اور فرزند ارجمند خواجہ محمد الدین صاحب (جو حضرت ثانی صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے لقب سے معروف ہیں) کو اپنے خاص حجرہ میں اپنے سامنے بٹھایا اور ارشاد فرمایا۔ اے فرزند! دنیا کے حالات ہر وقت بدلتے رہتے ہیں کبھی خوشحالی، ہمارے دادا صاحب کئی گاؤں کے مالک تھے اور دولت و ثروت کی فراوانی تھی۔ اس طرح والد ماجد بھی خوشحالی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ جب میرا زمانہ آیا، میں نے تحصیل علوم کے لیے سفر اختیار کیا بعد ازاں خواجہ خواجگان محمد سلیمان

رضی اللہ عنہ سے بیعت کی، دن بدن معاشی حالت بگڑنے لگی یہاں تک کہ فاقہ کی نوبت آنے لگی اور کبھی کبھی تو سات سات دن فاقہ میں گزر جاتے لیکن میں نے یہ راز کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اب اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اور خواجہ تونسوی کی برکت سے کسی چیز کی کمی نہیں لیکن اس دنیائے فانی کی کسی چیز کے ساتھ مجھے قطعاً کوئی اُلفت نہیں۔ البتہ دو چیزوں سے مجھے پیار ہے۔ کیونکہ یہی دونوں چیزیں پیرانِ عظام سے مجھے مرحمت ہوئی ہیں، اوّل محبّتِ درویشاں۔ دوئم اطاعت پیرومُرشد۔ تم توکل تسلیم اور صبرو قناعت کو اپنا معمول بنانا، ہر ایک سے خندہ پیشانی سے پیش آنا۔ درویشوں اور عالموں سے محبت رکھنا۔" صاحبزادہ صاحب نے (حضور ثانی صاحب سے التماس کیا کہ یاحضرت دولت ظاہری کی حاجت نہیں ہے۔ نعمتِ باطنی جو پیرانِ عظام نے آنحضرت کو عطا فرمائی ہے، اس سے عنایت فرمایئے حضور نے ارشاد فرمایا "املاک ظاہری قبول کرو۔ املاک معنوی باطنی سے اللہ تعالیٰ مالا مال کرے گا۔" صاحبزادہ صاحب نے پھر گزارش کی کہ میری تمنا ہے کہ حضور چالیس برس تک اور سلامت رہیں تاکہ اس چشمۂ شیریں سے پیاسے سیراب ہوتے رہیں، یہ سُن کر حضرت خاموش ہوگئے۔ پھر فرمایا "اے فرزند! ہم کو چالیس روز تک جینے کا بھی اعتبار نہیں کیونکہ میں نے اپنے پروردگار سے التجا کی ہے کہ میری عمر میرے پیرومرشد خواجہ تونسوی کی عمر کے موافق ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ میری عمر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ ماہ صفر میں میرے مُرشد نے انتقال فرمایا تھا شاید ہماری رحلت بھی اسی ماہ صفر میں ہووے۔"

جدائی کی یہ خبر حضور ثانی کے خرمن صبروضبط پر بجلی بن کر گری اور آپ نے زارو قطار رونا شروع کر دیا۔ صاحبزادہ صاحب کی آہ وزاری اور بے چینی کو دیکھ کر اعلیٰ حضرت نے فرمایا "اے نورِ چشم! میں چاہتا تھا کہ اسرارِ یزدانی سے تم کو آگاہ کروں گا مگر تم تھوڑی سی بات سے بے خود ہوگئے ہو۔ دنیا کی زندگی کا اعتبار نہیں۔ کل نفس ذائقۃ الموت کے مطابق ہر شخص نے موت کا شربت پینا ہے۔ پھر آپ نے دوسرے صاحبزادوں، جناب صاحبزادہ حافظ فضل الدین صاحب جناب صاحبزادہ شجاع الدین صاحب کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ اگر مندوبات اور مستحبات تم سے ادا نہ ہو سکیں تو فرائض کو مت ترک کرنا بلکہ تم پر لازم ہے کہ پیرانِ عظام کی متابعت اور حق تعالیٰ کی یاد میں مصروف رہو۔

ایک روز حضرت صاحبزادہ محمد دین صاحب کو فرمایا کہ آپ تونسہ شریف میں حضرت خواجہ کریم کی خدمت میں حاضر ہوں مگر یاد رکھنا جلدی واپس آنا، دیر مت لگانا۔ چنانچہ حسبِ ارشاد قبلہ صاحبزادہ صاحب تونسہ شریف روانہ ہوئے۔ ۱۸ ماہ صفر کو نمازِ تہجد سے فارغ ہونے کے بعد اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ کو بخار کا عارضہ لاحق ہوا۔ حکماء و اطباء نے بڑی کوشش کی لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ صاحبزادہ صاحب ۲۱ ماہ صفر کو منگل کے دن تونسہ شریف کی حاضری سے واپس آئے۔ حاضرِ خدمت ہو کر مزاج پرسی کی آستانہ عالیہ کے حالات سے آگاہ کیا۔ اور جو ادویہ آپ واپسی کے وقت لیئے کسی حاذق طبیب سے لے آئے تھے ان کا استعمال شروع ہوا۔ آخری عمر میں سماعت کم ہوگئی تھی اس لیے لوگ اپنے حالات لکھ کر خدمت بابرکت میں پیش کیا کرتے تھے۔ حضرت صاحبزادہ فضل الدین صاحب نے وظائف کی اجازت طلب کی حضور نے ارشاد فرمایا۔ اے فضل الدین! ہمارے تمام وظائف کی تم کو اجازت ہے۔ ۲۲ ماہ صفر حضرت خواجہ نے مولینا مرولوی کو فرمایا کہ تم بھی کچھ لکھو۔ مولانا نے صاحبزادوں کی طرف سے ایک درخواست پیش کی۔ جس کا خلاصہ یہ تھا کہ آنجناب کے آستانہ عالیہ سے سعادت دارین اور مطالب کونین کے حصول کے لیے بے شمار لوگ آتے ہیں کسی صاحبزادہ صاحب پر نظرِ شفقت فرمایئے تاکہ خاندانِ چشت کا یہ فیض ہمیشہ جاری رہے۔ حضور نے درخواست کا مطالعہ فرمایا لیکن خاموشی اختیار کی۔ تھوڑی دیر کے بعد مولانا نے پھر یہ درخواست پیش کی۔ اعلیٰ حضرت نے ملاحظہ فرما کر دُعا کے لیے دستِ مبارک اُٹھائے اور زبانِ مبارک سے بھی کچھ فرمایا جو سمجھا نہ جا سکا۔ نقاہت میں مزید اضافہ ہوگیا۔ صفر کی

چوبیسویں رات تھی حضور حاضرین سے بار بار دریافت فرماتے کہ فجر طلوع ہوئی ہے یا نہیں۔ پھر پوچھا۔ آج کون سا دن ہے اور کیا تاریخ ہے؟ کسی نے عرض کیا۔ اے جانِ عالم! آج جمعہ کا دن ہے اور ۲۴ ماہ صفر۔ حضور نے دستِ مبارک میں تسبیح لے کر چند بار درود شریف پڑھا پھر ذکر پاک انفاس میں مشغول ہو گئے۔ جب فجر طلوع ہوئی دو رکعت نماز فجر اشارہ سے ادا فرمائی پھر پاک انفاس میں مشغول ہو گئے۔ حاضرین کی طرف محبّت بھری اور الوداعی نگاہوں سے دیکھا اور قبلہ رو ہو گئے اور علاماتِ وصال آپ پر ظاہر ہوئیں اس طرح شمس مطلع ہدایت و محبّت، نصف صدی تک محبّت اور عشق کی دولت لٹانے کے بعد اپنے محبوبِ حقیقی سے جا ملا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

ہر سال ماہ صفر کی بائیس تیئس، چوبیس تاریخ کو آستانہ عالیہ سیال شریف پر عرس مبارک منعقد ہوتا ہے۔ جس میں آج بھی ملک اور بیرونِ ملک سے بے شمار مخلوق فیضیاب ہونے کے لیے حاضر ہوتی ہے اور حضرت کے آستانہ عالیہ کے سجادہ نشین علامہ قمر الدین سیالوی صاحب ہیں۔

اولیاء اللہ سراپا مظہرِ نورِ ذاتِ حق ہوتے ہیں ان کا وجود سراپا کرامت ہوتا ہے مگر کرامات کے ظہور کو پسند نہیں فرماتے۔

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جسے اللہ تعالیٰ کی محبّت مطلوب ہو اسے چاہیے کہ اہلِ ذکر کی مجلس میں بیٹھے۔ یعنی اہلِ عرفان کی صحبت کو حضورِ حق کی ہم نشینی کے قائم مقام ٹھہرایا گیا ہے۔ علاوہ ازیں اہلِ عرفان کے ملفوظات میں غور و فکر کرنا درحقیقت صاحب ملفوظ کی صحبتِ باطنی قرار دیا گیا ہے۔ بلکہ ایک دفعہ حضرت خواجہ گنج شکر نے فرمایا کہ اگر کوئی مرید اپنے شیخ کے اقوال سُنے اور انھیں قلمبند کرے تو ہر حرف کے بدلے ہزار سال عبادت کا ثواب اس کے نامۂ اعمال میں لکھ دیا جاتا ہے۔ مولانا جامی شعر کی صورت میں ایک جگہ فرماتے ہیں ضروری نہیں کہ معشوق کے دیکھنے سے ہی عشق پیدا ہو بلکہ بعض اوقات معشوق کا ذکر سنتے سنتے بھی یہ نعمت عظمیٰ نصیب ہو جاتی ہے۔ حضرت خواجہ شمس الدین سیالوی صاحب کے ملفوظات کا ایک مجموعہ مرآت العاشقین کے نام سے ہم تک پہنچا ہے۔ اُس کے چند ایک اقتباسات نہایت مختصر طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔

فرمایا۔ پہلی مرتبہ جب نزولِ وحی کا وقت قریب آیا تو رسولِ خدا جس جگہ سے گزرتے وہاں شجر و حجر سے یہ آواز آتی تھی: "السلام علیکم یا رسول اللہ!" آوازوں کا یہ سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ ایک دن افق پر ایک فرشتہ کو دیکھا جو پاؤں پر پاؤں رکھے کھڑا ہے۔

فرمایا۔ انبیاء اور اولیاء کو "طے زمانی" اور "طے مکانی" کا مرتبہ حاصل ہوتا ہے، آنحضرتؐ نے بھی زمین سے قاب قوسین تک کی مسافت طے زمانی اور طے مکانی کی قوت سے طے کی ورنہ یہ مسافت لاکھوں کروڑوں میل تھی۔

فرمایا۔ نظامِ کائنات کو چلانے والے خدا کے برگزیدہ بندے ہیں کہ تمام امور بست و کشاد ان کے زیرِ فرمان ہیں برعکس ظاہری بادشاہوں کے کہ فقط دنیوی امور میں مشغول و متصرف ہوتے ہیں۔

فرمایا۔ اکثر لوگ علم و فضل کے باوجود قربِ حق تعالیٰ سے محروم رہتے ہیں، علم کی اصل حسنِ اعتقاد ہے۔ پس طالب صادق کو چاہیے کہ حسنِ اعتقاد حاصل کرنے میں زیادہ کوشش کرے اور اطاعتِ شیخ میں اپنے ظاہر و باطن کو مشغول رکھے تاکہ حق تعالیٰ شانہٗ اُسے قسم قسم کے علوم سے فیضیاب کرے۔

فرمایا۔ عشق کی گرمی کی وجہ سے امیر خسرو کی قمیص دل والی جگہ سے جلی رہتی تھی۔ کسی دوست نے عرض کیا کہ اس قسم کا عشق کس طرح حاصل ہوتا ہے، تو جواباً فرمایا۔ یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے عنایت کرتا ہے۔ پھر ایک شخص نے پوچھا کہ اذکار و اوراد سے عشق حاصل نہیں ہوتا۔ آپ نے فرمایا۔ اشغال و اذکار کی برکت سے لذت

طرے اور شیطانی وسوسے دُور ہو جاتے ہیں لیکن دولتِ عشق محض اس کی عطا ہے۔

فرمایا۔ ہم نے مدّتِ دراز تک مثنوی مولانا روم کا مطالعہ جاری رکھا۔ چھ کے چھ دفتروں کا حاصل مطلب خدمت و اطاعتِ شیخ ہی نظر آیا۔ سالک جب " اطاعتِ شیخ " کی منزل سے کامیابی کے ساتھ گزر جائے تو اسے سلوک و معرفت کے تمام مراتب حاصل ہو جاتے ہیں، کیونکہ خود " اطاعتِ شیخ " عین اطاعتِ خدا اور رسول ہے۔ پھر فرمایا۔ سالک کو چاہیے کہ سلوک کے ابتدائی مراحل میں امام غزالی کی کیمیائے سعادت اور سلوک کی آخری منازل میں مثنوی رومی کا مطالعہ کرے۔"

فرمایا۔ نماز کی دو قسمیں ہیں۔ نمازِ صوری اور نمازِ معنوی۔ صوری نماز یہ ہے کہ شریعت کے حکم کے مطابق تمام ظاہری آداب و شرائط کو ملحوظ رکھ کر ادا کی جائے۔ معنوی نماز یہ ہے کہ ماسوا اللہ سے ترکِ تعلّق کر کے حق تعالیٰ سے جا پیوند ہونا۔

خواجہ تونسوی کی نماز کا ذکر چھڑا تو فرمایا۔ ایک دن خواجہ سلیمان تونسوی کے آنے سے پہلے جماعت ہو گئی۔ اس دن آپ بذاتِ خود امام بنے۔ میں نے آپ کی اقتدار کی۔ اس دن آپ کے دل و عشقِ الٰہی کا اتنا ہیجان تھا کہ نماز آہستہ نہیں پڑھ سکتے تھے اور رکوع و سجود اتنی تیزی سے کرتے تھے کہ مجھے آپ کی متابعت کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ اسی طرح مسیح الاولیاء حضرت عین العرفاء کے مریدوں سے نقل کرتے ہیں کہ وہ فرمایا کرتے تھے کہ نماز میں حضورِ دل کے غلبے کی وجہ سے مکمل سورت فاتحہ پڑھنی بھی انتہائی مشکل ہو جاتی ہے۔ اسی طرح حضرت سیّد محمّد گیسودراز اپنی کتاب بتیان میں فرماتے ہیں کہ طالب صادق کو نماز میں مختصر قراءت کرنی چاہیے تاکہ وہ حضورِ دل کی کیفیت سے غافل نہ ہو۔

فرمایا۔ ایک بزرگ نماز نہیں پڑھتے تھے۔ لوگوں نے انھیں نماز پڑھنے کو کہا۔ تو انھوں نے جواب دیا کہ میں نماز تو پڑھوں گا مگر سورۃ فاتحہ نہیں پڑھوں گا اور اس کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ لوگ برابر اصرار کرتے رہے۔ آخر انھوں نے مجبور ہو کر کہا میں سورۃ فاتحہ بھی پڑھوں گا مگر " ایاکَ نعبدُ و ایاکَ نستعین " نہیں پڑھ سکوں گا۔ غرض جب وہ نماز پڑھنے لگے اور " ایاکَ نعبدُ و ایاکَ نستعین " پر پہنچے تو ان کی رویئں رویئں سے خون جاری ہو گیا۔ ایک مُرید نے اس کا سبب پوچھا تو فرمایا جب خدا کے بندے خدا کی محبّت میں محو ہو جاتے ہیں تو عشق کے شدید غلبے کی وجہ سے ان کا خون جاری ہو جاتا ہے۔

فرمایا۔ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی نے حضرت گنج شکر کو نمازِ معکوس کی اجازت دی اور فرمایا اے فرید پنجگانہ نماز جماعت کے ساتھ ادا کرو اور روزمرّہ نمازِ معکوس میں ایک قرآن ختم کیا کرو۔ گنج شکر نمازِ معکوس پڑھنے تل گئے اور کوئی موزوں جگہ تلاش کر کے ایک آدمی کو اپنا ہمراز بنا لیا اور اسے تاکید کی کہ رات کو جب لوگوں سے فراغت ملے تو ہمارے پاؤں سے مضبوط رسّی باندھ کر ہمیں کنوئیں میں لٹکا دیا کرو اور صبح سویرے نکال لیا کرو۔ حضرت خواجہ گنج شکر اس نماز میں قرآن ختم کرتے اور پنجگانہ نماز بھی جماعت کے ساتھ ادا کرتے۔ اس طرح چالیس دن آپ نمازِ معکوس پڑھتے رہے اور آج تک خواجگان میں یہ نماز اسی طرح رائج ہے البتہ کنوئیں کے بجائے چھت سے رسّی لٹکائی جاتی ہے۔

ایک دن صبح کے وقت بیر کے درخت پر ایک بلبل نغمہ خوانی کر رہی تھی۔ خواجہ شمس الدین نے ایک مُرید سے پوچھا۔ بلبل کی آواز کس جگہ سے آ رہی ہے۔ اس نے عرض کی بیر کے درخت پر بلبل بیٹھی ہے شاید یہاں کوئی غنچہ نظر آیا ہو۔ فرمایا عاشقِ صادق کے لیے ہر جگہ پھول ہی پھول ہیں یعنی جب عاشق فنا فی الحبیب ہو جاتا

ہے تو وہ ہر جگہ اپنے معشوق کا حسن و جمال ہی دیکھتا ہے۔
ایک مرید نے عرض کیا. کیا وجہ ہے کہ صوفیائے کرام کو کھانے پینے کی حاجت بھی نہیں رہتی. فرمایا بھوک اور پیاس کا احساس ختم ہو جانے کی دو وجوہات ہیں ایک تو یہ کہ خدا تعالیٰ اس امر پر قادر ہے کہ کھانے پینے کے بغیر بھی زندہ رہ سکتا ہے. دوسرے یہ کہ کھانے پینے کی حاجت کا تعلق خاکی وجود سے ہے. جب خدا کے بندے بشریت کی منزل سے گزر کر فنا کی حدود میں قدم رکھتے ہیں تو انھیں کھانے پینے کی کوئی حاجت باقی نہیں رہتی۔
ایک دن فرمایا عبادت کی ابتداء استغفار ہے اور انتہا تسلیم و رضا ہے۔ پھر ایک بار فرمایا سالک کو اپنی زندگی یادِ الٰہی میں گزارنی چاہیئے. زندگی عبادت کے لیے ہے, نفسانی خواہشات کے لیے نہیں۔
فرمایا. سالک کے لیے تین چیزیں ضروری ہیں. توکل. تحمل. صبر, اور انہی سے وہ قرب کے مرتبہ تک پہنچتا ہے. فرمایا. صبر کا مرتبہ سخاوت سے اونچا ہے. بھوک کا مرتبہ پیٹ بھر کر کھانے سے بلند ہے. جس مرتبہ تک صابر پہنچے ہیں اہلِ سخاوت کو وہاں کی خبر بھی نہیں اور جس مقام پر فاقہ کش پہنچے ہیں. امراء کو وہاں کی بو بھی نہیں پہنچتی۔
فرمایا. ہمارے ملک میں روٹی دینا تمام اعمال پر فضیلت رکھتا ہے اس لیے درویش کو چاہیے کہ حسب توفیق اس بارے میں انتہائی کوشش کرے۔
فرمایا جہاد کی دو قسمیں ہیں. جہاد اصغر اور جہاد اکبر. جہاد اصغر کفار سے جنگ کرنا ہے اور جہاد اکبر نفس کے ساتھ جنگ کرنا ہے. بعد ازاں فرمایا انسان کا نفس ریچھ کی مانند ہے اور سالک قلندر کی مانند. نفس کے ساتھ اسی طرح کوشش کرنی چاہیے. جس طرح قلندر ریچھ کے ساتھ گتھم گتھا ہو جاتا ہے تاکہ خدا اسے نفس کے شر سے محفوظ رکھے. صوفیا کے نزدیک ایسی کوشش جہادِ اکبر کہلاتی ہے۔
فرمایا. ایک دن حضرت بابا گنج شکر کی خدمت میں درویشوں نے عرض کیا کہ آپ کے صاحب زادہ صاحب فاقہ کی وجہ سے قریب المرگ ہیں اگر کوئی چیز عنایت فرمائیں تو ہم انھیں کھلا دیں. فرمایا اس وقت کوئی چیز نہیں کسی سے قرض لے لو. عرض کیا کوئی قرض نہیں دیتا. فرمایا. تو پھر کوئی حرج نہیں جو کچھ کرتا ہے خدا کرتا ہے تھوڑے وقت کے بعد خبر آئی صاحبزادہ فوت ہو گئے ہیں. فرمایا کفن دفن کر دو. عرض کیا نہ تو کوئی کپڑا ہے نقدی. فرمایا. میت کے اوپر نیچے گھاس لپیٹ کر دفن کر دو. چنانچہ اسی طرح کیا گیا۔
فرمایا. سالک کو چار چیزیں اپنے اوپر عائد کر لینی چاہئیں, کم کھانا, کم سونا, کم بولنا اور لوگوں سے کم میل جول رکھنا۔
فرمایا. ایک دن سلیمان تونسوی کے ایک مرید سے سننے میں آیا کہ حضرت تونسوی کے وجود مبارک سے جلالی تجلیات اس قدر برستی تھیں کہ کسی کو آپ کے مدمقابل بیٹھنے کی ہمت نہ پڑتی تھی اور محفل میں بیٹھے لوگ نقش بر دیوار بنے رہتے تھے اور آپ کی اجازت کے بغیر کوئی شخص لب کشائی نہ کر سکتا تھا لیکن آپ کا باطن جمالی تجلیات کا مرکز تھا اور آپ نے بیشمار لوگوں کو دنیوی دھندوں سے نکال کر خدا کی راہ پر ڈال دیا۔
فرمایا. ہر مہینے کا نیا چاند حضرت محبوب سبحانی شیخ عبدالقادر جیلانی غوث اعظم کی خدمت میں حاضر ہو کر کہتا کہ اس ماہ میرے دوران گردش میں اس قدر سردی یا بارش, بیماری وغیرہ پیدا ہو گی, پھر فرمایا اولیاء میں بھی بڑا فرق ہے بعض اولیاء ایسے ہوتے ہیں جن کے تمام اوصاف ذمیمہ اوصاف حمیدہ سے بدل جاتے

بعض اولیاء اس سے بھی بہت آگے یعنی اقوال و افعالِ بشری سے گزر کر فناء الفنا کے اوصاف میں جذب ہو جاتے ہیں۔

فرمایا۔ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا جو جی چاہو مانگو۔ حضرت عائشہ نے عرض کیا اپنے والد گرامی سے مشورہ کر کے بتاؤں گی۔ حضرت ابوبکر صدیق نے فرمایا کہ یہ عرض کرنا یا رسول اللہ وہ راز جو خدا نے آپ کو معراج کی رات بخشے تھے اور ان کے اظہار سے منع کیا گیا تھا۔ ان میں سے ایک راز بتا دیجئے۔ رسول اللہ قدرے متفکر ہوئے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان اسرار کا اظہار منع کیا تھا۔ اسی اثناء حضرت جبریلؑ آئے اور عرض کیا کہ خدا نے آپ کو اختیار دیا ہے آپ بے شک ایک راز بتا دیجئے۔ چنانچہ رسول اللہ نے حضرت عائشہؓ کو بتایا کہ ان رازوں میں سے ایک راز یہ ہے کہ جب کوئی مومن کسی دوسرے مومن کی کانٹا چبھنے کے برابر تکلیف بھی رفع کرے تو خدا اس کے تمام گناہ معاف کر دیتا ہے اور جنت میں اسے اعلیٰ درجہ ملے گا۔ جب صحابہ کرام کو یہ خبر پہنچی تو وہ خوش ہوئے۔ لیکن حضرت ابوبکر صدیقؓ نے رونا شروع کر دیا۔ وجہ پوچھی تو بتایا کہ میں اس لیے روتا ہوں کہ جب اتنا معمولی سا کام گناہوں کی معافی اور جنتی ہونے کا سبب بن سکتا ہے تو ان لوگوں کا کیا حشر ہو گا جو گناہوں میں غرق رہتے ہیں اور دوسروں کو دکھ پہنچاتے ہیں۔

فرمایا۔ ایک دن رسول اللہؐ کی خدمت میں عائشہ صدیقہؓ گئیں۔ آپ نے دریافت فرمایا کون ہو؟ عرض کیا میں عائشہ ہوں۔ آپ نے فرمایا کون عائشہ؟ انھوں نے کہا۔ ابوبکر صدیق کی بیٹی۔ فرمایا۔ کون ابوبکرؓ؟ انھوں نے عرض کیا۔ آپ کا یار۔ پھر آپ خاموش ہو گئے۔ فرمایا اس قسم کے استغراق کا وقت تمام اولیاء اللہ پر آتا ہے۔

فرمایا۔ ملامتیوں کا ایک خاص فرقہ ہے۔ یہ لوگ تمام مشروعات کو ترک کر دیتے ہیں اور اگرچہ ان میں بظاہر امور خلافِ شرع نظر آتے ہیں لیکن ان کا باطن نورِ عرفان سے روشن ہوتا ہے۔

ایک مرتبہ فرمایا کہ سالک کو چاہیے کہ اپنے اوراد کے قبول ہونے کے متعلق نہ سوچے۔ اگرچہ سلوک کا دارومدار جذبہ قلبی پر ہے لیکن کسی طرح بھی وظیفہ ترک نہیں کرنا چاہیئے۔

اہل اللہ کی حیات و ممات کا ذکر آیا تو فرمایا۔ اولیاء اللہ کی موت اس طرح ہوتی ہے جیسے ایک آدمی ایک مکان سے اُٹھ کر دوسرے مکان میں چلا جائے۔ لہٰذا جو شخص اولیاء اللہ سے دشمنی رکھتا ہے اپنی نیت کے مطابق رنج و بلا کا شکار ہو جاتا ہے اور جو شخص ان کا معتقد ہوتا ہے سعادت دارین پاتا ہے۔

کسی نے عرض کیا۔ کیا وجہ ہے انتقال کے بعد اولیاء اللہ کا فیض اور بھی کمال کو پہنچ جاتا ہے؟ فرمایا جب اہل اللہ دنیا سے نقل کرتے ہیں تو وہ بشری اوصاف سے منزہ اور مجرد ہو کر حق تعالیٰ سے واصل ہوتے ہیں اور ان کی حرکات و سکنات معراجِ کمال کو پہنچ جاتی ہے۔

فرمایا پیر وہ ہے جو اپنے مُرید کو قلبی غنا بخشے اور دُنیا کی طرف سے اس کا دل موڑ کر محبتِ الٰہی میں مشغول کرے نہ یہ کہ اسے مال و دولت سے سیر کرے۔

کسی نے پوچھا تصورِ شیخ کس طرح کیا جاتا ہے؟ فرمایا۔ اپنے شیخ کی صورت کو سامنے رکھنا چاہیئے یا دل میں رکھنا چاہیے یا بُرقعے کی طرح اسے اپنے اُوپر اوڑھ لینا چاہیئے یا جس طرح بھی ممکن ہو سکے اپنے شیخ کی صورت کو لینا چاہیئے۔ کھانے پینے سوتے اُٹھتے بیٹھتے اور چلتے پھرتے۔ غرض کسی وقت بھی اپنے شیخ کے تصور سے

خالی نہیں رہنا چاہیئے۔ پھر فرمایا تصوّرِ شیخ ایک عظیم نعمت ہے اور گناہوں کے مقابلے میں ڈھال ہے۔ یعنی جب صوفی کو کامل تصورِ شیخ حاصل ہو جاتا ہے تو اُسے کسی گناہ کی ہمت ہی نہیں پڑتی۔

فرمایا۔ مُرید صادق کو چاہیے کہ اپنے شیخ کا اس طرح تصوّر کرے کہ اُس کے ظاہر و باطن میں شیخ کی ذات ہی جلوہ گر نظر آئے۔ ذاتِ حق کا مطالعہ اگر شیخ کے آئینے میں کیا جائے تو انسان مقصودِ حقیقی کو جلد پالیتا ہے

پھر فرمایا سلوک کی کتابوں میں شیخ کے اداب بہت سے لکھے ہیں لیکن درحقیقت ادب آموز صرف عشق ہے عشق جتنا زیادہ ہوگا۔ اسی قدر محبوب کے آداب زیادہ سے زیادہ حاصل ہوں گے۔

فرمایا ایک دن بہت سے لوگ ذوالنون مصری کی خدمت میں آئے اور انھوں نے بارش کے لیے دُعا کی التجا کی ذوالنون مصری نے صبح سویرے مدین کی طرف سفر کیا۔ خدا نے بارش عطا کی۔ کچھ مدّت کے بعد ذوالنون مصری واپس آئے تو لوگوں نے سفر کی وجہ پوچھی۔ آپ نے فرمایا۔ لوگوں کے بُرے اعمال کی شامت سے قحط پڑتا ہے۔ مَیں نے دیکھا سب سے بدکردار مَیں ہوں اسی لیے مَیں یہاں سے چل دیا۔

فرمایا۔ ایک دفعہ حضرت صابر کلیری جمعہ پڑھنے مسجد میں گئے اور صفِ اوّل پر بیٹھ گئے۔ وہاں نوسو پالکی نشین امراء آتے تھے۔ جب وہ امراء آئے تو انھوں نے خواجہ صاحب کو آہستہ آہستہ پیچھے سرکانا شروع کر دیا۔ حتیٰ کہ وہ بالکل ہی مسجد کے احاطے سے نکال دیئے گئے۔ اس سے صابر برا فروختہ ہوئے۔ جب لوگ سجدہ میں گئے تو مسجد کو حکم دیا تو بھی سجدہ کر۔ مسجد فوراً بیٹھ گئی اور تمام لوگ ہلاک ہوگئے۔

ایک دن حضرت موسیٰؑ کا ذکر چھڑا۔ فرمایا۔ آپ پر ایک وقت ایسا بھی آیا جو کوئی آپ کے چہرے پر دیکھتا اس کی آنکھیں جل جاتیں۔ اس حالت سے تنگ آکر بارگاہ کبریا میں عرض کیا کہ یہ کیفیت فرو کر دی جائے۔ حکم ہوا شعیبؑ کی گودڑی میں مُنہ لپیٹ کر بیٹھ جاؤ۔ موسیٰؑ نے تعمیل کی۔ ان کی بیوی نے عرض کیا مَیں آپ کے دیدار سے محروم ہوں۔ فرمایا۔ ممکن ہے تمہاری آنکھیں بھی جل جائیں۔ بیوی نے عرض کیا۔ مَیں ایک آنکھ سے دیکھوں گی دوسری بند رکھوں گی۔ چنانچہ اس نے اسی طرح کیا۔ حضرت موسیٰؑ نے نقاب رُخ اُلٹی تو شدّتِ نور سے اس کی ایک آنکھ ضائع ہوگئی لیکن اس نے پھر عرض کیا کہ ابھی چہرہ نہ ڈھانپنا۔ تاکہ مَیں ایک مرتبہ پھر لذتِ دید حاصل کر سکوں۔ جب اس نے دوسری مرتبہ دیکھا تو دوسری آنکھ بھی جل گئی۔ پھر بیوی نے کہا اگر میرے بدن کے ہر بال کی جگہ ایک آنکھ ہوتی تو آج مَیں بے دریغ انھیں قربان کرتی رہتی۔ جب موسیٰؑ کی یہ کیفیت فرو ہوئی تو انھوں نے بیوی کو دم کیا جس کی برکت سے بینائی بحال ہوگئی۔

توحید کا ذکر چھڑا تو خواجہ شمس الدین نے فرمایا مسئلہ وحدۃ الوجود کے اصل بانی شیخ محی الدین ابن عربی مولانا روم نے بھی اس مسئلے کو تقویت پہنچانے کے لیے مثنوی میں پُرجوش اندازِ بیان اختیار کیا۔

کسی دوست نے خواجہ صاحب سے پوچھا کیا وجہ ہے مسئلہ وحدت الوجود سے علمائے ظاہر انکار کرتے ہیں۔ فرمایا اکثر اہلِ علم تو بےخبری کی وجہ سے انکار کرتے ہیں۔ اندھے کو بینائی کا لُطف کیسے محسوس ہو؟ ورنہ درحقیقت مسئلے کی صداقت میں کسی شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔

ایک دن فرمایا: مذاہب کی راہ تقلید ہی راہ راست ہے لیکن عاشق اپنے معشوق کی تجلیات کو اپنا لیتا ہے اور عشق کے غلبے کی وجہ سے شریعت کی تنگ اور محدود راہ کو وسیع کرتے ہوئے نکل جاتا ہے۔
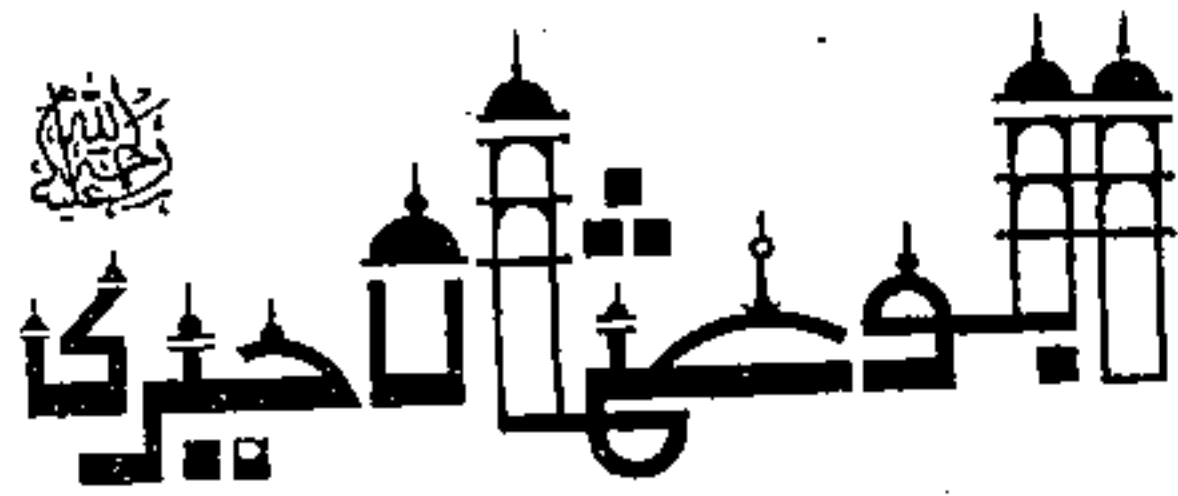
سعید نامی ایک نواب زادہ اپنے چار خادموں کے ساتھ دُنیا کے راز جاننے اور معرفت کی حقیقتوں کو پانے کے لیے کہیں جا رہا تھا۔ چلتے چلتے وہ ایک ایسی بستی میں پہنچ گئے جہاں لئے غم، دُکھ، بھوک اور مصیبتوں کے اور کچھ نہ تھا۔ ایک جگہ نواب زادے کو کسی گڑھے میں ایک بیمار گدھا ہوا ملا۔ جسے کمہار نے جان بُوجھ کر یہاں پر ڈال دیا تھا۔

گدھا اِس قدر لاغر اور کمزور تھا کہ خود بخود گڑھے سے باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ ستم ظریفی یہ تھی کہ کوّے ں غریب گدھے کے زخموں پر اپنے داؤ پیچ آزما رہے تھے۔

نواب زادے نے جب یہ کیفیت دیکھی تو اُس کا چہرہ اُداس اور رنجیدہ ہو گیا۔ اُس نے ہمرکاب اپنے خادموں ے دریافت کیا کہ گدھا یہاں کس لیے پڑا ہے؟

ایک خادم نے ہچکچاتے ہوئے کہا ممکن ہے کہ یہ اڑیل ٹٹو کسی وجہ سے زخمی ہو گیا ہو یا کمہار کے لیے اب کام کا نہ رہا ہو اور اُس نے جان بوجھ کر اُسے گڑھے میں ڈال دیا ہو۔

"مگر یہ کوّے کیا کر رہے ہیں؟ اور گدھے کا جسم لہولہان کیوں ہو رہا ہے؟"

"سرکار یہ بھوکے ہیں اور گدھے کے ماس سے اپنی بھوک مٹانے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

بات اب بھی نواب زادے کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اُس نے پھر پوچھا "کوّے ایسا کیوں کرتے ہیں؟"

"کیوں کہ وہ بھوکے ہیں اور گدھے کا گوشت کوّوں کی غذا ہے" خدمتگار نے دوبارہ وضاحت کی۔

"کیا یہ کوّے گدھے کا سارا گوشت چٹ کر جائیں گے؟" نواب زادے نے پوچھا۔ اس سے پیشتر کہ خادم وضاحت کرتا اُس کے دوسرے ساتھیوں نے اُسے ایسا کرنے سے منع کرنا چاہا مگر خدمتگار بدستور نواب ے کا تجسس بڑھاتا رہا۔

نواب زادے نے حیران ہو کر کہا "اِس کا مطلب یہ ہوا کہ گدھا مر جائے گا۔"

"جی ہاں" خادم نے کہنا شروع کیا "تمام جانداروں میں اللہ تعالیٰ نے روح پیدا کی ہے اور جب تک یہ روح جسم کے اندر رہتی ہے وہ زندہ رہتے ہیں۔ اسی طرح گدھے کے جسم میں بھی روح ابھی باقی ہے اور جب یہ روح نکل جائے گی تو پھر کوؤں کے نوچنے سے گدھے کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔"

خدمت گار کی یہ ساری باتیں سُن کر نواب زادے کی طبیعت میں عجیب قسم کی بے قراری پیدا ہوئی۔ فوراً اُس گڑھے میں اُتر گئے اور گدھے کے زخمی حصّوں پر اپنی دستار اُتار کر باندھنے لگے۔

اِدھر وہ چاروں خادم جو آپ کے ساتھ تھے وہ آپ کو اس کام سے منع کرنے لگے مگر نواب زادے نے اُنھیں بھی اپنے قریب آنے کو کہا اور پھر انھوں نے نواب زادے کے حُکم کی تعمیل کرتے ہوئے اُس کی دستار کے ٹکڑے کر کے اُسے گدھے کے زخمی حصّوں پر باندھ دیا۔

اس سارے عمل کے بعد نواب زادے کو یوں محسوس ہوا کہ جیسے وہ گدھا پہلے کے مقابلے میں قدرے سکون میں ہے اور اُس کا شکریہ ادا کر رہا ہے۔ اس کام سے فارغ ہو کر نواب زادہ اُس گدھے کے مالک یعنی کمہار کے پاس جا پہنچا اور اُس سے دریافت کیا کہ اُس نے گدھے کے ساتھ یہ سلوک کیونکر کیا؟

"جناب عالی وہ گدھا اب میرے کام کا نہ رہا تھا اور میرے پاس اتنی گنجائش نہ تھی کہ میں اُسے مفت میں چارہ کھلاتا" کمہار نے بے رُخی سے جواب دیا۔

مگر نواب زادے نے انتہائی رقت آمیز لہجے میں کمہار سے کہا "اے انسان اگر تُو بے زبان جانوروں پر رحم کھائے گا تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تیرے لیے آسانی پیدا کر دے گا۔"

نواب زادے نے کمہار کو یہ بات کچھ ایسے اثر انگیز انداز میں کہی کہ وہ تڑپ کر رہ گیا اور اُسی وقت گدھے کو گھر لے آیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ جب کمہار نے نواب زادے کی قبا کو گدھے کے جسم پر اور دستار اُس کے زخموں پر دیکھا وہ بے حد متاثر ہوا۔

اُس روز یہ نواب زادہ پہلی مرتبہ اُداس اور حیران ہوا تھا۔ دوسری جانب خدمتگار اس خیال سے خوف زدہ تھا کہ اگر سارے واقعہ کا علم نواب زادے کے والد محترم کو ہو گیا تو نہ جانے وہ اُس کے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔ چنانچہ انھوں نے انتہائی دردمندانہ انداز میں نواب زادے سے اپیل کی کہ وہ اس واقعہ کا ذکر اپنے والد محترم سے ہرگز نہ کریں۔

رات کو جب نواب زادے کے والد نے بیٹے کو پریشان اور کھویا کھویا سا پایا تو اُن کے دل کو کھٹکا۔ انھوں نے سوچا کہ ضرور کوئی خاص بات ہے جس کی وجہ سے اُن کا لختِ جگر زندگی میں پہلی بار پریشان دکھائی دے رہا ہے۔ ایک عقلمند خادم نے جو کہ دوسرے تین خادموں کے ساتھ نواب زادے کے ساتھ تھا جب یہ محسوس کر لیا کہ راز کسی بھی وقت افشا ہو سکتا ہے تو اُس نے رضا کارانہ طور پر نواب زادے کے والد کو سارا معاملہ بتا دیا۔

نواب صاحب یہ سُنتے ہی اپنے بیٹے کے کمرے میں پہنچے اور کہنے لگے "سعید بیٹا! مجھے تمہاری اُداسی کا معلوم ہو گیا ہے۔ اس پر بیٹے نے کہا۔

"ابا جان اگر میں آپ سے ایک سوال کا جواب طلب کروں تو آپ بُرا تو نہیں منائیں گے؟"

باپ نے جب اچھی طرح یقین دہانی کر دی تب بیٹے نے کہا "ابا جان کیا آپ اس بات سے آگاہ ہیں کہ دُنیا فانی ہے اور ایک دن ہر شخص کو یہاں سے رخصت ہو جانا ہے؟"

اس پر نواب صاحب نے کہا "جانِ پدر تُو نے بالکل دُرست کہا ہے واقعی تمام انسان اور حیوان ایک دن فنا ہو جائیں گے۔"

یہ سُن کر بیٹے نے کہا "ابا جان اگر یہ سچ ہے تو مجھے حیرت ہے کہ آپ اتنی زیادہ دولت اور ہیرے جواہرات کس مقصد کے لیے جمع کرتے جا رہے ہیں۔"

بیٹے کی زبان سے یہ انوکھا سوال سُن کر نواب صاحب چونک پڑے مگر اس کے باوجود تحمّل سے کہنے لگے "میرے بچے تیرا خیال کسی حد تک دُرست ہے مگر جب تک انسان کی زندگی ہے اُس کے لیے یہ سب دُنیاوی چیزیں اور مال وزر بہت ضروری ہے۔"

"حیرت ہے ابا جان! ایک طرف آپ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ دُنیا فانی ہے مگر دوسری جانب آپ حرص و طمع کے جذبے سے زر جمع کر رہے ہیں۔ میرے خیال میں تو ہم سب کو آخرت کی فکر کرنی چاہیئے۔" نواب زادے نے پختہ لہجے میں جواب دیا۔

اِدھر نواب صاحب نے جب یہ اندازہ لگا لیا کہ اُن کا بیٹا سعید اپنی بات پر ڈٹ گیا ہے تو وہ خاموشی سے واپس اپنے کمرے میں لوٹ آئے مگر اُن کے بیٹے کے دل ودماغ میں جو روحانی انقلاب کروٹ لے رہا تھا وہ کسی طور بھی ٹلنے والا نہیں تھا۔

نواب زادے نے دوبارہ ایک خدمتگار کو اپنے کمرے میں بلوایا اور اُس سے دُنیا کی حقیقت حال دریافت کرنے لگا۔ اُس کا سوال یہ تھا کہ جب انسان دُنیاوی رازوں سے واقف ہو جاتا ہے تو پھر وہ کیا کرتا ہے؟۔ خدمتگار کا کہنا تھا کہ اس صورت میں وہ دنیا سے فرار چاہتا ہے جب کہ دُنیا اُس کا پیچھا کرتی ہے مگر اُسے دُنیا کی آسائشوں سے نفرت ہو جاتی ہے۔

یہ سُنتے ہی نواب زادے کے چہرے پر ایک روحانی خوشی کی لہر دوڑ گئی اور اُس نے خادم سے دریافت کیا کہ اس قسم کے لوگ کہاں پر مل سکتے ہیں۔ خدمتگار نے کہا کہ ایسے عظیم الشان جو مردِ قلندر کہلاتے ہیں بغداد، شام، خراساں اور نیشاپور وغیرہ میں رہتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی خدمتگار نے شاہ شجاع، ابو حفص اور جنید بغدادی وغیرہ کے اسمائے گرامی گنوا دیئے جو کہ ہر قسم کا جاہ و جلال اور تخت وتاج چھوڑ کر گوشہ نشین ہو چکے تھے۔

خادم کی زبانی ان بزرگ ہستیوں کے نام اور کارنامے سُن کر نواب زادے نے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ کرمان میں شاہ شجاع کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتے ہیں اور اُن سے یہ دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ انھوں نے بادشاہی چھوڑ کر گدائی کیوں اختیار کی۔

خدمت گار نے عرض کی "نواب زادہ صاحب! میں اس سلسلے میں آپ کی مدد تو کر سکتا ہوں مگر آپ کے والد محترم مجھے اس کی جو کڑی سزا دیں گے میں تو اُس کے تصوّر سے ہی کانپ رہا ہوں لیکن آپ کے نیک جذبے کی خاطر میں ہر قسم کی سزا برداشت کرنے کو تیار ہوں کیونکہ میں جو کچھ کروں گا وہ آپ کی خوشی کے لیے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے کروں گا۔"

دوسری جانب نواب صاحب بھی اپنے بیٹے کے انقلابی عزائم کو بھانپ کر خاصے چوکس ہو گئے۔ انھوں نے حفظِ ماتقدم کے طور پر تمام پُرانے خادموں کو رُخصت کر دیا اور نئے خدمتگاروں کو سختی سے ہدایت کر دی کہ وہ سعید پر کڑی نگاہ رکھیں اور اگر وہ کہیں اِدھر اُدھر جائے تو اُس کی سختی سے نگرانی کی جائے۔

صرف یہی نہیں بلکہ بیٹے کو مزید قابو میں رکھنے کے لیے نواب صاحب نے اپنے ایک تاجر دوست کی بیٹی سے

اُس کی نسبت بھی ٹھہرا دی۔ یہ ساری کارروائی بیٹے سے قطعی طور پر خفیہ رکھی گئی اور ایک دن ڈرامائی طور پر اُس لڑکی کے ساتھ نواب زادے کی شادی کر دی گئی۔

کرنا خدا کا کیا ہوا کہ نواب زادے کی خوبصورت اور دلکش بیوی نے شادی کی رات اُس سے پہلا سوال یہی کیا۔ "کیا یہ دُرست ہے کہ وہ اس دنیا کو اچھا تصور نہیں کرتے؟"

نواب زادے نے جب ہاں میں جواب دیا تو دُلہن نے اگلا سوال کر دیا۔ کہنے لگی "ذرا مجھ پر ایک نگاہ ڈال کر بتائیے کہ یہ دُنیا کیسی ہے؟"

نواب زادہ بھی اپنے ارادے کا بہت پکّا تھا کہنے لگا۔ "مَیں تیرے بے مثال حُسن کا معترف ہوں مگر دُنیا کے بارے میں میرا اب بھی وہی نظریہ ہے جیسا کہ تُو نے سُن رکھا ہے۔"

اب تو نئی نویلی دُلہن کو اپنا مستقبل انتہائی تاریک اور مایوس کن دکھائی دینے لگا۔ نواب زادے نے بھی بیوی کی کیفیت بھانپ لی اور بولا۔ "تُو مت گھبرا اگر مَیں نے دُنیا چھوڑ بھی دی تو تب بھی تجھ سے قطع تعلق نہ کروں گا۔"

شادی کے بعد تھوڑے عرصہ کے لیے نواب زادے کی زندگی میں قدرے ٹھہراؤ اور سکون آ گیا۔ اسی دوران ایک بچّی بھی پیدا ہو گئی مگر دل میں دنیا سے نفرت کا جو جذبہ پیدا ہو چکا تھا وہ ختم نہ ہوا۔ بیوی نے ہر ناز و ادا سے شوہر کا دل بہلانا چاہا، نواب صاحب نے بیٹے کو زمینداری کی جانب راغب کر کے اُس کی توجہ بٹانی چاہی مگر بیٹا ایک مرتبہ جو ارادہ کر چکا تھا اُس میں ذرا بھی لغزش نہ آئی۔ بار بار اُس کے ذہن میں یہ سوال اُٹھ رہا تھا کہ کرمان کے حکمران شاہ شجاع نے بادشاہی چھوڑ کر کیوں گدائی اختیار کر لی۔

اب تو نواب زادے کی بے قراری انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ ایک شام جب سب گھر والے سو گئے تو نواب زادہ صاحب بے چینی کے عالم میں چہل قدمی کرنے لگے۔ رات کے پچھلے پہر وہ اپنی بیوی اور بچّی کے سرہانے کھڑا ہو کر ان کی صورت کو دیکھتا رہا اور پھر صبح ہوتے ہی نواب زادہ سعید ایک خدمتگار کے ہمراہ شاہ شجاع کے پاس جا پہنچا۔

ایک مُرید حجرے سے باہر نکلا اور اُس نے نواب زادے سے دریافت کیا کہ کیا آپ مرو سے آئے ہیں اور آپ کا نام سعید ہے؟"

نواب زادے نے ہاں میں جواب دیا تب وہ شخص آپ کو اپنے ہمراہ اندر حجرے میں لے گیا۔ شاہ شجاع تشریف فرما تھے۔ وہ نواب زادے کو دیکھتے ہی بولے: "کیا تُو یہاں آنے کے لیے بہت بے چین تھا؟"

نواب زادے نے حیرانی سے جواب دیا "جی ہاں بالکل ایسا ہی تھا۔"

اس پر شاہ شجاع نواب زادے سے کہنے لگے "سعید بیٹا تُو نے اس بات کا بخوبی اندازہ تو لگا لیا ہو گا کہ جس دنیا سے چل کر تُو یہاں تک آیا ہے وہ ہماری دنیا سے بہت جُدا ہے۔ یہاں پر روح کو سکون تو مل جاتا ہے مگر جسمانی بے سکونی بدستور رہتی ہے۔ لہٰذا ہماری اس روحانی دُنیا کو اختیار کرنے سے پہلے تُو بھی طرح سوچ لے کیا اپنے ارادے پر قائم بھی رہ سکے گا؟"

نواب زادے کو یوں احساس ہوا جیسے شاہ شجاع اُس سے کچھ چھپا رہے ہیں۔ اس نے دل کو مضبوط کر کے شاہ شجاع سے دریافت کیا "حضرت کیا آپ کو میرا یہاں آنا ناگوار گزرا ہے؟"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ مَیں تجھ کو اپنے حلقۂ ارادت مندوں میں شریک کرتے وقت محض یہ سوچ

تھا کہ کیا تُو بیوی بچّوں' والدین اور عزیز رشتہ داروں کے حقوق ادا کرنے کے بعد یہاں آیا ہے ؟"

اب تو نواب زادہ پھر پریشان ہو گیا مگر کچھ سوچتے ہوئے بولا " پیرو مُرشد ! میرے والد بہت امیر کبیر ہیں اُن کے پاس ہر طرح کی آسائش دُنیا موجود ہے. اسی لیے میرے خیال میں میری غیر موجودگی یا غیر حاضری سے انھیں کچھ فرق نہیں پڑے گا ."

شاہ شجاع نے جب نواب زادہ کی یہ بات سُنی تو چند لمحے خاموش رہے اور پھر فرمانے لگے " دیکھ سعید ! مجھے تیرے بارے میں ایک مدّت سے بتایا جا رہا تھا اور مَیں تیرا شدّت سے منتظر تھا لیکن جب مجھے علم ہوا کہ تیری ایک بیوی اور ایک بچّی بھی ہے تو مَیں کانپ اُٹھا. مَیں نے سوچا کہ تُو دنیا کو کس طرح ترک کرے گا. اب اگر مَیں نے تجھے اپنی مُریدی میں لے لیا تو قیامت کے دن تیری بیوی اور بچّی کو کیا جواب دوں گا ."

" تو پھر مجھے کیا کرنا چاہیے پیرو مُرشد ؟" نواب زادہ نے بے بسی کے عالم میں پُوچھا .

" سعید مَیں تجھے پھر یہی مشورہ دوں گا کہ اگر تُو اپنی بیوی اور بچّی کا خیال رکھنے کا وعدہ کرلے تو اس صورت میں تیرے لیے درویشی کے دروازے کُھل سکتے ہیں . کیونکہ جو شخص حقوق العباد پُورے کرنے کا اہل نہیں ہوتا اُسے ترکِ دُنیا کر کے کچھ حاصل نہیں ہوتا" شیخ شجاع نے واضح طور پر اپنا فیصلہ سُنا دیا .

چنانچہ نواب زادہ اس بات پر آمادہ ہو گیا کہ وہ حقوق العباد بھی پُورے کرے گا مگر درویشی کے راستے کو کبھی ترک نہیں کرے گا. اس کے بعد شاہ شجاع کی اجازت سے نواب زادہ واپس اپنے گھر چلا گیا. والدین اپنے لختِ جگر کو دیکھ کر خوشی سے پھولے نہ سمائے . بیوی اور بچّی کو تو گویا جنّت مل گئی . انھوں نے پوچھا " آپ کہاں چلے گئے تھے ؟"

نواب زادہ نے جواب دیا کہ مجھے ایک بیماری لاحق ہو گئی تھی . اس لیے ایک طبیب کی تلاش میں نکلا تھا .

" مگر اب آپ کہیں نہیں جائیں گے اور میرے ہی رہیں گے ."

نواب زادہ سعید پر دوبارہ درویشی کا جنون غالب آگیا کہنے لگا . " مجھ پر خدائے بزرگ و برتر اور اس کی مخلوق کے حقوق واجب الادا ہیں . اب مَیں اگر بندوں کے حقوق ادا کرتا ہوں اور حقوق اللہ کو فراموش کر دوں تو مَیں اپنی ذات پر بہت ظلم کروں گا .

یہ سُن کر بیوی بہت رنجیدہ ہوئی اور رونے لگی . مگر نواب زادہ نے اُسے یقین دلایا کہ وہ اس کے حقوق کا پورا پورا خیال رکھے گا مگر اپنے پیرو مُرشد شیخ شجاع کا پلّہ ہرگز نہ چھوڑے گا اور پھر اپنے وعدے کے مطابق نواب زادہ سعید دین اور دُنیا دونوں کے تقاضوں کو پورا کرتا رہا .

ایک مرتبہ جب شاہ شجاع نیشا پور جا رہے تھے تو نواب زادہ بھی اُن کے ساتھ ہو لیا . نیشا پور کے محلہ حیری میں ابو حفص حداد قیام پذیر تھے جو پیشہ کے اعتبار سے لوہار تھے اسی لیے اُن کے نام کے ساتھ حداد لگا ہوا تھا جس کے معنی لوہار ہیں .

ابو حفص نے شاہ شجاع کے ہمراہ جب ایک اجنبی کو دیکھا تو دریافت فرمایا کہ یہ کون ہے ؟ شاہ شجاع نے جواب دیا" ان کا نام سعید ہے ان کا تعلق مرو کے ایک نواب خاندان سے ہے اگرچہ انھیں ہر طرح کی دنیاوی آسائش میسّر ہے مگر یہ روحانی سکون کی تلاش میں میرے پاس آئے ہیں ."

شاہ شجاع کی بات سُن کر ابو حفص نے نواب زادہ کو تیکھی نظروں سے دیکھا اور پھر شاہ شجاع صاحب سے کہنے لگے " اگر آپ مناسب فرمائیں تو نواب زادہ کو کچھ دنوں کے لیے میرے پاس چھوڑ جائیں کیونکہ مجھے ان میں

ایک مکمل باعمل درویش نظر آتا ہے۔ پھر وہ خود ہی نواب زادہ سے پوچھنے لگے: "اے سعید کیا آپ میرے پاس رہنا پسند کریں گے؟"

نواب زادہ نے فوراً اثبات میں جواب دیا۔ اس پر ابوحفص کہنے لگے: "یہ میرے پاس آپ کے ذریعے آئے ہیں اس لیے آپ کا نام ہمیشہ ان سے منسوب رہے گا۔" نواب زادہ نے ابوحفص سے درخواست کی کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں شاہ شجاع کی خدمت بھی کر لیا کروں۔ ابوحفص نے اس کی اجازت دے دی۔

چنانچہ شاہ شجاع تو چند روز بعد واپس آ گئے اور نواب زادہ ابوحفص کے پاس ہی رہ گئے۔ اب آپ کا واسطہ ابوحفص حداد سے تھا۔ انھوں نے نواب زادہ سے پوچھا۔ تمہاری بیوی بچے کہاں ہیں؟

"میری بیوی اور بچے دونوں مرو میں رہتی ہیں۔ والدین بھی وہیں پر مقیم ہیں۔" نواب زادہ نے جواب دیا۔

پھر ابوحفص حداد کہنے لگے۔ "ایک بار پھر سوچ لو سعید! اگر تم میرے ساتھ نیشاپور میں رہو گے تو تمہیں بے پناہ مشکلات اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یہ بہت بڑی آزمائش ہو گی۔ کیا تم اس پر پورا اتر سکو گے۔

"میں ہر کٹھن اور پریشانی کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہوں۔" نواب زادہ نے جواب دیا۔ اگر میرے والدین اور بیوی میری راہ میں حائل ہونے کی کوشش کریں گے تو میں انھیں بھی چھوڑ دوں گا۔"

"نہیں ایسا ہرگز نہ کرنا۔" ابوحفص حداد نے نواب زادہ کو ٹوک دیا۔ "سعید! شاید تم یہ نہیں جانتے کہ حقوق العباد سے کوتاہی کرنے والے کبھی بھی درویشی کی راہ کو نہیں پا سکتے۔"

ابوحفص کی نصیحت سن کر نواب زادہ صاحب فوراً گھر واپس آئے۔ آپ کی بیوی خاصی پریشان تھی لیکن والدین اس کے لیے رضامند ہو چکے تھے کیوں کہ انھیں جس بات کا خدشہ تھا بالکل ویسا ہی ہو چکا تھا اور انھیں معلوم تھا کہ ان کا بیٹا اب درویشی کی راہ سے واپس نہیں لوٹ سکتا۔ مگر آپ کی بیوی نے روتے ہوئے کہا: "میرے مالک آپ اب میرے ساتھ ہی رہیں۔ اگر آپ نے میری بات نہ مانی تو آپ اپنے حقوق سے غفلت کے مرتکب ہوں گے جو کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک ناپسندیدہ عمل ہے۔ جب کہ آپ درویشی کی راہ پر اللہ کی تسلیم و رضا کے لیے چل رہے ہیں۔"

نواب زادہ نے بیوی سے کہا۔ "اگر ایسا ہی ہے تو تو بھی میرے ساتھ نیشاپور چل۔ جس زندگی کی تو بات کرتی ہے اس میں سوائے شرمندگی اور ندامت کے کچھ نہیں ہے لیکن اس زندگی سے نجات اور فلاح کا راستہ نہیں ملتا۔ اگر تو میرے ساتھ یہ ساری تکالیف برداشت کر سکتی ہے تو میں تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کو تیار ہوں۔"

آپ کی بیوی نے چند لمحے موجودہ آسائشوں، درویشی کی راہ میں آنے والی دشواریوں اور آزمائشوں کا موازنہ کیا اور پھر انتہائی پختہ ارادے کے ساتھ نواب زادہ سے بولی کہ وہ ان کے ساتھ ہی جائے گی۔ نواب زادہ بیوی کے اس فیصلے سے بہت مسرور ہوئے۔ پھر انھوں نے والدین کو بھی اپنی بیوی کے ارادے سے مطلع کر دیا۔ ماں تو یہ سن کر خاصی پریشان ہوئی مگر باپ انھیں سمجھاتے ہوئے کہنے لگا "شریف عورت! رنجیدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں نے تو بہت پہلے اندازہ لگا لیا تھا کہ میرا بیٹا جن راہوں پر چل نکلا ہے وہ خداشناسی کی طرف جاتی ہیں۔ جب عارفوں کی تاریخ مرتب ہو گی تو اس میں میرے بیٹے کا ذکر بھی ہو گا اور عین ممکن ہے کہ ہمارا یہ درویش منش بیٹا قیامت کے روز ہماری نجات کا سبب بن جائے۔"

یہ سن کر نواب زادہ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے مگر ان کے ارادے میں کوئی لغزش نہ آئی۔ اسی وقت آپ اپنی بیوی اور بچی کے ہمراہ نیشاپور روانہ ہو گئے۔ ابوحفص حداد نے انھیں نیشاپور میں ہی رہنے کے لیے

ایک مکان مہیا کر دیا۔ نواب زادہ صاحب بھی اپنے مرشد ابوحفص حداد کے ساتھ لوہے کا کام کرنے لگے۔ اسی جگہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک بیٹا عطا کیا۔ ابوحفص نے نواب زادہ سعید کے اس بیٹے کا نام عثمان تجویز کیا اور اسی نسبت سے نواب زادہ سعید "ابوعثمان" کے نام سے مشہور ہوئے۔

آپ کے مرشد ابوحفص نے ایک روز فرمایا " میں بھی کتنا خوش نصیب ہوں کہ جس کو میں نے عبا میں تلاش کیا اُس کو میں نے اپنی قبا میں موجود پایا۔ ابوحفص کا یہ اشارہ شاہ شجاع کرمانی اور ابوعثمان کی طرف تھا کہ انہوں نے بادشاہی کو ٹھکرا کر گدائی کا لبادہ اوڑھ لیا۔

حضرت ابوعثمان ایک روز اپنے وقت کے عظیم جیّد اور عالم یحییٰ بن معاذ کے پاس چلے گئے۔ یحییٰ بن معاذ نے اُن سے دریافت فرمایا کہ اب تک وہ کیوں اُن سے دُور رہے ؟

" اعلیٰ حضرت! میں تو آپ کے پاس آنے کے لیے کافی عرصہ سے بیتاب تھا مگر بعض طاقتیں مجھے آپ کے قریب آنے سے روک رہی تھیں۔" ابوعثمان نے جواب دیا۔ لیکن اب غیبی طاقت نے میری مدد اور رہنمائی کی ہے جس کے باعث میں آپ تک پہنچنے میں کامیاب ہوا ہوں۔"

اس پر یحییٰ بن معاذ فرمانے لگے۔" ابوعثمان تم جیسی شان رکھنے والے فقیر اس دنیا میں بہت کم پیدا ہوں گے۔" آپ نے کچھ عرصہ تک یحییٰ بن معاذ کے ہاں قیام کیا۔ اور پھر واپس ابوحفص کی خدمت میں حاضر ہوگئے۔

ایک روز اچانک ابوحفص کسی بات پر ابوعثمان سے ناراض ہوگئے۔ آپ نے بہتیری منت سماجت کی اور التجائیں کرتے ہوئے گزارش کی کہ حضور میرا قصور تو بتائیں مگر ابوحفص نے کوئی وجہ بیان نہ فرمائی لہٰذا اس کے بعد ابوعثمان نے آپ ہی کے آستانے کے برابر ایک دیوار کی اوٹ میں رہنا شروع کر دیا۔ آپ دیوار میں ذرا سا سوراخ کر کے کبھی کبھار اپنے پیر و مرشد کا دیدار بھی کر لیتے۔ اُدھر جب ابوحفص کو آپ کی اس دیوانگی کا علم ہوا تو انھوں نے دوبارہ ابوعثمان کو اپنے قریب رہنے کی اجازت فرما دی۔ کافی عرصہ کے بعد آپ کو یہ مقام حاصل ہو گیا کہ آپ ابوحفص کی موجودگی میں اپنے مُریدوں اور محبوں میں وقت گزارنے لگے گویا پیر و مُرشد کی جانب سے ابوعثمان کو اجازت مل گئی تھی کہ وہ اپنے طور پر رشد و ہدایت کا کام شروع کر دیں۔

روایت ہے کہ ابوعثمان ایک روز مُریدوں کو پاس بٹھا کر انھیں صراطِ مستقیم پر چلنے کی ہدایت فرما رہے تھے۔ ایک مُریدِ خاص نے گزارش کی کہ حضرت یوں تو میں ہر لمحہ ہر آن ذکرِ الٰہی میں مصروف رہتا ہوں لیکن قلبی طور پر پھر بھی غیر مطمئن سا رہتا ہوں۔ اس کا کیا کیا جائے ؟

ابوعثمان نے جواب دیا:" اے خوش بخت انسان! قدرت نے تیری زبان کو جو لذت عطا کی ہے تُو اس کا شکر یہ ادا کرتا رہ تاکہ دوسرے اعضاء بھی لذتیں حاصل کر لیں۔ یہ سُن کر وہ مُرید پہلے سے زیادہ یکسوئی کے ساتھ عبادت میں مصروف ہو گیا۔

ابوعثمان انتہائی صابر و شاکر تھے۔ دوسروں کو معاف کر دینے کا جذبہ آپ میں بدرجۂ اتم موجود تھا۔ ایک مرتبہ آپ اپنے مُریدوں کے ساتھ بازار تشریف لے جا رہے تھے۔ جہاں دونوں جانب مختلف انواع و اقسام کی بے شمار دکانیں موجود تھیں۔ کہیں کہیں ان دُکانوں کی چھتوں پر لوگوں نے اپنی رہائش اختیار کر رکھی تھی۔

یوں ہی چلتے چلتے جب آپ ایک ایسی ہی دُکان کے قریب سے گزرے تو اُوپر سے کسی نے بہت ساری گرم راکھ آپ کے اُوپر ڈال دی۔ جس سے آپ کے جسم کے مختلف حصّوں کو اذیت پہنچی اور اسی تکلیف کے عالم میں

ایک کونے میں کھڑے ہو گئے۔ جب اُوپر نگاہ اُٹھا کر دیکھا تو وہاں کوئی بھی نظر نہ آیا۔ ابو عثمان کے ہمرکاب بعض مُرید بھی اس واقعہ سے باخبر ہو گئے لیکن چند مُرید اب بھی بے خبر تھے۔ انھوں نے آپ کو پریشان دیکھ کر دریافت کیا کہ پیر و مُرشد کیا ماجرا ہوا آپ کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہیں۔

ابو عثمان نے مُریدوں کو ٹالنے کی کوشش کی اور کہا "کوئی بات نہیں" مگر ایک مُرید نے عرض کیا: کتنا ظالم تھا وہ بدبخت شخص جس نے آپ کے مبارک جسم پر گرم گرم راکھ ڈال دی"۔

ابو عثمان نے مُریدوں کو دوبارہ منع فرمایا کہ وہ راکھ پھینکنے والے کو بُرا بھلا نہ کہیں کیونکہ میرا سَر اور جسم دونوں ہی آگ کے مستحق تھے مگر انھیں کم سے کم گرم راکھ کی صورت میں سزا دی گئی۔

ایک روز آپ نے ایک شرابی کو دیکھا جو نشے کی حالت میں بدمست اپنی ہی دُھن میں کہیں چلا جارہا تھا مگر اُس نے جب آپ کو دیکھا تو نشے کی حالت میں بھی پہچان گیا اور مارے شرم کے اپنا سَر نیچے کی طرف جُھکا لیا۔ ابو عثمان کو اُس شرابی کی یہ ادا بہت پسند آئی۔ انھوں نے شرابی کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا: "تُو کہاں دھکّے کھاتا پھرے گا اس لیے بہتر ہے کہ میرے ساتھ چل"۔

چنانچہ ابو عثمان نے اُس شرابی کو اپنے ہمراہ گھر لے آئے۔ اپنے ہاتھوں سے نہلا دُھلا کر اُسے خرقہ پہنا دیا اور پھر اُس کے حق میں دُعا فرمائی۔

"اے اللہ جو کام میرے اختیار میں تھا وہ تو مَیں نے کر لیا۔ اب وہ کام جو تیرے اختیار میں ہے اُسے تُو انجام دے۔"

ابھی آپ دُعا مانگ ہی رہے تھے کہ شرابی کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کا نشہ ہرن ہو چکا ہو اور ایک انتہائی روشنی سے اس کے دل و دماغ روشن ہو گئے ہوں۔ یوں لگتا تھا جیسے اب وہ کسی اور ہی بلند مقام پر فائز ہو چکا ہو۔ آپ کو اپنی دُعا کے اس فوری شرفِ قبولیت پر خود بھی بہت حیرت اور مسرت ہوئی۔ حُسنِ اتفاق سے اُس وقت آپ کے ہم نام بزرگ صوفی ابو عثمان مغربی بھی وہاں پہنچ گئے۔ انھوں نے جب آپ کے سامنے ایک شرابی کو کھڑے پایا تو وہ کانپ اُٹھے اور ابو عثمان سے دریافت کیا کہ یہ کون سے بزرگ ہیں کیونکہ اُن کی روحانی طاقت کے سامنے مَیں خود کو انتہائی بے بس سا محسوس کر رہا ہوں۔

ابو عثمان نے جواب دیا "جو شخص آپ کو بظاہر بزرگ نظر آرہا ہے چند لمحے پہلے یہ محض ایک شرابی بھٹکا ہوا انسان تھا۔" اس کے ساتھ ہی آپ نے انھیں پوری تفصیل بتا دی۔

سارا واقعہ سُن کر ابو عثمان مغربی بے اختیار پُکار اُٹھے "اے ابو عثمان حیری! آپ کی زبانی سارا واقعہ سُن کر مَیں رشک اور حسد کی آگ میں جلنے لگا ہوں۔ یہ شرابی چند لمحوں میں جس مرتبہ کمال پر پہنچ گیا ہے مَیں پوری زندگی میں سخت عبادتوں اور ریاضتوں کے باوجود اُس مقام کو حاصل نہ کر سکا۔

ابو عثمان نے مسکراتے ہوئے فرمایا "اس عمل پر تو مَیں بھی حیرت زدہ رہ گیا ہوں لیکن اس سے مَیں نے نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا انحصار محض عمل پر نہیں ہوتا بلکہ یہ فیضانِ نظر اور قلبی کیفیات کا کرشمہ بھی ہے۔

حضرت ابو عثمان حیری کو اکثر یہ فکر دامن گیر رہتی کہ انجانے میں اُن سے کوئی ایسا کام سرزد نہ ہو جائے جو خدا کے نزدیک ناپسندیدہ ہو۔ شاید یہی وجہ تھی کہ آپ ہر وقت خود کو عبادات و ریاضات میں مصروف رکھتے تاکہ دنیا کی بُرائیوں کی جانب آپ کی نگاہ نہ پڑے۔ ایک مرتبہ نیشاپور کا ایک تاجر کہیں

سے آیا اور خاموشی سے آپ کی مجلس میں بیٹھ کر آپ کا وعظ سننے لگا۔ جب آپ نے وعظ ختم کیا تو اُسے اپنے قریب بلوا کر آمد کا مقصد دریافت کیا۔

تاجر نے کہا کہ وہ تنہائی میں آپ سے کچھ عرض کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ جب تمام مُرید باہر چلے گئے تو تاجر کہنے لگا۔

"حضرت شہر اصفہان سے ایک بیوپاری آیا تھا۔ اُس نے مجھ سے کچھ مال اُدھار لیا تھا اور وعدہ کیا تھا آئندہ سال وہ اُس مال کی ادائیگی کر دے گا مگر ایک سال گزرنے کے باوجود وہ ادائیگی پر آمادہ نظر نہیں آتا۔ اب مجھے اطلاع ملی ہے کہ وہ ہرات میں آکر ٹھہرا ہوا ہے مگر نیشا پور نہیں آنا چاہتا تاکہ کہیں میں اُس سے رقم کا مطالبہ نہ کر بیٹھوں۔" پھر تاجر نے کہا "حضور! میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں فوری طور پر ہرات پہنچنا چاہتا ہوں مگر ایک مجبوری میری راہ میں حائل ہے۔ اگر آپ میری مدد فرمائیں تو میں تاحیات آپ کا احسان مند رہوں گا۔"

"تمہاری کیا مجبوری ہے؟" ابوعثمان حیری نے دریافت فرمایا۔

وہ تاجر جھجکتے ہوئے کہنے لگا۔ "کچھ عرصہ پہلے مجھے ایک کنیز پسند آئی تھی جسے میں نے خرید لیا تھا۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ اگر اُس کنیز کو تنہا گھر میں رکھتا ہوں تب بھی خطرہ درپیش رہتا ہے اور اگر اُسے سفر پر ہمراہ لے جانے کا سوچتا ہوں تو اس صورت میں بھی مشکلات نظر آتی ہیں۔ اگر آپ اُس کنیز کو اپنے پاس بطور امانت رکھ لیں تو میں واپسی پر اُسے اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

"تمہاری واپسی کا امکان کب تک ہے۔" ابوعثمان نے پوچھا۔

تاجر نے بتایا کہ وہ زیادہ سے زیادہ تین ماہ تک واپس لوٹ آئے گا۔"

ابوعثمان تاجر کی بات سُن کر چند لمحے سوچتے رہے اور پھر تاجر سے کہنے لگے۔ "اُس کنیز کو میرے بیوی بچّوں کے پاس چھوڑ دے اور اُسے اس بات کی سختی سے تاکید کر دے کہ وہ میرے حجرے کی جانب ہرگز نہ آئے۔"

اب تو تاجر کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اُس نے فوری طور پر کنیز کو ابوعثمان کے بیوی بچّوں کے پاس چھوڑا اور خود ہرات روانہ ہوگیا اور وہاں پہنچ کر جب اُسے پتہ چلا کہ مذکورہ تاجر وہاں سے غزنی جاچکا ہے تو وہ بھی اُس کے پیچھے پیچھے غزنی روانہ ہوگیا۔

اِدھر ابوعثمان حیری اس کوشش میں تھے کہ کسی بھی طور اُن کی نگاہ اُس کنیز پر نہ پڑے۔ اس لیے وہ گھر میں بہت کم آنے لگے تھے۔ دوسری جانب آپ کی بیوی عورت ہونے کے باوجود کنیز کی خوبصورتی سے بہت متاثر تھی۔ وہ اکثر دل میں سوچتی کہ ایسی کنیز کو تو کسی محل میں ملکہ بن کر رہنا چاہیئے تھا۔

ایک روز ابوعثمان حیری کی بیوی نے اُن سے کہا کہ آپ ذرا غور سے اس کنیز کو دیکھیں۔ اُس کی خوبصورتی دیکھ کر آپ بھی حیرت زدہ رہ جائیں گے۔

"مگر یہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے؟" ابوعثمان نے کہا۔

"اس میں مشکل والی کون سی بات ہے۔ کنیز گھر میں موجود ہے آپ جب چاہیں اُسے دیکھ سکتے ہیں۔" آپ کی بیوی نے ایک طرح سے آپ کو آزمائش میں ڈال دیا تھا جس کی وجہ سے لاشعوری طور پر آپ کا دھیان اس کنیز کی طرف منتقل ہوتا جارہا تھا۔ پھر اچانک ایک روز جب ابوعثمان حیری نے کنیز کو اپنے حجرے میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تو حیرت زدہ رہ گئے مگر کنیز آپ کو دیکھ کر ذرا برابر پریشان نہ ہوئی اور بڑھے

اعتماد سے کہنے لگی: کیا آپ ہی ابوعثمان ہیں؟"
"میں تو ابوعثمان ہی ہوں مگر تم یہاں حجرے میں کس لیے آئی ہو؟" ابوعثمان نے پوچھا۔
اس پر کنیز کہنے لگی" میں یہاں آپ سے یہ دریافت کرنے آئی ہوں کہ وہ تاجر جو مجھے آپ کے پاس بطور امانت رکھ کر گیا ہے کب تک واپس لوٹ آئے گا۔"
آپ نے جواب دیا" اُس نے دو تین ماہ بعد آنے کے لیے کہا تھا۔ مقررہ مدت تو یقیناً گزر چکی ہے بہرحال امید ہے کہ وہ جلد ہی واپس لوٹ آئے گا۔"
"وہ تو درست ہے بزرگوار مگر میں کیا کروں۔ میرا تو یہاں پر دم گھٹنے لگا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ میں کسی سے بات بھی نہیں کر سکتی۔ آخر مجھے کس جرم کی یہ سزا مل رہی ہے۔" کنیز کے انداز میں ایک قسم کا شکوہ تھا۔
ابوعثمان معلوم نہیں اس کا کیا جواب دینا چاہتے تھے مگر غیر ارادی طور پر انھوں نے کنیز سے کہہ دیا کہ جب کبھی طبیعت مضمحل ہو تو یہاں چلی آیا کرو۔ میں تمہارا مسئلہ سن لیا کروں گا۔"
اِدھر خلافِ توقع کنیز نے جو یہ الفاظ سُنے تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اُس نے مسکراتے ہوئے آپ کا شکریہ ادا کیا اور اگلے روز آنے کا وعدہ کر کے واپس چلی گئی۔ مگر اس کے جاتے ہی ابوعثمان حیری کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ خود سے کہنے لگے کہ یہ میں نے کیا کر دیا۔ کنیز تو ایک طرح سے میرے ایمان کا سودا کر کے چلی گئی ہے
پھر اُسی روز جس وقت آپ عشاء کی نماز پڑھنے کا ارادہ کر رہے تھے تو آپ کو اس مہ لقا کنیز کا خیال آگیا جس سے دل و دماغ پر ایک عجیب قسم کا سرور چھا گیا۔ الغرض یہ کہ کنیز کے تصور نے اُن کی پُرسکون زندگی میں اس قدر خلل ڈال دیا کہ آپ فوراً اپنے پیرومرشد ابوحفص حداد کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انھیں سارا ماجرا سُنا کر کہنے لگے کہ کنیز نے اُنھیں آزمائش کی بھٹی میں ڈال دیا ہے۔
آپ کے پیرومُرشد نے پورا واقعہ سننے کے بعد کہا: اب میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں۔ تجھ سے کس نے کہا تھا کہ اُس زہد شکن کنیز کو اپنے گھر میں پناہ دے۔
اب تو ابوعثمان حیری بچوں کی طرح رونے لگے۔ اس قدر آنسو بہائے کہ آپ کی ڈاڑھی بھیگ گئی۔ اپنے مُرشد سے کہنے لگے کہ اگر وہ حسینہ چند روز مزید اُن کے ہاں رہی تو وہ تباہ و برباد ہو جائیں گے۔
ابوحفص حداد کہنے لگے" ابوعثمان میں اس سلسلے میں تمہاری رہنمائی نہیں کر سکتا۔ تم 'رے' شہر میں چلے جاؤ وہاں یوسف بن حسین مقیم ہیں وہی تمہارے اس مسئلے کا حل بتا سکتے ہیں۔"
ابوعثمان نے کہا' پیرومُرشد رے تو نیشاپور سے بہت زیادہ دُور ہے۔"
"کچھ بھی ہو اب تو تمہیں وہاں جانا ہی پڑے گا۔" ابوحفص حداد نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔
ابوعثمان کسی نہ کسی طور رے شہر پہنچ گئے اور لوگوں سے پوچھا' یہاں کوئی یوسف بن حسین رہتے ہیں؟"
لوگ آپ کے اس سوال پر بہت حیران ہوئے اور کہنے لگے کہ آپ یوسف بن حسین ایسے زندیق کے ہاں کیا لینے جائیں گے اُس کو تو پورے شہر نے چھوڑ رکھا ہے: وہاں پر موجود ایک شخص نے کہا۔
"جناب آپ تو خود شکل سے بزرگ معلوم ہوتے ہیں۔"
مگر جب ابوعثمان حیری یوسف بن حسین سے ملنے پر بضد رہے تو ایک شخص آپ کو یوسف بن حسین کے گھر تک پہنچانے کے لیے آپ کے ساتھ ہو لیا۔
آپ کو ساتھ لے جانے والے شخص نے آپ کو ایک دکان میں کھڑا کیا اور آپ کو خاموشی سے ایک

ی کے راستے دُکان کے اندر دیکھنے کا اشارہ کیا۔
ابوعثمان نے دیکھا کہ اندر ایک شخص ایک خوبصورت لڑکے کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے اور پاس ہی شراب
راحی رکھی ہوئی ہے۔
یہ منظر دیکھ کر ابوعثمان نے کھڑکی سے نگاہیں ہٹالیں اور دل میں سوچنے لگے کہ یہ شخص بھلا میری کیا
ی کرے گا۔ آپ کو ساتھ لانے والے شخص نے کہا۔ "اب فرمائیے ایسے شخص سے آپ کیا حاصل کرسکتے ہیں"۔
ابوعثمان نے کہا "میں نے سب کچھ دیکھ لیا ہے میں ابھی نیشاپور واپس لوٹ جاؤں گا۔"
نیشاپور واپس آکر ابوعثمان حیری نے جب یہ واقعہ ابوحفص حداد کو سنایا تو وہ سخت برہم ہوئے اور
لگے " رے کے لوگوں نے تمہیں ورغلایا ہے اور ایک سچے خدارسیدہ شخص سے تمہیں ملنے نہیں دیا
جب میں نے تمہیں خود کہا تھا کہ تمہارے مرض کا علاج یوسف بن حسین کے پاس ہے تو پھر تُو نے
ی بات کیوں نہ مانی۔ بہرکیف، بہتر یہی ہے کہ دوبارہ رے جاؤ اور یوسف بن حسین سے ملو۔"
ابوعثمان حیری واپس "رے" جانے ہی والے تھے کہ گھر سے ایک مُرید نے آکر عرض کیا۔ "حضرت گھر والے
ے پریشان ہیں، آپ فوراً گھر تشریف لے چلیں۔"
آپ نے مُرید سے کہا "میں دوبارہ رے جارہا ہوں تم میرے گھر والوں کو اطلاع دے دینا۔"
مُرید نے دوبارہ موقع پا کر دھیرے سے آپ کے کان میں کہا "وہ رشکِ حور کنیز آپ کو بے حد یاد کرتی ہے"۔
ی بات سُن کر آپ کو احساس ہوا کہ جیسے شیطان ایک بار پھر آپ کو ورغلا رہا ہے۔ آپ نے لاحول
پڑھی، دوبارہ نیشاپور سے روانہ ہوگئے۔
رے میں قیام کے دوران پھر اُسی شخص سے آپ کی ملاقات ہوگئی۔ اُس نے بھی آپ کو پہچان لیا اور
ی خوشی کے عالم میں بولا "آپ پھر آگئے۔"
آپ نے جواب دیا "ہاں۔ میں یوسف بن حسین سے لازمی طور پر ملنا چاہتا ہوں"۔ وہ شخص افسوس کے
ں کہنے لگا۔
آپ پھر اُس زندیق سے ملنے آگئے ہیں کاش آپ میں عقل ہوتی اور میں آپ کو سمجھا سکتا۔" بہرطور اُس
نے آپ کو یوسف بن حسین کے پاس بھیج دیا۔
آپ کو دیکھتے ہی یوسف بن حسین بولے: "ابوعثمان تجسس بہت بڑی چیز ہے۔ تم نے کھڑکی کے پاس
ے ہو کر دُکان کے ماحول کا جائزہ لیا تھا اور مجھ سے کوئی بات کیے بغیر واپس لوٹ گئے تھے۔"
یہ سُن کر ابوعثمان حیری خاصے نادم ہوئے۔ یوسف بن حسین نے پوچھا "میرا دوست ابوحفص حداد کیسا ہے"۔
آپ نے جواب دیا "وہ بالکل ٹھیک ہیں اور آپ کو سلام کہتے ہیں۔"
پھر وہ ابوعثمان سے کہنے لگے کہ اب اپنی آمد کا سبب بتاؤ۔
آپ نے فرمایا "جو شخص تعارف کے بغیر ہی میرا نام پکارے اور میرے پیرومرشد ابوحفص حداد کے بارے
ئے اُسے میں زبان سے کیا عرض کروں۔" اس وقت بھی وہ نوجوان لڑکا یوسف بن حسین کے پاس
تھا۔ قریب صراحی بھی رکھی تھی۔ اُس نے صراحی کو انڈیلا اور رنگین پانی کو حلق سے اُتار لیا۔ ابوعثمان
ت محسوس ہوئی لیکن مُنہ سے کچھ نہ بولے۔
ی دوران یوسف بن حسین کہنے لگے "وہ تاجر ابھی واپس نہیں آیا تم خوبصورت کنیز کو اپنے پاس کب

تک رکھو گے۔"
اب تو ابوعثمان کا پیمانہ صبر سے لبریز ہو گیا۔ وہ یوسف بن حسین سے کہنے لگے: "حضرت ایک طرف تو آپ اتنے روشن ضمیر ہیں اور دوسری طرف یہ بُری عادتیں۔ مَیں کچھ سمجھا نہیں۔"
"یہ آپ نے کیا کہہ دیا ہے کیسی بُری عادتیں؟" یوسف بن حسین نے پوچھا۔
ابوعثمان نے لڑکے اور پھر صراحی کی طرف اشارہ کیا۔
اس پر یوسف بن حسین کہنے لگے "یہ میرا بیٹا ہے اس کی ماں کا انتقال ہو چکا ہے۔ اس لیے اسے مَیں ہر وقت اپنی نظروں کے سامنے رکھتا ہوں۔ اور خود ہی اسے پڑھاتا ہوں۔ رہی یہ صراحی تو اس کو مَیں بھٹی سے نکال کر لایا ہوں اور اسے پاک صاف کر کے اپنے کام میں لاتا ہوں۔ اب تم پوچھو گے کہ صراحی کے اندر کیا ہے تو وہ کوئی ناپاک شے نہیں بلکہ رنگدار میٹھا شربت ہے۔
ساری حقیقتِ حال جان کر ابوعثمان حیرت زدہ رہ گئے اور اپنی سوچ پر سخت نادم ہوئے پھر یوسف حسین نے مسکراتے ہوئے ابوعثمان سے کہا کہ وہ نیشاپور واپس چلے جائیں کیونکہ جس مقصد کے لیے آپ دوبارہ یہاں آئے ہیں وہ پورا ہو چکا ہے۔
"مگر وہ کس طرح؟" ابوعثمان نے پوچھا۔
اس پر یوسف بن حسین بولے "آپ نے یہاں تک پہلی بار آنے میں تیس دن برباد کر دیئے۔ پھر واپس گئے اور دوبارہ آ گئے۔ اب پھر آپ واپس جائیں گے۔ تو ذرا خود ہی حساب لگا کر بتائیں کہ کتنے دن ہو گئے۔"
"حضرت یہ تو پورے نوّے دن ہوئے۔" ابوعثمان نے حساب لگا کر بتایا۔
"پس یہ کسوف اور خسوف نوّے دن کا تھا اور ان نوّے دنوں کو سفر میں نکال دیا گیا۔ اب آپ نیشاپور واپس لوٹ جائیں اور آئندہ خود کو آزمائش کی بھٹی سے دُور رکھیں۔"
یوسف بن حسین کی ہدایت پر ابوعثمان واپس نیشاپور چلے آئے اور ابوحفص کو سارا واقعہ سُنا دیا۔ ابوحفص کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ کہنے لگے: "ہاں عثمان کسوف اور خسوف کے نوّے دن تو کسی نہ کسی طرح گزرنے ہی تھے لہٰذا اب تم گھر جاؤ۔ ابوعثمان جب گھر پہنچے تو بیوی نے بتایا کہ تاجر آیا تھا وہ اپنی کنیز کو واپس لے گیا۔
حضرت ابوعثمان حیری انتہائی بُردبار، تحمل مزاج اور نرم طبیعت کے مالک تھے۔ آپ ہر حالت میں خود پر ضبط رکھتے۔ آپ کا ایک مُرید دس سال تک آپ کی خدمت میں مشغول رہا۔ آپ جب حج کیلئے تشریف لے جانے لگے تو اسے بھی ساتھ کر لیا۔ اُس نے راستے میں آپ پر سوالوں کی بھرمار کر کے آپ کو عاجز کر دیا مگر آپ انتہائی صبر و تحمل سے اُس کے سوال کا جواب دیتے رہے۔ آخر میں وہ بار بار یہ سوال کرنے لگا "حضرت کیا ایسا ممکن نہیں کہ آپ مجھے غیب کے علم سے آگاہ کریں۔"
ابوعثمان نے کہا: "خدا کے بھیدوں سے تو مَیں خود بھی واقف نہیں ہوں۔ جس پر خدا کا فضلِ خاص ہوتا ہے وہی اس سے آگاہ ہوتا ہے۔"
ایک مرتبہ آپ نے سربراہوں کو تلقین کی کہ ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کیساتھ خندہ پیشانی سے پیش آنا چاہیے۔ کسی نے پوچھا کہ اگر ایک جاہل اور دوسرا عالم ہو تو اس صورت میں کیا کرنا چاہیے۔ آپ نے جواب دیا کہ اس صورت میں عالم کو جاہل کیلئے دُعائے خیر کرنی چاہیے۔ —— ابوعثمان حیری کی تمام زندگی لوگوں کے لیے مشعل راہ تھی، بزرگوں میں آپ کا مقام انتہائی افضل و اعلیٰ ہے۔ آپ ۲۹۸ھ کو ربیع الاوّل کے مہینے میں اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔ آپ کا مزار بھی نیشاپور ہی میں واقع ہے۔

حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی اپنی خانقاہ کے اندر مراقبے میں اس طرح غرق تھے کہ اُن کو تراب درویش کی آمد کی خبر قطعی نہ ہوئی۔ تراب کو حضرت
ے پرانی دشمنی تھی۔ آج بھی وہ قتل کے مذموم ارادے سے آیا تھا۔ حضرت کو ہوش سے بیگانہ دیکھ کر
ں کو اپنا ارادہ پورا ہوتا ہوا نظر آیا۔ اُس نے اپنے تھیلے سے خنجر نکالا اور حضرت چراغ دہلوی پر گیارہ
ی ضربیں لگائیں جب آپ زخموں سے چور ہو گئے تو اُس نے بھاگ جانے کا ارادہ کیا، لیکن گلی
ں تراب کے خون آلود کپڑوں کو دیکھ کر لوگوں کو شک گزرا تو انہوں نے اُس کو پکڑ لیا۔ اُس نے اپنے آپ
چھڑانے کی بہتیری کوشش کی مگر بے سود، لوگوں نے اُس کو بھاگنے نہ دیا۔ ہر شخص کا یہی سوال تھا
م کس کو قتل کر کے آئے ہو؟ تراب نے اس بارے میں مسلسل خاموشی طاری رکھی۔ آخر لوگوں نے
ے مارنا شروع کر دیا۔ جب جسمانی ضربوں کی مزید برداشت نہ رہی تو اُس نے سب کچھ اُگل دیا۔ کہنے
لگا میں حضرت چراغ دہلوی کو قتل کر کے آ رہا ہوں۔ لوگوں پر عجیب ماتمی کیفیت طاری ہو گئی۔ سب فوراً
رت کے پاس پہنچنا چاہتے تھے، لیکن تراب کو چھوڑنا بھی دانشمندی نہ تھی۔ چنانچہ چند لوگوں نے
ے زیر حراست رکھا اور باقی حضرت چراغ دہلوی کی طرف دوڑ پڑے۔
خانقاہ کا فرش خونِ معصوم سے رنگین ہو چکا تھا۔ حضرت بے ہوش پڑے تھے۔ اُن کو فوراً
امداد کے لیے طبیب کے پاس لے جایا گیا۔ خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے حضرت کی حالت
تشویشناک تھی۔ ہر قسم کی دوائی آزمائی جانے لگی مگر حضرت کو کوئی افاقہ نہ ہو رہا تھا۔ مسلسل سعی
بعد آپ ہوش میں تو آ گئے مگر شدید کرب و اذیت کے باوجود آپ کے لب متبسم تھے۔ آپ
لوگوں سے پوچھا کہ تراب کدھر ہے؟
لوگوں نے سوال کیا: "حضرت آپ کو کیسے پتہ چلا کہ آپ پر حملہ تراب نے کیا ہے؟"

آپ نے جواب دیا "بے شک مجھے پتہ ہے، لیکن میں نے اُس کو اس لیے نہیں روکا کہ میرا وقت ابھی نہیں آیا اور میں اُس کے حملے سے مروں گا نہیں اس لیے میں نے اس کی دل شکنی مناسب نہ سمجھی اور اس کو حملہ کرنے دیا۔"

معالج نے آپ کو باتیں کرنے سے منع کرتے ہوئے کہا۔ آپ کے لیے اس حالت میں بولنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ مگر آپ نے جواب دیا "میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ ابھی میرا وقت نہیں آیا پھر خطرہ کس بات کا۔ فوراً تراب کو میرے سامنے لاؤ۔ میں اُس سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

لوگوں نے سمجھا کہ شاید حضرت اُسے بُلا کر کوئی سزا دینے چاہتے ہیں اس لیے اُنہوں نے عرض "حضرت! آپ فکر نہ کریں بلکہ آرام کریں۔ تراب ہماری قید میں ہے وہ کہیں بھاگ نہیں سکتا۔ آپ ٹھیک ہو جائیں تب اُس کو آپ کے سامنے پیش کر دیا جائے گا اور پھر آپ جو بھی اُس کو سزا دیں گے اُس سے اس کا بچنا مشکل ہوگا۔"

آپ نے ذرا ترش سے حاضرین کو حکم دیا "تراب میرا مجرم ہے اُس کے متعلق کسی قسم کا فیصلہ مجھ ہی کو کرنا ہے۔ چنانچہ تراب کو فوراً میرے سامنے پیش کیا جائے۔"

لوگوں نے آپ کے حکم کی تعمیل کی اور تراب کو آپ کی خدمت میں پیش کر دیا۔

آپ نے تراب سے سوال کیا "اے تراب! تم نے مجھ پر کتنے وار کیے؟" تراب خاموش رہا۔ آپ نے دوبارہ اپنا سوال دہرایا مگر اس مرتبہ بھی وہ خاموش ہی رہا۔ شاید وہ یہ سوچ رہا تھا کہ حضرت سے ایسا سوال اس لیے کر رہے ہیں کہ وہ مجھ کو میرے جرم کے مطابق سزا دیں گے۔

حضرت چراغ دہلوی نے اپنا سوال ایک مرتبہ پھر دہراتے ہوئے فرمایا "تراب تم کیوں نہیں بتا کہ تم نے ہم پر کتنے وار کیے ہم تمہیں سزا نہیں انعام دینا چاہتے ہیں اس لیے گھبراؤ نہیں۔"

تراب کی حالت ایسی تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہ ہو اور وہ بری طرح کانپ رہا تھا۔ اسی کیف میں اُس نے عرض کیا "حضرت آپ کی لوگوں میں مقبولیت کی وجہ سے مجھے حسد پیدا ہو گیا تھا میرے دل میں ہر ایک ہی خیال رہتا تھا کہ میں بھی اتنی عبادت کرتا ہوں مگر مجھے وہ شہرت عزت نصیب نہیں ہوئی۔ اسی جلن اور حسد میں آ کر میں آپ پر حملہ آور ہوا ہوں۔"

حضرت نے فرمایا "میں نے تم سے حملہ کرنے کی وجہ نہیں پوچھی بلکہ میں صرف اتنا جاننا چاہتا کہ تم نے مجھ پر کتنے وار کیے۔"

یہ سن کر تراب جھکتے ہوئے بولا "حضرت! اس بدنصیب نے آپ پر گیارہ وار کیے ہیں۔"

حضرت نے دوبارہ پوچھا "وار آرام آرام سے کیے تھے یا زور زور سے؟"

اُس وقت تراب کی حالت دیدنی تھی اور وہ شرم کے مارے زمین میں گڑا جا رہا تھا۔ اُس ہوتے ہوئے کہا "حضور! میں نے اپنی پوری طاقت سے حملہ کیا ہے۔"

آپ نے فرمایا "اس طرح تو تمہارے ہاتھوں کو بہت تکلیف پہنچی ہوگی۔ خیر ہم اس وقت تکلیف کا مداوا کرنے کے تو قابل نہیں مگر پھر اس کا صلہ نہیں کچھ نہ کچھ ضرور دیں گے۔" اس کے اپنے خادم سے کہا "جاؤ اور ہمارے کمرے میں ایک نئی پوشاک پڑی ہے اور ایک تھیلی میں ہیں وہ لے آؤ۔" خادم تعمیل حکم کے لیے اسی وقت چل پڑا اور تھوڑی ہی دیر بعد وہ پوشاک اور

لے کر حضرت کی خدمت میں پہنچ گیا۔

حضرت چراغ دہلوی نے وہ پوشاک اور اشرفیاں تراب کو دیتے ہوئے کہا "یہ تمہاری اس تکلیف کا ادنیٰ سا بدل ہے جو تم نے مجھ پر حملہ کرتے ہوئے اُٹھائی۔ اس وقت اس کے علاوہ میرے پاس کچھ نہیں پھر کبھی آنا اور میرے پاس جو کچھ ہوگا میں تیرے حوالے کر دوں گا اور اس وقت تو آزاد ہے جہاں تمہارا دل چاہتا ہے چلا جا۔"

اسکے بعد خدام کو حکم دیا کہ تراب کو چھوڑ دیا جائے اور اس پر کسی قسم کی گرفت نہ رکھی جائے۔ یہ جہاں جانا چاہتا ہے۔ مجھے اس سے کوئی گلہ نہیں۔ کیونکہ میرے مرشد حضرت محبوب الٰہی نے حکم دیا تھا کہ دُنیا تجھ پر ظلم کرے گی اور تمہیں طرح طرح کی تکلیفیں اور اذیتیں دی جائیں گی۔ مگر تمہارا کمال یہ ہوگا کہ تم اُن تمام کو خندہ پیشانی سے برداشت کرو گے اور کسی پر کوئی گلہ نہیں روا رکھو گے۔ تو میں آج اپنے مرشدِ عالی مقام کے احکام کی بجا آوری کرتے ہوئے تراب کو چھوڑ رہا ہوں۔

❖

اخلاقِ حسنہ، بردباری اور دین داری کا یہ پرتو حضرت نصیرالدین چراغ دہلوی کا تھا۔ آپ حسنی سید خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور اودھ سے آپ کا تعلق تھا۔ آپ کے دادا کسی نامعلوم جگہ سے لاہور تشریف لائے جہاں آپ کے والد صاحب نقل مکانی کر کے اودھ تشریف لے آئے۔ یہاں پر ہی حضرت نصیرالدین کی ولادت ہوئی۔ آپکی تربیت آپ کے والدین نے کی۔ کہا جاتا ہے جس انداز سے آپ کے والدین نے آپ کی تربیت کی تھی۔ دُنیا میں بہت کم اولادیں ایسی ہیں۔ جن کو اتنی اعلیٰ وارفع تربیت نصیب ہوئی ہے مگر آپ ابھی عمر کے نویں سال میں تھے کہ آپ کے والد صاحب رحلت فرما گئے اور کچھ عرصہ کے بعد آپکی والدہ ماجدہ نے بھی داعیِ اجل کو لبیک کہہ دیا۔

آپ نے مزید تعلیم ایک بہت بڑے عالم عبدالکریم شیروانی سے حاصل کی۔ پھر مولانا افتخار الدین گیلانی نامی فاضلِ اجل سے علومِ ظاہری کی تکمیل کی۔ آپ مادر زاد ولی تھے۔ آپ نے روزِ اول سے وہ راستہ اختیار کر لیا تھا جس پر چل کر منزلِ ولایت پر پہنچا جاتا ہے۔

آپ میں ترکِ تجرید اور نفس کشی کے آثار نوعمری ہی سے ہویدا تھے۔ آپ ہمیشہ با جماعت نماز ادا فرمایا کرتے تھے اور سال بھر روزے رکھتے تھے۔ رفتہ رفتہ آپ نے شدت سے عبادت و ریاضت شروع کر دی اور دن رات مجاہدات میں مصروف رہنے لگے۔ آپ نے اپنی عمر کے سات سال ایک درویش کے ساتھ گزارے جن کا نام اگرچہ تاریخ کے صفحات میں نہیں ملتا، لیکن اُن کی صحبت نے آپ کو ہشت پہلو بنا دیا اور اس بزرگ کامل کی صحبتِ اقدس کا ہی اعجاز تھا کہ آپ جب عمر کے چالیسویں سال میں پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے عہد ساز شخصیت۔ روحانیت و ولایت کے تاجدار حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیاء کی خدمت میں آپ کو بھیج دیا۔

حضرت نصیرالدین کو حضرت محبوبِ الٰہی نے نہ صرف اپنا مرید بنایا بلکہ ہمیشہ اپنے ساتھ رہنے کی اجازت دے دی۔ اس مقدس چھاؤں میں حضرت نصیرالدین کو دائمی سکون نصیب ہوا۔

حضرت نصیرالدین کے والدین چونکہ وفات پا چکے تھے اور اب اُن کے علاوہ اُن کی صرف ایک بہن تھی۔ جو اودھ میں رہتی تھی اور آپ دہلی میں حضرت محبوب الٰہی کی صحبت صالحہ میں رہتے تھے۔ آپ کا جب کبھی

دل اُداس ہوتا اور بہن یاد آتی تو آپ حضرت محبوب الٰہی سے اجازت لے کر اودھ چلے جایا کرتے تھے۔ اور پھر واپس آجایا کرتے تھے۔

جب نصیر الدین بہن سے ملاقات کے لیے دہلی سے اودھ جاتے تھے تو وہاں کے لوگ آپ کی بزرگی سے متاثر ہو کر آپ کو ہر وقت گھیرے رکھتے۔ آپ سے طرح طرح کے سوالات اور مسئلے و مسائل پوچھتے یہ باتیں نصیر الدین کو ناگوار گزرا کرتی تھیں۔ اُن کا تو منشا تھا کہ وہ اُودھ میں جتنے روز قیام کریں بہن کے ساتھ نشست کے علاوہ باقی وقت کسی ویرانے میں یادِ الٰہی اور ذکرِ الٰہی میں بسر کریں۔ مگر ایسا کرنے سے پہلے وہ مرشد پاک سے اجازت لینا ضروری خیال کرتے تھے مگر احترام کی وجہ سے اُن میں اتنی ہمت بھی نہ تھی کہ وہ اس بارے میں حضرت محبوب الٰہیؒ سے بات بھی کر سکیں۔

اودھ سے واپسی پر انہوں نے اپنی اس مشکل کا ذکر حضرت امیر خسروؒ سے کیا کہ اس طرح وہ حضور مرشد سے اجازت کے خواہش مند ہیں۔ امیر خسرو نے وعدہ کیا کہ جونہی موقع ملا وہ حضرت سے آپ کے مسئلہ پر بات چیت کریں گے۔ ایک رات پاؤں دابتے ہوئے امیر خسرو نے حضرت محبوب الٰہی سے نصیر الدین کا مسئلہ بیان کیا۔

حضرت محبوب الٰہی کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ اُنہوں نے قدرے ناراضگی سے فرمایا "نصیر الدین کو آخر خلق خدا سے کیوں بے زاری ہے اور وہ اُن سے کیوں دُوری چاہتا ہے۔ اُسے ویرانے کی بجائے آبادی میں رہ کر خدا کی عبادت کرنی چاہیئے۔" یہ کہہ کر حضرت نے امیر خسرو کو حکم دیا کہ اسی وقت نصیر الدین کو میرے پاس بھیجا جائے۔ امیر خسرو نے فوراً نصیر الدین کو طلب کیا اور کہا کہ آپ کو حضرت یاد فرماتے ہیں۔ ڈرتے ڈرتے نصیر الدین حضرت محبوب الٰہی کے پاس پہنچے۔ آپ کو دیکھتے ہی حضرت نے فرمایا "نصیر الدین تمہیں آبادی کو چھوڑ کر جنگل میں بسیرا کرنے کا خیال کیوں آیا۔"

نصیر الدین نے عرض کی "حضرت! میں چاہتا ہوں کہ دُنیاوی علائق سے دُور ہو جاؤں۔ دنیا اور لذت ترک کر کے ہر وقت یادِ الٰہی میں بسر کروں اور ذکرِ الٰہی سے لمحہ بھر کے لیے بھی غافل نہ رہوں۔ مگر ایسا کرنے سے پہلے میں آپ کی اجازت چاہتا تھا۔ کیونکہ میں تو وہی عمل کروں گا جس کا آپ حکم فرمائیں گے۔"

حضرت محبوبِ الٰہی نے نصیر الدین سے سوال کیا "تمہارے والد صاحب کیا کام کرتے تھے۔"

انہوں نے جواب دیا۔ "وہ روئی کے سوداگر تھے۔"

یہ سُن کر محبوب الٰہی مسکرائے اور فرمایا "خوب وہ لوگوں کو گرمی پہنچایا کرتے تھے اور تم لوگوں کو اپنی گرمی سے محروم رکھنا چاہتے ہو۔"

یہ کہہ کر حضرت محبوب الٰہی نے نصیر الدین کو اپنے قبلہ پیر صاحب حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ کا واقعہ سُنایا۔

"ایک روز میں یعنی (محبوب الٰہیؒ) اپنے مرشد (بابا فریدؒ) کی خدمت میں حاضر تھا۔ اتفاق سے وہاں میرا ایک دوست آگیا جو دُنیا دار اور وضع دار تھا۔ اُس نے میرا مذاق اُڑایا اور کہا کہ نظام ایسی درویشی کرنے سے بہتر تھا کہ تم معلمی کا پیشہ اختیار کرتے۔ کم از کم تمہیں کوئی مالی آسودگی بھی حاصل ہوتی۔ اس کے بغیر تو تم ہمیشہ تنگ دست اور بھوکے رہو گے۔"

UBL

میں اپنے دنیا دار دوست کی بات سن کر بڑا آزردہ خاطر ہوا اور اسی حالت میں اپنے پیر بابا فریدؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت نے میری حالت دیکھ کر سوال کیا "بابا نظام کیا بات ہے تمہارا چہرہ اترا ہوا ہے" میں نے حضرت کی بات سن کر سکوت ہی کیا۔ میرے بولنے سے پہلے میرے بابا فریدؒ نے خود ہی فرمایا۔ "نظام بابا! اگر تمہارا دوست تمہیں اس فقیرانہ زندگی سے باز کر کے اور معلمی اختیار کرنے کا تمہیں مشورہ دے تو تم کیا کرو گے"

میں تو مرشدِ عالی کی کشفی دست برد پر ہی حیران ہو گیا اور میرے منہ سے کوئی بات نہ نکلی۔

اس پر باباؒ نے فرمایا۔

نہ ہمسری تو مرا خویش گرد برد   ترا سعادت باد امرا نگو نساری

(یعنی اپنے ساتھ میری برابری کا خیال دل میں نہ لا۔ تجھے تیری خوش حالی مبارک۔ میرے لیے یہ عاجزی ہی کافی ہے)

اس کے بعد باباؒ نے مجھے کھانے کا خوان دیا جو ڈھکا ہوا تھا اور وہ مجھے اپنے دوست کو دینے کے لیے حکم دیا۔ جب میں اپنے دوست کے پاس وہ خوان لے کر گیا تو میرا دوست دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس میں مرغن اور لذیذ کھانے تھے۔ میں نے اس کو بابا کا ارشاد سنایا کہ آسودگی اور خوش حالی ایسی چیزیں نہیں جو ہم درویش لوگ نہیں حاصل کر سکتے۔ بلکہ ان کا حاصل کرنا تو ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ ہم تو ان چیزوں کو خود ہی پسند نہیں کرتے کیونکہ درویشی اور ان چیزوں کا آپس میں کوئی جوڑ نہیں ہے۔ دوست بڑا شرمندہ ہوا اور اس نے نہ صرف مجھے مبارکباد دی بلکہ خود بھی بابا فریدؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر معافی مانگی اور ان کے عقیدت مندوں میں داخل ہو گیا"

حضرت نظام الدین اولیاء نے اپنا یہ واقعہ نصیر الدین کو سنایا اور فرمایا۔ "تم عزلت نشینی اور ویرانہ پسندی کا خیال اپنے دل سے نکال دو۔ دنیا تمہیں بے شک بہت ستائے گی مگر تم کو ان کے جور و ستم اور زیادتیاں برداشت کرنی ہوں گی۔ کیونکہ چراغ جب جلتا ہے تو ہمیں صرف اس کی جلتی ہوئی روشنی محسوس ہوتی ہے ہم اس کی جلن کا تصور نہیں کر سکتے کہ وہ کتنی اذیت سے جل کر ہمیں روشنی پہنچا رہا ہے اور تم بھی ایک چراغ کی طرح دنیا میں روشن ہو گے اور تمہاری روشنی دنیا کو تب ہی فائدہ پہنچا سکے گی کہ تم اذیت اور تکلیف برداشت کرو گے۔ اسی روز آپ کو حضرت محبوب الٰہی نے چراغ دہلی کا خطاب دیا۔

اس کے بعد حضرت چراغ دہلی کو لوگوں نے بڑی سے بڑی اذیت دی مگر آپ نے اپنے مرشد کے حکم کو ذہن میں رکھ کر انہیں برداشت کیا۔ اور یہی وجہ ہے۔ کہ آپ کو دین و دنیا میں اللہ تعالیٰ نے بڑے سے بڑے مراتب عطا فرمائے ہیں۔

❖

سلطان محمد تغلق ٹھٹھہ کی مہم پر روانہ ہوا تو فوج کے ساتھ حضرت چراغ دہلوی بھی تھے مگر بادشاہ اس بات سے بے خبر تھا کہ حضرت ساتھ ساتھ ہیں۔ آپ کی شمولیت امیر الٰہی کے ایماء پر تھی۔ ٹھٹھہ میں ابھی جنگ جاری ہوئی۔ باغیوں کی سرکوبی ابھی پوری طرح نہ ہو پائی تھی کہ سلطان محمد تغلق کا انتقال ہو گیا۔ اس میں بادشاہ کی بہن خداوند زادہ بھی موجود تھی وہ اک مدت سے اس بات کی متمنی تھی کہ اس کا بیٹا خسرو ملک اس کا جانشین بنے۔ چنانچہ اس نے اس موقعہ پر اپنے دیرینہ خواب کی تکمیل کرنی چاہی لیکن مشیت ایزدی کو

تھی اور حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی مشیت ایزدی کی تکمیل کرنا چاہتے تھے چنانچہ انہوں نے حکم ربی کے تحت بادشاہ کے برادر عم زاد کمال الدین جو مردانہ وجاہت کے بھرپور شاہکار تھا اور قابلیت کے لحاظ سے بھی اس قابل تھا کہ اسے بادشاہ بنایا جائے۔

حضرت چراغ دہلوی نے کمال الدین کے خیمہ میں جا کر اسے حکم خداوندی سنایا اور فرمایا "تم اگر وعدہ کرو کہ مخلوق خدا کے ساتھ عدل و انصاف اور محبت کا سلوک کرو گے تو تمہیں خداوند تعالیٰ بادشاہ بنانے کا ارادہ رکھتا ہے"۔

کمال الدین نے عرض کی "حضرت میں تو عاجز اور ناتواں سا آدمی ہوں اگر اللہ تعالیٰ مجھے اس کام پر معمور کرنے والا ہے تو وہی مجھے اس قدر ہمت اور طاقت دے گا کہ میں رعایا پروری اور جہاں داری کے فرائض کی انجام دہی کما حقہ کر سکوں"۔

حضرت نصیر الدین نے فرمایا "تم وعدہ اور ارادہ تو کرو مدد تو بہر حال خدا نے ہی کرنی ہے اور نیت جس کی نیک ہو۔ اسے خدا نے کبھی بے یار و مددگار نہیں چھوڑا۔ اس کے بعد حضرت نے کمال الدین کو انتالیس کھجوریں دیں اور فرمایا تم ہندوستان پر انتالیس سال تک حکومت کرو گے۔ اللہ تعالیٰ نے دہلی سے ٹھٹھہ تک مجھے اسی مقصد کے لیے بھیجا تھا۔

دوسری طرف خداوند زادہ مرحوم بادشاہ کی بہن اپنے بیٹے کو بادشاہ بنانے کا ادھار کھائے بیٹھی تھی۔ اس نے لوگوں کو اکٹھا کیا اور اپنے بیٹے کی بادشاہت کا اعلان کر دیا، لیکن تمام امراء اور دیگر افواج کے سربراہ خداوند زادہ کے بیٹے کی حکومت کو پسند نہیں کر رہے تھے، تاہم جرأت اظہار ان میں نہ تھی۔

سیف الدین نامی ایک امیر سچا اور کھری شخصیت کا انسان تھا اس نے خداوند زادہ کو منع کیا کہ تم اپنے بیٹے خسرو کو بادشاہ بنانے کا ارادہ ترک کر دو کیونکہ ایک ولی کامل نے کمال الدین کی بادشاہت کا اعلان کر دیا ہے اور ولی کا عمل خدا کا حکم ہوتا ہے۔ اس لیے خدا کے حکم سے اگر تم سرتابی کرو گی تو تمہیں سخت نقصان اٹھانا پڑے گا۔ یہ باتیں سن کر خداوند زادہ نے اپنے بیٹے کی بادشاہت سے دستبرداری کا اعلان کر دیا۔

یوں کمال الدین فیروز شاہ تغلق کے نام سے بادشاہ بنا اور ٹھٹھہ کی فتح کے بعد جب فوج بادشاہ فیروز شاہ کی قیادت میں واپس دہلی جا رہی تھی تو ملتان کے مقام پر خواجہ جہان جو محمد تغلق کا وزیر اعظم تھا اس نے فیروز شاہ کا مقابلہ کرنے کے لیے فوج کشی کی۔ اب فیروز شاہ گھبرایا اور حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی سے دعا کی درخواست کی اور آپ کی دعا نے بادشاہ کو جنگ سے نجات دلا دی۔ مگر ہانسی کے نواح میں پہنچ کر خواجہ جہان ایک مرتبہ پھر محمد تغلق کے کسی نام نہاد بیٹے کی قیادت میں فوج کش ہوا۔ یہاں یہ بات بڑی عجیب تھی کہ بادشاہ مرحوم محمد تغلق کی کوئی اولاد نرینہ نہ تھی پھر یہ خوان جہان بادشاہ کے نامعلوم کون سے بیٹے کو لے کر آ گیا اب فیروز شاہ نے دوبارہ نصیر الدین چراغ دہلوی کی خدمت میں دعا کی درخواست کی۔

اس پر حضرت نے فرمایا "میں تمہیں ٹھٹھہ سے با حفاظت لایا ہوں۔ اب ہانسی سے آگے کا علاقہ حضرت قطب الدین منور کا ہے۔ وہ حضرت محبوب الٰہی کے چہیتے مریدہیں ان سے دعا کراؤ۔ چنانچہ بادشاہ نے اسی وقت اپنا قاصد حضرت قطب الدین منور کی خدمت میں روانہ کیا اور عرض کی "حضرت میں حضرت نصیر الدین کی دعاؤں سے ٹھٹھہ میں بادشاہی کے منصب پر فائز ہوا ہوں اور زبردست مصائب سے بچتا ہوا ہانسی تک

پہنچا ہوں ۔ اب دہلی تک جانے میں مجھے کئی اور میدانوں کا سامنا کرنا پڑے گا ۔ آپ میرے لیے دعا فرمائیں؛
حضرت قطب الدین منور نے جواب دیا ۔ فیروز شاہ تمہیں حضرت چراغ دہلوی نے مجھ ضعیف کے سپرد کیا ہے
تو میں دعا کرتا ہوں اللہ تمہیں دہلی کی بادشاہت بھی عطا فرمائے گا ۔

دہلی میں مرحوم بادشاہ کا ایک اور وزیر جنگ کی تیاریوں میں تھا مگر جب حضرت نصیر الدین اور قطب الدین منور کی سربراہی میں فوج دہلی پہنچی تو وہاں کی ہوا ہی بدل چکی تھی ۔ تمام امراء ۔ وزراء ۔ خواتین اور رعایا خفیہ طریقے سے نکل نکل کر دہلی کے باہر آگئے اور فیروز شاہی لشکر میں شامل ہو گئے ۔ باغی وزیر خود اپنے آپ کو زنجیروں میں جکڑ کر بادشاہ کے سامنے پیش ہوا اور معافی مانگی ۔ بادشاہ نے اُسے معاف کر دیا مگر رعایا اور درباریوں نے بادشاہ کو خواجہ جہان کو قتل کرنے کا مشورہ دیا کیونکہ اُسکی صلح ریاکاری پر مبنی تھی اور اُس سے کسی وقت بھی بادشاہ کو خطرہ درپیش ہو سکتا تھا ۔ دہلی پر مکمل قبضہ کر لینے کے بعد بادشاہ ہانسی پہنچا اور وہاں پر جمعہ کی نماز ادا کی اس موقع پر حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی اور حضرت قطب الدین منور نے ایک دوسرے سے ملاقات کی ۔ ملاقات کرتے ہوئے دونوں ایک دوسرے کے قدموں پر جھک گئے ۔ بادشاہ یہ انکسارانہ منظر دیکھ کر رو رہا تھا ۔ پھر دونوں بزرگوں نے بادشاہ سے کہا ہم نے سُنا ہے کہ تم مے خوری کا شغل کرتے ہو ۔ اس شغل سے اہل حاجت کی کاربراری میں رخنہ پڑتا ہے ۔ بادشاہ نے آئندہ کے لیے مے خوری ترک کرنے کا وعدہ کیا ۔ بادشاہ نے دونوں بزرگوں کے ساتھ اور بھی بہت سے وعدہ وعید کیے تھے ۔ اور پورے اُنتالیس سال تک ہندوستان پر حکومت کی ۔

فیروز شاہ کا ایک وزیر خان جہان جو ہندو تھا اس نے حضرت نصیر الدین کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا اور مسلمان ہونے کے بعد اس نے بہت ہی عبادت اور ریاضت کی ۔ مجاہدوں کا کوئی حد اور شمار نہ رہا ۔ سرکاری کاموں کے دوران بھی وہ ذکر و فکر میں مشغول رہتا تھا ۔ جب اُسکی وفات ہوئی تو اُسے حضرت محبوب الٰہی کے قرب میں دفن ہونے کا شرف حاصل ہُوا ۔

حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی کو اپنے مُرشد کے ساتھ شدید محبت تھی ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ حضرت محبوب الٰہی نے یکسوئی کے ساتھ عبادت کرنے کے لیے دہلی میں کیلو کھڑی نامی جگہ پر اپنی خانقاہ بنا رکھی تھی ۔ خانقاہ کی بالائی منزل پر حضرت عبادت کیا کرتے تھے اور حضرت نصیر الدین اس خانقاہ میں غلام بے مرام کی طرح اپنے مُرشد کی خدمت کرتے تھے ۔

ایک روز حسب معمول فجر کی نماز اور ذکر و فکر کے بعد حضرت محبوب الٰہیؒ اپنی خانقاہ کی بالائی منزل میں تشریف لے گئے ۔ خانقاہ کے ساتھ ہی دریا بہتا تھا وہاں پر لوگ صبح سویرے نہایا کرتے تھے ۔ اس روز بھی ایک درویش نے کپڑے اتارے اور اُن کو ساحل پر رکھا اور خود دریا میں اُتر گیا ۔ نہانے میں وہ اس قدر مشغول تھا کہ اُسے اپنے کپڑوں کا ہوش نہ رہا ۔ اچانک ایک چور آیا اور اُس نے درویش کو پانی میں ڈبکی لگاتے دیکھا اور اُن کے کپڑے اُٹھا کر لے گیا ۔ جب درویش نہا دھو کر ساحل پر آیا تو اپنے کپڑے نہ پا کر شور مچانے لگا ۔ اُس کے ارد گرد لوگوں کا ایک ہجوم جمع ہو گیا اور اس قدر شور مچنے لگا کہ اُس کی آواز حضرت محبوب الٰہی کی خانقاہ تک بھی پہنچ گئی ۔ حضرت نصیر الدین شور سُن کر خانقاہ سے باہر نکلے اور اُس درویش کو خاموش رہنے کی تلقین کی کہ مبادا اُس کے شور سے حضرت محبوب الٰہی کی عبادت میں خلل پڑے ۔ درویش نے چراغ دہلوی کی بات سُنی تو اور زور زور سے چیخنے لگا اور کہنے لگا میرا

لباس کوئی چُرا کر لے گیا ہے تو کیا میں خاموش ہو جاؤں اگر مجھے خاموش کرنا ہے تو مجھے میرا لباس لا کر دو۔"
چراغ دہلوی بولے "صبر کرو تمہارا لباس ابھی مل جاتا ہے۔"
یہ کہہ کر آپ خانقاہ میں گئے۔ وہاں جا کر آپ نے ایک تہمند باندھی اور کپڑے اُتار کر اُس درویش کو دے دیے۔ درویش نے حیرانی سے پوچھا "مگر یہ کپڑے تو میرے نہیں۔ آپ نے اپنے کپڑے کیوں مجھے اتار کر دیے ہیں۔"
حضرت چراغ دہلوی بولے "تمہیں کپڑے چاہیں۔ کپڑے لو اور اپنا راستہ ناپو۔ مجھے خدشہ ہے کہ تمہارے شور سے میرے مرشد کی عبادت میں خلل پڑے گا۔"
وہ درویش کپڑے لے کر چلا گیا۔ اب جب سارے کپڑوں سے عاری صرف دھوتی میں ملبوس چراغ دہلوی خانقاہ میں پہنچے تو ساتھی مُریدوں نے پوچھا یہ کیا قصہ ہے۔ ابھی چراغ دہلوی کچھ بتانے کے لیے تیار ہو رہے تھے کہ خادم نے آ کر بتایا کہ اوپر حضرت یاد کر رہے ہیں۔ اس حالت میں آپ کو اوپر جانے میں تامل ہُوا مگر نہ جانا بھی گستاخی تھی۔
ڈرتے ڈرتے جب آپ بارگاہِ مُرشد میں پہنچے تو حضرت محبوبِ الٰہی نے فرمایا "نصیر الدّین گھبراؤ مت ہم تمام واقعہ سے باخبر ہیں اور ہمیں بڑی خوشی ہوئی ہے کہ تم ہمارے سعادت مند اور بلند مرتبہ مرید ہو۔ اس کے بعد حضرت محبوبِ الٰہی نے اپنی پوشاک نصیر الدّین چراغ دہلوی کو عطا کی۔ اس تحفۂ مرشد کو حاصل کر کے چراغ دہلوی کو اس قدر خوشی ہُوئی وہ کہتے تھے کہ مجھے پوری کائنات مِل گئی۔ دوسرے مُرید بھی رشک کرتے تھے کہ ایسا خوش نصیب مُرید روئے زمین پر نہ ملے گا جس پر مُرشد کا اس قدر تلطف ہے۔

ایک مرتبہ حضرت نصیر الدّین کے کسی پیر بھائی کے گھر محفلِ سماع منعقد ہوئی۔ قوالی کا آغاز ہُوا۔ طبلے پر تھاپ پڑی۔ سارنگی نے ساز چھیڑا۔ قوال نے شعر کی لَے شروع کی۔ نصیر الدّین وہاں سے چلے گئے۔ دوستوں نے روکا مگر آپ نے انکار کر دیا کہ اسلام میں موسیقی کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ پیر بھائیوں نے کہا "جب حضرت محبوبِ الٰہی قوالی سُنتے ہیں تو پھر آپکو کیوں اعتراض ہے۔"
آپ نے جواب دیا کہ یہ کوئی حجّت نہیں۔ دلیل تو کتاب اللّٰہ اور حدیث سے ملتی ہے۔ اگر کتاب اللّٰہ اور حدیث میں موسیقی سُننے کی کہیں اجازت ہے تو پھر مجھے کوئی تردد نہیں یہ کہہ کر نصیر الدّین چراغ وہاں سے رُخصت ہو گئے۔
آپ کے ساتھی مریدوں نے یہ بات حضرت محبوبِ الٰہی کو جا کر شکایتاً بتا دی کہ حضرت چراغ دہلوی آپ کے مشرب سے گریزاں ہیں۔ اس پر حضرت محبوبِ الٰہی نے فرمایا "نصیر الدّین کو تم لوگ نہیں جانتے لہٰذا اُس کے زہد و رکوع پر انگلی مت رکھو اس کا بہت بڑا مقام ہے۔ اس کے بعد حضرت محبوبِ الٰہی نے حضرت نصیر الدّین چراغ کو خلافت سے نوازا اور چراغ دہلوی کے علاوہ محمود گنج شرف جیسا اعلیٰ و ارفع لقب بھی عطا فرمایا۔

ایک مرتبہ حضرت نصیر الدّین گنج شرف کا لباس چوری ہو گیا۔ اور تلاش کے باوجود نہ ملا۔ لوگوں نے آپکو بددُعا کرنے کا مشورہ دیا، لیکن آپ نے فرمایا "میرے مُرشد نے مجھے حکم دیا تھا کہ لوگ تمہیں عُمر بھر تکلیفیں

دیں گے اذیت میں مبتلا رکھیں گے، لیکن تم نے نہ صرف برداشت کرنا ہے بلکہ اُن کے ساتھ عفو درگزر، مہربانی اور مروّت سے پیش آنا ہے۔ چنانچہ چور اگر چوری کر کے میرا لباس لے گیا ہے تو کوئی فکر نہیں میں پھر بھی اس کے حق میں ہدایت کی دعا کروں گا۔"

آپ کے مریدوں میں آپ کے ہمشیر زادہ رکن دین بھی شامل تھے۔ ایک مرتبہ آپ نے اپنے دیگر مریدوں جن میں خواجہ گیسو دراز بھی شامل تھے سب کو اکٹھا کیا اور اُن سے نصیر الدین نے فرمایا "تمہیں خواجگان چشت کی نعمتوں میں جتنا تمہاری قسمت میں تھا مل گیا۔ اب میں اپنا خرقہ۔ کاسۂ چوبیں۔ تسبیح، نعلین اور عصا کسی کو نہ دے سکوں گا۔ یہ باتیں سُن کر رکن الدین تو خاموش رہے مگر گیسو دراز کو اس بات سے سخت دُکھ ہُوا تو انہوں نے عرض کی "حضرت! اگر آپ گستاخی نہ سمجھیں تو آپ کے اس فیصلے سے ناچیز تو آپکی عنایات سے محروم ہو جائے گا۔"

یہ بات سُن کر حضرت نصیر الدین چراغ نے فرمایا "تم میرا خرقہ لے سکتے ہو، لیکن دیگر تبرکات میں کسی کو نہ دوں گا۔" کسی مرید کو جرأت نہ ہوئی کہ آپ سے مزید سوال جواب کر سکے۔

آخر رمضان کی ۱۷ اور ۱۸ تاریخ کی درمیانی شب ۷۵۷ھ بمطابق ستمبر ۱۳۵۶ء کو اس مہر درخشاں کا وصال ہو گیا اور وصیت کے مطابق آپ کی استعمال کردہ اشیاء آپ کے ساتھ قبر میں دفن کر دی گئیں۔ اس انوکھے فیصلے سے تمام مُرید پریشان تھے۔ آخر آپ کے وصال کے بعد عرصہ کے بعد آپ کے ایک مرید آپ کے مزار پر گئے اور عرض کی حضرت اب تو بتا دیں کہ آپ نے اپنے متبرکات لوگوں میں کیوں نہ تقسیم کیے تھے اس کی رمزیت کا پتہ چل جائے تو دلوں کو سکون مل جائے گا۔ ان باتوں کے دوران ہی وہ مرید سو گیا اور خواب میں اُسکی ملاقات چراغ دہلوی سے ہوئی۔ اُنہوں نے فرمایا "ہم نے اپنے متبرکات اس لیے اپنے مریدوں کو نہیں دیے کہ باوجود اس کے وہ سب کے سب بڑے صاحبِ کرامت ہیں مگر اُن تمام کے دلوں میں تعصب ہے اور جس شخص کے دِل کے اندر تعصب ہو گا وہ میری متبرکات حاصل کرنے کا حقدار نہ ہو گا اس لیے میں نے اپنی متبرکات اپنی قبر میں دفن کرا دینے کا حکم دیا تھا۔

آپ کے مزار کا گنبد فیروز شاہ نے آپکی زندگی میں ہی تعمیر کروایا تھا۔ آپ کی درگاہ بارہ دروازوں پر مشتمل ہے۔ بارہ دری میں سنگ جار اکے ستون ہیں اور پردوں میں سنگ سُرخ کی جالیاں لگی ہوئی ہیں۔ گنبد کا کلس سورج کی روشنی میں یوں چمکتا ہے جیسے چراغ دہلوی اپنی ضیا باریاں اس کلس کے ذریعے لوگوں تک پہنچا رہے ہوں۔ آپ کا مزار شاہ جہاں آباد سے ۶ کوس کے فاصلے پر جنوب میں واقع ہے۔

صوفی فضل کریم رح

ضلع سرگودھا میں ایک ایسے شخص نے جنم لیا جسکو اللہ تعالیٰ نے عبادت و ولایت میں یگانۂ روزگار بنا دیا۔ روحانیت کے اس سپوت کا نام صوفی فضل کریم تھا۔ آپ ضلع جہلم کے ایک گاؤں احمد آباد میں ۱۳۴۸ھ پیدا ہوئے کہ دریائے جہلم کے کنارے بھیرہ شہر کے ساتھ واقع ہے۔ آپ کے ننھیال احمد آباد میں رہتے تھے جب کہ آپ کے دیال سرگودھا شہر سے متعلق تھے۔ مگر آپ کے والد ماجد میاں محمد بخش رح نے تلاشِ معاش کے سلسلہ میں نقل مکانی کر کے بھیرہ شہر کے اسلامی باغ محلہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ صوفی فضل کریم رح نے اپنا عہد طفولیت بھیرہ شہر میں ہی گزارا آپ کو شروع سے ہی اہلِ روحانیت سے بڑی محبت تھی۔ آپ اپنی والدہ محترمہ فضل بی بی رح کے ہمراہ ہر جمعرات کو بھیرہ میں تمام بزرگانِ دین کی درگاہوں پر جاتے تھے اولیائے کرام کے مزاروں پر جا کر قبلہ صوفی صاحب کو ایک گوناگوں سکون نصیب ہوتا تھا۔ آپ اکثر غور فرمایا کرتے تھے کہ ان صاحبانِ مزاروں نے اتنے بلند مراتب کیونکر حاصل کیے یہی وجہ ہے کہ آپ کے اندر اوائل عمری میں ہی روحانیت میں پرواز کرنے کا شوق پیدا ہو گیا۔

محترم صوفی صاحب رح نے سنِ جوانی سے ہی شرعی شکل و صورت اختیار کی۔ اور عمر بھر اپنی ڈاڑھی کو قینچی نہ لگنے دی۔ آپ اپنی ملازمت کے ابتدائی ایام میں راولپنڈی کی ایک مسجد میں بیٹھے تھے کہ وہاں پر ایک بزرگ شخصیت مسجد میں داخل ہوئی۔ اس نے آپ کو مخاطب کر کے فرمایا "اے نوجوان! تمہارے دل میں تو خدا طلبی کی تڑپ ہے مگر تمہاری راہ ابھی اس طرف متعین نہیں ہوئی جہاں سے کارزارِ روحانیت کو راستہ جاتا ہے"، صوفی صاحب فرماتے ہیں۔ ان بزرگ کی باتوں نے میرے دل پر اتنا اثر کیا کہ میں نے خود ان کے قدموں میں بیٹھ کر عرض کی "حضرت! میں واقعی ولایت و ریاضت کے خزانوں کا متلاشی ہوں۔ میری راہ نمائی فرمائیے"، ان بزرگ نے حکم دیا کہ سب سے پہلے اپنے سر کے بال منڈوا دو اور عمر بھر بال نہ رکھنا اور ساری زندگی عبادت میں گزارنا۔ ہمیشہ متوکل رہنا اور رزقِ حلال استعمال کرنا۔ کیونکہ رزقِ حلال کے بغیر انسان کی عبادات بالکل قبول نہیں ہوتیں"، یہ کہہ ان صاحب کرامت ہستی نے اپنے ہاتھ سے آپ کا سر مونڈ دیا اور آپ کو نصیحت کرتے رخصت ہو گئے۔ صوفی صاحب رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں "اس دن کے بعد میں نے ساری زندگی

سر پر بال رکھے اور ہمیشہ رزقِ حلال پر تقویٰ کیا اور توکل کو اپنا نصب العین بنائے رکھا اور یہی وجہ تھی کہ صوفی صاحب مشکل سے مشکل حالات میں بھی نہایت مطمئن اور خدا کی رضا پر صابر و شاکر رہے ہیں۔

ملازمت کے سلسلہ میں قبلہ صوفی صاحب نے متحدہ ہندوستان کا کوئی ایسا علاقہ نہ تھا جس کا دورہ نہ کیا ہو۔ لیکن آپ کا معمول تھا کہ جس علاقے میں بھی جاتے سب سے پہلے اس علاقے میں کسی اہل اللہ کو تلاش کرتے اور جب تک آپ کسی صاحب کمال ہستی کو تلاش نہ کر لیتے آپ مضطرب ہی رہتے تھے۔ آپ نے بے شمار اولیائے کرام سے ملاقاتیں کیں جن میں حضرت مجدد الف ثانی کے سجادہ نشین حضرت پیر مہر علی صاحب، خواجہ سلیمان تونسوی صاحب، بابا لال شاہ مری والے اور حضرت سائیں اللہ دتہ شاہ صاحب جیسی یگانۂ عصر ہستیاں قابلِ ذکر ہیں۔ آپ نے حضرت سائیں اللہ دتہ شاہ سے بیعت کی اور یوں آپ کو قادری نوشاہی خاندان کی خلافت حاصل ہوئی آپ کے ہی ایماء پر آپ کے خاندان کے دیگر افراد کو حضرت قبلہ سائیں اللہ دتہ شاہ صاحب نے اپنی مریدی میں لے لیا۔ آپ نے اپنے مرشد کی زندگی میں انکی خدمت میں حاضری کو اپنا شعار بنائے رکھا اور وصالِ مرشد کے بعد آپ کو مری جا کر بابا لال شاہ صاحب سے ملاقات کرنے کا حکم دیا گیا۔

صوفی صاحب فرماتے ہیں کہ حضرت بابا لال شاہ صاحب کے متعلق مشہور تھا کہ وہ اپنے پاس لوگوں کو آنے کی اجازت نہیں دیا کرتے تھے اور جو آپ کے پاس آنے کی کوشش کرتا اس کو بابا صاحب بہت مارا کرتے تھے چنانچہ جس وقت میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو میرے دل میں بھی یہ خدشہ پیدا ہوا کہ بابا صاحب مجھے بھی کہیں نہ ماریں۔ ابھی میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا ہی تھا کہ حضرت نے مجھے اپنے پاس بلایا اور فرمایا "میں آپ کو بالکل نہیں ماروں گا" اس کے بعد مجھے اپنے خصوصی لطف و کرم سے نوازا۔ بیعت اور خلافت سے بھی سرفراز فرمایا۔

❖

ایک مرتبہ ایک عورت قبلہ صوفی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کی کہ میرا لڑکا دو سال ہو گئے گھر سے بھاگ گیا ہے تمام چارہ گری۔ تلاش اور کوشش کے باوجود اس کا کوئی پتہ نہیں ملا۔ آپ نے اس عورت کو دلاسا دیا اور چند وظائف مخصوص طریقہ سے کرنے کو کہا اور ایک ہفتہ کے اندر اس عورت کا بیٹا خود بخود گھر واپس آگیا اور اس نے گھر آکر بتایا کہ مجھے کوئی غیبی طاقت گھر واپس لائی ہے جب کہ میرا گھر واپسی کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ یہ خاصۂ اولیاء ہوتا ہے کہ وہ وہی کچھ کرتے یا لیتے ہیں جس کا ان کو خدا کی طرف سے حکم ملتا ہے اور پھر اس بات میں جو کہ وہ خدا کے حکم سے کرتے ہیں اس میں حق تعالیٰ تاثیر اور برکت بھی پیدا کر دیتا ہے۔

❖

آپ مسلسل تیس سال تک سال میں سے نو ماہ روزے رکھا کرتے تھے اور ہر سال رمضان میں اعتکاف کرتے تھے آپ نے دنیا داری کے جھمیلوں کے باوجود کبھی کوئی اعتکاف نہیں چھوڑا۔ آپ کی ایک مستقل عادت تھی کہ آپ جس عبادت کو شروع کرتے تھے اس پر ہمیشہ کاربند رہتے تھے اور اسی روش کو آپ نے عمر بھر اپنائے رکھا اور ساری زندگی آپ نے عبادت و ریاضت میں بسر کر دی۔ آپ نے زیادہ تر بھرہ کی محلہ اسلامی باغ والی مسجد میں اعتکاف کیے آپ اس مسجد میں اعتکاف میں ہوتے تو آجکل کے شرعی عدالت کے جج جسٹس وپیر محمد کرم شاہ صاحب ازہری اس وقت پیروں والی مسجد میں اعتکاف فرماتے تھے۔ اور دورانِ اعتکاف موصوف پیر صاحب اور صوفی صاحب کے درمیان دعاؤں کے لیے باہمی درخواستیں ہوتیں تھیں۔ عید کے روز قبلہ صوفی صاحب، پیر صاحب سے عید کی نماز کے بعد مصافحہ اور معانقہ کرتے تو پیر صاحب متبسم ہو کر فرماتے کہ آپ کو دوہری مبارک ہے ایک عید مبارک اور دوسری اعتکاف مبارک۔ اور جواباً صوفی صاحب موصوف بھی اسی قسم کی مبارکبادیں پیر صاحب کو پیش کرتے تھے۔ یہ اہل اللہ کی آپس کی وابستگی ہوتی ہے جس کا انحصار ریاضت

و روحانیت کی بنیاد پر ہوتا ہے۔

صوفی صاحبؒ ایک مرتبہ اعتکاف فرما رہے تھے کہ ایک نہایت غریب گھرانے کا لڑکا آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی، "میں امسال مقابلے کا امتحان دے رہا ہوں آپ دعا فرمائیں کہ اللہ مجھے کامیاب فرما دے۔" آپ نے فرمایا دعا تو میں کر دوں گا لیکن کل آنا میں تمہیں تمہاری کامیابی کے متعلق کچھ باتیں استخارہ کر کے بتاؤں گا۔" چنانچہ اگلے روز وہ لڑکا حسب ارشاد حاضر ہوا۔ آپ نے اس کو خوشخبری سنائی "تمہارا کام جو اللہ کے فضل اور حکم سے ہو جائے گا لیکن اعلیٰ ملازمت پا کر تم فرعون ثانی بن جاؤ گے"۔ اس لڑکے نے عرض کی "حضرت! ایسا انشاء اللہ نہیں ہوگا۔ میں ثابت قدم رہنے کی پوری کوشش کروں گا۔" آپ نے فرمایا "اللہ تمہیں تمہارے ارادے میں کامیاب کرے۔ ویسے اللہ اپنے بندے کے منہ سے وہی بات کہلواتا ہے جس کو ہونا ہوتا ہے"۔ چنانچہ آج جب کہ وہ لڑکا اعلےٰ آفیسر ہے اور اس کی فرعونیت اور تکبر کا یہ عالم ہے کہ بیان سے باہر ہے اور صوفی صاحب کی پیشین گوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی ہے۔

حکومت کی طرف سے آپ کی تعیناتی قصبہ ساہی وال ضلع سرگودھا میں تھی۔ آپ ایک روز جمعہ کی نماز ادا فرما کر مسجد سے نکل رہے تھے۔ سردی اس غضب کی تھی کہ ہاتھ پاؤں سُن ہو رہے تھے آپ نے دیکھا کہ ایک ضعیف آدمی سردی کی شدت سے کانپ رہا ہے اس کے پاس کوئی گرم کپڑا نہیں ہے آپ کے دل کو سخت رنج پہنچا۔ آپ نے فوراً اپنا کوٹ اتارا اور اس بوڑھے اور کمزور کے حوالے کر دیا۔ آپ کے معتقدین میں سے سائیں جیون شاہ ہمیشہ آپ کے ساتھ رہتا تھا۔ اس نے جب یہ دیکھا تو فوراً اپنی گرم چادر پیش کی۔ آپ نے فرمایا "مجھے اللہ تعالیٰ نے سردی برداشت کرنے کا حوصلہ دیا ہے اور میرا گھر قریب ہی ہے میں گھر جا کر چادر لے لوں گا۔ آپ قیام ساہی وال کے دوران سیال شریف بھی بکثرت جایا کرتے۔ خواجہ قمر الدین سیالویؒ سے آپ کی خصوصی دوستی تھی۔ آپ ایک مرتبہ سیال شریف تشریف لے گئے ان دنوں عرس کے ایام تھے مریدوں اور ارادت مندوں کا ایک سیلاب تھا جو چہار سو پھیلا ہوا تھا۔ صوفی صاحب خواجہ صاحب سے ملاقات کے لیے آگے بڑھے کہ ان کے خادم نے آپ کو روک دیا کہ اس وقت حضرت ملاقات نہیں کر سکتے خواجہ صاحب نے خادم کو روکتے ہوئے دیکھا اور اس کو حکم دیا کہ صوفی صاحب کو فوراً میرے پاس بھیج دو۔ چنانچہ آپ خواجہ صاحب کے پاس پہنچے۔ انہوں نے خصوصی تلطف فرماتے ہوئے آپ کو اپنی مسند پر بٹھایا اور پھر جب اجتماعی دعائے خیر ہونے لگی تو آپ کو حکم دیا کہ آج دعا صوفی صاحب کروائیں گے۔ اولیائے کرام کا فیضان اور لطف و کرم آپ پر اس قدر تھا کہ آپ کی زندگی کو رشک کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے اور یہ مرتبۂ بلند اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو دیتا ہے جن سے اللہ خود محبت کرتا ہے۔

آپ کے برادر کلاں حاجی محمد حیات صاحب اپنی یادداشت میں بیان فرماتے ہیں کہ صوفی صاحب علی رحمت مادرزاد ولی تھے اور ولایت کے آثار ان کے بچپن کے زمانہ میں ہی نظر آنے لگ گئے تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ ایک مرتبہ ہم دونوں بھائی اپنے والدین کے ساتھ لاہور میں آئے تھے اور گوالمنڈی گندا انجن کے پاس ہم لوگوں کی رہائش تھی۔ لاہور کے راستوں اور علاقوں سے ہمیں رائی برابر واقفیت نہ تھی۔ ایک روز صوفی صاحب مجھے ساتھ لے کر گلیوں گلیوں میں سے گذارتے حضرت داتا گنج بخش کے مزار پر لے گئے اور وہاں جا کر فاتحہ وغیرہ پڑھی۔ میں ان دنوں تو صرف اتنا سوچ سکتا تھا کہ اس طرح گھر سے باہر جانے پر والدین ناراضگی کریں گے اور میں نے سوچا بھی یہی تھا اور صوفی صاحب کو جلدی گھر واپس جانے کے لیے کہا اور راستے میں میں نے یہ بھی پوچھا کہ آپ لاہور میں تو پہلی مرتبہ آئے ہیں آپکو داتا صاحب کے مزار کا راستہ کس طرح معلوم ہوا ہے تو انہوں نے جواب دیا میں

خود ہی پتہ چل گیا۔ وہ زمانہ تو بچپنے کا تھا۔ شعوری حدود میں داخل ہونے کے بعد آج میں سوچتا ہوں کہ اتنے کم سن بچے کے ذہن میں
اس قسم کے اسرار و رموز کے دروازوں کا وا ہونا قطعی معمولی بات نہیں بلکہ یہ خدا کے ودیعت کردہ علوم معرفت تھے۔ جو صوفی صاحب
اللہ نے ان کو اپنے وَلی کے مزار تک بھیجنے کے راستے دکھلائے
کو عہد طفولیت میں حاصل ہوئے۔

❖

۱۹۷۳ء میں آپکی تعیناتی سرکاری طور پر چنیوٹ میں تھی۔ یہ شہر دریائے چناب کے بالکل قریب ہے اگست ۱۹۷۳ء کے دن
تھے کہ دریائے چناب میں شدید سیلاب آگیا۔ اہل شہر کو مقامی انتظامیہ نے خبردار کر دیا کہ فوراً شہر سے نکل کر کسی محفوظ مقام پر چلے
جائیں۔ بیشتر لوگ پہاڑیوں پر چڑھ گئے۔ کچھ فیصل آباد کی طرف نکل گئے۔ غرض نفسا نفسی کا عالم تھا۔ آپ کی جائے قیام دریا کے
بالکل نزدیک تھی۔ سیلاب نے سب سے پہلے آپ کے گھر کا احاطہ کیا۔ آپ کے گھر کے چاروں طرف پانی ایک بحر بیکراں کی
شکل میں بہہ رہا تھا۔ آپ اپنے اہل خانہ کے ساتھ گھر سے بالکل باہر نہ نکلے۔ آپ کا گھر جزیرہ نما لگ رہا تھا۔ اردگرد کے کچے مکان
دھڑام دھڑام گر رہے تھے۔ مگر ایک بات عجیب تھی کہ آپ کے گھر میں سوائے صحن کے پانی کمروں میں بالکل نہ آیا جب کہ
گھر سے باہر صحن اور گلی میں پانی کی سطح کمروں سے اونچی تھی آپ بس اس وقت خدا کے دربار میں استغفار میں مگن تھے۔
کچھ لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس قیامتِ صغریٰ سے نجات کے لیے دعا کی درخواست کی۔ آپ نے فرمایا
"یہ دعا کا نہیں، توبہ استغفار کا وقت ہے۔ جس قدر توبہ ہو سکتی ہے کر لو،" لوگ چلے گئے اور اپنے اپنے گھروں میں جا کر استغفار
کرنی شروع کر دی۔ مگر پانی تھا کہ سوار چلا آ رہا تھا اور شہر کو نیست و نابود کرنے کے درپے تھا۔
عصر کی نماز سے پہلے لوگ پھر ایک وفد کی شکل میں آئے اور عرض کی "قبلہ صوفی صاحب! خدا سے اس آفتِ ناگہانی سے
نجات کی دعا کیجیے ورنہ ہم لوگ ڈوب کر مر جائیں گے،" آپ مسکرائے اور ان لوگوں کو ٹھیکریوں پر چند آیات لکھ کر دیں اور فرمایا
"ان کو دریا میں ڈال دو،" چنانچہ ایسے ہی کیا گیا۔ عصر سے مغرب تک پانی کا زور خدا کے فضل سے ٹوٹ گیا اور عشاء کی نماز کے بعد
سطح زمین نظر آنی شروع ہو گئی اور فجر کی نماز کے بہت پہلے بلکہ آدھی رات کو پانی بالکل واپس چلا گیا اور یوں اللہ تعالیٰ نے اپنے
کلام کی برکت سے اپنے مقرب بندے کو سُرخرو کیا۔

❖

آپ نے اپنے والدین کی بڑی خدمت کی۔ آپ کی والدہ کی بینائی رخصت ہو گئی۔ آپ ان کو علاج کی غرض سے گوجرہ
گئے۔ اسٹیشن سے ہسپتال برائے امراضِ چشم تک جانے کے لیے کافی راستہ پیدل چلنے کا تھا۔ آپ کی والدہ ماجدہ چلنے سے
معذور تھیں۔ تانگے وغیرہ کا کوئی انتظام نہ تھا۔ آپ نے اپنی والدہ کو کندھے پر اٹھا لیا اور ہسپتال لے گئے اور ان کا مکمل
علاج کروایا۔ آپ کو اپنے والدین کی خدمت کا اس قدر خیال تھا کہ آپ نے والد اور والدہ دونوں کا علیحدہ علیحدہ جیب
خرچ مقرر کر رکھا تھا۔ ان کا حتی المقدور خیال رکھتے اپنی اولاد کی ضروریات پر والدین کی خدمت کو ترجیح دیتے تھے۔
آپ فرماتے تھے کہ والدین کی خدمت حج اکبر کے برابر ہے اگر والدین زندہ نہ ہوں تو ان کی قبر پر جانا بڑا کارِ ثواب ہے
دوسرے اگر کوئی دعا نہ قبول ہو رہی ہو تو دعا کرنے والے کو چاہیے کہ اپنے والدین کے مزار پر جائے اور وہاں دعا مانگے
اللہ تعالیٰ فوراً استجابت ہو گی۔ آپ کے والدین آپ پر اس قدر مہربان تھے کہ صوفی صاحب خود فرمایا کرتے تھے کہ مجھے
اور ولایت میں جس قدر ترقی اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی ہے یہ سب میرے والدین کی دعاؤں کا نتیجہ ہے ورنہ ایک بے مایہ انسان
کس طرح اللہ تعالیٰ کی عنایات خصوصی سے بہرہ ور ہو سکتا ہے۔ والدین کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھنا بھی کار
باعث ثواب ہے۔ آپ کے پاس محکمانہ طور پر ایک بیلدار تھا۔ اس نے میٹرک پاس کر رکھا تھا یہ ۱۹۶۰ء سے پہلے کا واقعہ ہے
ان دنوں میٹرک کی تعلیم کی خوب قدر و قیمت تھی۔ آپ کو بہت خیال ہوا کہ یہ لڑکا میٹرک پاس ہے اور چپڑاسیانہ زندگی اس

قدر بن گئی ہے آپ نے اس کو ایک خط ایک آفیسر کے نام دیا اور فرمایا یہ خط فلاں آفیسر کو دے دو۔ تمہیں تمہاری تعلیم کے مساوی نوکری مل جائے گی۔ خط میں آپ نے تحریر کر دیا "اے افسر! خدا تعالیٰ نے تمہیں صاحب اختیار بنایا ہے اس شخص کا جائز کام کر کے اس کا حق دلواؤ۔ یہ تمہارے حق میں باعث فلاح ہوگا" وہ لڑکا خط لے کر چلا گیا۔ بعد میں آپ نے خدا سے گڑگڑا کر دعا مانگی کہ "اے رب! میں نے تیرے بھروسے پر اس کو بھیجا ہے اب میری لاج رکھنا تیرا کام ہے" اللہ تعالیٰ آپ کی دعا قبول فرمائی اور اس لڑکے کو اچھی ملازمت مل گئی۔ وہ آپ کے لیے لوٹا مصلیٰ اور تسبیح وغیرہ لے کر حاضر ہوا مگر آپ نے فرمایا ہم کسی سے کچھ نہیں لیتے۔ یہ اشیاء اپنے استعمال میں رکھو اور خدا کا شکر ادا کرو تاکہ تم اس کے مقرب بندے بن جاؤ۔

❖

قبلہ صوفی صاحب فرماتے ہیں کہ مجھے قلبی ٹیلیفون کے ذریعہ حضرت سلطان باہوؒ اپنے پاس بلایا کرتے تھے اور مجھے اپنے لطف و مہربانی سے نوازتے تھے۔ اسی طرح حضرت میراں شاہ صاحبؒ بھیرہ شریف والے بڑے برگزیدہ ولی اللہ ہیں ان کے متعلق بھی صوفی صاحب نے اپنی یادداشت میں تحریر کیا ہے کہ وہ مجھے اپنے پاس بلاتے تھے اور روحانیت اور معرفت کے اسرار و رموز سمجھایا کرتے تھے۔

❖

ایک دفعہ ایک شخص نے آپ سے کچھ پیسے اس سلسلہ میں لیے کہ وہ کاروبار کرے گا اور آپ کو بھی ان پیسوں کے علاوہ منافع میں سے حصہ دے گا مگر پیسے لینے کے بعد اس کی نیت میں فتور آ گیا۔ اس نے نہ صرف آپ کے پیسے ضبط کر لیے بلکہ آپ کو بدنام کرنے کی بھی کوشش کی۔ آپ نے بظاہر تو خاموشی اختیار کی مگر خدا کے حضور اپنا معاملہ رکھ دیا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ بالآخر تو اس شخص نے بمعہ منافع آپ کی رقم لوٹا دی۔ دوسرے اتنا پریشانی کا شکار رہا کہ آپ سے تحریراً معافیاں مانگتا رہا۔ آپ نے اس کو خدا کے نام پر معاف کر دیا۔

❖

ایک ڈاکٹر صاحبہ جو خود اعلیٰ تعلیم یافتہ تھی ان کو سر کا شدید عارضہ تھا۔ اس کا علاج انہوں نے از خود بھی کیا۔ ملکی اور غیر ملکی ڈاکٹروں سے مشورہ کیا مگر مطلق آرام نہ آیا۔ ان کو کہیں صوفی صاحب کا پتہ چلا اور وہ دم کروانے آئیں آپ نے ان کو دم بھی کیا اور ایک تعویز بھی دیا اور اس کے بعد ان کے سر کا درد خدا کی کلام اور فضل کے اثر سے ہمیشہ کے لیے جاتا رہا۔

❖

آپ کا معمول تھا کہ آپ لاہور اس وقت تشریف لاتے تھے جب آپ کو داتا صاحب بلاتے۔ آپ فرمایا کرتے تھے جب میں داتا صاحب آنے کا پروگرام بناتا ہوں تو اگر داتا صاحب نے خود نہ بلایا ہو تو ناگہانی وجوہات کی بنا پر میرا پروگرام ملتوی ہو جاتا ہے جب کہ بعض اوقات مجھے خود بھی پتہ نہیں چلتا کہ میں کیوں لاہور جا رہا ہوں اور بغیر کسی پروگرام کے داتا صاحب پہنچ جاتا ہوں ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے ولی جس کو چاہیں اپنے پاس طلب فرما سکتے ہیں۔

❖

آپ کی ریٹائرمنٹ جب ہوئی تو آپ کے بچے ابھی بہت چھوٹے تھے اور اس غرض سے آپ نے ملازمت میں اضافی سال دیے جانے کی درخواست دی متعلقہ افسر اس میں رکاوٹ کا باعث بنا۔ آپ کو اس نے بہت تنگ کیا۔ آخر آپ نے اس کے پاس جانا چھوڑ دیا اور آرام سے گھر بیٹھ گئے۔ آپ کو ایک روز وہی افسر خود ملنے آیا آپ نے جب اس کو دیکھا تو آنے کا مقصد پوچھا اس نے بتایا کہ میں نے جب سے آپ کا کام کرنے سے انکار کیا ہے میری رات کی نیندیں حرام ہو گئیں ہیں آج رات کوئی غیبی طاقت مجھے پکار پکار کر کہتی رہی کہ صوفی صاحب کا کام فوراً کر دو۔ تو میں نے صبح اٹھ کر پہلے آپ کا کام

کیا ہے اور اضافی مدت دینے کی اجازت کے احکامات جاری کر کے از خود آپ کی خدمت میں لایا ہوں اب میرے لیے دعا فرمائیں کہ مجھے سکون نصیب ہو جائے آپ نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اس کے لیے دعا خیر کی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے لیے ان کے مسائل کا حل خود کروا دیتا ہے اور یہ انعام صرف متوکل لوگوں کو ملتا ہے۔

محکمہ ریلوے کے ایک ریٹائرڈ پلیٹر عبدالوحید خاں نے عمر بھر نہ کبھی نماز پڑھی نہ روزہ رکھا بلکہ ساری زندگی مے نوشی میں گزار دی۔ ایک روز آپ کے ساتھ ان کی ملاقات ہو گئی آپ نے ان کو ایسی طلسماتی نظروں سے دیکھا کہ ان کے اندر کی دنیا تبدیل ہو گئی اور انہوں نے ستر سال کی عمر میں صوم وصلوٰۃ کی پابندی شروع کر دی اور نیک بندے بن گئے۔

صوفی صاحبؒ قبلہ کی خدمت میں لوگ اپنی مشکلات و مسائل لے کر آتے اور ان کا مناسب حل لے کر جاتے۔ ایک مر ایک لڑکی کی شادی ہونے والی تھی۔ تاریخ بھی طے ہو چکی تھی مگر کچھ گھریلو فسادات ہوئے کہ لڑکے نے شادی سے نہ صرف انکار کر دیا بلکہ انتہائی جلدی سے تیاری کر کے لندن روانہ ہو گیا اب لڑکی والے سخت پریشان تھے اور لڑکے والے بھی کے والدین کو اپنی بے عزتی کا بڑا خطرہ تھا۔ انہوں نے اپنی مشکل آپ سے بیان کر دی۔ آپ نے ان کے لیے دعا فرمادی اور اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ وہ لڑکا لندن کے ہوائی اڈے پر ہی کاغذات کی عدم تکمیل کی وجہ سے دفتری الجھنوں کا شکار ہوا اور وہیں سے واپس پاکستان بھیج دیا گیا اور واپس آنے کے بعد اس لڑکی کی شادی اسی لڑکے کے ساتھ بخیر و خوبی طے پائی۔

لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے تو اکثر یہ رونا رویا کرتے تھے کہ فلاں نے ہم پر جادو کر دیا ہے، فلاں کو جن کا اثر ہے آپ لوگوں کو سخت ڈانٹا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ اس دور میں نماز سلیقے سے ادا نہیں ہوتی تو جادو ٹونے اثر کرتے ہیں اور یہ جن وغیرہ کسی کے قابو میں نہیں کہ وہ کسی کا حکم مان کر دوسرے کو برباد کر دیں آج کل اپنی پیدا کی ہوئی اولادیں تو کہنا مانتی نہیں پھر جن وغیرہ کس طرح حکم کی پیروی کریں گے۔ آپ فرمایا کرتے تھے "صرف رزقِ حلال کماؤ اور کھاؤ پھر دعا مانگو۔ تمہاری دعا نہ صرف قبول ہو گی بلکہ تمہیں یہ جادوؤں اور جن پریوں سے بھی بچائے رکھے گی۔

ایک بزرگ پیر سدھارن شاہ جن کا مزار چنیوٹ شہر میں واقع ہے ان کے آپ بہت معترف تھے آپ فرماتے تھے کہ کو بھی پریشانی لاحق ہو وہ پیر سدھارن شاہ کے دربار جا کر نوافل پڑھے اور دعا مانگے اس کی دعا قبول ہو گی اور جب دعا قبول ہو جائے تو سائل کو چاہیے کہ وہ دربار پر چار اتوار جھاڑو دے کیونکہ اللہ کے ولیوں کی خدمت سے خدا بہت خوش ہوتا ہے۔

قطبِ وقت محمد یونس خاں آفریدی — کے آپ بہت ہی چاہنے والے تھے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ آفریدی جیسا ولی اس دور میں ڈھونڈے نہیں ملتا آپ نے اپنی تمام اولاد کو حضرت آفریدی صاحب کا بیعت کروایا۔ آفریدی صاحب اپنی ذات میں نہایت برگزیدہ اور معصوم خدا کے ولی ہیں۔ آفریدی صاحب کے اوصاف بیان کرتے ہوئے صوفی صاحب فرمایا کرتے تھے۔ کہ ایک کامل مرشد کی جو پہچان ہوتی ہے وہ آفریدی صاحب کی شان ہے اور آفریدی وہ ولی ہیں جن کو گھر بیٹھے ہوئے خدا نے ولایت اور خلافت عطا کی جس کامل کی آفریدی صاحب اپنے دل میں خواہش تھے اللہ تعالیٰ وہ عمل غیبی مدد سے آپ کو عطا فرما دیا کرتا ہے۔ محترم صوفی صاحب کو بھی آفریدی صاحب کے خصوصی حاصل تھے اور اللہ والوں کے آپس میں رشتے اور تعلق بے لوث ہوتے ہیں اور یہ ایک دوسرے کی نظر میں اپنے آپ

کم قیمت خیال کرتے ہیں اور یہی انکساری ہی ان لوگوں کی بڑائی ہوتی ہے آفریدی صاحب آج بھی زندہ موجود ہیں اور ان کا فیضان لوگوں کے لیے عام ہے۔ دور دراز سے لوگ آکر ان سے فیوض و برکات سے جھولیاں بھرتے ہیں۔

ایک حکیم صاحب کی بیٹی کو دمہ کی تکلیف تھی اس کی شادی ہوگئی اور اس کے سسرال والے اس موذی بیماری سے تنگ آگئے انھوں نے لڑکی کو واپس اس کے والدین کے پاس بھیج دیا۔ حکیم صاحب بڑے پریشان ہوئے کہ لڑکی شادی کے چند روز کے بعد ہی واپس گھر آگئی ہے۔ یہ بات لڑکی والوں کے لیے بڑی بے عزتی کی ہوتی ہے حکیم صاحب صوفی صاحب کے خاص عقیدت مندوں میں سے تھے انہوں نے آکر آپ کی خدمت میں سارا قصہ بیان کیا۔ آپ نے ان کو تسلی دی کہ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب کے صدقے نہ صرف لڑکی کو شفایاب کرے گا۔ بلکہ لڑکے والے خود آکر اس کو لے جائیں گے آپ نے دعائے خیر فرمادی اور اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و رحمت کے ساتھ لڑکی کو شفا دی اور اس کے بعد ہنوز اس کو دمہ کی تکلیف نہیں ہوئی۔ اور اس کو اس کے سسرال والے خود آکر لے گئے اور آج بھی وہ اپنے گھر میں شاد آباد ہے۔ اللہ نے اس کو صاحب اولاد بھی بنایا ہے

سلانوالی کے ایک بہت بڑے زمیندار کا بیٹا وفات پاگیا یہ ان کا اکلوتا بچہ تھا۔ اس کے غم میں وہ اور اس کی بیوی بڑے ہی آزردہ خاطر تھے کسی نے اس کو آپ کے پاس دعا کے لیے بھیجا آپ نے اس کو تسلی دی اور فرمایا کہ تمہیں اس بچے کا نعم البدل تو ضرور ملے گا مگر دس سال کے بعد ملے گا۔ نامعلوم یہ اتنی لمبی مدت کی بات آپ کے منہ سے کس طرح نکل گئی وہ شخص واپس چلا گیا۔ آپ بھی اس بات کو بھول گئے یہ ۱۹۶۲ء کی بات تھی ان دنوں آپ کی سرکاری تعیناتی سلانوالی ضلع سرگودھا میں تھی کوئی دس سال کے بعد ۱۹۷۳ء میں وہ شخص یعنی مذکورہ بالا زمیندار آپ کو ڈھونڈھتا ہوا آپ کے پاس پہنچا اس کے ساتھ اس کی بیوی بھی تھی اس نے آپ کو ساری بات سنائی کہ پورے دس سال کے بعد اب میری بیوی امید سے ہے آپ کی پیشین گوئی پوری ہوئی ہے اب دعا کیجیے اللہ ہمیں بیٹا عطا فرمائے۔ آپ نے اس کو کہا کہ مجھے تو یہ بات بھول چکی ہے بہرحال میں دعا کیے دیتا ہوں۔ اللہ آپ لوگوں کو نیک فرزند عطا فرمائے اور خدا نے کچھ عرصہ کے بعد اس شخص کو بیٹا عطا فرمایا۔ اس نے آپ کو بہت کچھ پیش کرنے کی کوشش کی مگر آپ نے انکار کر دیا اور فرمایا "بھائی! دعا تو خلوص دل کے ساتھ کی جاتی ہے نہ کہ معاوضہ کی خاطر۔ تمہاری مراد بر آئی۔ ہمارے لیے یہی خوشی کیا کم ہے جاؤ اپنے گھر میں اور خدا کے حضور شکرانے کے نفل ادا کرو۔

۲۱ رجب الثانی ۱۴۰۷ھ کو صوفی فضل کریم اس جہان فانی سے کوچ کر گئے آپ کے عقیدت مند دور دور سے آپ کے مزار پر حاضر ہوتے ہیں اور فیوض و برکات سے جھولیاں بھرتے ہیں کیونکہ اللہ کے ولی مرتے نہیں بلکہ دنیا والوں سے پردہ کر جاتے ہیں۔

مشہور تابعی حضرت سعید بن جبیر نے خواجہ حسن بصری سے عرض کی کہ مجھے کوئی نصیحت فرمایئے۔ آپ نے فرمایا تین چیزوں سے ہمیشہ بچتے رہو۔ اوّل یہ کہ بادشاہوں سے میل جول نہ رکھنا کیونکہ اس کا انجام بالعموم اچھا نہیں ہوتا۔ بادشاہ خواہ کتنا ہی شفیق اور مہربان کیوں نہ ہو اس کو آنکھ بدلتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ دوسری یہ کہ کسی نامحرم کے ساتھ خلوت میں نہ بیٹھنا خواہ وہ رابعۂ دوران ہی کیوں نہ ہو اور خواہ تو اسے قرآن پاک کی تعلیم ہی کیوں نہ دیتا ہو۔ تیسری یہ کہ مزامیر سے پرہیز کرنا کیونکہ مزامیر سے دل قابو میں نہیں رہتا اور انسان لغزش کھا جاتا ہے۔

یوں تو ہر ولی اللہ صاحبِ کرامت ہوتا ہے جس کی تعلیمات کرامات اور فیوض و برکات
کے سمندر سے اُس کے مُرید اور ارادت مند اپنی علمی اور روحانی پیاس بُجھاتے ہیں مگر
ر کے جس برگزیدہ اور نیک بزرگ کا تذکرہ ہم اس وقت کرنے جا رہے ہیں اُس کی تعلیمات سب
جُدا، اُس کے افکار عام علمائے سے مختلف اور اُس کی کرامات انسانی فہم و ادراک سے بالاتر تھیں ۔ یہ
مولانا فخر الدین زرادی کا ہے جو یکتائے زمانہ تھے جن کی نرمی اور ہمدردی کمزور اور دُکھی لوگوں کے لیے
اور جن کی سختی وقت کے بڑے بڑے راجوں مہاراجوں اور سلاطین کے لیے تھی ۔ آپ کو بچپن ہی میں
ی کے عظیم عالم مولانا فخر الدین ہانسوی کے مکتب میں دینی علوم کے حصول کے لیے بھجوا دیا گیا تھا ۔ چونکہ
ی پیاس آپ میں جنون کی حد تک تھی اس لیے باقی تمام شاگردوں میں سے آپ ذہین ٹھہرے ۔
ایک روز اُستادِ محترم علم ہدایہ پڑھاتے پڑھاتے اچانک خاموش ہو گئے ۔ جس پر آپ ہی کے ہم نام شاگرد
الدین زرادی نے آپ سے سوال کیا کہ اچانک پڑھانے کے دوران یہ خاموشی کیسی ۔ اُستادِ محترم نے جواب دیا
ایک نقطے پر انھیں کچھ شک ہوا ہے اس لیے جب تک وہ اس کی وضاحت حاصل نہ کر لیں گے مزید نہیں پڑھائیں
۔ چونکہ فخر الدین زرادی خاصے ذہین تھے اس لیے انھوں نے سوچا کہ شاید اُستادِ محترم کے علم میں کچھ کمی ہے
نے اس خیال کا اظہار انھوں نے اپنے ہم جماعت دوست نصیر الدین سے کیا تو وہ اُستادِ محترم کی تحقیر برداشت
کر سکے ۔ انھوں نے فخر الدین زرادی سے کہا انھیں بغیر سوچے سمجھے اُستادِ محترم کی علمی قابلیت کو شک کی نگاہ
سے نہیں دیکھنا چاہیے تھا ۔ اگر تمھیں کوئی شک ہے تو تم اُن کے پاس جا کر اس کی وضاحت حاصل کر لو ۔ مگر فخر الدین
چونکہ اپنی ذہانت پر ناز تھا اسلئے وہ اپنے موقف پر ڈٹے رہے اور انھوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ آئندہ وہ اپنے
استاد کا نام سننا بھی پسند نہیں کریں گے ۔ فخر الدین کی باتیں سُن کر نصیر الدین کو بہت قلق ہوا مگر انھوں نے اسے ظاہر نہ ہونے
۔ البتہ اتنا ضرور کہا چونکہ وہ میرے مُرشد بھی ہیں اسلئے میں اپنی ذات کو اُن کی ذات کے بغیر نامکمل سمجھتا ہوں ۔

زرادی نے جواب دیا۔ "اگر تم ان کا نام لو گے تو میں بھی انھیں رد کروں گا اُن کی مخالفت کروں گا۔"
نصیر الدین دل برداشتہ ہو گئے، بولے۔ "اگر تم ان کی مخالفت کرو گے، انھیں رد کرو گے تو اس سے اُن کا مرتبہ کم نہیں ہو جائے گا۔ وہ جو کچھ بھی ہیں وہی رہیں گے۔"
زرادی نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی۔ "دیکھو بھائی! نظام الدین تمھارے پیر ہیں میرے پیر تو نہیں۔ یہ جو تم بار بار موقع بے موقع اُن کا نام لیتے ہو یہ بات دل و دماغ کو گراں گزرتی ہے میں اُن سے بیزار ہو چکا ہوں۔"
نصیر الدین خاموشی سے اپنے گھر چلے گئے۔
کئی دن بعد، ایک بار پھر ان دونوں میں تلخ کلامی ہو گئی۔ کسی بات پر نصیر الدین نے کہا۔ "میں نے آج تک اپنے پیر مرشد جیسا حال و قال کا باکمال نہیں دیکھا۔ وہاں سوز بھی ہے اور ساز بھی عجیب یگانہ زمانہ شخصیت ہے ان کی بھی اور وہ لوگ بڑے بدبخت اور بدنصیب ہیں جنھیں اُن کا دور تو ملا مگر وہ اُس باکمال ذات کی زیارت سے محروم رہے۔"
زرادی کو غصہ آ گیا۔ "نصیر الدین! تم مجھے بدنصیب کہہ رہے ہو؟ آخر تم چاہتے کیا ہو؟"
نصیر الدین نے جواب دیا۔ "میں یہ چاہتا ہوں کہ تم اس بادشاہِ دین و دنیا سے ایک بار ملاقات کر لو، اس کے بعد جو رائے چاہو قائم کر لینا، میں خاموش ہو جاؤں گا۔"
زرادی نے کہا۔ "نصیر الدین! تم مجھے اُن کے پاس مت لے جاؤ کیونکہ اس کے بعد میں جس طرح اُن کی مخالفت کروں گا تم اس کی بات سوچ بھی نہیں سکتے۔ میں ذرا دوسری قسم کا انسان ہوں۔"
نصیر الدین نے زرادی کو نیم آمادہ جو دیکھا تو مزید اصرار کیا۔ "مجھے تمھاری ہر بات منظور ہے میں تمھیں اُن سے ملا کے رہوں گا۔"
زرادی نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔ "اچھا مجھے منظور۔ میں وہاں ضرور چلوں گا لیکن ایک شرط پر۔ میں وہاں تنہا نہیں جاؤں گا۔ اپنے ساتھ اپنے دوست امیران بورکش کو بھی لے جاؤں گا۔"
نصیر الدین نے خوشی سے اجازت دے دی۔ "میری طرف سے تمھیں اس کی اجازت ہے میں تم دونوں کو اپنے ساتھ پیر مرشد کی خدمت میں اس طرح لے جاؤں گا کہ دیکھنے والوں کو رشک و حسد پیدا ہو جائے۔"
زرادی لاچار ہو چکے تھے انہوں نے اپنے دوست امیران بورکش سے کہا۔ "یار بورکش! میں سوچتا ہوں ایک دن ہم دونوں نظام الدین کی خدمت میں چلے چلیں۔"
امیران بورکش نے حیرت سے اپنے دوست زرادی کو دیکھا اور پوچھا۔ "دوست! خیریت تو ہے؟ یہ الٹی ہوا کب سے چلنے لگی؟"
زرادی نے جواب دیا۔ "ہوا تو ہر طرف سے سیدھی ہی چل رہی ہے مگر ہم لوگ اپنی لاعلمی کی وجہ سے یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ ہوا الٹی چل رہی ہے۔ خدا سے دعا کرو میرے دوست! کہ میں ان ظالموں سے محفوظ رہوں جو دین و دنیا میں اپنا سکہ چلانا چاہتے ہیں۔"
بورکش نے کہا۔ "کل تک تو تم نے نظام الدین کی مخالفت کی ہے اُن کا مذاق اڑایا ہے اور آج اُن سے ملاقات کا منصوبہ بنا رہے ہو، آخر کیوں؟"
زرادی نے جواب دیا۔ "میں نظام الدین کی تعریفیں سنتے سنتے تنگ آ چکا ہوں اب میں یہ چاہتا ہوں کہ انہیں قریب سے تنا جان لوں اتنا سمجھ لوں کہ نصیر الدین جیسے لوگوں کے منہ بند کر سکوں میں انہیں بتاؤں گا کہ تم لوگ جس کی پرستش کی حد تک عزت کرتے ہو وہ ایک معمولی انسان کے علاوہ کچھ بھی نہیں اور میں اُن سے کچھ زیادہ ہی لائق و فائق انسان ہوں۔"
نصیر الدین کو زرادی کی گفتگو سے تکلیف پہنچ رہی تھی مگر مصلحتاً خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔
امیر الدین بورکش نے نصیر الدین سے مسکرا کر کہا۔ "یہ تم کس مصیبت کو اپنے پیر مرشد کے پاس لیے جا رہے ہو؟"
نصیر الدین نے جواب دیا۔ "میں انہیں مصیبت سمجھ کر نہیں لے جاؤں گا بلکہ میں یہ چاہتا ہوں کہ یہ انہیں مستقلاً لاجواب کر کے اپنے پیر مرشد کا قائل کر دوں۔"
امیر الدین بورکش کو ہنسی آ رہی تھی۔ "اور تم یہ سمجھ رہے ہو کہ اس مقصد میں تم کامیاب بھی ہو جاؤ گے؟"
نصیر الدین نے جواب دیا۔ "کیوں نہیں، کیونکہ میں دوست زرادی اور اپنے پیر مرشد کے فرق سے واقف ہوں، ایک ذرہ ہے دوسرا آفتاب۔ ذرہ ذرہ ہی رہے گا اور آفتاب آفتاب ہی۔"
ان تینوں میں دن طے پا گیا اور موعودہ اور مقررہ دن یہ تینوں نظام الدین اولیا کی خدمت میں روانہ ہو گئے۔

جب یہ تینوں ان کی خدمت میں پہنچ گئے تو نصیرالدین نے نہایت ادب سے اپنے پیر مرشد کو سلام کیا لیکن ان دونوں نے السلام علیکم نہ کہا اپنی جگہ سنبھال لی۔ یہ دونوں حضرت محبوبِ الٰہی کے پاس بیٹھ گئے۔
حضرت محبوبِ الٰہی نے ان دونوں سے پوچھا "تم دونوں کہاں رہتے ہو؟"
زرادی نے جواب دیا "شہر میں۔"
حضرت محبوبِ الٰہی نے زرادی کا جواب سن کر نیا سوال کیا "شہر میں؟ خوب۔ اور تعلیم کہاں پاتے ہو؟"
زرادی نے اس بار بھی جواب دیا "ہم دونوں مولانا فخرالدین ہانسوی سے تعلیم حاصل کرتے ہیں۔"
آپ نے مزید سوال کیا "اور کیا پڑھتے ہو؟"
زرادی نے اس بار بھی جواب دیا "ہدایہ۔"
آپ نے مسکرا کر فرمایا "ہدایہ؟ خوب۔ سبق کہاں تک پہنچا؟"
زرادی نے جہاں تک پڑھا تھا سنا دیا اور حضرت محبوبِ الٰہی کا امتحان لینے کے لیے اشتباہ والے حصے کو بطورِ خاص سنا کر کہا۔ "لیکن یہ حصہ اپنی سمجھ میں نہیں آیا۔"
حضرت محبوبِ الٰہی نے جواب دیا "کیا تمہارے استاد نے اس اشتباہ کو دور نہیں کیا؟"
زرادی نے جواب دیا "نہیں، انھوں نے اس کے لیے وقت مانگا ہے۔"
حضرت محبوبِ الٰہی نے اس سلسلے میں تقریر شروع کردی، فرمایا "اچھا تو اس شبہ کو میں دور کیے دیتا ہوں۔"
اس کے بعد آپ نے شبہات کو اپنی دلنشیں اور پُر دلائل تقریر سے رفع کر دیا۔ زرادی محوِ حیرت، فرطِ رعب سے پیچھے ہٹنے لگے۔ ایمان ترکش کا حال بھی غیر ہو رہا تھا وہ بھی پیچھے ہٹ رہے تھے۔
جب آپ تقریر ختم کر چکے تو دونوں مفتوح ہو چکے تھے۔ زرادی کو خود پر غصہ آ رہا تھا کہ اب تک انھوں نے آپ سے ملاقات کیوں نہیں کی تھی۔ ان دونوں کی نظر میں محبوبِ الٰہی چیز ہی کچھ اور تھے۔ نصیرالدین کے کان میں زرادی نے کہا "دوست! میں شرمندہ ہوں کہ اب تک میں ان سے ملا کیوں نہیں تھا؟"
نصیرالدین کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی، کہا "کیا میں نہ کہتا تھا کہ ایسی یگانۂ زمانہ ہستی صدیوں بعد کہیں پیدا ہوتی ہے۔"
زرادی نے کہا "اب میں معافی کس طرح مانگوں؟ معذرت کیوں کر کروں؟"
نصیرالدین نے جواب دیا "دوست! اس کی کوئی ضرورت ہی نہیں۔"
زرادی نے خواہش ظاہر کی "کیا سلطان المشائخ مجھے اپنی مریدی کا شرف بخشیں گے؟"
نصیرالدین نے خوش ہو کر جواب دیا "کیوں نہیں۔ میں ابھی بات کرتا ہوں۔"
زرادی نے کہا "میں اسی وقت مرید ہونا چاہتا ہوں۔"
نصیرالدین نے حضرت محبوبِ الٰہی سے کہا "پیر مرشد ان دونوں صاحبان کی خواہش ہے کہ آپ انہیں اپنا مرید کر لیں۔"
آپ نے شاید نصیرالدین کی بات سنی نہیں، کچھ توقف کے بعد دریافت فرمایا "تم نے کچھ مجھ سے کہا؟"
نصیرالدین نے جواب دیا "حضرت! یہ دونوں شرفِ مریدی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔"
آپ نے فرمایا "اتنی بھی کیا جلدی، پہلی ہی ملاقات میں مریدی کی خواہش۔ جب دوبارہ کبھی آؤ گے تو تم دونوں کی یہ خواہش بھی پوری کر دی جائے گی۔"
زرادی کا چہرہ اتر گیا، نصیرالدین کے کان میں کہا "دوست! اگر مجھے اسی وقت مرید نہ کیا گیا تو میں اپنی جان دے دوں گا۔"
آپ نے پوچھا "یہ کان میں کیا کہہ رہے ہیں؟"
نصیرالدین نے جواب دیا "پیر مرشد! یہ کہہ رہے ہیں کہ اگر اسی وقت مجھے مرید نہ کیا گیا تو میں اپنی جان دے دوں گا۔"
آپ مسکرائے اور فرمایا "ایسی بھی کیا جلدی، لیکن اگر تم دونوں مُصر ہی ہو تو میں تمہیں اسی وقت مرید کیے لیتا ہوں۔"
آپ نے اسی وقت ان دونوں کو مرید کر لیا اور انہیں کلاہِ ارادت سے سرفراز فرمایا۔
زرادی نے اسی وقت اپنا سر منڈوا دیا اور درویشوں میں شامل ہو گئے۔ انھوں نے کتابیں اور کاغذ دوستوں میں تقسیم کر دیے۔ انہیں دانشمندی کا زعم نہیں رہا تھا اور طلبِ جاہ و منزلت کا غرور ان کے سر سے نکل چکا تھا۔ ابھی تک زرادی کا جہاں قیام تھا اس

جگہ کو چھوڑ دیا اور حضرت محبوب الٰہی کے قریب غیاث پور میں سکونت اختیار کر لی۔ پانچوں وقت کی نمازیں اپنے پیر مرشد کے ساتھ ادا فرماتے تھے۔ زرادی رفتہ رفتہ اپنے پیر مرشد کا سایہ بن گئے۔ سفر و حضر میں اپنے پیر مرشد کے ساتھ رہتے۔ مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کے لیے حضرت محبوب الٰہی جاتے تو یہ بھی ان کے ساتھ ہوتے۔ پھر انہوں نے اپنے پیر مرشد کے سامنے ہی ایک مکان لے لیا اور اسی میں سکونت اختیار کر لی۔ شہر والے حیران تھے کہ زرادی کو یہ کیا ہو گیا ہے۔

حضرت محبوب الٰہی زرادی سے بہت خوش رہتے تھے۔ یہ بھی اپنے پیر مرشد سے طرح طرح کے سوالات کرتے اور اُن کے اثر انگیز جوابات سے محظوظ ہوتے۔ حضرت محبوب الٰہی کے بعض مرید زرادی کے سوالات پر مسکراتے اور آپس میں پوچھتے "یہ زرادی پیر مرشد کو خواہ مخواہ تنگ کرتے رہتے ہیں۔"

دوسرا کہتا۔ "شاید اس لیے کہ شاید اس طرح انہیں پیر مرشد سے زیادہ قربت حاصل ہو جائے۔"

کسی تیسرے نے کہا۔ "وہ تو انہیں قربت اب بھی حاصل ہے۔"

جب یہ گفتگو حضرت محبوب الٰہی نے سُنی تو آپ نے فرمایا۔ "زرادی کی طبیعت میں بے چینی اور جستجو پائی جاتی ہے وہ پوچھتے ہیں تو جواب کی شکل میں کچھ نہ کچھ حاصل بھی کر لیتے ہیں اور اس طرح زرادی دوسروں سے زیادہ دولت مند ہیں اور، اور زیادہ دولتمند ہو جائیں گے۔"

مریدوں نے آپس میں طے کیا کہ زرادی پر نظر رکھی جائے اور یہ دیکھا جائے کہ وہ کس قسم کے سوال کرتے ہیں اور انہیں جواب کی شکل میں کیا کچھ مل جاتا ہے۔

مریدوں نے زرادی کو تشنہ تشنہ اپنے پیر مرشد کے پاس جاتے جو دیکھا تو وہ بھی اُن کے پیچھے پیچھے آپ کے حجرے میں داخل ہو گئے اس وقت زرادی اپنے پیر مرشد سے پوچھ رہے تھے: "پیر مرشد! کئی دن سے ایک سوال دل و دماغ میں کھٹک رہا ہے۔"

آپ نے فرمایا: "کون سا سوال؟ پوچھو۔"

زرادی نے پوچھا۔ "افضل الذکر کیا ہے؟ تلاوتِ قرآن پاک یا ذکر اللہ؟"

آپ مسکرائے، فرمایا۔ "زرادی! تم ہمیشہ بہت اچھے سوال کرتے ہو۔ افضل الذکر تو ذکر اللہ ہی ہے مگر اس میں ایک مصیبت بھی ہے۔ اللہ کا ذکر کرنے والا اپنے مقصود پر بہت جلد پہنچ جاتا ہے لیکن ہر وقت زوال کا خطرہ بھی دامن گیر رہتا ہے مگر قرآن پاک کی تلاوت کرنے والا اگرچہ اپنے مقصود تک دیر میں پہنچتا ہے لیکن اس میں زوال کا خطرہ نہیں رہتا۔"

مریدوں کو اس جواب کی شکل میں گویا ایک خزانہ ہاتھ آ گیا تھا۔ وہ بہت خوش ہوئے اور شاید اس دن انہیں زرادی کے اعلیٰ مقام کا علم ہوا۔

حضرت محبوب الٰہی اپنے ارادت مندوں اور مریدوں میں ابھی اچھی باتیں کر رہے تھے کہ ایک غیر ملکی آپ کی مجلس میں داخل ہوا۔ اس نے حاضرین سے پوچھا۔ "میں شیخ المشائخ نظام الدین سے ملنا چاہتا ہوں۔"

مریدوں نے حضرت محبوب الٰہی کی طرف اشارہ کر دیا۔ "اے شخص! اس وقت تو انہی کی مجلس میں کھڑا ہے بتا اُن سے تیرا کیا کام ہے؟"

غیر ملکی اجنبی نے حضرت محبوب الٰہی سے پوچھا۔ "تو جناب آپ ہی شیخ المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاء ہیں؟"

آپ نے جواب دیا۔ "ہاں میں ہی نظام الدین ہوں، کہو مجھ سے کوئی کام ہے؟"

غیر ملکی اجنبی نے پوچھا۔ "آپ کے مرید فخر الدین کہاں رہیں؟"

آپ نے پوچھا: "کون سے مرید فخر الدین! اس نام کے تو کئی مرید ہیں میرے پاس۔"

غیر ملکی نے جواب دیا۔ "حضرت! میں بغداد سے آیا ہوں۔ میں نے ابھی حال ہی میں ایک عجیب و غریب خواب دیکھا ہے۔ میں نے دیکھا کہ ایک فرشتہ اپنے ہاتھوں میں بہشتی طبق لیے ہوئے ہے اس طبق پر سبز غلاف پڑا ہوا تھا۔ وہ اس طبق کے ساتھ اوپر سے نیچے آرہا تھا جب وہ بالکل میرے قریب آ گیا تو میں نے اس فرشتے سے پوچھا: بھائی! اس طبق میں کیا ہے اور اسے تم کس کے پاس لیے جا رہے ہو؟" فرشتے نے جواب دیا۔ اس طبق میں علمِ لدنی بھرا ہوا ہے مجھے خدا نے حکم دیا ہے کہ میں اس کو مولانا فخر الدین زرادی کے سینے میں منتقل کر دوں۔

میں نے فرشتے سے پوچھا: "یہ فخر الدین زرادی کون بزرگ ہیں؟"

اس نے جواب دیا: "ہندوستان کے دار الخلافہ دہلی میں شیخ المشائخ نظام الدین رہتے ہیں، زرادی انہی کا مرید ہے تو اُن کے پاس چلا جا اور دل مراد حاصل کر۔" اتنا کہہ کر وہ غائب ہو گیا اور پھر کچھ دیر کے بعد کہا۔ "میں انہی فخر الدین زرادی کی تلاش میں یہاں تک آ گیا ہوں۔"

براہ کرم اُن سے میری ملاقات کرا دیجیے۔ آپ کا بہت شکر گزار ہوں گا۔"

آپ نے فرمایا: "اتفاق کی بات ہے کہ مولانا زرادی اس وقت یہاں موجود نہیں۔ یہاں کے علاوہ اُن کے دو ٹھکانے اور ہیں۔ یہاں ایک سیدوں کا گھرانا ہے مولانا زرادی وہاں چلے جاتے ہیں اور دوسرا ٹھکانا ہے مسجد۔ ہو سکتا ہے اس وقت وہ مسجد میں ہوں۔"

غیر ملکی اجنبی باہر نکلا تو کسی نے بتایا کہ مولانا زرادی اس وقت جماعت خانے میں موجود ہیں وہ بھاگا بھاگا جماعت خانے میں داخل ہوا اور حاضرین جماعت خانہ سے بآواز بلند پوچھا: "حضرات! میں مولانا فخر الدین زرادی سے ملنا چاہتا ہوں۔ سنتا ہوں وہ جماعت خانے میں موجود ہیں براہ کرم مجھے مولانا سے ملوا دیجیے۔"

کسی نے مولانا زرادی کی طرف اشارہ کیا: "یہ ہیں مولانا زرادی۔"

اس اجنبی اور غیر ملکی نے ایک نحیف الجثہ، بلند قامت، سفید رنگت ایک نہایت وجیہہ جوان کو دیکھا اُس وقت زرادی ایک کونے میں بیٹھے اللہ اللہ کر رہے تھے۔ یہ شخص اُن کے پاس گیا اور کہا: "حضرت! میں آپ سے ملنے کے لیے بغداد سے یہاں تک آ گیا ہوں۔"

آپ نے پوچھا: "مگر کیوں؟ مجھ میں وہ کون سی ایسی بات ہے جس نے تجھے بغداد سے یہاں تک پہنچا دیا؟"

اس نے پہلے تو اپنا خواب بیان کیا اور کہا: "میں اس لیے آپ کے پاس چلا آیا ہوں۔"

مولانا زرادی نے کہا: "تو جس مولانا فخر الدین زرادی کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہے ہو سکتا ہے، ہو سکتا ہے وہ مولانا زرادی میرے علاوہ کوئی اور ہوں میں نہ ہوں۔"

بغدادی جوان نے جواب دیا: "وہ آپ ہی ہیں آپ کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔"

مولانا زرادی نے کہا: "تیرا حسن ظن ہے لیکن بیٹا میں اب بھی اس شبہ میں ہوں کہ وہ مولانا زرادی کوئی اور ہوں گے، میں نہیں۔ تو ہی بتا تو کر۔"

بغدادی جوان نے پشتملان میں سے دو کتابیں نکالیں۔ ایک تو تصریف مالکی اور دوسری مجمع البحرین تھی اس نے یہ دونوں کتابیں مولانا زرادی کے حوالے کیں اور کہا: "آپ ان دونوں کا کل اس وقت تک مطالعہ فرمائیں بقیہ باتیں میں کل کروں گا۔ کل اس وقت تک میں آپ کے پاس آؤں گا اور آپ ہی کے سلسلے میں کافی دیر تک باتیں کر کے یہ ثابت کر دوں گا کہ مولانا فخر الدین زرادی آپ ہی ہیں۔"

مولانا زرادی نے پوچھا: "ان دونوں کتابوں میں کیا خاص بات ہے؟"

بغدادی جوان نے بتایا: "جناب والا تصریف مالکی کے مصنف نے اس کو کچھ اس طرح لکھا ہے کہ اس کے مشکل مقامات کا حل بہت دشوار ہے اور مجمع البحرین کی خوبی یہ ہے کہ یہ نسخہ نایاب تھا اس لیے اس کا لوگوں کو علم ہی نہیں۔ اس کا سمجھنا بھی بہت مشکل ہے۔"

مولانا زرادی نے دونوں کتابیں غیر ملکی اجنبی سے لے لیں اور عشاء کی نماز کے بعد سونے سے ذرا قبل تقریباً ایک گھنٹہ اس کا مطالعہ فرماتے رہے اور اس کے مشکل مقامات کی اپنے قلم سے تشریح فرماتے رہے یہاں تک کہ پوری کتاب کے مشکل مقامات کو حل کر کے رکھ دیا۔

مجمع البحرین کو مولانا زرادی مولانا رکن الدین اندرپتی کو پڑھاتے رہے تھے اس لیے اس کا سمجھنا یا سمجھانا بھی مشکل نہیں تھا۔ دوسرے دن صبح جب مولانا زرادی نے دونوں کتابیں بغدادی جوان کے حوالے کیں اور اس نے تصریف مالکی پر مولانا کے قلم سے مشکل مقامات کی تشریح دیکھی اور پھر مجمع البحرین پر بات کی تو وہ مولانا زرادی کے تبحر علمی کا قائل ہو چکا تھا۔ اُس نے بے ساختہ کہا: "مولانا! الحمد للہ کہ میرا خواب سچا نکلا اور میں جس شخص کی تلاش میں بغداد سے نکلا تھا اس کو پا لیا آپ کو علم لدنی ملا ہوا ہے خداداد علم ملا ہوا ہے۔"

وہ بغدادی آپ کے پاس ہی رہ گیا اور آپ سے علم حاصل کرتا رہا۔

چونکہ مولانا زرادی چشتیہ سلسلے سے تعلق رکھتے تھے اس لیے سماع سے بڑا شغف تھا۔ شہر کے اکثر علماء سماع سے منع کرتے تھے۔ اسی طرح ایک بار کسی عالم نے مولانا زرادی سے کہا کہ آپ کیسے عالم ہیں جو سماع سے شغف رکھتے ہیں۔ آپ نے پوچھا: "سماع پر آپ کو کیا اعتراض ہے؟"

ان صاحب نے کہا: "مولانا سماع حرام ہے۔"

مولانا زرادی کو غصہ آ گیا۔ آپ نے اس عالم کے ذریعے شہر کے تمام علما کو دعوتِ مقابلہ دے دی۔ کہا: "جناب والا! میں آپ کے توسط سے شہر کے تمام علماء کو مقابلے کی دعوت دیتا ہوں۔ میں کہتا ہوں سماع حلال ہے اور میں اپنے اس موقف کو دلائل سے ثابت کر دوں گا۔ اور اگر شہر کے علما کہیں کہ سماع حلال ہے تو میں اس کا حرام ثابت کر دوں گا۔"

عالم نے کہا۔ "مولانا یہ کیا بات ہوئی؟ اگر کوئی چیز حرام ہے تو حرام ہی رہے گی اور اسی طرح جو چیز حلال ہے وہ حلال ہی رہے گی۔ آپ کی دلیلوں سے حرام حلال نہیں ہو جائے گا اور حلال حرام نہیں ہو جائے گا۔"

"اپنے جواب کے بارے میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اسے توجہ سے سنو اور اس پر خوب غور کرو۔ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ انسان کو جو عقل ملی ہے وہ اس کے ارادوں کی غلام ہے اس غلام سے آپ جیسی بھی دلیل مانگیں گے وہ دے دے گا۔ عقل ہی دلیلوں سے حرام کو حلال اور حلال کو حرام ثابت کر دیتی ہے اس لیے اس مسئلے کو عقل کے حوالے نہیں کرنا چاہیے بلکہ یہ خالص عشق اور جذبے کا مسئلہ ہے اس لیے مذہب عشق میں سماع حلال ہے۔"

عالم آپ کی باتوں سے مسحور سا ہو گیا۔ بولا۔ "بس حضرت بس۔ اب میں آپ کے کسی بھی مسئلہ پر بحث نہیں کروں گا اور ایک میں ہی کیا پورے شہر کے عالم آپ سے بحث کر کے جیت نہیں سکتے آپ میرے حق میں دعائے خیر فرمائیں۔"

عالم گھبرا کر چلا گیا۔

حضرت محبوب الٰہی کی خانقاہ میں مریدوں اور ارادت مندوں کا ہجوم تھا۔ ان میں مولانا وجیہہ الدین پائلی بھی تھے مولانا پائلی محبوب الٰہی کے جید مریدوں میں شامل تھے۔ انہی میں مولانا زرادی بھی شامل تھے۔ مولانا وجیہہ الدین پائلی کو کہیں خیال گزرا کہ علم اصول فقہ سے متعلق کتاب بزودی کے بعض حصوں پر مولانا زرادی کو اختلاف ہے۔ انہوں نے مولانا زرادی سے بحث چھیڑ دی۔ مولانا وجیہہ الدین نے زرادی پر ایک تقریر کر ڈالی۔ مولانا زرادی نے اس کی مخالفت یا موافقت میں ایک لفظ بھی نہیں کہا بلکہ اس میں کچھ اضافہ ہی فرما دیا۔ مولانا وجیہہ الدین کو آپ کی یہ بات گراں گزری اور سختی سے مولانا زرادی کو روک دیا کہا۔ "مولانا! زیادہ حد ادب۔ یہ آپ نے کہاں کا ذکر چھیڑ دیا؟"

مولانا زرادی نے جواب دیا۔ "میں نے ذکر کہیں کا بھی نہیں چھیڑا اور نہ آئندہ چھیڑنے کا ارادہ ہے۔"

مولانا وجیہہ الدین پائلی کو اس پر غصہ آ گیا اور انہوں نے مولانا زرادی کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ مولانا زرادی مولانا پائلی کو منہ توڑ جواب دیں گے لیکن ہوا یہ کہ وہ خود ایک کونے میں بیٹھ کر آنسو بہانے لگے پھر لوگوں نے یہ عجیب و غریب منظر بھی دیکھا کہ مولانا زرادی روتے روتے ایک دم اٹھے اور مولانا پائلی سے لپٹ کر معافی مانگنے لگے اور دونوں بزرگوں نے بڑی جلدی ایک دوسرے سے دل صاف کر لیا۔

اس دوران حضرت محبوب الٰہی نے وصال فرمایا۔ اس صدمے نے آپ کو بہت دکھ پہنچایا اور آپ ادھر ادھر پھرنے لگے۔ آپ کو کسی جگہ قرار نہیں ملتا تھا۔ آخر آپ نے ایک پہاڑی علاقہ بند بسنالہ کا رخ کیا۔ اس خطرناک سفر میں آپ کے تین ارادت مندوں نے بھی ساتھ دیا بند بسنالہ پہاڑی ایک ایسی جگہ تھی جہاں درندوں کی حکومت تھی۔ کسی طرف سے بھیڑیوں کی عف عف کی آوازیں سنائی دیتیں اور کسی طرف سے شیر کی گرج سننے میں آتی۔ زمین پر اور درختوں کی شاخوں سے لٹکی ہوئی سانپوں کی کینچلیاں عام تھیں۔ کسی انسان میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ بند بسنالہ میں رہنے کا خیال ہی اپنے دل میں لاتا۔ یہاں معلوم نہیں کس نے ایک چھوٹی سی مسجد بھی بنا دی تھی۔ مولانا زرادی نے اسی مسجد میں قیام فرمایا۔ آپ نے تینوں ارادت مندوں کے چہروں پر خوف اور پریشانی کے آثار دیکھے تو کہا۔ "تم میں سے جو بھی جانا چاہے جا سکتا ہے میری طرف سے اجازت ہے۔"

تینوں نے بیک زبان عرض کیا۔ "ہم نے یہ سفر اس لیے نہیں اختیار کیا تھا کہ آپ کو چھوڑ کر واپس چلے جائیں۔ آپ کو ہماری بابت اس طرح نہیں سوچنا چاہیے۔"

مولانا زرادی نے فرمایا۔ "لیکن میرا خیال یہ ہے کہ تم تینوں درندوں سے خوفزدہ اور یہاں آنے پر شرمندہ ہو۔ ویسے اللہ عالم غیب ہے؟"

تینوں نے کہا۔ "نہیں حضرت ہم آپ کے ساتھ رہیں گے اور ساتھ جان دیں گے۔"

مولانا زرادی نے فرمایا۔ "تم تینوں جو چاہو فیصلہ کرو لیکن میری طرف سے تم تینوں کو اجازت ہے کہ جب تک چاہو میرے ساتھ رہو اور جب چاہو واپس چلے جاؤ۔"

تینوں نے ایک بار پھر آپ کے ساتھ رہنے کا عہد کیا۔ "مولانا خدا گواہ ہے کہ ہم تینوں آپ کے ساتھ جینے مرنے کا عہد کر چکے ہیں۔"

رات کو مولانا زرادی تو عبادت میں مصروف ہو گئے۔ ان تینوں نے بھی عبادت کا ارادہ کیا مگر درندوں کی پے بہ پے آنے والی خوفناک آوازوں نے انہیں بے حد خوفزدہ کر رکھا تھا۔ ایک نے سوچا کہ مسجد کے دروازے تو بند ہی کر لینا چاہئیں کیونکہ درندوں کا کوئی بھروسا نہیں کب انسانوں کی بو سونگھ کر مسجد میں گھس آئیں۔ جب وہ دروازہ بند کرنے کے لیے اپنی جگہ سے اٹھا تو اس کا پاؤں کسی بھاری سی چیز پر پڑ گیا۔ اس نے گھبرا کر پاؤں ہٹایا تو اندھیرے میں پھنکار کی آواز سنائی دی۔ وہ چیخ مار کر اپنے دونوں ساتھیوں کے پاس واپس آ گیا۔ بولا۔ "بھائیو! میں تو دروازہ بند نہیں کروں گا تم میں سے کوئی ایک ہمت کر کے دروازہ بند کر آئے کیونکہ اگر ذرا سی بھی غفلت کرتا تو سانپ مجھے ڈس لیتا۔"

وہ دونوں بھی ڈر گئے اور کسی میں بھی اتنی ہمت نہیں تھی کہ اٹھ کر مسجد کا باہری دروازہ ہی بند کر آتا۔ تینوں بڑی بے چینی سے پہلو بدلتے رہے۔ آخر ایک نے ہمت کی۔ اس نے اپنے دونوں پاؤں پر چادر لپیٹ لی اور باہری دروازے کی طرف چلا۔ ابھی وہ چند قدم ہی چل سکا تھا کہ کہیں قریب ہی سے شیر کے دہاڑنے کی آواز سنائی دی۔ پورا جنگل گونج گیا اور مسجد کی فضا تھرا گئی۔ ڈر کر یہ دوسرا بھی اپنی جگہ پر واپس گیا، بولا "سرِدست ہمیں اللہ پر بھروسا کرنا چاہیے۔ میں باہری دروازہ بند کرنے نہیں جاؤں گا کیونکہ مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ شیر مسجد کے دروازے ہی پر موجود ہے اور میں وہاں جیسے ہی جاؤں گا شیر مجھے کھا جائے گا۔"

تیسرے نے جوش میں آکر کہا "تم دونوں تو بڑے بزدل نکلے۔ میں دروازہ بند کرنے جاتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ شیر مجھے کس طرح چٹ کرتا ہے۔"

وہ تیسرا ابھی زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ دروازے کی طرف سے چٹ چٹ کی آوازیں آنے لگیں۔ اس کو اس آواز سے اندازہ ہو چکا تھا کہ یہ بھیڑیے کے چلنے کی آواز ہے۔ شاید بھیڑیا مسجد کے اندر ہی کہیں موجود تھا۔ یہ بھی اپنے دونوں ساتھیوں میں واپس گیا اور دونوں سے پوچھا۔

"دوستو! ذرا غور سے سنو تو یہ چٹ چٹ کی آواز کیسی آرہی ہے کہیں یہ بھیڑیے کے چلنے کی آواز تو نہیں ہے؟"

ایک نے جواب دیا "مجھے تو چٹ چٹ کی آواز نہیں سنائی دے رہی۔"

دوسرے نے جواب دیا "اور مجھے بھی نہیں سنائی دے رہی ہے یہ تمہارا وہم ہے۔"

تیسرا برہم ہوگیا۔ بولا "تب پھر کیا میرے ہی کان بج رہے ہیں؟"

جواب ملا "ہاں تمہارے ہی کان بج رہے ہوں گے، اس میں کیا شک۔"

تیسرا برہم ہوگیا۔ "تب پھر تمہیں بھی شیر کی آواز نہیں سنائی دی ہوگی بلکہ کان ہی بج رہے ہوں گے اور رہ گیا سانپ کا پاؤں تلے آنا تو وہ بھی تمہارا وہم ہی ہوگا۔"

ان میں ایک صلح جو تھا، بولا "بھائیو! یہ لڑنے جھگڑنے کا وقت نہیں ہے اب جب کہ ہم تینوں یہاں آنے کی مصیبت کا شکار ہو ہی چکے ہیں تو اب سنجیدگی سے اس سے نجات حاصل کرنے کی تدبیر بھی سوچنا ہوگی۔"

ایک نے زیر لب کہا "اس سے نجات حاصل کرنے کی تدبیر! تم نے بات تو بڑی معقول کی، خوب!"

دوسرا بولا "اب میں سوچتا ہوں کہ میں نے خواہ مخواہ مولانا زرادی کا ساتھ دیا۔ ان کا کیا ہے نہ بیوی نہ بچے۔ اپنے ساتھ تو پورا ایک کنبہ ہے اگر مجھ کو یہاں کچھ ہوگیا تو میرے کنبے کا کیا بنے گا؟"

تیسرے نے کہا "مگر ہم نے تو جینے مرنے میں مولانا زرادی کا ساتھ دینے کا عہد کیا ہے۔"

پہلے نے جواب دیا "ہم نے جو عہد کیا ہے اس کو ضرور نباہیں گے مگر پہلے تو یہاں سے بھاگ نکلنے کی تدبیر ہونی چاہیے پھر اپنے اپنے گھروں میں بیٹھ کر سوچیں گے کہ مولانا زرادی سے موت زندگی میں ساتھ دینے کا عہد کس طرح پورا کیا جا سکتا ہے۔"

دوسرے نے پوچھا "تو پھر کیا یہ طے پا گیا کہ ہم سب یہاں سے کسی طرح بھی نکل چلیں گے۔"

تیسرے نے کہا "کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ہم جانے سے پہلے پیر مرشد کو مطلع کر دیں؟"

پہلا بولا "نہیں، کہیں ایسا غضب بھی نہ کرنا۔ ادھر تم نے مولانا زرادی کو اپنی روانگی کی اطلاع دی اور ادھر انہوں نے ہمیں کسی نہ کسی ترکیب سے روک لیا۔"

تیسرے کے دل میں کچھ خوف، کچھ لحاظ تھا۔ اس نے کہا "لیکن میرا خیال ہے ہمیں بتائے بغیر نہیں جانا چاہیے اس طرح مولانا زرادی ناراض ہو جائیں گے اور ہو سکتا ہے ان کے دل سے ہمارے لیے بددعا ہی نکل جائے۔"

پہلے نے کہا "میں کسی کی دعا سے نہیں ڈرتا اور پھر ہمارے پیچھے ہمارے عزیز رشتے دار جو بددعائیں دے رہے ہوں گے اس کا کیا ہوگا؟"

دوسرے نے کہا "اب یہ فضول بحث ختم ہو جانی چاہیے۔ میں نے منصوبہ بنا لیا ہے کہ رات کے پچھلے پہر مولانا زرادی جیسے ہی جھپکی لیں ہم تینوں یہاں سے نکل چلیں۔"

تیسرے نے کہا "رات کے پچھلے پہر! خوب! اور ان درندوں سے کس طرح بچو گے جو راستے میں ملیں گے؟"

پہلے نے مشورہ دیا "ہم تینوں یہاں سے نکل کر کسی اونچے درخت پر چڑھ جائیں گے۔ پچھلی رات کا بقیہ حصہ اس درخت پر گزار کر صبح ہوتے ہی اتر کر اپنے اپنے گھر چلے جائیں گے۔"

دوسرا اس تجویز سے بہت خوش ہوا، بولا "سبحان اللہ۔ کیا تجویز ہے اب اس پر عمل ضرور ہونا چاہیے۔"

تیسرا اب بھی مذبذب تھا۔ بولا "بھائیو! ابھی اس تجویز پر پہلے خوب اچھی طرح غور کر لو اس کے بعد اس پر عمل کا منصوبہ بناؤ۔"
پہلے نے کہا "ہم دونوں نے تو یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ ابھی اس تجویز پر بہر حال اور بہر قیمت عمل کریں گے۔ ہاں تم اگر چاہو تو یہیں مولانا کے پاس رُک جاؤ اور ان کی دعائیں لیتے رہو۔"
تیسرے نے جواب دیا "نہیں بھائیو! جب تم دونوں یہاں سے چلے جاؤ گے تو میں اکیلا رہ کر کیا کروں گا یہاں میں تمہارے ساتھ ہی چلوں گا۔ میں بھی تم دونوں کا ساتھ دوں گا تم فکر نہ کرو۔"
دونوں ایک ساتھ ہنس پڑے ایک نے کہا "بخدا اگر تو زیادہ میں میخ نکالتا تو ہم دونوں تجھ کو یہیں چھوڑ کر چلے جاتے۔"
دوسرے نے کہا "ذرا دیکھنا تو مولانا زرادی اس وقت ہیں کہاں؟ اور کیا کر رہے ہیں؟"
پہلا بولا "مولانا مسجد میں تو کہیں ہیں نہیں اگر ہوتے تو ان کے اوراد و وظائف پڑھنے کی آواز ضرور سنائی دیتی۔"
اب ان میں یہ بحث چل نکلی کہ وہ ابھی رات گئے وہاں سے فرار کیوں کر ہوں گے کیونکہ مسجد سے نکلتے ہی درندوں کا خوف لاحق ہو جاتا تھا۔ رہا یہ حل کہ مسجد سے نکل کر کسی اونچے درخت پر چڑھ کر رات گزار دیں اور صبح ہوتے ہی اپنے اپنے گھر چلے جائیں تو اس میں دشواری یہ تھی کہ اگر مسجد سے باہر نکلتے ہی شیر یا کسی درندے نے ان پر حملہ کر دیا تو کیا ہو گا۔ اس پر پہلے نے مشورہ دیا "ہمیں خطرہ تو مول لینا ہی پڑے گا، اس کے سوا کوئی دوسرا حل بھی تو نہیں۔"
ان تینوں نے مسجد کے صحن اور اس کے حجرے میں مولانا زرادی کو دیکھا وہ کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ چپکے چپکے مسجد کے باہر نکل گئے اور دائیں بائیں آگے پیچھے دیکھتے ہوئے کچھ دُور جا کے ایک درخت پر چڑھ گئے۔ رات بھر انہیں درخت کے نیچے شیر، بھیڑیے اور ریچھ کی آہٹ محسوس ہوتی رہی۔ صبح ہوتے ہی وہ درخت سے اترے اور بچتے بچاتے احتیاط سے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔
دہلی میں مولانا زرادی کی گمشدگی کی خبر پھیل ہوئی تھی۔ لوگ ان کی تلاش میں ادھر ادھر مارے مارے پھر رہے تھے۔ خاص کر مولانا رکن الدین اندرپتی، مولانا سراج الدین عثمان، مولانا رکن الدین کے بھائی صدر الدین، حضرت محبوب الٰہی کے رکاب دار عبداللہ کوئی بہت زیادہ پریشان تھے۔ تلاش اور جستجو میں ایک ہفتہ گزر گیا تو ان تینوں کو جو آپ کے پاس سے بھاگ آئے تھے ان پر رحم آ گیا اور ان میں تیسرے شخص نے مولانا رکن الدین اندرپتی سے مل کر پوچھا "حضرت! آپ لوگ کس کو تلاش کرتے پھر رہے ہیں؟"
مولانا اندرپتی نے جواب دیا "استادِ محترم مولانا زرادی کو۔"
اس شخص نے کہا "وہ آپ لوگوں کو یہاں کہاں ملیں گے، وہ بندلبسالہ میں مقیم ہیں۔"
مولانا اندرپتی نے حیرت سے پوچھا "بندلبسالہ میں؟ اس ویرانے میں انسان کہاں رہتے ہیں؟"
اس نے جواب دیا "بیشک وہاں انسان نہیں رہتے لیکن مولانا ضرور رہتے ہیں۔"
مولانا اندرپتی کا تجسس بڑھتا جا رہا تھا، پوچھا "لیکن یہ بات تمہیں کس نے بتائی ہے؟"
اس نے جواب دیا "ہمیں کون بتائے گا ہم تین آدمی تو ان کے ساتھ ہی گئے تھے۔"
مولانا اندرپتی بے چین ہو گئے "پھر تم انہیں چھوڑ کر واپس کیوں آ گئے؟"
اس نے جواب دیا "اس لیے کہ بندلبسالہ انسانوں کے رہنے کی جگہ نہیں ہے وہاں ہر طرف درندوں کا راج ہے۔"
مولانا اندرپتی گھبرا گئے، بولے "خدا سے ڈرو ظالمو، تم انہیں بندلبسالہ میں چھوڑ کر چلے آئے کمال کر دیا۔"
مولانا اندرپتی نے اپنے ساتھیوں کو مطلع کیا اور انہیں لے کر بندلبسالہ روانہ ہو گئے۔ مولانا زرادی سے مسجد ہی میں ملاقات ہو گئی۔ یہ لوگ باری باری مولانا زرادی سے بغلگیر ہوئے۔ مولانا زرادی نے پوچھا "آپ لوگوں کو میرا پتہ کس نے بتایا؟"
مولانا اندرپتی نے جواب دیا "ان تینوں میں سے ایک نے جو آپ کے ساتھ یہاں آئے تھے۔"
مولانا زرادی نے افسوس کرتے ہوئے کہا "افسوس کہ ان تینوں نے میرا ساتھ نہیں دیا اور ظالموں نے اس پر ظلم یہ کیا کہ میرا پتا بتا کے میری پردہ دری بھی کی۔"
ان آنے والوں نے پوچھا "یہاں کھانے پینے کا کیا انتظام ہے؟"
مولانا زرادی نے جواب دیا "اللہ رزاق ہے وہ ہر جگہ رزق پہنچاتا ہے۔"
مولانا اندرپتی نے کہا "ہم سب آپ کو لینے آئے ہیں۔"

آپ نے جواب دیا: "سچ بات تو یہ ہے کہ پیرمرشد کے بعد دہلی میں دل نہیں لگتا بس جی چاہتا ہے کہ خوب سیاحت کرتے رہو"
لیکن مولانا اندربتی اور اُن کے رفقا نہیں مانے اور انھیں زبردستی دہلی لے آئے۔ آپ دہلی میں کچھ دن رہ کر اجمیر چلے گئے۔ وہاں خواجہ غریب نواز کے مزار پر حاضری دی اور اعتکاف میں بیٹھ گئے اور اللہ سے رجوع رہے پھر اجمیر سے اجودھن میں بابا فرید گنج شکر کے مزار کو سلام کیا اور وہاں بھی اعتکاف میں بیٹھ گئے۔ یہاں سے اٹھے تو پہاڑوں اور جنگلوں میں پھرتے رہے آپ کا کہیں دل نہیں لگتا تھا۔ آخر حضرت محبوب الٰہی کی محبت نے جوش مارا اور آپ پھر دہلی واپس آگئے۔ دہلی میں حوضِ علائی پر قیام کیا۔

یہاں اُن کے اعزاز میں ایک محفلِ سماع منعقد ہوئی اس محفل میں اس عہد کی جیّد ترین ہستیوں نے شرکت کی اُن میں شیخ المشائخ کے مشہورِ زمانہ مولانا حسام الدین مُلتانی بھی شریک تھے۔ خوش الحان قوالوں نے سوز و گداز میں ڈوبا ہوا کلام سُنانا شروع کیا۔ حاضرینِ محفل کا حال غیر ہونے لگا۔ مولانا زرادی پر گریہ طاری ہوگیا اور اس گریے نے اُن کا سانس روک دیا۔

لوگوں نے آپ کو اس حال میں دیکھا تو تشویش ہوئی۔ مولانا زرادی کا رنگ زرد پڑ چکا تھا۔ آنکھوں سے آنسو لگاتار بہہ رہے تھے۔
اس محفل میں سیرالاولیاء کے مصنّف امیر خورد بھی موجود تھے۔ انھوں نے مولانا زرادی سے پوچھا: "حضرت! یہ آپ کا کیا حال ہو رہا ہے؟"
مولانا زرادی نے کوئی جواب نہیں دیا، اچانک کھڑے ہو کر پاؤں کے دونوں انگوٹھوں کے بل اچھلنے لگے۔ مولانا حسام الدین ملتانی کا حال بھی عجیب تھا۔ وہ مضطربانہ قوالوں کے پاس جاتے اور پھر اپنی جگہ پر واپس آجاتے۔
مولانا زرادی رفتہ رفتہ بے ہوش ہوگئے۔ ایسا لگتا تھا گویا وہ آگ میں جل رہے ہوں۔

انہی دنوں سُلطان محمد تغلق نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ ترکستان اور خراسان میں منگولوں سے جہاد کرنے جائے۔ اس کو خوب معلوم تھا کہ جب وہ منگولوں پر یلغار کرے گا تو منگول بھی ہندوستان کا رخ کریں گے چنانچہ منگولوں سے بچاؤ کے لیے دار الخلافہ دہلی مناسب نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ دار الخلافہ کو دہلی سے جنوبی ہند کے شہر دیوگیر لے جائے۔ دیوگیر جس کا بعد میں نام دَولت آباد رکھا گیا۔ اس کا موجودہ نام اورنگ آباد ہے۔

سلطان محمد تغلق نے اپنے وزیرِ تعلیم قطب الدین کو حکم دیا کہ وہ شہر کے معززین اور بزرگ حضرات کو ایک خاص مجلس میں یکجا کرے تاکہ انہیں جہاد کی فضیلت بتائی جائے اور دار الخلافہ کی تبدیلی کا اعلان کرے۔
سُلطان نے اس مقصد کے لیے ایک بہت بڑا خیمہ نصب کرایا۔ اس خیمے میں شاندار منبر نصب کیا گیا۔ سلطان کو اس منبر پر کھڑے ہو کر حاضرین کو خطاب کرنا تھا۔

سلطان نے اپنے وزیر قطب الدین دبیر سے کہا: "ہمیں معلوم ہوا ہے کہ مولانا فخر الدین زرادی، مولانا شمس الدین یحییٰ اور مولانا نصیر الدین محمود جنھیں روشن چراغِ دہلی کہا جاتا ہے یہ تینوں حضرات دہلی میں مقیم ہیں۔ انہیں بطورِ خاص اس محفل میں بلوایا جائے۔"
قطب الدین دبیر نے جواب دیا: "بہتر ہے۔ حکم کی تعمیل ہوگی۔"
سلطان نے کہا: "ہم نے سنا ہے مولانا زرادی کسی کو خاطر میں نہیں لاتے؟"
قطب الدین نے جواب دیا: "سلطان والاجاہ! وہ ایک درویش ہیں اپنے حال میں مست۔ انہیں دنیا کی نہ تو پروا ہے نہ لالچ۔"
سُلطان نے تحکمانہ کہا: "مولانا زرادی کو ہر حال میں حاضر کیا جائے۔"
قطب الدین نے محسوس کیا کہ سُلطان کی نیت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ خود بھی حضرت محبوب الٰہی کا مرید تھا اور مولانا زرادی کا بہت احترام کرتا تھا۔ وہ سلطان کے پاس سے اُٹھ کر سیدھا مولانا زرادی کے پاس پہنچا اور نہایت ادب سے عرض کیا: "حضرت! آپ تو جانتے ہیں کہ بندہ حضرت شیخ المشائخ کا مرید اور آپ کا شاگرد ہے میں نے آپ سے درس لیا ہے۔"
مولانا زرادی نے فرمایا: "تم اپنی آمد کی غایت بیان کرو۔ بس۔"
قطب الدین نے عرض کیا: "حضور والا! سلطان کا ارادہ ہے کہ وہ ترکستان اور خراسان پر فوج کشی کر کے منگولوں کو نیست و نابود کردے لیکن وہ اس جہاد پر جانے سے قبل دہلی دار الخلافہ کو جنوبی ہند کے شہر دیوگیر لے جانا چاہتا ہے سلطان نے حکم دیا ہے کہ شہر کے امراء اور معززین کو یکجا کیا جائے تاکہ وہ انہیں جہاد کی فضیلت سے آگاہ کرے اور دار الخلافہ کی تبدیلی کا اعلان کرے۔"
مولانا زرادی نے پوچھا: "پھر ان باتوں کا میری ذات سے کیا تعلق ہے؟"

قطب الدین نے جواب دیا: "مشکل تو یہی ہے کہ سلطان نے آپ حضرات کو بطورِ خاص طلب کیا ہے۔ اُس نے کہا ہے کہ مولانا زرادی، مولانا یحییٰ اور روشن چراغ دہلی کو اس محفل میں بطورِ خاص حاضر کیا جائے۔"

مولانا زرادی مسکرائے: "بطورِ خاص حاضر کیا جائے۔ خوب! گویا ہم مجرم ہیں جنھیں حاضری کا حکم دیا جا رہا ہے۔"

قطب الدین کانپ رہا تھا، بولا: "یہ بات نہیں ہے حضرت! شاہوں کا لب و لہجہ ہی کچھ ایسا ہوتا ہے۔"

مولانا زرادی نے فرمایا: "تب پھر تو میری بات مان مجھے سلطان کے پاس نہ لے جا کیونکہ میں وہاں سلطان کی رعونت کو برداشت نہیں کر سکوں گا۔ بس قصہ مختصر یہ کہ میں اپنے سر کو سلطان کے خیمے میں لڑھکتا ہوا دیکھ رہا ہوں۔"

قطب الدین نے عرض کیا: "وہ کس طرح پیر و مرشد؟"

آپ نے جواب دیا: "قطب الدین! میں سلطان کو ناپسند کرتا ہوں چنانچہ جب ہم دونوں کا آمنا سامنا ہوگا اور سلطان محمد رعونت سے پیش آئے گا تو میں بھی برداشت نہیں کر سکوں گا اور اس کی رعونت کو خاک میں ملا دوں گا جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ سلطان محمد کو قتل کرا دے گا۔"

قطب الدین نے عرض کیا: "شاید ایسا نہیں ہوگا اور میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں آپ کو سب سے پہلے سلطان کی خدمت میں پیش کر دوں تاکہ وہاں جو کچھ بھی پیش آئے دوسروں کو اس کا علم نہ ہو اور شاید سلطان تنہائی میں نرمی سے پیش آئے۔"

مولانا زرادی نے جواب دیا: "تم جو مناسب سمجھو وہ کرو لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ سلطان سخت گیر اور ظالم ہے وہ اپنی رعونت سے باز نہیں آئے گا۔"

لیکن قطب الدین کو اپنے آپ پر اعتماد تھا اور اُس کو یقین تھا کہ وہ بات کو بگڑنے نہیں دے گا۔

وہ مولانا زرادی کو اپنے ساتھ اس حال میں سلطان کے روبرو لے گیا کہ مولانا زرادی کے جوتے قطب الدین کی بغل میں دبے تھے اور وہ غلاموں کی طرح مولانا زرادی کے ساتھ چل رہا تھا۔

سلطان نے اُن دونوں کو اس حال میں اپنے سامنے آتے دیکھا تو برداشت کر لیا اور مولانا زرادی کو اپنے پاس بٹھا کر پوچھا: "آپ جانتے ہیں کہ میں نے اس وقت آپ کو کیوں بلایا ہے؟"

مولانا زرادی نے جواب دیا: "میں جانتا ہوں مگر سلطان کی زبان سے بھی سننا چاہتا ہوں۔"

سلطان نے کہا: "مجھے معلوم ہوا ہے کہ چنگیز خان اور اس کی اولاد نے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا ہے چنانچہ میں ان کے خلاف جہاد کرنا چاہتا ہوں۔ اللہ نے چاہا تو میں چنگیز خان کی بنیادیں اکھاڑ دوں گا۔"

مولانا زرادی نے دعائیہ کلمات ادا کیے: "میری دعا ہے کہ خدا اس نیک کام میں مدد کرے۔"

سلطان نے کہا: "اور میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ اس کارِ خیر میں آپ میری مدد کریں۔"

مولانا زرادی نے جواب دیا: "انشاء اللہ میں آپ کی مدد کروں گا۔"

سلطان نے جھنجھلا کر کہا: "انشاء اللہ کلمۂ شک ہے۔"

مولانا زرادی نے جواب دیا: "لیکن میں کیا کروں کیونکہ مستقبل کے لیے یہی کلمہ استعمال ہوتا ہے۔"

سلطان لاجواب ہو چکا تھا۔ وہ کچھ دیر پیچ و تاب کھاتا رہا پھر نرمی اختیار کی۔ بولا: "میں نے آپ کے علم کی بڑی تعریفیں سنی ہیں مجھے کوئی نصیحت کیجیے تاکہ میں اس پر عمل کروں۔"

مولانا نے جواب دیا: "غصہ سے پرہیز کرو۔"

سلطان نے پوچھا: "کون سا غصہ؟"

آپ نے جواب دیا: "درندوں جیسا غصہ اور وہ غصہ جس کی نذر اب تک سات سلطان ہو چکے ہیں۔"

سلطان کو غصہ تو بہت آیا مگر وہ پی گیا۔ اُس نے حکم دیا: "دسترخوان لگایا جائے۔"

دسترخوان چنا گیا تو سلطان نے مولانا زرادی کی رکابی میں کھانا شروع کر دیا۔ مولانا زرادی کو سلطان کی یہ بات بہت گراں گزری۔ سلطان نے ہڈیوں میں سے گوشت نوچ نوچ کر تواضع کے طور پر مولانا زرادی کے سامنے رکھنا شروع کیا۔ آپ کو اس بات سے گھن سی آ رہی تھی۔ آپ بہ اکراہ اس میں سے کچھ کھا لیتے۔ سلطان بھی اس کراہیت کو محسوس کر رہا تھا۔ آخر کھانا ختم ہوا اور دسترخوان

دیا گیا۔

اس کے بعد سلطان نے حکم دیا: "مولانا شمس الدین یحییٰ اور مولانا نصیر الدین محمود کو بھی حاضر کیا جائے۔"

جب یہ دونوں بزرگ اندر داخل ہوئے تو مولانا زرادی ازراہِ احترام کھڑے ہو گئے اور اُن دونوں کو اپنے سے اونچی جگہ پر بٹھایا۔

سلطان اِن دونوں سے بھی اسی قسم کی باتیں کرنے لگا۔ اس نے کہا: "میں منگولوں کے خلاف جہاد کرنا چاہتا ہوں اور جب ان خونخوار کافروں سے جنگ چھڑے گی تو کچھ پتہ نہیں کہ کیا ہو۔ دہلی نسبتاً غیر محفوظ ہے اس لیے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ دارالخلافہ کو جنوبی ہند دیو گیر لے جاؤں۔ میرے اس منصوبے کو کامیاب بنانا آپ حضرات کا کام ہے۔"

ان حضرات نے جواب دیا: "جہاد جیسے عظیم اور نیک کام میں ہم جو بھی مدد کر سکیں گے، ضرور کریں گے۔"

سلطان نے مجلس برخاست کرنے سے پہلے سونے [illegible] کی تھیلیاں طلب کیں اور انہیں ان بزرگ حضرات میں تقسیم کیا گیا۔ سیلن تقسیم کرنے والا جیسے ہی مولانا زرادی کے پاس پہنچا، قطب [illegible] یہ دونوں چیزیں مولانا زرادی کی طرف سے خود وصول کر لیں کیونکہ قطب الدین کو خوب معلوم تھا کہ مولانا زرادی یہ چیزیں قبول [illegible] کریں گے اور اس پر سلطان غضبناک ہو کر انہیں نقصان پہنچا دے گا۔

جب یہ حضرات چلے گئے تو سلطان نے قطب [illegible] کو ذلیل کرنا شروع کر دیا: "او دھوکے باز مکار! تو نے یہ کیسی حرکتیں کی ہیں؟ پہلے تو تو نے مولانا زرادی کے جوتے اپنی بغل میں [illegible] اور پھر تو نے سونے کا پارچہ اور روپوں کی تھیلی ان کی طرف سے خود وصول کر لی۔ اگر مولانا زرادی ان چیزوں کو خود قبول کر لیتے تو میں [illegible] دیتا۔ افسوس کہ تو نے اُن کی بلا اپنے سر لے لی۔"

قطب الدین دبیر نے جواب دیا: "جہاں پناہ! مولانا [illegible] میرے استاد اور میرے مخدوم کے خلیفہ ہیں۔ میرے لیے یہی مناسب تھا کہ اُن کے جوتے سر پر رکھتا لیکن میں نے ازروئے احترام [illegible] بغل میں دبائے رکھا۔ اب اس کے بعد کپڑے اور روپے کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے۔"

سلطان نے کہا: "قطب الدین ان کفر آمیز کلمات سے پرہیز [illegible] ورنہ میں تجھ کو قتل کر دوں گا۔"

قطب الدین نے اپنا سر جھکا دیا اور کہا: "جہاں پناہ! یہ میری انتہائی خوش نصیبی ہو گی اگر میں سلطان المشائخ کی محبت اور مولانا زرادی کے احترام میں مارا جاؤں۔ اس طرح میں درجہ شہادت حاصل کر کے پیر مرشد کے پاس پہنچ جاؤں گا اور آپ کی بے توقیری سے نجات حاصل کر لوں گا۔"

سلطان نے غصہ میں کہا: "اچھا اب تو یہاں سے دفعان ہو جا۔"

قطب الدین سلطان کے سامنے سے ہٹ گئے۔

چند دنوں میں سلطان کا یہ پیغام مولانا زرادی کو ملا کہ "ہم نے آپ سے جہاد میں تعاون کی درخواست کی تھی اب آپ اس میں ہماری اس طرح مدد کر سکتے ہیں کہ میں چونکہ دہلی کے بجائے دیوگیر کو اپنا دارالخلافہ بنا رہا ہوں، آپ اس شہر کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے عزت بخشیں تاکہ یہ شہر مستقبل میں یگانۂ زمانہ ٹھہرے۔"

مولانا زرادی نے دوسرے بھوتوں کی طرح رختِ سفر باندھا اور دیوگیر چلے گئے۔ وہاں حوضِ سلطان نامی جگہ پر قیام کیا۔ دیوگیر میں جو لائق و فائق لوگ جمع ہو گئے تھے ان میں مولانا فخر الدین ہانسوی کے بھانجے کمال الدین بھی تھے۔ قاضی کمال الدین یہاں صدرِ جہاں کے عہدے پر فائز تھے۔

یہاں بھی ایک مجلسِ سماع منعقد ہوئی۔ قوالوں نے امیر خسرو کی ایک غزل شروع کی۔ اس غزل نے اہلِ دل حضرات کے سینوں میں ایک آگ سی لگا دی۔ مولانا زرادی کا اتنا بُرا حال ہوا کہ وہ سسکیاں لے لے کر رونے لگے۔ لوگوں نے آپ کی جو حالت دیکھی تھی اُس سے انہیں یہ خیال گزرا کہ شاید مولانا زرادی اس صدمہ سے جانبر نہ ہو سکیں گے۔

مولانا زرادی کا دُنیا سے جی سیر ہو چکا تھا۔ وہ اکثر سیر الاولیاء کے مصنف امیر خورد کے والد کے پاس جاتے اور یہی کہتے کہ اب تو اپنا جی حج بیت اللہ کے لیے تڑپ رہا ہے جس روز اپنی یہ خواہش پوری ہو گئی میں یہ سمجھوں گا کہ میں نے اپنی زندگی کا ہر کام کر ڈالا۔

ایک دن آپ قاضی کمال الدین صدرِ جہاں سے ملنے گئے۔ قاضی صاحب اُن سے بڑی محبت کرتے تھے۔

دورانِ گفتگو مولانا زرادی نے قاضی صاحب سے کہا: "قاضی صاحب! میرا جی دنیا سے سیر ہو چکا ہے۔"

قاضی کمال الدین کے کان کھڑے ہوئے، پوچھا: "یعنی؟ مطلب؟ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

مولانا زرادی نے جواب دیا: "میں چاہتا ہوں مرنے سے پہلے اللہ کے گھر اور اس کے رسول کے گھر میں حاضری دے آؤں۔"

قاضی صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ بے خیالی میں کہا: "بڑا نیک خیال ہے آپ کا۔"

لیکن مولانا زرادی نے محسوس کیا کہ قاضی صاحب بہت زیادہ فکرمند ہو گئے ہیں۔
مولانا زرادی نے کہا۔ اسی لیے میں نے اب یہ فیصلہ کیا ہے کہ جلد از جلد حج بیت اللہ کو چلا جاؤں اور وہیں سے رسول اللہ کے دربار میں حاضری دے آؤں آپ کا خیال کیا ہے؟"
قاضی کمال الدین نے جواب دیا۔ بڑا نیک خیال ہے آپ کا لیکن میری ایک بات کو ذہن نشین کر لیجیے۔ اس کے بغیر آپ کا کہیں جانا اچھا نہیں ہوگا اور نہ ہی میں خود آپ کو قدم اٹھانے دوں گا۔"
مولانا زرادی نے کہا۔ قاضی صاحب! میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا آپ اس طرح کہنا کیا چاہتے ہیں؟"
قاضی صاحب نے جواب دیا۔ میں اس طرح یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ کہیں بھی جائیں مجھے کوئی اعتراض نہیں مگر کہیں جانے سے پہلے سلطان سے اجازت ضرور لے لیں۔"
آپ نے پوچھا۔ وہ کیوں؟ اس میں سلطان کی اجازت کیوں ضروری ہے؟"
قاضی نے جواب دیا۔ اس لیے کہ سلطان نے اس شہر کو خاص مقصد سے آباد کیا ہے وہ چاہتا ہے کہ اس شہر میں علماء و مشائخ کے شاندار گروہ آباد ہو جائیں جس سے یہ شہر مستقبل میں دوسرے شہروں سے سبقت لے جائے۔ اور آپ کے خانہ کعبہ چلے جانے کے بعد جب سلطان سنے گا تو بہت ناراض ہوگا اس لیے میں آپ کو سلطان کی اجازت کے بغیر باہر نہیں جانے دوں گا۔"
قاضی کے جواب نے آپ کو حد درجہ دل برداشتہ کر دیا۔
مولانا زرادی قاضی کے پاس سے چپ چاپ چلے آئے۔
کئی دن پریشان پریشان کھوئے کھوئے پھرتے رہے آخر امیر خورد مصنف سیرالاولیاء کے والد سے ملے اور انھیں قاضی اور ان کے مابین ہونے والی گفتگو کی تفصیل سنا دی اور کہا۔ قاضی نے یہ عجیب سی شرط لگا دی ہے حالانکہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ بالکل فضول سی شرط ہے۔"
امیر خورد کے والد نے جواب دیا۔ مولانا! آپ کو یہ بات صدر جہاں سے نہیں کہنی تھی۔ وہ اپنی ذمہ داریوں سے مجبور ہے اس کو ہر ہر بات کا سلطان کو جواب دینا ہے۔"
مولانا زرادی نے کہا۔ اب میں کیا کروں؟ اپنی خواہش کس طرح پوری کروں؟"
امیر خورد کے والد نے جواب دیا۔ حضرت! عشق میں سب کچھ روا ہے اب آپ کچھ عرصے کے لیے حج کا خیال اپنے دل سے نکال دیجیے جب سال بھر بعد دوبارہ یہ وقت آئے گا تو خاموشی سے حج کے سفر پر روانہ ہو جائیں۔"
مولانا زرادی نے کہا۔ بہتر ہے، دیکھا جائے گا۔"
امیر خورد کے والد نے مولانا زرادی کو مشورہ دیا۔ اور مولانا! اگر آپ کی ملاقات اب قاضی سے ہو تو اس سلسلے میں اس سے کوئی بات نہ کیجیے گا۔"
مولانا زرادی نے اس کا وعدہ کر لیا۔
کوکن تھانہ (بمبئی) کے قریب بیھتون نامی قصبہ میں مولانا زرادی کے ایک بھانجے رہتے تھے ان کی ابھی تک شادی نہیں ہوئی تھی۔
اسی دوران ان کی شادی طے پا گئی اور مولانا زرادی کے نام تقریب میں شمولیت کی دعوت آ گئی۔
یہ دعوت نامہ لیے ہوئے امیر خورد کے والد کے پاس گئے اور دعوت نامہ کو ان کے سامنے رکھ کر مشورہ لیا۔ بتایئے اب میں کیا کروں؟"
امیر خورد کے والد نے پوچھا۔ کیا آپ نے حج بیت اللہ کا پکا ارادہ کر لیا ہے؟"
مولانا نے جواب دیا۔ بالکل پکا۔ اب بات برداشت سے باہر ہوتی جا رہی ہے۔"
امیر خورد کے والد نے کہا۔ اب آپ قاضی سے اجازت لے کر اپنا مدعا ئے دلی حاصل کر سکتے ہیں۔"
مولانا زرادی یہ دعوت نامہ لیے ہوئے قاضی کے پاس پہنچے اور اس سے تقریب میں شمولیت کی اجازت چاہی۔
قاضی نے دعوت نامے کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور کہا۔ میں اس تقریب میں جانے سے کس طرح روک سکتا ہوں جائیں اور ضرور جائیں۔
مولانا خوش خوش گھر آئے اپنے دوستوں سے ملاقاتیں کیں اور آخر میں امیر خورد کے والد سے ملاقات کی۔ بولے "پینڈ صاحب! قاضی نے جانے کی اجازت دے دی ہے؟"
امیر خورد کے والد نے جواب دیا۔ مبارک ہو۔ اللہ آپ کو اپنے ارادوں میں کامیاب کرے۔"

امیر خورد مصنف سیر الاولیاء اس وقت چھوٹے تھے، مولانا زرادی نے دو ٹکے ان کو دیے کچھ دیر بیٹھ کر گھر چلے گئے۔

دوسرے دن وہ قصبہ بھیون روانہ ہو گئے۔ بھیون میں تھوڑا سا وقت گزار کر وہ کوکن تھانہ (بمبئی) روانہ ہو گئے۔ وہاں جہاز تیار تھا۔ آپ اس میں سوار ہو گئے۔ جب جہاز نے لنگر اٹھایا اور پانی میں رواں دواں ہوا تو ان کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔

سفر کی ساری کلفتیں اور صعوبتیں انہیں گوارا تھیں جب وہ خانہ کعبہ میں داخل ہوئے تو انہیں یوں لگا گویا فرطِ خوشی سے ان کی جان ہی نکل جائے گی۔ وہ مناسک حج ادا کرتے ہوئے زار و قطار روتے رہے۔ آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب جاری تھا پھر دیارِ رسولؐ میں حاضری دی اور وہاں تو ایسے از خود رفتہ ہوئے کہ جذبات کے دباؤ نے ان کے ہوش و حواس ہی چھین لیے۔

انھوں نے رسولِ مقبولؐ کے مزار کے پائینتی کھڑے ہو کر عرض کیا "یا رسول اللہ! زندگی کی آخری خواہش بھی پوری ہو گئی۔ اب میں جینے کی خواہش سے ہاتھ اٹھاتا ہوں۔"

آپ یہاں کچھ دن ٹھہرے اس کے بعد بغداد کا رخ کیا کیونکہ بغداد اپنے علم و فضل اور اپنی منتخب روزگار شخصیتوں کی وجہ سے بہت مشہور تھا جب آپ بغداد میں داخل ہوئے اور وہاں کی مشہور ترین شخصیتوں کو آپ کی آمد اور آپ کے علم و فضل کا علم ہوا تو انھوں نے آپ کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔

دعوتوں، ضیافتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ اہلِ بغداد آپ کی زیارت کرتے اور اپنی قسمتوں پر رشک کرتے۔

علمائے حدیث نے آپ سے علم حدیث پر گفتگو کی اور آپ کو اس علم میں بحرِ ذخار پایا۔ انھوں نے آپ سے درخواست کی کہ آپ یہیں بغداد میں رہ جائیں۔

آپ نے جواب دیا "افسوس کہ میں یہاں نہیں رہ سکتا۔ معلوم نہیں میرا آب و دانہ کہاں کہاں لکھا ہے اور میں اپنی زمین کو تلاش کرتا پھر رہا ہوں جہاں کی مٹی ہو گی وہیں رہ پڑوں گا۔"

ایک عالم نے کہا "کیا آپ کو اس کا علم ہے کہ آپ کی مٹی کہاں کی ہے؟"

آپ نے جواب دیا "اس علم سے میں ہی نہیں پورا زمانہ ناواقف ہے اس لیے آئندہ اس کا ذکر نہ کیا جائے تو مہربانی ہو گی۔"

علما خاموش ہو گئے۔

یہاں چند ماہ رہ کر آپ نے عزمِ ہندوستان کیا۔ جس جہاز میں آپ سفر کر رہے تھے، اس پر سامان بہت زیادہ لدا ہوا تھا اور یہ سارا سامان بغداد کی حکومت کی طرف سے سلطان تغلق کو بطورِ تحفہ بھیجا جا رہا تھا۔

جہاز کے ملاح نے آپ سے پوچھا "جناب آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

مولانا نے جواب دیا "ہندوستان، دہلی۔"

جہاز کے ناخدا نے ہنس کر کہا "اس جہاز کا بیشتر سامان سلطان تغلق کے لیے تحفہ ہے۔"

مولانا زرادی نے جواب دیا "میں سلطان اور بادشاہ کے نام سے چڑتا ہوں اور جب بھی کبھی ان کا میری محفل میں آنا ہوتا ہے تو وہ آتے تو خوش خوش ہیں مگر واپس رنجیدہ ہو کر جاتے ہیں۔"

ملاح نے پوچھا "تب پھر آخر آپ ہیں کیا؟"

مولانا نے جواب دیا "خدا کا ایک معمولی بندہ۔ ایک عاجز اور کمترین انسان۔"

ناخدا چپ ہو گیا۔

شام سے ذرا پہلے جہاز ہچکولے کھانے لگا۔ مسافر ادھر ادھر گرنے لگے۔ سامان بھی الٹ پلٹ ہونے لگا۔ کسی کو متلی ہو رہی تھی کسی کو استفراغ۔ تھوڑی دیر بعد جہاز کے ہچکولوں میں اور زیادہ شدت پیدا ہو گئی۔ مسافروں نے گرتے پڑتے ناخدا کو گھیر لیا۔ پوچھا "یہ کیا ہو رہا ہے؟"

ناخدا نے جواب دیا "سامان بہت زیادہ ہے اس لیے جہاز کے ڈوب جانے کا خطرہ ہے۔"

مسافروں کے ہوش و حواس ہی اڑ گئے۔ وہ رونے اور چیخنے چلانے لگے۔ کسی نے ناخدا کو بتایا کہ اس جہاز میں اللہ کا ایک نیک بندہ سفر کر رہا ہے اس سے رجوع کرو۔

ناخدا آپ کے پاس آیا اور کہا "حضرت جہاز ڈوب رہا ہے کچھ کیجیے۔"

آپ نے جواب دیا "اگر جہاز ڈوب رہا ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں؟"

" میرا خیال ہے کہ اس پر کچھ زیادہ ہی سامان لدا ہوا ہے۔ اگر اس پر سے کچھ سامان کم کر دیا جائے تو جہاز ڈوبنے سے بچ سکتا ہے۔" ناخدا نے تجویز پیش کی۔

اس پر فخر الدین زرادی نے فرمایا کہ میں اجازت دینے والا کون ہوتا ہوں۔ جس کا سامان ہے اُسی سے جا کر مشورہ کر لو۔

دوسری جانب صورتحال یہ تھی کہ کسی بھی لمحے جہاز غرق ہو سکتا تھا۔ ناخدا نے یہ صورتحال دیکھی تو سخت خوفزدہ ہوا اور مولانا سے کہا کہ" وہ جہاز کی سلامتی کے لیے دعا فرمائیں تاکہ معصوم زندگیاں سمندر میں ڈوبنے سے بچ سکیں۔"

آپ نے ناخدا سے فرمایا کہ جب انسان کی عمر ختم ہو جاتی ہے اور اُس کی قضا کے لمحات آجاتے ہیں تب اس ہونی کو کوئی نہیں ٹال سکتا۔ میں تو خود جو خواہشات اور تمنائیں لے کر اس دنیا میں آیا تھا وہ پوری ہو چکی ہیں اور میں نے اللہ تعالیٰ سے کہہ دیا ہے کہ اب زندگی کی مزید کوئی آرزو نہیں اسی طرح یقین ہے کہ جہاز پر جو دوسرے لوگ موجود ہیں یقیناً ان کی زندگیاں بھی اپنے انجام کو پہنچ چکی ہیں۔ لہٰذا میں دعا کروں گا بھی تو اس کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

ناخدا اس قدر بدحواس تھا کہ مولانا زرادی کی باتیں اُس کے سر پر سے گزرتی جا رہی تھیں۔ اُس نے کہا" اب میرے پاس اس کے سوا کوئی اور چارہ نہیں کہ میں بادشاہ کا فالتو سامان بھی سمندر میں پھینک دوں۔"

مولانا نے فرمایا" اگر تم سمندر میں فالتو چیزیں پھینکنے پر آ ہی گئے ہو تو میں بھی جہاز پر ایک فالتو چیز کے برابر ہوں۔ اگر میرے اُترنے سے جہاز ڈوبنے سے بچ سکتا ہے تو مجھے بھی سمندر میں پھینک دو۔" پھر اسی حالت میں مولانا نے وضو کیا اور بارگاہِ ایزدی میں سر جھکا دیا اور جہاز میں مصروف دوسرے مسافروں سے بھی کہا کہ وہ بھی سربسجود ہو جائیں۔ جہاز میں موجود لوگ ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے کہ یہ کیسے بزرگ ہیں جو اپنی کرامات دکھا کر جہاز کو ڈوبنے سے بھی نہیں بچا سکتے۔

دوسری جانب مولانا فخر الدین زرادی سجدے میں پڑے کہہ رہے تھے کہ اے باری تعالیٰ میں تیرے کاموں میں دخل نہیں دے سکتا۔ میں تیری رضا کے سامنے سر جھکانے کے لیے تیار ہوں۔ ابھی دعا مانگ ہی رہے تھے کہ جہاز ایک زبردست ہچکولے کے ساتھ اُلٹ گیا۔ مسافروں کی زیادہ تعداد جن میں بچے شامل تھے پانی میں ڈوب گئے۔ البتہ کچھ زندہ رہے۔ انھوں نے تیر کر اپنی جان بچائی اور کسی نہ کسی طرح کنارے سے آ لگے۔ زندہ بچنے والوں میں مولانا زرادی نہیں تھے اور یہ اس بات کی دلیل تھی کہ مولانا فخر الدین زرادی کا اللہ اور اُس کے رسولؐ سے روحانی رابطہ قائم تھا اُن کے صابر و شاکر ہونے کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہے کہ موت کو سامنے دیکھ کر بھی وہ انتہائی سکون کی حالت میں بارگاہِ الٰہی میں جھکے ہوئے تھے۔
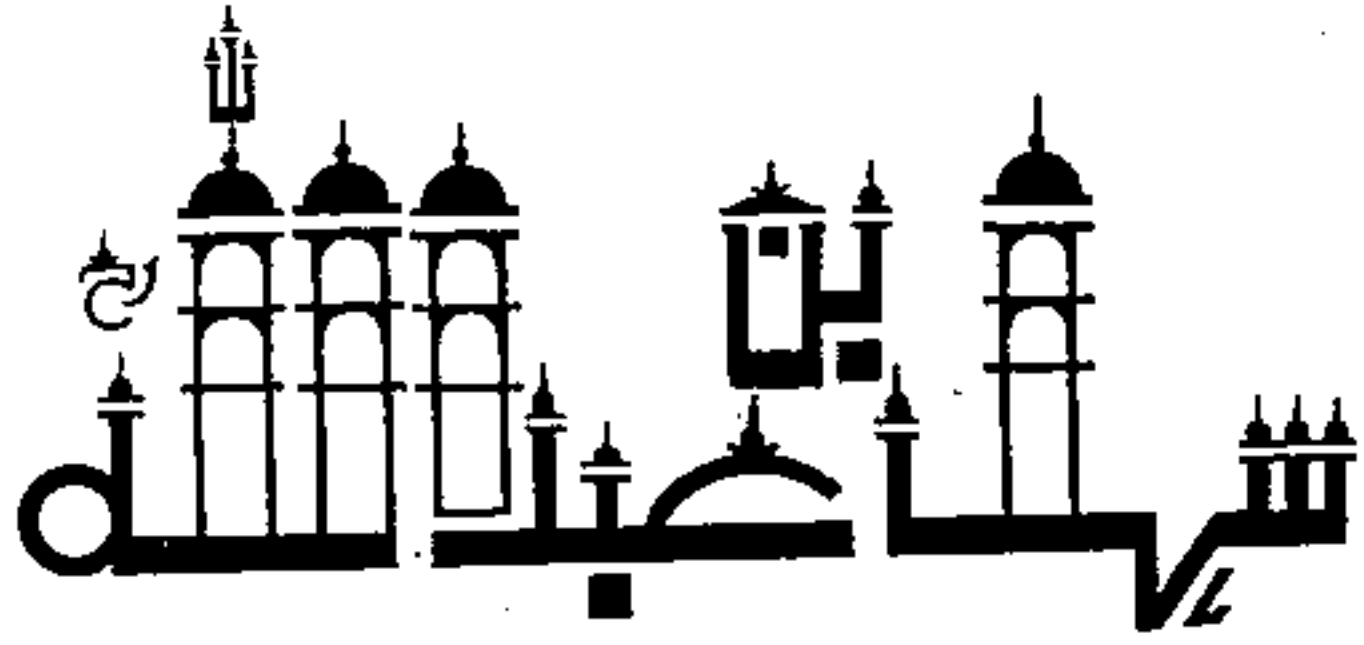
ایک شخص سخت بیمار ہوگیا۔ زندہ رہنے کی کوئی اُمید باقی نہ رہی۔ دنیا بھر کے حکماء نے واضح طور پر کہہ دیا تھا کہ اب موت ہی اس بیماری کا آخری علاج ہے چنانچہ اس مایوسی کے عالم میں مریض نے ایک بزرگ کو بلوایا اور دردناک لہجے میں روتے ہوئے ان سے اپنے حق میں دعا کرنے کے کہا۔

بزرگ نے اس بیمار سے کہا کہ دعا ہمیشہ اس کے حق میں قبول ہوتی ہے جو شخص ہر قسم کی برائیوں اور گناہوں سے ہو چکا ہو۔ لہذا میں صرف اسی صورت میں تمہارے حق میں تمہاری صحت یابی کے لیے دعا کر سکتا ہوں کہ پہلے تم ام سابقہ گناہوں اور کوتاہیوں کا ازالہ کرو اور تمام قیدیوں کو جنہیں تم نے ناجائز طور پر قید کر رکھا ہے انہیں رہا کر کے ں سے توبہ کرو۔

س شخص نے جب ان بزرگ کے حکم کی تعمیل کر دی تب انہوں نے دعا کیلیے ہاتھ اُٹھا کر کہا۔

اے اللہ جس طرح تو نے اپنی نافرمانی کی ذلت اس کو عطا کی اسی طرح میری عبادت کی عظمت بھی اس کو دکھا دے ن بزرگ نے دعا مانگی تھی کہ وہ شخص ایک دم بھلا چنگا ہوگیا۔ اپنی صحت یابی کی خوشی میں اس نے ان بزرگ کو سی دولت اور مال و زر دینا چاہا مگر بزرگ نے یہ نذرانے قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

ان بزرگ کا ایک مرید بھی پاس کھڑا تھا اس نے عرض کیا کہ اگر آپ یہ نذرانہ قبول کر کے مجھے عنایت فرما دیتے تو رض سے سبکدوش ہو جاتا کیونکہ مجھے ایک عرصہ سے قرض خواہ تنگ کر رہے ہیں۔

ریدکی بات سن کر یہ بزرگ کہنے لگے "اے بندے خدا اگر تجھے زر دیکھنا ہے تو اپنے سامنے کی طرف دیکھ۔"

جب اس شخص نے بزرگ کے کہنے کے مطابق سامنے کی جانب نگاہ اٹھائی تو اسے ہر سمت سونا اور ہیرے جواہرات ے ہوئے نظر آئے۔ یہ دیکھ کر مرید کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ بزرگ نے فرمایا "خدا نے جس کو یہ مرتبہ اور مقام عطا اسے بھلا دولت کی آرزو کیونکر ہو سکتی ہے۔ یہ عظیم صاحب کرامت بزرگ حضرت سہل بن عبداللہ تستری رح تھے جن ے کرام میں انتہائی بلند مقام ہے۔ اسی لیے بعض مذہبی حلقے آپ کو مقتدائے صوفیا قرار دیتے ہیں۔ آپ بچپن ہی میں

درویشی اور قلندری کی طرف مائل تھے۔ ننھی سی عمر میں ہی آپ نے فاقہ کشی اور شب بیداری شروع کر دی تھی۔
چونکہ آپ کے والدین آپ کی شیر خواری میں ہی انتقال فرما گئے تھے اس لیے سہل بن عبداللہ اپنے ماموں محمد بن سمار کے پاس رہتے تھے جو کہ اللہ کے انتہائی عبادت گزار بندے تھے اس وقت آپ کی عمر بمشکل تین سال تھی۔ ایک دن جب آپ اپنے ماموں کے پاس بیٹھے دین و دنیا کی باتیں سن رہے تھے تو نہ جانے دل میں کیا خیال آیا کہ اپنے ماموں سے کہنے لگے ابد سے لے کر آج تک عرش کے سامنے سجدہ ریز ہوں۔"
ماموں آپ کی یہ بات سن کر گہری سوچ میں پڑ گئے اور آپ کو سختی سے ہدایت کی کہ آئندہ ایسی بات نہ کہنا۔ ماموں نے ہر شام آپ کو یہ دعا پڑھنے کے لیے کہا اللّٰہ معی اللّٰہ ناظر الی اللّٰہ ساھدی۔
جب آپ نے اس دعا کو پڑھنا اپنا معمول بنا لیا تو آپ کے ماموں نے آپ کو حکم دیا کہ اس دعا کو روزانہ سات مرتبہ پڑھا کرو جب انہوں نے اس حکم کی تعمیل بھی کر دی تب آپ کے ماموں نے مزید ہدایت کی کہ اب اس دعا کو دن میں پندرہ مرتبہ پڑھا کرو۔ کہتے ہیں کہ سہل بن عبداللہ آخری عمر تک یہ دعا روزانہ پندرہ مرتبہ پڑھتے رہے۔
سہل بن عبداللہ خود فرماتے ہیں کہ اس کے بعد میں نے فوری طور پر قرآن پاک کی تعلیم حاصل کرنا شروع کر دی اور سات سال کی عمر میں باقاعدگی سے روزے بھی رکھنے لگا۔
پھر بارہ برس کی عمر میں جب ایک مسئلہ میں اشکال پیش آیا تو میں حضرت حبیب حمزہ کے پاس بصرہ پہنچا جو اپنے وقت کے بہت بڑے زاہد و عابد تھے۔ چنانچہ انہوں نے میرا اشکال دور فرمایا اور کچھ دن ان کی خدمت میں رہنے کے بعد میں دوبارہ تستر لوٹ آیا۔ واپسی پر بھی میں نے یہ معمول برقرار رکھا کہ دن میں روزہ رکھتا اور رات کو ساڑھے چار تولہ وزن کے برابر جو کی ٹکیاں کھا لیتا۔ بس یہی میری غذا تھی۔
پھر کچھ عرصہ بعد میں نے تین شبانہ روز کا روزہ رکھنا شروع کر دیا۔ حضرت سہل فرماتے ہیں کہ میں نے فاقہ اور کھانے دونوں چیزوں کا تجربہ کر کے دیکھا۔ شروع شروع میں بھوکا پیاسا رہنا میرے لیے بہت مشکل اور دشوار تھا اور نقاہت بہت زیادہ محسوس ہوتی تھی لیکن رفتہ رفتہ میں بالکل اس کیفیت کے برعکس محسوس کرنے لگا یعنی روزہ رکھنے کی وجہ سے مجھ میں زیادہ طاقت اور قوت آجاتی۔ آپ کہتے ہیں کہ شعبان کے روزوں کی فضیلت کی وجہ سے میں شعبان میں بکثرت روزے رکھا کرتا تھا
بعض روایات کے مطابق حضرت سہل بن عبداللہ پورے رمضان میں صرف ایک مرتبہ کھا پی لیتے جب کہ باقی ایام بغیر کھائے پیئے عبادت میں گزار دیتے۔
آپ کی ان عادات اور ناقابل یقین فضائل کے باعث اس وقت بعض لوگوں نے آپ پر کفر کا فتوے لگا دیا اور آپ کو مافوق الفطرت شئے تصور کرنے لگے۔ مگر جب وہ آپ کے بار بار سمجھانے سے بھی وہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے تو آپ نے تستر کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا اور اپنا تمام اثاثہ اور مال و زر اللہ تعالےٰ کی راہ میں قربان کر کے مکہ معظمہ کی جانب ہجرت کر گئے۔
سفر کے دوران آپ مسلسل فاقے کرتے اور راستوں کی صعوبتیں برداشت کرتے ہوئے جب کوفہ پہنچے تو نفس نے تقاضا کیا کہ اگر آپ مجھے مچھلی اور روٹی کھلا دیں تو مکہ معظمہ پہنچنے تک کچھ نہیں مانگوں گا۔
چنانچہ حضرت سہل بن عبداللہ نے دیکھا کہ ایک جگہ ایک اونٹ چکی سے بندھا ہوا چکی چلا رہا ہے

آپ نے چکی کے مالک سے پوچھا کہ دن بھر کی محنت و مشقت کے بعد تم اُونٹ والے کو کیا دیتے ہو۔
اس نے جواب دیا کہ "میں اونٹ کے مالک کو دو دینار دیتا ہوں۔"
یہ سنکر حضرت سہل بن عبداللہ نے فرمایا کہ اس اونٹ کو کھول دو اور اس کی جگہ مجھے باندھ دو اور دن بھر کے
دو دینار کے بجائے ایک دینار مجھے دے دینا۔
چنانچہ تمام دن اونٹ کی جگہ چکی چلانے کے بعد آپ کو ایک دینار مل گیا تو آپ نے مچھلی اور روٹی کھا کر نفس
سے کہا کہ جس وقت بھی تو مجھ سے بھوک کی شکایت کرے گا تو اسی طرح محنت کرنا پڑے گی۔ پھر مکہ معظمہ پہنچ کر حج کیا
حضرت ذوالنون مصری سے بیعت ہو کر تستر واپس آگئے

روایت ہے کہ جب کبھی آپ سطح آب پر چلتے تھے تو آپ کے پاؤں کبھی تر نہ ہوتے تھے اور جب لوگوں نے کہا
ہم نے سنا ہے کہ آپ کشتی کے بغیر پانی کے اوپر چلتے ہیں تو آپ نے فرمایا مسجد کے موذن سے پوچھ لو وہ
جھوٹ نہیں بولتا۔ لوگوں نے جب مؤذن سے پوچھا تو اس نے کہا کہ مجھے تو اس کا قطعی علم نہیں البتہ مجھے یاد
ہے کہ ایک مرتبہ آپ نہاتے ہوئے پھسل کر حوض میں گر پڑے تھے تو میں نے ان کو تھام لیا تھا لیکن شیخ ابو
...نا کہتے ہیں کہ آپ بہت صاحب کرامت ہونے کے باوجود خود کو زمانے کی نظروں سے چھپائے رکھتے تھے
نماز جمعہ سے قبل کوئی بزرگ ملاقات کی غرض سے آپ کے پاس آئے۔ انہوں نے دیکھا کہ آپ کے قریب
سانپ کنڈلی مارے ہوئے بیٹھا ہے اور جب وہ بزرگ اجازت لے کر قریب پہنچے تو فرمایا کہ جو حقیقت آسمان
ناواقف ہوتا ہے وہی زمین کی چیزوں سے خوف کھاتا ہے۔ پھر آپ نے اِن بزرگ سے پوچھا کہ نماز جمعہ کے
...یا خیال ہے۔
انہوں نے کہا کہ مسجد جامع تو یہاں سے ۲۴ گھنٹے کی مسافت کے فاصلے پر ہے۔ یہ سن کر حضرت سہل بن
...نے ان بزرگ کا ہاتھ پکڑا اور آنِ واحد میں اس جامع مسجد میں داخل ہو گئے اور نماز کے بعد لوگوں پر نظر
...ے ہوئے فرمایا کہ مخلص صاحب ایمان تو بہت قلیل ہیں البتہ گریبان چاک کرنے والے درویش قلندر ہر جگہ
...تے ہیں۔
حضرت سہل بن عبداللہ فرمایا کرتے تھے کہ پیٹ بھر کر کھانے سے نفسانی خواہشات اپنے عروج کو پہنچ جاتی
...ر نفس اپنی مرادیں طلب کرنے لگتا ہے۔ آپ اکثر فرمایا کرتے تھے رزقِ حلال سے محرومی خلوت نشینی کے
...و مند ثابت نہیں ہو سکتی اور حلال رزق اسی کو ملتا ہے جس کو خدا چاہے۔
...ک مرتبہ حضرت سہل بن عبداللہ جب مکہ معظمہ جا رہے تھے تو راستے میں انہیں ایک بڑھیا ملی۔ آپ نے
...کر جب اس بڑھیا کی اعانت کرنا چاہی تو اس نے ہاتھ اُٹھا کر مٹھی بند کر لی اور جب دوبارہ مٹھی کھولی تو
...ں سونا بھرا ہوا تھا۔ پھر بڑھیا آپ سے کہنے لگی۔ "تم تو جیب سے رقم نکالتے ہو مگر مجھے غیب سے رقم ملتی ہے۔"
...لہ کر وہ بڑھیا غائب ہو گئی۔ پھر جب آپ نے بیت اللہ پہنچ کر طواف کرنا شروع کیا تو دوران طواف ——
...یا کو اپنے سے بہت بلند مقام پر دیکھا اور جب آپ اس کے نزدیک پہنچے تو بڑھیا نے ان سے کہا کہ جو اختیاری طور پر
...تا ہے اس کے لیے طواف کعبہ بہت ضروری ہے جو دل میں اضطراری کیفیت رکھتے ہیں کعبہ خود انہیں
... بلاتا ہے
...پ کبھی اس حالت میں نہ بیٹھتے تھے کہ جس سے جسم کو زیادہ آرام سکون اور راحت ملتی۔ لوگوں نے کبھی آپ کو

دیوار سے ٹیک لگائے یا پاؤں پھیلا کر بیٹھے نہ دیکھا تھا۔ ایک مرتبہ مسلسل چار ماہ تک آپ کے پاؤں کی انگلیوں میں شدید درد رہا مگر آپ نے انگلیوں کو باندھے رکھا۔ جب ایک شخص نے اس کی وجہ دریافت کی تو سہل بدستور خاموشی اختیار کیے رہے۔ پھر اس شخص نے مصر پہنچ کر جب ذوالنون مصری سے ملاقات کی تو ان کے پاؤں کی انگلیاں بھی بندھی ہوئی تھیں۔ انہوں نے اس شخص کو بتایا کہ میں چار ماہ سے اس درد میں مبتلا تھا۔

اس شخص نے کہا اعلیٰ حضرت! میں تو کچھ سمجھ نہیں سکا۔ اُدھر سہل بن عبداللہ نے اپنے پاؤں کی انگلیاں باندھی ہوئی ہیں تو ادھر آپ نے اپنے پاؤں کی انگلیاں باندھی ہوئی ہیں آخر معاملہ کیا ہے۔ اس پر حضرت ذوالنون مصری نے کہا کہ اس زمانے میں سہل کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے جو میرے درد سے باخبر ہو کر اس طرح میری پیروی کرے۔

توکل اور قناعت پسندی پر آپ بہت زیادہ زور دیتے تھے۔ آپ اکثر فرماتے تھے کہ توکل انبیاء کرام کی پسندیدہ شے ہے اس لیے متبعین کے لیے اتباع سنّت بہت ضروری ہے اور توکل کا مفہوم یہ ہے کہ انسان خدا کے سامنے اسی طرح رہے جس طرح غسال کے سامنے میت پڑی رہتی ہے اور متوکل کی شناخت یہ ہے کہ نہ تو وہ کسی سے طلب کرے اور نہ بغیر طلب کے وہ کسی سے کچھ لے بلکہ اگر کوئی کچھ دے بھی تو اس کو صدقہ کر دے۔

اسی طرح دوستی کا مفہوم بیان کرتے ہوئے حضرت سہل بن عبداللہ نے فرمایا کہ دوستی کا مفہوم بیان کرتے ہوئے مخالف چیزوں سے فرار اختیار کرنا ہے۔ کیونکہ تمام آسائشیں اور راحتیں اسی شخص کے مقدّر میں ہوتی ہیں جو خدا کو دوست رکھتا ہے۔

حضرت سہل بن عبداللہ کے بقول نفس پر قابو پانا انسان کے لیے سب سے زیادہ خوشگوار ترین مرحلہ ہوتا ہے فرمایا کہ نفس کے لیے سب سے مشکل مرحلہ اخلاص ہے اور اخلاص کا مفہوم یہ ہے کہ بلا کسی تصرف و تغلب کے دین کو اسی طرح واپس کرنا ہے جس طرح حاصل کیا جاتا ہے۔ پھر فرمایا کہ تمام دن غلط راستے سے بچنا پوری شب کی نمازوں سے بہتر ہے۔

آپ کے کسی مریض نے عرض کیا" فلاں شخص کہتا ہے کہ وہ بغیر حکم الٰہی کے رزق تلاش نہیں کرتا۔ اس کا کیا مطلب ہے؟" حضرت سہل بن عبداللہ نے فرمایا کہ اس قسم کی بات صدیق اور یا پھر زندیق کے علاوہ اور کوئی نہیں کہہ سکتا۔ مزید فرمایا کہ دن رات میں صرف ایک مرتبہ کھانا صدیقین کا شیوہ ہے اور دو مرتبہ کھانا مومنین کی عادت ہے جبکہ تین مرتبہ کھانا چرنے والوں کا کام ہے۔

آپ ہمیشہ لوگوں کو اخلاق حسنہ کی ہدایت فرماتے تھے۔ فرمایا کہ لوگوں کے قصور معاف کرتے ہوئے برائی کا بدلہ نہ لے ایک مرید کے سوال کرنے پر مزید فرمایا کہ مرض و بلا پر قابو پانے اور الا ماشاءاللہ کہنے سے بندہ خدا کے کرم کا مستحق ہو جاتا ہے آپ اکثر اپنے مریدوں کو ہدایت فرماتے تھے کم کھاؤ اور زیادہ بولنے سے پرہیز کرو کیونکہ خوشی تنہائی اور کم کھانے میں ہی نجات ہے کسی شخص نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ آپ کی صحبت میں رہنا چاہتا ہے۔"

حضرت سہل بن عبداللہ نے سوال کیا کہ میرے بعد کس صحبت اختیار کرو گے

" میں آپ کے بعد خدا کی صحبت اختیار کروں گا۔" اس شخص نے جواب دیا۔ اس پر حضرت سہل نے فرمایا کہ ابھی سے خدا کی صحبت اختیار کرلو۔ اس شخص نے پھر پوچھا کہ حضرت ایک شیر آپ کے پاس آجاتا ہے۔" آپ نے فرمایا جب میں اس کو کتا کہہ کر آواز دیتا ہوں تو وہ میرے قریب آجاتا ہے۔ کیونکہ عارفین کی صحبت تمام امور سے افضل ہے۔

ایک مرتبہ وعظ کے دوران آپ فرمانے لگے کہ مجھے ایک ایسے خدا رسیدہ شخص سے شرف نیاز حاصل ہوا ہے جو شب و روز دریا کے اندر مقیم رہتے ہیں اور صرف پانچ وقت کی نمازوں کے لیے باہر نکلتے ہیں لیکن ان کے اوپر

ن کا بھی کچھ اثر نہیں ہوتا تھا۔ پھر فرمایا میں نے ایک مرتبہ خواب میں دیکھا کہ قیامت کا منظر ہے اور ایک پرندہ
وں کو پکڑ پکڑ کر بہشت میں لے جا رہا ہے۔ جب مجھے پرندے کے اس فعل پر حیرت ہوئی تو غیب سے آواز
ی کہ یہ پرندہ دنیا کا تقوے ہے اور آج اہل تقوے اسی کے طفیل جنت میں داخل ہو رہے ہیں۔
آپ نے اپنے ایک اور خواب کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ میں بہشت میں ہوں اور وہاں تین بزرگوں سے
ال کر رہا ہوں۔ میرا اُن بزرگوں سے سوال تھا کہ دنیا میں سب سے زیادہ ڈراؤنی شئے آپ کو کیا پیش آئی انہوں
ے جواب دیا کہ ہمیں سب سے زیادہ ڈر اپنے خاتمے کا تھا۔ پھر فرمایا کہ میں نے خواب میں ابلیس سے کہا تیرے
دیک سب سے زیادہ پریشان کُن چیز کونسی ہے۔ اس نے جواب دیا کہ بندے کا خدا کے ہمراہ رازو نیاز۔
حضرت سہل بن عبداللہ نے فرمایا کہ ایک مرتبہ میں نے ابلیس کو پکڑ کر اُس سے پوچھا کہ جب تک تو خدا
ی وحدانیت کے متعلق نہیں بتائے گا میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا چنانچہ اس نے اس قدر تشریح کے ساتھ
ارف وحدانیت بیان کیے کہ اِس انداز میں کوئی عارف بھی بیان نہیں کر سکتا۔ لیکن اس کے باوجود میں اس
ی باتوں سے متاثر نہ ہوا کیونکہ وہ اپنے اس علم کو منفی انداز میں انسانوں کو بہکانے کے لیے استعمال کرتا ہے۔
نے کا مقصد یہ ہے کہ جب تک کسی عالم فاضل کی نیّت پاک اور ارادہ نیک نہ ہو اس کی اچھی باتوں میں بھی
ثیر نہیں ہوتی۔ ایک موقع پر آپ نے فرمایا عالم کی شناخت یہ ہے کہ ازل سے جو مقدورت قائم ہو چکے ہیں،
اس پر خوش رہے۔

حضرت سہل بن عبداللہ اکثر کہا کرتے تھے کہ اے اللہ میں کسی بھی لائق نہیں مگر پھر بھی تو مجھے یاد رکھتا ہے
ر میرے لیے یہی خوشی کی بات ہے۔
جب آپ کے وصال کا وقت قریب آیا تو لوگوں نے پوچھا کہ آپ کے مرنے کے بعد خلیفہ کون ہوگا اور کون
نبر پر کھڑا ہو کر وعظ کیا کرے گا۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ شاد دیگر آتش پرست میرا خلیفہ ہوگا چنانچہ سہل بن عبداللہ
نے اسے بلوا کر فرمایا کہ میرے انتقال سے تین روز بعد نماز ظہر کے وقت سے وعظ کہنا۔
چنانچہ آپ کی وفات کے تین روز بعد جب تمام لوگ جمع ہوئے اور شاد دیگر آتش اپنے مذہبی لباس میں
نبر پر پہنچا تو اس نے لوگوں سے کہا "تمہارے سردار نے مجھے رہنما بنایا ہے اور یہ بھی فرما دیا ہے کہ تیری آتش
ستی ترک کرنے کا وقت آ پہنچا ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا لبادہ اُتار کر کلمہ پڑھا اور اسلام میں داخل ہو گیا

چیخ کا عذاب

ایک روایت میں ہے کہ رسول اکرمؐ نے اپنے صحابہ سے فرمایا: "تم ان حجر کی بستیوں میں خدا سے ڈرتے، عجز و زاری کرتے اور روتے ہوئے داخل ہوا کرو ورنہ ان میں داخل ہی نہ ہوا کرو کہیں ایسا نہ ہو کہ تم بھی اپنی غفلت کی وجہ سے عذاب کی مصیبت میں مبتلا ہو جاؤ۔" اس کے علاوہ ایک دوسری روایت میں یوں ہے کہ جب رسول اکرمؐ حجر میں داخل ہوئے تو فرمایا: "اللہ تعالےٰ سے نشانیاں طلب نہ کیا کرو۔ دیکھو صالحؑ کی قوم نے نشانی طلب کی تھی اور وہ ناقہ، پہاڑ کی کھو سے نکلتی اور اپنی باری میں کھائی کر وہیں واپس چلی جاتی اور جو اُن کی باری کا دن تھا اس میں قوم ثمود کو اپنے دودھ سے سیراب کرتی تھی، مگر ثمود نے آخرکار سرکشی کی اور ناقہ کی کونچیں کاٹ کر اس کو ہلاک کر دیا اور نتیجہ یہ نکلا کر خدا نے ان پر چیخ کا عذاب مسلط کر دیا اور وہ اس عذاب سے گھروں کے اندر ہی مُردہ ہو کر رہ گئے۔ صرف ایک شخص ابو رغال نامی بچا جو سرزمین حرم میں گیا ہوا تھا لیکن جب وہ حدودِ حرم سے باہر آیا تو فوراً اسی عذاب کا شکار ہو گیا۔"

اس کے بعد لوگوں کو نصیحت کی کہ میں تو ظاہری لبادہ اُتار کر مسلمان ہوگیا ہوں لیکن اگر تم روزِ محشر اپنے مرشد سے ملنا چاہتے ہو تو باطنی ظلمت رکاٹ کر پھینک دو۔ یہ الفاظ سُن کر اہلِ مجلس اس درجہ متاثر ہوئے کہ مضطربانہ انداز میں رونے لگے۔

ایک مرتبہ کسی تونگر نے آپ کو کچھ رقم دینے کی پیش کش کی مگر آپ نے اسے منع فرمایا اور کہا کہ میں اس ڈر سے نہیں لیتا کہ تیری موت کے بعد مجھے اللہ تعالےٰ سے یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ زمین کا رزق تو مرگیا لہٰذا اب تو میری ضروریات کی تکمیل فرما۔ اسی طرح جب کسی نے سوال کیا کہ آپ کو رزق کہاں سے ملتا ہے تو آپ نے فرمایا "خدا کے خزانے سے۔" اس شخص نے کہا کہ آپ تو لوگوں کو فریب دے کر رزق حاصل کرتے ہیں۔ سہل بن عبداللہ نے اُس سے پوچھا کیا میں نے تجھ سے کوئی رقم لی ہے۔

اس نے جواب دیا "ہرگز نہیں"

اس پر آپ نے فرمایا کہ کاش تو مسلمان ہو جاتا۔

اس شخص نے سہل بن عبداللہ کہا کہ آپ تو ہمیشہ کج بحثی کرتے ہیں

آپ نے فرمایا میں تو اس لیے حجت پیش کررہا ہوں کہ قیامت کے دن اللہ تعالےٰ بندوں سے حجت کرے گا۔

وہ شخص بولا۔ "یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔"

اب تو سہل بن عبداللہ کو بہت غصہ آیا۔ آپ نے اس شخص سے کہا کیا تو ان احکامات کو باتوں سے تعبیر کرتا ہے جس کی وجہ سے تیری ماں تیرے باپ کے لیے حلال ہوئی۔

اس نے دوبارہ دریافت کیا کیا آپ کو آسمان سے رزق ملتا ہے۔

"مجھے کیا ساری دنیا کے لیے ہی آسمان سے رزق نازل ہوتا ہے۔ آپ نے جواب دیا۔

وہ شخص بھی خاصا باتونی تھا۔ سوال پر سوال کیے جارہا تھا۔ اس نے کہا "اگر واقعی ایسا ہے تو آپ کسی ایسی جگہ پر جائیں جہاں اناج بالکل نہ ہو پھر میں دیکھوں گا کہ آپ کو رزق کیسے ملتا ہے۔"

اس آدمی کی یہ بات سن کر آپ پورے دو برس تک غار میں پڑے رہے اور اللہ تعالےٰ کی جانب سے آپ کو رزق میسر آتا رہا۔ ایک مرتبہ پھر اس شخص نے سوال کیا کہ کیا آپ نے کسی کو بغیر بیج ڈالے فصل کاٹتے دیکھا ہے سہل بن عبداللہ نے فرمایا "کیا تم بغیر بیج کے بوئے ہوئے اپنے بال نہیں کاٹتے۔" یہ سن کر وہ شخص مکمل طور پر تائب ہوگیا آپ نے اس کو نصیحت کی کہ مخلوق سے قطع تعلق کرکے اس طرح مشغول عبادت رہو کہ اس کے علاوہ کسی دوسرے کا علم نہ ہوسکے اور ہمیشہ مخلوق خدا کی خدمت کرتے رہو تاکہ وہ تمہاری خدمت کرے۔

حضرت سہل بن عبداللہ نے اسلام کی تین زریں اصول فرمائے اول اخلاص و اعمال میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع، دوم رزق حلال استعمال کرنا اور سوم افعال میں اخلاص پیدا کرنا۔ آپ نے فرمایا کہ افضل انسان وہی ہے جو بدخصلتی کو ترک کرکے نیک خصلت اختیار کرے۔ وعظ کے دوران آپ اکثر لوگوں کو ہدایت فرماتے کہ فقرا کو تحقیر کی نگاہ سے مت دیکھو کیونکہ ان میں سے اکثر نائب اور وارث انبیاء ہوتے ہیں۔

آپ کی آخری آرام گاہ تستر میں واقع ہے جہاں سے بندگان خدا آج بھی فیضیاب ہوتے ہیں۔

حضرت خواجہ محمد حافظ عرف میاں صاحب دینہ فاروقی ایک جلیل القدر درویش مشہور تھے۔ اُن کے زہد و رکوع اور روحانیت سے ہندو مسلم سب کے دل روشن اور شاداب ے۔ اس ہستی کے چمن میں ۱۷۳۹ء میں بمطابق ۱۱۵۲ھ ایک پھول کھِلا جس کی خوشبو سے پورا جہاں معطر ہو گیا س گُل خوش رنگ و بو نے شاعری۔ درویشی۔ تقویٰ، ایمان کی بیک وقت خوشبوئیں پھیلائیں۔

اس رونق چمن کا نام حضرت سچل سرمست رحمۃ اللہ علیہ تھا۔ آپ حضرت میاں صاحب دینہ کے پوتے اور میاں صلاح ین کے فرزندِ ارجمند تھے۔ اس ہفت زبان کا نام سب سے پہلے عبدالوہاب رکھا گیا اور یہی عبدالوہاب گے چل کر سندھی زبان کے سچو اور سچے دینہ۔ پنجابی اور اردو کے سچل اور فارسی میں آشکارا اور خدائی لے تخلص اور ناموں سے مشہور ہوئے۔ آپ یومِ تاسیس سے ہی سچ بولا کرتے تھے آپ کی سچائی کی نسبت ے ہی آپ کو سچل۔ سچو اور سچے دینہ کہا جاتا تھا۔

حضرت سچل سرمست ابھی عمر کے چھٹے سال میں تھے کہ شفقتِ پدری سے محروم ہو گئے۔ چنانچہ اس زِ یتیم کی پرورش آپ کے چچا خواجہ عبدالحق کے دریائے عاطفت اور بحرِ معرفت میں ہوئی۔ بعض روایات لے مطابق یہ بات بھی مشہور ہے کہ آپ کی پرورش ایک حبشی نژاد نیک دل آیا کے ہاتھوں ہوئی جس کا م جوشیدی تھا مگر آپ اُس کو کالی اماں کہا کرتے تھے۔ اس لفظ میں نامعلوم کیا چاشنی و شیرینی تھی کہ ہ آیا۔ یہ لفظ سُنکر نہال ہو جایا کرتی تھی۔

مشہور بزرگ اور صوفی شاعر حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی نے حضرت سچل سرمست کے متعلق اُن کے ن آغاز میں پیش گوئی کی تھی کہ جس خُم کو ہم نے تیار کیا ہے اس کا ڈھکنا یہ صاحب زادہ اُتارے گا۔ اہلِ سندھ کا آج بھی اعتقاد ہے کہ حضرت شاہ صاحب کی پیش گوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی اور حضرت

سچل سرمست نے مجذوبی و سرمستی کی حالت میں مسئلہ وحدۃ الوجود کو ایسے بے باکانہ طریقے سے واضح کیا کہ اُن سے پہلے کسی بھی شاعر نے نہیں کیا۔

حضرت سچل سرمست کو سب سے پہلے اُن کے عم محترم خواجہ عبدالحق نے حافظ عبداللہ قریشی صدیقی کے پاس حفظِ قرآن کے لیے بھیجا۔ آپ نہایت کم عمری میں قرآن مجید ازبر کر کے حافظ اور قاری بن گئے اس کے بعد آپ کو چچا نے ازخود فارسی کی تعلیم دینا شروع کی اس کے ساتھ ہی علوم عربیہ کی تحصیل و تکمیل بھی کی۔ علم تصوف و معرفت کے اسرار و رموز سے بھی آپ کو خواجہ عبدالحق نے ہی آگاہ کیا۔ یہ سارے امور طے ہونے کے بعد خواجہ صاحب نے حضرت سچل سرمست کو اپنی بیعت میں لے کر خرقہ خلافت سے سرفراز کیا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کو خلیفہ سچل بھی کہا جاتا ہے۔

آپ نے اپنے چچا سے حاصل کی ہوئی ظاہری و باطنی تعلیم کے متعلق ایک سی حرفی تحریر فرمائی جو حسب ذیل ہے۔

وہ ہادی عبدالحق صاحب ہے   جسے صوفی، شہنشاہ کہوں!
سب علم سکھائے اس نے مجھے   اسے عرفان سے آگاہ کہوں

حضرت سچل سرمست کی بچپن سے ہی ایک خاص عادت تھی کہ وہ اکیلا رہنا پسند کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ آپ تن تنہا جنگلوں میں پھرتے رہتے۔ اس دشتِ نوردی میں آپ خدا تعالیٰ کی قدرت کاملہ پر غور کرتے۔ خاموشی، صبر اور فکر آپ کا ازلی اور فطری سرمایہ تھا۔ آپ کو شکار سے نفرت تھی چنانچہ آپ نے زندگی میں کبھی کسی جانور کا شکار نہیں کیا۔

عہدِ جوانی میں آپ کے معمولات صرف پنجگانہ نماز اور ورد و وظائف تک محدود تھے اور ہمیشہ باجماعت نماز ادا فرماتے تھے۔ عموماً نماز کی ادائیگی اپنے رشتہ داروں کے ہمراہ اپنے مرشد و عم کی اقتدا میں فرمایا کرتے تھے۔ جوں جوں آپ عمر کی منازل طے کرتے گئے۔ آپ کے اندر موج مستی، عروج عرفان پیدا ہوتا گیا اور آپ بے خود سرمست بن گئے۔ آپ پر ہر وقت کیفیتِ استغراق طاری رہتی تھی۔

آپ کا قد درمیانہ تھا۔ رنگت موافق اور صاف ستھری تھی۔ ناک اور پیشانی کی ساخت بھی عمدہ تھی دراز زلفیں رکھتے تھے۔ سر پر قلندروں جیسا سبز عمامہ رکھتے تھے۔ آپ ہمیشہ سفید تہبند پہنا کرتے تھے ہاتھ میں ایک دراز عصا پکڑے رکھا کرتے تھے۔ چارپائی پر سونے سے ہمیشہ گریزاں رہتے۔ سخت لکڑی کے پھٹوں پر سویا کرتے تھے۔ اپنے کندھے پر ہر وقت طنبور لٹکائے رکھتے تھے۔ جس کو بجاتے اور اشعار گاتے رہتے تھے۔

بھرپور جوانی اور شاندار صحت کے باوجود آپ اپنے نفس پر ہمیشہ قادر رہے۔ سن آغاز سے لے دمِ واپسیں تک آپ نے کوئی کام خلافِ شرع نہیں کیا۔ شراب، بھنگ، حقہ اور چلم وغیرہ ریاست خیرپور میں بکثرت استعمال کیے جاتے تھے لیکن آپ نے ان میں سے کسی کی طرف نگاہ غلط سے بھی کبھی نہ دیکھا تھا۔

آپ کو شرک اور بدعت سے بھی سخت نفرت تھی۔ آپ کو غصہ بہت کم آتا تھا۔ جس کسی میں کوئی برائی دیکھتے اوّل تو خاموش رہتے تھے اگر روکتے یا ٹوکتے تو بالکل محبت بھرے انداز میں جس سے برائی

نے والا بُرا بھی نہیں مناتا تھا۔ آپ ہر شخص کو اس کے حال پر چھوڑ دینے کے قائل تھے۔ آپ کا
بنے متعلق خود اپنے الفاظ میں یہ عقیدہ تھا۔

ساقیا آں شراب انگوری
مانمی خواہیم زوست صددوری
لازوال است آں مئی وحدت
آں بنوشاں زہم زمہجوری

آپ اپنی درویشی اور سرمستی میں اس قدر غرق رہے کہ آپ کے عالمِ شباب میں آنے کے بعد
آپ کو شادی کرنے کا خیال ہی نہ آیا۔ آخر آپ کے عمِ محترم و مرشدِ عالی خواجہ عبدالحق نے آپ
رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتِ مسنونہ پوری کرنے کا حکم دیا۔ خواجہ عبدالحق نے سچل سرمست کا
اپنی صاحب زادی کے ساتھ کیا۔ آپ اگرچہ شادی کرنے کے خواہش مند نہ تھے لیکن اس کے
ف بھی نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپ کو آپکے مُرشد نے شادی کرنے کا حکم دیا تو آپ نے سُنتِ
پر عمل پیرا ہونے کے لیے اس حکم کو دل وجان سے قبول کیا۔ آپ کو شادی کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایک
ند بھی عطا کیا تھا جو جلد ہی خدا کو پیارا ہو گیا تھا۔

مرزا علی قلی بیگ نے اپنی کتاب میں رقم کیا ہے۔

"میر رستم خان ریاست خیر پور کا والی تھا۔ اس کا بیٹا میر محمد حسین سخت بیمار ہو گیا تھا۔ وہ حضرت
ل سرمست کی خدمت میں حاضر ہوا اور دُعا کی درخواست کی۔ آپ اُس وقت جلال میں آگئے اور فرمایا۔
ارے بیٹے کی زندگی کے لیے قربانی دینا پڑے گی اور ہم تمہارے بیٹے کے بدلے اپنا بیٹا خدا کے حضور
کرتے ہیں۔" آپ کی یہ دُعا ابھی آپ کے لبوں پر ہی تھی کہ اللہ نے قبول فرمالی۔ میر محمد حسن صحت
ب ہو گیا اور آپ کا بیٹا خدا کو پیارا ہو گیا۔ تاریخ نگار حضرت سچل سرمست کے بیٹے کا نام نیاز علی
جود علی تحریر کرتے ہیں۔"

حضرت سچل سرمست کا شجرۂ نسب مختلف واسطوں سے حضرت عمر ابنِ خطاب رض سے جا ملتا ہے۔ حضرت
اللہ بن عمر رض کی وفات کے بعد آپ کے پوتے شیخ شہاب الدین بن عبدالعزیز حجاز سے مہاجر ہو کر
ن میں آباد ہو گئے۔ عراق کے گورنر حجاج بن یوسف ثقفی نے جب اپنے نوجوان داماد محمد بن قاسم کو سندھ
تسخیر کے لیے روانہ کیا تو یہ جلیل القدر شخصیت یعنی شیخ شہاب الدین فاروقی بھی محمد بن قاسم رح کے ہمراہ
اعلیٰ کی حیثیت سے ساتھ تھے۔ شہاب الدین فاروقی اپنے عہد کے مدبر اور سیاست دان تھے۔ مسلمانوں
جب سندھ پر پہلا حملہ کیا اور اسلامی لشکر کے سپہ سالار بدیل کو شکست ہوئی تو شہاب الدین فاروقی نے
حجاز بن یوسف کو یہ مشورہ دیا کہ سندھ کے سرحدی علاقوں میں تبلیغ اسلام کے لیے بڑے بڑے علماء اور
دین کو روانہ کیا جائے۔ آپکی اس تجویز کو حجاز نے پسند کیا اور بعد میں یہی تجویز سندھ کی کامیابی کا سبب
سندھ کی فتح کے بعد شیخ شہاب الدین نے محمد بن قاسم کو سندھ کے ملکی و فوجی امور اور لوگوں کی آسودگی
خوشحالی کے متعلق بڑے مفید اور کارآمد مشورے دیئے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سندھ کے غیر مسلم قبائل جوق در
اسلامی برادری میں شامل ہو گئے اور اسلام کی بُنیادیں سندھ کے اندر مستحکم ہو گئیں۔ شیخ شہاب الدین

کے بعد اُن کے فرزند شیخ محمد فاروق اُن کے جانشین اور سیوستان کے حاکم مقرر ہوئے اُن کے انتقال کے بعد شیخ اسحاق فاروقی نے حکومت سنبھالی اُن کی وفات کے بعد ۱۹۳ھ میں شیخ محمد فاروقی نے فرمانروائی کا منصب سنبھالا۔

یہ اُس دَور کی بات ہے جب سلطان محمود نے سندھ فتح کیا تھا۔ شیخ محمد فاروقی کے بعد مخدوم نورالدین نے تخت و تاج سنبھالا۔ ان کے بعد ان کے چار بیٹے ابوسعید، بدرالدین، رکن الدین اور ضیاءالدین حکمران ہوئے۔ اِن چاروں کی اولادوں میں سے مخدوم حجار ہوئے جو حضرت بہاؤالدین زکریا ملتانی کے مرید اور خلیفہ تھے۔ اس طرح یہ فاروقی خاندان سیوِن شہر میں آباد ہو گیا اور اسی خاندان میں سچل سرمست جیسی ہستی نے جنم لیا۔ فاروقی خاندان کے بزرگوں کے چشمۂ فیض سے ہزاروں کے حساب سے لوگ آبِ روحانیت کا نوشیں پیتے اور اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرتے تھے۔

حضرت سچل سرمست اپنے دادا میاں صاحب ڈینہ کے متعلق ایک واقع اپنی فارسی تصنیف میں بیان کرتے ہیں کہ کلہوڑہ خاندان کی سندھ پر حکومت تھی۔ اسی حکومت کی طرف سے میرے دادا میاں صاحب ڈینہ ایک اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز تھے۔ ایک روز میرے دادا کسی کام کی غرض سے کوٹڑی کبیرہ ضلع نواب شاہ سے ڈیولوں کے گاؤں کی طرف جا رہے تھے۔ راستے میں جنگل کے درمیان ان کو ایک مجذوب عورت بیٹھی ہوئی نظر آئی —— اس عورت کا نام بی بی بصری تھا۔ اُس نے میاں صاحب ڈینہ کو آواز دی اور

"اے صاحبِ ڈینہ خدا تم سے بہت بڑا کام لینا چاہتا ہے۔ تم کہاں جا رہے ہو۔ جلدی واپس لوٹ جاؤ۔"

بی بی بصری کی اس بات کے بعد میاں صاحب ڈینہ طریقۂ قادری میں شامل ہوئے اور حضرت خواجہ عبداللہ جیلانیؒ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ حضرت خواجہ عبداللہ حضرت سید عبدالقادر جیلانی بغدادی قدس سرہٗ العزیز کے پوتے تھے اور یہ فیض آگے چل کر میرے اندر بھی منتقل ہوا اور میں روحانیت کی بلندی پر پہنچایا گیا۔

ہندو عامل دیوان چند حیدرآباد کے میر صاحبان کے ہاں ملازم تھا۔ اُس نے کسی وجہ سے یہ ملازمت ترک کر خیرپور کے والی میر سہراب خان کی ملازمت اختیار کر لی اور مختارِ کار مقرّر ہوا۔ چند دنوں کے بعد اس نے سرکاری کام میں دانستہ طور پر خرد برد کی اور اسی الزام میں گرفتار ہوا۔ اس حیدرآبادی دیوان کے رشتہ دار فقیر میاں فضل اللہ جھوک شریف والے کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سفارش کے لیے منت سماجت کی۔ صوفی فقیر نے انہیں ایک خط خواجہ عبدالحق کے نام لکھ کر دیا اور اس میں لکھا۔

"ہمارا ایک آدمی تمہارے ظالموں نے قابو کر رکھا ہے۔ اُسکو فوراً آزاد کراؤ۔"

حضرت خواجہ عبدالحق نے خط پڑھ کر اپنی دستارِ مبارک سے قادری ٹوپی نکال کر حضرت سچل سرمست کے سر پر رکھی اور فرمایا "جاؤ اور میران خیرپور سے حیدرآبادی عامل کو آزاد کراؤ۔"

حسبِ ارشاد حضرت سچل سرمست میر سہراب خان اور اُس کے صاحبزادوں کے دربار میں آ کر حاضر ہوئے اور وہاں بندوقیں دیکھ کر آپ نے پوچھا یہ کیا ہے؟

آپ کو وہاں پر موجود درباریوں نے بتایا کہ ان سے شیروں کا شکار کیا جاتا ہے۔
حضرت نے فرمایا۔ "شیروں کا شکار کرنا اتنا آسان نہیں۔"
حاضرین نے آپ سے بحث شروع کر دی کہ اس بندوق کی ایک گولی سے شیر کے جسم کے چیتھڑے اُڑ سکتے ہیں۔ یہ بحث و مباحثہ سن کر حضرت سچل سرمست کی طبع میں ایک عجیب قسم کا جوش و خروش پیدا ہو گیا۔ آپ کے چہرے پر جلال آگیا۔ اس جلال کی آمد تھی کہ اہل دربار کو یوں محسوس ہُوا جیسے سچ مچ کا شیر اُن کے درمیان آکھڑا ہُوا ہے۔ سب کے سب ڈر کے مارے کانپنے لگے اور حضرت سچل سرمست سے معافی مانگی۔ آپ نے حکم دیا کہ میرے مُرشد نے ہندو عامل دیوان کی رہائی کی خواہش کی ہے۔ اس لیے آپ لوگ اُسے فوراً آزاد کر دیں۔ آپ کے کہنے کی دیر تھی کہ دیوان کو قید سے آزاد کر دیا گیا۔

٭

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ریاست خیر پور کے والی میر صاحب شکار سے واپس آرہے تھے۔ اُن کے ہمراہ امراء وزراء کا ایک لشکر تھا جس وقت حضرت سچل سرمست ایک کنویں پر بیٹھے ہُوئے تھے۔ آپ نے پورے جسم میں ملتانی مٹی لگائی ہوئی تھی اور آپ کا ارادہ نہانے کا تھا۔ اسی وقت میر صاحب کا قافلہ کنویں کے قریب سے گزرا۔ میر صاحب حضرت سچل سرمست کی قدم بوسی کرنے کے لیے آگے بڑھے مگر انہیں ملتانی مٹی میں لتھڑے دیکھ کر پیچھے ہٹ گئے اور دُور کھڑے ہو کر حضرت کی خیریت دریافت کرنے لگے۔ اسی اثناء میں میر صاحب کے چھوٹے بھائی جو قافلے کے آخر پر تھے فوراً بڑھے اور حضرت کے قدموں پر گر پڑے حضرت سچل سرمست نے چھوٹے میر صاحب جن کا نام غالباً میر علی مراد خان تھا کو اُٹھا کر اپنے گلے لگایا اور اُن کی آنکھوں کو چوم لیا۔ اُن کو بہت زیادہ دعائیں دیں پھر بڑے میر صاحب سے مخاطب ہُوئے۔
"تم جس کو ملتانی مٹی سمجھ کر میرے سے دُور رہے۔ وہ ملتانی مٹی نہ تھی بلکہ جاہ و اقبال کی مہندی کا رنگ تھا جو چھوٹے میر صاحب میر علی مراد خان کو لگ گیا ہے۔"
حضرت سچل سرمست کی یہ دعا ۱۸۴۳ء میں قبول ہُوئی جب انگریزوں نے میرانِ سندھ سے حکومت چھین کر برطانوی حکومت کا پرچم لہرایا تو اس وقت سندھ میں خیر پور ہی ایک ایسا علاقہ تھا جہاں میر علی مراد خان کی ریاست قائم کی گئی۔
حضرت سچل سرمست نے بڑے ہی پُر آشوب سیاسی دور میں پرورش پائی۔ اُن دنوں سیاست گرگٹ کی طرح رنگ بدلتی تھی۔ آپ کو ان باتوں سے سخت نفرت تھی۔ آپ کا ہر عمل انسانی بھلائی سے عبارت ہوتا تھا۔ جب مدد خان پٹھان نے سندھ میں آکر خون کی ندیاں بہائیں اور اس کے گھوڑوں اور لشکر کی دہشت سے سندھی عوام کی سوچ اس قدر متاثر ہُوئی کہ آج کے سائنسی دَور میں بھی جب اُن پر کوئی مصیبت آجائے تو وہ گھوڑا، گھوڑا پکارتے ہیں۔ یہ خون آگیں اور انسان کشی کا منظر حضرت نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ سیاسی بے اعتدالیوں کے ساتھ مذہبی حالات بھی ناگفتہ بہ تھے۔ حاجی مخادیم کلہوڑا کو اس قدر مذہبی اقتدار حاصل تھا کہ وہ معمولی سی بات پر ہندوؤں کو جبراً مسلمان کر لیا کرتے تھے اور اس دَور کے علماء فضلا کے علاوہ اُس دَور کے حکام بھی اُن کا ہی ساتھ دیا کرتے تھے۔ مخادیم کا فتویٰ حکام اور رعایا دونوں یہاں کے حرف آخر کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ تمام اقلیت، حکومت اور مخادیم کلہوڑا کے خلاف ہمیشہ سازش اور بغاوت کے منصوبے بنائی رہتی تھی۔ انہی اندرونی خلفشاروں کے

عث اس اقلیت نے انگریزوں کا کھلم کھلا ساتھ دیا۔ حضرت سچل سرمست نے ان سارے حالات کو اپنی ظروں سے دیکھا آپ کا دل اُمتِ مسلمہ کے باہمی تعصب اور دشمنی پر بہت کڑھتا تھا۔ آپ کا زمانہ ادبی لحاظ سے بڑا زریں زمانہ تھا۔ کیونکہ کلہوڑا حکام اور سہراب خان اور میر رستم خان سب کے سب علم کے دلدادہ تھے چنانچہ ان کی حکومتوں میں ادب کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ یہ حکمران خود بھی شاعر اور ادب نواز تھے۔ میر تم خان کی کافیاں سوز و گداز پر دلالت کرتی ہیں۔

میر عالی خان اور میر مبارک خان اعلیٰ پایہ کے شاعر اور سخندان تھے۔ ران پور کے پیر صاحبان میں سے یر ابراہیم شاہ گرچہ خود شاعر نہ تھے لیکن اس کے باوجود بڑے فیاض اور ادب نواز تھے۔ ان تمام باتوں حضرت سچل سرمست نے اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے۔ ذوقی اور حقیری دو ایسے اشخاص تھے جن کو حضرت بابا چل سرمست بہت پسند فرماتے تھے۔ ان کے لیے آپ نے اپنے دیوان آشکار میں تحریر فرمایا ہے کہ:۔

بسے شاعر نہاں شد آشکارا
کجا ذوقی کجا رفتہ حقیری

سندھ کی ادبی مذہبی اور سیاسی زندگی میں حضرت سچل سرمست اور اُن کے آباؤ اجداد کا بڑا دخل ہے کیونکہ ان اصحاب صالحہ کی بدولت لوگوں کے اندر علم و آگہی اور معرفت کی شمعیں روشن ہوئیں اور ان ں ذات و برکات پر اہالیان سندھ جتنا فخر کریں کم ہو گا۔

حضرت سچل سرمست نے اپنی زیادہ تر زندگی سندھ کے اندر ہی رہ کر گزاری اور باہر جانے سے گریز ا۔ اُن کا خیال تھا کہ یادِ الٰہی میں کسی جگہ بھی بیٹھ کر مگن رہا جا سکتا تھا، لیکن اس کے باوجود انہوں نے ندِ علاقوں کا دورہ کیا۔ آپ ایک مرتبہ سکھر گئے وہاں آپ نے کئی نیک لوگوں سے ملاقاتیں کیں۔ درویشی ں بات کی متقاضی ہوتی ہے اور درویشوں کا یہ خاصا ہوتا ہے کہ وہ اپنے جیسے دوسرے درویشوں کو دیکھ کر ہت خوشی محسوس کرتے ہیں۔ اس میدان میں حسد، تعصب اور کینہ و بغض نام کو نہیں۔ چنانچہ درویش لوگ اپنے م مسلکوں اور صوفیاء کی محافل میں بیٹھ کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ روہڑی اور شکارپور سے ہوتے ہوئے حضرت سچل سرمست لاڑکانہ تک گئے۔ آپ نے روہڑی میں فقیر قادر بخش بیدل سے ملاقات کی وہ آپ سے ملاقات کرنے کے بعد آپ کے عقیدت مند اور معتقد ہو گئے۔ شکارپور اور سکھر میں آپ کی ولایت و رامت اور سخنوری و درویشی کو بڑی شہرت ہوئی۔ یہاں آپ نے کچھ عرصہ قیام کیا۔ دن رات لوگوں لے ٹھٹھ کے ٹھٹھ آپ کے گرد جمع رہا کرتے تھے اور ذکر کی محفلیں منعقد ہوا کرتی تھیں۔ یہاں آپ کے تھ پر لاتعداد لوگوں نے بیعت کی۔

عثمان فقیر جا کی کو لاڑکانہ میں روحانی فیوض و برکات سے مستفیض فرمایا اور اُن کو خلافت عطا کی۔ میاں د صالح قادری بھی آپ کے خادموں میں سے تھے اُن کو بھی سلوک و معرفت کی منازل طے کرائیں۔ روحانی بیت کر کے اُن کو ولایت کے اعلیٰ درجوں پر فائز کیا اور بعد میں ان لوگوں کے فیض اور روحانی تعلیم سے تعداد لوگوں نے اسلام کی شمع سے روشنی حاصل کی اور حضرت سچل سرمست کی خدمات کے بدلے اللہ تعالیٰ ے اُن کا نام تاریخ کے اوراق میں منور و تاباں کر دیا۔

حضرت سچل سرمست کے ان شہروں کے علاوہ اور کہیں جانے کا ذکر تاریخ میں نہیں ملتا۔ آپ نے اپنی

باقی ماندہ زندگی اپنے گاؤں میں ہی بسر کی اور یہاں پر رہ کر آپ نے لوگوں کو دینی تعلیم سے روشناس کرایا۔ لڑائی جھگڑوں۔ آئے دن کے سیاسی جوڑ توڑ۔ اور بغض وریا سے دُور رکھنے کے لیے آپ نے لوگوں کی روحانی اور دینی تربیت کی۔ آپ امن کے داعی تھے اور یہی وجہ ہے کہ آپ نے اپنے علاقے کے لوگوں کو بھی پُرامن زندگی گزارنے کی تلقین کی یہ آپ کی روح پرور زندگی کا ہی اعجاز ہے کہ آپ کے زمانے میں سندھ کی صورتِ حال باقی زمانوں کی نسبت بہتر رہی۔ لوگ آپ کی تعلیمات سے نہ صرف فائدہ اُٹھایا کرتے تھے بلکہ اُن پر عمل پیرا بھی ہوتے تھے۔

جیسا کہ پیچھے تحریر کیا گیا ہے کہ حضرت سچل سرمست اولیاء اللہ ہونے کے ساتھ ساتھ سخن ور بھی تھے شاعری آپ کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ آپ کے کلام میں فصاحت وبلاغت۔ بلند فکری اور ندرتِ بیان اس طرح سے قابلِ داد ہے آپ نے شاعری کی زبان میں علم تصوف کے جو رموز واسرار بیان کیے ہیں۔ ان کی بنا پر آپ کو حافظِ سندھ کہا جاتا تھا۔

آپ منصور وعطار کی طرح شطحیات بھی کہہ جایا کرتے تھے۔ ایک جگہ آپ نے فرمایا ہے:

"آتے ہیں بے خودی میں ہم لوگ گاہے گاہے"

اس کے علاوہ آپ نے عشقِ مجاز میں ایسے سوز وگداز کے ساتھ کافیاں کہیں ہیں جن کو سُنکر کوئی بھی صاحبِ ذوق شخص متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آپ ایک رقیق القلب اور دردمند انسان تھے۔ آپ خود فرماتے ہیں کہ:

دلم پُرغم پریشاں اشتیا نش
زدر دم شبیر دادہ دایۂ ما!

جناب عثمان علی انصاری صاحب مرحوم نے تحریر کیا ہے کہ سچل سرمست سندھ کی ادبی دنیا میں ایک ایسا روشن ستارہ ہے جسے زاہدوں کا ایک گروہ خراجِ تحسین دینے میں بخل سے کام لیتا رہا ہے۔ کیونکہ اس طرح اُن کے عقائد کو ٹھیس لگتی ہے۔ انصاری صاحب حضرت سچل سرمست کے کلام میں تصوف کی اتنی خوبیاں بیان کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ ان خوبیوں کی بدولت نہ صرف مسلمان متاثر ہوئے ہیں بلکہ ہندوؤں کے دل پر بھی آپ کے کلام کا اثر ہوتا ہے اور لوگ آپ کے کلام سے نہ صرف لذاتِ لسانی بلکہ تاثراتِ روحانی بھی حاصل کرتے ہیں۔ آپ نے اپنے کلام میں زیادہ تر مدہوشی کی باتیں کی ہیں۔ وہ ہوش میں رہ کر بے ہوشی کے گیت گاتے تھے۔ وہ اپنے اعجازِ کلام کے ساتھ سُننے والوں کو یہ بھی یاد دلاتے ہیں کہ مسلم اور غیر مسلم اور امیر غریب کا فرق یا اس قسم کی دوسری باتیں عالم انسانیت میں اوہام کی کارفرمائی کے نتائج ہیں ورنہ ظاہر وباطن کی ہر حالت میں واحد حقیقت ہے۔

"این وآں" کا فرق صرف نگاہِ انسانی کا قصور ہے۔ حضرت جو چیز دیکھتے تھے اسی کے متعلق بات کرتے تھے۔ اُن کی زبان اور نگاہ میں کوئی فرق نہیں۔ کیونکہ ان دونوں قوتوں پر قابض صرف ایک ہی چیز ہے۔ آپ کا عقیدہ ہے کہ جست کی بنیاد اتحادِ روحانی پر مستحکم ہے اور عاشق ومعشوق کی روح دو مختلف چیزیں نہیں ہے۔ آپ فرماتے ہیں تو واحد ہے عدد نہیں۔ جس طرح حروف کی پیدائش نون کے نقطے سے ہوتی ہے اور اس نقطے کے ردوبدل سے حروف کی مختلف صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں یا سونے سے مختلف زیورات کے مختلف نمونے بنائے جاتے ہیں اور اُن کے نام بھی مختلف ہوتے ہیں بالکل اسی طرح انسان

ذاتِ احد کا ایک منظر ہے اور غلبہ عشق کی وجہ سے اس نے مختلف صورتیں اور مختلف نام اختیار کر رکھے ہیں۔
حضرت سچل سرمست کا طرزِ بیان اور جذبہ عشق کوئی ہمت شکن اور عمل سوز کیفیت نہیں بلکہ آپ کے کلام کا ہر لفظ خودی اور منزلِ مقصود حاصل کرنے کے لیے ایک درسِ عمل ہے۔ آپ نے فرمایا۔

بہ شاہی می زنم نعرہ گدائی
گدائی نیست لیکن خود خدائی
بگمراہی نیفتادم —— ہرگز
جہاں را می کنم ایں رہنمائی

حضرت سچل کی مثالیں ایسی مثالیں ہیں جن میں اصلیت کی خوشبو ہے۔ آپ پیچیدہ اور دقیق مثالیں دینے سے ہمیشہ گریز کرتے تھے۔ اُن کی تمثیلات میں یہ خوبی ہے کہ وہ ہمارے ہر دور کے حالات کے مطابق ہیں اور اُن کو عام فہم میں بیان کیا گیا اور اس کو ہر کوئی سمجھ سکتا ہے۔"

حضرت سچل سرمست اپنے اظہارِ تعجب کے لیے کئی مثالیں پیش کرکے آخر اس اصلیت پر آکھڑے ہوجاتے ہیں کہ انسان خدا کا نور ہے۔ انسان خاک کا پُتلا ہے اور اسے خدا کی طاقت چلا رہی ہے۔ خدا نے انسان کو خود ہی پیدا کیا ہے اور خدا ہی اُسے اپنے پاس بُلا رہا ہے۔ وہ خود ہی دریا ہے خود ہی سمندر ہے خود ہی گلاب کا پھول ہے اور خود ہی خوشبو ہے۔ خود ہی ابر ہے اور خود ہی باراں ہے۔"

حضرت سچل سرمست سے پہلے سندھی شاعری صرف قدیم دوہے اور کافی پر بنی تھی۔ مذہبی شاعری کے لیے کبت کی صنف مقرر تھی جس میں فقہی مسائل وغیرہ بیان کیے جاتے تھے۔ یہ چیز آجکل متروک ہو چکی ہیں۔ کافی یا دائی عموماً دو مستزاد پر مشتمل ہوتی تھیں اور اس میں، مناجات اور محبوب کے سراپا وغیرہ کا بیان ہوتا تھا۔ حضرت نے ان تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی۔ آپ "وحدت نامہ" مخدوم محمد ہاشم کی زادِ الفقیر" مخدوم عبداللہ کی "کنز العبرت" اور شہید عبدالرحیم گرد یڑی کی "حقیقتِ محمدی" اور تفسیر وغیرہ سے بہت بلند پایہ تصانیف ہیں۔ وحدت نامہ کی زبان آسان۔ صاف اور شستہ ہے۔ اسی طرح آپکا "قتل نامہ" "پھولنا" وغیرہ سندھی شاعری میں پہلی کوشش ہونے کے باوجود آج تک اپنی مثال آپ ہیں۔ اس طرز کا کوئی دوسرا شاعر ابھی تک اس قدر کامیاب نہیں ہوا۔

حضرت سچل سرمست کی زبانِ حق کے تراجم بیان کرکے سندھی ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہوا ہے۔ سندھی کافی میں حضرت سچل نے ساختِ مضمون اور معنی کے لحاظ سے جو ایجادیں کی ہیں، ان میں آج تک کوئی بھی اضافہ نہیں کر سکا۔ آپ کی لاتعداد غزلیں اور خیال علم عروض کے قواعد کے مطابق ہیں۔ زبان کی صفائی۔ خیال کی گہرائی اور مضمون آفرینی میں آپ یکہ تاز تھے۔ آپ نے فارسی میں بھی غزل۔ مستزاد۔ قطعہ اور مثنوی پر طبع آزمائی کی۔ ان تمام اصناف میں تمثیل کے ذریعے آپ نے وحدت الوجود کی وضاحت فرمائی۔ آپ نے خیال کی بلندی اور معنوی گہرائی کے ساتھ ساتھ صنائع وبدائع کا بھی کافی استعمال کیا۔

آپکی تصانیف میں دیوانِ آشکار۔ راز نامہ۔ گداز نامہ۔ تار نامہ۔ مرغ نامہ۔ عشق نامہ۔ رہبر نامہ۔ اور وصیت نامہ قابلِ ذکر کتب ہیں۔ آپ کی غزلیات میں رندی اور منصوری جذبات کو بالکل آسان اور عام فہم میں بیان کیا گیا ہے۔

جلوۂ حسنش چوں بینی دیدۂ عبرت کشا
تا بہر مظہر شناسی بادشاہ کبریا!
گاہ ارنی گر ترانی ہر دو جاری حکم او
گاہ ہجر و گہ وصال و گہ صدا و گہ ندا
"لاتحرک ذرۃ الا باذن اللہ" شنو
آشکارا تو نہ ئی آں ہرچہ باشد خود خدا

علی ہذالقیاس حضرت سچل سرمست کا کلام ہر زبان میں جذب مستی سوز و گداز۔ رقت وجدانی۔ فنا و بقا۔ جلوۂ عبودیت۔ استغرق۔ تجلیاتِ معرفت اور ذوق فنا فی الوجود سے لبریز اور معمور ہے۔ فارسی کے علاوہ اُردو میں بھی آپ کو دوسرے درجے کا صوفی شاعر کہا گیا ہے۔ آپ اپنی جداگانہ مضمون آفرینی کے باعث سب سے زیادہ ممتاز نظر آتے ہیں۔ آپ کا توحیدِ وجودی کا مضمون صوفیانہ شاعری میں سب سے اہم ممتاز موضوع شمار کیا جاتا ہے۔ اس میں تعینات کے تمام پردے اُٹھ جاتے ہیں اور سالک کو ہر طرف وحدت ہی وحدت کا جلوہ نظر آتا ہے۔ آپکی شاعری کی تفسیر خواجہ میر درد نے یوں بیان فرمائی ہے۔

وحدت نے ہر طرف تیرے جلوے دکھا دیے
پردے تعینات کے جو تھے اُٹھا دیے
ہوں کشتۂ تغافل ہستیٔ بے ثبات
خاطر سے کون کون نہ اُس نے بھلا دیے
چاہے وفا کرو نہ کرو اختیار ہے
خطرے جو اپنے جی میں تھے وہ سب اٹھا دیے

حضرت سچل سرمست عمر بھر کبھی بیمار نہ ہوئے تھے۔ عمر کے آخری دور میں آپ خونی پیچش کا شکار ہوگئے مرض اس قدر بڑھا کہ آپ نڈھال ہوگئے اور اسی بیماری کی طوالت سے مورخہ ۱۴ رمضان المبارک ۱۲۴۲ھ بمطابق ۱۸۲۶ء کو آپ واصلِ حق ہوئے۔ عبدالقادر بیدل نے آپ کے مزار مقدس پر حسب ذیل قطعہ تحریر کروایا۔

دُرِ بیضائے ازل ترکید شد مخروج عشق
کف رو دریائے محبت کرد بیرون موج عشق
از خدا بودے صدیق و پیش احمد شد بجو
از علیؓ صادق یقین و پیشوا مخروج عشق
سالِ اورا انشی و بر لوح تقدیر ایں نوشت
بود مہ برجِ ہدیٰ اور آفتاب اوج عشق

بچے کی عمر تو پانچ برس تھی مگر اس کی پراسرار شخصیت ہر کسی کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ ننھے سے بچے میں اس قدر فہم وادراک اور سمجھ بوجھ بظاہر ایک غیر فطری سی بات معلوم ہوتی تھی مگر جب اپنی آنکھوں سے دیکھا جائے ین کرنا ہی پڑتا ہے۔

دیکھنے والے واضح طور پر دیکھ رہے تھے کہ یہ پانچسالہ بچہ ہر وقت غور وفکر میں مصروف رہتا ہے اور اپنے بزرگوں بھی عام چھوٹے بچوں کی طرح بہت کم دلچسپی لیتا ہے۔ وہ اکثر لوگوں سے یہ بھی کہتا کہ وہ اِس دنیا میں ایمان کی ں بتانے اور راہِ حق سے بھٹکے ہوئے لوگوں کی اصلاح کرنے آیا ہے۔

اب تو بڑے بڑے عالم فاضل لوگ بھی اس سال خوردہ بچے پر توجہ دینے لگے اور اُن کے دلوں پر اس کمسن بالک یک دہشت سی بیٹھ گئی اور پورے شہر میں اس کے چرچے ہونے لگے۔

اس بچے کی پیدائش کے موقع پر بھی ایک ایسا واقعہ رونما ہوا تھا جس نے خود اس کے گھر والوں کو ورطۂ حیرت ال دیا تھا۔ جس روز اس انوکھے بچے کی پیدائش ہوئی اسی روز ایک بزرگ وہاں تشریف لائے اور گھر والوں سے لگے کہ وہ نومولود سے ملنا چاہتے ہیں۔

بچے کے والد سیّد علی نے پوچھا کہ آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں۔ بزرگ نے بتایا کہ وہ دمشق سے آئے ہیں جہاں ی برسوں سے گوشہ گمنامی میں یادالٰہی میں مصروف ہیں اور کل ہی انہیں یہ بشارت ہوئی تھی کہ ان کا ایک دوست نیا میں تشریف لایا لہٰذا اب وہ اپنے اس ننھے دوست سے ملاقات کے لیے یہاں پر تشریف لائے ہیں۔

ب تو بچے کے والد سید علی بہت حیران ہوئے اور وہ بزرگ کو ناقابل یقین نگاہوں سے گھورتے ہوئے بولے ”واہ ت! یہ بھی خوب رہی۔ آپ تو اس قدر عمر رسیدہ اور باریش بزرگ ٹھہرے اور چلے ہیں۔ ایک دن کے بچے سے دوستی ے کرنے۔ میرا خیال ہے آپ شاید ہوش میں نہیں ہیں اور یا پھر کسی غلط جگہ پر آگئے ہیں۔“

سید علی کی یہ گستاخانہ گفتگو سن کر وہ صوفی بزرگ انتہائی تلخ لہجے میں بولے۔ ”اس کا مطلب یہ ہے کہ میں آپ سے جھوٹ

بول رہا ہوں۔

صوفی کے چہرے پر جلال کی کیفیت دیکھ کر بچے کے والد سید علی بھی ذرا ٹھٹھکے اور قدرے نرمی سے کہنے لگے۔" بزرگوار یہ بات ہرگز نہیں ہے البتہ مجھے ذرا سی حیرت ضرور ہو رہی تھی اگر آپ گستاخی نہ سمجھیں تو مہربانی سے مجھے بتا دیں کہ آپ کی نومولود سے کس منطق کے تحت دوستی ہوئی۔

بزرگ نے کہا" بھائی یہ باتیں معرفت کی ہیں یہ راز و نیاز کے معاملات ہیں تمہاری سمجھ سے بالاتر ہیں تم صرف اتنا کرو کہ تھوڑی دیر کے لیے اندر پردہ کرادو تاکہ میں اپنے دوست سے ملاقات کر سکوں۔

چنانچہ اس اجنبی صوفی کے زبردست اصرار پر سید علی مکان کے اندر گئے۔ انہوں نے بیوی کو دوسرے کمرے میں جانے کی ہدایت کی اور پھر بزرگ کو بچے کے پاس لے آئے۔

بزرگ نے بچے کے قریب پہنچ کر پہلے تو انتہائی ادب سے جھک کر سلام کیا اور پھر سجدے میں گر پڑے۔ چند لمحے اسی کیفیت میں گزر گئے۔ تھوڑی دیر بعد وہ دوبارہ کھڑے ہوئے اور نومولود کے انتہائی قریب جا کر کہنے لگے مجھے غیب سے اشارہ ہوا تھا کہ جو بھی آپ کو دیکھے گا فوراً سجدے میں گر پڑے گا۔ آج مجھے اس کا عملی تجربہ ہو گیا ہے اور میں نے غیب کے اسرار و رموز سے آگاہی حاصل کر لی ہے۔ اتنا کہہ کر وہ بزرگ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہوئے اور پھر یہ کہتے ہوئے رخصت ہو گئے کہ انشاء اللہ میں آئندہ بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا رہوں گا۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ جس وقت بزرگ، بچے سے ہمکلام تھے وہ بھی پورے انہماک اور توجہ سے بزرگ کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے وہ سب کچھ سنتا اور سمجھتا ہو۔

یقیناً اب تو بچے کے والد سید علی کو پورا یقین ہو گیا کہ اُن کا بیٹا کوئی ولی اللہ ہے اور اس کے طفیل اب اُنکے گھر انوار کی بارش ہوگی۔ بزرگ کے چلے جانے کے بعد سید علی نے اپنی بیوی کو بھی ساری بات بتا دی اور کہا کہ یہ بچہ ہمارے لیے قدرت کی ایک بہت بڑی نعمت ہے غیب کی جانب سے اس کی بزرگی اور عظمت کی تصدیق کے لیے اشارے مل رہے ہیں۔ کتنی عجیب بات ہے کہ ہمارے لخت جگر کو جو بھی پہلی نظر سے دیکھتا وہ اُسی وقت سجدے میں گر جاتا ہے۔ اگر یقین نہ آئے تو تم خود بھی ایسا کر کے اپنا اطمینان کر سکتی ہو۔

بیوی کہنے لگی" سرتاج! میں ایک ماں ہوں۔ میں تو پہلے ہی اس تجربے سے گزر چکی ہوں مگر جان بوجھ کر آپ سے اس کا تذکرہ نہیں کر رہی تھی۔ بہر طور دونوں میاں بیوی کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی انہیں یوں لگ رہا تھا جیسے دونوں جہاں کے خزانے ان کے ہاتھ لگ گئے ہوں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالٰی اپنے نیک بندوں کی زندگی کے آغاز میں ہی اُن کی بزرگی برتری اور عظمت کی نشانیاں عیاں کر دیتا ہے۔ سو یہ بچہ بھی ایسے ہی عظیم بزرگوں میں سے ایک تھا جس نے بعد میں بدیع الدین مدار کے نام سے روحانیت کی دنیا میں بے پایاں شہرت پائی۔

آپ یکم شوال ۲۴۲ ہجری کو اس دنیا میں تشریف لائے۔ آپ کے والد کا نام سید علی اور والدہ کا نام فاطمہ ثانی تھا۔ بدیع الدین مدار نے نوعمری میں ہی مختلف علوم کے خزانے جمع کر لیے اور اپنے زمانے میں تبلیغ و اشاعت اسلام کے ایسے ایمان افروز کارنامے انجام دیئے جس پر تاریخ اسلام آج بھی فخر کرتی ہے۔

جب آپ پانچ سال کے ہوئے تو آپ کے والد نے آپ کو اس وقت کے نامور جید عالم مولانا حذیفہ شامی کی شاگردی میں دے دیا۔ مولانا حذیفہ کو بدیع الدین ایسے قابل بچے کو شاگرد بنانے پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا انہوں نے بخوشی انہیں اپنے حلقہ درس میں بٹھایا اور پوری توجہ سے ان کی تعلیم و تربیت شروع کر دی۔

تھوڑے ہی عرصہ میں بدیع الدین نے مروجہ علوم میں غیر معمولی دسترس حاصل کر لی حتیٰ کہ آپ نے صرف دو سال عرصہ میں حدیث فقہ اور تفسیر کو بھی پوری طرح سمجھ لیا۔ یہ وہ دور تھا جب کیمیا گری کے فن میں لوگوں کا رجحان بہت رہ تھا۔ کیمیا گری کا مطلب چیزوں کی ماہیت کو تبدیل کر کے کوئی تیسری چیز بنانا ہے۔ مثلاً سونا اور چاندی وغیرہ چنانچہ بدیع الدین نے اس علم پر بھی خاصا عبور حاصل کر لیا مگر حیرت یہ تھی کہ دنیا جہان کے علوم حاصل کرنے باوجود ابھی آپ میں علم کی تشنگی باقی تھی۔ آپ کسی ایسے گوشۂ تنہائی کی تلاش میں سرگرداں تھے جہاں سے آپ ی اور روحانی سکون میسر آ سکے۔ ایک روز اسی جذبے کے تحت صبح سویرے آپ کہیں جا رہے تھے کہ اچانک ادھیڑ عمر بزرگ سے آپ کی ملاقات ہو گئی۔ بزرگ نے بدیع الدین کے چہرے کی کیفیت سے دل کی حالت کا اندازہ لگا لیا اور ان کا راستہ روک کر پوچھنے لگے۔

"تم کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہو بدیع الدین۔ کیا معاملہ ہے؟"

یہ بزرگ بدیع الدین کے لیے انتہائی اجنبی تھے اور کوشش کے باوجود وہ انہیں پہچان نہ سکے۔ تاہم بدیع الدین نے ے سے کہا "حضرت! یوں لگتا ہے جیسے میری کوئی قیمتی شے گم ہو گئی ہے عجیب سی بے سکونی اور بے کلی کی بت ہے کسی پل چین نہیں آتا اس لیے سکون قلب کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہوں۔

اس پر وہ بزرگ کہنے لگے "اگر تم چاہو تو میرے ساتھ چلو میرے پاس تمہارا علاج موجود ہے۔"

لیکن حضرت پہلے یہ تو بتائیں کہ آپ کون ہیں اور مجھے اپنے ساتھ کہاں لے جانا چاہتے ہیں۔"

بزرگ کہنے لگے "بدیع الدین! تم فی الحال ایسی باتیں نہ ہی پوچھو تو بہتر ہے لیکن اتنا یقین کر لو کہ اگر تم میرے ساتھ گے تو میں تمہارے قلب کے سکون کا کامل علاج کر دوں گا کیوں منظور ہے؟"

بدیع الدین کو چونکہ اپنے من کی مراد پوری ہوتی نظر آ رہی تھی۔ اس لیے انہوں نے مزید سوچ بچار کرنے میں وقت نہ کیا اور اسی وقت بزرگ کے ساتھ ہو لیے۔

یہ بزرگ بدیع الدین کو جہاں لے کر پہنچے وہاں لوگوں کا ایک جم غفیر موجود تھا۔ یوں لگتا تھا کہ روحانی اور قلبی بیماریوں بلا دنیا بھر کے مریض یہاں پر جمع ہو گئے ہیں۔ ادھر جیسے ہی بزرگ اور بدیع الدین وہاں پہنچے تو سارے ہجوم نے بڑے ی طریقے اور انتہائی عقیدت سے دونوں کا استقبال کیا۔ بعض لوگ تو باقاعدہ ان بزرگ کے ساتھ ساتھ بدیع الدین کے تھ چومنے لگے۔

وہاں پہنچ کر بدیع الدین نے بزرگ سے کہا "حضرت یہاں تک تو آپ مجھے لے آئے ہیں اب یہ فرمائیے کہ میری سکونی کا علاج آپ کیسے اور کب کریں گے؟

یہ سن کر بزرگ مسکرائے اور بدیع الدین کا ہاتھ تھام کر انہیں اپنے حجرے میں لے گئے اور وہاں جا کر کہنے لگے۔ "سنو الدین میرا نام طیفور شامی ہے۔ مجھے گذشتہ رات غیب سے یہ حکم ہوا تھا کہ میں تمہیں اپنے ہاں لے آؤں اور تمہارے دکھ ر پریشانی کو دور کرنے کی کوشش کروں۔ بدیع الدین دراصل مجھے معلوم ہے کہ تم بہت کچھ جاننا چاہتے ہو۔ بہت ازوں کو پانا چاہتے ہو۔ میں مانتا ہوں کہ تم نے ظاہر کے علم کو مکمل طور پر جان لیا ہے۔ مگر میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ ی تک باطنی علم کے اسرار و رموز سے ناآشنا ہو۔ تمہاری روح کو جس چیز کی طلب ہے وہ تمہیں دنیاوی علوم سکھانے مدرسوں سے حاصل نہیں ہو سکتی مگر میرے اس حجرے میں انسان کے باطنی امراض کا علاج کیا جاتا ہے لہٰذا بہتر یہی تم اب ہمارے ساتھ رہو یہاں پر علم سیمیا اور علم کیمیا بہت معمولی حیثیت رکھتے ہیں۔

طیفور شامی کی ایمان افروز باتیں سن کر بدیع الدین آبدیدہ ہو گئے وہ جی بھر کر رونا چاہتے تھے۔ آج ان کے ضبط کے تمام بندھن

ٹوٹ گئے تھے انہیں اپنے سامنے صحیح منزل دکھائی دے رہی تھی۔
صوفی طیفور شامی نے بدیع الدین کو اپنے سینے سے لگا کر اس زور سے بھینچا کر انہیں اپنی پسلیوں میں درد محسوس ہونے لگا۔ انہیں یوں لگا کہ جیسے ان کے اندر روشنی کی شعاعیں پھوٹ پڑی ہیں اور دل میں ایک الاؤ سا جل اٹھا ہے۔ پھر طیفور شامی کے پوچھنے پر بدیع الدین نے کہا کہ حضرت آپ کے قریب آنے سے میں اپنے اندر ایک روشنی سی محسوس کر رہا ہوں۔
اس پر طیفور شامی نے مسکراتے ہوئے کہا "بدیع الدین اس آگ میں جل کر تم کندن ہو گے اور روشنی کی یہی شعاعیں تمہیں تمہاری روحانی منزل تک پہنچا دیں گی۔ بدیع الدین نے فوراً کہا حضرت! اسی لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اب میں باقی زندگی آپ کے قدموں میں ہی گزاروں گا۔ بہرطور یہ بزرگ صوفی بدیع الدین کو اپنے حجرے میں ٹھہرا کر حبس دم کی تربیت دینے لگے۔ حبس دم کی تربیت میں انہوں نے اس قدر کمال اور عبور حاصل کر لیا کہ ان کی بھوک پیاس ہی ختم کر رہ گئی ایک لمحے کے لیے بھی انہیں اناج یا پانی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی، اور یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ قدرت کے پنہاں رازوں کے بہت قریب ہو گئے ہیں۔
جب حبس دم کی تربیت مکمل ہو گئی تو طیفور شامی سے خصوصی اجازت لے کر حج کی غرض سے آپ مکہ معظمہ تشریف لے گئے۔ حج کرنے کے بعد بدیع الدین مدینہ منورہ پہنچے۔ وہاں پر مسجد نبوی کے گنبد کو دیکھ کر آپ کے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے اور آپ کافی دیر تک گڑگڑا کر دعا مانگتے رہے۔ ایک دن آپ روضہ رسول ﷺ کی جالیوں سے لپٹ کر کہہ رہے تھے "یا رسول اللہ یہ عاجز و بے نوا آپ کے در مبارک سے کچھ لینے آیا ہے خدارا مجھے مایوس نہ کیجیے کیونکہ آپ نے تو اپنے بدترین دشمنوں کو بھی مایوس و نامراد نہیں لوٹایا۔ میں تو پھر آپ کا دیوانہ اور نام لیوا ہوں۔ بدیع الدین کافی دیر رو رو کر التجائیں کرتے رہے اور اسی عالم میں ان پر بے ہوشی طاری ہو گئی اور نہ جانے کب ان کی آنکھ لگ گئی پھر خواب میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے یہ حکم ہوا کہ بدیع تم ہندوستان جا کر وہاں مخلوق خدا کی خدمت کرو اور بھٹکے ہوؤں کو سیدھے راستے پر لانے کی جدوجہد کرو۔
اس کے ساتھ ہی آپ کی آنکھ کھل گئی۔ آج وہ لمحہ آن پہنچا تھا جب حضور ﷺ نے خود ان کے لیے منزل کا تعین کر دیا تھا۔ اللہ کے جس بندے کو محبوب خدا کی طرف سے رہنمائی حاصل ہو جائے اسے بھلا کیا چاہیے۔ یہ خواب دیکھنے کے بعد بدیع الدین کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے انہوں نے اپنی روحانی منزل کی معراج کو چھو لیا ہو۔
چنانچہ بغیر کسی تاخیر کے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہدایت کے مطابق بدیع الدین نے فوراً ہندوستان جانے کا قصد کیا اور واپسی پر سمندری سے ہوتے جب آپ گجرات پہنچے تب یہاں اسلام کے نام لیوا پیدا ہو چکے تھے۔ اجمیر شہر میں خواجہ غریب نواز اسلام کی تبلیغ میں مصروف تھے۔ بدیع الدین بھی گجرات سے ملحقہ دوسرے شہروں میں گئے جہاں پر اعلیٰ ذات کے ہندوؤں اور دوسری غیر مسلم ذاتوں اور فرقوں نے آپ کے اس نیک کام اور مشن کی مخالفت شروع کر دی مگر آپ ہر قسم کی تکالیف مصیبتوں اور رکاوٹوں کا مجاہدانہ وار مقابلہ کرتے رہے اور اپنی زبان سے مخلوق خدا کو اسلام کی طرف راغب کرتے رہے۔
بدیع الدین نے ہندوستان کے مقامی لوگوں کو جب پتھروں دیوتاؤں آگ اور سانپوں وغیرہ کی پوجا کرتے دیکھا تو آپ کو سخت ملال ہوا مگر اس خیال سے کہ شاید وہ اکیلے اتنا زیادہ کام مختصر عرصے میں نہ کر پائیں۔ بدیع الدین نے اپنی ایک جماعت بنالی یوں انہوں نے وسیع پیمانے پر اشاعت اسلام کا ایک کام شروع کر دیا۔
ایک مرتبہ کسی نے آپ سے دریافت کیا "حضرت کیا یہ درست ہے کہ اعمال کی بنیاد نیت پر ہوتی ہے
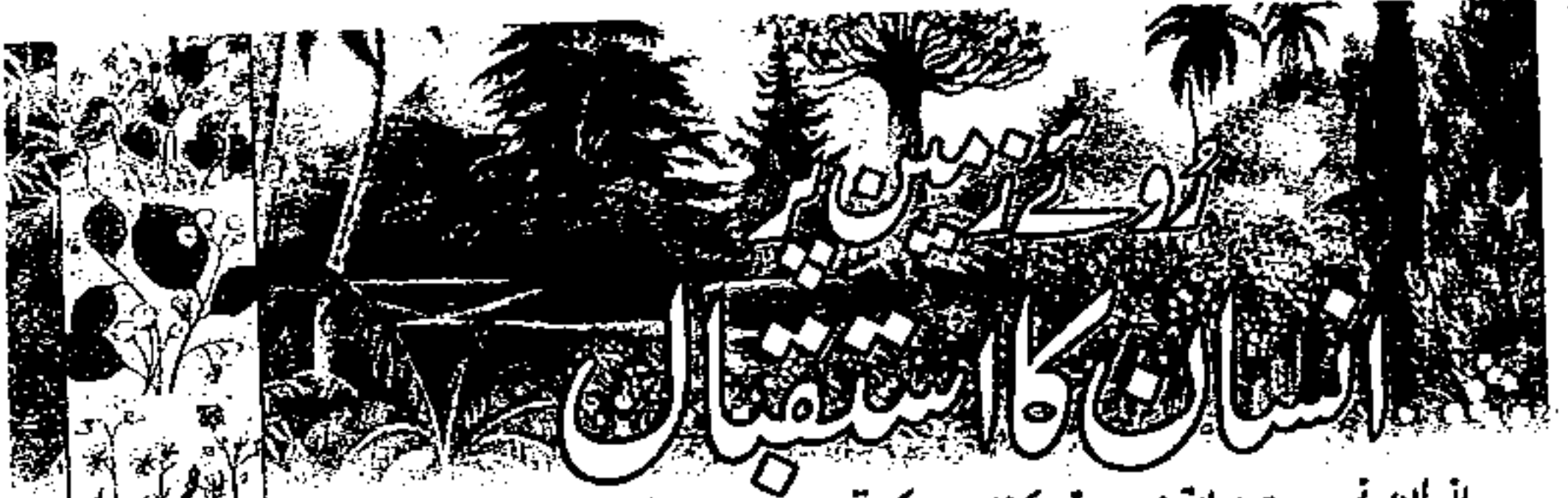
رُوئے زمین پر
انسان کا استقبال
انسان نے سب سے پہلا قدم جب رُوئے زمین پر رکھا تو درختوں نے لہلہا کر، نباتات نے
جھوم کر اور برگ و گل نے مسکرا کر انسان کا پُرجوش استقبال کیا۔
انسان نے چین محسوس کیا، وہ آغوشِ فطرت میں آچکا تھا۔ درخت اس کی غذا کا سامان
بنے اور نباتات اور گل و برگ اس کے درد کا درماں بنے۔ قدرتِ فیاض نے
رُوئے زمین کے چپّے چپّے پر نباتات پیدا کر دیئے ہیں اور انسان کی غذا اور دوا کا اہتمام کر دیا ہے۔
سائنس کی عظمتوں اور ٹکنالوجی کی رفعتوں نے بھی آخرکار انسانِ ارض کو آغوشِ فطرت
میں جانے کے لیے آج بے چین کر دیا ہے۔
ہاں، انسان کی بھلائی اسی میں ہے کہ وہ حتی الامکان دائرۂ فطرت سے باہر نہ جائے اور
نباتات سے اپنے علاج معالجے کا سامان کرے۔ ہمدرد نباتات کے عالمی میدان میں
گزشتہ کم از کم پچاس سال سے مصروف ہے اور دنیا کے ہر انسان کو ہمدرد نے دعوت دی ہے
کہ وہ آغوشِ نباتات میں آئے۔ آج دنیا نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا ہے۔
ہمدرد فطری علاج کا حامی ہے۔ آج کی دنیا فطری علاج کی خواہاں ہے
ہمدرد کی نباتی پیش رفتوں میں ایک نہایت موثر پیش رفت
ہمدرد
جوشینا
مدینۃ الحکمۃ
تعلیم، سائنس اور ثقافت کا عالمی منصوبہ۔
آپ ہمدرد دوست ہیں۔ اعتماد کے ساتھ مصنوعاتِ ہمدرد خریدتے ہیں۔ بائز منافع بین الاقوامی شہر علم و حکمت کی تعمیر میں لگ رہا ہے۔ اس کی تعمیر میں آپ بھی شریک ہیں۔
نزلہ، زکام۔ جوشینا سے آرام
Hamdard
BALM
ہمدرد
Adarts-JOS-1/92

بُری نیت کو دل میں رکھ کر اچھا عمل بھی کیا جائے تو اس کا ثواب بھی غارت ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔" ای
سوال کے جواب میں بدیع نے فرمایا۔ "یہ بالکل درست ہے مثال کے طور پر اگر کوئی شخص محض اس لیے اپنی نماز
اور عبادت کو طویل کرے کہ آتے جاتے لوگ اُسے دیکھ کر اس کی تعریف کریں یا اُسے نیک اور عبادت گزار
سمجھیں تو ایسی نماز نہ پڑھنا ہی بہتر ہے۔ جو شخص اللہ کے بجائے انسانوں کی خوشنودی کے لیے عبادت
ریاضت کرتا ہے اس سے زیادہ بدبخت اور منافق انسان اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ ایک اور عقیدت مند کے
سوال کا جواب دیتے ہوئے بدیع الدین نے فرمایا کہ ڈاکے ڈال کر اور لوٹ مار کر کے حاصل کیے ہوئے مال
سے غریبوں کی مدد کرنے کے عمل کو ثواب کے زمرے میں شمار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ انسان کے ہر اچھے
یا بُرے عمل کا دارومدار اس کی نیت پر ہوتا ہے۔

بدیع الدین مدار کی تعلیمات و افکار نہ صرف ان کے پیروکاروں کے لیے بلکہ ہر انسان کے لیے مشعل
راہ ہیں۔ جن دنوں آپ سورت شہر میں اسلام کی تبلیغ کر رہے تھے تو لوگ اسلام کی حقیقتوں اور صداقتوں
کو جاننے کے لیے آپ سے طرح طرح کے سوالات کیا کرتے تھے۔ ایک موقع پر جب آپ کسی محفل
لوگوں کو راہِ حق کے بارے میں بتا رہے تھے تو ایک شخص نے پوچھا" حضرت ہم نے سنا ہے کہ گناہ دو
کے ہوتے ہیں۔ ایک کو گناہ کبیرا اور دوسرے کو گناہ صغیرا کہتے ہیں۔ کیا آپ اس کی وضاحت فرمائیں
اس پر بدیع الدین نے تمام لوگوں کو اجتماعی طور پر مخاطب کرتے ہوئے کہا" بھائیو! مجھ سے جس
کے بارے میں پوچھا گیا ہے اس کی تقریباً اٹھارہ اقسام ہیں۔ پھر آپ فرمانے لگے کہ رسول پاکؐ کی احادیث
روشنی میں گناہ کبیرہ کی تعداد تقریباً اٹھارہ ہے اور ان میں سے چار کا تعلق قلب سے ہے اوّل یہ کہ اللہ
ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا، دوم گناہوں پر اصرار کرنا، سوم رحمت خداوندی سے مایوسی اور چہارم اللہ تعا
کی خفیہ تدابیر سے بے خوفی۔ بلاشبہ یہ چاروں گناہ کبیرہ ہیں۔

ایک شخص نے سوال کیا حضرت! چار کے بارے میں تو آپ نے فرما دیا اب ہم یہ بھی جاننا چاہیں
کہ بقیہ چودہ گناہ کبیرہ کون کونسے ہیں؟ بدیع الدین نے فرمایا۔ پہلا گناہ یہ ہے کہ کسی کے خلاف جھوٹی گواہی
جائے۔ دوسرا گناہ کبیرہ یہ ہے کہ کسی باعصمت عورت یا مرد پر تہمت لگائی جائے اور تیسرا گناہ یمین غموس کہلا
اس سے مراد ہر وہ جھوٹی قسم ہے جس کے ذریعے حق کو باطل اور باطل کو حق ثابت کیا جائے یا ایسی جھوٹی
جس کے نتیجے میں کسی مسلمان کے مال پر قبضہ جما لیا جائے۔ جو بھی شخص اس قسم کی قسمیں کھائے گا اللہ تعا
اسے جہنم کی آگ میں جلائیں گے۔

" اور چوتھا گناہ کون سا ہے پیرومرشد"۔ ایک طرف سے آواز آئی۔ آپ نے فرمایا کہ چوتھا گناہ جادو ٹو
اگرچہ یہ برحق ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرما دیا ہے کہ ایسا عمل کرنے والا کافروں میں شمار ہوگا۔ اسی
بدیع الدین نے باقی گناہوں کے بارے میں حاضرین محفل کو تفصیلی جواب دے دیا۔ آپ جتنا عرصہ
کے ساتھ رہ کر انہیں رشد و ہدایت کی تلقین کرتے وہ تمام وقت ان کے لیے طمانیت اور خوشی کا
ہوتا ____

اب ایک بار پھر آپ کو یادِ رسولؐ ستانے لگی تھی اسی وجہ آپ نے دوبارہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ
کا قصد کیا یہ اس دور کی بات ہے جب کسی سفر پہ نکلنا اور کامیابی کے ساتھ منزل پر پہنچنا جوئے شیر
کے مترادف ہوا کرتا تھا مگر بدیع الدین مدار راستے کی ساری مصیبتیں اور صعوبتیں برداشت کرتے ہوئے

پہنچ گئے اور وہاں پر بیعت اللہ کی جالیوں سے دیوانہ وار لپٹ کر روتے ہوئے فریاد کرنے لگے۔
"اے باری تعالیٰ! تو گواہ ہے کہ میں نے تیرے محبوب تیرے پیارے حبیبؐ کے حکم کی تعمیل اور پابندی میں کوئی کوتاہی نہیں کی اور جان و دل کے ساتھ اس مشن کو انجام تک پہنچانے کی اپنی سی پوری کوشش کی ہے اے خدائے بزرگ و برتر اب میری دلی آرزو یہی ہے کہ میری باقیماندہ زندگی بھی راہ حق کی تبلیغ میں گزر جائے میں سمجھوں گا کہ مجھے اپنی وہ منزل مل گئی ہے جس کا خواب میں نے بچپن میں دیکھا تھا۔
حضرت بدیع الدین مدار کو دنیا کے جھمیلوں اور دلچسپیوں سے کوئی غرض نہ تھی۔ شیطان نے آپ کو کئی مرتبہ بہکانے کی کوشش کی مگر آپ کی قوتِ ایمان دیکھ کر خود شیطان بھاگ جاتا تھا۔ لوگ دُور دُور سے آپ کے پاس دعائیں کروانے کی غرض سے آیا کرتے تھے جو ہر حال میں پوری ہوا کرتی تھیں۔
ایک مرتبہ ایک خاتون جس کا نام نصیبہ بی بی تھا آپ کے پاس آئیں اور زار و قطار روتے ہوئے عرض کرنے لگیں کہ حضرت میں اب تک اولاد کی نعمت سے محروم ہوں۔ آپ میرے حق میں دعا فرمائیں۔ حضرت بدیع الدین چند لمحے خاموش رہے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ گہری سوچ میں ڈوبے ہوں اور پھر انہوں نے نصیبہ خاتون کو بتایا کہ اللہ تعالیٰ اُسے اولاد کی نعمت سے ضرور سرفراز کرے گا مگر اس کے لیے اسے کم و بیش ایک سال تک انتظار کرنا پڑے گا۔ جب آپ اس خاتون سے باتیں کر رہے تھے تو آپ کا چہرہ نقاب میں چھپا ہوا تھا۔
خاتون کہنے لگی "حضرت آپ نے اپنا چہرہ نقاب میں چھپا رکھا ہے۔ میں تو ایک عرصہ سے آپ کے دیدار کی حسرت دل میں لیے ہوں۔ کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ آپ اپنے عقیدت مندوں سے اپنا چہرہ کیوں چھپاتے ہیں"۔ بدیع الدین روکھے لہجے میں کہنے لگے۔ "خاتون تم اپنے کام سے کام رکھو کیونکہ اگر میں نے چہرے سے نقاب ہٹالیا تو تمہیں پریشانی کا سامنا کرنا پڑے گا۔"
"میں اس کے لیے تیار ہوں آپ مجھے اپنا دیدار ضرور کروائیے" خاتون نے کہا۔
چنانچہ جیسے ہی بدیع الدین نے اپنے چہرے سے نقاب ہٹایا تو وہ خاتون از خود رفتہ ہو کر سجدہ ریز ہو گئیں اور کافی دیر تک مضطرب اور بے قرار ہو کر تڑپتی رہیں اور جب ہوش آیا تو واپس لوٹ گئیں۔ بدیع الدین کی پیش گوئی کے مطابق ٹھیک ایک سال بعد اس خاتون نے ایک خوب صورت بچے کو جنم دیا۔
ایک روز گرم دوپہر کی چلچلاتی دھوپ میں ایک مخبوط الحواس شخص دوڑتا ہوا آپ کے پاس آیا اور یہ بُری خبر سنائی کہ دریائے گنگا میں ایک مسافر کشتی غرق ہو گئی ہے۔ اتفاق سے اس کشتی میں آپ کے ایک ارادت مند تاجر کا کچھ قیمتی سامان رکھا ہوا تھا۔ بدیع الدین مدار نے زمین سے راکھ کی ایک مٹھی اٹھا کر اس کو دے کر فرمایا۔ جاؤ اس مٹی کو میرے اس ارادت مند تاجر کے ہاتھ پر رکھ دینا اور اسے کہنا کہ وہ اس خاک کو دریا میں ڈال کر اس سے کہے کہ وہ میری امانت واپس لوٹا دے۔ مذکورہ شخص نے وہ خاک لے جا کر آپ کے ارادت مند تاجر کے حوالے کرتے ہوئے اُسے آپ کے حکم کے بارے میں بھی آگاہ کر دیا۔ اور پھر جیسے ہی تاجر نے خاک کو دریا میں ڈالا پانی میں غرق شدہ کشتی دوبارہ پانی کی سطح پر ابھر کر تیرنے لگی۔
بدیع الدین مدار کے پاس عام آدمی ہی نہیں بڑے بڑے عالم فاضل لوگ بھی مشورے لینے آیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ شاہ فضل اللہ نے آپ سے پوچھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ایک حدیث میں درج ہے "جس نے خود کو پہچانا اس نے اللہ کو پہچانا۔" یہ فرمائیں حضرت کہ اس حدیث کا کیا مطلب کیا ہے۔؟
بدیع نے جواب میں فرمایا۔ "شاہ فضل! اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر انسان کو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ وہ کیا ہے

کون ہے کہاں سے آیا ہے کیوں آیا ہے اور اللہ تعالےٰ نے اسے کیوں پیدا کیا ہے۔ اس کے علاوہ اسے بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ نیک بختی کیا ہے اور بد بختی کیا ہے۔ پھر فرمانے لگے۔ اے عزیز! یاد رکھو کہ تمہاری بعض صفات حیوانی ہیں اور بعض شیطانی ہیں اور بعض ملکوتی مگر تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ تمہاری اصل صفات کیا ہیں رکھو کر کھانا پینا سونا فربہ ہونا اور غصہ کرنا یہ ساری حیوانی صفات ہیں اسی طرح مکر و فریب کرنا فتنہ برپا کرنا یہ سب شیطانی صفات ہیں اگر تم ان صفات کے تابع ہو جاؤ گے تو تمہیں اللہ تعالےٰ کی معرفت حاصل نہیں ہوگی۔ لیکن تم ملکوتی صفات حاصل کر لو گے تو معرفتِ خداوندی سے تمہارا قلب روشن ہو جائے گا اس لیے تمہیں کوشش کرنی چاہیے تم صفات حیوانی اور شیطانی سے نکل کر صفات ملکوتی کے حامل بن جاؤ۔ اگرچہ شاہ فضل اللہ خود بھی اہل علم تھے مگر ان کی زبانی یہ باتیں سُنکر انہیں یہ احساس ہوا جیسے ابھی وہ طفل مکتب ہوں۔

اللہ کے یہ نیک بندے جنہوں نے اپنی ساری زندگی اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں گزار دی ۲۷ جمادی الاول کو اس دار فانی کوچ کر گئے۔

کہتے ہیں کہ سکندر نے ایرانی سپاہ کے خلاف بڑی بے جگری دکھائی اور ایرانی خواتین کے ساتھ بڑی دلداری سے پیش آیا۔ وہ شجاعت سے زیادہ شرافت کے لیے ممتاز تھا۔ پلوٹارک نے کوئی پچاس بڑے آدمیوں کا حال لکھا ہے اور کئی آدمیوں کا ایک دوسرے سے موازنہ بھی کیا ہے۔ ہر شخص ایک تصویر بن کر نظروں میں گھوم جاتا ہے مگر جو خوش رنگ تصویر سکندر کی جوانی کی ہے ویسی تصویر کوئی اور نہیں۔ سکندر کے کردار سے کچھ اس قسم کا اصول وضع ہوتا ہے کہ اگر خداداد صلاحیت ہو اور اس کی تربیت ارسطو اور لیونی ڈس جیسے اساتذہ کے ہاتھوں میں ہو جائے تو دنیاوی معاملات کے بارے میں سوچنے کا انداز بالکل دوسرا ہو جاتا ہے۔ اس اندازِ نظر کو جب الفاظ میسر آتے ہیں تو وہ کچھ اس طرح کے ہوتے ہیں۔ "واحسرتا میرا باپ یوں فتوحات حاصل کرتا رہا تو میرے لیے کوئی بڑا کام نہیں رہے گا" جب باپ ایک رات کثرتِ مے نوشی سے لڑکھڑانے لگا تو بیٹے نے کہا "اہلِ مقدونیہ گواہ رہنا کہ جو شخص یورپ سے لے کر ایشیا تک سارے ملک فتح کرنا چاہتا تھا، وہ ایک میز سے دوسری میز تک نہ پہنچ سکا"۔ ایک اور موقع پر سکندر نے اعلان کیا کہ دیما ستھنیز نے پہلے مجھے نادان کہا پھر نابالغ۔ میں ایتھنز کی فصیل پر دستک دوں گا تاکہ اسے میری مردانگی کا پتہ چل جائے۔ پلوٹارک کی بدولت سکندر اور پارمینو کی وہ گفتگو بھی محفوظ ہے جو لڑائی سے پہلے دارا کی طرف سے صلح اور تحائف کی پیش کش کے بارے میں ہے۔ پارمینو نے کہا کہ اگر میں سکندر ہوتا تو یہ پیش کش قبول کر لیتا۔ سکندر نے جواب دیا کہ میں بھی اس پیش کش کو ضرور قبول کر لیتا اگر میں محض پارمینو ہوتا۔ سکندر کی فتوحات اور اس کی حاضر جوابی ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ہیں۔ وہ گفتار اور کردار دونوں کا مرد میدان تھا۔ وہ پارمینو کو لاجواب کرنے اور دارا کو شکست دینے میں کامیاب ہو گیا لیکن جب سائرس کی قبر پر نامرادی نے گھیر لیا۔ وہ دل گرفتہ ہوا کہ اس جوش و خروش اور جنگ و جدل کا انعام دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کی صورت میں مل سکتا ہے مگر اس کا انجام محض قبر کی تنہائی اور تاریکی ہوگا۔ سکندر کو سائرس نے رنجیدہ کیا اور جولیس سیزر کو سکندر اعظم نے۔ سیزر نے سکندر کا حال پڑھا تو رونے لگا کہ میری عمر تک سکندر کتنے ہی ملک فتح کر چکا تھا اور میرے اعمالنامے میں ابھی تک ایک درخشاں کارنامہ نہیں ہے۔ جولیس سیزر کا یہ جملہ میں نے پڑھا اور میں بھی آزردہ ہوا۔ سکندر اعظم کی سوانح کا ایک استعمال جولیس سیزر نے کیا تھا اور دوسرا ان فقیروں نے جو خیرات مانگتے ہوئے صرف اتنا یاد دلاتے ہیں کہ "سکندر جب گیا دنیا سے دونوں ہاتھ خالی تھے" جن ہاتھوں نے دنیا بھر سے مال وصول کیا، ان کے حوالے سے یہ لوگ خیرات مانگتے ہیں کیونکہ افراد اور اقوام واقعات سے ہمیشہ اپنے مزاج کے مطابق سبق حاصل کرتے ہیں۔

"آوازِ دوست" صفحہ
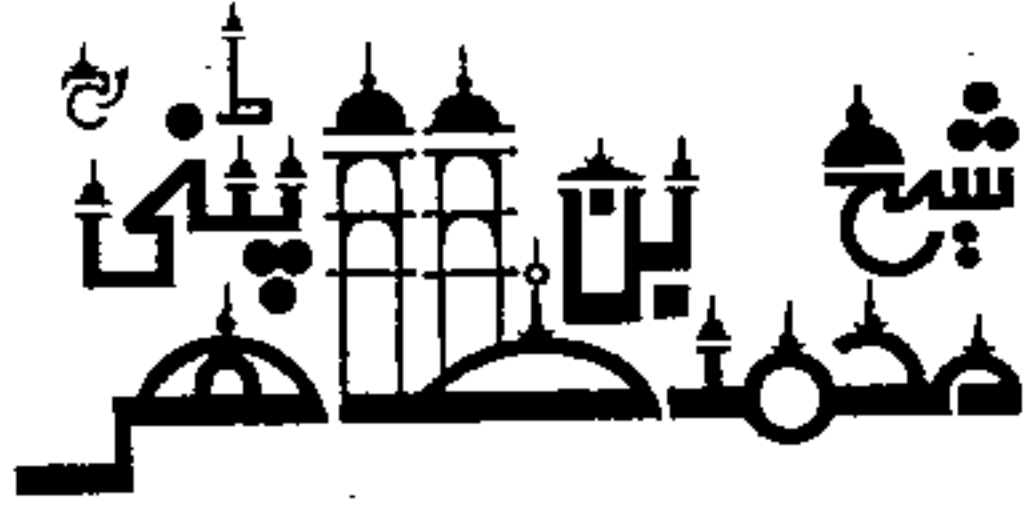
ماضی میں عموماً لوگ تجارت کا پیشہ اختیار کرتے تھے اور یہی لوگ زیادہ تر ساحلی علاقوں میں رہائش پذیر تھے۔
ووں کی نظر میں یہ لوگ بیوپاری سمجھے جاتے تھے۔ یہ بیوپاری خالص ہندو بھی تھے اور سُنی بھی شیعہ بھی، عراقی اور
ن بھی اور خالصتاً عرب بھی۔ ان بیوپاریوں کا کاروبار یمن، جدّہ، مکّہ، طائف، بصرہ اور افریقی ساحلی علاقوں اور
وں تک پھیلا ہوا تھا۔ ہندو اِن کو بیوپاری کہتے تھے مگر زمانہ — گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ بیوپاری سے
رے ہو گئے اور آج اِن بیوپاریوں کو بوہرے کہا جاتا ہے۔ یہ جن اشیاء کی تجارت کیا کرتے تھے ان میں کاغذ،
ب، مختلف قسم کے کپڑے، اسلحہ جات اور نیل شامل ہیں۔ اسلحہ جات میں وہ تلوار، کٹار اور خنجر وغیرہ کی تجارت
تے تھے۔

پٹن میں علی نامی ایک شخص سُنی بوہروں میں بہت مشہور تھا۔ اس شخص کے دو بیٹے تھے۔ اور یہ تجارت کے لحاظ
بہت کامیاب تھا کیونکہ اس کی تجارت بہت دُور دُور تک پھیلی ہوئی تھی۔ علی کی وفات کے بعد اُس کے بیٹے
ہر نے کاروبار کو سنبھالا اور اپنے ہم عصروں میں مشہور ہوتے۔ اس طرح طاہر نے خوب محنت کر کے اپنے باپ کے
وبار کو بڑی ترقی دی۔

✖

چند عالم بیٹھے ہُوتے شیخ محمدّ کے متعلق باتیں کر رہے تھے۔ شیخ محمدّ نے چونکہ کم سنی میں قرآن حفظ کرنے کے علاوہ
دُوسرے علوم بھی سیکھ رکھے تھے اس لیے یہ عالم آپ کے علم کی وجہ سے حسد کی آگ میں جل رہے تھے۔ ایک عالم
"مجھے تو اس کے علم میں کوئی خاص بات نظر نہیں آتی۔"
دوسرے عالم نے جواب دیا "مَیں تو اس میں خاص بات دیکھ رہا ہوں مگر نہ جانے آپ لوگوں کو وہ بات نظر
ں نہیں آتی۔" ایک اور عالم نے پوچھا "کون سی بات؟"
پہلے نے جواب دیا "بھئی آپ کو معلوم نہیں شیخ محمدّ کے باپ کتنے بڑے بیوپاری ہیں اور اُن کا کاروبار کتنا پھیلا

ہوتا ہے۔ کیا وہ اپنی دولت کے بل بوتے پر نااہل کو اہل اور اہل کو نااہل نہیں بنا سکتے۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ شیخ محمد کو اُن کے باپ کی دولت نے اتنا مشہور کر دیا ہے ورنہ ان میں تو ایسی کوئی خاص علم والی بات نظر نہیں آتی۔ آخر کار ان لوگوں نے مل کر پروگرام بنایا کہ وہ اس کم سن شیخ محمد سے ملاقات کر کے اس کے علم اور ذہانت کا امتحان لیں گے۔

شیخ محمد کے والد سے اجازت لے کر یہ عالم شیخ محمد سے ملے۔ جب یہ لوگ اُن کے پاس پہنچے تو شیخ محمد مراقبہ کی حالت میں تھے۔ اس لیے انہوں نے انتظار کیا کہ شیخ مراقبہ سے نکلیں اور یہ بات شروع کریں۔ تھوڑی دیر کے بعد پندرہ سالہ شیخ محمد مراقبے سے نکلے اور آنکھیں کھول کر اُن عالموں سے کہنے لگے: "جی صاحبان کیا میں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ میں اس وقت کا بہت بڑا عالم ہوں یا میں نے یہ کہا ہے کہ میں ایک غیر معمولی انسان ہوں۔ مگر پھر بھی مجھے اس بات کا اقرار ہے کہ مجھ میں جو کچھ بھی۔ ہے وہ سب میرے خدا کا ودیعت کردہ ہے اور اس کے لیے میں اپنے خدا کا شکر گزار ہوں۔"

ایک صاحب علم بولے "جناب کیا آپ کو یہ بات ناممکن نہیں معلوم ہوتی کہ جو علم ایک شخص تیس چالیس سالوں میں حاصل کرتا ہو وہی علم کوئی دوسرا شخص سات آٹھ سال میں حاصل کر لے؟"

شیخ محمد نے جواب دیا "اس بات سے تو آپ سب اتفاق کریں گے کہ دنیا میں کوئی بھی چیز ناممکن نہیں ہے اور یہ بات آپ لوگوں کو بھی معلوم ہوگی کہ کسی شیرخوار نے کسی مرد بزرگ کی اپنی زبان سے فضیلت بیان کر دی حالانکہ آپ لوگوں کے اندازِ فکر کے مطابق کسی شیرخوار کا یوں باتیں کرنا یا گواہی دینا بعید از قیاس و عقل ہے۔

علماء یہ جواب سُن کر لاجواب ہو گئے مگر پھر بھی اپنی ہٹ دھرمی کو نہ چھوڑا۔ پھر اُن میں سے ایک نے پوچھا "میاں صاحبزادے! تم خود کو ہمارے درمیان کیسا محسوس کر رہے ہو؟" آپ نے فوراً جواب دیا "خدا کا ایک عاجز بندہ"۔

یہ سُن کر وہ عالم کھسیا سا گیا اور کہنے لگا "بیٹے تمہارے دودھ کے دانت ٹوٹ چکے ہیں یا ابھی باقی ہیں؟" اس بات پر آپ کو غصہ آ گیا مگر خود پر قابو پاتے ہوتے فرمایا "یہ کس قسم کا سوال آپ پوچھ رہے ہیں؟ میاں صاحبزادے اتنی زیادہ کم سنی میں فضلا اور علما جیسی روش اور طور طریق اختیار کرنا کہاں کی عقلمندی ہے؟" اُن میں سے ایک نے کہا۔ آپ نے جواب دیا "میں نے تو کسی عالم یا فاضل کی روش اختیار نہیں کی بلکہ میں نے جو علم حاصل کیا ہے اس کے مطابق میں گفتگو کے دوران آپ کے سوالات کے جواب دیتا رہا ہوں اور اس کو آپ کسی فاضل کی نقالی تو نہیں کہہ سکتے۔ آپ مجھ سے معقولات اور منقولات کے متعلق گفتگو کیجیے۔ میں یہ بات فخر یہ نہیں کہتا مگر میں خود کو کسی سے کم نہیں دکھاؤں گا۔"

علما یہ سُن کر زور زور سے ہنسنے لگے۔ ایک نے کہا "ہم تم جیسے لڑکے سے علمی موضوعات پر بات کر کے خود کو ذلیل نہیں کروانا چاہتا۔" آپ نے فرمایا "جیسی آپ صاحبان کی مرضی۔ میں آپ لوگوں سے ایک بار پھر درخواست کروں گا کہ مجھے آپ لوگ وہ نہ سمجھیں جو میں ہو سکتا ہوں۔ بہرکیف اب میں آپ لوگوں کی دسترس میں نہیں آ سکتا۔ میں اپنے خدا کا شکر گزار ہوں جس نے مجھے اتنی کم عمری میں یہ مقام عطا فرمایا۔"

✕

یہی شیخ محمد مشہور بیوپاری علی کے پوتے اور شیخ طاہر کے بیٹے تھے جنہوں نے بعد میں بھی اپنے باپ کے کاروبار کو سنبھالا دیا اور اُسے پروان چڑھایا۔ جب شیخ محمد کی پیدائش ہوئی تو شیخ طاہر نے دیکھا کہ آپ کی پیشانی نہایت کشادہ اور روشن ہے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ نومولود کوئی معمولی آدمی نہیں بلکہ ایک غیر معمولی ذات ہے۔ آپ کی پیدائش

...ں ہوئی۔ شیخ طاہر آپ کو پٹن کے مشہور نجومی کے پاس لے گئے۔ یہ نجومی علم نجوم میں ماہر تھا اور جنم کنڈلی بنانے کا ...ی کامل تھا۔

نجومی نے بچے کو دیکھتے ہی کہا "یہ بچہ تاجر یا بیوپاری نہیں ہو سکتا بلکہ اگر اس نے سعادت مندی کی راہ اختیار ...تو فضل و کمال کی بلندیوں کو چھو لے گا اور خدا تعالیٰ کا قرب حاصل کرے گا اور اس کمال درجہ کو پہنچے گا کہ بڑے بڑے ...ل کامل ان کی ہمسری کو ترسیں گے۔"

پھر بعد میں دیکھنے والوں نے دیکھا کہ ایک بیوپاری کا بیٹا صرف اور صرف خُدا کی رضا کی خاطر کس طرح اتنی بڑی دولت ...ٹھکرا دیتا ہے۔ باپ نے بھی جب نجومی سے یہ سب باتیں سُنیں تو انہوں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنے بیٹے کو اعلیٰ تعلیم ...دلائیں گے اور اسے بڑا آدمی بننے میں اس کی مدد کریں گے۔ پٹن شہر جس میں شیخ طاہر رہائش پذیر تھے اس پٹن ...شہر سے علیحدہ ہے جو آج کل پاک پٹن کہلاتا ہے۔ یہ پٹن تو ہندوستان کے صوبہ گجرات میں واقع ہے اور تاریخ ...میں نہروالہ کہلاتا تھا۔

بچے کا نام محمد رکھا گیا تھا۔ جس زمانے میں شیخ محمد پیدا ہوتے اس وقت بہت سے مشہور استاد موجود تھے اُن ...میں مولانا شیخ ناگوری، شیخ برہان الدین سمہودی، ید اللہ سوہی اور مُلّا منتہ بہت زیادہ مشہور تھے۔ جب اساتذہ نے ...آپ کی اکتسابی صلاحیتوں کو دیکھا تو فرطِ حیرت میں پڑ گئے اور آپ کے والد سے کہا "جناب ہم نے تو ایسا ذہین فطین ...اور رسا بچہ آج تک نہیں دیکھا۔ خُدا اسے نظرِ بد سے بچائے۔"

شیخ محمد نے پندرہ سال ہی کی عُمر میں علومِ نقلیہ اور عقلیہ سے فراغت حاصل کر لی اور دوسروں کو درس دینا شروع ...کر دیا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ آپ کی زیارت کے لیے بہت سے علما۔ اور فضلا۔ دُور دُور سے آیا کرتے تھے۔ ...جب کبھی بھی آپ کا دل بے چین ہوتا تو بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ وضو کرتے اور دو رکعت نماز ادا کرتے پھر ...درگاہِ ایزدی میں سربسجود ہو کر خدا کا شکر ادا کرتے۔ آپ اکثر دُعا مانگا کرتے "اے خُدا مجھے اس قابل کر کہ میں دوسروں ...کو علم و فنون پہنچانے میں بخل سے کام نہ لوں اور جہاں تک میری رسائی ہو میں لوگوں کو علوم سے مالا مال کر دوں ...اور ایک جاری و ساری چشمے کی طرح مستحق لوگوں کو فیض یاب کرتا رہوں۔

اتنا علم حاصل کرنے کے بعد بھی آپ کو تشنگی محسوس ہوتی تو ایک عالم نے آپ کو مشورہ دیا "صاحبزادے! آپ حجاز ...تشریف لے جائیں وہاں آپ کو ایک سے ایک بڑھ کر جید عالم ملیں گے۔ آپ وہاں جا کر اپنی تشنگی مٹا سکتے ہیں۔

آپ نے اُن عالم کی بات کا اثر لیا اور فوراً سورت سے ایک جہاز پکڑ کر جدہ روانہ ہو گئے۔ پھر وہاں سے آپ ...مکہ معظمہ کے لیے روانہ ہوتے اور وہیں قیام کیا۔ کچھ عرصہ بعد حج کا مہینہ آ گیا۔ آپ نے حج کیا، خانہ کعبہ کا طواف کیا، ...حجرِ اسود کو بوسہ دیا اور غلافِ کعبہ کو پکڑ کر دُعا مانگنے لگے "یا رب العالمین! تو طاقت والا ہے جبکہ میں ایک کمزور ...اور ناتواں شخص ہوں اور تیرے اختیارات کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ یا خدا! مجھ ناتواں میں اتنی قوت اور طاقت عطا ...فرما دے کہ اگر لوگ میرا نام سنیں تو حقیقت کا اعتراف کر لیں۔" پھر آپ مدینہ منوّرہ تشریف لے آتے۔ روضۂ رسولؐ ...پر حاضری دی اور دیر تک بیٹھے آنسو بہاتے رہے اور یہاں بھی مذکورہ بالا نوعیت کی دُعائیں مانگیں۔

آپ نے مکہ میں استادوں کی تلاش شروع کر دی تاکہ علمِ باطن پر بھی دسترس حاصل کر سکیں۔ آپ کے مکی استادوں ...میں ابو عبید اللہ زبیری، شیخ عبید اللہ حضرمی، شیخ جار اللہ فہد مکی، شیخ ابو الحسن، سید عبد اللہ عیداس عدنی، شیخ علی ابن ...عراقی مدنی شامل ہیں۔ ان کے بعد آپ کے علم کی تکمیل شیخ ابن حجر اور شیخ علی متقی نے کی۔ شیخ علی متقی حدیث اور ...تصوف میں جبکہ شیخ ابن حجر مکی حدیث میں روشنی کے مینار رہ چکے تھے۔

شیخ علی متقی کے والد حسام الدین تھے جو" جون پور" کے رہنے والے تھے۔ پھر یہ جون پور سے مالوے کے شہر پانڈو میں آگئے اور وہیں سکونت اختیار کی۔ مگر آپ کے بیٹے شیخ علی متقی نے مکہ معظمہ میں سکونت اختیار کی۔ شیخ محمد بن طاہر نے آپ کو دوسرے کی نسبت افضل اور برتر پایا۔ اسی لیے ایک دفعہ آپ سے کہنے لگے "حضرت میں چاہتا ہوں کہ آپ کے اور میرے درمیان ایسا رشتہ قائم ہو جائے جو ہمیشہ قائم رہے۔"

شیخ علی متقی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "میں خوب سمجھتا ہوں کہ تو کیا چاہتا ہے اور خوب سمجھتا ہوں اور میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ تیرے ساتھ ایسا ہی رشتہ قائم ہو جائے۔" پھر شیخ محمد نے علی متقی کے ہاتھ پر بیعت کی۔ بعد میں مرشد نے شیخ محمد سے کہا "اب تو واپس وطن چلا جا اور وہاں جا کر علم کو عام کر دے۔"

شیخ محمد فوراً اپنے مرشد کے کہنے پر اپنے وطن پٹن واپس پہنچے مگر یہاں آکر معلوم ہوا کہ آپ کے والد محترم شیخ طاہر وفات پا چکے ہیں اور تمام ترکہ کے آپ اکیلے ہی وارث چھوڑ گئے ہیں۔ شیخ محمد کو اس بات کا بہت دکھ ہوا۔ رشتہ داروں نے کہا "شیخ محمد اب آپ کو یہ سارا کاروبار سنبھالنا پڑے گا۔" آپ نے جواب دیا "مجھے اس کاروبار سے کیا حاصل ہوگا جو میں اس کاروبار کو آگے چلاؤں۔" رشتہ داروں نے کہا "آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ ہماری سمجھ میں آپ کی بات نہیں آتی۔" آپ نے دوبارہ سمجھانے کے سے انداز میں فرمایا "یہ کاروبار میرے باپ سے پہلے میرے دادا کے پاس تھا جو ساری عمر اس کاروبار میں پھنسے رہے۔ انہیں اس کاروبار سے کیا حاصل ہوا پھر میرے والد نے اس کاروبار کو سنبھالا اور وہ بھی اپنے باپ کی طرح ساری عمر اسی کاروبار میں لگے رہے مگر نتیجہ وہی لاحاصل اب میں ان کے اس فعل کو نہیں دہراؤں گا۔ کیونکہ اب میں کسی سراب کے پیچھے نہیں بھاگوں گا۔"

رشتہ داروں نے پوچھا "پھر آپ اس کاروبار کا کیا کریں گے؟"

"میں اس کاروبار کو ایسی جگہ صرف کروں گا جہاں سے مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نفع ہو۔ اور یہ نفع مجھے دنیا میں بھی ملے اور آخرت میں بھی حاصل ہو۔" آپ نے نہایت تحمل سے جواب دیا۔ پھر آپ سے کسی نے پوچھا "یہ کیسے ممکن ہے؟" آپ نے فرمایا "میں اس دولت کو ناداروں اور یتیموں کی تعلیم پر خرچ کروں گا اور جب تک یہ لوگ علم حاصل کرتے رہیں گے اور دوسروں تک پہنچاتے رہیں گے تب تک میرے نامۂ اعمال میں نیکیوں کا اندراج ہوتا رہے گا۔"

❖

اب آپ کے گرد طلبا کی بھیڑ لگ گئی جن میں بہت سے نادار طلبا تھے۔ کچھ تو اتنے نادار اور مفلس تھے کہ انہیں دو وقت کی روٹی بھی مشکل سے میسر آتی تھی۔ آپ نے محسوس کیا کہ طلبا میں کچھ ایسے بھی لڑکے ہیں جو ذہین تو بہت ہیں مگر غیر حاضریاں کم نہیں کرتے۔ پہلے تو آپ ان کی غیر حاضریاں برداشت کرتے رہے مگر جب پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا تو آپ نے اپنے خادم کو حکم دیا کہ جو طلبا غیر حاضریاں کرتے ہیں انہیں کسی خاص وقت میرے روبرو پیش کر دو۔ چنانچہ خادم نے حکم کی تعمیل کی اور تمام غیر حاضر رہنے والے لڑکوں کو آپ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ سب طلبا استاد کے حجرے میں داخل ہوتے تو شیخ محمد نے فرمایا "نوجوانو! کبھی کسی کام سے نہ گھبرانا، کبھی ہمت نہ ہارنا اور کسی نیک کام میں کبھی بھی نہ شرمانا۔" تمام لڑکوں نے اس عہد پر قائم رہنے کا وعدہ کیا کہ وہ تکمیل علم سے پہلے کہیں نہیں جائیں گے۔ ان لڑکوں میں سے ایک طالب علم آگے بڑھا اور شیخ محمد سے کہنے لگا "حضرت میں دوسرے لڑکوں کے بارے میں تو نہیں کہہ سکتا مگر اپنی بابت یہ ضرور کہوں گا کہ میں اب آپ سے مزید نہیں پڑھ سکتا۔" آپ نے پوچھا "کیوں بھئی تو کیوں نہیں مجھ سے پڑھنا چاہتا۔ اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟" لڑکا کہنے لگا "حضرت صاف بات تو یہ ہے کہ میں اپنے سات بہن بھائیوں کا اکیلا کفیل ہوں۔ اگر میں ادھر پڑھنے آگیا تو ان کی کفالت

کون کرے گا۔" آپ نے کہا۔"میں اُن کی مدد کر سکتا ہوں، تُو مجھے اپنے مہینے کا حساب سمجھا دے۔" لڑکے نے سارا حساب کتاب سمجھا دیا۔ آپ نے تمام اخراجات کا حساب لگایا پھر فرمایا۔" اب تیرے گھر والوں کی ذمہ داری مجھ پر ہے میں اُن کی کفالت کروں گا تُو سکون سے اپنی تعلیم کو جاری رکھ۔" اس کے بعد آپ نے اعلاناً فرمایا" جو طالب علم اپنے گھر والوں کے کفیل ہیں وہ آکر مجھے اپنے گھریلو اخراجات کی تفصیل پیش کریں تاکہ میں اُن کا ماہانہ بھی مقرر کر دوں اور سب طالب علم یکسوئی کے ساتھ اپنی تعلیم کو جاری و ساری رکھیں۔"

یہ اعلان سُن کر تقریباً تیس بتیس طالب علم آپ کے پاس آئے اور آپ کی خدمت میں اپنے اپنے گھریلو ماہانہ اخراجات کی تفصیل رکھی۔ آپ نے وہ تفصیلیں اپنے پاس رکھ لیں اور اگلے روز تفصیل کے مطابق طلبا کو رقوم ادا کر دیں۔ اب تمام طالب علم نہایت انہماک کے ساتھ اپنی تعلیم پر توجہ دے رہے تھے۔ جب یہ سارا واقعہ مالدار طالب علموں تک پہنچا تو وہ سب بہت حیران ہوئے" کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے؟"

آپ نے ان طالب علموں کے دلوں کا حال کشف سے معلوم کر لیا۔ پھر اُن مالدار طالب علموں سے فرمایا" میرے دوستو! تم مالدار ہو، خُدا نے تمہیں جو کچھ دیا ہے اس پر اُس کا شکر ادا کرو اور اُس دولت کی موجودگی میں کچھ مت سوچو اور مستعدی سے علم حاصل کرتے رہو۔"

مالدار طلبا یہ سُن کر شرمندہ ہو گئے اور پھر نادار طلبا کی طرح سوالوں اور فکروں سے پیچھا چُھڑا کر تحصیل علم میں لگ گئے۔

✠

ایک بار آپ پٹن سے احمد آباد جانے لگے تو شاگردوں نے پوچھا" حضرت! یہ آپ احمد آباد کیوں جا رہے ہیں؟" آپ نے جواب دیا" احمد آباد میں پٹن کے مقابلے میں زیادہ امراء اور حکام پائے جاتے ہیں میں اُن سے مل کر اُن کا تعاون حاصل کر کے اپنا کام آگے بڑھاؤں گا۔"

آپ نے احمد آباد پہنچ کر بہت سے امرا اور ارکین سلطنت کو اپنی طرف راغب کرنا چاہا مگر انہوں نے دل شکن لہجے میں کہا" حضرت! یہ آپ خواہ مخواہ کن چکروں میں پڑے ہوتے ہیں۔ جا کر اپنا کام کریں اور ہمیں بھی اپنا کام انجام دینے دیں۔

آپ نے فرمایا" حضرت! آپ کا ایمان کہاں گیا، آپ کی دینی حمیت کہاں گئی؟ خُدا کے لیے میری باتوں پر دھیان کیجئے کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کہیں کے بھی نہ رہیں اور آپ سب کو ذلت کا سامنا کرنا پڑے۔"

تمام لوگوں نے شاید آپ کی بات پوری طرح نہیں سُنی تھی۔ کیونکہ انہوں نے اپنے کانوں میں اُنگلیاں ڈے دی تھیں۔ آپ نے پھر فرمایا۔" نہ جانے اِن لوگوں کا کیا حشر ہونے والا ہے۔"

آخر ایک امیر نے کہا" جناب! آپ یہ نہیں دیکھ رہے کہ ہمارے اِردگرد خانہ جنگی ہو رہی ہے ہم سب اس کی وجہ سے پریشان ہیں اور ہمارا ذہن اُسی طرف لگا ہوا ہے۔ جب تک ہم اس پریشانی سے نہیں نمٹ لیتے اس وقت تک آپ کی باتوں پر دھیان نہیں دے سکتے۔" یہ سارا ماجرا دیکھ کر آپ مایوس ہوئے اور واپس پٹن لگئے اور یہاں آکر دوبارہ رشد و ہدایت، پند و نصائح اور وعظ و ارشادات کا سلسلہ شروع کر دیا۔

مہدوی آپ کو دھمکیاں دینے لگے کہ اپنے قلم اور زبان کو قابو میں رکھیں ورنہ ایسا سبق سکھائیں گے کہ آپ یاد رکھیں گے مگر آپ کے سر پر جُوں تک نہ رینگی اور اپنا کام خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے۔

ایک دن علی الصبح آپ کے شاگرد اور مرید آپ کے پاس آئے تو یہ دیکھ کر بے حد پریشان ہوئے کہ آپ سر سے

ننگے ہیں اور پگڑی بھی غائب ہے۔ ایک شاگرد نے پوچھا "حضرت آپ کی دستار مبارک کو کیا ہوا۔ خیریت تو ہے" آپ نے جواب دیا" خیریت ہی تو نہیں ہے۔ میں کافی عرصے سے محسوس کر رہا ہوں کہ یہ قوم میری بات بالکل نہیں سُننی اور راہ راست سے بھٹکتی جا رہی ہے۔ پھر اس دستار کا کیا فائدہ۔ یہ فضول چیز جو علمی برتری کی علامت تھی میں نے اتار دی ہے کیونکہ میں نے دیکھ لیا ہے کہ مجھ میں اور ایک عام آدمی میں کوئی فرق نہیں رہا" یہ جواب سُن کر شاگردوں کو دلی صدمہ پہنچا اور انہوں نے رنج کا اظہار کیا۔

دوسری طرف اکبر آباد، جو آج کل آگرہ ہے، میں مغل فرمانروا اکبر کی نظریں گجرات کی طرف لگی ہوتی تھیں وہ اس پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ سلطان مظفر گجراتی کا وزیر (اعتماد خان) اکبر کو گجرات پر حملے کی دعوت دے چکا تھا جب اکبر اس بات سے مطمئن ہو گیا کہ وزیر ہمارے ساتھ چکر نہیں کھیل رہا تو اس نے گجرات کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ مالوے سے پیش قدمی کر کے اس نے پٹن پر قبضہ کر لیا پھر احمد آباد پر قبضہ کر لیا اور آخر میں گجرات نے بھی اکبر کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔

اکبر نے پٹن میں علمائے دین سے ملاقاتیں کیں۔ اس نے جب شیخ محمدؒ کو ننگے سر دیکھا تو بہت حیرانی سے پوچھا "حضرت آپ ننگے سر؟"

آپ نے جواب دیا" دستار سر پر باندھنے کا کیا فائدہ جب کوئی میری بات نہیں مانتا اور میری بات نہ ماننے کا مطلب ہے کہ کوئی مجھے عالم نہیں سمجھتا جس کی فرمانبرداری قرآن و حدیث کی رُو سے نائب رسول ہونے کی حیثیت سے ضروری ہے۔" اکبر نے جب یہ سب باتیں سُنیں تو فوراً آپ کی دستار مبارک طلب کی اور آپ کے سر پر باندھ دی پھر کہا۔ "حضرت آپ بالکل فکر نہ کریں آئندہ سے شرعی اور مذہبی امور پر صرف آپ سے ہی مسائل دریافت کیے جائیں گے اور پھر آپ کے کہنے کے مطابق ہی تمام معاملات طے پاتے جائیں گے۔"

گجرات اب سلطنتِ مغلیہ کا صوبہ بن چکا تھا اور اکبر نے خان اعظم مرزا کو اس صوبے کا گورنر مقرر کیا۔ شیخ محمدؒ کے ناظمِ گجرات (گورنر) سے بہت اچھے تعلقات قائم ہو گئے۔ مگر خانِ اعظم مرزا زیادہ عرصہ تک گجرات کے ناظم نہ رہے اور اکبر نے انہیں واپس اکبر آباد (آگرہ) بلا لیا اور ان کی جگہ بیرم خان کے بیٹے عبدالرحیم خان کو گجرات کا ناظم مقرر کر دیا۔ اس نے گجرات آتے ہی آپ پر واضح کر دیا کہ وہ مذہبی معاملات میں غلو اور بہت زیادہ شدت کو برداشت نہیں کرتا۔

شیخ محمدؒ نے یہ سُنا تو فرمایا" غلو اور زیادہ شدت۔ یعنی اس طرح آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟" عبدالرحیم خان خاناں نے جواب دیا "میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ گجرات کی تمام رعایا اکبر شہنشاہ کی ہے اور یہ کسی بادشاہ کو زیبا نہیں دیتا کہ وہ اپنی رعایا میں تفریق کرنے لگے۔"

آپ نے فرمایا" یہ فرق میں یا تم تھوڑی کر رہے ہیں یہ فرق تو رسول اللہ ﷺ نے قائم کیا تھا۔" خان خاناں نے جواب دیا" ہو سکتا ہے محترم آپ ٹھیک فرما رہے ہوں مگر میں اس پر عمل پیرا نہیں ہو سکتا اور نہ ہی کسی دوسرے کو اس پر عمل کرنے کی اجازت دوں گا۔"

آپ کو عبدالرحیم کی یہ بات سُن کر غصہ آ گیا فرمایا "تو کیا یہاں ہمارا ساتھ کوئی نہیں دے گا۔ کیا آسمان سے فرشتے اتریں گے ہماری مدد کے لیے؟"

خان خاناں نے کہا" لہٰذا ہماری گفتگو ختم ہو چکی ہے اب آپ یہاں سے چلے جائیں اور پھر کسی وقت تشریف لائیں تاکہ آپ سے کسی دوسرے موضوع پر بات چیت ہو سکے۔" آپ نے فرمایا" میں یہاں ضرور آؤں گا مگر گفتگو

ی موضوع پر ہو گی"۔
کچھ دنوں کے بعد اکبر نے عبدالرحیم کو اپنے پاس بلایا پھر وزیر خان کو ناظم خانِ خاناں عبدالرحیم کا نائب بنا کر
رات بھیجا۔ شیخ محمدؒ نے فوراً اُن سے رابطہ قائم کیا۔ مگر وزیر خان نے کہا "جناب میں یہاں خانِ خاناں کا نائب
ں اور یہ نیابت شاید زیادہ دن نہ چل سکے۔ اس لیے عرض ہے کہ آپ میرے بعد آنے والے سے رجوع کریں"۔
پ نے سوچا یہ مسلموں کو کیا ہو گیا ہے، یہ کیوں نہیں سیدھے سے بات سمجھتے"۔
کچھ عرصہ بعد وزیر خان کو بھی واپس بُلا لیا گیا اور گجرات میں شہاب الدین احمد کو ناظم مقرّر کر دیا۔ آپ شہاب الدین احمد
ے جا کر ملے اس سے اپنا مقصد بیان کیا۔ شہاب الدین خاموش ہو گئے۔ آپ نے فرمایا "تو چُپ کیوں ہے؟
ا ساتھ کیوں نہیں دیتا تیرے بادشاہ اکبر نے میری تائید کی ہے"۔
شہاب الدین نے کہا "حضرت جی اب میں آپ کو کیا جواب دوں؟ میں تو آپ کا ساتھ دینا چاہتا ہوں مگر میں
ر بادشاہ کا ملازم ہوں، میرے پیچھے میرا کنبہ ہے اس کا مستقبل ہے۔ البتہ اگر اکبر بادشاہ کی تائید آپ کے
یا مل حال رہی تو میں ضرور آپ کا ساتھ دوں گا چاہے مجھے اس کے لیے اپنی جان ہی کیوں نہ دینی پڑے"۔
آپ نے فرمایا "شہنشاہ اکبر نے میرے سر پر اپنے ہاتھ سے دستار رکھی تھی اور مجھے شیخ الاسلام کا منصب سونپا
ھا۔ اس کی تائید بھی میرے منصوبے میں شامل ہے"۔ شہاب الدین نے جواب دیا "میاں جی! میں کچھ دن پہلے
ی تو وہاں سے آیا ہوں اس لیے مجھ سے بہتر کون جانے گا کہ بادشاہ اکبر کیا چاہتا ہے اور کیا نہیں چاہتا اور آپ کے
س حد تک ہم خیال ہو گا"۔
آپ نے حیرت سے فرمایا "تم کیا کہنا چاہتے ہو شہاب؟ کیا بادشاہ بھی گمراہوں میں شامل ہو گیا ہے؟ ---
شہاب الدین نے جواب دیا "میں کہہ نہیں سکتا کیونکہ میرے مُنہ سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ، جو بادشاہ کے متعلق
و، اس کا حساب دینا ہو گا۔ اس لیے میری گزارش ہے کہ آپ خود اکبر آباد تشریف لے جائیں اور جو کچھ میں کہہ
ہیں سکتا وہ خود جا کر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں"۔
آپ نے جب یہ سُنا تو شہاب الدین کا مفہوم سمجھ گئے اور بہت رنجیدہ خاطر ہوئے۔ آپ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ
ہم سب پر رحم فرمائے۔ میں اکبر آباد ضرور جاؤں گا اور اکبر بادشاہ سے مل کر اس کی اصلاح کی کوشش کروں گا۔
دا مجھے ہمّت اور حوصلہ عطا فرمائے"۔ پھر آپ نے آسمان کی طرف منہ کیا اور دُعا فرمائی "یا رب العالمین! مجھے
رداشت اور ہمت عطا فرما تاکہ میں حق کے لیے آگے بڑھوں اور باطل کو روک سکوں"۔
اس کے بعد آپ پہلے گھر تشریف لائے۔ گھر پہنچے تو وہاں ایک شخص، جو حجاز سے آیا تھا، آپ کا انتظار کر رہا تھا۔
اُس شخص نے آپ کو آپ کے پیرو مُرشد سید علی متقی کا خط دیا۔ جس پر لکھا تھا:
مولانا محمد طاہر! احمد خُدا اور نعت رسول کے بعد علی متقی بن حسام تم سے ایک ضروری بات کہنا چاہتا ہے۔
اللہ تعالیٰ جو لپسند کرے اُس کے کرنے کی توفیق فرمائے۔ میں نے ایک خواب دیکھا کہ میں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم
سے دریافت کر رہا ہوں کہ یا حضرت اس زمانے میں افضل کون ہے؟ آپؐ نے جواب دیا "تو ہے"۔ میں نے پھر
پوچھا "تو میرے بعد؟" فرمایا گیا "مولانا شیخ محمد طاہر ہندوستانی"۔ میں نے پوچھا "مولانا محمد طاہر کے بعد؟" آپؐ نے
فرمایا "شیخ عبدالوہاب"۔
پھر میں جیسے ہی خواب سے بیدار ہوا تو پتہ چلا کہ شیخ عبدالوہاب میرا انتظار کر رہے ہیں۔ میں نے انہیں اپنے
حُجرے میں بُلا لیا۔ وہ کہنے لگے "جناب والا! کچھ دیر پہلے میں نے حضورؐ کو خواب میں دیکھا ہے۔ آپؐ فرما رہے تھے۔

اس زمانے میں سب سے زیادہ افضل تین اشخاص ہیں۔ شیخ علی متقی، دوسرے محمد طاہر اور تیسرے شیخ عبدالوہاب میں نے سوچا کہ آپ کو یہ خوشخبری سنا دوں۔"

چنانچہ جب وہاب نے بھی میرے خواب کی تائید کر دی تو کچھ شبہ نہ تھا کہ میں اس خواب کو غلط سمجھوں۔ اس لیے میں بہت خوش ہوں کہ ہم تینوں کی عاقبت بخیر ہے۔

شیخ محمد طاہر نے یہ خط پڑھا تو بہت مسرت ہوئی۔ مگر آپ آگرے جانے کے لیے بے چین تھے۔ آپ کو نہ گھر میں چین تھا اور نہ باہر سکون۔ آپ گھومتے پھرتے تالاب کو نکری پہنچے اور یادگار کے طور پر وہاں املی کا ایک بیج بو دیا۔ دوسرے دن جب وہاں پہنچے تو یہ دیکھ کر انتہائی مسرت ہوئی کہ املی کا پودا رات ہی میں نمودار ہو گیا ہے۔

آپ نے خود سے کہا "اے ابن طاہر! اپنی کوشش جاری رکھ خدا کسی کی محنت رائیگاں جانے نہیں دیتا۔ تو مایوس نہ ہو تیری اصلاح و تجدید کی کوششیں بھی کسی نہ کسی دن رنگ لائیں گی۔ اس کے بعد آپ فوراً آگرہ جانے کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ آپ نے اپنی دستار ایک بار پھر اتار دی تھی اور ننگے سر ہی آگرہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں مالوہ پہنچے اور سارنگ پور میں اپنے ایک شاگرد شیخ حاجی محمدؐ کے ہاں قیام کیا۔ یہ ۹۸۶ھ کا سال تھا۔ شاگرد نے استاد کی بے حد خاطر مدارت کی اور جب اسے یہ معلوم ہوا کہ استادِ محترم آگرہ میں صلاح و تجدید کے لیے جا رہے ہیں تو کچھ پریشان ہوتے اور کہا "حضرت! کیا آپ کو یہ یقین ہے کہ صلاح و تجدید کے سلسلے میں بادشاہ اکبر آپ کی ہر ممکن مدد کرے گا؟"

آپ نے جواب دیا "یہ مجھے معلوم نہیں ہے کہ وہ میری مدد کرے گا یا نہیں۔ مگر میں اپنا ارادہ بدل نہیں سکتا۔"

آپ کا یہ جواب سُن کر شاگرد نے کہا "استادِ محترم! وہاں پر تو بادشاہ خود گمراہ ہو چکا ہے۔ علماء نے اُسے گمراہ کر دیا ہے۔ وہاں کے دانشوروں نے بادشاہ کے دل میں یہ گمان پیدا کر دیا ہے کہ وہ خود اس دَور کا سب سے بڑا مصلح اور مجدد ہے۔ اور میں نے اس حد تک سُنا ہے کہ وہ ایک نئے دین کی بنیادیں بھی ڈال رہا ہے۔ ان حالات میں آپ کا آگرے جانا اور بادشاہ سے اصلاح و تجدید کے لیے مدد طلب کرنا کس حد تک درست ہے؟"

آپ نے جواب دیا "مجھے یہ سب باتیں معلوم ہیں اور اگر یہ سب باتیں دُرست ہیں تو میں اپنے کام کی ابتدا بادشاہ کی اصلاح سے کروں گا۔" آپ کے شاگرد نے کہا "اگر آپ اس بات پر پُرامید ہیں تو میں کیا کہہ سکتا ہوں مگر ایک بات میں ضرور کروں گا کہ یہ کام آپ اکیلے انجام نہیں دے سکیں گے۔"

آپ نے اپنے شاگرد سے فرمایا "میں نے اپنی زندگی کا جو نصب العین بنا رکھا ہے میں اُس کو اپنے دل سے نہیں نکالوں گا۔ یا تو میں اپنے نصب العین کو حاصل کروں گا یا اس راہ میں خود کو قربان کر دوں گا۔"

آپ اپنے شاگرد کے ہاں تین دن تک ٹھہرے رہے۔ اس دوران بہت سے لوگ آپ سے شرفِ ملاقات کرتے رہے۔ آپ نے اُن کے دِلوں کو دینِ حق کے نُور سے منور فرمایا اور اُن کے مسائل سُن کر حتی الامکان کوشش کی کہ ان کے مسائل کو حل کیا جاتے۔ جس دن آپ آگرے کے لیے سارنگ سے روانہ ہونے لگے تو چند مہدوی آپ کے پاس آتے اور آپ کو آگرے جانے سے منع کیا۔ انہوں نے کہا "جناب! کیا یہ درست ہے کہ آپ آگرہ جا رہے ہیں؟"

آپ نے جواب دیا "ہاں یہ درست ہے کہ میں آگرہ جا رہا ہوں۔"

انہوں نے پھر پوچھا "کیوں جا رہے ہیں کیا کوئی خاص کام ہے؟" آپ نے اس کے جواب میں اپنا سارا مقصد بیان کیا اور پھر فرمایا "میں مسلمانوں کی اصلاح و تجدید کے لیے آگرہ جا رہا ہوں۔" اُن میں سے ایک نے کہا "جناب میں آپ سے ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔" آپ نے فرمایا "ہاں پوچھو سوال۔"

اُس شخص نے کہا" جناب آپ اپنے نصب العین کی تکمیل کے لیے اکیلے جا رہے ہیں۔ شاید پورے ملک میں آپ اکیلے ہوں گے اور آپ جن لوگوں کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں وہ بہت زیادہ ہیں۔ آپ اگر اُن سب کو قتل کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے مگر بہت سارے بُروں کے لیے یہ کام بہت آسان ہوگا کہ وہ کسی ایک شخص کو قتل کر دیں"۔

آپ نے پوچھا" اس بات سے تم کیا واضح کرنا چاہتے ہو؟" اُس شخص نے جواب دیا" ہمیں جو کہنا تھا کہہ دیا اب آپ جانیں اور آپ کا کام جانے" یہ کہہ کر وہ مہدوی وہاں سے روانہ ہو گئے۔ آپ کے شاگرد نے گھبرا کر کہا "استادِ من! آپ فی الحال آگرے نہ جائیں میرا دل گھبرا رہا ہے"۔

آپ نے فرمایا" میں آگرہ ضرور جاؤں گا اور اپنے نصب العین کی تکمیل کے لیے اس نیک کام کو انجام دوں گا"۔ اس کے بعد آپ نے آگرے کا سفر شروع کر دیا۔ راستے میں ایک جگہ قیام کیا۔ وہاں پر مسجد بھی تھی مگر کوئی آدم زاد نظر نہیں آتا تھا۔ آپ نے وضو کیا اور فرض نماز کے لیے کھڑے ہو گئے۔ ابھی آپ نے ایک رکعت ہی پڑھی تھی کہ آپ کو چند آدمی اپنے گرد محسوس ہوئے اور پھر آپ کا شبہ اس طرح دُور ہوا کہ اُن آدمیوں میں سے ایک نے کہا" ہم نے آپ کو آگرہ جانے سے منع نہیں کیا تھا؟"

آپ اس کا کیونکر جواب دیتے' آپ تو نماز ادا کر رہے تھے۔ پھر کسی دُوسرے شخص نے کہا" اور کیا میں نے یہ بات ثابت نہیں کی تھی کہ آپ اپنے نصب العین کی تکمیل کے لیے اکیلے جا رہے ہیں جبکہ وہاں پر بُرے لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اگر آپ انہیں قتل کرنا چاہیں تو نہیں کر سکیں گے مگر وہ لوگ آپ کو بآسانی قتل کر دیں گے"۔

آپ بدستور خاموشی سے نماز ادا کرتے رہے۔ پھر اُن میں سے ایک شخص آگے بڑھا اور تلوار سے آپ کی گردن پر سجدے کی حالت میں وار کر دیا جس سے آپ کا سر جسم سے علیحدہ ہو گیا۔

شیخ محمد کا مرید حاجی محمد فجر کی نماز ادا کر کے غنودگی میں چلا گیا۔ پھر اُسے نیند نے آ لیا۔ اس نے خواب میں دیکھا کہ شیخ محمد ہاتھ میں اپنا سر اٹھائے ہوئے کھڑے ہیں اور فرما رہے ہیں" حاجی محمد! دیکھو ان موذیوں نے مجھے قتل کر دیا ہے"۔

حاجی محمد گھبرا کر بولے" کب اور کہاں؟" آپ نے فرمایا" یہاں موضع سومی کی مسجد میں ابھی ابھی۔ تم فوراً چلے آؤ میرے پاس"۔ اس کے بعد فوراً حاجی محمد کی آنکھ کھل گئی۔ انہوں نے اصطبل سے گھوڑا نکالا اور جس حال میں تھے بعجلت موضع سومی کی طرف روانہ ہو گئے۔ جب سومی مسجد کے مینار نظر آئے تو تیزی سے وہاں پہنچ گئے اُس وقت مسجد میں کچھ اور لوگ بھی موجود تھے۔ اُن لوگوں نے لاش کو اپنے قبضہ میں لے لیا تھا۔ حاجی محمد آپ کی لاش سے لپٹ کر رونے لگے اور ساتھ ساتھ کہتے جاتے" کیا میں نے آپ کو آگرہ جانے سے روکا نہیں تھا مگر آپ میری بات نہیں مانے اور چلے آئے۔ کسی شخص نے پوچھا" یہ کون بزرگ ہیں؟" حاجی محمد نے جواب دیا اس دَور کے سب سے مشہور عالم اور بزرگ شیخ محمد طاہر ہیں۔ شیخ الاسلام محمد طاہر"۔

جب مقتول کا تعارف ہو چکا تو سارا گاؤں آپ کے دیدار کے لیے مسجد میں پہنچ گیا۔ حاجی محمد آپ کی لاش لے کر سارنگ پور واپس آئے اور آپ کو اپنے والد شیخ الاسلام بھکاری کے قبہ میں دفن کیا گیا۔ آپ کی شہادت کی خبر گجرات میں آناً فاناً پہنچ گئی۔ پورے گجرات میں کہرام برپا ہو گیا۔ یہ خبر آگرے میں بھی پہنچ گئی۔ اکبر کو آپ کی شہادت کا بہت دُکھ پہنچا۔ اکبر نے پوچھا" انہیں کہاں دفن کیا گیا ہے؟" جواب ملا" سارنگ پور میں شیخ الاسلام بھکاری کے قبہ میں۔ بادشاہ نے کہا" میں حکم دیتا ہوں کہ اُن کو موجودہ مدفن سے نکال کر پٹن پہنچایا جائے اور وہاں انہیں اُن کے شایانِ شان

مقبرے میں دفن کیا جائے۔ جس وقت اکبر کا یہ فرمان سارنگ پور پہنچا اس وقت آپ کی شہادت کو چھ ماہ گزر چکے تھے
بادشاہ کے کارندے جن میں علما بھی شامل تھے، سارنگ پور پہنچے اور نہایت احتیاط سے قبر کو کھولنا شروع
کر دیا۔ بعض علما۔کو بادشاہ کے اس فرمان سے اختلاف تھا۔ انہوں نے کہا "اب کیا ہو گا اس قبر میں"۔ لیکن ان علما
میں سے چند ایسے بھی تھے جن کا خیال تھا کہ خدا اپنے نیک اور برگزیدہ بندوں پر اپنا کرم فرماتا ہے۔ بہرکیف قبر کو
کھولنے کا کام جاری رہا۔ لوگ جوق در جوق وہاں پہنچ گئے۔ پہلے اوپر والی اینٹوں کو اکھاڑا گیا۔ اس کے بعد لکڑی کے
تختے تھے اس کے بعد آپ کا جسد مبارک تھا۔

جب تختے ہٹائے جانے لگے تو قریب کھڑے لوگوں سے کہا گیا کہ وہ یہاں سے پرے ہو جائیں تاکہ کرم خوردہ
ڈھانچے کو دیکھ کر کراہت نہ ہو۔ اس ہجوم میں آپ کے ارادت مند بھی کھڑے تھے۔ انہوں نے کہا "کسی کو جسدِ مبارک کے
پاس جانے کی ضرورت نہیں سارا کام ہم خود کر لیں گے۔ یہ سن کر شاہی کارکنان کو خوشی ہوئی کیونکہ وہ کرم خوردہ جسم کو ہاتھ
لگاتے ہوئے کراہت محسوس کر رہے تھے۔ جب پائنتی کا تختہ ہٹایا گیا تو ایک شخص نے دیکھا کہ آپ کے پاؤں کے
ایک پودا اُگ آیا تھا۔ جب دوسرے تختے ہٹائے گئے تو انہوں نے دیکھا کہ وہ پودا موگرے کا ہے اور ذرا بلند ہو کر
دو شاخہ ہو گیا ہے۔ اس کی ایک شاخ آپ کی ناف کی طرف جھکی ہوئی تھی اور دوسری شاخ منہ کی طرف چلی گئی تھی۔ اس
پودے پر پتے اور پھول بھی تھے۔ ایک پھول شاخ کے ساتھ ہی منہ پر جھکا ہوا تھا۔ سبھی لوگ یہ منظر دیکھ کر حیران رہ
گئے۔ آپ کا کفن صاف ستھرا تھا اور اس پر خون کے دھبے ایسے لگ رہے تھے گویا یہ قتل ابھی ابھی ہوا ہے۔
آپ کو تابوت میں رکھ کر پٹن لے جایا گیا۔ پٹن کا حاکم آپ کا ارادت مند اور مداح تھا وہ فوراً شہر کے باہر آپ
کے تابوت کو لینے گیا۔ جب وہ آپ کے تابوت کو لے کر شہر میں داخل ہوا تو چہرے کی خوشی دیکھ کر معلوم ہوتا تھا
جیسے اُسے سارے جہاں کی دولت حاصل ہو گئی ہو۔

✖

ایک دفعہ آپ خدا کی یاد اور عبادت میں مشغول تھے کہ کسی نے آکر اطلاع دی کہ شیخ مہتہ کا انتقال ہو گیا ہے
شیخ مہتہ عالم ربانی تھے ان کی اولاد نہیں تھی۔ شیخ مہتہ آپ کے استاد بھی تھے۔ یہ خبر سن کر آپ کو بے حد افسوس ہوا
اولاد نہ ہونے کی وجہ سے شیخ مہتہ کی جانشینی کا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ اُن کے کئی عالم شاگردوں نے اپنے اپنے دل میں خود
اُن کا جانشین سمجھنا شروع کر دیا۔ مگر وہ اتنی ہمت نہیں رکھتے تھے کہ وہ اپنے نام کا اعلان کر دیتے۔ آخر کار یہ
پایا گیا کہ جو شخص بھی خود کو اُن کی جانشینی کے قابل سمجھتا ہے وہ اُن کے مصلے پر کھڑا ہو کر نماز ادا کرے گا۔ اس طرح
وہی شخص مہتہ کا جانشین قرار پائے گا۔
جن لوگوں نے یہ تجویز سوچی تھی وہ با اثر لوگ تھے اور خود کو اس کے لیے اہل نہیں سمجھتے تھے۔ انہوں نے یہ تجویز
سوچ لی تھی اور کسی سے اس کا ذکر نہیں کیا تھا۔ کیونکہ وہ یہ چاہتے تھے کہ وہ یہ دیکھ سکیں کہ استاد کے بعد شاگردوں
میں صاحب کشف کون ہے؟
کچھ دیر بعد باہر سے شیخ محمد تشریف لائے اور مرحوم استاد کا مصلے بچھا کر کھڑے ہو گئے اور نماز ادا کی۔ یہ دیکھ
صاحب ثروت حضرات نے صدا بلند کی کہ جانشینی کا مسئلہ طے پا گیا ہے۔ شیخ محمد استاد مرحوم کے حقیقی جانشین ہیں۔"

✖

ایک بار چند مہدوی علما۔ آپ کے پاس مناظرے کی غرض سے آئے۔ آپ نے اُن سے مناظرہ کیا۔ مناظرہ
والوں کا ایک ہجوم لگ گیا۔ مناظرے کے دوران آپ نے مہدوی علما۔ کو شاندار دلائل اور براہین سے لاجواب کر

اور باآواز بلند کہا" اب بھی وقت ہے، توبہ کر کے اپنے سچے دین کی طرف چلتے رہو"۔
مہدوی عالم نے ایک بار آپ کو دھمکی دی اور کہا" دیکھ شیخ محمد یہ تو اپنے حق میں اچھا نہیں کر رہا۔ آپ نے جواب دیا" میں جو کام کر رہا ہوں وہ حق ہے اور میں حق کو کسی قیمت پہ نہیں چھوڑوں گا"۔
انہی دنوں آپ نے "نصیحتہ الولاۃ" کے نام سے ایک رسالہ لکھا اس میں دلائل عقلی اور نقلی سے ثابت کر دیا گیا تھا کہ مہدوی غلط اور بے دین لوگ ہیں۔ یہ رسالہ آپ نے پٹن کے حاکم شیر خاں فولادی کی نذر کر دیا۔ وہ رسالہ پڑھ کر بے حد خوش ہوا اور کہا۔" اگر مولانا نے یہ کتاب نہ لکھی ہوتی تو قیامت کے روز میں ان کا دامن گیر ہوتا"۔
اس کتاب نے مہدویوں کو لاجواب کر دیا۔ مگر واتے قسمت کہ پٹن میں خانہ جنگی شروع ہو گئی اور یہاں لوگ آپس میں ہی کٹنے مرنے لگے۔ فجر کی نماز پڑھ کر آپ فارغ ہوتے تھے کہ ایک شخص آپ سے ملنے آیا۔ اس نے کہا" حضرت! میں نے آپ کا رسالہ پڑھا، کیا خوب لکھا ہے یہ رسالہ آپ نے، واللہ مزہ آگیا" آپ نے جواب دیا" تم منافقت کی باتیں کیوں کر رہے ہو، میں جانتا ہوں تم کس مقصد کے لیے یہاں آتے ہو"۔
اس شخص نے پوچھا" بتایئے میں کس غرض سے آیا ہوں"۔ آپ نے فرمایا" تو مجھے قتل کرنے آیا ہے۔ مگر تو مجھے قتل نہیں کر سکے گا"۔ اسی وقت آپ کے چند شاگرد آتے اور اس شخص کو پکڑنے کی کوشش کی مگر اس شخص نے فرار ہونے سے پہلے ہی آپ پر چاقو سے چند وار کر دیتے۔ شاگردوں نے آپ کو سنبھالا دیا۔ فوراً ہی طبیب اور جرّاح طلب کر لیے گئے۔ طبیب نے آپ کو دوائیں دیں اور جرّاح نے سولہ ٹانکے لگاتے۔ جرّاح نے تیرہ ٹانکوں پر اُف تک نہ کی مگر جب اس نے آخری ٹانکے لگاتے تو اس کے منہ سے اُف اُف کی آواز نکلی۔ طبیب اور جرّاح پابندی سے آپ کے گھر آتے رہے اور علاج کرتے رہے۔ یہاں تک کہ آپ بالکل ٹھیک ہو گئے۔

✖

جن دنوں آپ کی لاش کو پٹن میں لایا گیا اور دفن کیا گیا تو آپ کے ورثا کو یہ فکر لاحق ہوتی کہ اس مزار پر گنبد کو کہاں سے لایا جاتے اور کس طرح نصب کیا جاتے۔ پٹن ہی میں ایک بزرگ شرف الدین بھی تھے۔ یہ بھی ان لوگوں میں شامل تھے جو آپ سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔
کچھ عرصہ پہلے شرف الدین نے کہیں سے ایک گنبد خریدا تھا تاہم شرف الدین ــــ اس گنبد کو اُتروا کر حاجی نوحات کے مزار پر لگانا چاہتے تھے۔ جس وقت شرف الدین نے یہ منصوبہ بنایا اسی شب ــــ خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ڈانٹ دیا" خبردار جو گنبد اتروایا گیا ہے وہ حاجی نوحات کے مزار پر نہیں لگے گا"۔
شرف الدین نے پوچھا" یارسول اللہ! پھر یہ گنبد کہاں لگے گا"۔ تو فرمایا" یہ ہمارا کام ہے تمہیں اس کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں"۔ شرف الدین نے گنبد کو وہیں رہنے دیا۔
ادھر جب شیخ محمد بن طاہر پٹنی کا مزار تیار ہو گیا تو یہاں گنبد کی ضرورت پیش آئی۔ کسی نے گنبد کی نشاندہی کی اور چند طالبانِ گنبد شرف الدین کی خدمت میں حاضر ہوتے اور مدعا بیان کیا۔
شرف الدین نے کہا" ہاں بھئی گنبد تو ہے میرے پاس مگر میں اسے آپ لوگوں کو دے نہیں سکتا"۔ ایک نے پوچھا" جناب آپ وہ گنبد کیوں نہیں دے سکتے ہیں؟" شرف الدین نے کہا" مجھے کسی نے منع کیا ہے"۔ لیکن پھر شرف الدین نے سوچا کہ میں ان لوگوں کو کیوں منع کروں اگر کوئی ایسی بات ہوگی تو حضورؐ خود ان لوگوں کو منع فرما دیں گے۔ اس لیے آپ نے اعلان کیا میں آپ لوگوں کو گنبد دینے کے لیے تیار ہوں۔
وہ لوگ شرف الدین سے گنبد خرید کر لے گئے اور شیخ محمد طاہر کے مزار پر نصب کر دیا۔ شرف الدین کئی دن تک

اس انتظار میں بیٹھے رہے کہ حضورؐ خود انہیں منع کریں گے یا محمد بن طاہر کے عزیزوں اور رشتہ داروں کو منع کر دیں گے مگر ایسا نہیں ہوا۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی بات پر راضی تھے کہ گنبد شیخ محمد طاہر کے مزار پر ہی نصب ہو۔ یہ گنبد آج تک بالکل محفوظ ہے نہ ٹوٹا نہ گرا نہ ہی چٹخا۔

آپ نے شادی بھی کی تھی مگر یہ کوئی خاص قابل ذکر واقع نہیں تھا۔ آپ کی اولاد خوب پھلی پھولی۔ آپ کے بڑے صاحبزادے کا نام ابراہیم تھا۔ آپ کے شاگرد اپنے اپنے دور میں بہت مشہور ہوتے۔

آپ نے بہت سی کتابیں بھی لکھیں ان میں سے چند تصانیف درج ذیل ہیں۔

مقاصد جامع الاصول مشتمل۔ مجمع البحار، تکملہ مجمع البحار، حاشیہ مقاصد الاصول، حاشیہ صحیح بخاری، چہل حدیث ان کے علاوہ اور بھی کچھ کتابیں آپ کی تصنیف ہیں۔

آپ نے ہمیشہ تقویٰ اور پرہیزگاری سے زندگی گزاری اور حق کے لیے سرگرداں رہے۔ اسی لیے آپ کی شہادت بھی حق و باطل کی تکرار میں ہوئی۔

عبداللہ بن حمدون کا بیان ہے کہ میں نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ جوئے کے مال سے کوئی جائیداد نہیں خریدوں گا اور اگر اس سلسلے میں میرے ہاتھ کچھ رقم آئے گی تو اس سے موم بتیاں خریدلوں گا جو جل کر ختم ہو جانے والی چیز ہے یا پینے کے لیے نبیذ لے لوں گا یا کسی مغنیہ کو اس کے گانے کا انعام دے دوں گا۔

ایک دن میں خلیفہ معتضد باللہ کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ میں نے ان سے ستر ہزار درہم جیتے۔ معتضد باللہ رقم ادا کیے بغیر عصر کی سنتیں پڑھنے میں مشغول ہو گئے۔ میں بیٹھا ہوا سوچ رہا تھا اور اپنے عہد پر پچھتا رہا تھا کہ ستر ہزار درہم سے کہاں تک موم بتیاں خریدی جائیں گی یا نبیذ کا انتظام کیا جائے گا اور کتنا انعام دیا جا سکے گا۔ میں نے قسم کھانے میں بہت جلدی کی۔ اگر میں قسم نہ کھاتا تو اب اس رقم سے اچھی جائیداد خرید لیتا۔

جب معتضد نے سلام پھیرا تو مجھے متفکر دیکھ کر پوچھا: "کیا سوچ رہے ہو؟"

میں نے ٹالنا چاہا تو انہوں نے اپنی جان کی قسم دی۔ مجبوراً مجھے اپنے عہد کے بارے میں بتانا پڑا۔

وہ بولے: "کیا تم یہ سمجھ رہے ہو کہ میں جوئے کے ستر ہزار درہم تمہیں دے دوں گا؟"

میں نے گھبرا کر کہا: "کیا آپ ان کو ساقط کر دیں گے؟"

فرمایا: "ہاں، ہم نے ساقط کئے۔ اٹھو اور فضول خیالات کو چھوڑ دو۔"

خلیفہ تو یہ کہہ کر فرض نماز میں مشغول ہو گئے اور مجھے پہلے سے بھی زیادہ غم لاحق ہو گیا: مال ضائع ہونے کا بھی رنج تھا اور یہ بھی قلق تھا کہ میں نے خلیفہ سے سچ کیوں بولا۔

خلیفہ نماز سے فارغ ہو کر بولے: "اے عبداللہ تم کو میری زندگی کی قسم، سچ سچ بتانا، اب کیا سوچ رہے ہو؟"

میں نے پھر سچی بات کہہ دی۔

کہنے لگے: "جوئے کا معاملہ تو ہم ختم کر چکے اور کہہ چکے کہ وہ رقم ساقط ہوئی لیکن ہم اپنے مال سے تمہیں ستر ہزار درہم سچ بولنے کے انعام میں دیتے ہیں۔ اس کے لینے سے کوئی گناہ نہیں ہوگا اور جو کچھ جائیداد تم خریدو گے وہ بھی حلال ہوگی اور تمہارا عہد بھی نہیں ٹوٹے گا۔"

میں نے خلیفہ کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور انعام لے کر جائیداد خریدلی۔

خواجہ محمد زبیر رحمۃ اللہ علیہ

اللہ کے مقرب بندے اور ولی کا دربار لگا ہوا تھا۔ تمام مُرید اور عقیدت مند اس طرح اپنے مُرشد کے گرد بیٹھے تھے جیسے شمع کے گرد پروانے ہوں۔ اس دربار میں امراء اور غربا آتے اور روحانیت کے انمول موتی اپنی جھولیوں میں بھر کر واپس جاتے مغل تاجدار معظم بہادر شاہ بھی اس بطلِ جلیل کی قدم بوسی کو اکثر آتا۔ اُس کے ہمراہ وزراء بھی ہوتے اور امراء بھی اور رؤسا بھی ہوتے اور اہلِ ثروت بھی سب عقیدت مندوں کو حکم تھا کہ یہ دربار ولایت ہے۔ دربار شاہی نہیں لہٰذا یہاں فرقِ مراتب کا کوئی سلسلہ نہیں۔ اسی وجہ سے معظم بہادر شاہ کی آمد پر بھی کوئی امتیازیت نہیں برتی جاتی۔

حضرت کے اس کروفر کو دیکھ کر شہنشاہ معظم بہادر شاہ کے ایک امیر کے دِل میں سخت حسد اور جلن پیدا ہوئی اُس نے سوچا کہ یہ شخص کیا چیز ہے جو مسند ولایت پر کیا بیٹھا، بادشاہوں کے مراتب اور امراء کی حیثیت کو ہی نہیں پہچانتا اور نہ اپنے مریدوں سے کسی کی عزت ہونے دیتا ہے۔ اسی جلے بھُنے جذبے سے بھرا ہوا وہ ایک روز اُس ولیٔ کامل کے دربار میں آیا اور رعونیت سے بولا "حضرت! مَیں نے آپکی بزرگی اور عظمت کی بہت شہرت سُنی ہے اور یہاں تک کہ جہاں پناہ بھی آپ کے دربار میں آتے ہیں، لیکن میری امارت اور شاہانہ طبیعت مجھے آپکی تعظیم سے روکتی ہے۔"

حضرت نے اس امیر کی باتوں کو قطعاً کوئی وقعت نہ دی وہ بولتا گیا۔ آخر ایک مرید نے اس کو روکا کہ یہ مقام ہوش کا ہے تم عقل مندی سے ادب سے گفتگو کرو۔"

امیر نے اُس مرید کو ڈانٹا کہ تم خاموش رہو میرا مخاطب تمہارا مرشد ہے لہٰذا وہی میری بات کا جواب دیں۔"

حضرت نے یہ ساری باتیں سُنیں اور اپنے اُسی مرید کو جسے امیر نے ڈانٹا تھا حکم دیا۔" اس متکبر اور مغرور امیر کو یہاں سے چلتا کرو کیونکہ یہ دربار کسی دنیا دار کا نہیں جہاں کروفر کو پسند کیا جاتا۔ بلکہ یہ دربار تو

اللہ کے ولی کا ہے ۔ لہٰذا یہاں عجز و انکساری دیکھا جاتا ہے"

اس امیر نے پھر اُس ولی اللہ کو مخاطب کیا اور شکایتاً کہا "حضرت آپ زیادتی کر رہے ہیں ایک معمولی حیثیت کے انسان سے مجھ جیسے صاحبِ حیثیت کو اپنے دربار سے نکلوا رہے ہیں"

حضرت نے فرمایا "جس کو تم معمولی سمجھتے ہو وہ خدا کے حضور غیر معمولی ہے اور تمہاری بہتری یہی ہے کہ یہاں سے چلے جاؤ۔"

امیر غصے سے دربار سے نکلا اور زمین پر پاؤں پٹختا ہوا چلا گیا ۔ حضرت نے مسکرا کر فرمایا "یہ شخص جس زمین پر غصے سے پاؤں مار کر گیا چند دنوں میں اسی کے اندر چلا جائے گا اور یہی ہوا وہ امیر دو تین روز کے اندر ہی اپنے گھوڑے سے گر کر مر گیا۔

یہ خدا کا ولی کون تھا اس کے بارے میں تاریخ کی کتابیں ہمیں بتاتی ہیں کہ یہ قیوم چہارم خواجہ زبیر بن ابوالعلیٰ تھے۔

◈

قیوم چہارم خواجہ محمد زبیرؒ بروز پیر ۵ ذیلعقد ۱۰۹۲ھ کو پیدا ہوئے ۔آپ کے والد کا نام ماجد ابوالعلیٰ تھا ۔ وہ روحانیت میں اعلیٰ درجے کے بزرگ تھے ۔آپ کے دادا کا نام حجت اللہ تھا اور آبائی وطن سمرقند تھا ۔ وہاں سے وہ ہجرت کر کے ہندوستان پہنچے اور پھر مکہ معظمہ چلے گئے ۔ خواجہ زبیرؒ کے والد ابوالعلیٰ کو اپنے ایک دوست کے سپرد کر دیا جس کا نام خواجہ فیضی تھا ۔ یہ خواجہ فیضی ہندوستان کے راجا مان سنگھ کے مصاحب تھے اور اُن کی شفقت جاودانی میں ابوالعلیٰ نے پرورش پائی ۔ ان کا شمار ہندوستان کے نامی گرامی صوفیاء میں ہونے لگا تھا ۔ خواجہ محمد زبیر بچپن میں ہی بڑے صفائی پسند تھے حتیٰ کہ انہوں نے اپنے بستر کو بول و براز سے آلودہ نہ کیا اور آپکی حیا کا یہ عالم تھا کہ آپ کو جب آپکی والدہ کپڑے بدلوانے لگتیں تو وہ اُن کے آنچل میں اپنا آپ چھپا لیتے ۔ آپکی والدہ کو آپ کے شرم و حیا والے معمول کا پتہ چل گیا اور وہ آپ کو کمرہ بند کر کے کپڑے بدلواتی تھیں۔

آپ دو سال کی عمر سے ہی تنہائی اور گوشہ نشینی میں مشغول ہو گئے ۔ باوجود کوشش کے بھی آپ والدین یا دوسرے عزیزوں کے پاس نہ جاتے بلکہ علیحدگی میں کئی گھنٹے بیٹھے یا لیٹے رہتے تھے اور آپ کے والد صاحب خود بھی ایک صاحبِ ولایت شخص تھے وہ آپ کو تنہا لیٹا دیکھ کر محسوس کر لیتے ہیں جیسے آپ کسی کے ساتھ ہم کلام ہو رہے ہیں ۔ ان عجیب و غریب مشاہدات کو دیکھ کر ابوالعلیٰ کو وہ بشارتیں یاد آ جاتیں جو اُن کے حالات کے مطابق و موافق ہیں۔

◈

خواجہ محمد زبیر کے گھر کے بالکل سامنے ایک مکان تھا جو کافی عرصے سے خالی پڑا ہوا تھا ۔ اس ویران مکان کو دیکھ کر آپ کے والد محترم اکثر بے ساختہ فرمایا کرتے تھے "اللہ بس باقی ہوس"

ایک دن صبح کے وقت خواجہ صاحب کی والدہ اٹھیں تو وہ خواجہ صاحب کو بستر سے غائب پا کر سخت حیران ہوئیں اُس وقت آپ کی عمر بمشکل چند سال ہو گی ۔ آپ نے سوچا شاید آپ کو والد صاحب نے اُٹھا لیا ہو لیکن جب انہوں نے اپنے شوہر کے حجرے میں جھانکا تو اُن کو تنہا عبادت میں مشغول پایا ۔ پھر ماں نے پورے گھر میں تلاش کیا مگر خواجہ زبیر گھر میں نہ ملے ۔ پریشان حال والدہ نے بیٹے کی گمشدگی

متعلق اپنے شوہر ابوالعلیٰ کو بتایا۔ انہوں نے بیوی کی بات پر نہ کوئی توجہ دی نہ ہی اسکا کوئی جواب دیا۔ آخر تنگ آکر بیوی نے خاوند کو خدا کے واسطے دیئے کہ اُٹھیے اور خواجہ محمد زبیر کو تلاش کیجئے وہ گھر میں نہیں۔ اس پر ابوالعلیٰ نے اپنے معمولات کو ختم کرنے کے بعد دُعا مانگی اور اُٹھ کر بیوی سے مخاطب ہوئے اور فرمایا۔

"تم نے بچے کو گھر میں اچھی طرح تلاش کر لیا۔ وہ جائے گا کہاں یہیں کہیں گھر میں ہی ہوگا۔"
ممتا کی ماری نے روتے ہوئے عرض کی "میں نے سارا گھر تلاش کر لیا ہے نہ جانے میرا لال کہاں ہے۔"

ابوالعلیٰ نے بھی سارے گھر میں خواجہ زبیر کو تلاش کیا مگر وہ گھر سے نہ ملے۔ انہوں نے بیوی کو تسلی دی کہ تم مت گھبراؤ اللہ نے چاہا تو ہمارے زبیر کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ اسکے بعد ابوالعلیٰ بیٹے کی تلاش میں گھر سے نکلے۔ اُنکی بیوی نے بھی بے چینی کی وجہ سے دروازے میں کھڑے ہو کر جاتے ہوئے شوہر کو دیکھنا شروع کر دیا۔

ابوالعلیٰ گھر سے باہر نکلے تو انہوں نے ایک بہت بڑے سانپ کو دیکھا جو کہ اُسی ویران مکان کی طرف جا رہا ہے۔ اتنا بڑا سانپ ابوالعلیٰ اور انکی بیوی نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ سانپ کے اُس میں داخل ہوتے ہی ابوالعلیٰ بھی اُس کا پیچھا کرتے ہوئے اُسی مکان کی طرف گئے۔ اب بیوی کو بیٹے کی فکر کے ساتھ خاوند کی فکر بھی کھانے لگی کہ کہیں اُن کو سانپ نقصان نہ پہنچائے مگر ابوالعلیٰ کسی خوف و ڈر کے بغیر اُس مکان کی دیوار پر چڑھ کر مکان کے اندر دیکھنے لگے۔ اب سانپ مکمل طور پہ اُس ویران مکان میں داخل ہو چکا تھا۔ اندر کا منظر دیکھ کر ابوالعلیٰ دم بخود رہ گئے۔ مکان کے اندر اُن کا فرزند دلبند خواجہ محمد موجود ہے اور وہ شیش ناگ اُس کے پاؤں وفادار کتّے کی طرح چاٹ رہا ہے۔

ابوالعلیٰ کی جگہ کوئی اور باپ ہوتا تو جوشِ پدری میں سانپ کو مار دیتا یا اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا مگر انہوں نے اِس عجیب وغریب منظر کو دیکھ کر اپنے آپ کو بے خود اور مسحور پایا اور وہ تو قدرت کے عجائب کا تماشا دیکھنا چاہتے تھے۔ کیونکہ خواجہ زبیر کی پیدائش سے قبل ہی اُن کی ولایت کی پیش گوئیاں ہو چکی تھیں۔ چنانچہ ابوالعلیٰ یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ اُس کو کس طرح اعلیٰ مقام پہ پہنچاتا ہے۔

سانپ پہلے تو زبیر کے پاؤں چاٹتا رہا پھر اُس نے اپنے سر کو بلند کر کے اُن کے ہاتھ اور سارے جسم کو چومنا شروع کر دیا۔ خواجہ زبیر کسی خوف و ڈر کے بغیر زمین پر لیٹے رہے۔ ابوالعلیٰ کو بیٹے سے زیادہ بیوی کی فکر تھی کہ وہ دروازے میں کھڑی اُن باپ بیٹے کا انتظار کر رہی ہوگی۔ اس خیال سے انہوں نے مڑ کر بیوی کو دیکھا مگر دروازہ خالی پا کر دوبارہ اُنکی توجہ خواجہ زبیر کی طرف مرکوز ہوگئی مگر اُنہیں اس بات نے حیرت زدہ کر دیا کہ وہاں پر اب سانپ کا نام ونشان نہ تھا بلکہ صرف خواجہ زبیر لیٹے ہوئے تھے۔ وہ فوراً دیوار سے نیچے اُتر آئے اور اپنے گھر پہ نگاہ ڈالی تو دروازے پر مضطرب و بے چین بیوی کو کھڑے دیکھا جو کہہ رہی تھی۔ تم اُس ویران مکان میں کیا کر رہے ہو بیٹے کو کیوں تلاش نہیں کرتے اُن کی بات کو سُنی اَن سُنی کر کے ابوالعلیٰ نے پوچھا۔

"تم نے ابھی یہاں ایک اژدہا کو دیکھا تھا وہ اُس مکان کے اندر گیا تھا؟"
بیوی نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا "دیکھا تھا۔ تو کیا اُسے واپس باہر بھی نکلتے دیکھا۔ بیوی نے نفی

میں سر ہلا دیا کہ نہیں دیکھا۔
ابوالعلیٰ بڑے حیران ہوئے کہ وہ سانپ پھر کہاں چلا گیا۔ اُن کی اس غیر متعلق گفتگو اور کارروائی پر بیوی کو سخت غصّہ آیا اور وہ بولی کہ تم بیٹے کو ڈھونڈنے کی بجائے فضول تجسّس اور سُراغ رسانی کر رہے ہو۔ تمہیں فوراً بچّے کو تلاش کرنا چاہیئے۔
اب ابوالعلیٰ اس مکان کے اندر چلے گئے اور خواجہ زبیر کو اٹھا کر واپس لے آئے آسیب زدہ مکان سے بیٹے کو نکلتا دیکھ کر ان کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ انہوں نے شوہر کی گود سے فوراً خواجہ زبیر کو لیا اور اُن سے پوچھا "یہ اُس کھنڈر میں کیسے پہنچ گیا تھا۔"
شوہر نے جواب دیا "اس کا صحیح جواب تو میرے پاس بھی نہیں ہے۔"
اب بیوی نے فکر سے پوچھا "اگر یہ اُس مکان کے اندر تھا۔ تو وہاں تو وہ اژدہا بھی گیا تھا کہیں اُس نے اسے کچھ کہا تو نہیں؟"
یہ بات سُن کر ابوالعلیٰ نے بیوی کو لفظ بہ لفظ سارا قصہ سُنا دیا۔ بیوی نے سُنا تو وہ حیران رہ گیں انہوں نے بیٹے کو سینے سے بھینچ لیا مگر خواجہ پر بلا کی طمانیت تھی۔ یہ دیکھ کر ماں کا بے چین دل پُرسکون ہو گیا۔ اب ابوالعلیٰ نے بیوی سے کہا "مَیں نے تمہیں بتایا تھا کہ اس بچّے کو کچھ نہیں ہوگا حق تعالیٰ اس کی خود حفاظت کرے گا بلکہ سانپ کا اس بچّے کے ساتھ یہ غیر معمولی سلوک دیکھ کر وہ تمام بشارتیں پوری ہو گئی ہیں جو اس کی پیدائش سے پہلے کی گئی تھیں۔

❖

خواجہ زبیر کی تعلیم کا آغاز اُنکی عمر کے چوتھے سال میں کیا گیا۔ اُن کے اُستاد اُن کی تیز طبع سے بہت حیران ہوتے تھے۔ جو کچھ اُن کو پڑھایا جاتا تھا وہ انہیں فی الفور ازبر ہو جاتا تھا۔ ایک روز جب وہ اس آیت کا سبق حاصل کر رہے تھے کہ اللہ کا نور آسمانوں اور زمینوں میں ہے تو خواجہ زبیر کا رنگ بدلنے لگا اور یوں محسوس ہونے لگا جیسے کوئی بوجھ اُٹھانا چاہتے ہوں، لیکن اُن سے اُٹھایا نہ جا رہا ہو۔ اُن کا جسم ٹھنڈا ہو گیا اور اُن پر کپکپی طاری ہو گئی۔
استاد نے یہ کیفیت دیکھی تو پوچھا زبیر "کہو کیا بات ہے طبیعت تو ٹھیک ہے۔" مگر اس سے پہلے کہ زبیر کوئی جواب دیتے اُن کی طبیعت پہلے سے بھی زیادہ خراب ہو گئی۔ اُن کا چہرہ عرق آلود ہو گیا اور اسی کیفیت میں کافی دیر رہنے کے بعد بے ہوش ہو گئے۔ معلّم سخت گھبرا گئے اور فوراً ابوالعلیٰ کے پاس آئے اور اُن کی حالت بتائی۔ والد نے بیٹے کی تشویشناک کیفیت کے متعلق سُنا تو سکوت فرمایا اور کچھ دیر کے لیے آنکھیں بند کر کے مراقبے میں چلے گئے۔ پھر آنکھیں کھول کر معلّم سے کہا "آپ زبیر کے پاس جائیں اب اُسے ہوش آ گیا ہے اور وہ ٹھیک ہو گیا ہے۔"
اُس معلّم نے ابوالعلیٰ سے درخواست کی "حضرت آخر مجھے بھی کوئی پتہ چلے کہ زبیر کو کیا ہوا تھا؟"
ابوالعلیٰ نے جواب دیا "استادِ محترم! یہ روحانی اسرار ہیں۔ ان کا ظاہری علوم سے کوئی تعلق نہیں اس وجہ سے یہ باتیں آپ کو سمجھ نہ آ سکیں گی۔ استاد نے مزید کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا اور خاموشی سے رُخصت ہو گئے۔
مدرسے واپس جا کر استاد نے دیکھا کہ زبیر ہوش میں آ چکے ہیں اور استاد کو دیکھتے ہی اُنہوں نے عرض

ستادِ محترم ہم بہت تھک چکے ہیں ہمیں آرام کرنے کی اجازت ہے "
مر استاد اجازت دینے سے قبل کچھ دیر پہلے کی کیفیت کے متعلق جاننے کے آرزو مند تھے اُنھوں
"اجازت تو تمہیں آرام کرنے کے لیے مل جائے گی مگر یہ تو بتاؤ کہ تمہاری یہ حالتِ بے ہوشی کس
سے ہوئی"
خواجہ زبیر نے عرض کی "استاد محترم مجھ پر اسرار علوم کا ایک بوجھ ڈالا جا رہا تھا جس کے نیچے میرا
دبا جا رہا تھا۔ آخر اس دباؤ کے نیچے آکر میں بے ہوش ہو گیا تھا"
ستاد کی سمجھ میں اب بھی کوئی بات نہیں آئی مگر اس نے کوئی مزید سوال و جواب خواجہ زبیر کے ساتھ
۔ اس کے بعد یہ معمول ہی بن گیا کہ خواجہ صاحب بھی قرآن مجید کی کوئی ایسی آیت پڑھتے جس کے
و مطالب میں ایک سمندر پنہاں ہو تو اُن کی حالت عجیب و غریب ہو جاتی مگر جب وہ ہوش میں
تو اُن کو یوں محسوس ہوتا کہ جیسے علم و دانش اور معانی و مطالب کا ایک سمندر اُن کے جسم کے اندر سرایت
ا تھا۔

سیر و سیاحت کرتے ہوئے خواجہ زبیر کابل سے ہندوستان پہنچے یہاں ہندوستان کی سیاست میں اُن
ں کافی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں اورنگ زیب کا انتقال ہونے کے بعد دریائے راوی کے کنارے
کے بیٹے ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار تھے اور تختِ جہانگیری اپنے فرماں رواؤں کا منتظر تھا۔
انتشار کے زمانے میں کابل کے مریدوں کے پاس رہنے کے لیے خواجہ ہندوستان پہنچ گئے۔ شہزادہ معظم
اور شہزادہ اعظم شاہ ایک دوسرے کے خلاف صف آرا تھے اور وہ اورنگ زیب کے وارث اور
ین کا انتخاب بزورِ شمشیر کرنے لگے۔
خواجہ زبیر نے اِن دنوں اپنا مسکن ایک غیر آباد علاقے میں بنا رکھا تھا جہاں آنے جانے والا راستہ
ت مخدوش اور دشوار گزار تھا۔ مگر آپ نے اُس وقت تک اُسی غیر آباد علاقے میں رہنے کا فیصلہ
ر رکھا جب تک تختِ شاہی پر کوئی باقاعدہ حکمران نہیں آجائے گا۔ آپ کو آپ کے مرید نے بتایا کہ جس
قے میں آپ ٹھہرے ہوئے ہیں چند روز تک یہ بھی جنگ کی لپیٹ میں آجائے گا اس سے بہتر یہ ہے
آپ یہاں سے نقل مکانی کر جائیں۔ آپ نے فرمایا کہ زندگی موت تو خدا کے ہاتھ میں ہے اور دوسرے میں
ی مرضی سے اس جگہ نہیں آیا بلکہ مجھے خدا نے یہاں بھیجا ہے۔ اس لیے مجھے یقین ہے کہ مجھے کوئی گزند
ں پہنچے گی۔ پھر وہی ہوا اسی علاقے کو جنگ نے اپنی لپیٹ میں لے لیا اور گھوڑوں کی ٹاپیں آپ کے
وں میں سنائی دینے لگیں۔ اِن آوازوں سے آپ کے مرید خوف زدہ ہوتے مگر آپ اُن کو تسلی دیتے۔
ر رفتہ رفتہ گھوڑوں کی ٹاپیں اُن کے خیموں کے پاس آنے لگیں تو آپ نے اپنے مریدوں کو حکم دیا کہ گھبراؤ
ت اور خیمے سے باہر جو لوگ آئے ہیں اُن کو عزت و احترام سے خیمے کے اندر لے آؤ۔ آپ کے مرید
یمے سے باہر آئے تو انھوں نے دیکھا کہ پانچ گھڑ سوار خیمے کے باہر کھڑے تھے مریدوں نے اُن کو کہا آپ
یمے کے اندر چلیں ہمارے قبلہ پیر صاحب آپ کو یاد فرما رہے ہیں۔
اُن لوگوں میں سے ایک نے پوچھا "کیا واقعی آپ کے پیر صاحب نے ہمیں یاد فرمایا ہے" مریدوں
نے جواب دیا بیشک آپ تشریف لائیں اور ہمارے مرشد صاحب سے تصدیق کر لیں۔ اس کے بعد وہ لوگ

آپ کی کُٹیا کے اندر آئے اور خواجہ زبیر کی قدم بوسی کی۔ جس شخص نے سب سے پہلے قدم بوسی کا شرف حاصل کیا وہ شہزادہ معظم شاہ تھا۔ اُس نے عرض کی "حضرت! میں اِس وقت بے سروسامان ہوں۔ میرے ساتھ نہ امراء ہیں نہ منصب دار، میری کامیابی کے اسباب معدوم ہو چکے ہیں۔ چند لوگوں کا ایک گروہ میرے ساتھ ہے۔ جن میں یہ ذوالفقار خان ہے جو میرے ساتھ نمک حلالی کر رہا ہے۔"

خواجہ زبیر نے شہزادہ معظم کی پیٹھ پر تھپکی دے کر فرمایا "تم گھبراؤ مت اللہ تمہارے ساتھ ہے اور مجھے خدا نے تمہاری امداد کرنے پر مامور کیا ہے۔ اور یہ ظاہری اسباب کی معدومی۔ امراء اور منصب داروں کی دوری ان باتوں کو تم قطعاً خاطر میں نہ لاؤ۔ اللہ تعالیٰ اپنے مقاصد کو جب پورا فرماتا ہے تو وہ قلیل اور کثیر کی پروا نہیں کرتا۔ دنیاوی اور مادی اسباب دنیا داروں کے لیے معنی رکھتے ہیں، لیکن جن کی مدد خدا کرتا ہے اُن کے لیے یہ سب چیزیں بے وقعت اور بے معنی ہوتی ہیں۔ خدا کا یہ حکم ہے کہ بادشاہت تمہاری ہوگی اور اللہ کے اسی حکم کے پیشِ نظر مایوسی کے سمندر سے نکل کر میدانِ جنگ میں جاؤ۔"

یہ کہہ کر شہزادہ معظم شاہ اپنے ہمراہی ذوالفقار خان کو لے کر آپ کے دربار سے رخصت ہوا۔ جاتے وقت اُنہوں نے حضرت کے ہاتھ کو چوما اور دوبارہ دُعا کی درخواست کی اور خیمہ سے نکل گئے۔

شہزادہ کے جانے کے بعد آپ کے کسی مُرید نے عرض کی "حضرت شہزادے کی جو ظاہری پوزیشن اس میں تو اُس کو فتح ہوتی دکھائی نہیں دیتی مگر آپ نے اُسی کو کامیابی کی نوید سُنا دی ہے۔"

حضرت خواجہ محمد زبیر نے اپنے مُرید کو غصے سے کہا۔ "یاد رکھو دُنیا میں ناممکنات دنیا داروں کے ہیں اللہ کے نزدیک کوئی چیز ناممکن نہیں۔"

جب دونوں لشکروں کا آمنا سامنا ہوا۔ تو شہزادہ کو ہر طرف سے پسپائی ہونے لگی۔ اُس کی قلیل فوج کا صفایا ہونے لگا۔ شکست ہوتی دیکھ کر سپاہیوں میں رہا سہا حوصلہ بھی جاتا رہا۔ ذوالفقار خان بھی مایوس ہو گیا اور اُس نے خواجہ محمد زبیر کی خانقاہ کی طرف مُنہ کر کے عرض کی "حضرت آپ نے تو مجھے کامیابی کی نوید دی تھی مگر یہاں تو نقشہ ہی بدل چکا ہے۔ میری فوج کے پاؤں اُکھڑ چکے ہیں ادھر شہزادہ یہ عرض کر رہا تھا اُدھر مُریدوں نے خواجہ صاحب کی خدمت میں عرض کی "حضرت! یہ تو بڑی شرمندگی اور دُکھ والی بات ہو گی کہ شہزادہ معظم شاہ کو شکست ہو اور اُس کے حریف شہزادے کو فتح و کامرانی ہو۔"

آپ نے مُرید کو سختی سے کہا "خاموش رہو ابھی جنگ کا فیصلہ کہاں ہوا ہے۔ ابھی آپ کے یہ فقرہ آیا ہی تھا کہ مشرق کی طرف سے ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور راوی کی طرف بڑھ گیا اُس وقت شہزادہ اعظم کی فوجوں کا رُخ طوفان کی طرف تھا۔ گرد و غبار نے پورے لشکر کی آنکھوں کو نابینا کر دیا اور وہ ایک دوسرے کو مارنے لگ گئے کسی کو کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ تلوار کس پر چل رہی ہے۔ اس صورت حال سے شہزادہ معظم کو بہت فائدہ پہنچا ایک طرف سے طوفان اور دوسری طرف سے شہزادہ معظم کی فوجوں نے شہزادہ اعظم کی فوج پر حملہ کر دیا اور چند گھنٹوں میں مخالف فوج کی کمر ٹوٹ گئی۔ اعظم کا ... اسی جنگ میں مارا گیا اور اُس کی افواج نے معظم شاہ کی فوجوں میں مل کر وفاداری کا حلف اُٹھایا۔ ... شاہ خود بھی میدان میں کام آ گیا۔ اب معظم شاہ کے لیے میدان صاف تھا۔ اس نے ہندوستان کے تاراج کو سنبھال لیا اور پہلی فرصت میں خواجہ زبیر کی درگاہ میں حاضر ہو کر۔ اُن کے قدموں پر گر گیا اُس کی خوشی بے ٹھکانہ اور ناقابلِ بیان تھی آپ نے اُسے اُٹھا کر معانقہ کیا اور فرمایا "جاؤ ہندوستان

حکومت کرو اور عدل و انصاف سے کام لو۔" آپ سے دعائیں لیتا ہوا شہزادہ وہاں سے رخصت ہوا اور
راوی کے کنارے اُس نے اپنی بادشاہی کا اعلان کیا اور یہیں پر اُس کی رسم تاجپوشی ہوئی اور بہادر شاہ
کے لقب سے وہ ہندوستان کا تاجدار بن گیا۔ آپ کو شہزادے نے اپنے ساتھ رکھنے کی خواہش کی مگر
آپ نے انکار کر دیا۔

خواجہ زبیر کے دل میں یہ خواہش کروٹ لے رہی تھی کہ وہ مکہ معظمہ جائیں اور اللہ کے گھر کا دیدار
کریں۔ انہوں نے اپنی اس تمنا کا ذکر اپنے والدِ محترم سے بھی کیا اس وقت خواجہ صاحب کی عمر
بمشکل پندرہ سولہ سال ہو گی۔ آپ کے والد صاحب رضامند ہو گئے اور اس طرح انہوں نے اپنے سفر
سعید کا آغاز کیا۔ سفرِ مکہ آپ کو بہت پسند آیا۔ طوافِ کعبہ کے دوران آپ پر جذب و سُکر کی کیفیت طاری
ہو گئی اور آپ بے ہوش ہو گئے۔ آپ حج کے مناسک ادا کرنے مدینہ تشریف لے گئے اور عازمِ سفر
ہوئے۔ آپ ذرّے ذرّے اور چپے چپے پر سجدے کرتے اور زمین کو بوسے دیتے کہ شاید اس جگہ میرے
نبیٔ مکرم رحمتِ دو عالمؐ کے قدم لگے ہوں۔ انہیں ہر ذرّے سے رسول اللہؐ کی خوشبو محسوس ہو رہی تھی
اور اس طرح آپ طویل مسافت کے بعد آبلہ پا محبوب کے در تک پہنچے اور گنبدِ خضرا کو دیکھ کر دُور ہی سے
آپ پر رقت طاری ہو گئی۔ سب سے پہلے آپ نے مسجدِ نبوی میں نماز ادا کی پھر شکرانے کے نوافل ادا
کیے جب آپ دونوں باپ بیٹا مسجدِ نبوی میں بیٹھے تھے تو آپ کے کپڑوں اور جسم پر راستے کی گرد اتنی
زیادہ پڑی ہوئی تھی کہ وہاں پر کسی شخص نے آپ دونوں سے کہا کہ اپنے جسموں اور کپڑوں کو تو صاف کر
لو۔ آپ کے والد اُسے جواب دینے ہی والے تھے کہ خواجہ زبیر پہلے ہی بول اُٹھے اور فرمایا "تم نے صرف
ہمارے اوپر ظاہری گرد و غبار کو دیکھا ہے۔ تمہیں اس گرد و غبار کی قیمت کا کیا اندازہ ہے کہ اس کے اندر کیا
جذبے، کیا شوق، کیا وارفتگیاں اور کیا محبت شامل ہے۔ جس کے لیے ہم دیارِ حبیبؐ میں آئے ہیں اور
تم نے ہمارے پاؤں کے آبلوں کو تو دیکھا نہیں ورنہ تو ہمارے گرد و غبار سے اَٹے جسموں اور کپڑوں پر کبھی
تنقید نہ کرتا۔ ہم تو ان آبلوں کو بھی متاعِ عاشقاں خیال کرتے ہیں۔" وہ شخص اپنا سا منہ لیکر رہ گیا۔

آپ کے والد گرامی ابوالعلیٰ زیرِ لب رو کر خدا کے رسول سے عرض کر رہے تھے "اے حبیبِ خدا" جس
بیٹے کی خوشخبری آپ نے مجھے دی تھی وہ میں آپ کی خدمت میں لے کر حاضر ہو گیا ہوں آپ اُسے قبول
فرمائیں۔ دوسری طرف خواجہ محمد زبیر گریہ زاری کرتے ہوئے لب کناں تھے کہ اے رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم آپ نے میرے بارے میرے والد صاحب جو بشارت دی تھی اب مجھے وہ بھی دیجئے تاکہ
خدا تعالیٰ مجھے صالح رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ میں عاجز و ناتواں انسان ہوں میری عقل کمزور ہے سمجھ ناقص
ہے۔ میں عقل کے حوالے ہونے کی بجائے خدا کی دستگیری کا متمنی ہوں اور پہاڑ جیسی زندگی میں گناہ و مصیبت
سے اسی صورت میں محفوظ رہا جا سکتا ہے جب خدا کا فضل و کرم شاملِ حال رہے کیونکہ

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
گر نہ بخشد خدائے بخشندہ

خواجہ زبیر الحاج آہ و زاری کر رہے تھے۔ دعائیں مانگ رہے تھے۔ آنحضرتؐ کے روضے کی جالی تھامے
رو رہے تھے کہ اچانک اُن کو محسوس ہوا جیسے میرے اندر کوئی چیز سرائیت کر رہی ہے اور سیال چیز کی

مانند رگوں میں دوڑ رہی ہے۔ اس کیفیت سے آپ کو طمانیت سی محسوس ہوئی اور وہ عالم غنودگی میں چلے گئے انہوں نے دیکھا کہ ایک گراں بہا خلعت اُن کو پہنا دی گئی جس پر جلی حروف میں کچھ لکھا ہوا ہے اور غور سے پڑھنے پر اُن کو معلوم ہوا کہ اس پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم تحریر ہے اور تھوڑی دیر کے بعد جب وہ سلوک میں آ گئے۔ اُن سے اُن کے والد ابوالعلیٰ نے پوچھا کہ زبیر بیٹے تم کہاں کھوئے گئے تھے۔ خواجہ زبیر نے جواب میں اپنے والد گرامی کو وہ ساری کیفیت بیان کر دی اور خلعت کے متعلق بھی عرض کیا اس پر ابوالعلیٰ نے فرمایا "بیٹے اس ساری کیفیت کا مطلب کیا ہے"

خواجہ زبیر نے عرض کیا "بابا جان! میں آپ کے عرفان وجدان کے سہارے کے بغیر کچھ بھی نہیں اس لیے آپ مجھے اس کے متعلق بتائیں"

ابوالعلیٰ نے فرمایا "یہ خلعت تمہیں منصب قیومیّت پر فائز کرنے کے لیے عطا کی گئی ہے"

خواجہ زبیر کے دل میں ہر وقت خدا کا خیال رہتا اور اللہ کی محبّت میں آپ ہمیشہ سرشار رہتے تھے۔ آخر آپ کے والد نے آپ پر اکیس سال کی عمر میں خصوصی توجّہ دینی شروع کی۔ ابوالعلیٰ اپنے مریدوں کے ساتھ خواجہ زبیر کو ریاضت کرواتے اور جب یہ بات محسوس ہونے لگی کہ آپ کے کمالاتِ روحانی واضح ہیں اور آپکی ولایت چاروں طرف پھیلنے لگی تو ابوالعلیٰ نے اپنے مریدوں کو آپ کے پاس بھیجنا شروع کر دیا۔

کابل سے ایک قافلہ آیا اور وہ ابوالعلیٰ کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے اور عرض کی "حضرت ہمیں کسی ایسے نوجوان ولی کی تلاش ہے۔ عبادت و ریاضت میں جسکا کوئی ثانی نہ ہو۔ ہمارے بزرگوں کو ایسے ولی کی شکل بھی خواب میں دکھائی گئی تھی"

ابوالعلیٰ نے فرمایا "تو آؤ میں تم لوگوں کی ملاقات ایک ایسے نوجوان سے کراتا ہوں اگر تمہیں اُسکی شکل دکھائی گئی تھی تو تم اُسکو ضرور پہچان لوگے"

یہ کہہ کر آپ اُن قافلہ والوں کو خواجہ محمّد زبیر کے حجرے میں لے آئے۔ جب اہل قافلہ نے خواجہ زبیر کو دیکھا تو وارفتہ ہو کر رہ گئے اور کئی لوگوں نے اُن کے ہاتھ چوم لیے اور عرض کی "بے شک یہی وہ ولی ہیں جن کے متعلق ہم نے خوابوں میں دیکھا ہے اور اُن لوگوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کی درخواست کی۔ اِن لوگوں کو دیکھتے ہوئے دوسرے اہل قافلہ نے بھی بیعت کے لیے اپنے ہاتھ دراز کر دیے یوں پورے قافلے نے بیعت ہونے کے بعد آپ سے درخواست کی کہ آپ ہمارے ساتھ چلیں اور ہمارے علاقے کے باقی بھائیوں کا بھی اپنے مواعظ حسنہ سے ایمان تازہ کریں۔"

آپ نے حضرت ابوالعلیٰ سے اجازت طلب کی۔ انہوں نے اجازت دینے میں کوئی پس و پیش نہ کی اور آپ ان قافلے والوں کو روحانیت کی راہوں پر استوار کرنے کے لیے اُن کے ساتھ چل پڑے

جب آپ سرہند شریف پہنچے تو آپ سیدھے مجدد الف ثانیؒ کے مزار پر تشریف لے گئے وہاں پر بہت زیادہ ہجوم تھا جس کی وجہ سے آپ کو بیٹھنے کے لیے بہت کم جگہ ملی۔ وہاں پر آپ کے مریدوں نے اہل سرہند اور مزار پر موجود لوگوں کو آپ کے مقام کے متعلق آگاہ کرنا چاہا مگر سرہند والوں میں سے کسی نے آپ کو کوئی وقعت نہ دی بلکہ آپ کا حضرت امام ربانی کے مزار پر آنا بھی اُن لوگوں کو ناگوار گزرا۔ حضرت خواجہ زبیر

ے لوگوں سے پوچھا "تم لوگوں کو میرا یہاں آنا ناگوار معلوم ہوا ہے، لیکن میری تو حضرت مجدد الف ثانیؒ سے بت رہی ہے اور رشتۂ روحانیت ہے۔ میرے والد حضرت کے رشتہ دار اور خلیفہ تھے، لیکن اگر آپ لوگوں یری آمد سے تکلیف پہنچی ہے تو میں یہاں سے چلا جاتا ہوں۔ مزار کے سجادہ نشین کو اس بات کا پتہ تھا کہ اگر خواجہ زبیر کے متعلق سرہند والوں کو پتہ چل گیا کہ وہ حضرت مجدد الف ثانی کے رشتہ دار ں تو یہ اس کے حق میں اچھا نہیں ہوگا چنانچہ اُس نے یہی خواہش کی کہ آپ یہاں سے چلے جائیں۔ ہا کے مریدوں نے آپ کو مشورہ دیا کہ آپ سرہند سے کہیں نہ جائیں۔ حضرت مجدد الف ثانی کا مزار لوگوں کی جاگیر نہیں یہ روحانیت اور عبادت میں پرواز کرنے کی درس گاہ ہے یہاں ہر شخص کا برابر ہے۔ مگر آپ نے کہا کہ میں وہاں سے شاہ جہاں آباد چلا جاؤں گا مگر اہل سرہند اب زیادہ دیر پُر امن رہ سکیں گے اِن کے شدید جھگڑے ہوں گے اور یہ برباد ہو جائیں گے۔ یہاں سے خواجہ زبیر شاہ جہاں تشریف لے گئے اور ایک بوسیدہ سی مسجد میں قیام فرمایا۔ یہاں آپ کے پاس عقیدت مندوں کے غول ول آنے لگے اور پوری کی پوری آبادی آپ کی مُرید ہو گئی۔

دوسری طرف آپ کے والد ابوالعلیٰ کا وصال ہو گیا تو اُن کے سارے مُرید شاہ جہاں آباد پہنچ گئے۔

ایک مرتبہ ایک دولت مند آدمی کشمیر سے شمالی ہند پہنچا۔ اُسے کسی اہل روحانیت کی تلاش تھی اور اہتا تھا کہ کوئی مردِ حق اُسے خدا تعالیٰ سے ملا دے۔ اس سلسلہ میں اُس نے کئی لوگوں سے ملاقاتیں ے دھوکے بھی کھائے۔ تجربے بھی کیے۔ جب وہ پٹھان کوٹ میں پہنچا تو اُس کو ایک بزرگ شخص بتایا کہ جس کو تو تلاش کر رہا ہے وہ تو شاہ جہاں آباد میں ہے اُس کا نام خواجہ محمد زبیر ہے اور اُسکے نام ابوالعلیٰ ہے وہی تمہیں روحانیت کے اسرار سے آگاہ کر سکتا ہے کیونکہ اُس کا والد ابوالعلیٰ قیوم ے تھا اس لیے وہ قیوم رابع ہے اور قیوم ثانی حضرت مجدد الف ثانی کے بیٹے خواجہ معصوم تھے جبکہ اول حضرت مجدد الف ثانی خود تھے۔ وہ شخص خوشی سے سرشار اور منزل پر پہنچنے کے لیے بے چین جہاں آباد روانہ ہو گیا۔ جب وہ خواجہ زبیر کی خدمت میں پہنچا تو اُس کو معلوم ہوا راستے میں ملنے ے بزرگ خواجہ خضر تھے۔ آپ نے اُس شخص کو بیعت کیا اور اُس کی روحانیت سے تشنۂ روح کو یاب

حضرت خواجہ زبیرؒ کے عقیدت مندوں میں دن بدن اضافہ ہوتا گیا۔ آپ ہمیشہ اسوۂ رسول پر چلنے کی نصیحت تے تھے۔ آپ کو عمر کے آخری حصہ میں معدہ کی شکایت ہو گئی اور کثرتِ اسہال کی وجہ سے آپ مسلسل بخار ر رہنے لگے۔ تاہم آپ نے معمولات۔ ورود وظائف اور نوافل برقرار رکھے۔ مگر بیماری نے آپ کو اسقدر ر دیا کہ آپ کئی ماہ تک صاحب فراش رہے۔ ۵۔ ذیقعد کو آپ کا وصال ہوا اور آپ کا جسدِ خاکی پہنچایا گیا۔ آپ مجدد الف ثانی کے قدموں میں دفن ہوئے۔

حضرت شاہ سکندر رح

بیسویں صدی ہجری کا اختتام مسلمانانِ ہند کے لیے ابتلا کا دور تھا۔ بنیادی طور پر اسلام میں رخنہ اندازیاں ہو رہی تھیں اکبر دینِ الٰہی کے ذریعے اسلامی تعلیمات کو مسخ کر رہا تھا۔ خوشامدی علماء اس کے ہمنوا تھے۔ علمائے حق اس نازک دور میں بادشاہ کی اس بے راہ روی پر بے حد دل گرفتہ اور پریشان تھے۔ ایسے میں حضرت شاہ سکندر روشن الاولیاءؒ نے آوازۂ حق بلند کیا۔ وعظ و تلقین اور کشف و کرامات سے مسلمانوں کی کایا پلٹ دی اور مسلمانوں کا دورِ اوّل لوٹ آیا۔ انھوں نے احیائے دین کی روایت کو از سرِ نو تازہ کر دیا۔

کرامات کی حکمت یہی ہے کہ جب ہدایتِ انسانی میں مشکلات پیش آتی ہیں تو مشیتِ ایزدی اپنے برگزیدہ بندوں کو ایسی قوت سے نوازتی ہے جہاں عقل کا گزر ممکن نہیں۔

حضرت شاہ سکندرؒ کی ذات وہ مینارۂ نور تھی جس کی روشنی میں بیشمار طالبانِ حق نے راہ ہدایت پائی۔

ایک روز چند مشائخ اور خدام نے اعلیٰ حضرت شاہ کمالؒ کیتھلی کی خدمت میں عرض کیا "بڑے فرزند حضرت شاہ عماد الدین آپ کے رعب جلال سے خائف ہو کر دکن چلے گئے۔ دوسرے صاحبزادے حضرت شاہ موسیٰ ابوالمکارم کو قبولہ کی ولایت مل گئی اور سب سے چھوٹے بیٹے حضرت شاہ نور کمسنی میں رحلت کر گئے اب یہ مقام صاحب سجادہ سے خالی نظر آتا ہے آپ کے بعد ہم کس سے رجوع کر کے استفادہ کریں۔"

اعلیٰ حضرت نے ارشاد فرمایا "میرا جانشین عنقریب منصۂ شہود پر جلوہ گر ہونے والا ہے۔ اس کی تابانیوں سے ایک جہاں منور ہو گا۔ اس کے دسترخوان کرم سے عالی مرتبت ہستیاں ریزہ چینی کریں گی۔"

۲۹ شعبان ۸۶۳ / ۹۶۳ھ کو حضرت شاہ سکندر کی ولادت ہوئی۔ آپ کی والدہ جو حافظۂ قرآن اور رابعۂ عصر تھیں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے بشارت دی کہ تیرے بطن سے مبارک بچہ مثلِ آفتاب پیدا ہو گا۔ ولادت سے قبل آپ کی والدہ نے آدھی رات کو دیکھا کہ زمین سے آسمان تک روشنی

ہے۔ وہ گھبرا گئیں اور بارگاہ الٰہی میں سجدہ ریز ہوئیں کہ یہ کیا بھید ہے؟ ندا آئی کہ یہ تیرے فرزند کی پیدائش کا وقت ہے اور یہ روشنی اس کے دل کا نور ہے۔

عالم شیر خوارگی میں آپ اپنے جدِامجد حضرت غوث اعظم کی طرح ماہ رمضان میں دن کے وقت دودھ نہیں پیتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ کی والدہ نے دیکھا کہ آپ پنگھوڑے میں سو رہے ہیں اور سیاہ سانپ مگس رانی کر رہا ہے۔

ایک دن اعلیٰ حضرت شاہ کمال کیتھلی حوض کے کنارے وضو فرما رہے تھے۔ آپ کے دائیں طرف عصا اور عمامہ رکھا ہوا تھا کہ حضرت شاہ سکندر کھیلتے ہوئے آئے اور آپ کا عمامہ مبارک اپنے سر پر رکھا اور عصا ہاتھ میں لے کر چند قدم متانت اور سنجیدگی سے چلے اور پھر پلٹ کر اپنے جدِامجد سے پوچھا "بابا بتایئے میں آپ جیسا لگ رہا ہوں؟"

اعلیٰ حضرت کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی اور فرمایا بیٹا کمسنی کے باوجود مجھ جیسے ہی لگ رہے ہو۔ اچھا اب یہ عمامہ بھی تمہارا خلافت بھی تمہاری، میری جانشینی بھی تمہاری۔" یہ کہہ کر سینے سے لگایا اور پیار کیا۔

آپ کی وضع وروش حضرت غوث اعظم سید عبدالقادر جیلانی سے ملتی تھی۔ قاضی صدرالدین لاہوری پر حضرت غوث اعظم کی محبت غالب تھی اور وہ آپ کی روح کو ہر روز ایصال ثواب پہنچایا کرتے تھے۔ ایک رات انھوں نے حضرت غوث اعظم کو خواب میں دیکھا' فرما رہے ہیں۔ قاضی صدرالدین! کیتھلی میں ہمارے فرزند شاہ سکندر کے پاس جاؤ ان کی زبان ہماری زبان ہے۔

آپ ساری ساری رات عبادتِ الٰہی میں مشغول رہتے تھے۔ آپ کی نظر میں برق کی تاثیر تھی جس کی جانب بھی آپ دیکھتے وہ بے خود ہو کر رہ جاتا۔ ایک دفعہ آپ جنگل میں آدھی رات کے وقت مصروفِ عبادت تھے۔ چار رہزن اس طرف آ نکلے انھوں نے آپ سے شہر کی بابت پوچھا کہ کس طرف ہے اور یہاں سے کتنی دور ہے۔ آپ نے ان چاروں کو اپنے دامن میں لے لیا اور اپنی نگاہ کیمیا اثر سے درجۂ ولایت پر فائز فرما کر مختلف مقامات پر روانہ کیا۔

آپ جب کبھی باہر تشریف لے جاتے تو اہلِ باطن اکثر اپنے آپ کو چھپا لیتے اور اس راستے سے گزرنے کی ہمت نہ کرتے۔ ایک دفعہ ایک ویرانے سے آپ کا گزر ہوا، ایک بزرگ آپ کو آتے ہوئے دیکھ کر ایک طرف ہو گئے۔ ان بزرگ کے خادم نے ان سے وجہ دریافت کی تو بزرگ نے فرمایا' حضرت شاہ سکندر آفتاب ہیں جب آفتاب طلوع ہوتا ہے تو ستارے ماند پڑ جاتے ہیں۔

امام ربانی حضرت مجدد الف ثانیؒ کو آپ سے نسبت قوی اور رابطہ خاص رہا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ موسم گرما میں سورج کو جب وہ نصف النہار پر ہو کھلی آنکھوں دیکھ سکتا ہوں لیکن حضرت سکندر روس الاولیا کے قلب مبارک کی طرف دیکھنا چاہا تو نگاہیں خیرہ ہو گئیں اور تابِ جمال نہ لا سکیں۔

ان کے علاوہ آپ کے ہم عصر جلیل القدر بزرگوں نے بھی آپ کی روحانی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا محبوب الٰہی سے منقول ہے کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم شب معراج میں ایک خرقہ بہشت سے لائے تھے جس کے متعلق حکم تھا کہ جو صحابی اس کی شرائط پوری کرے اسی کو دیا جائے۔ چنانچہ رسالت پناہ نے حضرت صدیق اکبرؓ سے پوچھا کہ یہ خرقہ تم کو دیا جائے تو کیا کرو گے؟ انھوں نے کہا کہ میں صدق میں ترقی کروں گا، حضرت عمرؓ سے دریافت فرمایا۔ انھوں نے عرض کیا عدل وانصاف قائم

کروں گا۔ حضرت عثمان غنیؓ سے دریافت فرمایا تو انھوں نے جواب میں کہا کہ دنیا میں شرم و حیا کو رواج دونگا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے پوچھا تو انھوں نے عرض کیا یا رسول اللہ میں بندگان خدا کی پردہ داری اور عیب پوشی کروں گا۔ یہ جواب سن کر حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ مجھ کو یہی حکم تھا کہ جو شخص یہ جواب دے جیسا کہ اے علیؓ تم نے دیا اسی کو یہ خرقہ عنایت کرو۔

چنانچہ یہ وہی خرقہ ہے جو حسین علیہ السلام اور دیگر امامین کے ذریعے حضرت سیدنا عبدالقادر جیلانی تک پہنچا۔ حضرت غوث اعظم نے یہ خرقہ مبارک اپنے ذاتی کمالات سے مملو کر کے اپنے صاحبزادے حضرت سید عبدالرزاق کو سونپا اور ان سے خاندانی طور پر حضرت شاہ کمال تک پہنچا۔ حضرت شاہ سکندر نے وہ خرقہ مبارک امام ربّانی حضرت مجدّد الف ثانی شیخ احمد سرہندی کو عطا فرمایا۔ روایت ہے کہ وہ خرقہ مبارک امام ربّانی امام مہدیؑ کے درود مسعود پر ان کی خدمت میں پیش کریں گے۔

ایک مرتبہ امام ربّانی اپنی شادی کے بعد سخت بیمار ہو گئے۔ اہل خانہ ان کی زندگی سے مایوس ہو گئے۔ آپ کے والد نے ایک قاصد کے ذریعے آپ سے دُعا کی درخواست کی۔ آپ نے دوگانہ ادا کرنے کے بعد فرمایا۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں شیخ احمد جلد صحت یاب ہو جائیں گے۔ ان کے وجود سے دین مبین کو فروغ حاصل ہو گا۔ امام ربّانی سلسلۂ قادریہ میں آپ سے بیعت تھے اور خرقہ مبارک پہن کر امام ربّانی بے حد مسرور ہوئے۔ صاحب حضرت القدس کا بیان ہے کہ خرقہ مبارک پہننے کے بعد سرہند میں اس روز جنگل اور بیابان اولیاء اللہ سے بھر گئے تھے۔

ایک مرتبہ لاہور میں قیام کے دوران آپ نے شیخ طاہر لاہوری کو حکم دیا کہ شہر میں منادی کرادی جائے کہ جس کو لڑکے کی خواہش ہو وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو جائے۔ منادی کرادی گئی، ہزاروں حاجت مند حاضر ہو گئے۔ نذر قبول کرنے کے بعد آپ فرما دیتے تھے جاؤ لڑکا ہو گا۔ شہر کے چند بد باطن لوگوں نے اس اعلان پر مذاق کی خاطر ایک لڑکے کو زنانہ لباس پہنا کر آپ کی خدمت میں بھیجا۔ آپ نے اس کی نذر قبول فرمائی اور دُعا دی کہ جاؤ لڑکا ہو گا۔

باہر جا کر وہ بد باطن اور زیادہ بیہودہ گوئی کرنے لگے کہ دیکھئے بزرگ موصوف کو یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ یہ لڑکی نہیں بلکہ لڑکا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ نے لاہور میں قیام کے دوران سوا لاکھ لڑکوں کی بشارت دی۔ ان میں ایک عورت آئی جو ہرات کے شریف خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ شروع میں آپ نے تامل فرمایا پھر اس کے دل کی طرف دیکھ کر دعا دی۔ آپ اس واقعہ کے بعد دس ماہ تک لاہور میں مقیم رہے جن کو لڑکوں کی بشارت دی گئی تھی ان کے ہاں، بحکم خدا لڑکے پیدا ہو رہے تھے۔ جس لڑکے نے شرارت کی تھی اس کو بھی تکلیف ہو رہی تھی، وہ چلّانے لگا۔ لوگ جمع ہو کر ان کو لعنت کرنے لگے۔ آخر محلے کے شریف الطبع اور نیک لوگوں نے فیصلہ کیا کہ اس لڑکے کو آپ کی خدمت میں پیش کر کے اس کا قصور معاف کرایا جائے۔

چنانچہ لوگ اس لڑکے کو لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ حضور یہ کور باطن ہے اس کو معاف کیا جائے۔ اسی اثنا میں وہ عورت بھی آ گئی جس کو لڑکے کی طلب تھی۔ آپ کو لڑکے کی تکلیف پر رحم آ گیا۔ عورت کو حکم دیا کہ لڑکے کے پیچھے سے نکل جا عورت اس کے پیچھے سے نکل گئی۔ قدرت خداوندی سے وہ حمل عورت کو منتقل ہو گیا اور لڑکے نے تکلیف سے نجات پائی۔

جب اس عورت کے لڑکی پیدا ہوئی تو وہ آپ کی خدمت میں لے کر آئی۔ آپ نے فرمایا یہ لڑکی لڑکا

ہ کر مشہور ہوگی اور بڑا نام پائے گی۔ تاریخ میں وہ لڑکی زیب النساء کے نام سے مشہور ہوئی۔ وہ رقم جو نذر کی
ورت میں جمع ہوئی تھی شہر کے مصیبت زدہ لوگوں میں تقسیم کر دی گئی۔ ان ایام میں کئی ہزار لڑکیاں بیاہی گئیں۔
شیخ طاہر بندگی فرماتے ہیں کہ میں حضرت شاہ سکندر محبوب الٰہی کی خدمت میں رہتے ہوئے چلہ کشی کیا
رتا تھا ایک بار میں نے مراقبے میں دیکھا کہ حضرت شاہ سکندر قدس سرہٗ ایک پہاڑ پر تشریف رکھتے ہیں ان
ے اردگرد زرو جواہر کے ڈھیر ہیں، مخلوق خدا کا اژدھام ہے دونوں ہاتھوں سے لوگوں کو تقسیم فرما رہے ہیں، اس
م کے باوجود زرو جواہر میں کمی کی بجائے اضافہ ہو رہا ہے، مراقبہ سے فارغ ہو کر میں آنجناب کی خدمت میں
ر ہوا اور یہ واقعہ بیان کرنے ہی والا تھا کہ آنجناب نے فرمایا۔ طاہر جو کچھ تم نے دیکھا ہے یہ اس شفقت
ے پایاں کا نتیجہ ہے جو حضرت غوث اعظم کی ہم پر ہے۔ کرامت الاولیاء سے منقول ہے کہ ایک مرتبہ حضرت
ہ سکندر سرہند تشریف لائے، سخت گرمی کا موسم تھا۔ آپ شیخ احمدؒ کے گھر پہنچے سورج نصف النہار پر تھا۔
ربانی قیلولہ کے لیے گھر جا چکے تھے۔ اطلاع ملتے ہی باہر آئے اور کچھ اس انداز سے پذیرائی کو آگے بڑھے
ان کے بزرگوں کا حصہ ہے۔ خادم کو بھیج کر کنوئیں سے تازہ پانی منگوایا اور خود اپنے ہاتھوں سے حضرت
ہ سکندر رؤس کے پاؤں دھوئے سپاس گزاری یہ تھی کہ مرشد نے دھوپ میں قدم رنجہ فرمایا ہے۔
حضرت شاہ سکندر رؤس بھی امام ربانی سے بے حد محبت کرتے تھے اور ان کی بڑی قدر و منزلت فرماتے
۔ ایک روز فرمایا۔ اگر چاہتے ہو العلما وراثت الانبیاء کے معنی معلوم ہوں تو شیخ احمد دیکھ لیں۔
حضرت القدس سے منقول ہے امام ربانی کی محبت اور عقیدت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے
امام ربانی نے اپنے بیٹے یحییٰ کو یحییٰ کہہ کر کبھی نہ پکارا کیونکہ یہ حضرت شاہ سکندر کی گود میں بیٹھ چکا تھا۔
لیے اس کو ہمیشہ شاہ جیو کہہ کر پکارا۔ شاہ جیو پر قادری نسبت غالب رہی۔ شاہ جیو اپنی اس نسبت پر
ہ فخر کیا کرتے تھے کہ مجھے حضرت شاہ سکندر قدس سرہٗ نے بچپن میں ہی سلوک قادریہ میں مشرف فرمایا تھا
آپ طبعاً سلاطین اور امراء سے گریز کرتے تھے۔ البتہ اخلاقاً مل لیتے تھے۔ ایک مرتبہ حاکم سامانہ نے آپ کی
مت میں حاضر ہو کر قرب الٰہی کے بارے میں استفسار کیا۔ آپ نے فرمایا کہ آپ ہم فقیروں سے خدا کی پناہ
ب کرتے ہیں اور ہم اہل دنیا سے حق تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہیں۔ اس وقت ہندو پاکستان میں جتنے قادری،
بی، طاہری قادری اور فاضلی خانقاہیں ان کے رشتۂ ارادت کی ڈور آپ کے توسط سے ہی اپنے مرکزی
ے تک پہنچتی ہے۔

آپ کو مکاشفہ میں وصال کا وقت بتا دیا گیا تھا۔ ۹ جمادی الاول ۱۰۲۳ھ کو تازہ غسل فرمایا۔ نماز پڑھی،
ئے صلوٰۃ کے بعد دیر تک سربسجود رہے تبرکات جو سلسلہ بسلسلہ چلے آ رہے تھے وہ دونوں صاحبزادوں
ت شاہ گدا رحمٰن عباس اور شاہ محب اللہ الیاس کو عنایت فرمائے اور ضروری نصائح کے بعد دوسرے روز
ع آفتاب کے بعد رحلت فرمائی۔ درج ذیل قطعہ سے عبدالستار سہرائی نے مادۂ تاریخ نکالی۔

حضرت شاہ سکندر قطب دیں
چوں ز دنیا شد سوئے خلد بریں
گفت سال وصلی ہاتف پاکباز
شد سکندرؒ سوئے یارے دلنواز

کسی شخص نے ایک بزرگ کی خدمت میں آکر عرض کی "حضرت میں آپ کی توجہ کا طالب ہوں مجھ پر نظر عنایت کیجئے۔"

بزرگ نے جواب دیا۔ "وضو کرو اور نماز کے لیے کھڑے ہو جاؤ جو چاہو گے مل جائے گا"۔ اس شخص
زرگ کی یہ بات ناگوار گزری اس نے منہ بنا کر کہا۔
"واہ یہ کیا بات ہوئی؟ نماز کا وضو تو رسولِ خدا کے حکم کی رو سے گناہوں کا کفارہ ہے، پھر آپ کی توجہ کی
ضرورت ہے؟"
بزرگ کو اُس کی بے ادبی ناگوار گزری اور اُنہوں نے قدرے درشت لہجے میں فرمایا۔ "تو کچھ بھی نہیں"
اس کے سامنے سے اُٹھ کر اندر چلے گئے۔ ابھی آپ اندر بیٹھے بھی نہ تھے کہ الہام ہوا۔ "اے خدا کے
ے ہم نے تمہیں اپنی مخلوق میں اس لیے رکھا کہ ان کی بے ادبیوں سے درگزر کرو اور اُنہیں راہِ ہدایت
اؤ، پھر تم نے وَيَدْرَؤُنَ — (برائی کے بدلے نیکی اختیار کرتے ہیں) پر عمل کیوں نہ کیا۔
بزرگ اُسی وقت باہر نکلے اور ایک شخص کو اُس آدمی کے پیچھے روانہ کر دیا کہ اُسے لے کر آؤ۔ قاصد
ی آدمی کے پاس پہنچا اور بزرگ کا پیغام دیا۔ آدمی نے بیزاری سے کہا "اپنے شیخ سے کہہ کہ میں نہیں
۔ قاصد نے بہت اصرار کیا مگر وہ واپسی پر آمادہ نہ ہوا۔ قاصد ناکام لوٹا اور آکر بزرگ سے کہا کہ وہ اس
ر ناراض ہے کہ واپس نہیں آتا۔"
بزرگ نے کہا "اچھا تو ایک بار پھر واپس جا اور اُس کے دونوں کانوں میں اللہ اللہ کہہ اور پھر اُسے
نے کندھے پر اُٹھا لا۔"
قاصد واپس گیا اور اُس آدمی سے کہا "میں کہتا ہوں آرام سے میرے ساتھ چل ورنہ میں زبردستی کروں
" اس آدمی نے بدستور بیزاری سے جواب دیا "جب میں خود نہ جانا چاہوں تو تو کس طرح مجھے زبردستی اپنے

ساتھ لے جا سکتا ہے۔"

اُس نے مسکرا کر کہا "اچھا اپنا کان میرے مُنہ کے قریب لا اور ایک بات سُن لے اُس کے بعد تیری مرضی۔"

آدمی نے اپنا کان قاصد کے مُنہ کے قریب کر دیا قاصد نے لفظ اللہ کہہ کر دوسرے کان کو بھی مُنہ کے قریب کر لیا اور اس میں بھی اللہ کہہ دیا۔ آدمی کو یوں لگا جیسے اس کے دل و دماغ کو سُن اور بے حس کر دیا گیا ہو وہ چکرا کر زمین پر گر گیا۔ قاصد نے اُسے اُٹھا کر بزرگ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ بزرگ نے اُسے اپنے سامنے لٹایا اور پھر اس کے رُوبرُو کھڑے ہو کر کچھ پڑھنے لگے اور اُس پہ کئی بار دم کیا۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ شخص ہوش میں آیا تو اُس کی دُنیا ہی بدل چکی تھی۔ اُس نے شرمندگی سے آنکھیں چُرائیں اور بزرگ سے پوچھا "حضور میرے لیے آپ کا کوئی حکم۔"

بزرگ نے فرمایا: "تُو کچھ عرصہ میرے پاس رہ تاکہ میں مزید توجہ دے سکوں۔"

چند دِنوں بعد جب وہ شخص رُخصت ہُوا تو وہ خود بھی ولی کامل بن چُکا تھا۔

اپنی نظرِ عنایت سے دل و دماغ کی کایا پلٹنے والے اس بزرگ کا نام حضرت شیخ آدم بنوری تھا۔ اِن کا خاندان روم سے وارِدِ برِّصغیر ہوا اور سرہند میں مستقل سکونت اختیار کی یہ صحیح النسب سیّد گھرانہ تھا۔

آپ اپنی پیدائش سے ہی نہایت خاموش اور بُردبار نظر آتے تھے۔ آپ کے ماں باپ آپ کو دیکھ کر پھُولے نہ سماتے تھے۔ جب آپ کے والد نے آپ کا نام آدم رکھا تو آپ کی والدہ کو یہ نام عجیب سا لگا اور اُنہوں نے اپنے شوہر سے کہا "جناب! یہ کیا نام ہُوا؟ آدم؟ اس کا مطلب؟"

آپ کے والد سید اسمٰعیل نے جواب دیا "بیوی! اس کا مطلب یہ ہُوا کہ ہمارے گھر میں بزرگی اور فضیلت کی ابتدا اس سے ہو گی۔ یہ پہلا شخص ہو گا جو اپنے خاندان میں بزرگی اور عظمت میں کوئی ثانی نہ رکھے گا۔"

بیوی نے کہا "خدا کرے ایسا ہی ہو۔"

اکثر بڑے لوگوں کی طرح آدم کے ماں باپ بھی بچپن ہی میں فوت ہو گئے تھے۔ اِن کی تعلیم و تربیت بھی نہ ہو سکی۔ آدم کو بڑی فکر تھی کہ وہ علومِ ظاہری سے محروم تھے اور بظاہر اس کے حصول کی کوئی صورت بھی نظر آتی تھی۔

ایک دن تنہائی میں یہی سوچ رہے تھے کہ میرے حصول علم کا وسیلہ کہاں سے ہو گا کہ انہیں یوں محسوس ہوا جیسے کوئی اُنہیں بلا رہا ہے۔ آدم نے اپنے اِردگرد دیکھا مگر کوئی نظر نہ آیا۔ یہ پھر اپنے خیالوں میں کھو گئے۔ اسی عالم میں اُنہوں نے سُنا کوئی کہہ رہا ہے: "اے شیخ آدم! تم قرآن کیوں نہیں پڑھتے؟"

انہوں نے ایک بار پھر چاروں طرف دیکھا مگر کوئی نظر نہ آیا۔ حیرت اور تجسس سے کہا "تم کون ہو اور کہاں سے بول رہے ہو؟ مجھے نظر کیوں نہیں آتے؟"

جواب میں وہی آواز سنائی دی "شیخ آدم! کیا تم نے میری آواز نہیں سُنی؟ تم قرآن کیوں نہیں پڑھتے؟"

آدم نے جواب دیا "میں آواز سُن رہا ہوں، اسی لیے میں نے سوال کیا کہ تم کون ہو اور کہاں سے بول رہے ہو؟ مجھے نظر کیوں نہیں آتے؟"

جواب ملا "یہ ندائے ہاتفِ غیب کی ہے، دیکھنے کی کوشش نہ کرو، کیونکہ دکھائی کچھ بھی نہ دے گا!"

آدمؒ نے عرض کیا: "بارِ الٰہا! تُو قرآن پڑھنے کا حکم ایک ایسے شخص کو دے رہا ہے جو اُمّی ہے اور پڑھنا نہیں جانتا۔"

ہاتفِ غیب نے کہا: "شیخ آدم! یہ میرا حکم ہے کہ تو قرآن پڑھ۔ آخر پڑھتا کیوں نہیں؟"
آدمؒ نے جواب دیا: "اے اللہ! میں نے پہلے ہی عرض کر دیا کہ میں اُمّی ہوں اور مجھ کو پڑھنا لکھنا بالکل نہیں آتا..... اللہ! جب تک تیرا اشارہ شاملِ حال نہ ہو، میں کس طرح قرآن پڑھ سکتا ہوں۔ اگر تو چاہے تو چشم زدن میں خواندہ ہو سکتا ہوں۔"
ہاتفِ غیب نے کہا: "ادھر دیکھ اس سمت۔"
آدمؒ نے آواز کی طرف دیکھا وہاں ایک ہاتھ موجود تھا جس سے نور کی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ یہ ہاتھ آہستہ آہستہ ان کے سینے کی طرف بڑھنے لگا۔ آدم چند قدم پیچھے ہٹے مگر اس ہاتھ نے پیچھے نہیں ہٹنے دیا اور اس کے سینے پر حرکت کرنے لگا۔ اس حرکت کے ساتھ ہی آدم کو یہ محسوس ہونے لگا کہ وہ علومِ ظاہری سے مالا مال ہوتے جا رہے ہیں۔ اُنہیں چشم زدن میں علم کی دولت سے نواز دیا گیا تھا۔
اس آواز نے اُنہیں ایک بار حکم دیا: "آدم! قرآن پڑھو۔ آخر پڑھتا کیوں نہیں؟"
آدم کے سامنے نہ قرآن تھا نہ کوئی اور کتاب، لیکن اس کے باوجود وہ روانی سے قرآن پاک پڑھنے لگے ان کا خیال تھا یہ آواز اُنہیں کوئی اور حکم دے گی لیکن اس کے بعد یہ آواز نہیں سنائی دی۔

✠

آدمؒ نے جوانی میں قدم رکھا تو معیشت کی فکر نے اُنہیں ستانا شروع کر دیا۔ ان دنوں سپاہی بن جانا بہترین پیشہ تھا۔ آدم نے اپنے لیے بھی اسی پیشے کو اولیت دی اور ملازمت کی تلاش میں ادھر اُدھر آنے جانے لگے۔ آخر وہ شاہی لشکر میں سپاہی ہو گئے انہوں نے فنِ سپاہ گری بھی حاصل کر لیا تھا۔ شاہی لشکر جدھر بھی بھیجا جاتا..... اس میں آدم ضرور موجود ہوتے۔
دہلی کے قریب ایک گاؤں نے سرکشی اختیار کی اور بادشاہ کے حکم کو پس پُشت ڈال دیا۔ بادشاہ نے فوج کو حکم دیا کہ ان سب کو فنا فی النّار کر دیا جائے۔
آدم شاہی دستے کے ساتھ اس گاؤں پہنچ گئے۔ آدم نے کسی راہگیر سے پوچھا: "بھائی مجھے ایک بات تو بتانا بڑی مہربانی ہوگی۔"
راہ گیر نے کہا: "پوچھو، اگر آپ کی بات کا میرے پاس جواب ہوگا تو ضرور دوں گا۔"
آدمؒ نے پوچھا: "اس گاؤں میں اکثریت کن کی ہے؟ ہندوؤں کی یا مسلمانوں کی؟"
راہ گیر نے جواب دیا: "حضرت! میں خود مسلمان ہوں اور اچھی طرح جانتا ہوں کہ یہاں ایک مسلمان بھی نہیں ہے۔ یہاں سارے کے سارے ہندو ہیں۔"
آپ نے حیرت سے کہا: "یعنی اس گاؤں میں ایک بھی مسلمان نہیں۔"
اُس نے جواب دیا۔ "میں نے عرض جو کیا اس گاؤں میں ایک مسلمان بھی نہیں۔"
آپ خاموش ہو گئے۔ گاؤں کے در پر رک گئے اور انہیں حکم دیا: "گاؤں والو! میں تمہارے گاؤں اس لیے آیا ہوں کہ مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ تم سب حق سے گریزاں اور کفر پر قائم ہو۔ اگر یہ بات درست ہے تو میں تمہاری اصلاح کرنے آیا ہوں۔"
کسی گاؤں والے نے جواب دیا: "اے نادان شخص! اگر میں یہ کہوں کہ ہم حق پر ہے اور تم لوگ کفر پر، تو اس کی تصدیق و تردید کون کرے گا؟ اس لیے بہتر یہی ہے کہ جو جس کا مسلک یا عقیدہ ہے اس پر قائم رہے

اور دوسرے کے مسلک اور عقیدے میں مداخلت کا خیال تک دِل میں نہ لائے۔"

آدمؒ نے اور زیادہ سخت لہجے میں کہا "میں حق اور کفر سے اچھی طرح واقف ہوں اس لیے مجھے کسی سے بھی یہ نہیں معلوم کرنا ہے کہ حق پر کون ہے اور کفر پر کون۔"

اس کے بعد آدمؒ نے اپنی فوج کے ساتھ گاؤں پر حملہ کر دیا۔ گاؤں والوں نے ان کا مقابلہ کیا اور بڑی بے جگری سے لڑے۔ آدمؒ بار بار یہی کہہ رہے تھے کہ ان میں سے ایک بھی بچ کر نہ جانے پائے اور آخرکار ہوا بھی یہی۔ گاؤں کے سارے لوگ ہی قتل کر دیے گئے۔ آدم غصے میں بے قابو ہو کر گاؤں میں داخل ہو گئے اور مندروں کو ڈھانا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ وہ ایک سب سے زیادہ شاندار مندر میں گھس گئے۔ وہاں ایک شخص مورتی کے آگے اس کے قدموں میں پیشانی ٹکائے گڑگڑا رہا تھا "اے بھگوان! ان ملیچھوں سے ہمیں نجات دے ورنہ ہم کہیں کے بھی نہ رہ جائیں گے۔"

"آدم شمشیر برہنہ لیے اس شخص کے سر پہ پہنچ گئے اور اس کو حکم دیا "اے شخص! سیدھا کھڑا ہو جا" اس شخص نے گویا آدم کا حکم سنا ہی نہیں۔

آدم نے ایک بار پھر حکم دیا "اے شخص! تو میری آواز نہیں سن رہا کیا؟ میری بات کا جواب دے ورنہ بعد میں تو پچھتائے گا۔"

اس شخص نے پھر کوئی جواب نہیں دیا اور مورتی کے آگے سر جھکائے رہا۔

آدم نے سختی سے حکم دیا "اے شخص! بس اس میں تیری نجات ہے کہ تو کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو جا اگر اس میں پس و پیش سے کام لیا تو میں تجھ کو فوراً ہی قتل کر دوں گا۔"

اس شخص نے آدم کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ مورتی کے قدموں میں اسی خشوع و خضوع سے گڑگڑاتا رہا۔ آدم نے آخری بار متنبہ کیا "کیا تو بہرا ہے؟ کیا میری آواز تیرے کانوں تک نہیں پہنچ رہی؟"

اس نے لاپرواہی سے گردن اُٹھا کر جواب دیا "اے ملیچھ! تو کیوں کان کھا رہا ہے۔ اپنا کام کر۔ مجھ کو اپنے عقیدے میں اتنا بودا نہ سمجھ۔"

آدم کی تلوار بلند ہو کر اس کی گردن پر گری۔ سر جسم سے الگ ہو گیا۔ آدم نے اس کو قتل تو کر دیا تھا مگر انہیں بڑی خفت محسوس ہوئی۔ ایک شخص جو خدائے واحد پر یقین نہیں رکھتا تھا اور پتھر کی مورتیوں کو معبود سمجھ رہا تھا اپنے باطل اور کافرانہ عقیدے میں اتنا راسخ اور مضبوط تھا کہ دین داروں اور حق پرستوں کو رشک آ جائے۔ آدم کی باطنی دُنیا زیر و زبر ہو گئی۔ وہ پریشان اور افسردہ کئی دن اپنے گھر سے باہر نہ نکلے۔ ان کی کوشش تھی کہ مضمحل اور منتشر طبیعت قابو میں آ جائے لیکن وہ اس میں ناکام رہے۔ آخر کئی دن بعد جب گھر سے نکلے تو انہوں نے پہلا کام یہ کیا کہ شاہی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ اب انہیں کسی رہنما کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی جو ان کے باطن کو جلا بخش سکتا اور ان کے عقائد اور ایمان کو بت پرست سے زیادہ مضبوط اور راسخ کر سکتا۔

اب ان کا یہ دستور ہو گیا تھا کہ جس درویش کا چرچا سنتے اس کے پاس پہنچ جاتے اور اس سے کچھ حاصل کرنے کی کوشش کرتے لیکن کچھ عرصہ میں ہی انہیں اس فقیر میں بھی کسی کمی کا احساس ہونے لگتا اور وہ کسی دوسرے فقیر کی طرف رجوع ہو جاتے۔ یہ روش مدتوں جاری رہی اور جب اُنہوں نے خود کو مایوس اور بیزاری میں گرفتار محسوس کیا تو انہیں کسی مرد کامل کی تلاش ہوئی۔ اب اُنہوں نے ہر کس و ناکس کے پاس جانے کی روش ترک کر دی۔ اس دوران ان کی ملاقات ایک گوشہ نشین بزرگ سے ہو گئی۔ اس نے آدم کو پریشان اور مضطرب دیکھا تو

...ہا "خیریت تو ہے؟ تم پریشان کیوں ہو؟"
انہوں نے جواب دیا "بابا! میں کوشش تو بہت کرتا ہوں مگر وہ حاصل نہیں ہوتا جس کی مجھے طلب ہے۔"
گوشہ نشین فقیر نے جواب دیا "بابا! میں تمہاری بابت بس اتنا جانتا ہوں کہ تمہاری بے چینی اور اضطراب کا علاج ...رت مجدد الف ثانیؒ کے پاس ہے۔ اِدھر اُدھر بھٹکنے اور بھاگنے دوڑنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔"
آدمؒ نے کہا "اگر یہ بات ہے تو میں ان کی خدمت میں فوراً پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں۔"
درویش نے جواب دیا "ہاں میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اس عہد میں مجدد الف ثانیؒ سے افضل اس امت ...ں کوئی دوسرا نہیں اور میں یقین رکھتا ہوں کہ انہی کی وجہ سے تمہیں بہت سی نعمتیں حاصل ہوں گی۔"
آدمؒ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر حضرت مجدد الف ثانیؒ کی خدمت میں روانہ ہو گئے۔ ابھی یہ راستے ہی میں تھے ...ان کی ملاقات حاجی خضر خان افغانی سے ہو گئی۔ یہ ان دنوں ملتان میں مقیم تھے۔
حاجی خضر خان ملتانی نے کہا "آدم! حضرت مجدد الف ثانیؒ کی خدمت میں پہنچنے سے پہلے کچھ عرصہ میرے پاس ...و تاکہ تم شیخ کی صحبت کے لائق ہو جاؤ۔"
آدمؒ نے انکساری سے عرض کیا "میں حاضر ہوں، آپ جیسا فرمائیں گے اس پر عمل کروں گا۔"
یہ حاجی خضر خان افغانی کی خدمت میں رک گئے اور مقامات عالیہ سے مشرف ہوئے لیکن تشنگی بدستور برقرار ...ہی۔ یہ ایسی پیاس تھی جو بجھتی ہی نہ تھی ان کی تشنگی کا اندازہ حاجی خضر خان نے بھی لگا لیا اور صاف صاف ...ہ دیا "آدم! اب میں نے تمہیں اس لائق کر دیا ہے کہ تم حضرت مجدد الف ثانی کی صحبت میں رہ سکو، اس لیے میں ...ہیں اجازت دے رہا ہوں کہ تم حضرت پیرو مرشد کی خدمت میں چلے جاؤ۔"
آدمؒ نے پوچھا "وہ مجھے کہاں ملیں گے؟"
حاجی خضر خان نے جواب دیا "اجمیر میں! کیونکہ مجھ کو وثوق سے معلوم ہوا ہے کہ آج کل وہ اجمیر میں تشریف ...رما ہیں اور ان کے شائقین اجمیر پہنچ رہے ہیں۔"
آپ سیدھے اجمیر پہنچے اور حضرت مجدد الف ثانیؒ سے ملاقات کی۔ انہوں نے آدم سے نہایت شفقت اور محبت ...سلوک کیا اور ان پر خاص توجہ دی۔ دن کا کوئی وقت بھی ایسا نہ تھا جو حضرت مجدد الف ثانیؒ کی توجہ سے خالی ...وتا اور کسی بھی رات کا ایک لمحہ بھی ایسا نہ تھا جس میں آدم کو بھلا دیا گیا ہوتا۔
جب آدمؒ مجدد الف ثانیؒ کی صحبت اور فیض سے سرشار ہو چکے تو حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اپنے بیٹوں کے لیے ...چھ تحائف دے کر سرہند روانہ کر دیا اور کہا "میری یہ امانتیں تم سرہند میں میرے بیٹوں کے پاس لے جاؤ اور اس ...قت تک یہیں رہو جب تک کہ میں خود نہ بلاؤں۔"
آدمؒ کے پاس تعمیل کے سوا لب کشائی تک کی ہمت نہیں تھی۔ ان دنوں اجمیر میں دریا خان نامی ایک امیر حضرت ...مجدد الف ثانیؒ کی خدمت میں بڑی حاضریاں دے رہا تھا۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے دریا خان سے کہا "دریا خان ...یں اپنے مرید کو سرہند روانہ کر رہا ہوں، لیکن ڈرتا ہوں کہ اس کو راہ میں کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔ تم اس کی ...مدد کرو۔"
دریا خان نے بصد انکسار پوچھا "آپ جیسا حکم فرمائیں میں اس کی تعمیل کو حاضر ہوں۔"
مجدد الف ثانیؒ نے فرمایا "تم آدم کے ساتھ سو شہسواروں کا دستہ کر دو۔ اس دستے کا ہر سپاہی فن سپاہ گری ...یں ماہر ہونا چاہیے۔"

دریا خان نے بے چون وچرا..... آپ کے حکم کی تعمیل کر دی۔
ان ایک سو سواروں کی معیت میں آدمؒ سرہند پہنچ گئے اور وہیں قیام فرمایا۔ پیر ومرشد کے صاحبزادگان کو تحفے وغیرہ دے دیئے اور پیر ومرشد کے دوسرے حکم کا انتظار کرنے لگے۔ وہ ایک سو سپاہی جو آپ کے ساتھ آئے تھے آپ سے بے حد متاثر اور خوش تھے۔ آپ ہر روز مجلس منعقد کرتے اور اس میں موثر وعظ دیا کرتے تھے۔ سرہند میں اس روش سے جوش وخروش پیدا ہو گیا اور سامعین ایسا محسوس کرتے گویا ان کے سینے سے دل نکلا پڑ رہا ہے۔ کچھ ہی عرصہ بعد ان سو سواروں نے آدم سے درخواست کی کہ انہیں باقاعدہ مرید کر لیا جائے۔ آپ کو تامل ہوا اور فرمایا "افسوس کہ میں اس وقت تک مرید نہیں کر سکتا جب تک کہ پیر ومرشد کی طرف سے اس کی واضح اجازت نہ مل جائے۔"
افغان سوار خاموش ہو گئے، لیکن چند دنوں بعد دریا خان بھی سرہند پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ ہی حضرت مجددالف ثانیؒ بھی سرہند میں داخل ہوئے۔ آدمؒ کو طلب فرما کر خود ہی ارشاد فرمایا "آدم تو نہیں جانتا کہ میں نے تیرے ساتھ سو سوار کیوں روانہ کیے تھے۔"
آدمؒ نے جواب دیا "اگر مجھے اس کا علم بھی ہو میں اس کا اظہار نہیں کر سکتا۔ کیونکہ پیر ومرشد کے کسی حکم پر اپنی طرف سے اظہار خیال میں لب کشائی کی جرأت کو میں گستاخی سمجھتا ہوں۔"
حضرت مجددالف ثانی نے فرمایا "میں چاہتا تھا کہ تیری صحبت میں جو بھی رہے اس پہ تیری تجلی صحبت سایہ فگن ہو جائے۔ مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ دریا خان کے سو سوار تجھ سے اتنے متاثر ہوئے ہیں کہ وہ تیری مریدی اختیار کرنے کے خواہشمند ہیں۔"
آدم نے جواب دیا۔ "آپ نے بجا ارشاد فرمایا مگر میں نے انہیں منع کر دیا اور صاف صاف کہہ دیا کہ جب تک آپ مجھے اس کی اجازت نہ دے دیں میں یہ جرأت نہیں کر سکتا۔"
مجددالف ثانی نے فرمایا "میں نے تجھے اجازت دی۔ اب تو اس سلسلے کو جاری کر سکتا ہے۔ میں نے تجھ کو اس لائق کر دیا ہے کہ تجھ سے رشد وہدایت اور مریدی کا سلسلہ شروع کیا جائے۔"
چنانچہ دریا خان کے سو سوار اسی دن آپ سے بیعت ہو گئے۔ دریا خان نے جو یہ منظر دیکھا اور اپنے سواروں سے آدم کی تعریف وتوصیف سنی تو وہ بھی آدم کے حلقۂ بیعت میں داخل ہو گیا۔ یہ آدم کی صوفیانہ زندگی کا پہلا موقع تھا کہ ایک وقت اور ایک ساتھ سو آدمیوں نے آپ سے بیعت کی اور بعد میں اس کے دوسرے ماتحتوں اور زیر دستوں نے آدم کی بیعت کر لی۔
ان دنوں افغانستان سے جو لوگ سرہند میں داخل ہوتے وہ دریا خان ہی کے پاس قیام کرتے تھے اور جب انہیں یہ معلوم ہوتا کہ دریا خان اور اس کے ساتھی اور خدمت گزار آدم سے بیعت ہیں تو آمدہ لوگ بھی آدم ہی سے بیعت ہو جاتے۔ اس طرح ان کے مریدوں کی تعداد میں دن دونی رات چوگنا اضافہ ہونے لگا۔

٭

کچھ عرصہ بعد حضرت مجددالف ثانیؒ نے وصال فرمایا۔ اس وقت تک آپ خود کو آدم خان کہلواتے تھے لیکن وصال سے پہلے پیر ومرشد کے حکم پر آپ نے لفظ خان نام سے نکال دیا اور سرہند کے مضافات میں بنور نامی قصبے کی سکونت کی نسبت سے آدم بنوری کا لقب دیا۔ یہی نام بھی تھا اور لقب بھی۔
جب آپ کو شہرت اور ناموری حاصل ہونے لگی تو لوگ آپ سے حسد کرنے لگے۔ ان ایام میں سید علم اللہ نامی

ب امیر زادے نے شیخ آدم کی خدمت میں شوقِ طریقت میں حاضری دی اور دن رات کا زیادہ حصہ آپ ہی
ے پاس گزارنے لگے۔ سید علم اللہ علوم ظاہری اپنے بھائی سے حاصل کرتے تھے۔ ان کے بڑے بھائی علم و فضل
ں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی علم اللہ کو اپنی صحبت سے غیر حاضر جو پایا تو جستجو
دی کہ یہ کہاں چلا جاتا ہے۔

ایک دن ـــــ جب علم اللہ رات کو گھر میں داخل ہوئے تو اُن کے بڑے بھائی جاگ رہے تھے اور انہیں
م اللہ کا بڑا انتظار تھا۔ علم اللہ نے دبے قدموں اپنے بستر کا رُخ کیا مگر بڑے بھائی نے اسی وقت آواز دی۔
علم اللہ! کہاں ہو؟ میرے پاس تو آؤ۔"

علم اللہ گھبرا گئے۔ کھسیانی ہنسی سے پوچھا: "ارے آپ ابھی تک جاگ رہے ہیں۔"

بڑے بھائی نے کہا: "ہاں میں ابھی تک جاگ رہا ہوں اور میں یہ تہیہ کیے ہوئے جاگ رہا تھا کہ اگر تم
ری رات نہ آتے تو پوری رات بیدار رہتا۔"

علم اللہ نے پوچھا: "خیریت تو ہے؟ ایسی کیا مشکل پیش آگئی کہ آپ کی نیند ہی اُڑ گئی۔"

بڑے بھائی نے پوچھا: "یہ شب و روز کا بیشتر وقت کہاں گزر رہا ہے آج کل۔"

علم اللہ نے جواب دیا: "شیخ آدم بنوری کی خدمت میں۔"

بڑے بھائی کا غصے سے چہرہ لال ہو گیا کہا: "تم وہاں کیوں جاتے ہو؟"

علم اللہ نے جواب دیا: "شوقِ طریقت میں، اور ظاہر ہے کہ میں آپ سے علومِ ظاہری تو حاصل کر سکتا ہوں مگر
راہِ طریقت کی راہنمائی آپ کے بس کی بات نہیں۔"

بڑے بھائی نے گرم ہو کر کہا: "یہ آدم بنوری وہی شخص ہے نا جو اُمّی ہے اور لکھنا پڑھنا نہیں جانتا؟"

علم اللہ نے جواب دیا: "یہ وہی آدم بنوریؒ ہیں۔ وہ اُمّی تو ہیں مگر انہیں علمِ لدنی حاصل ہے۔ اس لیے انہیں
آپ کے ظاہری علم کی کوئی ضرورت نہیں۔"

بڑے بھائی کو ہنسی آگئی طنزاً کہا: "تو آدم بنوری کو علمِ لدنی حاصل ہے! لیکن تمہیں اس کا علم کس طرح ہوا۔
کیا شیخ آدم بنوری اس سلسلے میں خود ہی اعلان کرتے ہیں؟"

علم اللہ نے جواب دیا: "نہیں، یہ جو کچھ میں نے کہا، وہ میں نے اپنی طرف سے کہا ہے۔ اس میں آپ
کو اعتراض کیوں ہے؟"

بڑے بھائی نے کہا: "مجھ کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے، لیکن میں یہ نہیں برداشت کر سکتا کہ ایک جاہل انسان
کسی پڑھے لکھے شخص کے بھائی کو اپنی صحبت میں بٹھا کر ورغلائے۔"

علم اللہ کو غصہ آگیا، کہا: "بھائی صاحب! شیخ کی شان میں گستاخی نہ کیجیے میں اسے برداشت نہیں کر سکتا۔"

بڑے بھائی نے کہا: "علم اللہ! وہ علم سے بے بہرہ ایک عام فقیر ہے وہ کچھ بھی تو نہیں جانتا۔"

علم اللہ نے کہا: "اگر آپ کو اپنے علم و فضل پر ایسا ہی ناز ہے تو میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ آپ اس علم
سے بے بہرہ عام فقیر کی صحبت میں کچھ وقت گزار کر اس کا امتحان ضرور لیں پھر آپ کو علم ہو جائے گا کہ علم سے
بے بہرہ کون ہے؟ آپ یا میرے پیر و مرشد آدم بنوری۔"

بڑے بھائی نے جواب دیا: "کل تو میرے ساتھ اس دنیادار ان پڑھ فقیر کے پاس چلے گا اور میں تجھ پر یہ
ثابت کر دوں گا کہ تو غلطی پر ہے اور میں حق پر ہوں۔"

علم اللہ نے کہا ؛ اور آپ میری یہ بات ضرور مان لیں کہ جب تک آدم بنوری کی بابت تجربہ سے آپ یہ نہ مان لیں کہ وہ عالم اور صاحبِ کشف بزرگ ہیں یا دنیادار اور عامی فقیر۔ آپ ان کی بابت گستاخانہ کلمات استعمال نہیں کریں گے ۔"

بڑے بھائی نے کہا ؛ میں تیری خاطر یہ وعدہ کر لوں گا ورنہ میری رائے اس شخص کے بارے میں اچھی سے اچھی ہو سکتی ہے ۔ میں انسانوں کو پڑھتا رہتا ہوں ۔"

علم اللہ اپنے غصے کو دبائے ہوئے تھا ۔ پھر بھی بڑی تلخی سے کہا ؛ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر آپ اور آپ جیسے دوسرے لوگ شیخ آدم کی صحبت میں بیٹھنے لگیں تو چند ہی دنوں میں خود کو گونگا اور جاہلِ مطلق کہنے لگیں گے ۔"

بڑے بھائی کو بہت غصہ آیا اور کہا ؛" اس موضوع پر اس وقت تک بات نہیں ہوگی جب تک میں تیرے شیخ کی علمیت کا امتحان نہ لے لوں ، تو ان کی بڑائی اور بزرگی کا ذکر مجھ سے نہیں کرے گا ۔"

دوسرے دن صبح بڑا بھائی علمِ کلام کا ایک دشوار ترین مسئلہ لے کر شیخ آدم کے پاس پہنچ گیا ۔ اس کے ساتھ چھوٹا بھائی علم اللہ بھی تھا ۔ شیخ آدم نے ان دونوں کو احترام سے بٹھایا اور غیر معمولی عزت و تکریم کا مظاہرہ کیا ۔ بڑے بھائی نے بناوٹی احترام سے کہنا شروع کیا ؛" حضرت میں کئی دن سے حاضری دینے کی سوچ رہا تھا لیکن بعض ناگزیر امور مانع آجاتے تھے ۔ آج میں نے ان کی پروا کیے بغیر آپ کی خدمت میں حاضری کی ٹھان لی تھی اور آ گیا ۔"

شیخ آدم نے انکساری سے جواب دیا ؛" فقیر آپ کا شکر گزار ہے ۔ کرم فرمائی ، فقراء پروری ، فرمایئے آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں ۔"

بڑے بھائی نے عرض کیا ؛" حضرت ! علمِ کلام کا ایک دشوار مسئلہ ہے جو میری سمجھ میں نہیں آتا ۔ اگر آپ اس کو سمجھا دیں گے تو میں ہمیشہ آپ کا شکر گزار رہوں گا ۔"

شیخ آدمؒ نے تیز نظروں سے علم اللہ کے بھائی کی طرف دیکھا اور عاجزی سے کہا ؛" میرے بھائی ! جو کچھ تم نے پوچھا ہے یہ خالص علمی مسئلہ ہے فقیر عامی ہے ۔ آپ خود بھی عالم ہیں ۔ میں کیا جواب دوں آپ خود ہی اس مسئلے کی بابت کچھ بتائیں ۔"

بڑے بھائی نے علم اللہ کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھ کر شیخ آدم سے اصرار کیا ؛" حضرت میں کچھ نہیں جانتا ۔ میں تو آپ ہی سے اس مسئلے کا حل کراؤں گا ۔"

علم اللہ شرمندگی محسوس کر رہا تھا ۔ اس کو شیخ آدم کی بابت یہ عجیب سی بات معلوم ہوئی تھی ۔

بڑے بھائی نے عرض کیا ؛" حضرت ! اگر آپ کو ظاہری علوم نہیں آتے تو کیا ہوا ، میں نے تو یہ سنا ہے کہ آپ کو علمِ لدنی آتا ہے ، پھر آپ کو اس مسئلے کی بابت کچھ فرمانے میں کیا تکلف ہو سکتا ہے ۔"

شیخ آدم نے کہا ؛" میں نے کہہ جو دیا کہ اپنے اس مسئلے کو کسی اور کے پاس لے جاؤ اور اس سے حل کراؤ ۔"

بڑے بھائی نے ایک بار پھر علم اللہ کی طرف دیکھا اور سرگوشی میں کہا ؛" علم اللہ ! اب کیا کہتے ہو ۔ میں کہتا تھا درست نکلا یا نہیں ؟"

شیخ آدم نے بڑے بھائی کی بات سن لی ، پوچھا ؛" تم کیا کہتے تھے ؟"

علم اللہ کو رونا آگیا ، جذباتی آواز میں کہا ؛" ایسی بات نہ کہیے صاحب ، حضرت شیخ معلوم نہیں کیوں اس

سے کام لے رہے ہیں ورنہ میں اب بھی اس یقین پر قائم ہوں کہ اس سے زیادہ لائق فائق انسان کا اس دور میں ملنا ناممکن ہے۔"

شیخ آدم کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ غصے میں علم اللہ کے بڑے بھائی کو مخاطب کیا "اے بھائی! میں تو ... کو طرح دے رہا ہوں اور تو ایک شریف انسان کو شرمندہ کر رہا ہے۔ تو میرا امتحان لینے آیا ہے۔ تو میرا امتحان ... گا۔ کمال ہے۔ اس نو تو نے جس مسئلے کے لیے مجھ سے شرح و استفسار چاہا ہے، وہ ایک ایسا مسئلہ ہے کہ ... مشرق و مغرب کے تمام علماء یک جا کیے جائیں اور ان سے کہا جائے کہ وہ اس پر اظہار خیال کریں تو وہ سب ... جواب اور بے بس ہو جائیں گے۔ ہاں ہم اس کو حل کر سکتے ہیں اور صرف ہم، ہمارے سوا دوسرا کوئی بھی اس مسئلے کو سمجھنے تک کی صلاحیت اور اہلیت نہیں رکھتا۔"

اس کے بعد شیخ آدم نے اس مسئلے پر تقریر شروع کر دی اور دیر تک ایک مدلل تقریر کرتے رہے۔ علم اللہ کے چہرے پر رونق آ گئی مگر بڑے بھائی کا چہرہ اتر گیا اس کو ایک افسوسناک حقیقت کے ساتھ ہی یہ اعتراف بھی تھا کہ اس نے اس مسئلے کے بعض پہلوؤں کو خود بھی نہیں سمجھا تھا اور شیخ آدم نے جو کچھ بتا دیا تھا اس میں کوئی شخص بھی بال برابر اضافہ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ خود کو شیخ آدمؒ کے روبرو طفل مکتب سمجھنے لگا۔

کافی دیر بعد جب دونوں بھائی شیخ کی صحبت سے اٹھے تو بڑے بھائی پر خجالت اور خفت نے ایسا ... کر لیا تھا کہ اس کے اپنے خیالات پر غصہ آ رہا تھا اور دل توبہ کی طرف مائل تھا۔ علم اللہ نے پوچھا "کہیے بھائی صاحب! اب آپ کیا فرماتے ہیں؟"

بڑے بھائی نے جواب دیا "اب میں کیا کہوں گا شیخ کی سچائی ظاہر ہو چکی ہے۔ اب میں توبہ کر کے ان کے حلقے میں داخل ہو جاؤں گا۔"

علم اللہ نے کہا۔ "اللہ اکبر، اللہ اکبر۔ اس وقت میں بہت خوش ہوں۔"

بڑے بھائی نے گھر تک پہنچتے پہنچتے اپنا فیصلہ بدل دیا تھا اندر سے کوئی اسے ورغلا رہا تھا کہ ہو سکتا ہے شیخ کو علم کلام کے اس مسئلے کا پہلے ہی علم ہو اور اتفاق سے انہوں نے اس کو شرح و بسط سے بیان کر دیا ہو۔ کیوں نہ ان سے علم تفسیر کا کوئی مشکل ترین مسئلہ پوچھ لیا جائے۔"

دوسرے دن بڑے بھائی نے علم اللہ سے کہا "علم اللہ! آج میں وہاں پھر جاؤں گا۔"

علم اللہ نے کہا "یہ آج ہی پر کیا موقوف، میں تو آپ کو یہ مشورہ دوں گا کہ آپ شیخ کی صحبت میں پابندی اور باقاعدگی سے تشریف لے جایا کریں۔"

بڑے بھائی نے کہا "آج میں ان سے علم تفسیر کا ایک مسئلہ پوچھوں گا، مشکل ترین مسئلہ، کیونکہ معلوم نہیں کیوں مجھ کو اب بھی ان کی علمیت پر شبہ ہے۔"

علم اللہ نے افسوس سے کہا۔ "تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کی ذات میں ایک شیطان مستقل موجود رہتا ہے جو آپ کو ورغلاتا رہتا ہے۔"

بڑے بھائی نے کہا "تم اس کو شیطان کہو، لیکن میں خود اس کو اپنی علمیت اور ہمہ دانی کہوں گا۔"

اس دن علم اللہ کا دل بڑے بھائی کے ساتھ جانے کو تیار نہ تھا، لیکن طوعاً و کرہاً ساتھ دے دیا۔

شیخ آدمؒ نے ان دونوں کو بڑے تپاک سے لیا اور عزت و احترام سے اپنے پاس بٹھا لیا۔ شیخ آدمؒ نے پوچھا: "دوستو! آج کیسے آنا ہوا؟ خیریت تو ہے؟"

بڑے بھائی نے جواب دیا "جناب! آج میں پھر آپ کو زحمت دوں گا۔ علمِ تفسیر کا ایک مشکل مسئلہ میری سمجھ میں نہیں آرہا اس کو آپ ہی حل کریں گے۔"

شیخ آدم نے جواب دیا "بابا تو فقیر کو کیوں ستانے پر تُل گیا ہے۔ میں علمِ تفسیر کے مسئلے پہ کیا زبان کھولوں تُو تو خود بھی عالم ہے اس مسئلے پر تو روشنی ڈال تاکہ اس سے میں بھی مستفید ہو سکوں۔"

بڑے بھائی کو ایک دم شبہ گزرا کہ شیخ آدم اس مسئلے پر مار کھا جائیں گے اور شاید وہ علمِ تفسیر سے واقف نہیں ہیں۔ بڑے بھائی نے کہا "حضرت! میں جو کچھ جانتا ہوں، اُس سے جب میں خود مطمئن نہیں ہوا تو آپ کو کیا مطمئن کروں گا۔ میں تو آپ کی زبان، طاقتِ لسّان سے کچھ سننا چاہتا ہوں۔"

شیخ آدم نے آنکھیں بند کر لیں اور کچھ دیر خاموش رہ کر بولنا شروع کیا "اے شخص پہلے ایک بات سن لے تجھ کو مجھ سے جو بھی سمجھنا ہو، سیدھی طرح صاف دلی سے آجایا کر، لیکن میں یہ بات ذرا بھی پسند نہیں کرتا کہ تو بغضِ باطن سے میرا امتحان لینے آجائے۔"

بڑے بھائی نے عاجزی سے کہا "ایسی کوئی بات نہیں حضرت شیخ!"

آپ نے سختی سے فرمایا۔ "ایسی ہی بات او نادان انسان۔"

شیخ آدم نے ذرا سا سکوت اختیار کیا اور اس کے بعد علمِ تفسیر کے اس مسئلے پر تقریر شروع کر دی اور بڑی دیر تک بولتے رہے۔ ایک سماں بندھ گیا اور انہوں نے علم اللہ اور اس کے بڑے بھائی کو مسحور کر کے رکھ دیا۔ اس بار پھر بڑے بھائی نے شیخ آدم کے علم اور بزرگی کا لوہا مان لیا اور خود کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا۔

دونوں شیخ کی صحبت سے اُٹھے تو پورے دل و دماغ پہ شیخ آدم کی عظمت، علمیت اور بزرگی ثبت ہو چکی تھی۔ علم اللہ نے پوچھا "بھائی صاحب! آج آپ کا کیا حال ہے؟"

بڑے بھائی نے جواب دیا "آج میں کل سے زیادہ شرمندہ ہوں۔ میں حیران ہوں کہ آخر آج میں نے ان کا امتحان کیوں لیا۔ اس سیدھے سچے، صاف، صاحبِ کشف اور علمِ لدنی سے مالا مال شخص کا میں نے امتحان ہی کیوں لیا۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

علم اللہ نے عرض کیا۔ "بھائی صاحب! اتنی شرمندگی تو آپ بھی نہیں محسوس کر رہے ہوں گے جتنی میں محسوس کر رہا ہوں۔ شیخ آدم یہ سمجھ رہے ہوں گے کہ آپ کو ان کے امتحان کے لیے میں بار بار مجبور کر کے لا رہا ہوں۔ خدا کے لیے میرے حال پر رحم کیجئے اور اگر ایک بار پھر آپ کا دل آپ کو ورغلائے بہکائے تو یہاں اکیلے ہی چلے آئیے گا۔ مجھے ساتھ نہ لائیے گا۔"

بڑے بھائی نے جواب دیا۔ اب نہ میں خود آؤں گا اور نہ تم کو لاؤں گا۔ بس جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ اب میں ایسی جرأت نہیں کر سکتا۔"

لیکن بڑے بھائی کی حالت اس کے برعکس تھی جیسی وہ بیان کر رہے تھے۔ ان کے اندر علمیت کی انا کا جن انہیں بار بار ورغلا رہا تھا کہ تو اُس درویش سے زیادہ لائق ہے۔ شیخ آدم کو اتنا علم نہیں جتنا تو سمجھ بیٹھا ہے ایک بار اور امتحان لے شیخ چت ہو جائے گا۔

تیسری بار بڑے بھائی نے علم اللہ کو اپنے ساتھ نہیں لیا۔ اکیلے ہی شیخ کی خدمت میں پہنچ گیا۔ شیخ آدم نے اس بار پھر بڑے احترام سے اس کو بٹھایا اور پوچھا۔ "آج تیرے ساتھ علم اللہ نہیں آیا؟ خیریت؟"

بڑے بھائی نے جواب دیا "علم اللہ گھر پہ موجود نہیں تھا۔ میں نے اس کا انتظار نہیں کیا اور آپ کی خدمت میں آگیا۔"

شیخ آدمؒ نے بالکل خلافِ توقع پوچھا "بابا آج کونسا مسئلہ لائے ہو؟ بیان کرو تاکہ میں امتحان دوں۔"
بڑے بھائی کو شرمندگی تو ہوئی مگر پھر بھی وہ باز نہیں آیا اور عرض کیا: حضرت! آپ تو روشن ضمیر ہیں، ایک مسئلہ اور ہے جس پر آپ کے اظہارِ خیال کی ضرورت ہے۔"
شیخ آدمؒ نے مسکرا کر جواب دیا "مسئلے تو تم جتنے چاہو لاؤ اور بیان کرو۔ میں ان سب پر تقریریں کروں گا مگر اپنے اندر کے جن کو نکال باہر کرو۔ یہ انا کا جن تمہیں ہمیشہ پریشان کرتا رہے گا۔"
بڑے بھائی نے ایک بار پھر ایک مسئلہ پیش کر دیا۔ شیخ آدمؒ نے اس مسئلے پہ تقریر شروع کر دی۔ شیخ آدم دیر تک بولتے رہے۔ جب وہ سب کچھ کہہ چکے تو بڑا بھائی ان کے قدموں میں گر گیا بولا "حضرت! مجھ کو معاف کر دیجئے۔ میں نے آپ کو بہت پریشان کیا۔"
آپ نے فرمایا "تم نے مجھ کو کہاں پریشان کیا۔ ہاں، خود ضرور پریشان ہوتے رہے۔"
بڑا بھائی کچھ دیر سر جھکائے بیٹھا رہا، دل رقت زدہ تھا۔ گلا رندھ گیا۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ آپ اس کو بغور دیکھتے رہے پھر فرمایا "جا میں نے اس کا علاج کر دیا۔ اب تو پریشان نہیں ہو گا۔ تیرے اندر کی انا میں نے دور کر دی ہے۔"
چوتھے دن بھی بڑا بھائی شیخ کی خدمت میں پہنچا۔ اس روز شیخ کے بے شمار مریدوں اور ارادت مندوں نے اسے اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ یہ مریدوں اور ارادت مندوں کی جوتیوں کے پاس بیٹھ گئے اور دل میں توبہ استغفار کرتے رہے۔ کچھ دیر بعد شیخ نے اپنے ایک مرید کو حکم دیا "جا، جوتیوں کے پاس جو شخص بیٹھا ہے اس کو میرے پاس لے آ۔"
مرید اٹھا اور جوتیوں کے پاس بیٹھے ہوئے اس عالم فاضل شخص سے کہا "حضرت! آپ کو پیر و مرشد یاد فرما رہے ہیں۔"
علم اللہ کے بڑے بھائی اپنی جگہ سے اٹھے۔ اور مرید کے پیچھے پیچھے شیخ کے پاس پہنچ گئے۔
شیخ نے پوچھا "وہاں تو کیا کر رہا تھا؟"
بڑے بھائی نے جواب دیا "میں خود کو ذلیل و خوار کر رہا تھا کیونکہ میں نے آپ کو کئی دن تک جس طرح ستایا تھا اس کی سزا میں نے خود تجویز کی ہے۔ اب میں اپنے آپ کو ذلیل و خوار کرتا رہوں گا۔"
شیخ نے تسلی دی "اس کی کوئی ضرورت نہیں، تو عالم فاضل انسان ٹھہرا۔ علم انسان کو یونہی پریشان کرتا ہے اب تو میرے پاس ہی موجود رہ۔ میں خود تیری عزت کرتا رہتا ہوں۔"
تسلی اور دل جوئی کے لفظوں نے دل میں ایک آگ لگا دی۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ پھر آپ نے علم اللہ کے بھائی سے پوچھا "بابا! تم پڑھے لکھے انسان ہو۔ تم نے اپنے سر کے بال کنپٹیوں کے نیچے چھوڑ رکھے ہیں حالانکہ شرعاً ایسا کرنا منع ہے۔ تم تو علم و فضل والے ہو تمہیں تو یہ علم ہونا چاہیئے۔"
بڑے بھائی نے شرمندہ ہو کر جواب دیا۔ "آج اس غیر شرعی طریقے کو خیرباد کہہ دوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔"
اس کے بعد شیخ نے تہمد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اور یہ تہمد۔ یہ ٹخنوں سے نیچے کیوں لٹک رہا ہے حالانکہ شرعاً اس کو ٹخنوں کے اوپر تک رہنا چاہیئے۔"
بڑے بھائی نے کہا "حضرت میں کچھ نہیں جانتا۔ میں تو آج اس لیے آیا ہوں کہ آپ مجھ کو بھی اپنے مریدوں میں شامل فرما لیں۔"

آپ نے فرمایا "مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ ابھی لے۔"
آپ نے اسی وقت ایک حجام کو بلوایا اور اس سے علم اللہ کے بھائی کا سر منڈوا دیا۔ تہمد کو ٹخنوں سے اُوپر کر کے اپنے حلقۂ بیعت میں داخل کر لیا۔

آپ کی خانقاہ سے ہزاروں آدمی فیض یاب ہوتے تھے۔ لنگر عام جاری تھا۔ لیکن ایک دفعہ یہ بُری خبر سُننے میں آئی کہ بارش نہ ہونے کے سبب وہ علاقہ قحط سالی کا شکار ہو چُکا ہے۔ خانقاہ کے منتظمین کو بڑی فکر ہُوئی کہ اب کام کس طرح چلے گا جو غلہ موجود تھا وہ چند دنوں میں ختم ہو جائے گا۔ مزید کہاں سے آئے گا؟
آخر جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو شیخ آدمؒ کی خدمت میں پہنچے اور مؤدبانہ عرض کیا "حضرت! ہم سب بہت پریشان ہیں۔ آپ ہی بتائیں ان حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟"
آپ نے پوچھا "کیوں پریشان ہو! پریشانی کی وجہ؟"
منتظمین نے عرض کیا "حضرت! شاید آپ کے علم میں ہو کہ یہ پورا علاقہ خشک سالی کا شکار ہو چُکا ہے اور کچھ پتا نہیں کہ یہ صورتحال کب تک برقرار رہے۔"
آپ نے پوچھا "پھر تمہیں کیا پریشانی ہے؟"
عرض کیا۔ "پریشانی یہ ہے کہ جو غلہ سردست موجود ہے، چند دنوں میں ختم ہو جائے گا۔ اس کے بعد خانقاہ کا کام کیونکر چلے گا؟"
آپ نے فرمایا "کیا بازار میں گندم بالکل نہیں ہے؟"
جواب دیا گیا "حضرت! بالکل نہیں، کہیں بھی نہیں۔"
آپ نے قدرے تامّل کے بعد کہا "مجھ کو غلہ دان کے پاس لے چلو۔"
منتظمین نے آپ کو غلہ دان کے سامنے پہنچا دیا۔ آپ اس کے پاس کھڑے ہو کر کچھ پڑھتے رہے۔ اس کے بعد خانقاہ کے منتظم اعلیٰ کو حکم دیا "اس غلہ دان کا منہ اوپر سے بند کرا دے۔ مٹی کا ردّا چڑھا دے۔"
منتظم نے عرض کیا "آپ نے حکم دیا ہے تو اس کی تعمیل ہو جائے گی، لیکن حضرت یہ تو فرمائیں کہ اگر غلہ دان کا منہ بند کر دیا جائے تو پھر اس میں سے غلہ کس طرح نکالا جائے گا۔"
آپ نے فرمایا "غلہ دان کے نیچے سوراخ کر کے غلہ اس میں سے نکالتے رہو۔ اللہ برکت دے گا۔"
آپ کی بتائی ہوئی ترکیب پر عمل کیا گیا لیکن چند مرید بہت مایوس تھے اور ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ اس سے فائدہ کیا ہو گا؟
مریدوں نے غلہ دان کا منہ بند کر دیا اور نیچے ایک سوراخ کر دیا۔ اب غلہ کو اسی سوراخ کے راستے سے نکال کر اور پہنچایا جا رہا تھا۔ ہر روز بقدرِ ضرورت غلہ نکال لیا جاتا۔ یہ عمل مہینوں جاری رہا مگر غلہ دان کا غلہ کم نہیں ہوا۔ مُرید جب بھی غلہ نکالتے یہی سوچتے کہ شاید آخری بار غلہ نکال رہے ہیں، لیکن جب مہینوں بعد بھی یہ عمل جاری رہا اور غلہ کم نہ ہُوا تو سبھی کو اتنی حیرت ہوئی کہ وہ اس پر کسی قسم کے تبصرے تک سے عاجز رہ گئے۔ پھر ماہ و سال گزر گئے اور غلہ کم نہ ہُوا۔
نئی فصل آئی تو کھیتوں میں گندم کی بالیاں لہلہانے لگیں اور قحط سالی دُور ہو گئی۔ آپ نے منتظمین سے پوچھا "اب غلے کا کیا حال ہے؟"

منتظم نے جواب دیا "اب کوئی پریشانی نہیں۔ غلّے سے بازار بھرے پڑے ہیں۔"
"آپ نے فرمایا "تو اب غلّہ دان کا مُنہ کھول دیا جائے۔ کیونکہ اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔"
مریدوں نے آپ کے حکم پر غلّہ دان کا مُنہ کھول دیا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اس میں جتنا غلّہ پہلے تھا اتنا ہی اب بھی موجود ہے۔ ہر شخص نے ایک دوسرے کا مُنہ دیکھنا شروع کر دیا۔ جس میں حیرت کے ساتھ ساتھ خوف بھی شامل تھا۔

اب خانقاہ میں گندم کی کوئی کمی نہ رہی تھی اور اس کا لنگر ایک دن بھی بند نہ ہُوا۔ اس واقعے کی شہرت نے دُور دُور کے لوگوں کو اکھاڑ کر اس خانقاہ میں پہنچانا شروع کر دیا۔

ایک دن ایک شخص نے خانقاہ کے ایک مرید سے کہا "شیخ سے کہہ دو کہ ان کے قصبے بنور سے ایک شخص ملاقات کو حاضر ہُوا ہے۔"
مرید نے جیسے ہی آپ کو اطلاع دی، آپ نے فرمایا "اس کو اندر لے آ۔"
مرید نے اُس کو اندر پہنچا دیا۔ وہ شخص آپ کے پاس بیٹھ گیا۔ آپ نے بنور کے حالات پوچھے اور اہالیانِ بنور کی خیریت دریافت کی۔ پھر پوچھا "تمہارا آنا کس غرض سے ہُوا؟"
وہ شخص روہانسا ہو رہا تھا، بولا "حضرت! میں عاجز آ کر حاضر ہوا ہوں۔ میں بہت پریشان ہوں۔ آپ کو میری مدد کرنا ہو گی۔"
آپ نے اس شخص کو تسلی دی اور فرمایا "تم پریشان کیوں ہو، میں ضرور مدد کروں گا۔ بتاؤ کیا بات ہے؟"
اس شخص نے عرض کیا "حضرت میری ایک بیٹی ہے۔ وہ جوان ہُوئی تو میں نے اس کی شادی کر دی۔ بس شادی کرتے ہی میں پریشانی میں مبتلا ہو گیا۔"
آپ نے پوچھا "وہ کس طرح؟"
اس نے عرض کیا "شادی کے بعد پتا چلا کہ میری لڑکی کسی جن کے زیر اثر ہے۔ اس کا شوہر اس کے پاس نہیں جا سکتا۔ جیسے ہی جانے کی کوشش کرتا ہے اس کو معلوم نہیں کون دھکے دے کر دُور کر دیتا ہے۔ ابھی تو یہ خیریت ہے کہ میرے داماد کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔"
آپ نے پوچھا "وہ جن اور کیا کرتا ہے؟"
اس نے جواب دیا "وہ بیٹی کو لے کر ایک کمرے میں بند ہو جاتا ہے اور اندر کسی کو داخل ہی نہیں ہونے دیتا۔"

آپ نے پوچھا "پھر تم کیا چاہتے ہو مجھ سے؟"
اس نے جواب دیا "میں چاہتا ہوں، جن میری بیٹی کا پیچھا چھوڑ دے۔"
آپ نے فرمایا "وہ پیچھا چھوڑ دے گا۔ تُو پریشان نہ ہو۔"
اس شخص کا خیال تھا کہ آپ اس کو از قسم تعویذ کوئی چیز مرحمت فرمائیں گے مگر آپ نے کچھ بھی نہ دیا۔ کچھ دیر خاموش کچھ پڑھتے رہے۔ اس کے بعد فرمایا "جا، بنور واپس جا، میرا نام لے کر جن سے کہہ دے کہ وہ بھاگ جائے ورنہ نقصان اُٹھائے گا۔"
اس شخص نے مایوسی سے پوچھا "بس یا کچھ اور؟ آپ تعویذ وغیرہ نہیں دیں گے کیا؟"

آپ نے فرمایا "تعویذ کی کوئی ضرورت نہیں۔ تو لڑکی کے کان میں میری طرف سے کہہ دے کہ شیخ آدم کا یہ فرمان ہے کہ میری لڑکی کے پاس سے چلا جا ورنہ شیخ تجھ کو جلا دے گا"
وہ شخص دل برداشتہ ہو کر چلا گیا اور اپنی بیٹی کے کان میں وہی کلمات ادا کر دیئے اور دیکھ کر حیرت زدہ ہو گیا کہ اس کے بعد اس کی بیٹی بالکل درست رہی اور اس کے شوہر کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔

شیخ آدم کے ارادت مندوں میں ہر قسم کے لوگ تھے۔ نوجوان جوان، ادھیڑ عمر، بوڑھے، ہر عمر اور ہر طبع کے لوگ آپ کی مجلس میں آتے اور مواعظ حسنہ سے سرشار ہو کر جاتے۔
ایک نوجوان نے آپ کا وعظ سننے کے بعد خوشامدانہ عرض کیا "پیرومرشد! مجھے یہ فخر ہے کہ میں آپ کے ارادتمندوں میں شمار کیا جاتا ہوں۔ سرہند کے لوگ مجھے آپ کے خاص عقیدت مندوں میں گنتے ہیں"
آپ نے فرمایا "لیکن اس تمہید کا کیا مطلب کیا ہے؟ مجھے تو تم بس یہ بتا دو"
نوجوان نے عرض کیا "حضرت! میری شادی ہونے والی ہے۔ میرے دوستوں کا اصرار ہے کہ اس میں آپ بھی شرکت فرمائیں"
آپ نے فرمایا "اے شخص! دل آزاری بدترین گناہ ہے۔ اگر تو میری شرکت سے خوش ہو جائے گا تو میں ضرور شریک ہو جاؤں گا"
نوجوان کو اس بات کا یقین نہیں تھا کہ آپ اتنی جلدی اس کی درخواست مان لیں گے۔ اس نے آپ کی زبان سے جو کچھ سنا اس پر حیران و ششدر رہا۔ پوچھا "کیا میں اپنے کانوں پر یقین کر لوں؟"
آپ نے پوچھا "یقین نہ کرنے کا سبب؟ وجہ؟"
نوجوان نے جواب دیا "اس لیے کہ اس وقت پورے برصغیر میں آپ کے پائے کا کوئی دوسرا بزرگ نہیں۔ تفاخر، احساس برتری ایسی چیزیں ہیں کہ انسان ان سے پریشان ہو جاتا ہے"
آپ نے فرمایا "میں نے تجھ سے جب یہ وعدہ کر لیا کہ تیری شادی میں ضرور شریک ہوں گا تو تجھ کو میری شرکت پر شبہ نہیں کرنا چاہئے"
نوجوان نے عرض کیا "اچھا حضور والا! میں ایک درخواست اسی وقت آپ کی خدمت میں پیش کروں گا"
آپ نے فرمایا "اب لوگوں کو تم سبق پڑھانا چاہتے ہو تو پڑھاؤ۔ میں نے یہ وعدہ کر لیا ہے کہ تمہاری شادی کی رسم میں شرکت کروں گا۔ شادی سے متعلقہ دوسری رسوم میں بھی حاضری دوں گا۔ تو اس یقین دہانی کے بعد مجھ سے بار بار وعدے لینا اچھی بات نہیں ہے"
نوجوان خفیف ہو گیا، بولا "حضرت! بات صرف اتنی ہی ہے کہ میری ہونے والی بیوی کے گھر والوں نے اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں سے کہہ دیا ہے کہ ان کی بیٹی کی شادی میں حضرت شیخ آدم بھی تشریف لائیں گے تو میں اس اندیشے سے خوفزدہ ہو جاتا ہوں کہ کہیں عین وقت پر کسی کی شرارت پر آپ تشریف نہ لائیں تو میرا کیا ہو گا"
آپ نے ایک بار پھر بڑے تحمل اور ضبط و برداشت سے کہا "اے نوجوان! کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ میں دوسروں کے ورغلانے اور پھسلانے میں آ جاؤں گا تو یہ تیری بھول اور غلط فہمی ہے۔ اب میں اس موضوع پر بات نہ کروں گا"
نوجوان دل برداشتہ ہو کر چلا گیا اور تیسرے دن دوپہر کو آپ کے پاس آ پہنچ گیا۔ اس وقت آپ قیلولہ فرما رہے تھے کی کیفیت میں تھے۔ نوجوان نے حجرے میں داخل ہوتے ہی سلام کیا۔ آپ نے سلام کا جواب دے کر پوچھا "کیا"

وقت ابھی چلنا ہے ؟"

نوجوان نے جواب دیا۔"جی پیرومرشد۔آج سہ پہر کو میری منگنی کی رسوم ادا ہوں گی۔آپ کو اس میں شرکت فرمانا ہے"۔

آپ نے فرمایا۔"میں عین وقت پہ پہنچ جاؤں گا۔مجھ کو لے جانے میں اتنی جلدی بھی نہ کرو"۔

اس وقت تو وہ چلا گیا لیکن سہ پہر کو پھر نازل ہو گیا اور آپ کو اپنے ساتھ لیے چلا گیا۔

جب منگنی کی رسوم ادا ہو رہی تھیں۔آپ نے لڑکی والوں سے کہا"کیا یہ ممکن نہیں کہ منگنی کی بجائے نکاح پڑھوا دیا جائے کیونکہ منگنی کی رسم میری سمجھ میں نہیں آئی"۔

لڑکی کے باپ نے کہا۔"میری تو یہی خواہش تھی کہ اس وقت نکاح پڑھوا دیا جاتا ، مگر لڑکے کے گھر والے نہیں چاہتے وہ منگنی پر بضد ہیں"۔

آپ نے کہا"میرے اپنے خیال میں منگنی فضول شے ہے"۔

لڑکی کے باپ کے کان کھڑے ہوئے پوچھا"حضرت جو کچھ بھی ہو صاف صاف فرما دیجئے۔آپ بتانا کیا چاہتے ہیں۔کیا منگنی کی رسم سے ہمیں کسی قسم کا نقصان پہنچ سکتا ہے ؟"

آپ نے جواب دیا"مشیت ایزدی میں کسی کا کیا اجارہ ، کسی کا کیا چارہ"۔

لڑکی والے چپ ہو گئے مگر اب ان کا دل بیٹھنے لگا تھا۔

جب ساری رسوم ادا کی جا چکیں۔آپ نے اس نوجوان کو بلوایا۔یہ بہت خوش تھا۔اس کا انگ انگ مسکرا رہا تھا آپ نے اس سے پوچھا"ہاں بھائی ! منگنی کی رسمیں ادا ہو چکیں ؟"

نوجوان نے جواب دیا"جی حضرت !ساری رسوم ادا کی جا چکیں میرے لائق کوئی خدمت ہو تو ارشاد فرمائیں۔میں تو حضرت آپ کا بندۂ بے دام ہوں"۔

آپ نے فرمایا"اے شخص !ان چکنی چپڑی باتوں سے کیا حاصل !میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہیں تو انقلاب زمانہ کا شکار نہ ہو جائے۔کیونکہ انسان کا اس کی تلون مزاجی سے بڑا کوئی دشمن نہیں"۔

نوجوان حیرت سے آپ کو دیکھتا رہا ، پھر پوچھا"اگر میں کبھی بھی آپ کی حکم عدولی کروں تو میری خدا سے یہ دعا ہے کہ وہ مجھے حزم و احتیاط کا حامل بنائے اور اگر میں کسی بھی معاملے میں آپ کی مخالفت اور اپنے ضمیر کے خلاف کوئی کام کروں تو خدا مجھ کو معاف نہ کرے"۔

آپ نے فرمایا"بس میرے لیے تیری یہ بات کافی ہے کہ اگر تو کسی بھی معاملے میں میری مخالفت اور اپنے ضمیر کے خلاف کوئی کام کرے تو خدا تجھ کو معاف نہ کرے"۔

منگنی کے بعد شادی کی تاریخ تین ماہ آگے رکھی گئی۔

یہ نوجوان آپ کی خدمت میں حاضری دیتا رہا۔یہاں تک کہ منگنی کے ڈھائی ماہ گزر گئے۔لڑکی والے شادی کی تیاریوں میں مشغول تھے مگر نوجوان ایک دم غائب ہو گیا۔آپ نے اپنے مریدوں سے کئی بار اس نوجوان کی خیریت بھی معلوم کی لیکن اس کا کوئی خاطر خواہ جواب نہ مل سکا۔

تین ماہ بھی گزر گئے لیکن وہ نوجوان نہیں آیا۔چند دنوں بعد لڑکی کے گھر والے روتے پیٹتے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سسکیاں لے لے کر عرض کیا"حضرت شیخ !دہائی ہے ، ہم لوگ برباد ہو گئے ، تباہ ہو گئے۔اب ہم اپنی بیٹی کی شادی کس سے اور کس طرح کریں گے"۔

آپ نے انہیں اپنے پاس بٹھا لیا اور دل جوئی.... کرنے لگے"کیا ہوا ؟ کچھ مجھے بھی تو بتاؤ ، وہ نوجوان کہاں ہے ؟

بہت دِنوں میرے پاس بھی نہیں آیا۔"
لڑکی کے باپ نے عرض کیا۔" حضرت ایئں کیا عرض کروں۔ وہ شخص منگنی کے بعد دو تین بار تو آیا۔ اس کے بعد غائب ہو گیا۔ ہم نے شادی کا سامان تیار کر لیا اور جب آخری بار اُس سے رابطہ قائم کر کے پوچھا کہ شادی کے نظام اوقات طے کرے تو اس نے سرے سے شادی کرنے سے ہی انکار کر دیا۔"
آپ نے اُس سے دریافت کیا کہ اس انکار کی وجہ کیا تھی۔ لڑکی کے والد نے بتایا کہ اُس نے کسی اور دوشیزہ کو اپنی بیوی بنانے کا قصد کر لیا ہے۔"
" وہ لڑکی جسے اُس نے اپنی بیوی بنایا ہے کیا وہ اپنے شوہر کے ہاں چلی گئی ہے ؟" آپ نے سوال کیا۔ اس پر لڑکی کے باپ نے بتایا کہ آٹھ دس روز تک رُخصتی ہو جائے گی۔" آپ نے لڑکی کے باپ سے کہا کہ وہ گھر چلا جائے۔ "لڑکا تو میں اُس سے خود بات کر لوں گا۔"
لڑکی کا والد آنسو بہاتے ہوئے بولا۔ حضور والا ! ایسا کون ہو گا جو میری بیٹی سے شادی کرے گا لوگ تو نہ جانے کیسی کیسی باتیں بنائیں گے۔" تاہم آپ نے لڑکی کے باپ کو تسلی وغیرہ دے کر گھر بھجوا دیا۔ پھر آپ اُس لڑکے کے پاس گئے اور اُس سے ساری تفصیل پوچھی۔ لڑکے نے انتہائی شرمندگی کے عالم میں بتایا کہ عشق کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں نے ایسا کیا ہے۔" آپ نے کہا۔" اے نوجوان کیا تو نے یہ بھی سوچا ہے کہ تجھ سے جس لڑکی کی نسبت ٹھہری تھی اب منگنی ٹوٹ جانے کے بعد اُس کے والدین کو کس پریشانی کا سامنا ہو گا۔"
نوجوان نے کہا۔" پیرو مرشد ! میں اپنے اس فعل پر آپ سے سخت نادم ہوں۔"
شیخ آدم بنوری نے فرمایا۔" اے نادان نوجوان تو میرے سامنے نادم ہو رہا ہے، لیکن کیا تجھے اس بات کا احساس ہے کہ تمہارے اس فعل کی وجہ سے مجھے اپنے خدا کے سامنے شرمندہ ہونا پڑ رہا ہے۔"
آپ تو نوجوان سے اتنی بات کہہ کر وہاں سے رُخصت ہو گئے، لیکن ٹھیک آٹھ روز بعد جب وہ نوجوان دُلہن کو بیاہ کر گھر واپس آیا تو اُس نوجوان کی تمام مردانہ صلاحیتیں ختم ہو چکی تھیں۔ حالانکہ شادی سے پہلے وہ بھلا چنگا تھا۔ چنانچہ دلہن اُس کی ناراض ہو کر اپنے میکے چلی گئی اور طلاق کے لیے تقاضا کرنے لگی اب نوجوان کے پاس بھی سوائے اس کے کوئی چارہ کار نہ رہا تھا کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے۔
ب وہ نوجوان روتا دھوتا شیخ آدم بنوری کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا پیرو مرشد واقعی مجھ سے بہت بڑی بھول ہو جس پر میں بہت شرمندہ ہوں، لیکن اب میں نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی ہے اور جس لڑکی سے میری منگنی ٹوٹی تھی اُسی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔
چنانچہ شیخ آدم بنوری کی اس کرامت سے نہ صرف وہ نوجوان راہِ راست پر آ گیا بلکہ ایک لڑکی کی زندگی بھی تباہ ہونے سے بچ گئی اور اپنی منگیتر سے شادی کرنے کے بعد اُسے احساس ہوا کہ اُس کی مردانہ قوت واپس لوٹ آئی ہے۔ شیخ صاحب کی اس کرامت سے متاثر ہو کر وہ نوجوان آپ کے ارادت مندوں میں داخل ہو گیا۔

شیخ آدم بنوری اُن یکتائے روزگار اور صاحب کرامت ہستیوں میں سے تھے جنہوں نے اپنی ساری زندگی اللہ کے دین کی خدمت اور تبلیغ میں گزار دی۔ آپ ۱۳ شوال کو مختصر علالت کے بعد اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔ آپ کا م۱ار جنت البقیع میں واقع ہے۔

حضرت شمس الدین تبریزیؒ نے خدا سے دُعا مانگی "اے خداوندِ عالم میں ایک مدت سے تیری عبادت و ریاضت میں مشغول ہوں۔ تُو نے مجھے علم و عرفان کی دولت عطا فرمائی ہے، معرفت و حکمت کے دروازے مجھ پر کھول دیئے ہیں ولایت کی مسند پر تُو نے مجھے متمکن فرمایا ہے۔ اب کمی رہ گئی ہے تو کسی ایسے طالب ولایت اور دل سوختہ کی ملاقات کی جس کے ساتھ میری ملاقات ہو تو میں تیرے عطا کردہ علم و عرفان کے خزانے میں سے کچھ اُس کے حوالے بھی کروں۔ تیری دی ہوئی معرفت و حکمت کی دولت میں کسی اور کو بھی شریک کروں۔ ولایت کی مسند پر اپنا کوئی جانشین بھی بٹھاؤں۔"

حضرت شمس تبریزیؒ کی دعا بارگاہِ ایزدی میں مستجاب ہوئی اور غائب سے ندا آئی "اے میرے برگزیدہ بندے تمہاری دُعا ہم نے قبول کر لی ہے۔ تیری خواہش اور تمنا کا عکاس تمہیں تبریز میں نہیں ملے گا۔ اس کے لیے تمہیں اپنا وطن مالوف چھوڑنا ہو گا۔ طویل مسافت طے کرنی ہو گی۔ خستہ حالی اور مسافرت برداشت کرنا ہو گی اور پھر تمہیں گوہر مقصود ملے گا۔ اگر تو مذکورہ تکالیف اور مصائب برداشت کرنے کی ہمت رکھتا ہے تو آج ہی اپنے وطن کو خیر باد کہہ کر رُوم کے شہر قونیہ کے لیے روانہ ہو جا۔ وہاں تمہیں ایک ایسا شخص ملے گا جو اپنے وقت کا مفتی، عالم اور فاضل ہے۔ اس کا نام جلال الدین رومیؒ ہے۔ وہی تمہاری ولایت، بزرگی، علمیت، معرفت و عرفان کا حقیقی جانشین ہو گا۔" ہاتفِ غیبی کا پیغام سُن کر حضرت شمس تبریزیؒ تبریز سے قونیہ کے لیے روانہ ہو گئے

⁂

دوسری طرف مولانا جلال الدین رومیؒ کو خدا تعالیٰ نے خواب میں حکم دیا "مولانا! بے شک تم اپنے علم و عرفان، تفسیر و تقریر، علم و حکمت اور تقویٰ و زہد میں یکتائے روزگار ہو لیکن تمہاری اِن صفات کو جلا بخشنے کے لیے ایک ایسی نابغہ عصر ہستی کی ضرورت ہے جو تمہیں جذب و سُکر اور صحو و سلوک کے مبادیات سے آشنا کرے۔ ہم نے اُس جریدۂ عصر شخصیت کو تمہارے پاس روانہ کر دیا ہے۔ اُس کا نام شمس الدین تبریزیؒ ہے۔ اب تمہارا کام ہے تم اس کو کس طرح تلاش کرتے ہو اور اُس سے فیوض و برکات، علم و حکمت کے اسرار و رموز کس قدر حاصل کرتے ہو۔"

مولانا رومؒ اس خواب سے بڑے خوش ہوتے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے راہ سلوک و عرفان کے لیے ایک رہبر بھیجا کرتا ہے۔ لیکن پریشان بھی ہوتے کہ اب راہنما اور اتالیق کو کہاں تلاش کروں۔ مولانا رومؒ ہر روز قونیہ اور اس کے مضافات میں سرگرداں رہتے اور اس صاحب عرفان اور خدا کے بھیجے ہوتے خضر زماں کو تلاش کرتے۔ لیکن ہر روز آپ کو مایوسی ہوتی

ایک روز مولانا جلال الدین رومیؒ قونیہ میں اپنے شاگردوں اور معتقدوں کے ہمراہ ایک حوض کے کنارے تشریف فرما تھے۔ یہ واقعہ ۶۴۲ھ کا ہے۔ مولانا کے پاس قلمی نسخوں (کتابوں) کا ایک ڈھیر لگا ہوا تھا۔ لوگ عرفان و حکمت کی باتیں سُن رہے تھے۔ اسی اثناء میں ایک خستہ حال درویش جس کے کپڑے پھٹے ہوتے تھے۔ اُس کے چہرے مہرے سے مسافرت ٹپک رہی تھی۔ انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں آپ کے پاس آیا۔ اُس نے جب دیکھا کہ مولانا شاگردوں کو وعظ و نصیحت کرتے ہیں اور پاس کتابوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے تو اُس نے کتابوں کی طرف اشارہ کرکے مولانا سے پوچھا "یہ کتابیں کون سی ہیں مولانا نے جواب دیا "چیزے است کہ تو نمی دانی" مطلب یہ کہ یہ وہ چیز ہے جس کو تم نہیں جانتے۔ درویش نے جب یہ بات سُنی تو اُس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ سے کتابیں اٹھائیں اور حوض میں پھینک دیں۔ مولانا کو درویش کی اس حرکت پر بہت غصہ آیا کہنے لگے "ارے میاں تو نے یہ کیا کیا۔ ایسی نادر و نایاب کتابوں کو برباد کر دیا" مولانا کی زندگی ہوئی آواز سُن کر وہ درویش مسکرایا اور کہا تم فکر مت کرو تمہاری کتابوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔" مولانا نے کہا "نقصان کیسے نہیں پہنچے گا یہ قلمی نسخے تھے۔ ان کی کوئی نقل نہیں ہے اور جب کاغذ کی کتابیں پانی میں گر گئی ہیں تو وہ کیسے ضائع نہیں ہوں گی؟ ان کا تو ستیاناس ہو گیا ہے۔" یہ باتیں درویش نے سُن کر اپنا ہاتھ تالاب میں ڈالا اور ساری کی ساری کتابیں تالاب میں سے نکال کر باہر رکھ دیں۔ سب سے حیرت کی بات یہ تھی کہ اُن کتابوں میں سے کوئی کتاب بھی گیلی نہیں ہوئی تھی۔ سب کی سب خشک اور محفوظ تھیں۔ یہ حیرت انگیز کرامت دیکھ کر مولانا نے اس درویش سے پوچھا "یہ آپ نے کیا کیا اور کس طرح کیا؟" درویش نے مولانا کو اُن کا ہی جواب لوٹایا اور فرمایا "چیزیست کہ تو نمے دانی" یہ وہ چیز ہے جس کو تم نہیں جانتے۔ مولانا نے یہ جواب سُنا اور سکتے میں آگئے اور اس درویش سے پوچھنے لگے کہ آپ کہیں شمس تبریزیؒ تو نہیں ہیں۔ اس درویش نے کہا "ہاں میں شمس تبریزیؒ ہوں اور مجھے خدا نے تمہاری تربیت کے لیے بھیجا ہے۔" مولانا اُن کے قدموں میں گر گئے اور حضرت شمس تبریزیؒ نے آپ کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔

حضرت شمس الدین تبریزیؒ کے حالات زندگی کے بارے میں تاریخوں میں زیادہ تفصیل نہیں بیان کی گئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نام کے ایک بزرگ شمس تبریز سبزواری ملتان میں مدفون ہیں۔ ان کا رتبہ بھی بڑا بلند ہے۔ اُن کے مریدین اور عقیدت مندوں سے اک جہاں آباد ہے۔ اس لیے اکثر تذکرے انہی شمس تبریز سبزواری کے ہی ملتے ہیں۔ جس شمس تبریزؒ کا ہم ذکر کر رہے ہیں اُن کے تذکرے بہت کم ملتے ہیں اور اگر ملتے بھی ہیں تو حضرت مولانا رومؒ کے حوالے سے۔ آپ کی تاریخ ولادت کے متعلق بھی کسی تذکرہ نگار نے کہیں ذکر نہیں کیا۔ آپ کے والد گرامی کا اسم شریف علی بن ملک داد تبریزیؒ تھا بعض حقائق نگاروں نے آپ کے والد صاحب کا نام علاؤ الدین بھی بیان کیا ہے جو اسماعیلیہ فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔

حضرت شمس تبریزیؒ بھی ابتداء میں فرقہ باطنیہ کے پیشوا اسماعیلیہ فرقے کے ایک بزرگ سے منسلک تھے۔ آپ نے اپنا آبائی مسلک ترک کرکے ایک خدا رسیدہ بزرگ بابا کمال جندیؒ کے مرید بن گئے۔ آپ کے مرشد نے اپنی نگرانی میں تھوڑے ہی عرصے میں آپ کو طریقت و سلوک کی تمام منازل طے کرا دیں۔ آپ اپنے مُرشد کے منظورِ نظر تھے۔ آپ شروع سے ہی فقر و درویشی کی زندگی پسند کرتے تھے۔ آپ کا معمول تھا کہ چالیس روز تک کھانا نہ کھاتے اور پھر کچھ کھانے کے بعد دوبارہ چالیس روز تک فاقہ کرتے اور اس عرصہ میں عبادت و ریاضت میں مشغول رہتے تھے۔ آپ کے احباب آپ کو کچھ کھانے کے لیے
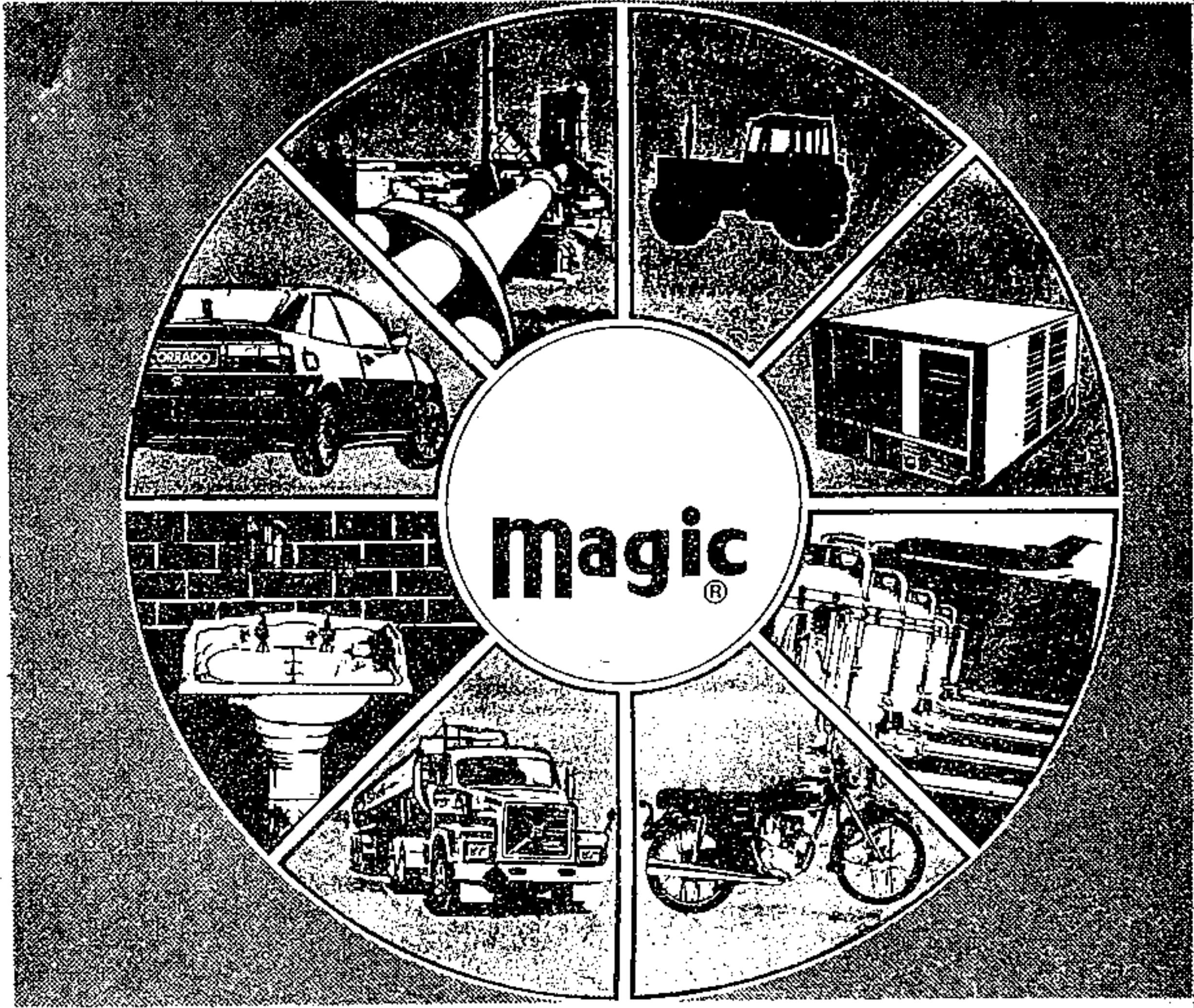
مجبور بھی کرتے تو آپ انکار فرما دیا کرتے تھے۔ آپ نے اپنی زندگی سخت ریاضت کر کے گزاری تا آپ تنہائی پسند تھے اور تنہائی میں عبادت کرنا پسند کرتے تھے۔ آپ کی انہی خوبیوں کی بدولت آپ کے مُرشد کی مہربانیاں اور عنایات آپ پر بہت زیادہ تھیں۔

ایک مرتبہ لوگوں کو آپ کی عبادات و ریاضت' زہد و تقویٰ اور بزرگی کا پتہ چل گیا۔ تو انہوں نے آپ کے پاس آنا جانا شروع کر دیا۔ بعض اصحاب نے بیعت کرنے کی بھی خواہش ظاہر کی مگر آپ اُن درویشوں میں سے نہیں تھے جو مریدوں کے خواہش مند اور عقیدت مندوں کے لیے جویاں اور ترساں ہوتے ہیں۔ آپ نے لوگوں کو اپنے پاس آنے سے سختی سے روک دیا۔ بلکہ آپ نے لوگوں کی اس طرح آمد سے تنگ آکر اپنا وقت کاروباری حلقوں میں گزارنا شروع کر دیا۔ اس طرح کئی لوگوں کے دل آپ سے بدگمان ہو گئے اور یوں لوگوں سے آپ کی گلو خلاصی ہو گئی۔ آپ نے پھر سے اپنا وقت تخلیے میں گزارنا شروع کر دیا۔

حضرت شمس تبریزیؒ بڑے ضعیف و نحیف شخص تھے' مگر اُن کے بیان میں کشش اور ان کی شخصیت میں جاذبیت تھی۔ آپ کو درویشوں کی ملاقاتوں کا بڑا شوق تھا۔ اس کے لیے آپ شہر بہ شہر گھومتے پھرتے رہے۔ اسی شوق کی تکمیل کے لیے آپ نے خُدا سے دُعا مانگی تھی کہ الٰہی مجھے کوئی ایسا بندہ مِل جائے جو میری صحبت کا متحمل ہو سکے اور ربّ جلیل نے آپ کو روم کے شہر قونیہ میں بھیجا اور یہاں ان کی ملاقات مولانا رومیؒ سے ہوئی۔ آپ نے مولانا کو بیعت کر کے حلقۂ ارادت میں داخل کیا۔ آپ کی مُلاقات کے بعد مولانا روم میں ایک انقلاب برپا ہو گیا۔ پہلے مولانا ہر وقت درس و تدریس' وعظ و ہدایت اور فتویٰ نویسی کیا کرتے تھے۔ پھر انہوں نے اپنے یہ سارے معمولات ترک کر دیئے اور نغمہ و ساز کی طرف متوجہ ہو گئے۔ تاہم مولانا روم ایک لمحہ کے لیے بھی شمس تبریزیؒ سے جُدا نہ ہوتے تھے۔ مولانا نے جب اپنے اشغال ترک کیے تو قونیہ کے لوگوں کو سخت گلہ ہوا۔ انہوں نے مولانا کے وعظ و نصیحت سے محرومی کا محرک حضرت شمسؒ کی آمد کو قرار دیا۔ بعض لوگ تو اس قدر مشتعل اور جذباتی ہو گئے کہ وہ شمس تبریزیؒ کے درپئے آزار ہو گئے۔ بعض حضرت تبریزیؒ کے ساتھ سخت گستاخیاں بھی کرنے لگے۔ ان باتوں کا حضرت تبریزیؒ کو بہت رنج پہنچا اور انہوں نے قونیہ کو چھوڑ دینے کا ارادہ کر لیا۔ اور اچانک ایک دن قونیہ سے دمشق جا پہنچے۔"

مولانا رومؒ کو حضرت تبریزیؒ کی جدائی اور فراق کا بڑا شاق گزرا۔ وہ جب اپنے پُرانے اشغال یعنی درس و تدریس کی طرف لوٹتے تو اُن کی حالت مرغ بسمل کی طرح ہو جاتی تھی۔ مولانا' حضرت تبریزیؒ کے فراق کی شدت میں رقت آمیز شعر پڑھا کرتے تھے۔ انہوں نے کھانا پینا چھوڑ دیا اور اپنے مریدوں اور خادموں سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ انہی فراق و جدائی کے جاں گسل لمحات میں مولانا کو حضرت تبریزیؒ کا خط ملا جس سے اُن کی آتش عشق اور بھڑک اُٹھی۔ مولانا کی بے قراری دیدنی تھی۔ آپ کی تڑپ دیکھی نہ جاتی تھی۔ جب آپ کی جان کے لالے پڑ گئے تو مولانا رومؒ کے صاحبزادے سلطان کی سرکردگی میں ایک وفد دمشق ہو گیا اور حضرت شمس تبریزیؒ سے معافی مانگی۔ مولانا نے وفد کو ایک منظوم خط اور ایک ہزار دینار سرخ بھی حضرت تبریزیؒ کے آستانے پر نچھاور کرنے کے لیے بھیجے۔

مولانا کی حالت پر حضرت تبریزیؒ کا دل پسیج گیا اور انہوں نے قونیہ واپس آنے کی حامی بھر لی اور جب آپ قونیہ پہنچ گئے تو مولانا روم بہت خوش ہوتے۔ ذوقِ سماع کی محافل پھر سے بپا ہونے لگیں۔ اہلِ قونیہ کو حضرت شمس تبریزیؒ کا قونیہ میں رہنا ناگوار گزرتا تھا لیکن وہ خاموش رہتے تھے۔

حضرت شمس تبریزؒ نے دنیائے تصوف میں جو بے مثال مقام حاصل کیا ہے وہ ارباب فکر ونظر سے مخفی نہیں ہے۔ آپ نے اشعار کی زبان میں جو اظہارِ خیال کیا ہے۔ اس کے جذب وگداز اور تاثیر نے دلوں کو مسخر کر رکھا ہے۔ آپ سراپا عشق تھے۔ آپ کے کلام میں اوّل تا آخر عشق کا پیغام ہے۔ آپ کہتے ہیں "اگر انسان کا دل عشق سے خالی ہے تو انسان نہیں پتھر کا بت ہے اور اگر کوئی قوم عشق سے تہی دامن ہے تو وہ محض راکھ کا ڈھیر ہے۔ آپ کے کلام میں تصوف اخلاق اور نفسیات کے دقیق مسائل اور اسرار ورموز کا ایک دریا ہے کہ امڈا چلا آتا ہے۔

آپ جہاں ذاتِ خداوندی کو روحِ مطلق سمجھتے ہیں وہاں اُسے حسنِ مطلق بھی کہتے ہیں۔ حسنِ مطلق ایک سرچشمہ ہے جس سے حسن کے سوتے پھوٹتے ہیں اور کائنات میں پھیل جاتے ہیں۔ انسانی روح اپنے اس سرچشمے کو دیکھنے اور اس میں داخل ہونے کے لیے بے تاب ہے۔ اسی اضطراب اور بے چینی کو آپ عشق کہتے ہیں۔ اس صورت میں روحِ انسانی عاشق اور ذاتِ باری محبوب ہے۔ بعض مقامات پہ آپ اس عشق کو مجاز کے پردے میں بیان کرتے ہیں۔ جس میں زلف و خال و رخ کا بھی ذکر ہوتا ہے۔ ساقی و جام کو بھی آپ نے عشق کے لازمی جُز قرار دیتے ہیں مگر ان سب چیزوں کا اصل تعلق ذاتِ خداوندی سے ہوتا ہے۔ جہاں دہکتے ہوتے رخساروں کا ذکر آتا ہے وہاں اس سے مراد حسنِ ذاتِ حق ہوتی ہے۔ جو صفات کی صورت میں ظاہر ہو رہا ہوتا ہے۔ شراب کے نشے سے جو کیف و مستی کا ذکر ہوتا ہے اس سے تصورِ محبوب میں سالک کے غرق ہو جانے کا مطلب لیا جاتا ہے۔

اس مبہم اسلوب بیان کی وجہ آپ یہ بیان فرماتے ہیں کہ صوفی شاعر اپنی فانی حیثیت میں حسنِ مطلق سے محبت کرتے تھے اور اس تصور میں ماسوائے اللہ کے سب کو بھول جاتے تھے۔ جب وہ اپنے خواب نما عاشقانہ واردات کا اظہار کرتے تو انسان ہونے کی حیثیت میں وہ الہیاتی نہیں بلکہ انسانی طریق بیان اختیار کرتے تھے۔ اس طرزِ بیان کو مولانا رومؒ نے اس طرح بیان کیا ہے۔

سیر پنہاں است اندر زیر و بم فاش اگر گویم جہان برہم زنم

حضرت شمس تبریزیؒ فرماتے ہیں راہ طریقت میں ایسا مقام بھی آتا ہے۔ اگر اسے واضح طور پر بیان کیا جاتے تو ظاہر بین لوگ راہ طریقت کے سالک کو دار و رسن کا مستحق سمجھتے ہیں۔ صوفیاء کا عقیدہ ہے کہ انسانی روح ایک ابدی اور غیر فانی عنصر ہے جس کا براہِ راست ذاتِ خداوندی سے تعلق ہے۔ یہ تعلق بالکل ایسا ہی ہے جیسا جزو کو کل کے ساتھ ہوتا ہے۔

ایک مرتبہ حضرت شمس تبریزیؒ چند مہینوں کے لیے ایک کمرے میں بند ہو گئے اور چلہ کشی شروع کر دی۔ اُن کی یہ جدائی بھی مولانا رومؒ سے برداشت نہ ہوئی۔ اور جب شمس تبریزیؒ نے اپنی چلہ کشی تمام کی تو مولانا بہت خوش ہوتے۔ اُن کی ساری بے قراری اور پژمردگی کافور ہو گئی۔ اس انتہائی خوشی کے عالم میں دیکھ کر حضرت شمس تبریزیؒ نے مولانا کو آزمانا چاہا اور فرمایا "اے مولانا! مجھے اس وقت ایک خوبصورت عورت کی طلب ہے۔ میں تم سے اُس وقت خوش ہوں جب تم مجھے ایک خوبصورت عورت لا دو گے۔" مولانا رومؒ نے کوئی سوال جواب کیے بغیر اپنی بیوی جو شاہ خوارزم کی بیٹی تھی اور حسن و جمال میں یکتا تھی، کو اپنے مرشد کی خدمت میں پیش کر دیا۔ حضرت شمس تبریزیؒ نے جب مولانا رومؒ کی بیوی کو دیکھا تو فرمایا "میں نے تمہیں اس عورت کے لیے تو نہیں کہا تھا یہ تو میری بہن اور بیٹی ہے۔" مولانا عرض گزار ہوتے "حضرت! میری نظر میں اس سے خوبصورت اور کوئی عورت نہ تھی۔ دوسرے میں اپنی پیاری سے پیاری چیز آپ پر قربان کرنے کا متمنی ہوں۔" اس پر حضرت شمس تبریزیؒ نے جواب دیا "مجھے اب عورت کی خواہش نہیں۔ اگر تم لا سکو تو ایک نوخیز اور خوبصورت لڑکا لا دو۔ مولانا رومؒ مشینی انداز میں اپنے مرشد کے حجرے سے نکلے اور بغیر کسی سوال جواب

کے اپنے گھر روانہ ہوتے اور اپنے چھوٹے بیٹے کو ساتھ لیا اور حضرت شمس تبریزیؒ کی خدمت میں پیش کر دیا حضرت شمس تبریزیؒ نے اس مرتبہ بھی مولانا کی سرزنش کی کہ میں نے تمہیں بڑا لڑکا لانے کو تو نہیں کہا یہ تو میرا بیٹا ہے۔ مولانا نے عرض کی "مرشدی مولائی! میں آپ پر قربان ہونا چاہتا ہوں میں کیوں اور کیا کی زبان نہیں جانتا میں تو حکم کا بندہ ہوں میرا کام آپ کی فرماں برداری کرنا اور آپ پر نثار ہو جانا ہے۔" یہ باتیں سننے کے بعد مولانا کے بیٹے کو بھی حضرت تبریزیؒ نے واپس کر دیا۔ پھر مولانا رومؒ سے کہا "اب جاؤ اور میرے لیے شراب کا بندوبست کرو۔ ایسی تیز اور شراب لاؤ جو مجھے کیف و مستی میں مبتلا کر دے۔" مولانا رومؒ جو اپنے زہد و ورع میں جریدہ عصر تھے اُن کے علم و حکمت اور عظمت و بزرگی کے چرچے ہر کہیں تھے مگر انہوں نے اپنی شہرت کی پرواہ نہ کی۔ قونیہ میں ایک یہودیوں کا محلہ تھا آپ تشریف لے گئے اور وہاں سے شراب حاصل کی اور حضرت تبریزیؒ کی خدمت میں پیش کر دی۔ حضرت شمس تبریزیؒ نے جب شراب کی بھری ہوئی صراحی دیکھی تو کافی دیر مولانا رومؒ کی طرف دیکھتے رہے۔ پھر شراب کی صراحی کو دیوار کے ساتھ دے مارا اور ساری کی ساری شراب گرا دی۔ مولانا چپ کھڑے ہیں نہ کچھ پوچھ رہے نہ بول رہے۔ کافی دیر کے بعد حضرت شمس تبریزیؒ نے مولانا سے فرمایا "اے جلال الدین رومیؒ آج سے تمہاری عرفان و معرفت، سلوک، محو اور جذب و سکر کی تمام منازل طے ہو گئی ہیں۔ یہ عورت، لڑکے اور شراب کی جو میں نے خواہش تمہارے سامنے کی تھی ایک آزمائش تھی۔ مگر تم آزمائش میں جس طرح پورے اُترے ہو اس کی مثال نہیں ملتی۔ آج سے تمہیں وہ مقام حاصل ہو گیا ہے جس سے تمہارا نام رہتی دُنیا تک یادگار رہے گا اور لوگ تمہاری تصانیف و تالیفات کو قیامت تک پڑھتے رہیں گے اور اُن سے اسرار و رموز کی باتیں سیکھتے رہیں گے۔ بلکہ میں شمس تبریزیؒ جو تمہارا مرشد ہوں' میں دُنیا میں گمنام ہو جاؤں گا اور میں تمہاری نسبت سے جانا اور پہچانا جاؤں گا۔ لوگ مجھے شمس تبریزیؒ کی بجائے مولانا رومؒ کے مرشد کی حیثیت سے جانیں گے۔ ان باتوں سے مولانا رومؒ کی خوشی اس قدر بڑھ گئی اور آپ نے حضرت شمس تبریزیؒ کی محبت میں اس قدر آگے بڑھ گئے کہ آپ نے اپنے ایک شعر میں فرمایا کہ "میں کبھی بھی مولانا روم نہ ہوتا اگر اس کو شمس تبریزیؒ کی غلامی میسر نہ آتی۔"

حضرت شمس تبریزیؒ جب دمشق سے واپس قونیہ تشریف لائے تو ان کی مراجعت نے پھر پرانی صحبتوں کو زندہ کر دیا اور مولانا روم دُنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر ہر وقت آپ کی خدمت میں مصروف رہنے لگے۔ لیکن لوگوں میں بغض و حسد ویسا کا ویسا ہی تھا جس سے حضرت تبریزیؒ کی بہت دل آزاری ہوتی تھی۔ حسد کرنے والوں میں مولانا کے فرزند بھی شامل تھے۔ ان باتوں سے تنگ آ کر ایک روز اچانک شمس تبریزیؒ روپوش ہو گئے۔ مولانا روم کی حالت پھر سے ناگفتہ بہ ہو گئی۔ انہوں نے ادھر اُدھر سے بہت تلاش کیا مگر شمس تبریزیؒ کو نہ ملنا تھا نہ ملے۔

مولانا روم کو خیال ہوا کہ حضرت پھر دمشق چلے گئے ہوں گے چنانچہ انہوں نے دمشق کا کونہ کونہ چھان مارا مگر گوہر مقصود ہاتھ نہ آیا۔ آخر مولانا نے فیصلہ کیا جب تک شمس تبریزیؒ نہ ملیں گے وہ قونیہ نہ جائیں گے مگر کچھ عرصہ بعد اہل قونیہ کے اصرار پر آپ کو واپس قونیہ جانا پڑا۔ وہاں جا کر آپ کو معلوم ہوا کہ حضرت شمس تبریزیؒ کو چند لوگوں نے جن میں مولانا کا لڑکا علاؤ الدین بھی شامل ہے' سازش کر کے شہید کر دیا ہے۔ مولانا روم اپنے لڑکے سے اس قدر ناراض ہو گئے کہ عمر بھر اس کی شکل نہ دیکھی۔ علاؤ الدین نے بڑی تکلیفیں اُٹھائیں اور طویل بیماری کے بعد مر گیا۔ مگر مولانا نے نہ اُن کی عیادت کی اور نہ ہی اُس کے جنازے میں شرکت کی۔

ان حقائق کے مطابق حضرت شمس تبریزیؒ ۶۴۵ھ میں قونیہ میں شہید کر دیئے گئے۔ آپ کے مزار کے متعلق بھی تاریخ خاموش ہے۔

حضرت نور محمدؒ صاحب سروری قادری کلاچوی ۱۳۰۳ھ میں ڈیرہ اسماعیل خان کے ایک دور افتادہ قصبہ کلاچی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد صاحب کا نام حاجی گل محمدؒ تھا۔ وہ نہایت زاہد عابد دین دار، متقی پرہیز گار اور صاحب کرامت بزرگ تھے، حضرت نور محمدؒ صاحب بچپن سے ہی صاحب ولایت وکرامت والے بزرگ تھے، آپ انتہائی ذہین اور ذکی تھے۔ عمر کے ابتدائی چند سالوں میں آپ نے قرآن مجید حفظ کر لیا اور دینی تعلیم جس کا حصول سالوں پر منحصر ہوتا ہے وہ نہایت کم مدت میں حاصل کر لی۔ آپ کو مادر زاد ولی کہنا بے جا نہ ہوگا۔

آپ سے ایسے ایسے غیر معمولی واقعات بچپن سے ہی ظاہر ہونا شروع ہو گئے تھے۔ جن سے آپ کی صداقت حقانیت اور ریاضت کو چار چاند لگ گئے تھے۔ آپ کی والدہ ماجدہ بھی بڑی نیک اور خدارسیدہ خاتون تھیں۔ آپ کی تعلیم وتربیت میں آپ کے والدین کا بہت حصہ ہے۔ آپ نے حضرت شمس العارفین سلطان باہوؒ سے بیعت کی اور رحمت وبرکت کے خزائن حاصل کئے۔ آپ نے قرآنِ حکیم اور احادیثِ نبویؐ کی تفاسیر کو جس حیرت انگیز اور مؤثر طریقے سے ثابت کیا ان کی نظیر نہیں ملتی۔

حضرت نور محمدؒ کلاچوی نے اپنے علم کا زبان وقلم سے شاندار عملی نمونہ پیش کیا۔ آپ نے اپنی تحریروں میں تین ایسی نرالی باتیں تحریر فرمائی ہیں جو آج تک کسی اہل قلم اور اہل علم سے نہیں ظاہر ہو سکیں۔ آپ نے اس علم کے پوشید اور مخفی بھید کو پوری طرح بے نقاب اور طشت ازبام کر دیا ہے اور اہلِ مشرق کو پہلی بار اس بھید سے روشناس کیا ہے۔ مزید برآں اس علم کی روشنی میں اسلامی اور قرآنی حقائق اور پیغبروں کے عقل معجزات اور خوارق کو عقل اور نقل سے جس مؤثر انداز سے ثابت کیا ہے وہ آپ کا ہی حصہ ہے۔ آپ نے قرآن حکیم کی چند آیتوں اور سورتوں کے معنی اور تفسیر التفاسیر کر کے ایک ایسا قابلِ فخر اور عظیم کارنامہ انجام دیا ہے جس نے قرآن حکیم کی عظمت ورفعت کو چہار چند کر دیا ہے۔ آپ نے اپنے ملفوظات کو اپنے مشاہدات

اور دیدہ تجربات سے اس قدر دلچسپ اور مرعوب خاطر کر دیا ہے کہ پڑھنے والا اسلوب بیان میں کھو کر رہ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ آپ نے فقر و عرفان کے متعلق جس انداز سے تبلیغ و تلقین کی ہے، اُس سے مردہ دلوں میں بھی زندگی کے آثار نظر آنے لگتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ اپنے خاص برگزیدہ بندوں یعنی انبیاء اور اولیاء کو جب اپنی مخلوق کی رشد و ہدایت پر مامور فرماتا ہے تو انھیں اپنا باطنی علم عطا فرماتا ہے جس کو علمِ لدنی کہتے ہیں جیسے ارشاد ربانی ہے۔

"جسے ہم نے اپنی خاص رحمت سے نوازا تھا اور اسے اپنی طرف سے باطنی علم عطا کیا تھا۔"

اس کے متعلق آپ فرماتے ہیں ایک مرتبہ میں اپنے باطنی حکم و مربی اور مرشد حضرت سلطان العارفین کے دربار میں حاضر تھا۔ میں نے باطن میں دیکھا کہ حضرت کے دربار میں داخل ہو رہا ہوں۔ میں نے ایک بزرگ عامل کو بھی آپ کے دربار کے باہر غلام گردش میں دیکھا جو ایک طالب علم کو سورۃ مزمل پڑھنے کی خاص تلقین کر رہے تھے۔ چنانچہ دربار کے دروازے میں میری آنکھیں اُس بزرگ سے دو چار ہو گئیں اور میری اس کے ساتھ باطنی رسہ کشی شروع ہو گئی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میرے اور اُس عامل کے درمیان ایک نور کا رسہ ہے جس کا ایک سرا اُس بزرگ کے ہاتھ میں اور دوسرا میرے ہاتھ میں۔ ہم دونوں خوب زور لگا کر اُس نوری رسے کو اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جس وقت وہ بزرگ رسے کو زور سے اپنی طرف کھینچتے ہیں تو اُن کے جسم کی حالت میں عجیب سی تبدیلی آ جاتی اور جب رسہ کو میں کھینچتا تو مجھے بھی اپنا جسم تبدیل ہوتا ہوا محسوس ہوتا۔

ہم دونوں میں کافی دیر رسہ کشی ہوتی رہی۔ میرا منہ اُس وقت اُس بزرگ کی طرف تھا اور کمر اپنے مُرشد کے مزار کی طرف تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میری پشت کی طرف سے میرے اندر کوئی روحانی قوت منتقل ہو رہی ہے جس سے میری طاقت بڑھ گئی اور میں نے زور لگا کر رسہ کھینچا تو یک لخت رسہ اُس بزرگ کے ہاتھ سے چھوٹ کر میرے ہاتھ میں آ گیا اور اُسی وقت کسی نے میری کمر تھپکی اور مجھے آفرین و شاباش کہا اور مجھے یوں محسوس ہوا کہ میرا سینہ نورانی بوجھ سے وزنی ہو گیا ہے اور یہ بزرگ جن کا اوپر مذکور ہے حضرت خضر علیہ السلام تھے۔

ایک درویش جن کا نام یار محمد تھا وہ آپ کے مُرشد حضرت سلطان العارفین کا عقیدت مند تھا۔ وہ اپنا واقعہ بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہے۔

میں نے سُنا تھا کہ جو شخص بھی حضرت سلطان العارفین کے مزار پر حاضری دیتا ہے اُس کی وہ مراد پوری ہو جاتی ہے جو وہ دل میں سوچ کر جاتا ہے۔ چنانچہ میں اپنے دل میں یہ مراد لے کر گیا کہ حضرت کو اصلی صورت میں دیکھوں۔ مگر دو دن قیام کے باوجود میں حضرت کی زیارت نہ کر سکا۔ میں نا اُمید ہو کر دربس چل پڑا اور دل میں سوچنے لگا کہ لوگوں نے یہ غلط پراپیگنڈا کیا ہوا ہے کہ حضرت کے مزار پر حاضری سے مُرادیں بر آتی ہیں۔ انھی خیالات پریشاں میں غلطاں چلتا رہا اور جب رات ہونے لگی تو میں نے سوچا کہ کسی مسجد میں جا کر رات گزاری جائے۔ چنانچہ رات کو جب میں سو گیا تو اس نے خواب میں دیکھا کہ میں حضرت سلطان العارفین کے مزار میں ہوں اور وہاں سے رخصت ہونے کی تیاری کر رہا ہوں اور دل میں یہ سوچتا ہوں کہ جاتی دفعہ آخری بار حضرت کے مزار کی زیارت کر لوں۔ جب نگاہ مزار کی طرف کرتا ہوں تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہاں قبر کی بجائے ایک چارپائی بچھی ہوئی ہے اور اُس پر چادر اوڑھے حضرت سلطان العارفین لیٹے ہیں اور منہ سے

چادر ہٹا کر فرماتے ہیں۔

"یار محمد! مجھے دیکھو دنیا میں میری یہی صورت تھی جو آپ تم دیکھ رہے ہو۔"

پس میری آنکھ کھل گئی۔ میں اپنی مراد بر آنے پر توخوش تھا ہی عجیب دولت اور خوشی جو مجھے ملی وہ یہ تھی کہ رات سونے سے پہلے میں بالکل مطلق جاہل اور ان پڑھ آدمی تھا مگر سلطان العارفین کی زیارت کے بعد مجھے قرآن مجید حفظ ہو چکا تھا۔ اپنی تسلی کے لیے میں نے کئی حفاظ کو قرآن مجید سنایا۔ اس میں کوئی غلطی نہ تھی۔ یہ برکات اللہ تعالیٰ نے ایک ولی کے روئے روشن کی بدولت یار محمد کو عطا فرمائیں۔

آپ فرماتے ہیں کہ قرآن مجید کی تلاوت، عبادت و ریاضت فی نفسہ کرنے سے قرب خداوندی نصیب ہوتا ہے۔ آپ حضرت بایزید بسطامیؒ کے متعلق بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ بایزید کعبۃ اللہ کا طواف کر رہے تھے وہاں انھوں نے خدا کے کسی والی کو دیکھا۔ اس پر آسمان سے نور کی تجلی نازل ہو رہی تھی۔ بایزید کہتے ہیں کہ میں نے اس ولی کے پیچھے پیچھے کعبہ کا طواف کرنا شروع کر دیا۔ جہاں وہ ولی کامل پاؤں رکھتے میں بھی وہیں رکھتا تھا۔ اچانک اس ولی نے مڑ کر دیکھا اور مجھے سرزنش کی۔

"اے نادان! جب تک میرے جیسے عمل نہیں کرے گا خالی میرے قدموں پر اپنے قدم رکھنے سے تمہیں کوئی فائدہ حاصل نہ ہوگا۔"

بایزید فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے دل میں سوچا کہ خدا جانے یہ ولی اللہ کون سا عمل کرتے ہوں گے۔ ابھی میں یہ سوچ رہا تھا کہ اس کامل شخص نے دوبارہ مڑ کر میری طرف دیکھا اور بولا۔

"میرا عمل یہ ہے کہ میں دن میں ستر مرتبہ قرآن حکیم پڑھتا ہوں۔"

بایزید کے دل میں خیال آیا" دل تو تسلیم نہیں کرتا کہ یہ شخص دن میں اتنی دفعہ قرآن پڑھ لیتا ہوگا کیونکہ بظاہر تو ایسا کرنا ممکن نہیں البتہ خیال میں یہ شخص پڑھ لیتا ہوگا۔"

اس ولی نے تیسری مرتبہ پھر مڑ کر بایزید کو مخاطب کیا اور فرمایا" میں قرآن مجید کو خیال میں نہیں پڑھتا بلکہ لفظاً اور عبارتاً پڑھتا ہوں۔"

حضرت نور محمد کلاچویؒ قرآن مجید کی تلاوت کی اہمیت اور اس واقعہ کو اس لیے نسبت دیتے ہیں تاکہ عام بندوں کو پتہ چلے کہ اولیاء کرام بھی اللہ کی عنایات اس کے کلام کی برکت سے حاصل کرتے ہیں۔

حضرت نور محمد فرماتے ہیں۔ انبیا اور اولیاء پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یکساں طور پر باطن میں واردات غیبی اور فتوحات کا نزول ہوتا ہے۔ صرف ان میں مراتب اور درجات کا فرق ہوتا ہے۔ ولی کے دل پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو باطنی القا ہوتے ہیں۔ انھیں الہام کہا جاتا ہے جب کہ نبی کے دل پر باطنی القا کو وحی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ ولی کی خوارق کو کرامات کہتے ہیں لیکن ایسے خوارق کو معجزات کا نام دیا جاتا ہے۔ اسی طرح نبی کی اللہ تعالیٰ اور اس کے آسمانوں، عرش و کرسی کی طرف باطنی پرواز کو معراج کہا جاتا ہے لیکن ولی کے باطنی صعود اور عروج کو باطنی طیر سیر کہا جاتا ہے۔ الغرض نبی اور ولی کے باطنی کمالات اور روحانی مشاہدات میں ہر طرح کی پوری مماثلت اور تمام مشابہت پائی جاتی ہے۔

نبی اور ولی کے وجود میں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے باطنی لطائف زندہ ہو جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ انھیں زندہ اور تابندہ کر دیتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے۔

"اللہ ان لوگوں کا دوست ہے جو اس پر سچے دل سے ایمان لائے ہیں۔ انھیں مادے کی کثیف

ظلمت سے نکال کر عالمِ غیب کی لطیف نوری دُنیا میں داخل کر دیتا ہے۔"
اللہ تعالیٰ اولیاء اور انبیاء کو خلق کی راہ نمائی اور ہدایت کے واسطے منتخب فرماتا ہے تو اس کے باطنی لطائف کو اپنے نور سے زندہ فرما دیتا ہے اور ان لطائف سے وہ عالمِ نفس اور عالمِ الغیب میں طیر سیر کرتا ہے اور اسے کئی ایسے باطنی نوری وجود عطا ہوتے ہیں جن کے تمام اعضاء اللہ تعالیٰ کے نور سے منور ہوتے ہیں۔ غرض تمام باطنی کمالات، روحانی کشف و کرامات اور عجیب و غریب خوارق ہی غیبی نوری اجسام کے کرشمے ہیں۔
آپ کی ہمشیرہ جن کا نام رابعہ بی بی تھا، بڑی نیک، عابدہ، پارسا اور سعادت مند لڑکی تھیں انھوں نے آپ سے ہی کمالات حاصل کر رکھے تھے۔ موصوفہ کو آپ سے حد درجہ محبت تھی۔ جوانی میں ہی وہ بیچاری استسقاء کے مرض کا شکار ہو گئیں۔ اس مرض کا خاصہ ہے کہ اس میں مریض کے پیٹ، ہاتھ پاؤں غرض تمام جسم پھول جاتا ہے اور رنگت زرد ہو جاتی ہے۔ بیماری رفتہ رفتہ بڑھتی گئی مگر دوا دارو نے کوئی اثر نہ کیا۔ آخرکار اُس عفیفہ لڑکی پر دقت نزع آ گیا۔ آپ نے اُس کے لیے سورہ یٰسین شریف پڑھنی شروع کی اور اُس کو کلمہ طیبہ پڑھنے کا حکم دیا۔ اس بیماری میں اُس نوجوان بچّی کا انتقال ہو گیا۔ اُس کو دفن کر دیا گیا تو تیسری رات کشفی حالت میں آپ نے دیکھا کہ آپ اپنے خاندانی گورستان میں کھڑے ہیں۔ جس جگہ آپ کی ہمشیرہ دفن تھی وہاں قبر کی بجائے ایک شکستہ اور ٹوٹا ہوا مکان ہے اس مکان میں وہ مرحومہ ایک ٹوٹی پھوٹی چارپائی پر دراز ہے۔ اُس کی حالت بالکل ویسی ہے جیسی مرنے سے پہلے تھی اور وہ آپ کو پکار رہی ہے کہ بھائی آؤ اور میری مدد کو پہنچو۔ آپ اُس کی مدد کو پہنچتے ہیں اور اُس کو تسلّی و تشفی دینے کے بعد اُس کی چارپائی کی پائنتی پر بیٹھ کر آیۃ الکرسی پڑھنی شروع کر دیتے ہیں۔ اُس کے بعد سورۃ مزمّل پڑھتے ہیں، پڑھتے پڑھتے آپ کی نظروں کے سامنے سے وہ ٹوٹا ہوا مکان اور ٹوٹی ہوئی چارپائی ہٹ جاتی ہے اور ایک عالیشان مکان اور اس میں بیش قیمت مسند بچھی ہوئی ہے جس پر آپ کی ہمشیرہ متمکن ہوتی ہے۔ اُس کا لباس ریشمی اور پُرکشش ہوتا ہے اُس واقعہ کو بتلاتے ہوئے آپ فرماتے ہیں کہ ان واقعات کے بیان سے "قرآن مجید کی تلاوت کی اہمیت و تاثیر بتانا مقصود ہوتی ہے کہ قرآن کی آیات کے اندر کس قدر اثر ہوتا ہے۔
اولیاء اللہ مرتے نہیں بلکہ اس دارِ فانی سے آخرت کے دارِ جاودانی کی طرف نقل مکانی اختیار کر لیتے ہیں قبروں میں ان کا تصرف قائم رہتا ہے اور دنیا کی نسبت دارِ آخرت میں اُن کی روحانی طاقت بڑھ جاتی ہے۔ کئی دفعہ دیکھا گیا ہے کہ بعض بزرگوں اور اولیاء کے مزارات جب کبھی کسی عام شاہراہ، ریلوے لائن، نہر وغیرہ یا سرکاری عمارات کی زد میں آ جائیں اور سرکاری افسران نے اپنی سڑک سیدھی رکھنے کے لیے کسی قبر کو مٹانے کا ارادہ کیا تو ان بزرگوں نے اپنے باطنی تصرف اور روحانی طاقت سے ان افسران کو ایسی ڈانٹ دی کہ وہ فوراً اُس کام سے باز آ گئے ورنہ وہ خود مٹ گئے۔
چنانچہ ان مزارات کے مقامات پر بعض سڑکوں، نہروں، بازاروں اور قلعوں کی دیواروں میں ایسے موڑ اور خم آج تک موجود ہیں کہ ان قبروں کو بیچ سلامت چھوڑ دیا گیا ہے، یہ صورت حال صاف طور پر زبانِ حال سے بتا رہی ہے کہ ان مادی اور نفسانی حکمرانوں کو باطنی اور روحانی حکمرانوں کے سامنے دم مارنے کی مجال نہیں۔
حضرت بیان فرماتے ہیں کہ ایک با اختیار حاکم نے کسی ولی اللہ کی قبر مبارک اُس کے مقام سے ہٹانا چاہی کیونکہ وہ اس جگہ پر محل تعمیر کرنا چاہتا تھا اور وہ قبر اس کے محل کی زیبائش و تزئین میں بدصورتی پیدا کرتی تھی اُس نے جعلی مولویوں سے فتویٰ لے کر قبر گرانا چاہی، رات کے وقت اُس کو خواب میں ایسے عذاب سے دوچار

کیا گیا کہ وہ ساری عمر کے لیے مفلوج الدماغ ہوگیا۔ اُس کی سُدھ بدھ عنقا ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ سے جو محبت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اُن کی دوستی و محبت کا پُورا پورا حق ادا کرتا ہے۔

جیسے ایک مشہور واقعہ ہے کہ اورنگ زیب بادشاہ کا ایک بیٹا باغی ہوگیا اور ایک راجہ کے پاس جاکر رہنے لگا۔ اور حکمران باپ کے خلاف سازشیں کرنے لگ گیا۔ اورنگ زیب کو جب اپنے بیٹے کی کارستانیوں کا علم ہوا تو وہ چند سپاہی لے کر اس راجہ کے علاقے میں سیر و شکار کے بہانے جا نکلا اور اپنے سپاہیوں کو ایک جگہ کھڑا کرکے خود راجہ کے محل کے قریب ایک مسجد میں جاکر بیٹھ گیا اور وہاں سے ایک پروانہ اس راجہ کے نام لکھ کر بھیجا کہ مَیں ایک ضروری کام سے تمہارے علاقے میں آیا ہوں اور تمہارے ساتھ چند ضروری باتیں کرنے کا خواہش مند ہوں۔ اس وقت فلاں مسجد میں تمہارا منتظر ہوں۔"

راجہ نے جب اورنگ زیب کا بھیجا ہوا پروانہ پڑھا تو اُس کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ حیرت سے دم بخود رہ گیا۔ اسی وقت مع ارکانِ سلطنت کی طرف پا پیادہ روانہ ہوگیا۔ جب اس کی نظر بادشاہ کے چہرے پر پڑی تو خوف اور ہراس سے کانپنے لگا۔ مسجد میں داخل ہوکر بصد ادب و احترام بادشاہ کے سامنے کورنش بجا لایا۔ دست بستہ بادشاہ کے سامنے مع تمام ارکانِ حکومت کھڑا ہوکر حکم کا انتظار کرنے لگا۔ بادشاہ نے اسے اپنے قریب بیٹھنے کا حکم دیا۔ اس وقت گرمی کا موسم تھا۔ بادشاہ کا لباس پسینے سے شرابور تھا۔ بادشاہ نے اُسے اپنی قمیص کے بٹن کھولنے کے لیے کہا، راجہ کے ہاتھ مارے خوف کے کانپ رہے تھے، اس نے ہر چند کوشش کی لیکن وہ گردن کے ساتھ والے بٹن کو نہ کھول سکا۔ پھر بادشاہ نے اپنا خنجر جو اس وقت اس کے پاس تھا، راجے کے حوالے کیا اور حکم دیا کہ وہ اس خنجر سے بٹن کاٹ ڈالے۔ اب چونکہ معاملہ پہلے سے بھی خطرناک اور نازک صورت اختیار کر گیا تھا کہ ادھر تیز خنجر اور ادھر بادشاہ کے نازک گلے کے متصل بٹن کاٹنے کا حکم راجہ کے چہرے پر مارے خوف کے ہوائیاں اُڑنے لگیں کئی دفعہ کوشش کی لیکن خنجر ہاتھ سے گر پڑتا۔ آخر عرض کی۔

"جہاں پناہ! یہ غلام حضور کی اس خدمت سے قاصر ہے۔"

بادشاہ نے خنجر واپس لے لیا اور اس راجہ سے کہا۔ "اے ناداں بنیئے! اورنگ زیب اس وقت اکیلا بے یار و مددگار اور بغیر فوج و سپاہ تیری مملکت میں بیٹھا ہے۔ اُس کا خنجر تیرے ہاتھ میں اس کا گلا تیری انگلیوں میں اور باوجود اس کے حکم اور فرمائش اور اپنی بار بار کوشش کے تُو میری قمیص کا بٹن نہیں کاٹ سکا۔ چہ جائیکہ تُو میرے لڑکے کے ساتھ مل کر میرے قتل کے منصوبے بنا رہا ہے۔ یاد رکھ ہمارے اُوپر اللہ کا سایہ ہے۔ ہم خدا کے مقرر کردہ ہیں جب تک ہم خدا اور اُس کے رسولؐ کے احکام کی بجا آوری کرتے رہیں گے اور اولیاء اللہ کی خدمات بجا لاتے رہیں گے تم جیسے دنیا دار ہمارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔"

حضرت فرماتے ہیں: "یہ حال اُن بادشاہوں کا تھا جو ظلِ اللہ تھے اور حقیقی وارث الارض اولوالعزم اولیاء سایۂ فگن تھے اور جو ہر حال ظاہر و باطن ان کے ہمراہ پشت پناہ تھے۔"

حضرت نور محمد کلاچوی کی تاریخ وفات کے متعلق کوئی حتمی رائے تذکرہ نگاروں نے نہیں بیان کی۔ آپ نے عمر بھر دین کی خدمت کی جس سے بے شمار خوابیدہ اور غافل قلوب اس کے مطالعہ سے بیدار ہوگئے ہیں اور بکثرت گم گشتگان بادیۂ ضلالت اسے مشعلِ راہ بنا کر طریقت کی صراطِ مستقیم کے راہوار ہوگئے۔

بارگاہِ ایزدی میں دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی غیر فانی تعلیمات کے فیض کا مبارک سلسلہ تاحیات جاری رکھے۔

حضرت شیخ احمد سرہندیؒ کی مجلس وعظ جاری تھی۔ دفعتاً آپ حلقۂ ذکر سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور فرمایا۔ میں نے اس حلقہ میں ایک دوست کی پیشانی پر لفظ شقی لکھا ہوا دیکھا ہے۔

یہ سُن کر تمام حاضرین پر ہیبت طاری ہو گئی اور ہر ایک لرز کر رہ گیا۔ سب بہت خوف زدہ اور متفکر تھے۔ حضرت مجدد الف ثانی نے فرمایا۔ میں ایک بلا کے دفع کرنے کے درپے ہوا۔ جو کسی دوست کے حق میں مقرر ہو چکی تھی۔ اس وقت میں نے بارگاہ الٰہی میں انتہائی عاجزی سے التجا کی تو معلوم ہوا کہ لوح محفوظ میں اس امر کی قضا کسی امر سے متعلق اور کسی شرط سے مشروط نہیں ہے۔ اس بات سے مجھے بہت مایوسی ہوئی۔ اچانک مجھے حضرت سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ کی بات یاد آئی۔ کہ انھوں نے ایک موقع پر فرمایا تھا۔ "قضائے مبرم میں کسی کو تصرف حاصل نہیں لیکن مجھے بفضل ایزدی حاصل ہے۔" چنانچہ یہ سوچ کر میں بارگاہ خداوندی میں دوبارہ ملتجی ہوا اور حد درجہ عجز و انکسار سے پیرانِ پیر کا واسطہ دیا۔ تب اس فقیر پر ظاہر ہوا۔ کہ قضائے معلق دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک وہ جس کا معلق ہونا صرف اللہ تعالیٰ کے پاس محفوظ ہے اور جو لوح محفوظ میں قضائے مبرم کی حیثیت رکھتی ہے نہ ایک قضا پر جو حقیقت میں مبرم (اٹل، قطعی) ہے اور اس میں تصرف اور تبدیلی عقلی اور شرعی طور پر محال ہے۔

چنانچہ جو آفت و مصیبت اس دوست پر پڑی تھی، اس کی حقیقت معلوم ہوئی اور حق تعالیٰ نے اس بلا کو دفع فرمایا۔ یہ دوست آپ کے مرید اور پیر بھائی شیخ محمد طاہر لاہوری تھے۔ اس انکشاف پر لوگ حیران تھے کہ ایسا شخص جو علم کا دریا نہیں سمندر ہے کیسے شقی ہو سکتا ہے۔

اس واقعہ کے تھوڑے عرصہ بعد ہی شیخ طاہر سے عجیب عجیب لغزشیں سرزد ہوئیں۔ ایک مرتبہ آپ کی زبان سے نکل گیا کہ اگر مجدد الف ثانی بھی چاہیں تو میری نسبت سلب نہیں کر سکتے۔ یہ بات جب مجدد الف ثانی تک پہنچی تو وہ جلال میں آ گئے اور شیخ طاہر ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگے۔ ان کی حالت کا اندازہ ہونے

آپ شیخ طاہر کے پاس گئے۔ ان کو تڑپتا دیکھ کر آپ کو رحم آگیا اور اُن کا قصور معاف کر دیا۔ کیونکہ شیخ ہر آپ کے صاحبزادوں کے استاد تھے۔

خواجہ محمد سعید اور خواجہ محمد معصوم اکثر کہا کرتے تھے کہ شیخ محمد طاہر کے حقوق ہم پر اس قدر ہیں کہ ہم کسی طور ان کے شکریہ سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔

شیخ محمد طاہر ۹۸۷ھ میں بمقام لاہور پیدا ہوئے اور یہیں پرورش پائی۔ آپ کا نام محمد طاہر تھا۔ عالم یا میں حضرت شاہ کمال کیتھلی نے آپ کو بندگی کا لقب عطا فرمایا تھا اور حضرت شاہ سکندر رؤس الاولیاء آپ کو ابو طاہر کا خطاب دیا تھا۔ آپ طاہر بندگی کے لقب سے مشہور ہوئے۔ آپ کے آباؤ اجداد ایران سے ور آکر آباد ہوئے تھے۔ مفتی غلام سرور لاہوری نے لکھا ہے کہ آپ سلسلۂ قادریہ میں اپنے عہد کے قطب تھے۔ علومِ ظاہری میں یکتائے روزگار و منفرد تھے۔ علمِ شریعت و طریقت میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ حضرت مجدد ف ثانی نے آپ کو العالم، الفاضل اور الکامل کے القابات سے یاد فرمایا ہے۔ آپ کی عادات و خصائل عام وں سے مختلف اور بزرگی کے آثار بچپن سے ہی نمایاں تھے۔ جب تحصیل علم کے لیے آپ کو مکتب میں بٹھایا گیا۔ بہت کم مدت میں آپ نے قرآن مجید حفظ کر لیا تھا۔ حافظہ بلا کا تیز تھا۔ ابتدائی تعلیم والد کے زیرِ سایہ حاصل اور پھر لاہور کے بڑے بڑے علمائے سے اکتساب علم کیا۔

ایک روز مجدد الفِ ثانی نے فرمایا۔ میں چاہتا ہوں کہ محمد یحییٰ کو شیخ طاہر کے سپرد کر دوں۔ تاکہ وہ بھی اپنے ٹیوں کی طرح شیخ طاہر کی صحبت کے فیض سے عالم باعمل ہو جائے لیکن اب ان کا وہ دماغ کہاں رہا ہے ں اب ظاہری علوم کی جگہ درویشی نے لے لی ہے۔"

علوم ظاہری کی تکمیل کے بعد آپ نے دہلی اور آگرہ جا کر وہاں کے اربابِ فضل و کمال سے مل کر ان کے سے استفادہ کیا۔ ان دنوں جب آپ علوم ظاہری کی تکمیل میں کوشاں تھے۔ وہاں باطنی فیض حاصل کرنے لیے کسی مردِ حق کی تلاش میں رہے۔ دہلی میں قیام کے دوران آپ حضرت باقی باللہ دہلوی کی شہرت ن کر فوراً ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا مدعا بیان کیا۔ حضرت خواجہ باقی باللہ نے فرمایا۔ تمہارا معاملہ شیخ احمد سرہندی کے ساتھ ہے اور وہ بہت بڑے عالم باعمل ہیں۔ تم ان کے پاس سرہند جاؤ۔ وہاں دوران م ایک روز تمہارا مُرشد خود تمہیں طلب کرے گا۔ تمہاری نسبت نقشبندی نہیں قادری ہے۔ سرہند جا کر آپ رت و ریاضت میں مصروف ہوئے اور حضرت مجدد کی خدمت میں رہتے ہوئے آپ کے جوہر چمک اٹھے۔ انہی ں بحکمتِ الٰہی آپ پر وہ بلائے عظیم نازل ہوئی اور حضرت مجدد کی نظرِ کرم سے اس سے نجات پائی۔ ایک مرتبہ پ نے اخذ فیض میں کمی کا احساس کرتے ہوئے اخذ فیض کا طریق جاننے کی درخواست کی۔ حضرت مجدد نے یا۔ طاہر! کیا تمہیں ہمارے حضرت خواجہ باقی باللہ کی بات پر یقین نہیں آیا۔ پھر مسکرا کر فرمایا۔ تمہارا اصل ہاں ہے وہ عنقریب تمہیں مل جائے گا۔

ایک روز حضرت شاہ سکندر نے مجدد صاحب سے فرمایا کہ کسی ایسے شخص کو جو علم و فضل میں یکتا ہو۔ ایسے رے پاس بھیج دیں تاکہ ہم ان سے قصیدہ بردہ کی صحت کے متعلق ـــــ گفتگو کر سکیں۔ حضرت مجدد نے شیخ ہر لاہوری کا ذکر کرکے ان کے علم و فضل کی تعریف کی اور کچھ دن بعد ہی شیخ طاہر کو ہمراہ لے کر حضرت شاہ سندر کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت مجدد ایک دن ٹھہر کر تھانیسر چلے گئے اور شیخ طاہر کو تنبیہہ کر گئے کہ ں بہت محتاط رہنا۔

شیخ طاہر کو آپ کی خانقاہ میں رہتے کئی دن گزر گئے۔ اس دوران حضرت شاہ سکندر نے آپ سے کوئی بات نہ کی۔ شیخ طاہر اس خاموشی سے اُکتا گئے لیکن جب اس سلسلہ میں کچھ کہنے کی کوشش کرتے تو زبان گنگ ہو جاتی۔ بالآخر ایک اور قصیدہ بردہ مع تشریح لکھ کر حضرت کی خدمت میں پیش کیا۔ حضرت شاہ سکندر نے قصیدہ بردہ کا پہلا شعر قواعدِ حرف و نحو کے خلاف پڑھا تو شیخ طاہر نے اصلاح کرنا چاہی۔ لیکن شاہ سکندر نے جلال میں آکر فرمایا۔" طاہر! یہ شعر اسی طرح درست ہے جیسے میں نے پڑھا ہے۔" آپ کے جلال کا شیخ طاہر پر ایسا اثر ہوا کہ وہ تین دن تک بیہوش رہے۔ جب حضرت نے شیخ پہ اپنا ہاتھ رکھا تو وہ ہوش میں آئے، لیکن اپنے سینہ کو علم و عرفان سے خالی محسوس کر کے پریشان ہو گئے اور بلا اجازت سرہند کی راہ لی۔ تین دن تک برابر چلتے رہے لیکن ہر صبح آنکھ کھلنے پر خود کو کیتھل میں پاتے۔ چوتھے روز حضرت شاہ سکندر قادری نے فرمایا۔" طاہر! از ما بہ گریختی۔ بددلی مکن۔ قسمت تو وابستۂ فتراک ماست۔ وعنقریب خدا تعالیٰ درباره تو عنایت سازد" شیخ طاہر کی زبان پر بے اختیار عراقی کا یہ شعر جاری ہو گیا۔

از تو نگریزد دل من یک زماں   قالب را کے بود از جاں گریز

دار لطف مرا در بر گرمت   دار بیش از مادرم صد گونہ شیر

اس کے بعد شیخ نے اپنا سر مُرشد کے قدموں پر رکھ دیا اور بیعت کر کے خلعت خلافت پائی اور لاہور کی قطبیت کے فرمان سے نوازے گئے۔ حضرت شاہ سکندر نے مجدد صاحب کو لکھا کہ وہ طاہر کے حق میں خصوصی توجہ رکھیں اور لاہور کی قطبیت کے فرمان پر اپنی مہر ثبت فرمائیں۔ اس تحریر کے ساتھ شیخ طاہر کو سرہند روانہ کیا۔

لاہور میں آپ کے زہد و اتقا اور علم و فضل کی شہرت گلی گلی پہنچ گئی۔ آپ دن رات طالبانِ حق کی تلقین میں مصروف رہتے تھے۔ اس زمانہ میں خطۂ میانی کے رئیس حافظ جان محمد تھے اور آپ سے بے حد محبت رکھتے تھے۔ انھوں نے ایک عالیشان مدرسہ بنوا کر آپ کی نذر کیا اور بمنت تمام آپ کو میانی صاحب میں لے آئے۔ یہاں بھی آپ کا دینی اور علمی شغل جاری رہا۔ آپ کسی معاوضے کے بغیر وعظ و تدریس کا کام کرتے تھے۔ میانی صاحب میں آپ کی وجہ سے علماء فضلا کا جمگھٹ رہنے لگا۔ پنجابی زبان میں عالم کو میاں کہتے ہیں اس لیے اس محلہ کا نام میانی صاحب مشہور ہوا۔ اور آپ پیر میانی کہلائے۔

آپ کے پاس بکثرت نذرانے آتے تھے لیکن آپ قبول نہ کرتے تھے۔ امراء اور رؤسا کو کسی حال میں آنے کی اجازت نہ تھی۔ ایک مرتبہ حاکم لاہور نے بہت کوشش کی کہ آپ اس کے دربار میں تشریف لائیں لیکن آپ نے انکار کر دیا۔ شاہجہاں تخت نشین ہوا تو اس نے گراں بہا رقم حاکم لاہور کے ذریعہ آپ کے پاس ارسال کی اور ہدایت کی کہ یہ ان کا حق ہے۔ آپ میں جذبۂ سخاوت اس قدر غالب تھا کہ دوسروں کی حاجت کو اپنی ضرورت پر ترجیح دیتے تھے، موسم سرما میں درویشوں کو لحاف اور بستر لا کر دیا کرتے تھے۔ اور خود رات کا بیشتر حصہ نوافل میں گزار دیتے تھے۔

ایک مرتبہ آپ اپنے مُرشد کے عرس پہ کیتھل میں حاضر تھے۔ آپ کے پیر بھائی اور دوسرے مشائخ جمع تھے کلمہ طیبہ کا ذکر آیا آپ نے جذبہ میں آکر کہا کہ جس نے اس کلمہ کو دل و جان سے پڑھا ہے۔ وہ اگر لفظ لا کسی ذی روح کے کان میں کہے تو وہ مر جائے اور الا اللہ کہے تو پھر زندہ ہو جائے۔ یہ کہہ کر آپ کھڑے ہو گئے۔ وہاں ایک گائے بندھی تھی، اس کے کان میں لا کہا تو وہ اسی وقت مر گئی، پھر الا اللہ کہا تو زندہ ہو گئی۔ ایک درویش آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اس کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی۔ آپ نے پوچھا یہ کونسی کتاب

ہے۔ اس نے عرض کیا کہ میرے مرشد کے ملفوظات ہیں۔ میں اسے ہمیشہ پڑھا کرتا ہوں۔ وہ درویش کچھ مدت آپ کی خدمت میں رہا۔ ایک روز اس نے عرض کیا "اے شیخ طاہر! مجھے کچھ عنایت کریں۔"

آپ نے فرمایا۔ مانگ کیا مانگتا ہے۔ اس نے عرض کیا۔ میرے پیر کو سولی چڑھایا گیا تھا۔ آپ دعا کریں کہ مجھے بھی سولی چڑھایا جائے تاکہ پیر کامل کی مطابقت نصیب ہو جائے۔ آپ نے فرمایا۔ اے عزیز! تُو نے کیا مانگا۔ اس نے عرض کیا۔ آپ توجہ فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ مجھے یہ سعادت نصیب کرے۔ تب آپ نے فرمایا، حق تعالیٰ تیری یہ خواہش پوری کرے گا۔ اس کے بعد وہ درویش آپ سے اجازت لے کر حیدر آباد دکن چلا گیا۔ آپ اکثر اس درویش کا ذکر کیا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ وہ درویش اہل معنی میں سے تھا کچھ عرصہ بعد آپ کا حیدر آباد دکن جانا ہوا۔ جہاں جاتے وہاں لوگوں سے دریافت کرتے کہ اس وضع اور شکل کا کوئی درویش یہاں دیکھا ہے مگر اس کا کوئی پتہ نہ چل سکا۔ بالآخر ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں یہ پتہ چلا کہ اس شکل و شباہت کا ایک درویش یہاں آیا تھا۔ ڈاکوؤں نے ایک گاؤں کو لوٹا اور وہ سب ڈاکو گرفتار ہو گئے۔ ان ڈاکوؤں میں وہ درویش بھی شامل تھا۔ حاکم نے ان سب کو سولی کا حکم سُنایا۔ وہ درویش سولی کی طرف خوشی خوشی دوڑا اور کہا سب سے پہلے مجھے سولی دو۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ بعد میں ڈاکوؤں نے بتلایا کہ یہ شخص ہم میں سے نہ تھا۔ یہ درویش تو مسجد میں بیٹھا کچھ پڑھ رہا تھا۔ جب ہم پکڑے جانے کے خوف سے مسجد میں چھپے تو لوگوں نے ہمارے ساتھ اسے بھی پکڑ لیا۔ یہ سُنکر حاکمِ شہر کو بہت افسوس ہوا اور انھیں سولی سے اُتار کر بڑی عزت اور احترام سے دفن کیا۔

آپ کی دو بیویاں تھیں لیکن اولاد کسی سے نہ تھی۔ البتہ آپ کی معنوی اولاد میں ہزارہا لوگ تھے۔ جن میں بہت بڑے نامور خلیفہ گزرے ہیں ان خلفاء میں سرِفہرست شیخ ابو محمد قادری فاضلیہ سلسلہ کے پیشوائے اعظم کا نام آتا ہے۔ جن کا مزار آپ کے جنوب مشرق میں واقع ہے۔ ایک مرتبہ آپ نے جذب کی کیفیت میں فرمایا اور ابو محمد قادری کو حکم دیا کہ لوگوں میں اس کا اعلان کر دو۔ میں نے خدا سے اجازت لے لی ہے کہ جو شخص میرے قرب و جوار میں دفن ہو گا اس کے تمام گناہ معاف کر دیئے جائیں گے اور وہ اللہ کی رحمت سے جنت میں داخل ہو گا"

آپ پر حضرت غوث الثقلین شیخ عبدالقادر جیلانی کی محبت کا بہت غلبہ تھا جس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا تھا کہ ایک مرتبہ آپ کو الہام ہوا۔ اے طاہر! کہدے میرا قدم تمام اولیاء کی گردن پر ہے: لیکن آپ انتہائے ادب سے ایسا نہیں کہتے تھے بلکہ عرض کرتے کہ یہ رتبۂ عالی تو صرف حضور غوث الاعظم کو ہی سزاوار ہے۔ مجھے تو صرف اتنا کام ہے کہ میں حضور غوث پاک کا ایک کمتر مُرید اور پیروکار ہوں۔"

آپ کے قلب و روح پر حضرت شاہ سکندر قادریؒ کی توجہات کا اثر اتنا غالب تھا کہ ایک دفعہ حضرت شاہ سکندر قادریؒ لاہور تشریف لائے اور حضرت طاہر بندگیؒ کے مکان پر پہنچے۔ جو محلہ شیخ اسحاق موجودہ موتی بازار متصل چونا منڈی میں تھا۔ اسوقت آپ بالائی منزل پر تھے۔ مُرشد کو دیکھتے ہی بے اختیار چھلانگ لگا کر قدمبوسی کا ارادہ کیا۔ مُرشد کو آپ کی قلبی کیفیت معلوم ہو گئی۔ اس لیے فوراً بلند آواز سے فرمایا۔ طاہر! حوصلے سے کام لو اور سیڑھی کے ذریعہ نیچے آؤ۔

حضرت شیخ آدم بنوری نے جب آپ کی شہرت سُنی تو ترک شیخیت کر کے پا پیادہ بنور سے لاہور تشریف لائے اور آپ سے نسبت قادریہ میں فیض حاصل کیا اور مسند ارشاد پر فائز ہوئے۔

۳۰ محرم ۱۰۴۰ھ کو آپ نے انتقال فرمایا۔ روشن آفتاب سے مادۂ تاریخ نکلتا ہے۔ اپنے مدرسے کے ایک گوشہ میں مدفون ہوئے۔ آپ کے مدفون ہونے کے بعد خطۂ میانی لاہور کا عظیم قبرستان بن گیا۔

مکمل
بلب خریدیئے
فلپس
ہی خریدیئے

Philips Lighting

PHILIPS